تاریخِ اسلام

حصہ اوّل، حصہ دوم

چہاردہ معصومینؑ کی سیرتِ طیبہ
پر مشتمل ایک جامع و مستند لاجواب کتاب

تالیف
اہلِ قلم کی ایک جماعت

تہذیب وتدوین
علامہ ریاض حسین جعفری (فاضل قم)
ریسرچ سکالر اسلامک یونیورسٹی ٥ قم ٥ ایران

تاریخ اسلام

(حصہ اوّل و حصہ دوم)

چہاردہ معصومین علیہم السلام کی سیرتِ طیبہ پر مشتمل
ایک جامع و مستند کتاب

تالیف

اہلِ قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

حجۃ الاسلام نثار احمد زین پوری

تہذیب و تدوین

حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضلِ قم

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین

جناح ٹاؤن' ٹھوکر نیاز بیگ' لاہور
فون : 35425372

جملہ حقوق بحقِ ادارہ محفوظ

نام کتاب : تاریخ اسلام (حصہ اوّل وحصہ دوم)

تالیف : اہلِ قلم کی ایک جماعت

مترجم : حجۃ الاسلام نثار احمد زین پوری

تہذیب وتدوین : حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضلِ قم

پروف ریڈنگ : اسد علی ڈار

فنی تعاون : زہرا بتول جعفری، محدثہ بتول جعفری

اشاعت : مئی 2016ء

تعداد : 1000

ہدیہ : -/650

ملنے کا پتہ

اِدارہ مِنہاجُ الصَّالِحِین۔ لاہور

الحمد مارکیٹ فسٹ فلور دکان نمبر 20۔ غزنی سٹریٹ۔ اُردو بازار۔ لاہور

فون: 042-37225252 ، 0301-4575120

بسم الله الرحمن الرحيم

maablib.org

ترتیب

(حصہ اول)

☼ عرضِ ناشر	25
☼ اپنی بات	27
☼ مقدمہ	29
☼ تاریخ کی تعریف	29
☼ اَقسام تاریخ	29
☼ ① بیانیہ	29
☼ بیانیہ تاریخ کی خصوصیات	29
☼ ② تاریخ علمی	30
☼ ③ فلسفۂ تاریخ	30
☼ بیانیہ تاریخ کی اصل حقیقت	30
☼ تاریخ اسلام کی اہمیت اور قدر و قیمت	31
☼ تاریخ کی اہمیت قرآن کی نظر میں	31
☼ تاریخ اسلام	32
☼ تاریخ اسلام کے بارے میں استاد مُطہری رقم طراز ہیں	32
☼ تاریخ کی اہمیت نہج البلاغہ کی روشنی میں	33
☼ غیر مسلم دانش وروں کی نظر میں تاریخ اسلام کی اہمیت	34
☼ تاریخ اسلام کو دیگر تواریخ پر فضیلت	35
☼ ① سیرتِ پیغمبر اکرمؐ اور دوسرے معصومینؑ کی سیرت و زندگی:	35
☼ اسلام سے قبل جزیرہ نما عرب کی حالت	35
☼ سیاسی حالت	36
☼ قبیلہ	36
☼ اجتماعی حالات	37
☼ دینی حالت	38
☼ تعلیمی و تمدنی حالت	40
☼ توہم پرستی اور خرافات کی پیروی	41
☼ عہدِ جاہلیت میں عورتوں کا مرتبہ	42

☼ حرمت کے مہینے 43
☼ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب 44
☼ رسولؐ خدا کے آباء و اجداد 44
☼ حضرت عبد مناف 45
☼ حضرت ہاشم 45
☼ حضرت عبدالمطلبؑ 46
☼ واقعہ عام الفیل 47
☼ قابلِ ذکر باتیں 48
☼ حضرت عبداللہ 50
☼ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت 51
☼ پیغمبر اکرمؐ کا بچپن 52
☼ خدائی تربیت 53
☼ رسالتؐ کی جانب ایک قدم 54
☼ شام کی طرف پہلا سفر 54
☼ مستشرقین کی افتراء پردازی 55
☼ ملک شام کا دوسرا سفر 55
☼ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی 56
☼ حضرت خدیجہؓ سے شادی کے محرکات 57
☼ پیغمبر اکرمؐ کے منہ بولے بیٹے 58
☼ حضرت علی علیہ السلام کی ولادت 59
☼ پیغمبر اکرمؐ کے دامن میں تربیت 59
☼ معبودِ حقیقی سے انس و محبت 60
☼ مکہ میں اسلام کی تبلیغ اور قریش کا ردعمل 62
☼ نزولِ وحی 62
☼ سب سے پہلے اسلام کا اعلان کرنے والا 63
☼ دعوت کا آغاز 63
☼ (الف) پوشیدہ دعوت: 64
☼ قریش کا ردعمل 64
☼ (ب) عزیز و اقرباء: 64
☼ عزیز و اقارب کو ہی کیوں پہلے دعوتِ حق دی گئی؟ 65

☼ (ج) عام دعوتِ حق:	66
☼ قریش کا ردِ عمل	67
☼ (الف) مذاکرہ	67
☼ (ب) لالچ:	68
☼ (ج) تہمت و افترا پردازی	69
☼ (د) شکنجہ و ایذا رسانی	70
☼ قریش کی سازشیں	72
☼ حبشہ کی طرف ہجرت	72
☼ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچنے سے لوگوں کو روکنا	72
☼ قرآن سے مقابلہ	72
☼ اس ہجرت کے فوائد اور برکتیں	75
☼ اقتصادی ناکہ بندی	76
☼ محاصرے کا خاتمہ	77
☼ رسول اکرمؐ کے پاس عیسائیوں کے ایک وفد کی آمد	78
☼ حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؑ کی رحلت	79
☼ حضرت ابوطالبؑ کی مظلومیت	80
☼ معراج	83
☼ یثرب کے لوگوں کی دینِ اسلام سے واقفیت	83
☼ معراج	83
☼ حضرتِ ابوطالبؑ کی وفات کے بعد قریش کا ردِ عمل	84
☼ رسولِ اکرمؐ کی اس گفتگو کے اہم نکات	86
☼ یثرب (مدینہ) کے لوگوں کی دینِ اسلام سے واقفیت	86
☼ عقبہ میں دوسری مرتبہ بیعت	88
☼ اہلِ یثرب کے مشرف بہ اسلام ہونے کے اسباب	89
☼ پیغمبر اکرمؐ کو قتل کرنے کی سازش	91
☼ انقلاب کی ضرورت کے تحت ہجرت	92
☼ ہجرتِ مدینہ کرنے کے بعد رسولِ خدا کے اقدامات	94
☼ قبا میں رسولِ خدا کی تشریف آوری	94
☼ مدینہ میں تشریف آوری	94
☼ ہجرت کے اوّلین سال میں رسولِ خدا کے اقدامات	96

☼ الف: مسجد کی تعمیر	96
☼ ب: رشتۂ اُخوت و برادری (بھائی چارہ)	97
☼ ج: یہودیوں کے ساتھ عہد و پیمان	98
☼ عہد شکنی	99
☼ رزمیہ و اعلانیہ ابتدائی اقدامات	100
☼ 1 انصار کا ان مہمات میں شریک نہ ہونے کا سبب	100
☼ 2 ان جنگوں و غزوات کا مقصد	101
☼ تحویلِ قبلہ	101
☼ جن وجوہ کی بنا پر قبلہ تبدیل کیا گیا ان میں سے چند یہ تھیں	102
☼ جنگِ بدر	103
☼ جنگِ بدر کی مختصر تاریخ	107
☼ ۱ مالِ غنیمت اور قیدیوں کا انجام	108
☼ ب: فتح و کامیابی کے اسباب	110
☼ معنوی عوامل	110
☼ مادی اور عسکری عوامل	112
☼ جنگ بدر کے نتائج	113
☼ جنگِ اُحد	116
☼ غزوۂ بنی قینقاع	116
☼ رسولِ خدا کی دختر نیک اختر کی شادی خانہ آبادی	118
☼ حضرت فاطمہ زہرا ؑ کا مہر	120
☼ شادی کی رسومات	120
☼ غزوۂ اُحد	121
☼ غزوۂ اُحد کی اجمالی تاریخ	121
☼ سپاہ کی دوبارہ جمع آوری	126
☼ جنگِ اُحد سے جنگِ اَحزاب تک	128
☼ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی شکست کے اسباب	128
☼ تعمیری شکست	130
☼ طاقت کا اظہار	134
☼ اُحد اور اَحزاب (خندق) کے درمیان فاصلہ	136
☼ غزوۂ اَحزاب	137

☼ اندرونِ مدینہ جنگی محاذ کھولنا	140
☼ کفر و ایمان	142
☼ غزواتِ اَحزاب، بنی قریظہ اور بنی مصطلق	143
☼ لشکرِ اَحزاب (کفار) کی شکست کے اسباب	143
☼ جنگ اَحزاب کا خاتمہ اور مسلمانوں کی یورش کا آغاز	145
☼ عہد شکن لوگوں کی سزا	145
☼ غزوۂ بنی قریظہ کا سود مند پہلو	148
☼ صلح و محبت کا سال	148
☼ غزوۂ بنی مصطلق	149
☼ صلح حدیبیہ	149
☼ مخالفین	150
☼ قریش کی مخالفت	151
☼ مذاکرات کا آغاز	151
☼ بیعتِ رضوان	152
☼ صلح حدیبیہ کے سیاسی، اجتماعی اور مذہبی فوائد	153
☼ جنگِ موتہ	155
☼ حجاز سے یہود کے اثر و رسوخ کا خاتمہ	155
☼ دنیا کے اَربابِ اقتدار کو دعوتِ اسلام	155
☼ غزوۂ خیبر	156
☼ فدک	158
☼ غزوۂ وادی القریٰ	158
☼ مکہ کی جانب روانگی	159
☼ جنگِ موتہ	161
☼ جنگِ موتہ کے نتائج	163
☼ غزواتِ فتح و حنین اور طائف	165
☼ غزوۂ فتح	165
☼ پیغمبرِ خدا رسولِ ہدایت و اصلاح نہ کہ انتقام جو	170
☼ غزوۂ حنین و طائف	171
☼ دونوں لشکروں کا مقابلہ حنین نامی مقام پر ہوا	171
☼ مالِ غنیمت کی تقسیم	174

☼ غزوۂ حنین کی ابتدا میں شکست کے عوامل اور آخر میں مسلمانوں کی	174
☼ کامیابی کے اسباب وعلل	174
☼ الف: ابتدائی مرحلے میں شکست	174
☼ آخری فتح	175
☼ غزوۂ تبوک	177
☼ رسولؐ خدا کے فرمان پر لوگوں کے گوناگوں افکار ونظریات	178
☼ تبوک کی جانب روانگی	179
☼ نفاق کا چہرہ بے نقاب	182
☼ حجۃ الوداع، جانشین کا تعین اور رحلت پیغمبر اکرمؐ	188
☼ حجۃ الوداع	188
☼ جانشین کا تعین	190
☼ رسولؐ خدا کی آخری عسکری کوشش	193
☼ رسولؐ خدا کی رحلت	196
☼ غزوۂ بنی قینقاع	198
☼ حضرت فاطمہ زہراؑ کا حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ عقد	200
☼ غزوۂ سویق	200
☼ غزوۂ بنی سلیم	201
☼ قردہ میں سریہ زید بن حارثہ	201
☼ غزوۂ غطفان	202
☼ جنگ اُحد کے مقدمات	202
☼ پہلا قدم، جنگی بجٹ کی فراہمی	204
☼ قوتوں کی جمع آوری	204
☼ سیاسی پناہ گزین	205
☼ مدینہ کا قصد	205
☼ عباس کی رپورٹ	205
☼ سپاہِ قریش راستہ میں	206
☼ اطلاعات کی فراہمی	206
☼ دشمن کے لشکر کے ٹھہرنے کی جگہ	207
☼ مدینہ میں تیاریاں	207
☼ فوجی کمیٹی کی تشکیل	207

☼ فیصلہ کن ارادہ 209
☼ لشکرِ اسلام کی روانگی 210
☼ لشکرِ توحید کے کیمپ میں 210
☼ منافقین کی خیانت 212
☼ صف آرائی 212
☼ دشمن اپنی صفوں کو منظم کرتے ہیں 213
☼ جنگ کیسے شروع ہوئی؟ 213
☼ دشمن کے حرکت میں آنے کا سبب موسیقی 214
☼ عام حملہ 215
☼ فتح کے بعد شکست 216
☼ پیغمبرؐ خدا کا دفاع کرنے والوں کی شجاعت 218
☼ اُم عمارہ شیر دل خاتون 219
☼ لشکر کی جمع آوری 220
☼ شہیدوں کے پاکیزہ جسم کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟ 221
☼ طرفین کے نقصانات کا تخمینہ 221
☼ مفہومِ شہادت 221
☼ نفسیاتی سرد جنگ 222
☼ کہاں جا رہے ہو؟ 223
☼ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی شکست کے اسباب کا جائزہ 223
☼ شہیدوں کی میت پر 224
☼ ان کو یہیں دفن کردو، ان کی دُعا مستجاب ہوئی 225
☼ مدینہ کی طرف 226
☼ نمازِ مغرب کا وقت آن پہنچا 227
☼ شہیدوں کی ایک جھلک 228
☼ صرف ایک سجدہ وہ بھی محرابِ عشق میں خون بھرا سجدہ 228
☼ ایک مال دار عقل مند کی شہادت 228
☼ ایک عارف بوڑھے کی شہادت 229
☼ حجلۂ خون 229
☼ مدینہ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں 230
☼ مدینہ سے ۲۰ کلومیٹر دُور حمراء الاسد میں جنگی مشق 231

☼ ابوعزہ شاعر کی گرفتاری 232
☼ سریہ ابوسلمہ بن عبدالاسد 232
☼ سریہ عبداللہ بن انیس انصاری 233
☼ رجیع کا واقعہ 234
☼ بئر معونہ کا واقعہ 235
☼ سریہ عمرو بن اُمیہ 236
☼ غزوۂ بنی نضیر 236
☼ دہشت گردی کا انتقام 238
☼ غزوۂ بدر موعد 239
☼ غزوۂ ذات الرقاع 240
☼ غزوۂ دومۃ الجندل 241
☼ غزوۂ خندق (اَحزاب) 241
☼ لشکر اَحزاب کی مدینہ کی طرف روانگی 243
☼ لشکر کی روانگی سے رسولؐ خدا کی آگاہی 243
☼ مدینہ لشکر کفار کے محاصرے میں 245
☼ بنی قریظہ کی عہد شکنی 246
☼ اضطراری حالت 246
☼ ایمان و کفر کا آمنا سامنا 248
☼ دشمن کی صفوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش 249
☼ بنی قریظہ اور مشرکین کے درمیان پھوٹ 250
☼ دشمن کے درمیان لشکرِ اسلام کا سپاہی 253
☼ شہدائے اسلام اور کشتگانِ کفر 254
☼ سپاہِ احزاب کی شکست کے اسباب 254
☼ غزوۂ بنی قریظہ 255
☼ ایک مسلمان خیانت کرتا ہے 256
☼ بنی قریظہ کا اپنے آپ کو رسولؐ خدا کے حوالے کرنا 258
☼ سعد بن معاذ کا فیصلہ 258
☼ سعد کے فیصلے کی دلیلیں 259
☼ پیمان شکن ضرور شکستہ حالی کا شکار ہوتا ہے 260
☼ اسیر اور مالِ غنیمت 260

☆ سنہ ۶ ہجری کا آغاز	261
☆ غزوۂ بنی لحیان	261
☆ زمین پر فساد پھیلانے والوں کا قتل	262
☆ غزوۂ بنی مصطلق یا مریسیع	262
☆ حادثہ	263
☆ زید بن ارقم نے حضورؐ کو خبر دی	263
☆ باپ اور بیٹے میں فرق	264
☆ بنی مصطلق، اسلامی تحریک میں شامل	265
☆ ایک فاسق کی رُسوائی	265
☆ پیغمبرؐ خدا کی بیوی پر تہمت (حدیث افک)	266
☆ صلح حدیبیہ کا پیمان	267
☆ قریش کا موقف	268
☆ قریش کے نمائندے پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں	269
☆ رسولؐ خدا کے سفراء	270
☆ بیعت رضوان	270
☆ صلح نامہ کا مضمون	271
☆ مخالفینِ صلح	272
☆ ابوبصیر کی داستان اور شرطِ دوم کا ختم ہو جانا	273
☆ صلح حدیبیہ کے نتائج کا تجزیہ	274
☆ پیغمبرؐ اسلام کے عالمی پیغام کا اعلان	275
☆ ڈپلومیٹک نکات کی رعایت	276
☆ خسرو پرویز کی دوہی گستاخی اور یمن کے لوگوں کا مسلمان ہونا	277
☆ بادشاہ حبشہ نجاشی کے نام پیغمبرؐ خدا کا خط	278
☆ دوسرے زمام دارانِ حکومت کا موقف	280
☆ خیبر کے یہودیوں سے جنگ کے اسباب	280
☆ لشکرِ توحید کی روانگی	281
☆ اطلاعات کی فراہمی	281
☆ جنگی اعتبار سے مناسب جگہ پر لشکرگاہ کی تعیین	282
☆ لشکر کے لیے طبی امداد رسانی کا انتظام	282
☆ جدید اطلاعات	282

☼ سردار کے حکم سے رُوگردانی	283
☼ دوسری جنگی ٹیکنیک	283
☼ علی علیہ السلام فاتح خیبر	284
☼ طرفین کے خسارے کا تخمینہ	286
☼ اسیروں کے ساتھ اچھا برتاؤ	286
☼ کامیابی کے بعد درگزر	286
☼ خیبر کی غنیمتیں	287
☼ مالِ غنیمت میں خیانت کی سزا	287
☼ مالِ غنیمت کی تقسیم	288
☼ خیبر کے حملے کے نتائج	288
☼ خیبر میں لشکرِ اسلام کی کامیابی کے اسباب	288
☼ فدک	289
☼ غزوۂ وادی القریٰ (سنہ ۷ ہجری قمری)	289
☼ تیماء (سنہ ۷ ہجری قمری)	290
☼ خیبر کے سرایا	290
☼ مکہ کی طرف (عمرۃ القضاء)	290
☼ جنگِ موتہ (عالمی استکبار سے پہلا مقابلہ)	291
☼ کیوں روتے ہو؟	292
☼ دو طاقتوں کی جنگ	293
☼ لشکرِ اسلام کے دلیر سردار جعفر ابن ابی طالبؑ کی شہادت	294
☼ عبداللہ بن رواحہ اور زید ابن حارثہ کی شہادت	294
☼ جنگ سے بیٹھ رہنا	295
☼ تجدید معاہدہ کی کوشش	296
☼ لشکرِ اسلام کی آمادگی	297
☼ راستوں کو کنٹرول کرنے کے لیے چیک پوسٹ	297
☼ ایک جاسوس جال میں	297
☼ مکہ کی جانب	298
☼ فتح مکہ	300
☼ قریش کی عہد شکنی	300
☼ رسولِ خدا جعفرؑ ابن ابی طالبؑ کے سوگ میں	301

☼ جنگ ذات السلاسل	301
☼ دشمن کو ڈرانے کے لیے جنگی مشق	302
☼ مشرکین کا پیشوا، مومنین کے چنگل میں	304
☼ مکہ میں نفسیاتی جنگ	305
☼ شہر کے محاصرہ کی ٹیکنیک	306
☼ ایک فوجی دستہ کے ساتھ مشرکین کی جھڑپ	306
☼ شہر مکہ میں داخلہ	306
☼ اتحاد کی آواز	307
☼ بلال کی آواز	309
☼ بت پرست، بت شکن	309
☼ آزاد شدہ شہر مکہ کے لیے والی اور معلم دین کا تقرر	310
☼ اسلام کے نام پر خونریزی اور جرائم	310
☼ جنگ حنین	311
☼ دشمن کی سازش سے پیغمبر خدا کی آگاہی	311
☼ حنین کی طرف روانگی	312
☼ دشمن کی اطلاعات اور ان کی تیاری	312
☼ درۂ حنین میں	312
☼ فرار	313
☼ واپسی، مقابلہ، کامیابی	313
☼ عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرو	314
☼ آغاز جنگ میں مسلمانوں کی شکست کا تجزیہ	315
☼ طائف کی جنگ	315
☼ اسلحوں کی ٹیکنالوجی	316
☼ واپسی	316
☼ ہوازن کے اسیروں کی رہائی	317
☼ وہ افراد جن کی دلجوئی کی گئی	318
☼ منافقین کا اعتراض	318
☼ دوستوں کے آنسو	319
☼ مدینہ کی طرف واپسی	319
☼ غزوۂ تبوک	320

☼ منافقین کی حرکتیں	320
☼ بہانے	321
☼ منافقین کی ٹیم کے اڈہ کا انکشاف	322
☼ جنگی اخراجات کی فراہمی	323
☼ اشکِ حسرت	324
☼ بے نظیر لشکر	324
☼ منافقین کی واپسی	325
☼ شخصیت پر حملہ	325
☼ تپتے صحرا میں	326
☼ حضرت ابوذرؓ کا واقعہ	327
☼ لشکرِ اسلام تبوک میں	327
☼ دومۃ الجندل کے بادشاہ کی گرفتاری	328
☼ پیغمبرؐ خدا پر حملہ کرنے کی سازش	328
☼ مسجدِ ضرار کو ویران کردو	329
☼ اسلحے نہ فروخت کرو	330
☼ جنگ میں دُعا کی تاثیر	330
☼ غزوۂ تبوک سے ماخوذ نتائج	331
☼ منافقین کے لیڈر کی موت	331
☼ مدینہ میں قبائل کی نمائندگی کرنے والے وفود کی آمد	332
☼ وہ دین جس میں نماز نہیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں	332
☼ ابراہیم کا سوگ	332
☼ خرافات سے جنگ	333
☼ مشرکین سے بے زاری	333
☼ حضرت علی علیہ السلام کی اہم ذمہ داری	333
☼ مباہلہ	334
☼ حضرت علی علیہ السلام کی یمن میں ماموریت	336
☼ حجۃ الوداع	337
☼ جہانِ عدالت، باعثِ عداوت ہے	337
☼ حج آخر میں رسولؐ خدا کی پُرزور تقریر	338
☼ غدیرِ خم میں	341

- رسولؐ خدا کی تقریر کا ترجمہ ملاحظہ ہو 342
- شورشیں 344
- اسود عنسی کا واقعہ 344
- یمن میں انقلاب کی سازش 345
- مسلیمہ کذاب کا واقعہ 346
- جھوٹے پیغمبر کی طرف میلان کا سبب قومی تعصب 347
- جھوٹوں کا انجام 347
- رحلتِ پیغمبرؐ کے وقت کے حالات کا تجزیہ 348
- لشکرِ اسامہ کی روانگی 348
- اہلِ بقیع کے مزار پر 350
- بے لکھی تحریر 350
- ناتمام نماز 351
- وداعِ پیغمبرؐ 351
- یہ نور ہرگز نہیں بجھے گا 353
- تاریخ اسلام 355

(حصہ دوم)

- اپنی بات 356
- حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے 358
- مختلف ادوار 358
- حضرت علی علیہ السلام کی تریسٹھ سالہ زندگی کے پانچ ادوار 359
- ولادت سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک 360
- ولادت 360
- پیغمبرؐ کے زیرِ دامن آپ کی پرورش 361
- بعثت سے ہجرت تک 363
- پہلا شخص جس نے دینِ اسلام قبول کیا 363
- بے نظیر قربانی 364
- ہجرت سے رحلت تک 366
- علیؑ رسولؐ خدا کے امین 366
- علیؑ رسولؐ خدا کے بھائی 366

☼ علیؑ اور راہِ خدا میں جنگ 367
☼ علیؑ جنگِ بدر کے بے نظیر جانباز 368
☼ جنگِ فرد بفرد: 368
☼ علیؑ رسولؐ کے تنہا محافظ 369
☼ (۱) مرحلۂ فتح و کامیابی: 369
☼ (۲) مرحلۂ شکست: 369
☼ جنگِ خندق میں حضرت علیؑ کا کردار 370
☼ علیؑ فاتح خیبر 371
☼ امیر المومنینؑ کی سیاسی زندگی میں جنگجوئی کے اثرات 373
☼ علیؑ اور پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی 374
☼ حدیثِ یوم الانذار 375
☼ حدیثِ منزلت 375
☼ قرآن مجید میں حضرت ہارونؑ کے مراتب و مناصب 376
☼ حدیث غدیر 377
☼ رسولِ اکرمؐ کی رحلت سے خلافت ظاہری تک 379
☼ وفاتِ پیغمبرؐ کو جھٹلانا 379
☼ غیر متوقع حادثہ و واقعات 380
☼ پیغمبرؐ کی جانشینی کا مسئلہ شیعوں کی نظر میں 381
☼ (۱) لاتعلقی 382
☼ اُمت کی پریشانی کا خطرہ 382
☼ لوگوں کا دورِ جاہلیت کی جانب واپس چلے جانے کا خطرہ 383
☼ منافقین کا خطرہ 383
☼ شوریٰ 384
☼ وصی اور جانشین کا تقرر 385
☼ سقیفہ میں رونما ہونے والے حالات 387
☼ اس خطبے کے اہم نکات 388
☼ انصار کا ردِ عمل 388
☼ حضرت علیؑ کی بیعت کے بارے میں تجویز 390
☼ سقیفہ کے واقعات کے بعد حضرت علی علیہ السلام کا ردِ عمل 391
☼ علیؑ نے کیوں عجلت نہیں کی؟ 393

☼ حضرت علی علیہ السلام کے گھر میں پناہ گزینی	394
☼ انصار سے مدد چاہنا	395
☼ حساس صورتِ حال	395
☼ قیام نہ کرنے کے دلائل اور وجوہات	396
☼ ۱ معقول فوجی طاقت کی کمی	396
☼ ۲ اسلام اور اسلامی وحدت کا تحفظ	397
☼ ۳ جاہلیت کی طرف بازگشت	398
☼ ۱ کینہ توز دشمن	400
☼ بیعت کا انجام	400
☼ مسئلہ فدک	401
☼ فدک پر قابض ہونے کے محرکات	403
☼ ۱ مخالفین کو اپنی جانب متوجہ کرنا	403
☼ ۲ جمع وخرچ کی مد میں کمی	404
☼ ۳ علیؑ کی اقتصادی قوت کے باعث خطرے کا احتمال	405
☼ مخالفین کی سرکوبی	405
☼ شورشوں کا دبانا	407
☼ حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی شہادت	407
☼ سرزمین شام وعراق کی فتح	410
☼ خلیفہ وقت کی قرآن وسنت سے واقفیت	410
☼ حضرت علی علیہ السلام اور حضرت ابوبکرؓ کی علمی وسیاسی مشکلات	411
☼ جانشینی کا تعین	412
☼ قلمرو اسلام کی وسعت	413
☼ فتوحات کی خوشخبریوں کے اثرات	414
☼ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ خلیفہ ثانی کے سیاسی وعلمی مشورے	415
☼ بنی ہاشم کی گوشہ نشینی	416
☼ احادیثِ نبویؐ کے لکھنے پر پابندی	417
☼ بیت المال کی تقسیم میں خلیفہ کا رویہ	418
☼ خلیفہ دوم کا قتل	419
☼ کون سی شوریٰ؟	420
☼ مذکورہ شوریٰ کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا رویہ	421

حضرت علی علیہ السلام کی شرکت اور اس کی وجہ	422
حضرت عثمان کی خلافت	423
مسلمانوں کا بیت المال	424
حضرت علی علیہ السلام کے پند ونصائح	425
خلیفہ سوم کا قتل	427
حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں حضرت عثمان کا قتل	428
پچیس سالہ حکومت خلفاء کے دوران علیؑ کے کارنامے	430
خلافت ظاہری سے شہادت تک	432
حضرت علی علیہ السلام کی بیعت	432
بیعت کے بعد لوگوں میں سرور وشادمانی	434
قریش کی وحشت و پریشانی	436
گوشہ نشین لوگ	436
حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے امتیازات	437
سوالات کے جوابات	439
حضرت علی علیہ السلام نے کن مقاصد کے تحت حکومت قبول فرمائی	440
ابتدائی اقدامات	441
نیک اور صالح کارکنوں کا تقرر	442
معاویہ کی برطرفی	443
مساوی حقوق کی ضمانت	445
لوٹے ہوئے مال کی واپسی	445
بدعنوانیوں میں ملوث دولت مندوں کی رخنہ اندازی	447
حکومت علیؑ کی مخالفت	448
موقف میں تبدیلی	452
مکہ میں مخالفین کا جمع ہونا	454
سپاہ کے اخراجات	455
عراق کی جانب روانگی	456
سپاہ کی جانب عثمان بن حنیف کے نمائندوں کی روانگی	457
پہلا تصادم	459
عہد شکنی	460
جمل اصغر	461

☼ سرداری پر اختلاف 462
☼ خبر رسانی 462
☼ حضرت علی علیہ السلام کی بصرہ کی جانب روانگی 463
☼ ربذہ میں قیام 465
☼ لشکر کا جاہ و جلال 467
☼ صلح کی کوشش 469
☼ لشکر کے لیے دستور العمل 471
☼ دشمن کو متفرق کرنے کی آخری کوشش 471
☼ فیصلہ کن جنگ 473
☼ عام معافی 476
☼ حضرت علی علیہ السلام کی بصرہ میں آمد 478
☼ جنگ جمل کے ناخوشگوار نتائج 479
☼ کوفہ دار الحکومت 481
☼ کوفہ پہنچنے پر حضرت علی علیہ السلام کے اقدامات 483
☼ قاسطین 484
☼ معاویہ کی تخریب کاری 485
☼ سرکشی کے اسباب 487
☼ ۱ دشمنی اور کینہ 487
☼ ۲ حکومت کی آرزو 489
☼ ۳ ناکثین کی شورش 489
☼ ۴ گذشتہ خلفاء کی دلیل و مثال 489
☼ ۵ پروپیگنڈا 490
☼ مشہور و معروف اشخاص کو اپنانا 491
☼ قاسطین (جنگ صفین والے) 494
☼ معاویہ سے مراسلات کا محرک 494
☼ حجاز کی جانب دراز دستی 496
☼ نمائندے کی روانگی 497
☼ مہاجرین و انصار سے مشورہ 498
☼ عمومی فوج 499
☼ کمانڈروں کا تقرر 501

☼ صفین کی جانب روانگی 502
☼ شام میں غیر معمولی حالات کا اعلان 504
☼ پہلا مقابلہ 505
☼ پانی پر بندش 506
☼ نمایندگان کی روانگی 508
☼ دوبارہ وفود کی روانگی 509
☼ معاویہ کے نمایندے 510
☼ دغابازی کا کمزور حربہ 510
☼ لشکروں کے سرداروں سے ملاقات 511
☼ قاریوں اور زاہدوں کی جماعت سے ملاقات 511
☼ سپاہ کے درمیان خلل اندازی 512
☼ فیصلہ کن جنگ 513
☼ عام جنگ 515
☼ قرآن کی طرف دعوت 519
☼ معاویہ کہاں ہے؟ 519
☼ حضرت علی علیہ السلام میدانِ کارزار میں 521
☼ دوست واصحاب کی مدد 522
☼ استقامت و پائیداری کے لیے نصیحت 524
☼ فرار کرنے والوں کی سرزنش 525
☼ جنگ میں مالک اشترؓ کا کردار 526
☼ دو حجر کی جنگ 527
☼ حریث کا قتل 527
☼ آخری تجویز 528
☼ بدترین حربے کا سہارا 529
☼ سردارانِ دشمن کا اعتراف 530
☼ دھوکا 531
☼ جنگ کی شدت 532
☼ دو لائق فرمان داروں کی شہادت 533
☼ حضرت عمارؓ کی شہادت کا ردعمل 538
☼ نجات کے لیے کوشش 539

☼ آخری حربہ	541
☼ فوج عراق کا ردِ عمل	544
☼ فوج عراق کے درمیان اختلاف	545
☼ مالک اشترؒ کا واپس آنا	548
☼ سرکشوں کی سرزنش	549
☼ نفاق وحماقت کے خلاف جنگ وجدال	551
☼ حکمیت کی دعوت	552
☼ معاویہ کی جانب	553
☼ حکمین (ثالثوں) کا انتخاب	554
☼ خوارج کی نامزدگی	555
☼ حکمین کا معاہدہ	560
☼ جنگ صفین کے عبرت آموز سبق	563
☼ جنگ کے نتائج	564
☼ سرکشوں کی تشکیل وگروہ بندی	566
☼ حضرت علی علیہ السلام خوارج کے درمیان	567
☼ منافقین کی تحریکات	568
☼ منصفین کا اجتماع	570
☼ حکمیت کا نتیجہ اوراس کا ردعمل	571
☼ مارقین (جنگ نہروان)	575
☼ خوارج کے مقابل حضرت علی علیہ السلام کا موقف	575
☼ منشور	577
☼ مجموعی نعرہ	578
☼ شورش وسرکشی	580
☼ بغاوت	581
☼ معاویہ سے جنگ	582
☼ خوارج کے ساتھ جنگ کی ضرورت	584
☼ جنگ سے باز رہنے کے لیے کوشش	585
☼ دو سپاہ کے درمیان جنگ	587
☼ جنگ کے بعد	588
☼ اصل دشمن کی جانب توجہ	589

☼ خالیوں کا وجود	590
☼ جنگ نہروان کا نتیجہ	591
☼ جہاد کی دعوت	593
☼ حضرت مالک کا صوبہ دارِ مصر کی حیثیت سے تقرر	594
☼ مالک اشترؓ کی شہادت	596
☼ مصر پر لشکر کشی	598
☼ محمدؓ بن ابی بکر کی شہادت	600
☼ لوگوں کی سرزنش	602
☼ نہروان کے بعد	604
☼ دہشت پسند اور غارت گر گروہ	604
☼ (۱) نعمان بن بشیر	605
☼ (۲) سفیان بن عوف	605
☼ (۳) عبداللہ بن سعد	607
☼ (۴) ضحاک بن قیس	607
☼ (۵) بسر بن ارطاۃ	608
☼ حضرت علی علیہ السلام کا ردعمل	609
☼ معاویہ کے حملوں کا نتیجہ	610
☼ دو متضاد سیاسی روشیں	611
☼ فتنہ خریت	614
☼ آخری کوشش	617
☼ حضرت علی علیہ السلام کے خلاف سازش	619
☼ شہادت کا انتظار	620
☼ شہادت	621
☼ حضرتِ فاطمہ زہراء علیہا السلام کے مختصر احوالِ زندگی	625
☼ فرشتہ نما انسان	626
☼ ولادتِ باسعادت	627
☼ تنہائی	633
☼ حضرت امام حسن علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	640
☼ وجودِ امام حسنؑ ایک عظیم مانع	644
☼ جنگ یا صلح	648

☼ معاویہ......	648
☼ عہد نامہ	650
☼ حضرت امام حسین علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	653
☼ عدل اور عاشورہ	659
☼ کیا حق وعدل نسبی ہیں یا مطلق؟	660
☼ عدلِ اسلامی	661
☼ عاشورہ کا مقصد، عدل	661
☼ مقصد	662
☼ سانحۂ کربلا کے تاریخی ریشے	672
☼ عاشور کے بعد	683
☼ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	686
☼ والد ماجد	687
☼ والدہ ماجدہ	687
☼ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	703
☼ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	709
☼ والدہ ماجدہ	711
☼ والد ماجد	711
☼ امام علیہ السلام کی شخصیت	719
☼ امام علیہ السلام کی علمی روش	723
☼ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	726
☼ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	733
☼ حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	741
☼ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	748
☼ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی	755
☼ حضرت امام مہدی علیہ السلام	760
☼ انسان کا دوسرا سفر	765
☼ امیر المومنین علی علیہ السلام کا مذہب اہل بیتؑ کی طرف دعوت دینا	775

☼

راہِ حق

(عرضِ ناشر)

خداوندِ قدوس نے ہر عہد و عصر و مصر میں اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کا کلام اپنے منتخب نفوسِ قدسیہ کے ذریعے اپنے ذِمّے لے رکھا ہے۔ جنابِ آدمؑ سے سرکارِ خاتمؐ تک رُشد و ہدایت اور تعلیم و تربیت کا یہ فریضہ بطریقِ احسن انجام پایا۔ تعمیرِ انسانیت کے اس طویل سفر کے عروج کا زمانہ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے خلفائے اثنا عشر کا زمانہ ہے۔ سرکارِ رسالتؐ نے اپنے اعلیٰ و ارفع نظامِ تبلیغ کے ذریعے ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کر کے پیغامِ اسلام پہنچایا۔

دعوتِ ذوالعشیرہ سے ہجرتِ مدینہ اور ہجرتِ مدینہ سے غدیرِ خم تک تکمیلِ دین کا ایسا سامانِ عالی شان ہوا کہ نعمت تمام ہوگئی اور دین اسلام کو پسندیدہ دین کے طور پر چُن لیا گیا۔ یوں نبوت و رسالت کی انتہا ہوئی اور مَن کنت مولاہ فھذا علیؑ مولاہ سے دائمی امامت و ولایت کا اعلان ہوا اور تبلیغ و محافظتِ اسلام میں مولائے کائناتؑ سے لے کر مولا امام حسن عسکریؑ تک نے جامِ ہائے شہادت نوش فرمائے اور اب ولیِ عصر امام زمان عجل اللہ فرجہ الشریف حجتِ خدا کے طور پر تحفظِ اسلام پر مقرر و منصوب ہیں۔

زیرِ نظر "تاریخ اسلام" انھیں قنادیلِ اسلام کی تاریخِ حقیقی ہے، جو دو حصوں میں تقسیم ہے اور قبل ازیں قم المقدسہ ایران سے اُردو کے قالب میں ڈھال کر شائع کی جاچکی ہے۔ لاریب اسلوبِ بیان نہایت جالب ہے اور حقِ تحقیق ادا کرنے میں گروہِ محققین نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ البتہ کتاب کی کتابت خستہ تھی اور ترجمہ رواں دواں نہیں تھا، لہٰذا یہ کارِ خیر ہمارے حصّے میں آیا۔ چوں کہ کتاب ہذا پاکستان کے شیعی مدارس کے نصابِ تعلیم میں شامل کی جاچکی ہے اور اس کی تدریسی اہمیت مسلّم ہوچکی ہے اس لیے اکثر علمائے مدارس نے ادارہ منہاج الصالحین کی طرف رجوع کیا کہ ادارہ اس کتاب کو اصلاح و تصحیح کے بعد شایانِ شان طریقے سے شائع کرے۔

ہم نے علمائے عالی قدر کے حکم کی تعمیل میں اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ادبی ولسانی تصحیح، اہتمامِ اعراب، نقلِ حوالہ جات اور دُرستی اخبارِ معصومینؑ کا بیڑا اُٹھایا اور کئی ماہ کی محنتِ شاقہ کے بعد از سرِ نو جدید کتابت (کمپوزنگ) کروا کر کہنہ مشق محبِ اہلِ بیتؑ پروف ریڈر اسدعلی ڈار سے اس کی پروف ریڈنگ کروائی۔ اب اُمید کامل ہے کہ طلابِ دینیہ اس مستند کتابِ تاریخ سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

بارگاہِ ایزدی میں عاجزانہ دُعا ہے کہ وہ ہماری اس سعیِ قلیل کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اپنی رحمتِ واسعہ سے ہمارے والدین مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ نیز اُن کی بلندئ درجات کے بعد اُنھیں اعلیٰ علیین میں جوارِ معصومینؑ میں جگہ عطا فرمائے۔

آخر میں بقولِ مظہرؔ عباس چودھری:

ثبت ہیں سینۂ تاریخ پہ عصمت کے نقوش
آلِ یاسینؑ کی تہذیب کے عظمت کے نقوش
بخدا وہ بھی زمانے میں امر ہوتے ہیں
اِن سے جو چھوڑ کے جاتے ہیں مودّت کے نقوش ①

والسلام مع الاکرام

ریاض حسین جعفری، فاضل قم
صدر نشین ادارہ منہاج الصالحین، لاہور

① ناشرِ کبیر علامہ ریاض حسین جعفری کے والدین کی نذر

maablib.org

اپنی بات

تاریخ نویسی اور سیرت نگاری جدید فن ہے اور نہ ہی یہ کسی قوم و مذہب سے مخصوص ہے بلکہ قدیم فنون میں سے ہے اور ہر مذہب میں اس کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ہر قوم اپنے رہبروں اور اَسلاف کی تاریخ سے شغف رکھتی ہے۔ اگرچہ تاریخ ماضی کے حالات اور قصہ پارینہ کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن یہی قصے اور حالات، تجربات، نصائح، سبق آموز باتوں سے معمور ہیں، اور ان میں ایسی صلاحیت ہے کہ دیدہ وروں نے ان کے بارے میں یہ تک کہہ دیا ہے۔ ''تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے، ماضی مستقبل کا آئینہ دار ہے''۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''انسان ہر قسم کا تجربہ کرسکتا ہے، لیکن زندگی مختصر ہے لہٰذا دیگر افراد کے تجربات سے استفادہ کرے''۔

کیونکہ دوسروں کے تجربات سے ہی استفادہ کر کے صحیح معنوں میں انسان اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔ ہمارے مستقبل، دین و دنیا اور آخرت کے لیے سیرتِ رسولؐ اور تاریخ آئمہ معصومینؑ آئینہ ہے اور کسوٹی ہے، اسی میں اپنی زندگی کو دیکھ کر سنوارنے اور اسی پر اس کے کھرے کھوٹے ہونے کو پرکھنا ہے۔ مسلمان مفکرین، مؤرخین اور سیرت نگاروں نے ہر زمانے میں سیرتِ رسولؐ، تاریخ اسلام اور ائمہؑ کی سوانح حیات لکھنے کے لیے سعی مشکور کی ہے مگر ہر ایک سے کچھ نہ کچھ گوشے تشنہ رہ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معصوم کی زندگی کا غیر معصوم احصار نہیں کرسکتا۔

لہٰذا ہر زمانے کے صاحبِ قلم و نظر کا فریضہ ہے کہ وہ رائج زبان میں اپنے افکار اور زمانے کے مقتضا کے مطابق سرورِ کائناتؐ اور ائمہ معصومینؑ نیز علمائے اعلام کی تاریخ سے سماج کو آگاہ کرے تاکہ وہ اپنے دینی پیشواؤں کی سیرت کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی میں اعمال انجام دے سکیں۔ اس سلسلہ میں کسی کی تحریر حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ ہر ایک کو خدا نے مخصوص صلاحیت وفکر سے نوازا ہے اور اسے اخلاق کے دائرہ میں رہ کر اپنی صلاحیت وفکر کے

اظہار کا حق دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں ایک ہی نمایاں ذات پر بہت سی قلمی کاوشیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔

عرصۂ دراز سے خواہش تھی کہ مختصر طور پر ہی، رسولِؐ اسلام اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی جامع، تجزیاتی، سیاسی اور اخلاقی تاریخ کو پیش کروں تاکہ مومنین زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔ عدیم الفرصتی کی بنا پر میں صرف حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے امام مہدی علیہ السلام کی مختصر تاریخ ہی کا ترجمہ کرسکا ہوں۔ اس کے ابتدائی حصوں کا ترجمہ اگرچہ میں نے نہیں کیا ہے لیکن تین، تین بار اس کی اصلاح کی ہے۔ تیسری بار دیکھنے کے بعد یہ یقین ہوگیا تھا کہ اب اصلاح کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، مگر کمپیوٹر سے کتابت ہو کر جب سامنے آئی تو پروف دیکھنے میں تصحیح سے زیادہ وقت لگ گیا۔ چونکہ کمپیوٹر کی کتابت جاذبِ نظر نہیں تھی لہٰذا اس سلسلہ کی پہلی دو کتابوں کے علاوہ باقی کتابیں کاتب کے سپرد کردی گئیں جو عنقریب منظر عام پر آجائیں گی۔

تاریخ کا یہ سلسلہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتداء میں نہایت محققانہ تاریخ کے موضوع پر ایک مقدمہ مرقوم ہے اور اس کا دوسرا حصّہ اسلامی غزوات سے متعلق ہے۔ تیسرے حصّہ میں حضرت علی علیہ السلام کی حیات کو پیش کیا گیا ہے اور چوتھے میں حضرت صدیقۂ طاہرہ سلام اللہ علیہا سے لے کر امام مہدی علیہ السلام تک کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ تالیف میں قدیم وجدید کتب اور مورخین و مولفین کے نظریات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

دُعا ہے کہ خداوند عالم مؤلفین، مترجمین اور ناشر کی اس سعی کو قبول فرمائے کہ یہی عظیم سعادت ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم

نثار احمد

مقدمہ

تاریخ کی تعریف

لغت کی کتابوں میں تاریخ کے معنی وقت کے تعیین کے ہیں۔ ارخ الکتب وارخہ اس نے کتاب لکھنے کی تاریخ لکھی۔ (ملاحظہ فرمائیں القاموس المحیط)

تاریخ کے اِصطلاحی معانی بیان کرتے ہوئے لوگوں نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن میں سے چند ذیل میں درج ہیں:

① کسی ایسے قدیم اور مشہور واقعہ کی مدت و ابتداء معین کرنا، جو عہد گذشتہ میں رُونما ہوا ہو اور دوسرا واقعہ اس کے بعد ظہور پذیر ہو۔ (تاریخ سیاسی معاصر ایران، ج ا، ص ۷)

② سرگذشت یا قابلِ ذکر ایسے اعمال و افعال، نیز حادثات اور واقعات کا ذکر جنھیں زمانے کی ترتیب کے لحاظ سے منظم و مرتب کیا گیا ہو۔ (جامعہ تاریخ)

اقسامِ تاریخ

علمِ تاریخ اور اس کی اقسام و خصوصیات سے جو فوائد مرتب ہوتے ہیں ان کے بارے میں بہت زیادہ بحث کی جاچکی ہے۔ استاد شہید مرتضیٰ مُطہری نے علمِ تاریخ کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

① بیانیہ

عہدِ حاضر کی وضع و کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے گذشتہ واقعات و حادثات اور عہد ماضی کے انسانوں کی حالت اور کیفیت بیان کرنا۔ اس میں سوانح عمری، فتح نامے اور سیرت کی وہ کتابیں شامل ہیں جو تمام اقوام میں لکھی گئی ہیں اور اب بھی لکھی جارہی ہیں۔

بیانیہ تاریخ کی خصوصیات

(الف) یہ تاریخ جزئی ہوتی ہے، مجموعی اور کُلی نہیں۔

(ب) یہ محض منقول ہے اور اس میں عقل و منطق کا دخل نہیں ہوتا۔
(ج) ان واقعات کا علم جو وقوع پذیر ہو چکے، نہ کہ آیندہ ہوں گے۔
(د) ان واقعات کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے حال سے نہیں۔

۲ تاریخِ علمی

ان آداب و رسوم کا علم جن کا رواج عہد ماضی کے انسانوں میں تھا اور یہ علم ان واقعات و حوادثات کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے جو گزر چکے ہیں۔

۳ فلسفۂ تاریخ

وہ علم ہے کہ جس کے ذریعے انسانی معاشروں میں ارتقاء کے ذریعے تبدیلی واقع ہوئی اور وہ کس طرح ایک مرحلے سے گزر کر دوسرے مرحلے تک پہنچے، اور اس ارتقاء پذیر حالت کے وقت ان میں کون سے قوانین کارفرما رہے۔

اس کتاب میں اس بات کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ سب سے پہلے ان واقعات کو بیان کیا جائے جو پیغمبر اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے دوران رُونما ہوئے اور اس کے ساتھ ہی ان کا تجزیہ بھی کیا جائے۔ اس کے بعد دیگر مراحل میں ان واقعات سے پند و نصیحت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ان سے نتائج اخذ کر کے ان سے مجموعی قواعد مرتب کیے جائیں اور انھیں اِنفرادی اور اِجتماعی زندگی میں بروئے کار لایا جائے۔ بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ ایران کے اسلامی انقلاب کی تاریخ درحقیقت وہ منطقی سلسلۂ تاریخ ہے جس کا آغاز دورانِ رسالت و خلافت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس انقلاب میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد میں بھی ہم ان واقعات سے دوچار ہوتے ہیں جو اَب سے قبل صدرِ اسلام میں رُونما ہوئے تھے۔

بیانیہ تاریخ کی اصل حقیقت

علمی اور بیانیہ تاریخ کی تشکیل چونکہ ان واقعات کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے جو عہد ماضی میں گزر چکے ہیں اس لیے محققین یہ طے نہ کر سکے کہ یہ واقعات کس حد تک معتبر یا غیر معتبر ہو سکتے ہیں۔

بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ قدماء کی کتابوں میں بیانیہ تاریخ سے متعلق جو کچھ درج کیا

گیا ہے اسے بیان اور قلم بند کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے واقعات کو اغراض کی بنیاد، شخصی محرکات، قومی تعصبات یا اجتماعی و عقیدتی وابستگی کی بنیاد پر نقل کیا ہے اور اس میں تصرف و تحریف کر کے واقعات کو اپنی منشاء کے مطابق پیش کیا ہے یا انھوں نے واقعات کو اس طرح لکھا ہے جس سے ان کے اغراض و مقاصد پورے ہوتے تھے اور ان کے عقائد کے منافی بھی نہیں تھے۔

بیانیہ تاریخ کے بارے میں یہ بدبینی بے سبب نہیں ہے، بلکہ اس کا سرچشمہ تاریخ کی کتابوں کی کیفیت اور مورخین کے مزاج کو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اس کے باوجود تاریخ بھی دیگر علوم کی طرح مسلمہ حقائق و واقعات پر مبنی ایک سلسلہ ہے۔ اس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک محقق شواہد و قرائن کی بنیاد اور اپنی اجتہادی قوت کے ذریعے سراغ لگا سکتا ہے کہ حوادثات و واقعات میں کس حد تک صحت و سقم ہے اور انھی کی اساس پر وہ بعض نتائج اخذ کرسکتا ہے۔

تاریخ اسلام کی اہمیت اور قدر و قیمت

جن مسلم اور غیر مسلم محققین اور دانش وروں نے تاریخ خصوصاً تاریخ اسلام اور سیرت النبی کے بارے میں تحقیق کی ہے انھوں نے اس کی اہمیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر اس کی قدر و قیمت کا اعتراف کیا ہے۔

تاریخ کی اہمیت قرآن کی نظر میں

قرآن کی نظر میں تاریخ، حصولِ علم و دانش اور انسانوں کے لیے غور و فکر کے دیگر ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ قرآن نے انسانوں کو غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے غور و فکر کے منابع بھی ان کے سامنے پیش کیے ہیں۔

قرآن نے مختلف آیات میں انسانوں کو یہ دعوت دی ہے کہ وہ گذشتہ اقوام کی زندگی کا مطالعہ کریں۔ ان کی زندگی کے مفید نکات پیش کرنے کے بعد انھیں یہ دعوت دی کہ وہ باصلاحیت افراد کو اپنا ہادی و رہنما بنائیں اور ان کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ سمجھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِىٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (سورۂ ممتحنہ: آیت ۴)

"تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے"۔

اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۂ احزاب: آیت ۲۱)

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے"۔

حدیث وسنتِ نبوی اور ائمہؑ کی رفتار و گفتار اُمت مسلمہ کے لیے حجتِ قاطع اور سندِ محکم ہیں۔ سیرت نبویؐ ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ ہمارا اخلاق و کردار نبی ﷺ کی سیرت کے مطابق ہونا چاہیے جب کہ دیگر تواریخ میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

تاریخ اسلام

تاریخ کے جتنے بھی منابع و ماخذ موجود ہیں ان میں تاریخ اسلام سب سے زیادہ معلومات سے لبریز اور مالا مال ہے۔ چنانچہ جب کوئی محقق تاریخ اسلام لکھنا شروع کرتا ہے اور اسے تاریخی واقعات، وافر مقدار میں بصورتِ دقیق مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اسلام میں جس قدر مُستند وباریک نیز روشن نکات موجود ہیں وہ دیگر تواریخ میں نظر نہیں آتے۔

ان خصوصیات کا سرچشمہ سیرت اور سنتِ رسولؐ ہے اور یہ مسلمانوں کے لیے قطعی حجت و دلیل ہے۔ چنانچہ وہ انھی کی پیروی کرتے ہیں۔

تاریخ اسلام کے بارے میں استاد مُطہری رقم طراز ہیں

پیغمبر اسلام ﷺ اور مذہب اسلام کو دیگر مذاہب پر فوقیت حاصل ہے، کیونکہ آپؐ کی تاریخ روشن و مستند ہے۔ اس اعتبار سے دنیا کے دیگر رہبر و راہنما ہماری برابری نہیں کر سکتے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی کی دقیق باتیں اور اس کے جزئیات آج بھی ہمارے پاس قطعی اور مسلم طور پر موجود و محفوظ ہیں۔ آپؐ کا سالِ ولادت ماہِ ولادت، روزِ ولادت یہاں تک کہ ہفتہ ولادت بھی تاریخ کے سینے میں درج ہے۔ دورانِ شیر خوارگی، وہ زمانہ جو آپؐ نے صحرا میں بسر کیا، وہ دور جب آپؐ سنِ بلوغ کو پہنچے، وہ سفر جو آپؐ نے ملکِ عرب سے باہر کیے۔ وہ مشاغل جو

آپؐ نے مبعوث بہ رسالت ہونے سے پہلے انجام دیے ہیں وہ ہمیں بخوبی معلوم ہیں۔ آپؐ نے کس سال شادی کی اور اس وقت آپؐ کا سن مبارک کیا تھا؟ آپؐ کی ازواج کے بطن سے کتنے بچوں نے ولادت پائی اور کتنے بچے آپؐ کی رحلت سے قبل اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ وفات کے وقت آپؐ کی عمر کیا تھی؟ یہ واقعات مبعوث برسالت ہونے کے وقت تک ہیں۔ اس کے بعد کے واقعات اور دقیق ہوجاتے ہیں۔ تفویض رسالت، جیسا عظیم واقعہ کب پیش آیا وہ پہلا شخص کون تھا جو مسلمان ہوا، اس کے بعد کون شخص مشرف بہ اسلام ہوا۔ آپ کی لوگوں سے کیا گفتگو ہوئی؟ آپؐ نے کیا کارنامے انجام دیے اور کیا راہ وروش اختیار کی۔ سب دقیق طور پر روشن وعیاں ہیں۔

سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ میں "زمانہ وحی" کے دوران تحقیق ثبت کی گئی۔ تیئس سالہ عہد نبوت کا ہر واقعہ وحی آسمان کے نور سے منور ہوا اور اسی کی روشنی میں اس کا تجزیہ کیا گیا۔ قرآن مجید میں جو واقعات درج ہیں ان میں اکثر وبیشتر وہی مسائل و واقعات ہیں جو عہد نبوت کے دوران پیش آئے۔ ہر وہ واقعہ جسے قرآن نے بیان کیا ہے، بے شک وہ خداوند عالم الغیب والشہادہ نے ہی بیان کیا ہے۔

قرآن کی رُو سے تاریخ بشر اور اس کا ارتقاء اصول وضوابط کی بنیاد کے سلسلے پر قائم ہے۔ عزت وذلت، کامیابی وناکامی، فتح وشکست اور بدبختی وخوش نصیبی کے واقعات دقیق ومنظم حساب کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ان اصول وضوابط اور قوانین کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ کو سمجھا جائے، اور اس کے ذریعے اپنی ذات نیز معاشرے کو فائدہ پہنچایا جائے۔ یہاں مثال کے طور پر یہ آیت پیش کی جاسکتی ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۳۷)

"تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنھوں نے اللہ کے احکامات اور ہدایات کو جھٹلایا"۔

تاریخ کی اہمیت نہج البلاغہ کی روشنی میں

قرآن کے علاوہ معصومین علیہم السلام کے پیشوا حضرت علی علیہ السلام نے بھی اپنے اقوال میں اس عظیم

اور علم و دانش کے وسیع سرچشمے کی قدر و قیمت کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپؑ کے ارشاداتِ عالیہ میں سے نہج البلاغہ کے اس قول کو نقل کیا جاسکتا ہے۔

یَا بُنَیَّ اِنِّی وَاِنْ لَّمْ اَکُنْ عُمِّرْتُ عُمُرَ مَنْ کَانَ قَبْلِی فَقَدْ نَظَرْتُ فِی اَعْمَالِھِمْ وَفَکَّرْتُ فِی اَخْبَارِھِمْ وَسِرْتُ فِی اٰثَارِھِمْ حَتّٰی عُدْتُ کَاَحَدِھِمْ بَلْ کَاَنِّی بِمَا انْتَھٰی اِلَیَّ مِنْ اُمُوْرِھِمْ قَدْ عُمِّرْتُ مَعَ اَوَّلِھِمْ اِلٰی آخِرِھِمْ فَعَرَفْتُ صَفْوَ ذٰلِكَ مِنْ کَدَرِہٖ وَنَفْعَهٗ مِنْ ضَرَرِہٖ

"اے میرے بیٹے! میری عمر ہر چند اتنی طویل نہیں جتنی گذشتہ دور کے لوگوں کی رہی ہے لیکن میں نے ان کے کاموں کو دیکھا، ان کے واقعات پر غور کیا، ان کے جو آثار باقی رہ گئے تھے ان میں تلاش و جستجو کی یہاں تک کہ میں بھی ان جیسا بن گیا بلکہ ان کے جو اعمال و افعال مجھ تک پہنچے میں نے گویا ان کے ساتھ اوّل تا آخر زندگی بسر کی۔ اس کے بعد ہی میں نے ان کے کردار کی پاکیزگی وخوبی کو برائی اور تیرگی سے علیحدہ کر کے نفع ونقصان کو پہچانا"۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا یہ بیان اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ آئمہ علیہم السلام کس حد تک عہد گذشتہ کی تاریخ کو اہمیت دیتے تھے۔

غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں تاریخ اسلام کی اہمیت

عیسائی دانشور ادیب جرجی زیدان رقم طراز ہے:

اس میں شک نہیں کہ تاریخ اسلام کا شمار دنیا کی اہم ترین تواریخ عامہ میں ہوتا ہے، کیونکہ مذکورہ تاریخ نے قرونِ وسطیٰ سے متعلق پوری دنیا کی تاریخ تمدن کا احاطہ کرلیا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اسلام زنجیر کی وہ کڑی ہے جس نے دنیائے قدیم کی تاریخ کو جدید تاریخ سے متصل کیا ہے۔ یہ تاریخ اسلام ہے جس سے جدید تمدن کا آغاز اور قدیم تمدن کا اختتام ہوتا ہے۔

تاریخ اسلام کو دیگر تواریخ پر فضیلت

تاریخ اسلام کو دوسری تمام اقوام کی تاریخ پر جو فوقیت حاصل ہے ہم یہاں اس کے بعض پہلو بیان کرتے ہیں:

① سیرتِ پیغمبر اکرمؐ اور دوسرے معصومینؑ کی سیرت وزندگی:

تاریخ کے بارے میں یہی مستند ترین و دقیق ترین نظریہ اور تجزیہ پیش کرتی ہے۔ اگر ہم واقعات کے بارے میں غور وفکر کریں تو اس نظریے اور تجزیے کی روشنی میں ہی تمام واقعات کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں، اور ان سے نتائج اخذ کر کے دوسروں کے لیے اسلامی وقرآنی راہ کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔

دورِ رسالت کی تاریخ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح انسانیت کے لیے بہترین مثال اور نمونہ ہے اور تاریخی روایات کے لیے ہم اسے مفید ترین ماخذ کے طور پر بروئے کار لا سکتے ہیں۔

اسلام سے قبل جزیرہ نما عرب کی حالت

جزیرہ نما عرب ایشیا کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں عراق، اُردن، مشرق میں خلیج فارس، جنوب میں بحرِ عمان اور مغرب میں بحرِ احمر اور خلیج عقبہ واقع ہے۔

اس جزیرہ نما کا رقبہ ۳۰ لاکھ مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے اور جغرافیائی اعتبار سے تین منطقوں میں تقسیم ہوتا ہے:

① مرکزی حصہ صحرائے عرب کے نام سے مشہور ہے اور اس جزیرہ کا وسیع ترین علاقہ ہے۔

② شمالی علاقے کا نام حجاز ہے۔ حجاز حجر سے مشتق ہے جس کے معنی حائل اور مانع ہیں۔ چونکہ یہ سرزمین نجد اور تہامہ کے درمیان واقع اور مانع ہے اسی لیے اس منطقے کو حجاز کہا جاتا ہے۔

③ اس جزیرہ نما کا جنوبی حصہ بحرِ ہند اور بحرِ احمر کے ساحل پر واقع ہے جس میں یمن اور "حضر موت" کے علاقے شامل ہیں۔

جنوبی منطقے کے علاوہ جزیرہ نما کا پورا علاقہ خشک اور بے آب صحرا ہے، مگر بعض جگہوں پر

اس میں نخلستان بھی پائے جاتے ہیں۔

سیاسی حالت

عہدِ جاہلیت میں سیاسی اعتبار سے کسی خاص طاقت کے مطیع اور فرمانبردار نہ تھے۔ وہ صرف اپنے ہی قبیلے کی طاقت کے بارے میں سوچتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ ان کا وہی سلوک تھا جو شدت پسند، وطن دوست اور نسل پرست روا رکھتے ہیں۔

جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے جزیرہ نما عرب ایسی جگہ واقع ہے کہ جنوبی منطقے کے علاوہ اس کا باقی حصہ اس قابل نہ تھا کہ ایرانی یا رومی جیسے فاتحین اس کی جانب رُخ کرتے۔ چنانچہ اس زمانے میں ان فاتح نے اس کی طرف کم ہی توجہ دی، کیونکہ اس کے خشک و بے آب اور تپتے ریگستان ان کے لیے قطعی بے مصرف تھے۔ اس کے علاوہ عہدِ جاہلیت کے عربوں کو قابو میں لانا اور ان کی زندگی کو کسی نظام کے تحت منظم کرنا انتہائی سخت اور دُشوار کام تھا۔

قبیلہ

عرب انفرادی اور طبعی طور پر استبداد پسند اور خود خواہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے جب بیابانوں میں زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کیا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ تنہا رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتے۔ اس بنا پر انھوں نے فیصلہ کیا کہ جن افراد کے ساتھ ان کا خونی رشتہ ہے یا حسب ونسب میں ان کے شریک ہیں، ان سے اپنے گروہ کی تشکیل کریں۔ جس کا نام انھوں نے ''قبیلہ'' رکھا۔ قبیلہ ایسا مستقل و متحد دستہ تھا جس کے ذریعے عہدِ جاہلیت میں عرب قومیت کی اساس و بنیاد شکل پذیر ہوتی تھی۔ چنانچہ ہر اعتبار سے وہ خود کفیل تھے۔

دورِ جاہلیت میں عربوں کے اَقدار کا معیار قبائلی اَقدار پر منحصر تھا۔ ہر فرد کی قدر و منزلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا تھا کہ قبیلے میں اس کی کیا حیثیت ہے اور اہلِ قبیلہ میں اس کا کس حد تک اثر و رسوخ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ قدر و منزلت کے اعتبار سے قبائل کو بالاترین مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ اس کے مقابل کنیزوں اور غلاموں کو قبائل کے ادنیٰ ترین اور انتہائی پست ترین افراد میں شمار کیا جاتا تھا۔

دیگر قبائل کے مقابل جس قبیلے کے افراد کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی وہ قبیلہ اتنا ہی زیادہ فخر محسوس کرتا اور خود کو قابلِ قدر و منزلت سمجھتا۔ اپنے قبیلے کی قدر و منزلت کو بلند کرنے اور قبائل کے افراد کی تعداد کو زیادہ دکھانے کی غرض سے وہ اپنے قبیلے کے مُردوں کی قبروں کو شامل کرنے سے دریغ نہ کرتے۔ چنانچہ قرآن نے اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○

''ایک دوسرے پر فخر جتانے کی فکر نے تمھیں قبروں تک پہنچا دیا''۔

اجتماعی حالات

جزیرہ نما عرب کے اکثر لوگ اپنے مشاغل اور اقتصادی تقاضوں کے باعث صحرا نشینی کی زندگی اختیار کیے ہوئے تھے۔ کُل آبادی کا چھٹا حصّہ ایسا تھا جو شہروں میں آباد تھا۔ شہروں میں جمع ہونے کی وجہ یا تو ان کا تقدس تھا یا ان میں تجارت ہوتی تھی۔ چنانچہ مکّہ کو دونوں ہی اعتبار سے اہمیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ شہروں میں آباد ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کی زمینیں سرسبز و شاداب تھیں اور ضرورت پوری کرنے کے لیے پانی نیز عمدہ چراگاہیں بھی موجود تھیں۔ یثرب، طائف، یمن، حیرہ، حضرموت اور غسان کا شمار ایسے ہی شہروں میں ہوتا تھا۔

عرب اپنے لب و لہجہ اور قومی عادت و خصلت کے اعتبار سے شہر نشین عربوں کی بہ نسبت اچھے سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے عرب کے اہلِ شہر اپنے بچوں کو صحراؤں میں بھیجتے۔ جہاں وہ کئی سال تک رہتے تاکہ ان کی پرورش اسی ماحول اور اسی تہذیب و تمدن کے گہوارے میں ہو سکے۔

جو لوگ شہروں میں آباد تھے ان کی سطحِ فکر زیادہ وسیع و بلند تھی اور ایسے مسائل کے بارے میں ان کی واقفیت بھی زیادہ تھی جن کا قبیلے کے مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا۔

صحرا نشین لوگوں کو شہری لوگوں کی بہ نسبت زیادہ آزادی حاصل تھی۔ اپنے قبیلے کے مفادات کی حدود میں رہ کر ہر شخص کو یہ حق حاصل تھا کہ عملی طور پر وہ جو چاہے کرے۔ اس معاملے میں اہلِ قبیلہ بھی اس کی مدد کرتے تھے۔ اسی لیے ان کے درمیان باہمی جنگ و جدال اور مال و دولت کی غارت گری ایک معمولی چیز بن گئی تھی۔ چنانچہ عربوں میں جنھوں نے شجاعت و بہادری کے کارنامے انجام دیے ہیں ان میں اکثر صحرا نشین تھے۔

دینی حالت

عہدِ جاہلیت کے دوران ملکِ عرب میں بت پرستی کا عام رواج تھا اور لوگ مختلف انداز میں اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں کعبہ مکمل بت خانہ میں بدل چکا تھا جس میں تین سو ساٹھ سے زیادہ اقسام اور مختلف شکل وصورت کے بت رکھے ہوئے تھے اور کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس کا بت وہاں موجود نہ ہو۔ حج کے زمانے میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے بت کے سامنے کھڑے ہوتے، اس کی پوجا کرتے اور اس کو اچھے ناموں سے پکارتے تھے۔

ظہورِ اسلام سے قبل یہود و نصاریٰ بھی جو کہ اقلیت میں تھے، جزیرہ نما عرب میں آباد تھے۔ یہودی اکثر شمال عرب کے گردونواح کے علاقوں، مثلاً یثرب، وادی القریٰ، تیما، خیبر اور فدک میں رہا کرتے تھے، جب کہ عیسائی نواح جنوب میں یمن اور نجران جیسی جگہوں پر بسے ہوئے تھے۔

انھی میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو وحدانیت کے قائل اور خدا پرست تھے اور وہ خود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے پیروکار سمجھتے تھے۔ مؤرخین نے ان لوگوں کو حنفاء کے نام سے یاد کیا ہے۔

جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوئی، اس وقت عرب میں مذہب کی جو حالت وکیفیت تھی اسے حضرت علی علیہ السلام نے اس طرح بیان کیا ہے:

> وَاَهلُ الْاَرْضِ يَوْمَئِذٍ مِلَلٌ مُتَفَرِّقَةٌ وَاَهْوَاءٌ مُنْتَشِرَةٌ وَطَرَائِقُ مُتَشَتِّتَةٌ بَيْنَ مُشَبِّهٍ لِلّٰهِ بِخَلْقِهِ اَوْ مُلْحِدٍ فِي اِسْمِهِ اَوْ مُشِيْرٍ اِلٰى غَيْرِهِ فَهَدَاهُمْ بِهِ مِنَ الضَّلَالَةِ وَاَنْقَذَهُمْ بِمَكَانِهِ مِنَ الْجَهَالَةِ
>
> ”اس زمانے میں لوگ مختلف مذاہب کے ماننے والے تھے، ان کے افکار ایک دوسرے کی ضد اور طریقے مختلف تھے۔ بعض لوگ خدا کو مخلوق سے مشابہ کرتے تھے۔ (ان کا خیال تھا کہ خدا کے بھی ہاتھ پیر ہیں، اس کے رہنے کی بھی جگہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں)۔ وہ خدا کے نام میں تصرف بھی کرتے۔ اپنے بتوں کو خدا کے مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے، مثلاً لات کو اللہ، عزیٰ کو عزیز اور منات کو منان کے ناموں سے یاد کرتے“۔

بعض لوگ خدا کے علاوہ دوسری اشیاء کو بھی پوجتے تھے۔ بعض لوگ دہریئے تھے اور صرف فطرتِ حرکات فلکیہ اور گردشِ زمان ہی کو خود پر مؤثر سمجھتے تھے۔

خداوند تعالیٰ نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے انھیں گمراہی سے نجات دلائی اور آپ کے وجود کی برکت سے انھیں جہالت کے اندھیرے سے باہر نکالا۔

جب ہم بت پرستوں کے گوناگوں عقائد کا مطالعہ کرتے اور ان کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھیں اپنے بتوں سے ایسی زبردست عقیدت تھی کہ وہ ان کے خلاف ذرا سی بھی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے وہ حضرت ابوطالبؑ کے پاس جاتے اور پیغمبرؐ کی شکایت کرتے اور کہتے کہ وہ ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہہ رہے ہیں اور ہمارے دین و مذہب میں برائیاں نکال رہے ہیں۔

وہ وجود خدائے مطلق و خالق اور پروردگار کے معتقد و قائل تو تھے اور اللہ کے نام سے اسے یاد کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی وہ بتوں کو تقدس و پاکیزگی کا مظہر اور انھیں قابلِ پرستش سمجھتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بت ان کے معبود تو ہیں مگر ان کے خالق نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب رسولؐ خدا ان سے گفتگو فرماتے تو یہ ثابت نہیں کرتے تھے کہ خداوند تعالیٰ ان کا خالق ہے بلکہ ثبوت و دلائل کے ساتھ یہ فرماتے کہ خدائے مطلق واحد ہے اور ان کے بنائے ہوئے معبودوں کی حیثیت و حقیقت کچھ بھی نہیں۔

قرآن مجید نے مختلف آیات میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے۔ یہاں اس کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (سورۂ لقمان: آیت ۲۵)

"ان لوگوں سے اگر تم پوچھو کہ زمین اور آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے: اللہ نے"۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (سورۂ زمر: آیت ۲)

"ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں"۔

اس کے علاوہ وہ بت پرستی کی یہ بھی تعبیر کرتے تھے:

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (سورۂ یونس: آیت ۱۸)

"یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں"۔

تعلیمی و تمدنی حالت

عہد جاہلیت کے عرب ناخواندہ اور علم کی روشنی سے قطعی بے بہرہ تھے۔ ان کے اس جہل و ناخواندگی کے باعث توہمات و خرافات نے پورے معاشرے پر اپنا سایہ پھیلا رکھا تھا۔ ان کی کثیر آبادی میں گنتی کے لوگ ہی ایسے تھے جو لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے۔

دورِ جاہلیت میں عرب تمدن کے نمایاں ترین مظہر حسب ونسب کی پہچان، شعر گوئی اور تقاریر میں خوش بیانی جیسے اَوصاف تھے۔ چنانچہ عیش و عشرت کی محفل ہو، خواہ میدانِ کارزار، وہ جہاں بھی جاتے اس میں شعر گوئی یا جادو بیان تقاریر کے ذریعے اپنے قبیلے کی قابلِ اِفتخار باتیں بیان کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام سے قبل عربوں میں شجاعت، شیریں بیانی، مہمان نوازی، لوگوں کی مدد کرنا اور حریت پسندی جیسی عمدہ خصوصیات وصفات بھی موجود تھیں۔ مگر ان قابلِ مذمت عادات و اَطوار کے مقابل جو ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھیں ان کی یہ تمام خوبیاں بے حقیقت بن کر رہ گئی تھیں۔ اس کے علاوہ ان تمام خوبیوں اور ذاتی اَوصاف کے محرک انسانی اَقدار اور قابلِ تحسین و ستائش باتیں نہ تھیں۔

زمانۂ جاہلیت کے عرب، طمع پروری اور مادی چیزوں پر فریفتگی کا کامل نمونہ تھے۔ وہ ہر چیز کو مادی مفاد کے زاویے سے دیکھتے تھے۔ ان کی اِجتماعی تہذیب بے راہ روی، بدکرداری اور قتل و غارت گری جیسے بُرے افعال پر مبنی تھی اور یہی حیوانی پست صفات، ان کی سرشت اور عادت و جبلت کا جُز بن گئے تھے۔

دورِ جاہلیت میں عربوں کے درمیان جو تمدن رائج تھا اس میں اخلاق کی توجیہ و تعبیر دوسرے انداز میں کی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر غیرت، مروت، شجاعت کی سب ہی تعریف کرتے

تھے مگر شجاعت سے ان کی مراد سفاکی اور دوسروں کا قتل و خون کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ طاقت ہوتی تھی۔ غیرت کا مفہوم ان کے تمدن میں لڑکیوں کو زندہ دفن کردینا تھا اور اپنے اس طریقہ کار سے اپنی غیرت کی نمایاں ترین مثال پیش کرتے تھے۔ عہد وفا وہ اسی بات کو سمجھتے تھے کہ ان کے قبیلے کے فرد نے جو بھی عہد و پیمان کیا ہے وہ چاہے غلط ہو یا صحیح وہ اس کی حمایت و پاسداری کریں۔

توہم پرستی اور خرافات کی پیروی

طلوعِ اسلام کے وقت دنیا کی تمام اقوام کے عقائد میں کم و بیش خرافات اور جن و پری وغیرہ کے قصے شامل تھے۔ اس زمانے میں یونانی اور ساسانی اقوام کا شمار دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اقوام میں ہوتا تھا۔ چنانچہ انھی کے قصوں اور کہانیوں کا ان پر غلبہ تھا۔ یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جو معاشرہ تہذیب و تمدن اور علم کے اعتبار سے جس قدر پسماندہ ہوگا اس میں توہمات و خرافات کا اتنا ہی زیادہ رواج ہوگا۔ جزیرہ نما عرب میں توہمات کا عام رواج تھا۔ ان میں سے بہت سے تاریخ نے اپنے سینے میں محفوظ کر رکھے ہیں۔ یہاں بطور مثال چند پیش کیے جاتے ہیں:

① ایسی ڈوریوں کو جنھیں کمانوں کی زہ بنانے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ لوگ اُونٹوں اور گھوڑوں کی گردنوں نیز سروں پر لٹکا دیا کرتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ایسے ٹوٹکوں سے ان کے جانور بھوت پریت کے اثر سے بچے رہتے ہیں اور انھیں کسی کی بری نظر بھی نہیں لگتی۔ اسی طرح جب دشمن حملہ کرنے کے بعد لوٹ مار کرتا ہے تو ایسے ٹوٹکوں کی وجہ سے ان جانوروں پر ذرا بھی آنچ نہیں آتی۔

② خشک سالی کے زمانے میں بارش لانے کی غرض سے جزیرہ نما عرب کے بوڑھے اور کاہن لوگ ''سلع'' درخت جس کا پھل مزے میں کڑوا ہوتا ہے اور ''عشر'' نامی پیڑ (جس کی لکڑی جلدی جل جاتی ہے) گایوں کی دُموں اور پیروں میں باندھ دیتے اور انھیں پہاڑوں کی چوٹیوں تک ہانک کر لے جاتے۔ اس کے بعد وہ ان لکڑیوں میں آگ لگا دیتے۔ آگ کے شعلوں کی تاب نہ لا کر ان کی گائیں اِدھر اُدھر بھاگنے لگتیں اور سر مار مار کر ڈِکارنا شروع کر دیتیں۔ ان کے خیال میں ان گائیوں کے ڈکارنے اور

سر مارنے سے پانی برسنے لگتا تھا۔ ان کا یہ بھی گمان تھا کہ جب ورشا کی دیوی یا جل دیوتا ان گائیوں کو تڑپتا ہوا دیکھیں گے تو ان کی پاکیزگی اور پوترتا کو دھیان میں رکھ کر بادلوں کو جلد برسنے کے لیے بھیج دیں گے۔

۴ وہ مُردوں کی قبر کے پاس اُونٹ قربان کرتے اور اسے ایک گڑھے میں ڈال دیتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان کا یہ اقدام ہے کہ صاحبِ قبر عزت و احترام کے ساتھ اُونٹ پر سوار میدانِ حشر میں نمایاں ہوگا۔

عہدِ جاہلیت میں عورتوں کا مرتبہ

دورِ جاہلیت کے عرب عورتوں کی قدر و منزلت کے ذرہ برابر بھی قائل نہ تھے۔ وہ ہر قسم کے انفرادی و اجتماعی حقوق سے محروم تھیں۔ اس عہدِ جاہلیت کے نظام میں عورت صرف ورثے ہی سے محروم نہیں رکھی جاتی تھی، بلکہ اس کا شمار اپنے باپ، شوہر یا بیٹے کی جائداد میں ہوتا تھا۔ چنانچہ مال و جائداد کی طرح اسے بھی ورثے اور ترکے میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔

عرب قحط سالی کے خوف یا اس خیال سے کہ لڑکیوں کا وجود ان کی ذات کے لیے باعث ننگ و عار ہے، انھیں پیدا ہوتے ہی زمین میں گاڑ دیتے تھے۔ اپنی معصوم لڑکیوں سے انھوں نے جو ناشائستہ و ناروا سلوک اختیار کر رکھا تھا اس کی مذمت کرتے ہوئے قرآنِ مجید فرماتا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ○ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (سورۂ نحل: آیت ۵۸-۵۹)

"جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے"۔

دوسری آیت میں بھی کلام اللہ انھیں اس ناشائستہ فعل اور انسانیت سوز حرکت کے بدلے خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہ قرار دیتا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○ (سورۂ تکویر: آیت ۸-۹)

"اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟"

سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ان کے درمیان شادی بیاہ کی ایسی رسومات رائج تھیں کہ جن کی کوئی محکم اصل و بنیاد نہ تھی۔ وہ اپنی زوجہ کے لیے کسی معین حد کے قائل نہ تھے۔ مہر کی رقم ادا کرنے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے وہ انھیں آزاد کر دیتے۔ کبھی وہ اپنی زوجہ پر بے عصمت ہونے کا الزام لگاتے تاکہ یہ بہانہ بنا کر مہر کی رقم ادا کرنے سے بچ جائیں۔ ان کا باپ اگر کسی بیوی کو طلاق دے دیتا یا خود مر جاتا تو اس کی بیویوں سے شادی کر لینا ان کے لیے عار نہ تھا۔

حرمت کے مہینے

عہد جاہلیت کے تمدن میں ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب چار مہینے ایسے تھے جنھیں ماہِ حرام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ان چار ماہ کے دوران ہر قسم کی جنگ و خونریزی ممنوع تھی۔ البتہ اس کے بدلے تجارت، میل ملاقات، مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور رسومات کی ادائگی کا بازار گرم رہتا تھا۔

قمری مہینوں کے حساب سے سال کے موسم چونکہ آہستہ آہستہ بدلتے رہتے تھے اور یہ موسم ان کے لیے سازگار اور مناسب نہ ہوتے۔ اسی لیے وہ قابلِ احترام مہینوں میں تبدیل کر دیتے۔ قرآنِ مجید نے انھیں "النسی" کے عنوان سے یاد کیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ

"نسی تو کفر میں ایک اضافہ ہے"۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق خاندانِ ہاشم اور قبیلۂ قریش سے ہے۔ جزیرہ نما عرب میں تین سو ساٹھ قبیلے آباد تھے۔ ان میں قریش شریف ترین قبیلہ تھا۔ ماہرین نسب کی اِصطلاح میں حضرت نضر بن کنانہ کی نسل ہی کو قریش کہا جاتا تھا جو کہ آنحضرتؐ کے بارہویں جدامجد تھے۔

آپؐ کے چوتھے جداعلیٰ حضرت قصیٰ بن کلاب کا شمار قبیلہ قریش کے سربرآوردہ افراد میں ہوتا تھا۔ انھوں نے ہی کعبہ کی تولیت اور کنجی قبیلہ خزاعہ کے چنگل سے نکالی تھی۔ انھوں نے ہی حرم کے مختلف حصوں میں اپنے قبیلے کے افراد کو آباد کیا اور کعبہ کی تولیت سنبھالی تھی۔

مؤرخ یعقوبی لکھتا ہے: قصیٰ بن کلاب وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے قبیلہ قریش کو عزت و آبرومندی بخشی اور اس کی عظمت و ناموری کو آشکار کیا۔ قبیلۂ قریش میں خاندانِ ہاشم سب سے زیادہ نجیب وشریف شمار ہوتا تھا۔

رسولِ خدا کے آباء واجداد

مؤرخین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء واجداد میں حضرت عدنان تک اکیس پشت کے نام بیان کیے ہیں اور ترتیب ذیل اسماء پر سب متفق الرائے ہیں۔

حضرت عبداللہ، حضرت عبدالمطلب، حضرت ہاشم، حضرت عبدمناف، حضرت قیس، حضرت کلاب، حضرت مرہ، حضرت کعب، حضرت لوی، حضرت غالب، حضرت مہر، حضرت مالک، حضرت نضر، حضرت کنانہ، حضرت خزیمہ، حضرت مدرکہ، حضرت الیاس، حضرت معنر، حضرت نزار، حضرت معد اور حضرت عدنان۔

حضرت عدنان سے اُوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک اور حضرت ابراہیم خلیل سے حضرت آدم صفی اللہ تک کی ترتیب کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایت بھی بیان کی گئی ہے:

اِذَا بَلَغَ نَسَبِیْ اِلٰی عَدنَانَ فَامسِکُوا

"جب میرے نسب کے بارے میں حضرت عدنان تک پہنچ جاؤ تو ٹھہر جاؤ"۔

اب ہم مختصر طور پر آپ کے آباء و اجداد میں سے بعض کا حال بیان کریں گے۔

حضرت عبد مناف

حضرت قصیٰ کے عبدالدار، عبد مناف، عبدالعزیٰ اور عبد قصیٰ چار فرزند تھے جن میں حضرت عبد مناف سب سے زیادہ شریف اور محترم و بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ حضرت عبد مناف کا اصل نام "مغیرہ" تھا۔ انھیں اپنے والد محترم کے نزدیک نیز لوگوں کے درمیان خاص مرتبہ حاصل تھا، وہ بہت زیادہ سخی اور وجیہ انسان تھے۔ اسی وجہ سے انھیں "فیاض" اور "قمر البطحا" کے القاب سے نوازا گیا، پرہیزگاری، خوش خلقی، نیک چلن اور صلہ رحم جیسے اوصاف ان کی زندگی کا شعار تھے۔

ان کی نظر میں دُنیوی مقامات و مراتب ہیچ تھے۔ مگر اہلِ انصاف لوگوں سے حسد بھی نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ کعبہ کے تمام عہدے اور مناصب ان کے بھائی عبدالدار کے دستِ اختیار میں تھے مگر انھیں اپنے بھائی سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔

حضرت ہاشم

حضرت قصیٰ کے فرزند مکہ سے متعلق معاملات اور کعبہ کی تولیت کا انتظام کسی اختلاف کے بغیر انجام دیتے رہے۔ مگر ان کی وفات کے بعد عبدالدار اور عبد مناف کے لڑکوں کے درمیان کعبہ کے عہدوں کے بارے میں اختلاف ہوگیا۔ بالآخر فیصلہ اس بات پر ہوا کہ کعبہ کی تولیت اور دارالندوہ کی صدارت عبدالدار کے فرزندوں کے پاس ہی رہے اور حاجیوں کو پانی پلانے، نیز ان کی پذیرائی حضرت عبد مناف کے لڑکوں کی تحویل میں دے دی جائے۔ حضرت عبد مناف کے فرزندوں میں یہ عہدہ حضرت ہاشم کے سپرد کیا گیا۔

حضرت ہاشم اور ان کے بھائی عبدالشمس ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ پیدائش کے وقت دونوں کے بدن ایک دوسرے سے پیوست تھے۔ جس وقت انھیں ایک دوسرے سے جدا کیا گیا تو دونوں کا خون زمین پر بہہ گیا اور عربوں نے اس واقعہ کو سخت بدشگونی خیال کیا۔ اتفاق سے

بدشگونی صحیح ثابت ہوئی اور حضرت ہاشم اور عبدالشمس کے لڑکوں میں ہمیشہ ہی کشمکش اور لڑائی رہی۔

عبدالشمس کا لڑکا اُمیہ پہلا شخص تھا جس نے حضرت ہاشم کی مخالفت شروع کی۔ اس نے جب فرزندانِ عبدمناف میں سے حضرت ہاشم میں عزت وشرف اور بزرگواری جیسے اوصاف پائے تو ان سے حسد کرنے لگا اور اپنے چچا کے ساتھ چشمک اور مخالفت پر اتر آیا۔ چنانچہ یہیں سے بنی ہاشم اور بنی اُمیہ کے درمیان مخالفت اور دشمنی شروع ہوئی جو ظہورِ اسلام کے بعد بھی جاری رہی۔

حضرت ہاشم اس فرض کو انجام دینے میں جو ان کے ذمہ تھا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی حج کا زمانہ شروع ہوتا تو وہ قبیلہ قریش کی پوری طاقت وقوت اور تمام وسائل اور امکانات کو حجاج بیت اللہ کی خدمت کے لیے بروئے کار لاتے، اور زمانہ حج کے دوران جس قدر پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی اسے فراہم کرتے تھے۔

لوگوں کی خاطر داری، مہمان نوازی اور حاجت مندوں کی مدد کرنے میں وہ بے مثال یکتائے زمانہ تھے، اسی وجہ سے انھیں "سیدالبطحا" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

حضرت ہاشمؓ کے پاس اُونٹ کافی تعداد میں تھے۔ چنانچہ جس سال اہلِ مکہ قحط وخشک سالی کا شکار ہوئے تو انھوں نے اپنے بہت سے اُونٹ قربان کردیے اور اس طرح لوگوں کے لیے کھانے کا سامان فراہم کیا۔

حضرت ہاشمؓ نے جو اختراعات کیں اور نمایاں کام انجام دیے ان میں سے ان کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے قریش کی محدود کاروباری منڈیوں کو جاڑوں اور گرمیوں کے موسم میں تجارتی سفروں کے ذریعے وسعت دی اور اس منطقے کی اقتصادی زندگی میں حرکت پیدا کی۔ حضرت ہاشم نے بیس یا پچیس سال کی عمر میں تجارتی سفروں کے درمیان "غزہ" نامی مقام پر انتقال کیا۔

حضرت عبدالمطلبؓ

حضرت ہاشمؓ کی وفات کے بعد ان کے بھائی "مُطلب" کو قبیلہ قریش کا سردار مقرر کیا گیا، اور جب ان کی وفات ہوگئی تو ان کے فرزند حضرت "شیبہ" کو کہ جنھیں لوگ عبدالمطلبؓ کہتے تھے قریش کی سرداری سپرد کی گئی۔

حضرت عبدالمطلبؓ اپنے ذاتی کمالات وفضائل اور اوصاف کی بنا پر لوگوں میں بہت

محبوب تھے اور خاص حیثیت کے مالک تھے۔ وہ عاجز اور مجبور لوگوں کے حامی اور ان کے پشت پناہ تھے۔ ان کی جود و بخشش کا یہ عالم تھا کہ ان کے دسترخوان سے صرف انسان ہی نہیں بلکہ پرندے اور حیوانات بھی فیض یاب ہوتے تھے، اسی وجہ سے انھیں "فیاض" کا لقب دیا گیا تھا۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا بہت ہی دانش مند و بردبار شخص تھے۔ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو اخلاق کی بلندی، جور و ستم سے کنارہ کشی، برائیوں سے بچنے اور پست باتوں سے دور رہنے کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کا یہ قول تھا کہ ظالم آدمی اپنے کیے کی سزا اسی دنیا میں پاتا ہے اور اگر اسے اپنے کیے کا بدلہ اس دنیا میں نہیں ملتا تو آخرت میں یہ صلہ اسے ضرور ملے گا۔

اپنے اس عقیدے کی بنا پر انھوں نے اپنی زندگی میں نہ کبھی شراب کو ہاتھ لگایا، نہ کسی بے گناہ کو قتل کیا اور نہ ہی کسی برے کام کی طرف رغبت کی، بلکہ اس کے برخلاف نیک کاموں کی ایسی روایات قائم کیں جن کی دینِ اسلام نے بھی تائید کی۔ ان کی قائم کردہ بعض روایات درج ذیل ہیں:

① باپ کی کسی زوجہ کو بیٹے کے لیے حرام کرنا۔
② مال و دولت کا ہر سال ۱/۵ پانچواں حصہ (خمس) راہِ خدا میں خرچ کرنا۔
③ چاہِ زمزم کا "سقایۃ الحاج" نام رکھنا۔
④ قتل کے بدلے سو اُونٹ بطور خون بہا ادا کرنا۔
⑤ کعبہ کے گرد سات مرتبہ طواف کرنا۔

تاریخ کی کتابوں میں ان کی قائم کردہ دیگر روایات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں: منت مان لینے کے بعد اسے پورا کرنا، چور کا ہاتھ کاٹنا، لڑکیوں کے قتل کی ممانعت اور مذمت، شراب و زنا کو حرام قرار دینے کا حکم جاری کرنا اور برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف نہ کرنا وغیرہ۔

واقعہ عام الفیل

حضرت عبدالمطلبؓ کے عہد میں جو اہم واقعات رُونما ہوئے ان میں سے ایک واقعہ "عام الفیل" تھا۔ اس واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ یمن کے حکمران اَبرہہ نے اس ملک پر اپنا تسلط برقرار کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ اس کی حکومت کے گرد و نواح میں آباد عرب کی خاص توجہ کعبہ پر

مرکوز ہے اور وہ ہر سال کثیر تعداد میں اس کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔

اس نے سوچا کہ عربوں کا یہ عمل اس کے نیز ان حبشی لوگوں کے لیے جو یمن اور جزیرہ نما عرب کے دیگر مقامات پر آباد ہیں، کوئی مصیبت پیدا نہ کردے۔ چنانچہ اس نے یمن میں ''قلیس'' نام کا بہت بڑا گرجا تیار کیا اور تمام لوگوں کو وہاں آنے کی دعوت دی تاکہ کعبہ جانے کے بجائے لوگ اس کے بنائے ہوئے کلیسا میں زیارت کی غرض سے آئیں۔ اس کے اس اقدام کو لوگوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ بعض نے تو اس کے کلیسا کی بے حرمتی بھی کی۔

لوگوں کے اس رویے سے ابرہہ کو سخت طیش آگیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ ان کے اس جرم کی پاداش میں کعبہ کا وجود ہی ختم کردے گا۔ اس مقصد کے تحت اس نے عظیم لشکر تیار کیا جس میں جنگجو ہاتھی پیش پیش تھے۔ چنانچہ پورے جنگی ساز وسامان سے لیس ہو کر وہ مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ سردارِ قریش حضرت عبدالمطلبؓ اور دیگر اہلِ شہر کو جب ابرہہ کے ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے شہر خالی کردیا اور نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔

جنگی ساز وسامان سے لیس اور طاقت کے نشے میں چور جب ابرہہ کا لشکر کعبہ کی طرف بڑھا تو ابابیل جیسے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی منقاروں اور پنجوں میں کنکریاں لے کر اس کے لشکر پر چھا گئے اور انھیں ان پر برسانا شروع کردیا، جس کی وجہ سے ان کے جسم ایسے چور چور ہو گئے جیسے چبایا ہوا بھوسا۔

یہ واقعہ بعثت سے چالیس سال قبل پیش آیا۔ چنانچہ عربوں نے اس واقعے سے ہی اپنی تاریخ شروع کردی جو رسولِ خداؐ کے مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کے عہد تک جاری رہی اور واقعات اسی سے منسوب کیے جانے لگے۔

قابلِ ذکر باتیں

۱۔ ابرہہ کا حملہ اگرچہ مذہبی محرک کا ہی نتیجہ تھا مگر اس کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ سرزمینِ عرب پر سلطنتِ روم کا غلبہ ہو جائے اس لیے اس کی اہمیت مذہبی پہلو سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ ابرہہ کا مکہ اور حجاز کے دیگر شہروں پر قابض ہو جانا سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے روم جیسی عظیم طاقت کی اہم فتح و کامرانی تھی، کیونکہ یہی ایک ایسا طریقہ تھا جسے بروئے

کار لا کر شمال عرب کو جنوب عرب سے متصل کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح پورے جزیرہ نما عرب پر حکومت رُوم کا غلبہ و تسلط ہو سکتا تھا۔ نیز اس کا استعمال ایران پر حملہ کرنے کے لیے فوجی چھاؤنی کے طور پر کیا جا سکتا تھا۔

۲ خداوند تعالیٰ کے حکم سے معجزہ کی شکل میں اَبرہہ کے لشکر کی جس طرح تباہی و بربادی ہوئی اس کی تائید قرآنِ مجید اور اہلِ بیت علیہم السلام کی ان روایات سے ہوتی ہے جو ہم تک پہنچی ہیں۔ قرآنِ مجید کے سورۂ فیل میں ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ○ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ○ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ○ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ○

''تم نے دیکھا کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے، جو ان پر پتھر پھینک رہے تھے۔ پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے (جانوروں) کا کھایا ہوا بھوسا''۔

جو لوگ اس واقعہ کی توجیہ پیش کرتے ہیں کہ اس سال مکہ میں چیچک کی بیماری اَبرہہ کے سپاہیوں میں مکھیوں اور مچھروں کے ذریعے پھیلی اور ان کی ہلاکت کا باعث ہوئی۔ بعض وہ مسلمان جو خود کو روشن فکر خیال کرتے ہیں وہ بھی مغرب کے مادہ پرستوں کے ہم خیال ہو گئے ہیں۔ قابلِ افسوس بات تو یہ ہے کہ بعض مسلم مؤرخین اور مفسرین بھی اس مغرب پرستی کا شکار ہو گئے ہیں۔

۳ اَبرہہ کے لشکر کی شکست اور خانہ کعبہ کو گزند نہ پہنچنے کے باعث قریش پہلے سے بھی زیادہ مغرور و متکبر ہو گئے۔ چنانچہ حرام کاموں کے کرنے، اخلاقی پستیوں کی جانب جانے اور ان لوگوں پر ظلم و ستم روا رکھنے میں جو حرم کے باہر آباد تھے ان کی گستاخیاں اور دراز دستیاں پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئیں۔ وہ برملا کہنے لگے کہ ہم ہی آلِ ابراہیمؑ ہیں، ہم ہی پاسبانِ حرم ہیں، ہم ہی کعبہ کے اصل وارث ہیں۔ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ جاہ و مرتبت میں عربوں کے درمیان کوئی ہمارا ہم پلہ نہیں ہے۔

ان نظریات کی بنا پر انھوں نے حج کے بعض اَحکام، جو حرم کے باہر انجام دیے جاتے ہیں جیسے عرفہ میں قیام، قطعی ترک کر دیے۔ ان کا حکم تھا کہ ان زائرین بیت اللہ کو جو حج یا عُمرہ کی نیت

سے آتے ہیں یہ حق نہیں ہے کہ اس کھانے کو کھائیں جسے وہ اپنے ساتھ لاتے ہیں یا اپنے کپڑے پہن کر خانہ کعبہ کا طواف کریں۔

حضرت عبداللہ

حضرت عبدالمطلبؑ کے سب سے چھوٹے بیٹے حضرت عبداللہؑ تھے کہ جنھیں رسولؐ خدا کے والد ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ وہ حضرت ابوطالبؑ، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے والد اور زبیر ایک ہی ماں یعنی حضرت فاطمہ کے بطن سے تھے۔ حضرت عبداللہؑ اپنے والد کی نظروں میں دوسرے بھائیوں کے مقابل زیادہ قدر و منزلت تھی، جس کی وجہ ان کے ذاتی اوصاف اور معنوی کمالات تھے۔ اس کے علاوہ دانشوروں اور کاہنوں نے بھی یہ پیش گوئی کی تھی کہ ان کی نسل سے ایسا فرزند پیدا ہوگا جسے پیغمبری کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ اس خوشخبری کی تائید و تصدیق اس خاص تابانی سے ہوتی تھی جو حضرت عبداللہؑ کے چہرے سے عیاں تھی۔

حضرت عبدالمطلبؑ نے اپنے جواں سال فرزند حضرت عبداللہؑ کے لیے طائفہ بنی زہرہ کے سردار حضرت وہب بن عبدمناف کی دختر نیک اختر حضرت آمنہؑ سے رشتہ مانگا اور انھیں اپنے فرزند دلبند کے حبالہ نکاح میں لے آئے۔ اس شادی خانہ آبادی کا حاصل و ثمرہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مسعود تھا اور یہی وہ ذاتِ گرامی ہے جسے بعد میں خاتم الانبیاءؐ کہا گیا۔

حضرت آمنہؑ سے شادی کرنے کے بعد حضرت عبداللہؑ تجارتی قافلے کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوئے۔ سفر سے واپسی پر شہر یثرب میں بیمار ہوگئے اور اس بیماری کی وجہ سے وہیں ان کا انتقال ہوگیا اور اسی شہر میں انھیں دفن کیا گیا۔

maablib.org

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت

اکثر محدثین اور مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت عام الفیل میں یعنی نزولِ وحی سے چالیس سال قبل ماہ ربیع الاوّل میں ہوئی۔ لیکن یومِ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ شیعہ محدثین ودانشوروں کی رائے میں آپؐ کی ولادت ۱۷ ربیع الاوّل کو ہوئی اور اہلِ سنت کے مورخین نے آپؐ کا روزِ ولادت ۱۲ ربیع الاول تسلیم کیا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے وقت چند حوادث اور غیر معمولی واقعات بھی رُونما ہوئے جن میں سے بعض یہ ہیں: ایوانِ کسریٰ میں شگاف پڑ گیا اور اس کے چودہ کنگرے زمین پر گر گئے۔ فارس کا وہ آتش کدہ جو گذشتہ ایک ہزار سال سے مسلسل روشن تھا، یکا یک خاموش ہوگیا۔ ساوہ کی جھیل بیٹھ گئی۔ تمام بت منہ کے بل زمین پر گر پڑے۔ زرتشتی عالموں اور کسریٰ خاندان کے بادشاہ نے پریشان کن خواب دیکھے، شاہانِ دنیا کے تخت سلطنت سرنگوں ہوگئے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باعث "نور" آسمان کی طرف بلند ہوا اور بہت وسیع حصے میں پھیل گیا۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے وقت ایسے حیرت ناک واقعات کا رُونما ہونا درحقیقت لوگوں کو خطرے سے آگاہ اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنا تھا بالخصوص ان حکمرانوں کی تنبیہ کرنا مقصود تھی جو اس وقت دُنیا میں فرماں روائی کررہے تھے۔ تاکہ وہ ان واقعات کے بارے میں غور کریں اور یہ جانیں کہ ان حادثات کا رُونما ہونے کا کیا سبب ہے؟۔ نیز خود سے سوال کریں کہ کیونکر بتوں کے ڈھانچے اور بت پرستی کے نشانات منہ کے بل زمین پر آرہے ہیں، اور وہ لوگ جو خود کو زمین کا آقا و مالک سمجھتے تھے مضطرب و پریشان ہوگئے؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے بھی برتر و بہتر طاقت کا ظہور ہوچکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بت پرستی اور شیطانی طاقتوں کا زمانی عروج ختم ہوچکا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کا بچپن

رسولِ خدا ﷺ نے اس دنیا میں اس وقت آنکھ کھولی جب ان کے والد کا سایہ اُٹھ چکا تھا، اسی لیے ایک قول کے مطابق رسولِ خدا کی تربیت بچپن سے ہی آپؐ کے دادا حضرت عبدالمطلبؓ کی زیرِ سرپرستی ہوئی۔

حضرت عبدالمطلبؓ نے پیدائش کے ساتویں دن بھیڑ ذبح کر کے اپنے پوتے کا عقیقہ کیا اور نام محمدؐ رکھا۔ اس نومولود بچے کے لیے دایہ کی تلاش ہوئی اور چند روز کے لیے انھوں نے بچے کو ابولہب کی کنیز ثوبیہ کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد طائفہ بنی سعد کے معزز فرد ابوذویب کی مہربان و پاک دامن دختر حضرت حلیمہ نے آنحضرت ﷺ کو اپنی تحویل میں لے لیا اور صحرا کی جانب لے گئیں تاکہ فطرت کی آغوش اور صحت مندانہ آزاد فضا میں ان بیماریوں سے دُور (جو کبھی شہر مکہ کے لیے خطرہ پیدا کر دیتی تھیں) ان کی پرورش کر سکیں۔ قبیلہ بن سعد کی موجودگی میں حضرت حلیمہ اس نونہال کو ان کی والدہ کی خدمت میں لے گئیں تو انھوں نے آنحضرتؐ کو دوبارہ اپنے ساتھ لے جانے کی درخواست کی۔ چنانچہ حضرت آمنہؑ نے بھی ان سے اتفاق کیا۔

پیغمبر اکرم ﷺ پانچ سال تک صحرا کے دامن میں طائفہ بنی سعد کے درمیان زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ کو واپس والدہ اور دادا کے پاس بھیج دیا گیا۔ جب آپؐ کی عمر مبارک چھے سال ہوئی تو آپؐ کی والدہ ماجدہ حضرت عبداللہؓ کے مزار کی زیارت سے مشرف ہونے اور دونوں اناؤں (دایوں) سے ملاقات کرنے کی غرض سے یثرب گئیں، جہاں ان کا ایک ماہ تک قیام رہا۔ وہ جب واپس مکہ تشریف لا رہی تھیں تو راستہ میں (ابواء ۳۷) نامی مقام پر شدید بیمار ہو گئیں اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ اس حادثے سے آنحضرت ﷺ بہت رنجیدہ ہوئے اور آپ کے مصائب میں دوگنا اضافہ ہو گیا، لیکن اس واقعے نے ہی آپ کو دادا سے بہت نزدیک کر دیا۔

قرآن مجید نے ان مصائب و رنج و تکالیف کے زمانے کی یاد دلاتے ہوئے فرمایا ہے:

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ○ (سورۂ ضحیٰ: آیت ۶)

"کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا"۔

ابھی آپؐ نے زندگی کی آٹھ بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں کہ دادا کا بھی سایہ سر سے اُٹھ گیا اور آپؐ حضرت عبدالمطلبؑ کی وصیت کے مطابق اپنے چچا ابوطالبؑ کے زیرِ سرپرستی آ گئے۔

حضرت ابوطالبؑ اور ان کی زوجہ فاطمہؑ بنت اسد کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت زیادہ عزیز تھے۔ وہ لوگ آپؐ کا اپنے بچوں سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ جس وقت کھانے کا وقت ہوتا تو حضرت ابوطالبؑ اپنے بچوں سے فرماتے کہ پیارے بیٹے (حضرت محمدؐ) کے آنے کا انتظار کرو۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمہؑ بنت اسدؑ کے بارے میں فرماتے ہیں:

حقیقی معنوں میں وہی میری ماں تھیں، کیونکہ وہ اکثر اپنے بچوں کو تو بھوکا رکھتیں مگر مجھے اتنا کھانا دیتیں کہ شکم سیر ہو کر کھاتا۔ ان کے بچے میلے ہی رہتے مگر مجھے نہلا دُھلا کر ہمیشہ صاف ستھرا رکھتیں۔

خدائی تربیت

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کے بارے میں فرماتے ہیں:

لَقَدْ قَرَنَ اللهُ بِهِ مِن لَّدُنْ اَن كَانَ فَطِيمًا اَعْظَمَ مَلَكٍ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ يَسْلُكُ بِهٖ طَرِيقَ الْمَكَارِمِ وَمَحَاسِنَ اَخْلَاقِ الْعَالَمِ لَيْلًا وَنَهَارًا

”جس دن رسولِ خدا کا دودھ چھڑایا گیا اسی دن سے خداوند تعالیٰ نے فرشتے کو آپؐ کے ہمراہ کر دیا تا کہ آپؐ کی دن رات عظمت و بزرگواری کی راہوں اور اخلاق کے قابلِ قدر اوصاف کی جانب رہنمائی کرتا رہے“۔

maablib.org

رسالتؐ کی جانب ایک قدم

شام کی طرف پہلا سفر

رسولِ خدا ﷺ نے جب حضرت ابوطالبؑ کے گھر میں رہنا شروع کیا تو آپؐ کی زندگی کی نئی فصل کا آغاز ہوا۔ یہ فصل لوگوں سے ملاقات اور مختلف نوع کے سفر اختیار کرنے سے شروع ہوئی۔ چنانچہ ان سفروں اور لوگوں سے ملاقاتوں کے ذریعے ہی حضرت محمد ﷺ کا گوہر وجود اس تاریک وسیاہ ماحول میں درخشاں ہوا اور یہیں سے آپؐ کو معاشرے نے امینِ قریش کہنا شروع کیا۔

بارہ سال کی عمر میں اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ کے ہمراہ اس کارروانِ قریش کے ساتھ، جو تجارت کے لیے ملک شام کی جانب جارہا تھا سفر پر روانہ ہوئے۔ جس وقت یہ کارواں ''بصرہ'' پہنچا تو ''بحیرا'' نامی عیسائی دانشور قافلہ والوں سے ملاقات کے لیے آیا۔ اسی اثناء میں اس کی نظر رسولِ خدا ﷺ پر پڑی۔ اس نے انجیل مقدس میں پیغمبر آخرالزماںؐ سے متعلق جو علامات پڑھی تھیں وہ اور دیگر نشانیاں اسے نبی اکرمؐ میں نظر آئیں تو اس نے آپؐ کو فوراً پہچان لیا۔ چنانچہ اس نے حضرت ابوطالبؑ کو آپؐ کے نبی ہونے کی خوشخبری دی اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ اس بچے کا خاص خیال رکھیں اور مزید کہا:

ان کے بارے میں جو کچھ مَیں جانتا ہوں اگر وہی باتیں یہودی بھی جان لیں تو وہ انھیں گزند پہنچائے بغیر نہ رہیں گے اس لیے بھلائی اسی میں ہے کہ انھیں جتنی جلدی ہوسکے واپس مکہ لے جائیے۔

حضرت ابوطالبؑ نے اپنے کاروبار کے اُمور کو جلد از جلد انجام دیا اور مکہ واپس آگئے اور پوری طرح اپنے بھتیجے کی حفاظت ونگرانی کرنے لگے۔

مستشرقین کی اِفتراء پردازی

راہب کی اس روایت کو اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یہ تاریخ کا بہت معمولی واقعہ ہے۔ لیکن بعض بدنیت مستشرقین نے اپنے ذاتی مفاد کے تحت اسے دستاویز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کا اس پر اصرار ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی اس غیر معمولی ذہانت کی بنا پر جو آپ کی ذاتِ گرامی میں موجود تھی اس سفر کے دوران بحیرا عیسائی سے بہت سی باتیں سیکھیں اور اپنے قوی حافظہ میں محفوظ کرلیں اور اٹھائیس سال گزرنے کے بعد انھی باتوں کو اپنے کیش و آئین کی بنیاد قرار دیا اور یہ کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ یہ باتیں وحی کے ذریعے آپؐ پر نازل ہوئی ہیں لیکن پیغمبر اکرم ﷺ کی سوانح حیات آپؐ کے دین و آئین کی اِلہامی خصوصیات نیز عملی و عقلی دلائل و براہین سے اس گمان کی نفی ہوتی ہے۔

ذیل میں ہم اس موضوع سے متعلق چند نکات بیان کرتے ہیں:

۱. عقل کی رُو سے یہ بات بعید ہے کہ ایک بارہ سال کا نوجوان، کہ جس نے کبھی مدرسہ کی شکل تک نہ دیکھی ہو، وہ چند گھنٹوں کی ملاقات میں توریت و انجیل جیسی کتابوں کے حقائق سیکھ لے اور اٹھائیس سال بعد انھیں شریعتِ آسمانی کے نام سے پیش کرے۔
۲. اگر پیغمبرؐ خدا نے بحیرا سے کچھ باتیں سیکھ لی ہوتیں تو وہ یقیناً قریش کے درمیان پھیل گئی ہوتیں اور وہ لوگ جو کارواں کے ساتھ گئے تھے ضرور واپس آکر انھیں بیان کرتے۔ اس کے علاوہ اس واقعے کے بعد رسولِ اکرمؐ اپنی قوم کے افراد سے یہ نہیں فرماسکتے تھے کہ میں اُمّی ہوں۔
۳. اگر توریت اور انجیل کا قرآنِ مجید سے موازنہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ قرآن کے مندرجات وہ نہیں ہیں جو ان کتابوں کے ہیں۔
۴. اگر عیسائی راہب کو اتنی زیادہ مذہبی و علمی معلومات حاصل تھیں تو وہ کیوں نہ اپنے زمانے میں مشہور ہوا، اور پیغمبر اکرم ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا علم کیوں نہ سکھایا؟

ملکِ شام کا دوسرا سفر

رسولِ اکرم ﷺ کی راست گوئی و نجابت، شرافت، امانت داری اور اخلاق و کردار کی

بلندی کا ہر شخص قائل تھا۔

حضرت خویلد کی دُختر حضرت خدیجہؓ بہت نیک سیرت اور شریف خاتون تھیں۔ انھیں اپنے والد سے بہت سا مال ورثے میں ملا تھا۔ وہ بھی مکہ کے بہت سے مردوں اور عورتوں کی طرح اپنے مال سے تجارت کرتی تھیں۔ جس وقت انھوں نے امین قریش کے اُوصاف سنے تو انھوں نے رسولِ خدا کے سامنے یہ تجویز رکھی: اگر آپؐ میرے سرمائے سے تجارت کرنے کے لیے ملک شام تشریف لے جائیں تو میں جتنا حصّہ دوسروں کو دیتی ہوں اس سے زیادہ حصّہ آپؐ کو دوں گی۔

رسولِ خدا نے اپنے چچا ابوطالبؑ سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت خدیجہؓ کی تجویز کو قبول کرلیا اور ان کے ''میسرہ'' نامی غلام کے ہمراہ پچیس سال کی عمر میں مالِ تجارت لے کر ملکِ شام کی طرف روانہ ہوئے۔

کاروانِ تجارت میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بابرکت و باسعادت وجود قریش کے تاجروں کے لیے نہایت ہی سودمند و منفعت بخش ثابت ہوا اور انھیں توقع سے زیادہ منافع ملا۔ نیز رسولِ خدا کو سب سے زیادہ نفع حاصل ہوا۔ سفر کے خاتمے پر ''میسرہ'' نے سفر کی پوری کیفیت حضرت خدیجہؓ کو بتائی اور رسولِ خدا کے فضائل و اخلاقی اُوصاف و مکارم نیز کرامات کو تفصیل سے بیان کیا۔

حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی

حضرت خدیجہؓ رشتے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چچازاد بہن تھیں اور دونوں کا شجرۂ نسب جناب قصیٰ بن کلاب سے جاملتا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کی ولادت و پرورش اس خاندان میں ہوئی تھی جو نسب کے اعتبار سے اصیل، ایثار پسند اور خانہ کعبہ کا حامی و پاس دار تھا اور خود حضرت خدیجہؓ اپنی عفت و پاک دامنی میں ایسی مشہور تھیں کہ دورِ جاہلیت میں انھیں ''طاہرہ'' اور ''سیّدۂ قریش'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ان کے لیے بہت سے رشتے آئے اگرچہ شادی کے خواہش مند مہر ادا کرنے کے لیے کثیر رقم دینے کے لیے تیار تھے مگر وہ کسی سے بھی شادی کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئیں۔

جب رسولِ خدا ملک شام سے سفرِ تجارت کے بعد واپس مکہ تشریف لائے تو حضرت خدیجہؓ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں قاصد بھیجا اور آپؐ سے شادی کرنے کا اظہار کیا۔ رسولِ خدا

نے اس مسئلے کو حضرت ابوطالبؑ اور دیگر چچاؤں کے درمیان رکھا۔ سب نے اس رشتے سے اتفاق کیا تو آپؐ نے قاصد کے ذریعے حضرت خدیجہ کو اس رشتے کی منظوری کا مثبت جواب دیا۔ رشتے کے منظور کیے جانے کے بعد حضرت ابوطالب اور دوسرے چچا حضرت حمزہؓ نیز حضرت خدیجہؓ کے قرابت داروں کی موجودگی میں حضرت خدیجہؓ کے گھر پر محفل تقریب نکاح منعقد ہوئی اور نکاح کا خطبہ دولہا اور دلہن کے چچاؤں حضرت ابوطالبؑ اور عمر بن اسد نے پڑھا۔ شادی کے وقت رسولؐ خدا کا سن مبارک پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی۔

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے محرکات

بعض وہ لوگ جو ہر چیز کو مادی مفاد کی نظر سے ہی دیکھتے ہیں انھوں نے اس شادی کو بھی مادی پہلو سے ہی دیکھا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے۔

چونکہ حضرت خدیجہؓ کو تجارتی اُمور کے لیے کسی مشہور و معروف اور معتبر شخص کی ضرورت تھی اس لیے انھوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے شادی کا پیغام بھیجا۔ دوسری طرف پیغمبر اکرمؐ یتیم و نادار تھے اور حضرت خدیجہؓ کی شرافت مندانہ زندگی سے واقف تھے اسی لیے ان کی دولت حاصل کرنے کی غرض سے یہ رشتہ منظور کرلیا گیا، اگرچہ سن کے اعتبار سے دونوں کی عمروں میں کافی فرق تھا۔

اس کے برعکس اگر تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کیا جائے تو اس شادی کے محرکات میں بہت سے معنوی پہلو شامل تھے۔ اس سلسلے میں ہم یہاں پہلے پیغمبرؐ خدا کی اور بعد میں حضرت خدیجہؓ کی نمایندگی کرتے ہوئے ذیل میں چند نکات بیان کرتے ہیں:

اوّل تو پیغمبرؐ خدا کی پوری زندگی ہمیں زُہد و تقویٰ و معنوی اَقدار سے پُر نظر آتی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نظر میں دُنیوی مال و دولت اور جاہ و حشم کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی اور آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کی دولت کو کبھی بھی اپنے ذاتی آرام و آسائش کی خاطر استعمال نہیں کیا۔

دوسرے اس شادی کی پیش کش حضرت خدیجہؓ نے کی تھی نہ کہ رسولؐ اسلام نے۔

اب ہم یہاں حضرت خدیجہؓ کی جانب سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

حضرت خدیجہؓ عفیف و پاک دامن خاتون تھیں اور انھیں متقی و پرہیزگار شوہر کی تلاش تھی۔

دوسرے یہ کہ ملک شام سے واپس آنے کے بعد جب میسرہ غلام نے سفر کے واقعات حضرت خدیجہؓ کو بتائے تو ان کے دل میں ''امینِ قریش'' کے لیے جذبۂ محبت و اُلفت بڑھ گیا۔ چنانچہ اس محبت کا سرچشمہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالاتِ نفسانی اور اخلاقی فضائل تھے اور حضرت خدیجہؓ کو ان ہی کمالات سے تعلق اور واسطہ تھا۔

تیسرے یہ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شادی کرنے کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو کبھی سفرِ تجارت پر جانے کی ترغیب نہیں دلائی۔ اگر انھوں نے یہ شادی اپنے مال و دولت میں اضافہ کرنے کی غرض سے کی ہوتی تو وہ رسولِ اکرمؐ کو ضرور سفر پر روانہ کرتیں تاکہ مال و دولت میں اضافہ ہو سکے۔ اس کے برعکس حضرت خدیجہؓ نے اپنی دولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے کر دی تھی تاکہ اسے آپؐ ضرورت مند لوگوں پر خرچ کریں۔

حضرت خدیجہؓ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے شادی کی درخواست کے اصل محرک کو اس طرح بیان کیا ہے:

اے میرے چچا کے بیٹے! چونکہ میں نے تمھیں ایک شریف، دیانت دار، خوش خلق اور راست گو انسان پایا تو میں تمھاری جانب مائل ہوئی اور شادی کے لیے پیغام بھیجا۔

پیغمبر اکرمؐ کے منہ بولے بیٹے

حضرت خدیجہؓ سے رسولِ خداؐ کی شادی کے بعد حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام ملکِ شام سے اپنے ساتھ کچھ غلام لے کر آئے جن میں ایک آٹھ سالہ لڑکا زید ابن حارثہ بھی تھا۔ جس وقت حضرت خدیجہؓ ان غلاموں کو دیکھنے کے لیے آئیں تو حکیم نے ان سے کہا کہ پھوپھی جان! آپ ان غلاموں میں سے جسے بھی چُن لیں گی وہ آپؓ ہی کو مل جائے گا۔ حضرت خدیجہؓ نے زید کو چُن لیا۔

جب رسولِ خداؐ نے زید کو حضرت خدیجہؓ کے پاس دیکھا تو آپؐ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ غلام مجھے دے دیا جائے۔ حضرت خدیجہؓ نے اس غلام کو پیغمبر اکرمؐ کے حوالے کر دیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسے آزاد کر کے اپنا فرزند (متبنّیٰ) بنایا لیکن جب پیغمبر اکرمؐ پر وحی نازل ہونا شروع ہوئی تو

قرآن نے حکم دیا کہ انھیں متبنیٰ نہیں صرف فرزند کہا جائے۔

جب زید کے والد "حارث" کو یہ معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا شہر مکہ میں رسولؐ خدا کے گھر میں ہے تو وہ آنحضرتؐ کے پاس آئے اور کہا کہ ان کا بیٹا ان کو واپس دے دیا جائے۔

آنحضرتؐ نے زید سے فرمایا: ہمارے ساتھ رہو گے یا اپنے والد کے ساتھ جاؤ گے؟ اگر چاہو تو ہمارے ساتھ رہو اور چاہو تو اپنے والد کے ساتھ واپس چلے جاؤ۔

حضرت زید نے پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس ہی رہنا پسند کیا۔ جب رسولؐ اللہ پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی تو حضرت علی علیہ السلام کے بعد وہ پہلے مرد تھے جو آنحضرتؐ پر ایمان لائے۔

رسولؐ خدا نے ان کا نکاح پاک دامن اور ایثار پسند خاتون اُمِ ایمن سے کر دیا جن سے اسامہ پیدا ہوئے۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے چچا کی لڑکی زینب بنت جحش سے ان کی شادی کر دی۔

حضرت علی علیہ السلام کی ولادت

شہر مکہ کے اس تاریخ ساز عہد میں جو اہم واقعات رُونما ہوئے ان میں سے ایک حضرت علی علیہ السلام کی کعبہ میں ولادت باسعادت تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی پیدائش واقعۂ عام الفیل کے تیس سال بعد ہوئی۔ خانہ کعبہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی پیدائش و تولد آپؑ کے عظیم و ممتاز فضائل میں سے ایک ہے۔ اس فضیلت کا نہ صرف شیعہ دانشوروں نے ذکر کیا ہے بلکہ اہلِ سنت کے محدثین و مؤرخین بھی اس کے معترف ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کے دامن میں تربیت

حضرت علی علیہ السلام نے بچپن اور شیر خوارگی کا زمانہ اپنے مہربان اور پاک دامن والدین حضرت ابوطالبؑ اور حضرت فاطمہؑ بنت اسد کی آغوش اور اس گھر میں بسر کیا جہاں نُورِ رسالتؐ اور آفتابِ نبوتؐ تاباں تھا۔ حضرت ابوطالبؑ کے اس نونہال پر حضرت محمدؐ کی شروع سے ہی خاص توجہ و عنایت تھی، اسی لیے آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ محبت و مہربانی کے سلوک اور تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

رسولؐ خدا نے اسی پر ہی اکتفا نہ کیا، بلکہ جب حضرت علی علیہ السلام نے اپنی عمر کی چھے بہاریں

دیکھ لیں، تو آپؐ اپنے گھر لے آئے اور بذاتِ خود ان کی تربیت فرمانے لگے۔

حضرت علی علیہ السلام سے بے پناہ شغف کی وجہ سے آپؐ انھیں اپنے سے ہرگز جدا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی آپ عبادت کے لیے مکہ سے باہر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تو حضرت علی علیہ السلام آپؐ کے ساتھ ہوتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیرِ سایہ حضرت علی علیہ السلام کی جو تربیت ہوئی اس کی اہمیت و قدر و قیمت کے بارے میں خود حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمْ مَوْضِعِي مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ بِالْقَرَابَةِ الْقَرِيبَةِ وَالْمَنْزِلَةِ الْخَصِيصَةِ وَضَعَنِي فِي حِجْرِهِ وَأَنَا وَلَدٌ يَضُمُّنِي إِلَى صَدْرِهِ وَيَكْنُفُنِي فِي فِرَاشِهِ وَيُمِسُّنِي جَسَدَهُ وَيُشِمُّنِي عَرْفَهُ وَكَانَ يَمْضَغُ الشَّيْءَ ثُمَّ يُلْقِمُنِيهِ..... وَلَقَدْ كُنْتُ أَتَّبِعُهُ اتِّبَاعَ الْفَصِيلِ أَثَرَ أُمِّهِ يَرْفَعُ لِي فِي كُلِّ يَوْمٍ مِنْ أَخْلَاقِهِ عِلْماً وَيَأْمُرُنِي بِالاقْتِدَاءِ بِهِ

"یہ تو تم سب ہی جانتے ہو کہ رسولؐ خدا کو مجھ سے کیسی قربت تھی اور آپؐ کی نظروں میں میری کیا قدر و منزلت تھی۔ اس وقت جب میں بچہ تھا آپؐ مجھے اپنی گود میں جگہ دیتے اور سینے سے لگاتے، مجھے اپنے بستر پر اپنی جگہ لٹاتے۔ میں آپؐ سے بغل گیر ہوتا اور آپؐ کے جسمِ مبارک کی عطر آگیں خوش بو میرے مشام کو معطر کر دیتی۔ آپؐ نوالے چبا کر میرے منہ میں رکھتے، میں پیغمبر اکرمؐ کے نقشِ قدم پر اس طرح چلتا جیسے شیر خوار بچہ اپنی ماں کی پیروی کرتا ہے۔ آپؐ ہر روز اخلاق کا پرچم میرے سامنے لہراتے اور حکم فرماتے کہ میں بھی آپؐ کی پیروی کروں"۔

معبودِ حقیقی سے انس و محبت

امینِ قریش نے اپنی زندگی کے تقریباً چالیس سال ان سختیوں اور محرومیوں کے باوجود، جو ہمیشہ دامن گیر رہیں، نہایت صداقت، شرافت، نجابت، کردار کی درستی اور پاک دامنی کے ساتھ گزارے۔ آپؐ نے اس عرصے میں خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش نہیں کی۔ عبادت اور

معرفتِ خداوندی کو ہر چیز پر ترجیح دی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آپؐ ہر سال کچھ عرصہ جبلِ نور اور غارِ حرا میں تنہا رہ کر عبادتِ خداوند میں گزارتے تھے۔

جناب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ کَانَ مجَاوِرُ فِي کُلِّ سَنَةٍ بِحِرَاءَ فَارَاهُ وَلَا یَرَاهُ غَیْرِي

"رسولِ خدا ہر سال کچھ عرصے کے لیے غارِ حرا میں قیام فرماتے، اس وقت میں ہی انھیں دیکھتا میرے علاوہ انھیں کوئی نہیں دیکھتا تھا"۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباء و اَجداد سب ہی موحد تھے اور سب ان آلودگیوں سے محفوظ تھے جن میں پوری قوم ڈوبی ہوئی تھی۔ اس بارے میں علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں:

شیعہ امامیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین، آباء و اَجداد مسلمان ہی نہیں بلکہ سب ہی صدیقین تھے۔ وہ یا تو نبی مرسل تھے یا معصوم اوصیاء تھے۔ ان میں سے بعض تقیہ کی وجہ سے یا مذہبی مصلحتوں کی بنا پر اپنے دینِ اسلام کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَم اَزَلْ اَنتَقِلُ مِن اَصلَابِ الطَّاهِرِینَ اِلَی اَرحَامِ الْمُطَهَّرَاتِ

"میں مسلسل پاک مردوں کے صُلب سے پاک عورتوں کے رحم میں منتقل ہوتا رہا"۔

مکہ میں اسلام کی تبلیغ اور قریش کا ردعمل

نزولِ وحی

خداوند تعالیٰ کی عبادت و پرستش کرتے رسولِ اکرمؐ کو چالیس سال گزر چکے تھے۔ ایک مرتبہ جب آپؐ غارِ حرا میں معبودِ حقیقی سے راز و نیاز میں مشغول تھے۔ اس وقت اچانک حضرت جبرائیل امینؑ آپؐ کے پاس آئے اور رسالت کی خوشخبری دیتے ہوئے انھوں نے وہ پہلی آیت جو خداوند تعالیٰ کی جانب سے نازل کی گئی تھی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ○

(سورہ علق: آیات ۱-۵)

"اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو کہ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے، پڑھو کہ تمھارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے اور انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا"۔

رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ آیت مبارکہ سنی اور خداوند تعالیٰ کی جانب سے پیغمبری کی خوشخبری ملی۔ نیز آپؐ نے مقامِ کبریائی کی عظمت و شان کا مشاہدہ کیا تو اس نعمت عظمیٰ کو حاصل کرنے کے بعد آپؐ نے اپنے وجودِ مبارک میں مسرت و شادمانی محسوس کی۔ چنانچہ آپؐ غار سے باہر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؑ کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

راستے میں جتنی پہاڑیاں اور چٹانیں تھیں وہ سب قدرتِ حق سے گویا ہو گئی تھیں اور پیغمبرؐ خدا کے ساتھ باادب و باصد احترام پیش آرہی تھیں اور "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا نَبِیَّ اللّٰهِ" کہہ کر آپؐ سے مخاطب ہو رہی تھیں۔

شیعہ محدثین اور مورخین کے نظریے کی رُو سے واقعہ (عام الفیل) کے چالیس سال گزر جانے کے بعد رسولِ خدا پر ۲۷ رجب کو پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی۔

سب سے پہلے اسلام کا اعلان کرنے والا

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ حرا سے گھر تشریف لے گئے اور آپؐ نے نبوت کا اعلان کر دیا۔ سب سے پہلے آپؐ کے چچازاد بھائی حضرت علی علیہ السلام اور عورتوں میں آپؐ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؑ نے آپؐ کے پیغمبرؐ ہونے کی تصدیق کی۔ اہلِ سنت میں کے اکثر و بیشتر مورخین بھی اس بات سے متفق ہیں۔ اس سلسلے میں چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

○ هٰذَا اَوَّلُ مَنْ اٰمَنَ بِيْ وَصَدَّقَنِيْ وَصَلّٰى مَعِيْ

"علیؑ پہلے شخص ہیں جس نے تصدیق کی اور میرے ساتھ نماز ادا کی"۔

○ اَوَّلُكُمْ وَارِدًا عَلَى الْحَوْضِ اَوَّلُكُمْ اِسْلَامًا عَلِيُّ ابْنُ اَبِيْ طَالِب

"علیؑ پہلے شخص ہیں جو سب سے پہلے حوضِ کوثر کے کنارے مجھ سے ملاقات کریں گے اور سابق الاسلام ہیں"۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَوَّلُ مَنْ اَنَابَ وَسَمِعَ وَاَجَابَ لَمْ يَسْبِقْنِيْ اِلَّا رَسُوْلُ اللّٰهِ

"بارِ الٰہا! میں پہلا شخص ہوں جو دین کی طرف آیا، اسے سنا اور قبول کیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی شخص نے نماز میں مجھ پر سبقت نہیں کی"۔

دعوت کا آغاز

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ حرا سے نکل کر جب گھر میں داخل ہوئے تو آپؐ نے بستر پر آرام فرمایا۔ ابھی اسلام کے مستقبل اور دین کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ سورۂ مدثر نازل ہوئی اور رسولِ خدا کو اُٹھ کھڑے ہونے اور ڈرانے پر مقرر کیا۔ چنانچہ اس طرح پیغمبر اکرمؐ نے دعوتِ حق کا آغاز کیا۔ اس دعوت کے تین مرحلے تھے:

(الف) پوشیدہ دعوت:

دعوتِ حق کے اس مرحلے کی مدت مورخین نے تین سے پانچ سال لکھی ہے۔ مشرکین کی سازش سے محفوظ رہنے کے لیے رسول اکرم ﷺ نے یہ فیصلہ کیا کہ عوام کی جانب توجہ دینے کے بجائے لوگوں کو فرداً فرداً دعوتِ حق کے لیے تیار کریں اور پوشیدہ طور پر باصلاحیت لوگوں سے ملاقات کر کے ان کے سامنے دین الٰہی پیش کریں۔ چنانچہ آپؐ کی جدوجہد سے چند لوگ آئینِ توحید کی جانب آ گئے مگر ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اپنے دین کو مشرکین سے پوشیدہ رکھیں اور فرائض عبادت کو لوگوں کی نظروں سے دُور رہ کر انجام دیں۔

جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور تیس تک پہنچ گئی تو رسولؐ خدا نے ارقم کے گھر کو جو کوہِ صفا کے دامن میں واقع تھا، تبلیغ اسلام اور پرستش خداوند تعالیٰ کا مرکز قرار دیا۔ آپ اس گھر میں ایک ماہ تک تشریف فرما رہے، اب مسلمانوں کی تعداد چالیس تک پہنچ چکی تھی۔

قریش کا ردِعمل

اگرچہ قریش کو کم و بیش علم تھا کہ رسولؐ خدا کی پوشیدہ طور پر دعوتِ دین حق جاری ہے لیکن انھیں اس تحریک کی گہرائی سے واقفیت نہ تھی اس لیے انھوں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہ کیا کیونکہ اس سے انھیں کسی خطرے کا اندیشہ نہیں تھا مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گردوپیش کے ماحول سے بھی بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ وہ ان واقعات کی کیفیت بھی ایک دوسرے سے بیان کر دیتے تھے۔ رسولؐ خدا نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور اس عرصے میں آپؐ نے (حزب اللہ) جماعتِ حق کی داغ بیل ڈال دی۔

(ب) عزیز و اقرباء:

دعوت کا یہ مرحلہ اس آیۂ مبارکہ کے نزول کے ساتھ شروع ہوا:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ (سورۂ شعراء: آیت ۲۱۴)

"اپنے رشتہ داروں کو عذابِ الٰہی سے ڈرائیے"۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو اس کام پر مقرر کیا کہ آپؑ کھانے کا انتظام

کریں اور آنحضرت ﷺ کے عزیز و اقارب کو کھانے پر بلائیں، تاکہ ان تک خداوند تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیں۔ تقریباً چالیس یا پینتالیس آدمی آپؐ کے دسترخوان پر جمع ہوئے۔ رسولِؐ خدا چاہتے تھے کہ لوگوں سے گفتگو کریں، مگر ابولہب نے غیر متعلقہ باتیں شروع کر کے اور آپؐ پر سحر وجادوگری کا الزام لگا کر محفل کو ایسا درہم برہم کیا کہ اس میں اصل مسئلے کو پیش نہ کیا جا سکا۔

اگلے روز آپؐ نے دوبارہ لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو رسولِؐ خدا اپنی جگہ سے اُٹھے اور تقریر کے دوران فرمایا:

اے عبدالمطلبؑ کے بیٹو! خدا کی قسم! مجھے قومِ عرب میں ایک بھی ایسا جوان نظر نہیں آتا کہ وہ اس سے بہتر چیز لے کر آیا ہو، جو میں اپنی قوم کے لیے لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے لیے دنیا اور آخرت کی خیر (بھلائی) لے کر آیا ہوں۔ خداوند تعالیٰ نے مجھے اس کام پر مقرر کیا ہے کہ میں تمھیں اس کی طرف دعوت دوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میری مدد کرے تاکہ وہ تمھارے درمیان میرا بھائی، وصی اور جانشین بن سکے۔

> فَاَيُّكُم يُوَازِرُنِي عَلَىٰ هٰذَا الْاَمرِ عَلٰى اَنْ يَكُونَ اَخِي وَوَصِيِّي وَخَلِيفَتِي؟
>
> "رسولِؐ خدا نے تین مرتبہ اپنی بات دُہرائی اور ہر مرتبہ حضرت علی علیہ السلام ہی نے اُٹھ کر اعلان کیا کہ میں آپؐ کی مدد و پشت بانی کروں گا"۔

اس پر رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:

> اَنَّ هٰذَا اَخِي وَوَصِيِّي وَخَلِيفَتِي فِيكُمْ فَاسْمَعُوا لَهُ وَاَطِيعُوا
>
> "یہ علیؑ، تمھارے درمیان میرے بھائی، وصی اور خلیفہ ہیں۔ ان کی بات سنو اور اطاعت کرو"۔

اس مجلس میں رسولِ خدا ﷺ نے جو تقریر کی اس سے مسئلہ امامت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اصل (نبوت) کو (امامت) سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

عزیز و اقارب کو ہی کیوں پہلے دعوتِ حق دی گئی؟

مندرجہ بالا سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ دعوتِ عمومی سے قبل عقل و دانش کی رُو

سے عزیز و اقارب کو ہی دعوت دی جانی چاہیے، کیونکہ امر واقعی یہ ہے کہ رسولؐ خدا کا یہ اقدام انتہائی حساس مرحلے اور خطرناک حالات میں دعوتِ حق کی بنیادوں کو استوار کرنے کا بہترین ذریعہ تھا، کیونکہ:

① عزیز و اقارب کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر کے ہی پیغمبر اکرم ﷺ دشمنانِ اسلام کے خلاف طاقتور دفاعی محاذ قائم کر سکتے تھے، اس کا کم از کم اتنا فائدہ تو تھا ہی کہ اگر ان کے دل آپؐ کے دین کی طرف متوجہ نہ بھی ہوئے تو بھی وہ رشتہ داری اور قرابت کی بنا پر آنحضرتؐ کے تحفظ و دفاع کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

② رسول اللہ ﷺ نے انسانی کوتاہیوں اور اپنی ذات میں تنظیمی قوت کا خوب اندازہ لگایا اور یہ جان لیا تھا کہ وہ کون سی طاقتیں ہیں جو آپ کی مخالفت کریں گی اور آپ سے برسرِ پیکار ہوں گی۔

(ج) عام دعوتِ حق:

رسولِ خدا ﷺ نے اس آیت فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّا كَفَيْنٰكَ (سورۂ حجر: آیت ۹۴-۹۵) "جس چیز کا آپؐ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کھلم کھلا بیان کرو اور مشرکین کی پروا نہ کرو، تمھارا مذاق اُڑانے والوں کے لیے ہم کافی ہیں"۔

آپؐ کو اس کام پر مقرر کیا گیا کہ سب کو دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں۔ چنانچہ اس مقصد کی خاطر آپؐ کوہِ صفا پر تشریف لے گئے اور اس جمِ غفیر کے سامنے جو اس وقت وہاں موجود تھا آپؐ نے اس تمہید کے ساتھ تقریر شروع کی:

اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے تمھاری گھات میں دشمن بیٹھا ہوا ہے اور تمھارے لیے اس کا وجود سخت خطرے کا باعث ہے تو کیا تم میری اس بات کا یقین کرو گے؟

سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہاں، ہم آپ کی بات کا یقین کریں گے کیونکہ ہم نے آپ کی زبان سے اب تک کوئی جھوٹی بات نہیں سنی ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

فَاِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ

"اب جب کہ تم نے میری راست گوئی کی تصدیق کردی ہے تو میں تمھیں بہت ہی سخت عذاب سے آگاہ وخبردار کررہا ہوں"۔

رسولِ خدا کی یہ بات سن کر ابولہب بول اُٹھا اور کہنے لگا: وائے تیرے حال پر، کیا تُو نے یہی بات کہنے کے لیے ہمیں یہاں جمع کیا تھا؟

خداوند تعالیٰ نے اس گستاخ کی تنبیہ اور اس کے چہرے سے کینہ توزی کی نقاب کو دُور کرنے کے لیے سورۂ ابولہب نازل فرمائی:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ○ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ○ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ○ وَّامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ○ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ○

"ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ کمایا ہوا، عنقریب اسے آگ میں ڈالا جائے گا اور اس کی بیوی لکڑی ڈھونے والی کو جس کے گلے میں بندھی ہوئی رسّی ہے"۔

قریش کا ردِ عمل

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی خبر جیسے ہی مکہ کی فضا میں گونجی ویسے ہی قریش کے اعتراضات شروع ہوگئے۔ چنانچہ جب انھیں یہ محسوس ہوا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرگیا ہے اور ان کے خس وخاشاک جیسے دینی عقائد اور مادی مفاد کے لیے خطرہ ہے تو انھوں نے آپؐ کے پیش کردہ آسمانی دین وآئین کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی۔ ہم یہاں ان کی بعض وحشیانہ حرکات کا ذکر کررہے ہیں:

(الف) مذاکرہ

مشرکین قریش کی شروع میں تو یہی کوشش رہی کہ وہ حضرت ابوطالبؑ اور بنی ہاشم کے مقابلے میں نہ آئیں بلکہ انھیں مجبور کریں کہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت وپشت پناہی سے دست بردار ہوجائیں تاکہ وہ آسانی سے رسولِ اکرمؐ کے مشن کو ناکام بناسکیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ حضرت ابوطالبؑ کو یہ کہنے پر مجبور کردیں کہ ان کے بھتیجے کی تحریک نہ صرف ان (مشرکینِ قریش) کے لیے ضرر رساں ہے بلکہ قوم و برادری میں انھیں جو عزت و حیثیت حاصل ہے اس کے لیے بھی خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

مشرکینِ قریش نے عمار بن ولید بن مغیرہ ایسے خوبرو، تنومند اور وجیہ و جمیل جوان شاعر کو حضرت ابوطالبؑ کی فرزندی میں دینے کی کوشش کی تاکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں اور آپ کو ان کے حوالے کردیں۔

حضرت ابوطالبؑ نے ان کی ہر بات کا نفی میں جواب دیا اور اس کام کے لیے کسی بھی شرط پر آمادہ نہ ہوئے کہ رسولِ خدا کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔

(ب) لالچ:

سردارانِ قریش کو جب پہلے ہی مرحلے میں شکست و ناکامی ہوئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ چراغِ نبوت کو خاموش کرنے کے لیے داعیِ حق کو مال و دولت کا لالچ دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت پہلے وہ حضرت ابوطالبؑ کے پاس پہنچے اور یہ شکوہ و شکایت کرتے ہوئے کہ ان کے بھتیجے (حضرت محمدؐ) نے ان کے دیوتاؤں کے خلاف جو رویہ اختیار کیا ہے وہ بہت ہی نازیبا ہے۔ لہٰذا اگر حضرت محمدؐ ہمارے دیوتاؤں کی مخالفت سے باز آجائیں تو ہم انھیں دولت سے مالامال کردیں گے۔ ان کی اس پیش کش کے بارے میں رسولِ خدا نے جواب دیا:

خداوند تعالیٰ نے مجھے دنیا اور زراندوزی کے لیے انتخاب نہیں فرمایا ہے بلکہ مجھے اس لیے منتخب کیا ہے کہ لوگوں کو اس کی جانب آنے کی دعوت دوں اور اس مقصد کی طرف ان کی رہبری کروں۔ یہ بات آپ نے دوسری جگہ ان الفاظ میں فرمائی ہے:

چچا جان! خدا کی قسم! اگر وہ سورج کو میرے داہنے ہاتھ اور چاند کو بائیں ہاتھ میں رکھ دیں تو بھی میں نبوت سے دست بردار ہونے والا نہیں۔ اس خدائی تحریک کو فروغ دینے کے لیے میں جان کی بازی تو لگا سکتا ہوں مگر اس سے دست کش ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

سردارانِ قریش نے اگلے مرحلے پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ براہ راست پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گفتگو کریں گے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت انھوں نے اپنا نمائندہ آپؐ کی خدمت میں روانہ کیا اور

آپ کو اپنے مجمع میں آنے کی دعوت دی۔ جب رسولِ خدا ان لوگوں میں پہنچ گئے تو کفارِ قریش نے آپؐ کے رویے کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپؐ کو مال و دولت کی تمنا ہے تو ہم اتنا مال و متاع دینے کے لیے تیار ہیں کہ آپؐ دولت مندوں میں سب سے زیادہ مال دار ہو جائیں۔ اگر آپ کو جاہ و امارت کی خواہش ہے تو ہم آپؐ کو اپنا امیر و سردار بنانے کے لیے تیار ہیں، اور ایسے مطیع فرمانبردار بن کر رہیں گے کہ آپؐ کی اجازت کے بغیر معمولی سا بھی کام نہ کریں گے اور اگر آپؐ کے دل میں حکومت اور سلطنت کی آرزو ہے تو ہم آپؐ کو اپنا حکمران و فرماں روا تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔

یہ سن کر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

میں مال و دولت جمع کرنے، تمھارا سردار بننے اور تختِ سلطنت پر پہنچنے کے لیے منتخب نہیں کیا گیا ہوں۔ خداوند تعالیٰ نے مجھے پیغمبرؐ کی حیثیت سے تمھارے پاس بھیجا ہے اور مجھ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے، مجھے تمھارے پاس جنت کی خوشخبری دینے اور عذابِ دوزخ سے ڈرانے کے لیے مقرر کیا ہے، جس پیغام کو پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے اسے میں نے تم تک پہنچا دیا ہے۔ اگر تم میری بات مانو گے تو تمھیں دنیا و آخرت کی خوشیاں نصیب ہوں گی، اور اگر تم میری بات کو قبول کرنے سے انکار کرو گے تو میں اس راہ میں اس وقت تک اِستقامت و پائیداری سے کام لوں گا کہ خداوند تعالیٰ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کر دے۔

(ج) تہمت و اِفترا پردازی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرشتوں جیسے چہرۂ مبارک کو داغ دار کرنے کے لیے قریش نے جو پست طریقے اختیار کیے، ان میں سے ایک احمقانہ حربہ آپؐ پر تہمتیں لگانا بھی تھا، چنانچہ آپؐ کو دروغ گو یا جنونی ہونے سے زیادہ ساحر و جادوگر سمجھنے لگے تھے اور یہ کہتے پھرتے تھے کہ اس شخص کے پاس کوئی ایسا جادو ہے جس کے ذریعے یہ شخص باپ، بیٹوں، بیوی و شوہر، دوستوں اور رشتہ داروں کے درمیان جدائی پیدا کر دیتا ہے۔

قرآن مجید نے ایسی تہمتوں کے بارے میں کئی جگہ اشارہ کیا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی متبرک و مقدس ذات کو اس قسم کے اتہامات و الزامات سے منزہ و مبرا قرار دیا ہے۔

ایک آیت میں پیغمبر اکرم ﷺ کی یہ کہہ کر دلجوئی کی ہے کہ یہ پست شیوہ ان ہی کفار کی خصوصیت نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی دشمنانِ انبیاءؑ اسی قسم کے حربے استعمال کر چکے ہیں۔

كَذٰلِكَ مَآ أَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ○ اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ○ (سورۂ ذاریات: آیت ۵۲-۵۳)

''یوں ہی ہوتا رہا ہے ان سے پہلے کی قوموں کے پاس بھی کوئی رسولؐ ایسا نہیں آیا جسے انھوں نے یہ نہ کہا ہو کہ یہ ساحر ہے یا مجنون، کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کرلیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں''۔

(د) شکنجہ وایذا رسانی

آپ کی طرف اتہامات و ناشائستہ حرکات کی نسبت دینے کے ساتھ ہی انھوں نے آپ کو ایذا رو آزار رسانی بھی شروع کردی اور انھوں نے ایذا و آزار رسانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ قریش کا یہ غیر انسانی طرز عمل نہ صرف پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ تھا بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھتے تھے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کو ابولہب، اس کی بیوی اُمِ جمیل، حکم ابن ابی العاص، عقبہ ابن ابی معیط اور ان کے ساتھیوں نے دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ایذا و تکلیف پہنچائی۔

ایک مرتبہ رسولؐ خدا تبلیغ اسلام کے لیے بازار (عکاظ) کی جانب تشریف لے جارہے تھے کہ ابولہب بھی آپؐ کے پیچھے پیچھے ہولیا اور چلا چلا کر کہنے لگا: لوگو! میرا یہ بھتیجا جھوٹا ہے، اس سے بچ کر رہنا۔

قریش آوارہ لڑکوں اور اپنے اوباش غلاموں کو پیغمبر اکرم ﷺ کے راستے پر بٹھا دیتے اور جب آنحضرتؐ اس راستے سے گزرتے تو سب آپؐ کے پیچھے لگ جاتے، آپؐ کا مذاق اُڑاتے۔ جس وقت آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو آپؐ پر اُونٹ کی اُوجھڑی میں سے فضلہ انڈیل دیتے۔ رسول اکرم ﷺ نے دشمن کے ہاتھوں ایسی سختیاں برداشت کیں کہ ایک مرتبہ زبانِ مبارک پر آہی گیا:

مَا أُوذِيَ أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُوذِيتُ فِي اللهِ

"راہِ خدا میں کسی بھی پیغمبر کو اتنی اذیتیں نہیں دی گئی ہیں جتنی مجھے دی گئی ہیں"۔

صحابہ رسولؐ کے بارے میں بھی انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر نو قبیلہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنے کے لیے انھیں ہر طرح کی ایذا و تکلیف پہنچائیں تاکہ وہ مجبور ہو کر اپنے نئے دین و آئین سے دست کش ہو جائیں۔

یاسرؓ، ان کی اہلیہ سمیہ اور فرزند عمارؓ، جنابِ ابن ارتؓ، عامر ابن فہیدہؓ اور بلالؓ حبشی نے دیگر مسلمانوں کے مقابل زیادہ مصائب و تکالیف برداشت کیں۔

سمیہؓ پہلی خاتون تھیں جو فرعونِ قریش ابوجہل کی طاقت فرسا ایذا رسانی و شکنجہ کے باعث اس کے نیزے کی نوک سے زخمی ہو کر شہید ہو گئیں۔ ان کے شوہر یاسرؓ دوسرے شہید تھے جو راہِ اسلام میں شہید ہوئے۔ عمارؓ نے گر تقیہ نہ کیا ہوتا تو وہ بھی قتل کر دیے جاتے۔

اُمیہ ابنِ خلف اپنے غلام بلالؓ کو بھوکا پیاسا مکہ کی دوپہر میں تپتے ہوئے ریت پر لٹا دیتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ کر کہتا تھا کہ یا تُو لات و عزیٰ کی پوجا کر، ورنہ تو اسی حالت میں مرجائے گا۔ مگر حضرت بلالؓ سخت تکالیف میں بھی یہی جواب دیتے: اَحَدٌ اَحَدٌ۔

اس کے علاوہ بھی دیگر مسلمانوں کو قید و بند میں رکھ کر سخت زد و کوب کر کے، بھوک پیاس سے تڑپا کر اور گلے میں رسّی باندھ کر جانوروں کی طرح کوچہ و بازار میں گھسیٹتے اور ہر قسم کی ایذا و تکلیف پہنچاتے تھے۔

قریش کی سازشیں

حبشہ کی طرف ہجرت

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچنے سے لوگوں کو روکنا

گرد و نواح سے وہ لوگ جن کے دلوں میں دینِ اسلام کی محبت پیدا ہو گئی تھی پیغمبر اکرمؐ سے ملاقات کرنے کی خاطر مکہ آتے، مگر مشرکین انھیں پیغمبر اکرمؐ تک پہنچنے سے منع کرتے تاکہ دینِ اسلام کے اثر و نفوذ کو روک سکیں۔ وہ ہر حیلے اور بہانے سے انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتے کہ دینِ اسلام قبول نہ کریں اور رسولؐ خدا سے الگ رہیں۔ یہاں بطورِ مثال ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

اعشیٰ زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر تھے۔ انھیں اجمالی طور پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزولِ وحی اور آپؐ کی اسلامی تعلیمات کا علم ہو گیا تو انھوں نے آنحضرتؐ کی شان میں قصیدہ کہا اور اسے لے کر مکہ کی جانب روانہ ہوئے، تاکہ دینِ اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کر سکیں۔ جس وقت وہ مکہ میں داخل ہوئے تو مشرکین ان سے ملنے آئے اور ان کے مکہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ جب انھیں اعشیٰ کے قصد و ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے اپنی فطری شیطنت و جبلی حیلہ گری کے ذریعے انھیں رسولؐ کے ساتھ ملاقات کرنے سے روکا۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس وقت تو واپس اپنے شہر چلے جائیں اور آئندہ سال پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر دینِ اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کریں گے، مگر موت نے انھیں اس سعادت کی مہلت نہ دی اور سال ختم ہونے سے پہلے انتقال کر گئے۔

قرآن سے مقابلہ

دشمنانِ اسلام کو جب یہ علم ہوا کہ آسمانی دین و آئین کی تبلیغ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

کامیابی کا اہم ترین عامل آیاتِ الٰہی کی وہ معنوی کشش ہے جو لوگوں کے قلوب پر اثر کرتی ہے اور انھیں اپنا گرویدہ بنالیتی ہے تو انھیں یہ طفلانہ تدبیر سوجھی کہ لوگوں کو قرآن کی جانب متوجہ ہونے سے روکیں اور اس کتابِ مقدس کی مقبولیت اور دلچسپی کو ختم کر دیں۔

نضر بن حارث کا شمار ان دشمنانِ اسلام میں ہوتا ہے جو رسولِ خدا کو بہت زیادہ ایذا و آزار پہنچایا کرتے تھے۔ جب اس نے حیرہ کا سفر کیا تو اس نے وہاں رستم واسفندیار کی داستانیں سن لی تھیں۔ چنانچہ قریش نے اسے اس کام پر مقرر و معین کیا کہ جب مسجد الحرام میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تبلیغی پروگرام ختم ہو جایا کرے تو وہ آنحضرتؐ کی جگہ جا بیٹھے اور لوگوں کو رستم اور اسفندیار کی داستانیں سنائے۔ شاید اس طریقے سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبے کو کم کیا جاسکے اور آپؐ کے پند و وعظ نیز آیاتِ الٰہی کو بے قدر و قیمت بنایا جاسکے۔ وہ بڑی ہی گستاخی اور دیدہ دلیری سے کہتا: لوگو! تم میری طرف آؤ، میں تمھیں محمدؐ سے کہیں بہتر قصے اور کہانیاں سناؤں گا۔

اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ گستاخی اور بے باکی میں اس سے کہیں آگے بڑھ گیا اور اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ وہ لوگوں سے کہتا: میں بھی جلد ہی وہ چیز اُتاروں گا جو محمدؐ کا خدا اس پر نازل کیا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ مجید میں چند آیات موجود ہیں، بطورِ نمونہ ہم ایک کا ذکر کر رہے ہیں:

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ○ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ (سورہ فرقان: آیت ۵-۶)

"کہتے ہیں: یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں، جنھیں لکھوا لیا ہے جنھیں صبح و شام ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ اسے اس نے نازل کیا ہے جو زمین و آسمان کا راز جانتا ہے اور بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے"۔

قرآنِ مجید کے خلاف مشرکین نے دوسرا محاذ یہ تیار کیا کہ انھوں نے اپنے پیروکاروں کو یہ حکم دیا کہ جس وقت رسولِ خدا قرآنِ مجید کی تلاوت فرماتے ہیں تو اسے نہ صرف سنا ہی نہ جائے بلکہ ایسا شور و غل بپا کیا جائے کہ دوسرے لوگ بھی اسے سننے سے باز رہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (سورۂ حم السجدہ: آیت ۲۶)

"اور کافر ایک دوسرے سے یہ کہتے ہیں: اس قرآن پر کان نہ لگاؤ اور جب پڑھا جائے تو شور وغل بپا کیا کرو، شاید تم کامیاب ہو جاؤ"۔

اگرچہ رسولؐ خدا اور بنی ہاشم میں چند حضرات حضرت ابوطالبؑ کی زیرِ حمایت کچھ حد تک دشمنوں کی گزند سے بالخصوص جسمانی آزار وایذا سے محفوظ تھے مگر بے پناہ اور بے یار ومددگار مسلمان ایذارسانی اور شکنجہ کشی کی انتہائی سخت تکالیف ومشکلات سے گزر رہے تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یہ بات سخت شاق و ناگوار تھی کہ آپؐ کے اصحاب وہم نوا ایسی سخت مشقت میں مبتلا رہیں اور ہر طرح کے مصائب وآلام سے گزرتے رہیں۔ دوسری طرف اس بات کا بھی امکان تھا کہ اگر یہی کیفیت برقرار رہی تو ہوسکتا ہے کہ نومسلم اپنے عقیدے میں سست ہو جائیں۔

اس کے علاوہ یہی حالت دوسرے لوگوں کو اسلام کی جانب مائل ہونے سے روک بھی سکتی تھی۔ چنانچہ ان حالات کے پیشِ نظر یہ لازم سمجھا گیا کہ اس دیوار کو بھی گرا دیا جائے تاکہ قریش یہ جان لیں کہ قوت اسلام ان کی حدِ تصور اور تسلط واقتدار سے کہیں زیادہ بالا وبرتر ہے۔

اس گھٹن اور دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ وہ ترکِ وطن کر کے حبشہ چلے جائیں۔ اس ملک کے انتخاب کیے جانے کی چند وجوہ تھیں:

مہاجرین کا وہ پہلا گروہ جو پندرہ افراد پر مشتمل تھا۔ عثمان ابن مظعون کی زیرِ سرپرستی ماہِ رجب میں بعثت کے پانچویں سال اس عیسائی ملک کی جانب روانہ ہوا، اور دو ماہ بعد واپس مکہ آ گیا۔

دوسرے گروہ میں تراسی (۸۳) مرد، اٹھارہ (۱۸) عورتیں اور چند بچے شامل تھے۔ یہ گروہ حضرت جعفر ابن ابی طالبؑ کی زیرِ سرپرستی ہجرت کر کے حبشہ چلا گیا، جس کا وہاں کے فرماں روا نجاشی نے بہت پرتپاک طریقے سے استقبال کیا۔

قریش کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے عمر بن عاص اور عبداللہ ابن ابی ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر حبشہ روانہ کیا۔ ان کے ہاتھ نجاشی بادشاہ اور اس کے امراء کے لیے بہت سے عمدہ تحفے

بھی بھیجے اور اس سے یہ درخواست کی کہ پناہ گزیں مسلمانوں کو واپس کر دیا جائے۔

قریش کے نمائندوں نے نجاشی بادشاہ اور اس کے امراء کو مسلمانوں کی طرف سے بدظن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بہت چاہا کہ مہاجرین مسلمانوں کو واپس کر دیا جائے، مگر انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اور وہ نجاشی بادشاہ کو ہم خیال نہ بنا سکے۔

نجاشی بادشاہ نے جب مہاجرین کے نمائندے حضرت جعفر ابن ابی طالبؓ کی دلچسپ اور منطقی باتیں سنیں اور حضرت جعفرؓ نے جب اس کے سامنے آیاتِ کلام اللہ کی قرأت کی تو وہ انھیں سن کر مسلمانوں پر فریفتہ اور ان کے عقائد کا دالہ وشیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے سرکاری طور پر مسلمانوں کی کھلم کھلا حمایت کا اعلان کر دیا اور قریش کے نمائندوں کو حکم دیا کہ اس کے ملک سے باہر نکل جائیں۔

ملک حبشہ میں مہاجرین انتہائی آرام اور سہولت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ چنانچہ جب رسولِ خدا ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو وہ بھی آہستہ آہستہ وہاں واپس آ کر آنحضرتؐ سے مل گئے۔

اس ہجرت کے فوائد اور برکتیں

ترکِ وطن کر کے حبشہ کی جانب روانہ ہونے اور اس ملک میں کافی عرصے تک قیام کرنے کے باعث مسلمانوں کو بہت سے فائدے ہوئے اور وہاں انھیں بہت سی برکات حاصل ہوئیں، جن میں سے چند کا ہم ذیل میں ذکر کریں گے:

١. جو مسلمان ترکِ وطن کر کے حبشہ چلے گئے تھے انھیں قریش کے مظالم سے نجات مل گئی اور مشرکین مکہ کی شکنجہ کشی وایذا رسانی سے محفوظ ہو گئے۔
٢. اسلام کا پیغام اور اعلانِ رسالتؐ اہلِ حبشہ بالخصوص حبشہ کے بادشاہ اور اس کے درباریوں تک پہنچ گیا۔
٣. قریش کی رُسوائی ہوئی اور ان کے وہ نمائندے جو نجاشی بادشاہ کے پاس گئے تھے ذلیل وخوار ہو کر وہاں سے نکلے۔
٤. حبشہ کے لوگوں کے درمیان دینِ اسلام کی تبلیغ وتوضیح کا میدان ہموار ہو گیا۔ عیسائیوں

کے ساتھ مسلم مہاجرین کی اسلامی راہ وروش، شرافت مندانہ طرزِ زندگی اور اسلامی احکام کی سخت پابندی اس امر کا باعث ہوئی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حبشہ کے لوگ دینِ اسلام کے شیدائی ہونے لگے۔ چنانچہ آج ایتھوپیا (حبشہ سابق) اری ٹیریا اور صومالیہ میں جو کروڑوں مسلمان آباد ہیں وہ مسلمانوں کی ہجرت کا ہی فیض ہے۔

اقتصادی ناکہ بندی

صرف قبائل اور اندرونِ حجاز ہی میں نہیں بلکہ اس کی حدود کے باہر بھی اسلام کی مقبولیت نیز ملکِ حبشہ میں مہاجرین کی کامیاب پناہ گزینی نے قریش کے سرداروں کو مجبور کیا کہ تحریکِ اسلام کو روکنے کے لیے کوئی قدم اُٹھائیں۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ایسے معاہدے پر دستخط کرائے جائیں جس کی روح سے "بنی ہاشم" اور "بنی مطلب" کے ساتھ مکمل تعلقات قطع ہوجائیں اور ان کے ساتھ کاروبار بند کردیا جائے اور کوئی شخص بھی ان کے ساتھ کسی طرح کا سروکار نہ رکھے۔

قریش نے جو تحریری معاہدہ تیار کیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ یا تو حضرت ابوطالبؑ مجبور ہوکر رسولؐ کی حمایت وسرپرستی سے دست بردار ہوجائیں (نیز آپ کو قریش حوالے کردیں) یا رسولِؐ خدا لوگوں کو دعوتِ حق دینا ترک کردیں اور قریش کی تمام شرائط کو مان لیں۔ یہاں تک کہ آپ کے حامی وطرفدار گوشہ نشینی وروپوشی کی حالت میں بھوک وپیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجائیں۔

قریش نے اس معاہدے کا نام (صحیفہ) رکھا جس پر چالیس سربرآوردہ اشخاص نے دستخط کیے اور اسے کعبہ کی دیوار پر نصب کردیا گیا۔ تاکید کی گئی تھی کہ تمام لوگ اس کے اندراجات پر حرف بحرف عمل پیرا ہوں۔

حضرت ابوطالبؑ کو جب "معاہدہ صحیفہ" کا علم ہوا تو انھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ رسالت کی تائید میں چند اشعار کہے، جن میں انھوں نے تاکید کے ساتھ پیغمبرؐ خدا کی حمایت و پشت بانی کا ازسرِنو اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے "بنی ہاشم" اور "بنی مطلب" سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مکہ کو خیرباد کہہ کر شہر کے باہر اس درے میں جابسیں جو شہر کے باہر واقع ہے۔ یہی درہ بعد میں "شعب ابوطالبؑ" کے نام سے مشہور ہوا۔

"ابولہب" کے علاوہ "بنی ہاشم" اور "بنی مُطلب" کے سب ہی افراد بعثت کے ساتویں سال رات کے وقت "شعب ابوطالب" میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے چھوٹے گھر اور سائبان بنائے۔ وہ حُرمت کے مہینوں (رجب، ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم) کے علاوہ تمام سال اس درے میں محصور رہتے تھے۔

شعب ابوطالبؑ میں مسلمانوں پر ایسے سخت دن گزر گئے کہ کبھی کبھی تو انھیں پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے درختوں کے پتّوں پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔

ان مہینوں کے درمیان جو حُرمت کے مہینوں کے نام سے مشہور ہیں اگرچہ قریش ان سے کوئی باز پُرس نہ کرتے البتہ دوسرے طریقوں سے انھیں پریشان کیا جاتا۔ انھوں نے مسلمانوں کی قوتِ خرید کو تباہ کرنے کے لیے چور بازاری کا دھندا شروع کر دیا، اور کبھی کبھی تو وہ دکانداروں کو یہ تنبیہ کرتے کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہ کریں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ان چار مہینوں سے الگ جو کہ حُرمت کے مہینے کہلاتے ہیں، کبھی کبھی چھپ کر مکہ جاتے اور وہاں سے کھانے کا سامان جمع کر کے شعب ابوطالبؑ میں لاتے تھے۔

حضرت ابوطالبؑ کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر وقت فکر دامن گیر رہتی تھی کیونکہ انھیں خطرہ تھا کہ کہیں ان کے بھتیجے کی جان پر نہ بن جائے۔ چنانچہ وہ شعب ابوطالبؑ کے بلند مقامات پر پہرہ دار مقرر کرنے کے علاوہ پیغمبرؐ کو اپنے بستر پر سُلاتے، اور جب سب سو جاتے تو وہ اپنے فرزند حضرت علی علیہ السلام کو رسولؐ خدا کے بستر پر سونے کے لیے کہتے اور رسولؐ خدا کو یہ ہدایت کرتے کہ آپؐ کہیں اور سو رہیں۔

محاصرے کا خاتمہ

تین سال تک سخت رنج و تکلیف برداشت کرنے کے بعد بالآخر امدادِ غیبی مسلمانوں کے شاملِ حال ہوئی اور جبرائیل امینؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خوشخبری دی کہ خداوند تعالیٰ نے دیمک کو اس عہدنامے پر مسلط کر دیا ہے اور اس نے پوری تحریر کو چاٹ لیا ہے۔ اب صرف اس پر بِاسْمِكَ اَللّٰهُمَّ باقی بچا ہے۔

رسولِ خدا ﷺ نے اس واقعے کی اطلاع اپنے چچا کو دی۔ یہ سن کر حضرت ابوطالبؑ قریش کے مجمعِ عام میں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ جو صحیفہ تم لوگوں نے لکھا تھا اسے پیش کیا جائے۔ اسی ضمن میں مزید فرمایا:

"اگر بات وہی ہے جو میرے بھتیجے نے مجھ سے کہی ہے تو تم اپنے جور و ستم سے باز آجاؤ اور اگر اس کا کہنا غلط اور بے بنیاد ثابت ہوا تو میں خود اسے تمھارے حوالے کروں گا"۔

قریش کو حضرت ابوطالبؑ کی تجویز پسند آئی۔ چنانچہ انھوں نے اس صحیفے کی مہر کو توڑا تو آپ کی بات صحیح ثابت ہوئی۔

قریش کے صاحب فہم و فراست اور عدل و انصاف کو دوست رکھنے والے افراد نے جب یہ معجزہ دیکھا تو انھوں نے قریش کی اس پست و کمینہ حرکت کی سخت مذمت کی جو انھوں نے پیغمبرِ اکرم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کے ساتھ اختیار کر رکھی تھی اور یہ مطالبہ کیا کہ عہدنامہ "صحیفہ" کو باطل قرار دیا جائے اور محاصرہ ختم کیا جائے۔ چنانچہ اس طرح رسولؐ خدا اور اصحاب تین سال تک استقامت و پائیداری کے ساتھ سخت مصائب برداشت کرنے کے بعد ماہِ رجب کے وسط میں بعثت کے دسویں سال سُرخرو و کامیاب واپس مکہ آگئے۔

رسولِ اکرمؐ کے پاس عیسائیوں کے ایک وفد کی آمد

جو مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے ان کے وہاں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ جب حبشہ یا نجران کے عیسائیوں کو رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنا وفد مکہ روانہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ رسولؐ خدا سے براہِ راست گفتگو کر سکیں۔ یہ پہلا وفد تھا جو مکہ کے باہر سے آیا اور رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا۔

نصاریٰ کا یہ وفد بیس افراد پر مشتمل تھا۔ رسولؐ خدا سے مسجد الحرام میں زیارت و ملاقات سے مشرف ہوا، اور اسی جگہ باہمی گفتگو کا آغاز ہوا۔ جب مذاکرات کا سلسلہ ختم ہوا تو رسولؐ خدا نے قرآن مجید کی ایک آیت تلاوت کر کے انھیں سنائی اور دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

عیسائیوں نے جب آیاتِ قرآنی سنی تو ان کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہوگئیں، اور دینِ

اسلام قبول کرنے کا انھوں نے شرف حاصل کرلیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ رسولِ خدا حضرت محمد ﷺ کے جو اوصاف ان کتابوں میں بیان کیے گئے تے وہ انھیں آپؐ کی ذاتِ مبارک میں نظر آ گئے تھے۔

نمائندگان کا وفد جب رسولِ خدا ﷺ کی ملاقات سے مشرف ہوا کر واپس جانے لگا تو ابوجہل اور قریش کے گروہ نے ان کا راستہ روک لیا اور کہا کہ تم کیسے نادان ہو، تمھاری قوم نے تو تمھیں اس مقصد کے لیے بھیجا تھا کہ وہاں جا کر اصل واقعے کی تحقیق کرو اور ان کا جائزہ لو لیکن تم نے بے خوف وخطر اپنے دین و آئین کو ترک کردیا اور محمد ﷺ کی دعوت کو قبول کرلیا۔

نصاریٰ کے نمائندگان نے کہا کہ ہم تمھارے ساتھ بحث ومباحثہ کرنے کی غرض سے نہیں آئے تھے۔ ہمیں ہمارے آئین مسلک پر رہنے دو۔

حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؑ کی رحلت

جنابِ رسولِ خدا ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کو شعب ابوطالبؑ سے نجات ملی تو اس بات کی اُمید تھی کہ مصائب وآلام کے بعد ان کے حالات سازگار ہو جائیں گے اور خوشی کے دن آئیں گے۔ مگر ابھی دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ دو ایسے تلخ اور جانکاہ صدمات سے دوچار ہوئے جن کے باعث رسولؐ خدا اور اصحابِ رسولؐ پر گویا غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس رنج واندوہ کا سبب حضرت ابوطالبؑ کی رحلت تھی، اور اس کے تین دن یا ایک ماہ بعد آپؐ کی ایثار پسند شریکِ حیات بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؑ کو "حجون" نامی قریش کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ (الصحیح من السیرۃ النبی: ج ۲، ص ۱۲۸)

حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؑ کی رحلت نے رسولِ خدا ﷺ کو بہت متاثر اور غمگین کیا۔ چنانچہ آپؐ نے اس غم والم کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"ان چند دنوں میں اس اُمت پر دو ایسی مصیبتیں نازل ہوئی ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ ان میں سے کس نے مجھے زیادہ متاثر کیا ہے"۔ (یعقوبی)

رسولِ خدا ﷺ کو اپنے واجب الاحترام چچا اور وفا شعار شریکِ حیات کی رحلت کا اس

قدر صدمہ ہوا کہ آپؐ بہت کم گھر سے باہر تشریف لاتے، چونکہ یہ دونوں عظیم حادثات بعثت کے دسویں سال میں واقع ہوئے تھے، لہٰذا ان کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سال کو "عام الحزن" یعنی غم واندوہ کا سال کہا جانے لگا۔ (السیرۃ الحلبیہ: ج ۱، ص ۳۴۷)

حضرت ابوطالبؑ کی مظلومیت

حضرت ابوطالبؑ کو چونکہ اپنے بھتیجے کے اوصافِ حمیدہ کا علم تھا اور اس امر سے بھی واقف تھے کہ آپؐ کو رسالت تفویض کی گئی ہے، اس لیے وہ نہایت خاموشی سے آپؐ پر ایمان لے آئے تھے۔ وہ رسولؐ خدا کی بیالیس سال سے زیادہ عرصے تک حفاظت ونگرانی کرتے رہے، یعنی اس وقت سے جب کہ رسولؐ خدا کا سنِ مبارک آٹھ سال تھا، اور اس وقت تک جب آپؐ پچاس سال کے ہوگئے تھے اور چونکہ حفاظت وحمایت کو اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے لہٰذا آپؐ کے پروانہ وار والہ و شیفتہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے رسولؐ خدا کے آسمانی آئین کی ترویج کی خاطر کبھی جان و مال سے دریغ نہیں کیا، یہاں تک کہ اسی سال کی عمر میں اس وقت انتقال کیا جب کہ آپ کا قلب خدا اور رسولؐ پر ایمان سے منور تھا۔

جیسے ہی حضرت ابوطالبؑ نے رحلت فرمائی، دشمنوں کے آستینوں میں پوشیدہ ہاتھ بھی باہر نکل آئے اور وہ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے کہ صدرِ اسلام کے اس مردِ مجاہد وسخت کوش انسان کی موت بحالت کفر واقع ہوئی ہے تاکہ لوگوں کو یہ باور کرائیں کہ رسولؐ کی حفاظت و حمایت ان کا قومی جذبہ تھا، جس نے انھیں اس ایثار وقربانی پر مجبور کیا تھا۔

حضرت ابوطالبؑ کے ایمان لانے پر شک وشبہ پیدا کرنے میں جو محرک کارفرما تھے اس کی مذہبی عقیدے سے زیادہ سیاسی اہمیت تھی۔ بنی اُمیہ کی سیاسی حکمت عملی کی اساس چونکہ خاندانِ رسالتؐ کے ساتھ دشمنی و کینہ توزی پر قائم تھی اس لیے انھوں نے بعض جعلی روایاتِ پیغمبر اکرم ﷺ سے منسوب کر کے حضرت ابوطالبؑ کو کافر مشہور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ابوطالبؑ کو کافر ثابت کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کے فرزند عزیز حضرت علی علیہ السلام کو عظمت وفضیلت کے اعتبار سے دوسروں پر فوقیت و برتری حاصل نہیں ہے۔ اگر حضرت ابوطالبؑ حضرت علی علیہ السلام کے والد بزرگوار نہ ہوتے تو وہ ہرگز اس بات کا اتنا زیادہ چرچا نہ کرتے اور نہ ہی

اس قدر نمایاں طور پر اتنا جوش و خروش دکھاتے۔

کوئی بھی ایسا انصاف پسند شخص جسے تاریخ اسلام کے بارے میں معمولی سی بھی واقفیت ہوگی اور پیغمبر اکرمؐ کے اس عظیم حامی اور مددگار کی جدوجہد سے لبریز زندگی کے بارے میں علم رکھتا ہوگا وہ اپنے دل میں حضرت ابوطالبؑ کے بارے میں ذرا بھی شک و شبہ کو راہ نہ دے گا، اس کی دو وجہ ہیں:

اوّل: یہ کہ اگر کوئی شخص قومی تعصب کی بنا پر کسی دوسرے شخص یا قبیلے کی حمایت و پشت بانی کرے تو یہ ممکن ہے کہ اسے ذرا سی دیر میں موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے لیکن یہ اس امر کا باعث نہیں ہوسکتا کہ وہ شخص چالیس (۴۰) سال تک نہ صرف حمایت و پشت پناہی کرے، بلکہ اس شخص کا پروانہ وار شیفتہ بھی ہو۔

دوسرے یہ کہ حضرت ابوطالبؑ کے اقوال و اشعار، اخبارِ پیغمبرؐ اور امامت ائمہ معصومین علیہم السلام اس وہم و گمان کی تردید کرتے ہیں اور اس بات پر متفق ہیں کہ رسولِ خدا کی حمایت کا اصل محرک ان کا وہ راسخ عقیدہ اور محکم ایمان تھا جو انھیں رسولؐ کی ذات بابرکات پر تھا۔

چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام کی مجلس میں حضرت ابوطالبؑ کا ذکر آیا تو آپؑ نے فرمایا: مجھے حیرت ہے کہ لوگوں کو حضرت ابوطالبؑ کے ایمان میں شک و تردّد ہے۔ کوئی ایسی عورت جس نے دینِ اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کرلیا وہ اپنے کافر شوہر کے عقد میں نہیں رہ سکتی ہے جب کہ حضرت فاطمہ بنت اسد ان اوّلین خواتین میں سے تھیں جو دینِ اسلام کی سعادت سے مشرف ہوگیں۔ چنانچہ جب تک حضرت ابوطالبؑ زندہ رہے وہ ان سے جدا نہ ہوئے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا: اگر حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کو ترازو کے ایک پلے میں رکھا جائے اور دوسرے پلے میں دیگر لوگوں کے ایمان کو رکھ کر تولا جائے تو یقیناً حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کا پلہ بھاری رہے گا۔ کیا آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے بعض لوگوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ حضرت ابوطالبؑ کی جانب سے فریضۂ حج ادا کریں۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید: ج ۱۴، ص ۶۸)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ حضرت ابوطالبؑ کا ایمان اصحابِ کہف کے ایمان کی طرح تھا، اگرچہ وہ لوگ دل سے ایمان

لے آئے تھے مگر زبان سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ان کے اس عمل کا خداوند تعالیٰ انھیں دوگنا اجر دے گا۔

حضرت ابوطالبؑ نے دینِ اسلام کی ترویج وتبلیغ کے لیے جو خدمات انجام دیں ان کے بارے میں ابن ابی الحدید لکھتا ہے: کسی شخص نے حضرت ابوطالبؑ کے ایمان سے متعلق کتاب لکھی اور مجھ سے کہا کہ اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرو اور اس پر اپنے ہاتھ سے کچھ لکھوں۔

میں نے کچھ اشعار اس کتاب کی پشت پر لکھ دیے جن کا مضمون یہ تھا:

لَوۡلَا اَبُوۡطَالِبٍ وَابۡنُهٗ لَمَا مِثلُ الَّذِیۡنَ شَخصًا فَقَامَا فَذَاكَ بِمَكَّةَ

آوٰی وَحَامِیۡ وَهٰذَا بِیَثۡرَبَ جَسَّ الحِمَامَا

"اگر ابوطالبؑ اور ان کے فرزند علیؑ نہ ہوتے دینِ اسلام ہرگز قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ باپ نے مکہ میں پیغمبرؐ کی حمایت کی اور بیٹا یثرب (مدینہ) میں موت کی حد تک آگے بڑھ گیا"۔

معراج

یثرب کے لوگوں کی دینِ اسلام سے واقفیت

معراج

تاریخ اسلام کے اس دور میں (بعثت سے عہد ہجرت تک) جو اہم واقعات رُونما ہوئے ان میں سے ایک واقعہ معراج بھی ہے۔ یہ کب پیش آیا اس کی صحیح و دقیق تاریخ کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ بعثت کے چھٹے ماہ بعد اور بعض کی رائے میں بعثت کے دوسرے، تیسرے، پانچویں، دسویں، گیارہویں یا بارہویں سال میں رُونما ہوا۔ (الصحیح من السیرۃ: ج ا، ص ۲۶۹، ۲۷۰)

جب ہم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دو عنوان آتے ہیں: ان میں سے ایک اسراء ہے اور دوسرا معراج۔

اسراء یا رات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ سفر ہے جو مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے بارے میں قرآنِ مجید کا صریح ارشاد ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا (سورۂ بنی اسرائیل: آیت ۱)

"پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے ماحول کو اس نے برکت دی تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے"۔

جملہ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اس حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ یہ سفر خداوند تعالیٰ کی قدرت کے پرتو

میں انجام پایا تھا۔

جملہ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا سے یہ مطلب واضح ہے کہ اس سیر کی علت ذاتِ خداوندی تھی اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ رات کے وقت ہوئی۔ اس کے علاوہ لفظ لَیْلًا سے بھی وہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے جو لفظ اسریٰ سے سمجھ میں آتا ہے۔ کیوں کہ عربی میں یہ لفظ رات کے وقت سفر کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ "سفر" جسمانی تھا۔ اگر روحانی ہوتا تو اس کے لیے لفظ بِعَبْدِہٖ کے ذکر کی ضرورت پیش نہ آتی۔

مذکورہ آیت کی رُو سے اس "سفر" کا آغاز "مسجد الحرام" سے ہوتا ہے اور اختتام "مسجد الاقصیٰ" پر اور آخر میں اس سفر کا یہ مطلب بتایا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ کو اپنی نشانیاں دکھانا مقصود تھیں۔

"معراج" اور ملکوتِ اعلیٰ کی سیر کے بارے میں بہت سے محدثین اور مورخین کے نظریات کی بنیاد پر تحقیقات کی جا چکی ہیں، اگرچہ سب کی متفقہ رائے یہی ہے کہ شبِ معراج شبِ اسراء ہی ہے۔ (تاریخ پیغمبرؐ، مؤلفہ مرحوم امین: ص ۱۰۹)

ہر چند مذکورہ بالا آیات سے پورے طور پر یہ مفہوم واضح نہیں ہوتا لیکن سورۂ نجم کی آیت اور بہت سی ان روایات کی مدد سے جو معراج کے متعلق ہم تک پہنچی ہیں، یہ ثابت ہو جاتا ہے۔

چنانچہ علامہ مجلسی مرحوم متعلقہ آیات بیان کرنے کے بعد معراج کے بارے میں لکھتے ہیں:

"رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیت المقدس کی جانب عروج کرنا اور وہاں سے ایک ہی رات میں آسمانوں پر پہنچنا اور وہ بھی بدنِ مبارک کے ساتھ ایسا موضوع ہے جس کے بارے میں ایسی آیات اور متواتر شیعہ سُنّی روایات ہم تک پہنچی ہیں جو اس واقعے کے وقوع پر دلالت کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار کرنا یا روحانی معراج کی تاویل پیش کرنا یا اس واقعے کا خواب میں رُونما ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کہنے والے نے پیشوایانِ دین کی کتابوں کا کم تتبع کیا ہے اور یا یہ بات اس کی ایمان کی کمزوری وضعف اعتقاد پر مبنی ہے۔ (بحار: ج ۱۸، ص ۲۸۹)

حضرتِ ابوطالبؑ کی وفات کے بعد قریش کا ردِ عمل

حضرت ابوطالبؑ کی رحلت کے بعد قریش کی گستاخیاں بڑھ گئیں اور وہ بہت زیادہ بے

باک ہوگئے۔ پہلے سے کہیں زیادہ رسولِ خدا کو آزار و تکلیف پہنچانے لگے۔ دینِ اسلام کی تبلیغ کے لیے انھوں نے آپؐ پر سخت پابندیاں لگادیں اور اس کا دائرہ بہت محدود کر دیا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپؐ حج کے زمانے کے علاوہ اپنے دین و آئین کی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمانا کہ "جب تک ابوطالبؑ زندہ رہے قریش مجھے ایسی گزند نہیں پہنچا سکے جو میرے لیے سخت ناگوار ہوتی۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۲، ص ۵۸)

اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے بعد قریش کی جانب سے ایذا رسانی اور شکنجہ کشی کی واردات میں اضافہ ہوگیا تھا، مگر ان سختیوں اور پابندیوں کے باوجود رسولِ خدا ان مہینوں میں جو ماہِ حرام قرار دیے گئے تھے موقع غنیمت سمجھتے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے۔ چنانچہ حج کے تین ماہ کے دوران "عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز" کے بازاروں کے علاوہ جہاں بھی لوگ جمع ہوتے رسولِ خدا ان کے پاس تشریف لے جاتے۔ وہاں سردارانِ قبائل نیز سربرآوردہ اشخاص سے ملاقات کرتے اور ہر ایک کو آسمانی آئین کی دعوت دیتے تھے۔

ان ملاقاتوں کی وجہ سے ہر چند رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی جاتی اور ان کے بعد سردارانِ قبائل کا ردِعمل ظاہر ہوتا۔ لیکن مخالفت اور ردِعمل کے باوجود یہ ملاقاتیں نہایت ہی مفید اور ثمر بخش ثابت ہوئیں۔ کیونکہ کوئی بھی فرد یا قبیلہ ایسا نہ ہوتا جو مکہ میں داخل ہوتا اور اس تک کسی نہ کسی طرح رسولِ خدا کی دعوت کا پیغام نہ پہنچتا۔ چنانچہ فریضۂ حج کے ادا کرنے کے بعد جب وہ لوگ واپس اپنے اپنے گھروں کو جاتے تو وہ اس دعوت و ملاقات کو دورانِ حج کے اہم واقعے یا خبر کی صورت میں دوسروں کے سامنے بیان کرتے۔

قبیلہ بنی عامر بن صعصعہ ان مشہور قبائل میں سے تھا جس کے افراد کو رسولِ خدا نے وحدت پرستی کی دعوت دی۔

"بحیر ابن فراس" کا شمار اس کے قبیلے کے سربرآوردہ اشخاص میں ہوتا تھا۔ اسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہرت اور قدر و منزلت کے بارے میں کم و بیش علم تھا۔ اس نے جب یہ بات سنی تو کہنے لگا: خدا کی قسم! اگر قریش سے میں اس نوجوان کو حاصل کرلوں تو اس کے ہاتھوں میں عرب کو نگل جاؤں گا۔ (یعنی اس کے ذریعے دُنیوی مال و متاع حاصل کروں گا)۔

چنانچہ یہ سوچ کر وہ رسولِ خدا کے پاس آیا اور کہنے لگا: کہ اگر ہم تمہارے ہاتھ پر بیعت

کرلیں اور تمھارا خدا ہمیں تمھارے مخالفین پر کامیاب بھی کردے تو کیا تمھاری قوم کی رہبری و سرداری ہمیں واگزار کردی جائے گی؟ اس پر رسولِ خدا نے فرمایا: "یہ خدا کا کام ہے وہ جسے اہل سمجھے گا اسے جانشین مقرر کرے گا"۔

بیحرہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ جواب سنا تو کہنے لگا: ہم تمھاری خاطر عربوں سے جنگ کریں اور جب کامیاب ہوجائیں تو قوم کی رہبری دوسروں کے ہاتھوں میں چلی جائے۔ ایسی جنگ اور رہبری سے ہم باز آئے۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۱، ص ۱۶)

رسولِ اکرمؐ کی اس گفتگو کے اہم نکات

۱۔ عام مشاہدہ ہے کہ اہلِ سیاست اقتدار حاصل کرنے سے قبل عوام و قوم سے بڑے بڑے وعدے کرتے ہیں جنھیں وہ کبھی پورا نہیں کرتے لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موجودہ سیاست کی روش کے برعکس قبیلہ "بنی عامر" کی اس شرط پر کسی قسم کا وعدہ نہیں کیا۔

۲۔ قولِ پیغمبرؐ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ مسئلہ امامت امرِ الٰہی پر منحصر ہے اور خداوند تعالیٰ جسے اس کا اہل سمجھے گا اسے پیغمبرؐ کا جانشین مقرر کرے گا۔

یثرب (مدینہ) کے لوگوں کی دینِ اسلام سے واقفیت

جس وقت بنی ہاشم اور بنی مطلب شعب ابوطالبؑ میں محصور تھے اس وقت یثرب سے اسعد ابن زرارہ اور ذکوان ابن عبدالقیس قبیلہ خزرج کا نمائندہ بن کر مکہ میں اپنے حلیف "عتبہ ابن ربیعہ" کے پاس آئے اور قبیلہ اوس سے جنگ کے سلسلے میں مدد چاہی۔

عتبہ نے مدد کرنے سے عذر ظاہر کیا اور کہا کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان طویل فاصلہ ہونے کے علاوہ ہم یہاں ایسی مصیبت میں گرفتار ہیں کہ جس سے نجات پانے کے لیے ہمارا کوئی بس نہیں چل رہا ہے۔ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کی تبلیغی سرگرمیوں کے واقعات قبیلہ "خزرج" کے نمائندگان کو بتائے اور تاکید سے کہا کہ وہ آنحضرتؐ سے ہرگز ملاقات نہ کریں، کیونکہ وہ شخص ساحر وجادوگر ہے اور اپنی باتوں سے لوگوں کو رام کرلیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے "اسعد" کو حکم دیا کہ جس وقت کعبہ کا طواف کرے تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لے تاکہ پیغمبر کی آواز اس کے کانوں میں نہ پہنچے۔

اسعد طوافِ کعبہ کے ارادے سے مسجد الحرام میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ "حجر اسماعیل" پر تشریف فرما ہیں۔ اس نے خود سے کہا کہ میں بھی کیسا نادان ہوں۔ بھلا ایسی خبر مکہ میں گرم ہو اور میں اس سے بے خبر رہوں۔ میں بھی تو سنوں کہ یہ شخص کیا کہتا ہے تاکہ واپس اپنے وطن جا کر لوگوں کو اس کے بارے میں بتاؤں۔ رسولِ خدا کی باتیں سننے کی خاطر اس نے روئی اپنے کانوں سے نکال دی اور رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آنحضرتؐ نے اسے دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جسے انھوں نے قبول کیا اور ایمان لے آئے۔ اس کے بعد "ذکوان" نے بھی دینِ اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کر لیا۔ (الصحیح من السیرۃ النبی: ج ۲، ص ۱۹۰-۱۹۱)

اہلِ یثرب میں یہ پہلے دو افراد تھے جو ایمان لائے اور دینِ اسلام سے مشرف ہو کر واپس اپنی قوم میں پہنچے۔ دوسرے مرحلے پر اہلِ یثرب میں وہ چھے اشخاص جن کا تعلق "خزرج" سے تھا۔ بعثت کے گیارہویں سال دورانِ حج پیغمبر اکرمؐ کی ملاقات سے مشرف ہوئے۔

رسولِ خدا نے انھیں دینِ اسلام کی دعوت دی اور قرآنِ مجید کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی۔ وہ رسولِ خدا کی ملاقات کا شرف حاصل کر کے اور آپؐ کی زبانِ مبارک سے بیانِ حق سن کر ایک دوسرے سے کہنے لگے: خدا کی قسم! یہ وہی پیغمبر ہے جس کے ظہور کی خبر دے کر یہودی ہمیں خوف دلایا کرتے تھے۔ آؤ! پہلے ہم ہی دینِ اسلام قبول کر لیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کارِ خیر میں وہ ہم پر سبقت لے جائیں۔ یہ کہہ کر ان سب نے دینِ اسلام اختیار کر لیا۔ جب وہ واپس یثرب گئے تو انھوں نے اپنے عزیز و اقارب کو بتایا کہ انھوں نے کیسے رسولِ خدا سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور انھیں بھی دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

تیسرے مرحلے پر اہلِ یثرب میں سے بارہ اشخاص جن میں سے دس کا تعلق قبیلہ "خزرج" سے تھا اور دوسرے کا قبیلہ "اوس" سے۔ بعثت کے بارہویں سال "عقبہ منا" میں رسولِ خدا کی ملاقات سے شرف یاب ہوئے۔ ان بارہ اشخاص میں سے جابر ابن عبداللہ کے علاوہ پانچ افراد وہ تھے جو کہ ایک سال قبل بھی رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کر چکے تھے۔

ان اشخاص نے دینِ اسلام قبول کرنے کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ کے دست مبارک پر

بیعت نساء کے طریقے پر بیعت کی، اور عہد کیا کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے، چوری سے باز رہیں گے، زنا کے مرتکب نہ ہوں گے، اپنی لڑکیوں کے قتل کو ممنوع قرار دیں گے، ایک دوسرے پر الزام و بہتان نہ لگائیں گے، نیز کار خیر میں رسول اللہ کا ہر حکم بجالائیں گے۔

رسولِ خدا ﷺ نے مصعب ابن عمیرؓ کو ان کے ہمراہ یثرب کی طرف روانہ کیا تاکہ وہاں پہنچ کر وہ دینِ اسلام کی تبلیغ کریں اور لوگوں کو قرآنِ مجید کی تعلیم دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ آنحضرت ﷺ کو شہر کی حالت کے بارے میں اطلاع دیں۔ نیز یہ بتائیں کہ وہاں کے لوگ دینِ اسلام کو کس سطح پر قبول کر رہے ہیں۔ مصعبؓ پہلے مسلمان مہاجر تھے جس نے یثرب پہنچے اور روزانہ باجماعت نماز کا وہاں انتظام کیا۔

عقبہ میں دوسری مرتبہ بیعت

یثرب میں رسولِ خدا ﷺ کے نمائندے کی موجودگی اور خزرجی اور اوسی قبائل کے افراد کی بے دریغ وسرگرمی اس امر کا باعث ہوئی کہ ان قبائل کے بہت سے لوگ دینِ اسلام کے والہ وشیفتہ ہو گئے۔

چنانچہ چوتھے مرحلے پر اور بعثت کے بارہویں سال تقریباً پانچ سو عورتوں اور مردوں نے خود کو حج کے لیے آمادہ کیا۔ جن میں تہتر افراد مسلمان مرد اور دو مسلمان خواتین شامل تھیں۔

قبل اس کے کہ اہلِ یثرب سفر پر روانہ ہوں "مصعب" مکہ کی جانب روانہ ہوئے اور اپنے سفر کی پوری کیفیت پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔

یثرب کے مسلمانوں نے مناسکِ حج انجام دینے کے بعد بارہ ذی الحجہ بوقت نصف شب عقبہ منا میں رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل کیا۔

رسولِ خدا ﷺ نے اس مرتبہ ملاقات کے دوران قرآنِ مجید کی چند آیات حاضرین کے سامنے تلاوت فرمائیں اور انھیں دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس ضمن میں آنحضرت ﷺ نے حاضرین سے فرمایا: جس طرح تم اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہو، اگر میری بھی حمایت کرو تو محبت کی پیمان باندھنے کو تیار ہوں۔ انھوں نے آنحضرتؐ کی بات سے اتفاق کیا اور یہ عہد کیا کہ وہ آپ کی حمایت اور پاسبانی کریں گے۔ آخر میں رسولِ خدا کے حکم سے

ان میں سے بارہ افراد نقیب مقرر کیے گئے، تاکہ وہ لوگ اپنی قوم کے حالات کی نگہبانی اور پاسداری کر سکیں۔

"خزرج" اور "اوس" جیسے طاقتور قبائل کے ساتھ عہد و پیمان کرنے، نیز دینِ اسلام کے لیے جدید اساس گاہ قائم ہو جانے کے باعث اب رسول اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے لیے جدید سازگار صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔

اس عہد و پیمان کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ کی جانب سے مسلمانوں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ چاہیں تو یثرب کا سفر اختیار کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں آپؐ نے فرمایا:

خداوند تعالیٰ نے تمھارے لیے بھائی پیدا کر دیے ہیں۔ نیز تمھارے لیے گھروں کے دروازے بھی کھل گئے ہیں، ان لوگوں کی مدد سے تم وہاں امن و امان سے رہو گے۔

رسولِ خدا ﷺ سے اجازت ملنے کے بعد مسلمان گروہ در گروہ یثرب جانے لگے اور اب پیغمبر اکرم ﷺ خود بھی حکمِ خداوندی کے منتظر تھے۔ (سیرۃ النبویہ: ج ۲، ص ۱۱۱)

اہلِ یثرب کے مشرف بہ اسلام ہونے کے اسباب

یثرب کے لوگ دینِ اسلام قبول کرنے میں کیوں پیش پیش رہے ہیں اس کی کچھ وجوہ تھیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱. وہ لوگ چونکہ یہودیوں کے گرد و نواح میں آباد تھے اسی لیے پیغمبر اکرم ﷺ کے ظہور پذیر ہونے کی خبریں اور آنحضرتؐ کی خصوصیات ان کی زبان سے اکثر سنتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کے اور یہودیوں کے درمیان کوئی تصادم ہو جاتا تو یہودی ان سے کہا کرتے تھے کہ جلد ہی اس علاقے میں پیغمبرؐ کا ظہور ہو گا۔ ہم اس کی پیروی کریں گے اور تمھیں قومِ "عاد" اور "اِرَم" کی طرح تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گے۔ (حوالہ سابق)

۲. قبیلہ "اوس" اور "خزرج" کے درمیان سالہا سال سے کشت و خونریزی کا سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ اہلِ یثرب اس داخلی جنگ سے تنگ آ چکے تھے۔ دونوں ہی قبائل کے بزرگ اس

فکر میں تھے کہ کوئی ایسی راہ نکل آئے جس کے ذریعے اس خانماں سوز جنگ سے نجات ملے۔ رسولِ خدا کی آمد ان کے لیے درحقیقت اُمید بخش خوشخبری تھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے رسولِ خدا سے پہلی ہی ملاقات میں عرض کیا:

''ہم اپنے قبائل کے افراد کو جنگ و نزاع میں چھوڑ کر (آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں) اُمید ہے کہ خداوند تعالیٰ آپؐ کے ذریعے ان میں صلح کرا دے، اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھ رہیں......

(۱) اگر ایسا ہو جائے تو ہمارے نزدیک آپؐ سے بڑھ کر کوئی شخص عزیز نہ ہوگا۔ (حوالہ سابق)

(۲) حقیقت کی جستجو و تلاش کرنے والوں کی خدمتِ رسولِ خدا میں بار بار حاضری۔

اہلِ یثرب کی زمانہ حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پے در پے ملاقات، کلام اللہ کی تاثیر۔ پیغمبرؐ خدا کو حکم دیا گیا کہ یثرب کی طرف تشریف لے جائیں۔ قریش نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ یکم ربیع الاول بعثت کے ۱۴ویں سال آپؐ کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ رسول اکرمؐ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ تم بستر پر آرام کرو اور ان کا مخصوص شانہ پوش اپنے سرِ مبارک پر ڈال لیا تاکہ دشمن کو یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ آپؐ گھر سے تشریف لے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے مٹھی بھر خاک دستِ مبارک میں اُٹھائی اور محاصرہ کرنے والوں پر پھینک دی۔ اور سورۂ یٰسین کی ایک سے نو تک آیات کی تلاوت فرمائی، اور گھر سے باہر اس طرح تشریف لے گئے کہ کسی کو آپ کے وہاں سے جانے کا گمان تک نہ ہوا۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گھر سے باہر تشریف لانے کے بعد شمال کی جانب رُخ نہیں فرمایا کیونکہ اس طرف سے یثرب کا راستہ گزرتا تھا بلکہ اس کے برعکس آپؐ نے جنوب مکہ کی راہ اختیار فرمائی اور حضرت ابوبکر کے ساتھ غارِ ثور میں تشریف لے گئے۔

جب قریش کو یہ علم ہوا کہ رسولِ خدا گھر سے باہر تشریف لے گئے ہیں تو وہ شہر مکہ اور تمام راستوں کی نگرانی کرنے لگے جو یثرب پر جا کر ختم ہوتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ان لوگوں کو بھی ان راستوں پر مقرر کر دیا جنھیں مسافرین کے نقشِ قدم پر پہچاننے کی مہارت تھی اور یہ اعلان کیا کہ جو شخص بھی آپ کو گرفتار کر کے لائے گا اسے سو اُونٹ بطور انعام دیے جائیں گے۔ لیکن وہ

اپنی جستجو وتلاش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ تین دن کے بعد تھک ہار کر بیٹھ رہے۔

رسول اکرم ﷺ جتنے عرصے غارِ ثور میں تشریف فرما رہے حضرت علی علیہ السلام پیغمبرؐ خدا اور آپؐ کے یارِ غار حضرت ابوبکر کے لیے کھانا پہنچاتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ مکہ کے حالات وواقعات سے بھی آنحضرتؐ کو مطلع فرماتے رہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ اس غار کے قیام کی چوتھی شب میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی معنوی کشش اور ان ملاقاتوں کے دوران آسمانی آئین کی فطرت سے ہم آہنگی آپؐ کی سودمند و پرمغز گفتگو اس امر کا باعث ہوئی کہ قبائل "اوس" اور "خزرج" کے افراد جانب حق کشاں کشاں چلے آئیں اور دینِ اسلام کو انھوں نے خوشی خوشی قبول کرلیا۔

پیغمبر اکرمؐ کو قتل کرنے کی سازش

جب مسلمانوں کی تقریباً اکثریت منتقل ہوکر یثرب منتقل ہوگئی اور وہ شہر دینِ اسلام کا جدید مرکز بن گیا تو قریش کے سردار جو اس وقت تک اس گمان میں مبتلا تھے کہ رسولؐ خدا اور اصحابِ رسولؐ ہمیشہ ان کے رحم وکرم پر زندہ رہیں گے اور ایذا و آزار پہنچا کر انھیں کسی بھی وقت فنا کیا جاسکتا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر سخت مضطرب و پریشان ہوئے۔ رسولؐ خدا کے ساتھ اہلِ یثرب جس حفاظتی عہد وپیمان پر کاربند ہوئے تھے اس نے بھی ان کے لیے خطرہ پیدا کردیا تھا۔ چنانچہ اب وہ اس کی اہمیت وسنگینی کے بارے میں سوچنے لگے۔ کیونکہ انھیں یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں رسولؐ خدا ان لوگوں کی مدد سے جو آپؐ کے ساتھ عہد وپیمان میں شریک ہیں، ان سے انتقام لینے پر کربستہ نہ ہو جائیں۔ یا کم از کم منطقہ "یثرب" پر غالب آنے کے بعد مسلمان ان کی تجارت اور معاشی زندگی کو تو تباہ کر ہی سکتے ہیں۔

ان حالات کے پیشِ نظر قریش کے سردار "دارالندوہ" جمع ہوئے۔ طویل بحث وگفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد انھوں نے اس رائے سے اتفاق کیا کہ ہر قبیلے سے ایک دلیر جوان منتخب کیا جائے اور وہ سب مل کر راتوں رات رسولِ اکرم ﷺ کے گھر کا محاصرہ کرلیں اور آنحضرتؐ پر حملہ آور ہو کر آپؐ کو قتل کر ڈالیں۔ ایسی صورت میں آپؐ کا خون تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے گا اور

حضرت عبد مناف کی آل و اولاد قریش کی پوری طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے گی اور اگر انھوں نے خون بہا کا مطالبہ بھی کیا تو سب مل کر اسے ادا کر دیں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعے ان کی سازش کے بارے میں علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہدایت کے مطابق راستہ بدل کر دوسرے راستے سے یثرب کی جانب روانہ ہوئے۔

انقلاب کی ضرورت کے تحت ہجرت

قرآن مجید میں جن اہم اور تعمیری اصول و قواعد کا ذکر کیا گیا ہے انھی میں "ایمان" اور "جہاد" کے پہلو بہ پہلو "ہجرت" کے بارے میں بھی تاکید کی گئی ہے۔

ہجرت کے معنی ان قیود و بندشوں سے نجات اور رہائی حاصل کر لینا ہیں جو انسان کے وجود یا اس کی زندگی میں ہوتے ہیں۔ ہوا و ہوس اور کثافتوں سے دل و دماغ کو پاک کر لینا اور ان سے فراغت پالینا ہی انسان کی مہاجرت کا عالی ترین مرحلہ ہے۔

اس ضمن میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَشرَفُ الهِجرَتِ اَنْ تَهجُرَ السَّیِّأتِ

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی جانب سے مقرر کردہ ہادی و رہبر نیز مصلحین انسانیت نے درجۂ کمال پر پہنچنے اور اپنی مقدس آرزوؤں کو عملی شکل میں دیکھنے کے لیے ہجرت و تحریک کا آغاز ہر گناہ و آلائش سے اجتناب کے ساتھ کیا: وہ آیات جو بعثت کے ابتدائی دنوں میں نازل ہوئیں ان میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○

"اے اُوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اُٹھو اور ڈراؤ...... اور اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دُور رہو"۔

اگلے مرحلے میں "آفاقی ہجرت" کی ہدایت دی گئی ہے، یعنی اس معاشرے سے ہجرت جو مرگ پذیر ہے اور جس میں کفر کے باعث جمود و سکوت واقع ہو گیا ہے۔ یہ ہجرت اس ماحول کی جانب ہے جو زندہ و آزاد ہے، اور اس کا مقصد عقائد کا تحفظ نیز انقلاب کے اغراض و مقاصد کو

حقیقت کی شکل میں پیش کرتا ہے۔

اس مرحلے پر ہجرت کا مفہوم دشمن یا میدانِ جنگ سے فرار نہیں بلکہ یہ وہ مقام ہے جہاں سے نئے انقلاب کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے معاشرے کے اس ماحول سے ہجرت کی جہاں کفر و شرک کا دَور دورہ تھا تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ یہ انبیاءؑ اپنی جدوجہد سے دست کش ہو گئے تھے اور انھیں اپنے جان و مال کی فکر لاحق ہو گئی تھی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انھیں اپنے وطن میں تبلیغ اور سرگرمی، عمل کے مواقع نظر نہ آئے تو انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہاں سے ہجرت کر کے مناسب اور آزاد ماحول میں پہنچیں اور بیش تر طاقت و توانائی اور امکانات کے ساتھ اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ آپؐ کی ہر اصلاح پسندانہ سعی و کوشش مکہ کے مایوس کن اور دبے ہوئے ماحول میں لاحاصل اور بے نتیجہ ہے نیز دوسری طرف ان حالات سے مقابلہ کرنے کی تاب و مجال بھی نہیں تو آپؐ نے بحالتِ مجبوری اپنے انقلاب کے تحفظ اور اسے جاری رکھنے کی خاطر ہجرت کو ترجیح دی، تاکہ اپنی تحریک کی کتاب کا نیا باب شروع کر سکیں اور دینِ مبینِ اسلام کو علاقائی محدود ماحول سے نکال کر اس کی دعوت آزاد اور عالمی فضا کے ماحول میں پیش کریں۔

اسلام کی عالمی تحریک کا یہ نیا عظیم باب اس قدر اہم اور تقدیر ساز تھا کہ اسے تاریخ اسلام کا مبداء و آغاز قرار دیا گیا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم کا وہ دین و آئین جو اس وقت تک واقعہ "عام الفیل" سے وابستہ تھا اور اپنی تاریخ کا آغاز کہلاتا تھا اس سے رہائی اور نجات مل گئی تھی۔

ہجرتِ مدینہ کرنے کے بعد رسولِ خدا کے اقدامات

قبا میں رسولِ خدا کی تشریف آوری

رسولِ خدا ﷺ نو دن تک ہجرت کرنے کے بعد بتاریخ ۱۲ ربیع الاوّل بروز پیر "قبا" میں تشریف فرما ہوئے جہاں لوگوں نے آپؐ کا نہایت ہی گرم جوشی سے استقبال کیا کیونکہ انھوں نے کافی عرصہ قبل یہ خبر سنی تھی کہ آنحضرتؐ مکہ سے یثرب تشریف لانے والے ہیں۔ اسی لیے وہ لوگ بے صبری سے آپؐ کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کلثوم بن ہدام کے گھر قیام فرما ہوئے اور سعد ابن خیثمہ کی قیام گاہ کو اس بنا پر کہ وہ مجرد آدمی تھے عام لوگوں سے ملاقات کے لیے پسند کیا۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۲، ص ۱۳۷-۱۳۸)

رسولِ خدا ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر یثرب تشریف لے گئے تو حضرت علی علیہ السلام تین روز تک مکہ میں قیام پذیر رہے اور پیغمبرؐ خدا کی ہدایت کے مطابق کام انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد اپنی والدہ محترمہ حضرت فاطمہؑ بنت اسد، حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا، فاطمہ بنت زبیر اور دیگر اصحاب کے ہمراہ مکہ سے مدینے کی جانب روانہ ہوئے۔ آج کے حساب سے گویا تقریباً چار سو ستر کلومیٹر طویل فاصلہ پیدل طے کیا۔ چنانچہ بروز جمعرات ربیع الاول کے نصف میں قبا میں پیغمبر کی ملاقات سے مشرف ہوئے۔

رسولِ خدا ﷺ نے قبا میں قیام کے دوران بنی عمر ابن عوف کے قبیلے کی زمین پر عبادت کے لیے مسجد کی بنیاد رکھی۔ یہ مسجد آج بھی مسجد قبا کے نام سے مشہور ہے، اور یہی وہ پہلی مسجد ہے جو مسلمانوں نے تعمیر کی تھی۔ (حوالہ سابق)

مدینہ میں تشریف آوری

رسولِ خدا ﷺ اپنی دختر عزیز حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور دیگر اصحاب کے ہمراہ

بروز جمعہ قبا سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آنحضرتؐ نے پہلی بار نماز جمعہ راستے میں قبیلہ بنی سالم بن عوف کے درمیان ادا کی۔ آپؐ نے خطبات میں مسئلہ توحید، لوگوں کی ہدایت کے لیے پیغمبروںؑ کی آمد، قرآنِ مجید کی اہمیت نیز افراد کی تعمیر میں اس کتابِ مقدس کا کردار اور موت و معاد (قیامت) کے موضوع پر روشنی ڈالی۔ آپؐ نے لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ تقویٰ اور پاکیزگی پر کاربند رہیں جو زبان سے کہیں اس پر عمل کریں۔ راہِ حق میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ محبت اور خندہ روئی کے ساتھ پیش آئیں۔ (بحار: ج ۱۹، ص ۱۳۶، طبری: ج ۲، ص ۳۹۴)

نماز ادا کرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناقے پر سوار ہوئے۔ اگرچہ راستے میں کتنے ہی قبیلے ایسے آئے جنھوں نے بہت اصرار کیا کہ آپ ان کے ہاں قیام فرمائیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینے کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔

اس روز یثرب کی رونق ہی کچھ اور تھی۔ انصار نوجوانوں نے مدینہ کی فضا کو بتوں کے کثافت آلود ماحول سے پاک وصاف کرنے کے لیے دل وجان کی بازی لگادی۔ راہ میں ہر طرف نعرۂ تکبیر کی گونج تھی۔ مرد عورتیں اور بچے آپ کا دیدار کرنے کے لیے مشتاق و بے قرار تھے۔ ہر شخص کی کوشش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار کرنے میں دوسروں پر سبقت لے جائیں۔ خوشیوں کے ترانے ان کی زبان پر جاری تھے اور سب مل کر پڑھ رہے تھے:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوِدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ
أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

"ماہِ کامل ثنیات الوداع سے ہم پر طلوع ہوا ہے، ہم پر شکرِ خدا اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ خدا کو پکارنے والا پکارتا رہے گا۔ آپؐ وہ شخص ہیں جو ہمارے لیے ایسا فرمان لے کر آئے ہیں جس کی اطاعت کرنا ہمارے اُوپر واجب ہے"۔ (سیرۃ الحلبیہ)

آخرکار ناقۂ رسولؐ اس جگہ بیٹھ گیا جو کہ دو یتیموں کی ملکیت تھی۔ رسولِ خدا نے اس سے اُتر کر زمین پر قدم رنجہ فرمایا۔ اس کے بعد آپ ابوایوب انصاری کے گھر تشریف لے گئے اور وہیں قیام فرمایا۔ (ثنیات، سنگلاخ کوہستانی راستہ کو کہتے ہیں)۔

جب رسولِ خدا ہجرت فرما کر یثرب تشریف لے آئے تو اس شہر کا نام بدل کر مدینۃ الرسول رکھ دیا گیا۔

ہجرت کے اوّلین سال میں رسولِ خدا کے اقدامات

الف: مسجد کی تعمیر

مورخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو آپؐ نے سب سے پہلے جو اقدام یہاں فرمایا وہ مسجد کی تعمیر تھی۔ اسی ضمن میں انھوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ مسجد اس جگہ تعمیر کی گئی جہاں آپؐ کا ناقہ زمین پر بیٹھا تھا اور اس کی زمین مبلغ دس دینار کے عوض ان دو یتیم بچوں سے خریدی گئی۔ (السیرۃ الحلبیہ: ج ۲، ص ۶۶-۷۱)

تمام مسلمانوں نے پورے ذوق وشوق اور خاص اہتمام سے اس مسجد کے بنانے میں کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدوجہد نے اس کی خوشی اور مسرت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ یہ ذوق وشوق حضرت عمارؓ جیسے لوگوں میں نمایاں وجلوہ گر تھا۔ (حوالہ سابق)

مسلمانوں کی اَن تھک کوشش اور لگن سے یہ مسجد بن کر تیار ہوگئی۔ اس کی دیواریں مٹی اور پتھروں سے بنائی گئی تھیں۔ ستونوں کے لیے درختِ خرما کے ستون لگائے تھے۔ چھت بھی کھجور کے تختوں سے پاٹی گئی تھی اور مسجد کے ایک کونے میں کمرہ نما ایک جگہ مخصوص کی گئی تھی تا کہ وہ نادار اصحابِ رسولؐ جن کے پاس سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی یہاں قیام پذیر ہوں۔ یہی وہ لوگ تھے جنھیں بعد میں اصحابِ صُفّہ کہا گیا۔

اس مسجد کے بن جانے کے بعد مسلمانوں کو مرکزیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ عام مسلمان جن میں صاحبِ خانہ اور بے خانماں سب ہی شامل تھے بلا روک ٹوک یہاں جمع ہوتے اور عبادت و نماز باجماعت ادا کرنے کے علاوہ مسلمانوں کے اہم مسائل سے متعلق تبادلۂ خیالات میں حصّہ لیتے۔ اس کے ساتھ ہی وہ رسولِ خدا سے یا ان اصحاب سے جنھیں آنحضرتؐ مقرر فرماتے، احکامِ دین اور دیگر مسائل کی تعلیم حاصل کرتے۔

جب مسجد کی تعمیر مکمل ہوگئی تو اس کے اَطراف میں رسولِ خدا اور اصحاب کے لیے اس طرح مکانات بنائے گئے کہ ہر گھر کا دروازہ مسجد کی جانب کھلتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد خداوند تعالیٰ کی طرف

سے حکم ہوا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے گھروں کے علاوہ جن لوگوں کے گھروں کے دروازے مسجد کی جانب کھلتے ہیں بند کر دیے جائیں۔ رسولؐ خدا نے جب یہ حکمِ خداوندی لوگوں تک پہنچایا تو بعض اصحاب کو یہ بات بہت گراں گزری اور انھیں یہ گمان ہونے لگا کہ یہ فرق و امتیاز خود رسولؐ خدا کا اپنا پیدا کیا ہوا ہے، برادرانہ شفقت کارفرما ہے لیکن رسولؐ خدا نے انھیں اس خیال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

یہ فرمان مَیں نے اپنی طرف سے نہیں دیا ہے بلکہ یہ حکمِ خداوندی ہے"۔ (بحارالانوار: ج ۱۹، ص ۱۱۲)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ صریح وقطعی موقف اس وقت اختیار کیا جب کہ مسلمان بالخصوص مہاجرین خاص حساسیت اور نازک صورتِ حال سے دوچار تھے اور انھیں پیغمبرؐ خدا سے یہ توقع تھی کہ ان کی دلجوئی کے ساتھ ہی ان پر دوسروں سے زیادہ لطف وعنایت فرمائیں گے۔ ان کے لیے یہ سعادت کسی طرح کم نہ تھی کہ ان کے گھروں کے دروازے مسجد کی جانب کھلتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رسولِ خدا کو صحابہ کرام سے تعلق خاطر تھا مگر یہ واقعہ اس حقیقت کا آئینہ دار تھا کہ رسولؐ خدا کا تعلق خاطر اور جذبہ لطف وعنایت حکمِ الٰہی کو ان تک پہنچانے میں مانع نہیں ہو سکا اور کوئی چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمانِ حق صادر کرنے سے روک نہ سکی۔

ب: رشتۂ اُخوت و برادری (بھائی چارہ)

اس میں شک نہیں کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اخوت و برادری برقرار فرمایا لیکن ہجرت کر کے ان مسلمانوں کا مکہ سے مدینہ چلے آنا اور نئے اقتصادی و اجتماعی مسائل وحالات کا پیدا ہونا اس امر کا باعث ہوئے کہ مہاجر وانصار مسلمانوں کے درمیان نیا رشتۂ اخوت و برادری برقرار ہو۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا:

"راہِ خدا میں تم دو دو مل کر بھائی بھائی بن جاؤ"۔ (السیرۃ الحلبیہ، ج ۲، ص ۹۰)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس دانش مندانہ اقدام سے ان مہاجرین کے مسائلِ زندگی کو حل کر دیا جو اپنی ہر چیز مکہ میں چھوڑ کر مدینہ چلے آئے تھے اور اس طرح آنحضرتؐ نے ان کے

ارمان و آرزو اور دین و ایمان کو حفاظت میں لے لیا۔ اگرچہ مہاجرین اور انصار دو مختلف ماحول کے پروردہ تھے اور ان کے طرز فکر و معاشرت میں بھی نمایاں فرق تھا لیکن آپؐ نے انھیں اپنی دانش مندی سے نہ صرف یک جان و دو قالب کر دیا بلکہ دونوں کے حقوق اور مراعات کو بھی مقرر اور مرتب فرمایا۔

رسولِ خدا ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتۂ اخوت اور برادری برقرار رکھنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک کو اپنے دست متبرک میں لے کر فرمایا:

هٰذَا اَخِی ''یہ میرا بھائی ہے''۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۲، ص ۱۳۷-۱۳۹)

ج: یہودیوں کے ساتھ عہد و پیمان

رسولِ اکرم ﷺ کے ہجرت کرنے سے قبل مقامی مشرکین کے علاوہ یہودیوں کے قبیلے بنی قینقاع، بنی نضیر، بنی قریظہ نامی تین طائفے مدینے میں آباد تھے اور انھی کے ہاتھوں میں اس شہر کی صنعت و تجارت تھی۔

اگرچہ رسولؐ خدا نے مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتۂ اخوت و برادری برقرار کر کے اپنی طاقت کو متحد کرنے کے لیے بہت ہی اہم اقدام کیا مگر آپؐ کے سامنے ایک دشوار مرحلہ داخلی تھا اور وہ تھا ان یہودیوں کا وجود جو اس سرزمین پر آباد تھے۔

حالات کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی بعض شرائط درج ذیل ہیں:

1. جن لوگوں نے اس معاہدے پر دستخط کیے ہیں وہ ایک قوم بن کر یہاں زندگی بسر کریں گے۔
2. اس معاہدے کی رُو سے ہر فریق کو اپنی رسومات انجام دینے کی آزادی ہوگی۔
3. مدینے کی حدود میں ہر قسم کی خونریزی حرام ہوگی اور اگر باہر سے کسی دشمن نے حملہ کیا تو سب مل کر شہر کا دفاع کریں گے۔ معاہدے میں جو فریقین شامل ہیں اگر ان میں سے کسی ایک فریق پر باہر کی طاقت نے حملہ کیا تو فریق دوم اس کی مدد کرے گا۔ بشرطیکہ وہ زیادتی نہ کی ہو۔

۴ اختلافی مسائل میں اختلاف کو دُور کرنے کے لیے خدا اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے رجوع کیا جائے گا۔ اس معاہدے کی برقراری کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت معمولی حکومت نہیں رہ گئی بلکہ اس نے مستقل حیثیت اختیار کرلی اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سرکاری سطح پر حاکمِ مدینہ تسلیم کرلیا گیا۔ چنانچہ یہیں سے حلقۂ اسلام کے اندر سیاسی وحدت کی تشکیل نمایاں ہونا شروع ہوئی۔ نیز اسلام کی دفاعی بنیاد کو بیرونی دشمنوں کے مقابل تقویت حاصل ہوئی اور رہبر و ہادی اسلام کے لیے دین کی تبلیغ کے لیے وسیع تر میدان ہموار ہوگیا اور بالآخر اس طرح اجتماعی حدود انفرادی حقوق مختلف جماعتیں مذہبی اقلیتیں ان کے باہمی روابط و تعلقات کی کیفیت اور دشمن کی شناخت جیسی چیزیں مشخص و نمایاں ہوئیں۔

عہد شکنی

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان دوجانبہ و مسالمت آمیز عہد مدینہ کے یہودیوں کے لیے بہت زیادہ سازگار ثابت ہوا۔ وہ اس عہد و پیمان کی بدولت اسلامی حکومت کے زیرسایہ آزادی کے ساتھ شرافت مندانہ طور پر زندگی بسر کرسکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ چنانچہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب انھوں نے جدید حکومت سے اپنے لیے سیاسی و اجتماعی خطرہ محسوس کیا تو انھوں نے اس عہد کو جو رسولِ خدا کے ساتھ کیا تھا نظرانداز کرنا شروع کردیا اور آنحضرت کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ وہ مسلمانوں کے لیے مشکلات اور ان کے دینی عقائد میں شک وشبہات پیدا کرکے اور دورِ جاہلیت کے کینہ و اختلاف کو یاد دلا کر یہ کوشش کرنے لگے کہ ان کے عقائد میں ضعف، سُستی اور ان کی صفوں میں انتشار پیدا کردیں۔ (السیرۃ الحلبیہ: ج ۱، ص ۳۳۸)

وہ منافقین بالخصوص ان کا سرغنہ ''عبداللہ ابن ابی'' جو کہ خفیہ طور پر یہودیوں کے ساتھ مل گئے تھے اس سازش میں ان کے ساتھ شریک ہوگئے۔ چنانچہ وہ لوگ مسلمانوں کے عقائد کا مذاق اُڑانے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک مرتبہ رسولِ خدا نے مجبور ہوکر حکم دیا کہ انھیں مسجد سے باہر نکال دیا جائے۔ (السیرۃ الحلبیہ: ج ۲، ص ۱۷۵)

رزمیہ واعلانیہ ابتدائی اقدامات

رسولِ خدا ﷺ نے مملکت اسلامی کی طاقت کو وسعت دینے اور اسلامی حکومت کے مقدس اغراض و مقاصد کی شکل پذیری کے لیے جو اقدامات فرمائے ان میں رزمیہ ساز وسامان اور جاسوسی مشنری کی تحریک کا آغاز بھی شامل تھا۔ اس تحریک کے تحت آپ نے رزمیہ اعلانیہ دستوں کو مدینہ سے باہر روانہ کیا اور یہیں سے رسولِ خدا کی سپاہیانہ مہمات اور غزوات کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ دشمن کے خلاف جنگ و دفاع کا جو فرسودہ نظام اب تک چلا آرہا تھا اس میں آپؐ نے تبدیلی کی اور اس کے جدید اصول وقواعد مرتب کیے۔

مؤرخین نے جنگِ بدر سے قبل کی سپاہیانہ مہمات اور غزوات کا ذکر آٹھ مختلف مواقع پر کیا ہے۔ ان مہمات میں جن سپاہیوں نے شرکت کی اور محاذ پر گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد محدود ہی مگر وہ سب کے سب مہاجر ہی تھے۔ ہم یہاں دو نکات کا بطور اختصار ذکر کریں گے:

1. انصار کا ان مہمات میں شریک نہ ہونے کا سبب۔
2. ان جنگوں وغزوات کا مقصد۔

① انصار کا ان مہمات میں شریک نہ ہونے کا سبب

1. عقبہ معاہدے کی رُو سے انصار اس شرط کے پابند تھے کہ وہ رسولِ خدا ﷺ کا دفاع شہر کی حدود کے اندر کریں گے اس کے باہر نہیں۔
2. انصار چونکہ کچھ عرصے قبل ہی مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور آئندہ جو مشکلات و دُشواریاں آنے والی تھیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کر رہے تھے۔ ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے پیغمبر اکرم ﷺ نے اس امر میں مصلحت سمجھی کہ ان کی طاقت کو اس موقع پر بروئے کار نہ لایا جائے۔
3. مہاجرین کا انتخاب شاید اس مقصد کے تحت کیا گیا تھا کہ ان میں ایسی رزمیہ واعلانیہ جنگی مہمات میں شرکت کا جذبہ انصار سے کہیں زیادہ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے قریش کے ہاتھوں جو تکالیف نیز سختیاں برداشت کی تھیں ان کے باعث وہ ان سے سخت رنجیدہ خاطر تھے۔ اس کے علاوہ ان کے لیے مدینہ میں کوئی مادی فائدہ بھی نہ تھا۔

دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے جغرافیہ کے بارے میں بیش تر اطلاعات کسب کریں۔

④ رسول اکرم ﷺ اس تحریک کے ذریعے انصار پر یہ بات واضح کر دینا چاہتے تھے کہ آپ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے قطعی فیصلہ اور مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ وہ مہاجرین جنھوں نے راہِ خدا میں ہر چیز کو ترک کر دیا تھا اور مکہ کی طرح اس وقت بھی وہ فرمانِ رسولؐ کی خاطر شرک سے جنگ کرنے میں اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے تیار تھے۔ یہ درحقیقت ان لوگوں کے لیے عملی درس تھا جو حال ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔

② ان جنگوں وغزوات کا مقصد

① ہادی ورہبر کی حیثیت کو مستحکم کرنا اور اسلام کی مرکزی حکومت کو تقویت پہنچانا۔

② مسلمانوں کی جنگی استعداد و طاقت کو بلند و مضبوط کرنا نیز لشکرِ اسلام کو آیندہ کی مشکلات کے لیے آمادہ کرنا۔

③ اطراف وجوانب میں بسنے والے قبائل کے علاوہ دفاعی معاہدے خصوصاً ان لوگوں سے معاہدہ کرنا جو قریش کے تجارتی قافلوں کے راستے میں آباد تھے۔

④ جغرافیائی حالات اور شہروں کو متصل کرنے والے راستوں سے واقفیت، اس کے ساتھ ہی اطرافِ مدینہ میں آباد قبائل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا۔

⑤ قریش کو جنگ کی دھمکی دینا اور ان کے ارتباطی اور تجارتی راستوں کو غیر محفوظ بنانا اور دشمن کو مسلمان طاقت وقوت سے خبردار کرنا۔

تحویلِ قبلہ

پیغمبر اکرم ﷺ مکہ میں اور ہجرت کے بعد مدینہ میں سترہ ماہ تک بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بروز پیر نصف ماہ رجب سن ۲ ہجری میں یہ واقعہ پیش آیا کہ جب آپ مسجد بنی سالم بن عوف جو کہ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لیے پہلی مسجد تعمیر کی گئی تھی نمازِ ظہر ادا فرما رہے تھے، آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ اپنا قبلہ تبدیل کر دیں۔ (السیرۃ الحلبیہ ج ۲، ص ۱۲۸)

جن وجوہ کی بنا پر قبلہ تبدیل کیا گیا ان میں سے چند یہ تھیں

(۱) ایک طرف تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہودی یہ اعتراض کرتے تھے کہ جب تم ہماری مخالفت کرتے ہو تو ہمارے قبلہ کی جانب رُخ کر کے نماز کیوں پڑھتے ہو۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں سے یہ کہتے کہ: اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو تم ہمارے قبلے کی جانب رُخ کر کے نماز کیوں پڑھتے؟ دوسری طرف مشرکین یہ طعنہ دیتے کہ تم جب کہ قبلہ ابراہیمؑ کو ترک کر کے قبلہ یہود کی طرف نماز پڑھتے ہو تو یہ کیسے دعویٰ کرتے ہو کہ ہم ملت ابراہیمؑ پر قائم ہیں۔ (حوالہ سابق)

اس قسم کے اعتراضات اور طعنے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت رنجیدہ اور آزردہ خاطر کرتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آپ راتوں کو بارگاہِ خداوندی میں دُعا فرماتے اور مقامِ ربِ ذوالجلال کی جانب رُخ کر کے اپنی آنکھیں آسمان کی جانب لگا دیتے تاکہ خداوند تعالیٰ کی جانب سے اس بارے میں کوئی حکم صادر ہو۔ (بحار: ج ۱۹، ص ۲۰۱)

قرآنِ مجید نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ذہنی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا (سورۂ بقرہ: آیت ۱۴۴)

"(اے رسولؐ) آپ کی توجہ آسمان کی جانب دیکھ رہے ہیں لو ہم اس قبلے کی طرف تمھیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم پسند کرتے ہو"۔

(۲) خداوند تعالیٰ قبلہ کا رُخ تبدیل کر کے مسلمانوں کو آزمانا چاہتا تھا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون لوگ حکمِ خدا کے مطیع اور رسولِ خدا کے فرمانبردار ہیں۔

وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (سورۂ بقرہ: آیت ۱۴۳)

"پہلے جس طرف تم رُخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹا پھر جاتا ہے۔ یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت مگر ان لوگوں کے لیے کچھ بھی سخت نہ ہوا جو اللہ کی جانب

سے فیض یاب تھے"۔

بعض روایات اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا ایک سبب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رسول خدا ﷺ مکہ میں اس وقت جب کہ آپؐ کا رُخ مبارک بیت المقدس کی جانب ہوتا، ہرگز کعبہ کی جانب پشت نہیں فرماتے تھے لیکن ہجرت کے بعد مدینے میں جس وقت آپؐ نماز ادا کرتے تو اس وقت مجبوراً آپؐ کی پشت کعبہ کی جانب ہوتی۔ رسولؐ خدا کے قلبِ مبارک میں بیت ابراہیمی کے لیے جو احترام تھا اور اس کی جانب پشت کرنے سے آپ کو تکلیف ہوتی تھی اسے ملحوظ رکھتے ہوئے خداوند تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کے ذریعے آپ کی رضامندی کا اہتمام کیا۔ (بحار: ج۱۹، ص ۲۰۰)

سمت قبلہ تبدیل کیے جانے کے بعد یہودیوں نے دوبارہ اعتراضات کرنا شروع کر دیے کہ آخر وہ کیا عوامل تھے جن کا باعث مسلمان قبلہ اوّل سے رُوگرداں ہوگئے؟ اس کے ساتھ ہی انھوں نے رسولؐ خدا کے سامنے یہ شرط رکھی کہ اگر آپؐ قبلہ یہود کی طرف رُخ فرمالیں تو ہم آپؐ کی پیروی و اطاعت کرنے لگیں گے۔

بعض سادہ لوح مسلمان یہودیوں کی اِفترا پردازیوں کا شکار ہوگئے۔ چنانچہ یہ دریافت کرنے لگے کہ وہ نماز جو انھوں نے بیت المقدس کی جانب رُخ کرکے ادا کی ہیں ان کا کیا ہوگا۔

قرآنِ مجید نے ان کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ

"اللہ تعالیٰ تمھارے ایمان (یعنی بیت المقدس کی جانب ادا کی جانے والی نماز) ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔

جنگِ بدر

سن ۲ ہجری میں جو واقعات رُونما ہوئے ان میں سے ایک جنگِ بدر کا تقدیر ساز معرکہ تھا۔ اس جنگ کا تعلق اِرادۂ ایزدی سے تھا۔

قرآنِ مجید کی آیات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا مدینہ سے قریش کے تجارتی قافلہ کے تعاقب اور نتیجہ میں جنگ کے لیے نکلنا وحی اور آسمانی حکم کے مطابق تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ (سورۂ انفال: آیت ۵)

"جس طرح تمھارے رب نے تمھیں تمھارے گھر سے حق کے ساتھ برآمد کیا"۔

لیکن وہ بعض سست عقیدہ لوگ کہ جو اسلامی حکومت کو اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے انھیں اس جنگ میں رسولِ خدا کے ساتھ روانہ ہونا گوارا نہ تھا۔

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (سورۂ انفال: آیت ۵)

"اور مومنوں میں سے ایک گروہ کو یہ گوارا نہ تھا"۔

یہ ظاہر بین گروہ اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اقدام حکمِ خدا کے عین مطابق ہے۔ آنحضرتؐ کے ساتھ جنگِ بدر پر جانے کے لیے جھگڑا کرنے پر لگا ہوا تھا۔

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ (سورۂ انفال: آیت ۶)

"یہ لوگ حق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی آپؐ سے بحث کرتے ہیں"۔

قرآنِ مجید نے اس گروہ کی ذہنی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (سورۂ انفال: آیت ۶)

"جیسے یہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور یہ حسرت سے دیکھ رہے ہیں"۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ جو لوگ اس مقصد و منشا کے مخالف تھے ان کی مخالفت، بدنیتی اور ایمان کی کمزوری کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں چونکہ یہ یقین نہیں تھا کہ یہ جنگ وقوع پذیر ہوگی اسی لیے وہ ساتھ چلنے سے انکار کر رہے تھے۔ (المغازی واقدی: ج ۱، ص ۲۱)

اگرچہ حق ان پر واضح و روشن ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود انھیں اسے قبول کرنا گوارا نہ تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ہماری تعداد بہت کم ہے اور دشمن بہت زیادہ ہیں۔ ایسی صورت میں ہم اتنے بڑے دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے مدینہ سے باہر کیسے جا سکتے ہیں۔ شاید ہمارے اس اقدام کو ہماری نادانی پر محمول کیا جائے۔ کیوں کہ یہ بھی تو نہیں معلوم کہ یہ کاروانِ جنگ ہے یا قافلۂ تجارت؟ (مجمع البیان: ج ۳، ص ۵۲)

دوسری دلیل جو اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ مسلمین و کفار کے درمیان یہ جنگ حکمِ الٰہی کا قطعی و حتمی نتیجہ تھی اور انھیں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دلا رہی تھی، یہ تھی کہ جنگ

سے پہلے دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کی تعداد کم نظر آرہی تھی۔

وَ اِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْٓ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا وَّ یُقَلِّلُكُمْ فِیْٓ اَعْیُنِهِمْ

(سورۂ انفال: آیت ۴۴)

"اگر کہیں وہ تمھیں ان کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو ضرور تم لوگ ہمت ہار جاتے اور جنگ کے معاملے میں جھگڑا شروع کر دیتے"۔

اس وقت سیاسی اور فوجی صورتِ حال ایسی تھی کہ اگر وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ بھی کرتے تو وہ اس سے رُوگرداں ہو جاتے۔

وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ

"اگر کہیں پہلے سے تمھارے اور ان کے درمیان مقابلے کی قرارداد ہو چکی ہوتی تو تم ضرور اس موقع پر پہلوتہی کر جاتے"۔

دوسری طرف اگر دشمن کو مسلمان طاقت و تعداد میں زیادہ نظر آتے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ کفار مسلمانوں کا مقابلہ کرنے سے گریز کر جاتے اور اس تقدیر ساز جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوتے۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ خداوند تعالیٰ نے حالات ایسے پیدا کر دیے کہ اب دونوں گروہوں کے لیے اس کے علاوہ چارہ نہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے مقابل آ جائیں اور ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کریں تاکہ ارادہ خداوندی حقیقت کی صورت میں جلوہ گر ہو۔

لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (سورۂ انفال: آیت ۴۴)

"تاکہ جو بات ہوئی تھی اسے اللہ ظہور میں لے آئے"۔

اس زمانے میں اسلامی معاشرے کی جو سیاسی و اجتماعی حالت تھی اگر ہم اس کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس وقت ایسی فاتحانہ جنگ کی اشد ضرورت تھی، کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو تیرہ سال تک با آواز بلند اپنی اُمت کی اصلاح و نجات کے لیے دعوتِ اسلام دیتے رہے۔ آپ کی اس صدائے حق و عدل کو معدودے چند کے علاوہ نہ صرف سننا گوارا نہ کی بلکہ ہر قسم کی ایذا و تکلیف پہنچا کر جلاوطنی کے لیے مجبور کر دیا۔ اور جو لوگ وہاں رہ گئے تھے وہ بھی سخت ایذا و آزار سے دوچار تھے اور ان پر ایسی سخت پابندیاں لگا رکھی تھیں کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ بھی

نہیں جاسکتے تھے۔ (حوالہ سابق)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کے بعد بھی دشمنوں نے چین کا سانس لینے نہ دیا۔ ابوجہل نے خط لکھ کر آنحضرتؐ کو یہ دھمکی دی کہ یہ مت سمجھ لینا کہ تم نے ہجرت کر کے قریش کے چنگل سے نجات پالی ہے۔ دیکھنا جلد ہی تم پر چاروں طرف سے قریش اور دوسرے دشمنوں کی طرف سے یلغار ہوگی اور یہ ایسا سخت حملہ ہوگا کہ تمھارا اور تمھارے دینِ اسلام کا نام صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوجائے گا۔ رسولؐ خدا کو یہ خط جنگ شروع ہونے سے ۲۹ دن پہلے ملا تھا۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۲، ص ۱۴۴)

دوسری طرف انصارِ مسلمین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ انھیں جب بھی موقع ملتا اور جس وقت بھی وہ مناسب سمجھتے رسولؐ خدا کے تحفظ اور آپؐ کے دین کی پاسداری کا اعلان کردیتے۔

مہاجرین نے ان مہمات و غزوات میں شرکت کر کے جو جنگِ بدر سے پہلے وقوع پذیر ہوچکے تھے یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ اب بھی حسبِ سابق اپنے ارادے پر قائم اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہیں۔

دوسری طرف منافقین اور یہودیوں کی تحریک اپنا کام کر رہی تھی۔ ابتدا میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو انھوں نے آپ کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا لیکن جب وہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکے تو مخالفت و سرکشی پر اُتر آئے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اٹھارہ ماہ سے زیادہ قیام کے دوران جہاں تک ہوسکتا تھا دشمن سے مقابلے کے لیے فوج تیار کی۔

تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اب وہ وقت آن پہنچا تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسیع پیمانے پر فتح مندانہ عسکری تحریک شروع فرمائیں اور دینِ اسلام کو گوشہ نشینی اور خفت و شرمساری کی حالت سے نکال کر اسے اجتماعی طاقتور و یلغاری تحریک میں بدل دیں، تاکہ شرک کے دعویدار اچھی طرح سمجھ لیں کہ مکہ میں جو مسلمانوں کی حالت تھی اب وہ بدل چکی ہے، اور اگر اس کے بعد مخالفت و خلل اندازی کی گئی تو وہ ہوں گے اور اسلام کی ایسی شمشیر براں ہوگی جس سے ان کی بیخ و بنیاد تباہ و برباد ہوکر رہ جائے گی۔ کیونکہ یہ اقدام و ارادہ حق کی جانب سے ہے اور

اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔

يُرِيْدُ اللهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (سورۂ انفال: آیت ۷)

"خدا اپنے کلمات کے ذریعے حق کو ثابت کر دینا چاہتا ہے اور کافروں کے سلسلے کو قطع کر دینا چاہتا ہے"۔

جنگ بدر کی مختصر تاریخ

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتوار کے روز ۱۲ رمضان سنہ ۲ ہجری کو ۳۱۳ مسلمان افراد کے ہمراہ (جن میں ۸۱ مہاجرین اور ۲۳۱ انصار شامل تھے) مدینہ سے "بدر" کی جانب روانہ ہوئے۔ اس وقت آپؐ کے پاس صرف دو گھوڑے اور ستر اُونٹ تھے، اور قریش کے اس تجارتی قافلے کا تعاقب کرنا تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں جا رہا تھا۔

"ذفیران" کے مقام پر آپؐ کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان اپنے قافلے کی حفاظت کی خاطر راستہ بدل کر مکہ چلا گیا ہے، لیکن مسلح سپاہی مکہ سے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے "بدر" کی جانب روانہ ہو چکے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحاب کے درمیان اس خبر کا اعلان کرنے کے بعد ان سے مشورہ کیا۔ متفقہ طور پر فیصلہ ہوا کہ اس مختصر سپاہ کے ساتھ ہی دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ اب یہ قافلہ "بدر" کی جانب روانہ ہوا۔

آخر ۱۷ رمضان کو دونوں لشکروں کے سپاہیوں میں بدر کے کنوؤں کے پاس مقابلہ ہوا۔ جنگ کا آغاز دشمن کی طرف سے ہوا۔ پہلے مشرکین کے تین دلاور "عتبہ، شیبہ اور ولید" نکلے جو کہ حضرت علی علیہ السلام، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے۔

عام یورش میں سپاہِ اسلام نے پروردگار کی غیبی امداد، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دانش مندانہ فرمان داری اور اپنے بارے میں جہاد سے متعلق آیات سن کر پہلے تو دشمن کے ابتدائی حملوں کا دفاع کیا۔ اس کے بعد اس کی صفوں میں گھس کر ایسی سخت یلغار کی کہ اس کی صفیں درہم برہم ہو کر رہ گئیں اور بہت سی سپاہ بالخصوص فرعونِ قریش یعنی ابوجہل کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دشمن کا لشکر

جو نو سو پچاس سپاہیوں پر مشتمل اور پورے ساز و سامانِ جنگ سے مسلح و آراستہ تھا، سپاہِ اسلام کے مقابلے کی تاب نہ لاسکا۔ چنانچہ کثیر جانی و مالی ستر مقتول اور ستر قیدی کا نقصان برداشت کرنے کے بعد اس نے راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ اس جنگ میں سپاہِ اسلام میں سے صرف ۱۴ نے جامِ شہادت نوش کیا۔ (تاریخ پیامبر: ص ۲۵۳، مؤلف آیتی)

یہاں ہم مختصر طور پر ہی لیکن چند مسائل کا ذکر و تجزیہ کریں گے:

۱. مالِ غنیمت اور قیدیوں کا انجام
۲. فتح و کامیابی کے عوامل
۳. جنگ کا نتیجہ

۱ مالِ غنیمت اور قیدیوں کا انجام

جنگِ بدر میں ایک سو پچاس اُونٹ اور بعض روایات کے مطابق تیس گھوڑے، بہت سے ہتھیار اور وہ کھالیں جنھیں قریش تجارت کے لیے لے جارہے تھے، مسلمانوں کو غنیمت میں ملیں۔ مگر اس مال کی تقسیم پر ان کے درمیان اختلاف ہوگیا جس کا سبب یہ تھا کہ انھیں معلوم تھا کہ مالِ غنیمت میں ان مجاہدین کا بھی حصّہ ہے جنھوں نے جنگ میں شرکت کی تھی یا یہ ان سپاہیوں کا بھی حصّہ ہے جو دشمن سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ اس مالِ غنیمت میں آیا سب کا حصّہ برابر تھا یا پیدل اور سوار سپاہ کے درمیان کوئی فرق و امتیاز رکھا گیا تھا۔ (المیزان: ج۹، ص۹)

یہ معاملہ پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور سورۂ انفال کی پہلی آیت نازل ہوئی جس نے مسئلہ مالِ غنیمت کو روشن کر دیا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝
(سورۂ انفال: آیت ۱)

"(اے رسولؐ) تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں: کہہ دیجیے یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہیں۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات میں فرق نہ آنے دو، اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اگر

تم مومن ہو"۔

اس آیہ شریفہ کی بنیاد پر مالِ غنیمت خدا اور رسولؐ کا حق ہے، لیکن پیغمبر اکرم ﷺ نے اس کے تین سو تیرہ حصّے کر کے اسے سب کے درمیان تقسیم کر دیا۔ تقسیم کے اعتبار سے ہر دو سوار سپاہیوں کے لیے دو اضافی حصّے مقرر کیے گئے تھے۔ شہداء کا حصّہ ان کے پسماندگان کو دے دیا گیا۔ ایک روایت یہ بھی ملتی ہے کہ وہ لوگ جو رسول اکرم ﷺ کے حکم سے مدینہ میں اپنی خدمات انجام دینے کے لیے مقرر کیے گئے تھے اور وہ وہیں مقیم تھے ان کا بھی حصّہ مقرر کیا گیا تھا۔ (مغازی: ج ۱، ص ۱۰۰-۱۰۱)

رسولِ خدا ﷺ کے حکم کے مطابق قیدیوں کو مدینہ لے جایا گیا۔ راستے میں پڑنے والی منزلوں میں سے ایک پر، دو آدمیوں نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو رسولؐ خدا کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۲، ص ۲۹۸)

مذکورہ اشخاص کے قتل کیے جانے کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ دونوں ہی کفر کے سرغنہ اور اسلام کے خلاف سازشیں تیار کرنے میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ انھوں نے رسولؐ خدا اور مسلمانوں کو جس بری طرح تکالیف پہنچائی تھیں اس کی ایک طویل داستان ہے اگر یہ لوگ آزاد ہو کر واپس مکہ پہنچ جاتے تو یہ امکان تھا کہ ازسر نو اسلام کی بیخ کنی کے لیے سازشوں میں مشغول ہو جاتے۔

چنانچہ ان کا قتل کیا جانا اسلام کی مصلحت کے تحت تھا تا کہ انتقام لینے کی غرض سے ان تمام قیدیوں کو فدیہ وصول کر کے جو کہ (ہزار سے چار ہزار درہم تک تھا) بتدریج آزاد کر دیا گیا۔ ان میں جو لوگ نادار تھے مگر لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے انھیں آزاد کرنے کی یہ شرط رکھی گئی کہ اگر وہ دس مسلمانوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دیں گے تو انھیں آزاد کر دیا جائے گا۔

ان قیدیوں میں چند اشخاص رسولِ خدا ﷺ اور حضرت علی علیہ السلام کے رشتہ دار بھی تھے، چنانچہ رسولؐ خدا کے چچا جنابِ عباس اپنا اور عقیل و نوفل نامی اپنے دو بھتیجوں کا فدیہ ادا کر کے آزاد ہوئے۔ اگرچہ ان لوگوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کے نبی ہونے کی شہادت بھی دے دی تھی۔ تمام قیدیوں میں بھی افراد تھے جو دینِ اسلام سے مشرف ہو کر واپس مکہ پہنچے۔ (الصحیح من سیرۃ النبی: ج ۲، ص ۲۴۳-۲۵۷)

ب: فتح وکامیابی کے اسباب

اس میں شک نہیں کہ جنگِ بدر میں کفار کو طاقت اور اسلحہ کے اعتبار سے مسلمانوں پر فوقیت حاصل تھی مگر مسلمانوں کو مختلف عوامل کی بنا پر فتح حاصل ہوئی اور وہ عوامل دین و اسلام پر ایمان و اعتقاد جیسی نعمت اور مدد خداوندی تھی۔ ہم دو اہم عنوانات کے تحت ان عوامل کی وضاحت کریں گے:

① معنوی عوامل ② مادی اور عسکری عوامل

معنوی عوامل

رسولِ خدا ﷺ نے خدا کے اس وعدے کے مطابق کہ میں تمھیں قریش کے تجارتی قافلہ پر فتح یاب کروں گا۔ لشکرِ اسلام کو "ذفران" میں پہنچادیا اور یہی وعدہ ان کے لیے جنگ میں جرأت وحوصلہ مندی کا سبب ہوا۔

وَاِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ.....

"یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمھیں مل جائے گا"۔

جس روز جنگی کارروائی ہونے والی تھی اسی دن کی شب میں بارش ہوئی جس کے دو فائدے ہوئے:

① مسلمانوں کی چونکہ بدر کے کنوؤں تک رسائی نہیں تھی کہ جس سے غسل کرتے اور خود کو ہر طرح کی نجاست سے پاک کرتے۔

② چونکہ بارش کثرت سے ہوئی تھی اس لیے دشمن کی سپاہ کیچڑ اور دلدل میں پھنس گئی اور اسے جنگ کی مشق کرنے کا موقع نہ مل سکا لیکن جس طرف مسلم سپاہ تھی وہاں کی زمین کنکریلی تھی جو بارش کے پانی سے مزید پختہ ہوگئی۔

وَ یُنَزِّلُ عَلَیْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ یُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَ لِیَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (سورۂ انفال: آیت ۱۱)

"اور آسمان سے تمھارے اُوپر پانی برس رہا تھا تاکہ تمھیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دُور کرے اور تمھاری ہمت بندھائے اور اس کے ذریعے تمھارے قدم جم جائیں"۔

③ جس روز جنگ ہوئی تھی اس سے پہلی رات میں مسلمانوں کو عالم خواب میں بشارت ملی تھی اور ان دلوں کو اطمینان ہو گیا تھا۔

④ مسلمانوں کی مدد کے لیے تین ہزار فرشتوں کا زمین پر اُترنا۔

⑤ دونوں لشکر ایک دوسرے کی تعداد کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا تھے، اس سے قبل کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ شروع ہو، وہ ایک دوسرے کی تعداد کو کم سمجھ رہے تھے لیکن جیسے ہی جنگ شروع ہوئی دشمن کو مسلمانوں کی تعداد دوگنا نظر آنے لگی۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۳)

"تمھارے لیے ان دو گروہوں میں ایک نشانِ عبرت تھا جو "بدر" میں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم خود دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوگنا ہے"۔

⑥ کفار کے دلوں پر مسلمانوں کے اس رعب کا چھا جانا جسے "رعب نصریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ

"میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رُعب ڈالے دیتا ہوں"۔

⑦ سپاہ کی کثرت اور سامانِ جنگ کی فراوانی کے باعث لشکرِ کفار کا غرور و تکبر۔

وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ (سورۂ انفال: آیت ۴۸)

"اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ شیطان نے ان لوگوں کے کرتوت ان کی نگاہوں میں خوش نما بنا کر دکھائے تھے اور ان سے کہا تھا کہ آج کوئی تم پر

غالب نہیں آسکتا اور پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہوں"۔

جب ہم اس کامیابی اور غیبی مدد کے بارے میں غور کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ فتح و نصرت خداوند تعالیٰ کی جانب سے تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبی تم نے ان پر ایک مٹھی خاک نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی ہے۔

مادی اور عسکری عوامل

① پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دانش مندانہ کمانڈر اور لشکر کی سپہ سالاری نیز آنحضرتؐ کا بذاتِ خود جنگ کی صف اوّل میں دشمن کے رُوبرو موجود رہنا۔

② امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب جنگ و کارزار کے شعلے پوری طرح مشتعل ہو جاتے تو ہم رسولِ خدا کی پناہ تلاش کرتے اور ہم میں سے کوئی شخص دشمن کے اس قدر نزدیک نہ ہوتا جتنے آنحضرت ہوتے۔

③ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے شجاعت مندانہ اور دلیرانہ کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے مورخین نے لکھا ہے کہ اس جنگ میں بیش تر مشرکین کا خون حضرت علی علیہ السلام کی تیغ سے ہوا۔ جناب علامہ مفید مرحوم نے لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں چھتیس مشرک تہ تیغ ہوئے۔ اگرچہ باقی مقتولین کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے کیونکہ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے قتل میں حضرت علی علیہ السلام شریک تھے۔ (ارشاد مفید: ص ۴۰)

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کے عظیم حوصلے اور تقدیر ساز کردار کو مدنظر رکھتے ہوئے کفارِ قریش نے آپؑ کو "سرخ موت" کا لقب دیا تھا۔ (مناقب ابن شہر آشوب: ج ۲، ص ۶۸)

سپاہِ اسلام کا جذبہ نظم و ضبط اپنے فرمان دار کے حکم کی اطاعت پذیری اور میدانِ کارزار میں صبر و پائداری کے ساتھ ڈٹے رہنا۔

④ دشمن کی صورتِ حال کے بارے میں صحیح و دقیق معلومات اور اس کے ساتھ ہی رسولِ خدا کی جانب سے جن جنگی حربوں کو بروئے کار لانے کی ہدایت دی جاتی تھی اس کی مکمل اطاعت۔

جنگ بدر کے نتائج

زمانہ کے اعتبار سے "غزوۂ بدر" کی مدت اگرچہ ایک روز سے زیادہ نہ تھی لیکن سیاسی و اجتماعی اعتبار سے نیز جو نتائج برآمد ہوئے ان کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے یہ جنگ نہ صرف مسلمانوں کی تاریخی معرکہ آرائی بلکہ حیاتِ اسلام کو ایک نئے رُخ کی جانب لے جانے میں معاون و مددگار ثابت ہوئی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جنگ دونوں ہی گروہوں کے لیے تقدیر ساز تھی۔ مسلمانوں کے واسطے یہ جنگ اس اعتبار سے اہمیت کی حامل تھی کہ وہ جانتے تے کہ اگر اس جنگ میں وہ کامیاب ہوجاتے ہیں (اور ہوئے بھی) تو عسکری طاقت کا توازن بدل کر مسلمانوں کے حق میں ہوجائے گا، اور اس علاقے میں ان کے بارے میں غور وفکر کیا جانے لگے اور رائے عامہ ان کی جانب ہوگی۔ اس کے علاوہ اور بھی مفید نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ ان کا ذکر ہم ذیل میں کریں گے۔ اس کے برعکس اگر اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوجاتی تو اس کے بعد اسلام کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ چنانچہ رسولؐ خدا کا جنگ سے پہلے کا وہ ارشاد جو بصورتِ دُعا فرمایا اس حقیقت کی تائید کرتا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِن تَهلك هٰذِهِ العِصَابَةَ اليَومَ لَا تَعبُدُ

"پروردگار! اگر آج یہ جماعت تباہ ہوگئی تو تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا"۔ (السیرۃ النبویہ)

اب ہم اس مسئلے کو کفار کے اعتبار سے دیکھتے ہیں، اگر وہ اس جنگ میں کامیاب ہوجاتے تو رسول اکرمؐ اور ان مسلمانوں کا قصہ بھی پاک ہوجاتا جو آپ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ لوگ قریش کے چنگل سے نکل کر مدینہ میں پناہ گزین ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ اہلِ مدینہ کے لیے یہ درس عبرت ہوتا کہ وہ آیندہ ایسی جرأت نہ کریں کہ دشمن قریش کو اپنے گھروں میں پناہ دیں اور اہلِ مکہ کا ان سے کوئی مقابلہ ہو۔

جنگ بدر میں خداوند تعالیٰ کی مرضی سے جو پیش رفت ہوئی اس کے باعث اسلامی معاشرہ نیز مشرک سیاسی، اجتماعی، عسکری اور اقتصادی لحاظ سے بہت متاثر ہوئے، بطور مثال:

(۱) مسلمانوں بالخصوص انصار کے دلوں میں نفسیاتی طور پر مکتب اسلام کی حقانیت کے

بارے میں پہلے سے کہیں زیادہ اطمینان و اعتقاد پیدا ہوگیا۔ اور اسلام کے درخشاں مستقبل کے متعلق ان کی اُمیدیں اب بہت زیادہ ہوگئیں۔ کیونکہ میدانِ جنگ میں طاقت ایمان کے مظاہرے کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

دوسری طرف "جزیرۃ العرب" کے لوگوں میں اسلام کو برتر طاقت کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ چنانچہ اب سب ہی لوگ رسول خدا ﷺ اور آنحضرتؐ کے آئین اسلام کی جانب راغب ہونے لگے۔

۲ جنگِ بدر ایسی طوفان خیز ثابت ہوئی کہ اس نے مخالفین اسلام (مشرکین، یہود اور منافقین) کی بنیادوں کو لرزا دیا۔ چنانچہ ان کے دلوں میں ایسا خوف و ہراس پیدا ہوا کہ اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اپنی حفظ و بقا کی خاطر اپنے تمام اختلافات کے باوجود یکجا ہوجائیں اور مسلمانوں کو تہِ تیغ کرنے کے لیے کوئی راہ تلاش کریں۔

جنگِ بدر کے بعد پورے شہر مکہ میں صف ماتم بچھ گئی۔ قریش کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جہاں کسی عزیز کے مرنے کی وجہ سے رسم سوگواری نہ منائی گئی ہو اور جو چند قریش باقی بچ رہے انھوں نے اضطراری حالت کے تحت جلسہ طلب کیا اور وہ اس بات پر غور و فکر کرنے لگے کہ اس شرم ناک شکست کے منفی اثرات کو کیسے دُور کریں اور اس کی تلافی کس طرح کی جائے۔ (السیرۃ النبویہ: ج۲، ص ۲۰۲)

ابولہب کو تو ایسا صدمہ ہوا کہ وہ جنگِ بدر کے بعد دس دن کے اندر اندر ہی غم و اندوہ سے گھل گھل کر راہی ملکِ عدم (دنیا سے رخصت) ہوگیا۔

مدینہ میں بھی جس منافق و یہودی نے مسلمانوں کی فتح و کامرانی کے بارے میں سنا اس کا سر شرم و خجالت سے جھک گیا۔

ان میں بعض نے تو یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ جنگِ بدر میں اتنے شرفاء سردارانِ قوم، حکمرانانِ عرب اور اہلِ حرم مارے گئے ہیں کہ اب اس کے بعد ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ زمین کے سینے پر رہنے کے بجائے اس کی کوکھ میں چلے جائیں اور بعض کی زبان پر یہ بات بار بار آرہی تھی کہ "اب جہاں کہیں پرچم محمدی لہرائے گا فتح و نصرت اس کے دوش بدوش ہوگی۔

۳ جنگِ بدر سے مسلمانوں کو جو مالِ غنیمت ملا اس کی وجہ سے مسلمانوں کی اقتصادی

حالت بہتر ہوگئی اور اس کی وجہ سے ان کی ذاتی اور لشکری ضروریات بھی پوری ہوگئی ہیں۔ ان کے واسطے جنگ کے راستے زیادہ ہموار اور وسیع ہوگئے۔ اس کے مقابل قریش کی اقتصادی زندگی کو سخت نقصان پہنچا۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ تمام تجارتی راستے جو شمال کی طرف جاتے تھے ان کے لیے مخدوش ہوگئے۔ دوسری طرف جنگ میں وہ تمام لوگ مارے گئے جو فن تجارت کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور مکہ کی اقتصادی زندگی کا انحصار انھی کے ہاتھوں میں تھا۔

جنگِ اُحد

غـزوهٔ بنی قینقاع

جو یہودی مدینہ میں آباد تھے ان کی خیانت و نیرنگی کم و بیش جنگِ بدر سے قبل مسلمانوں پر عیاں ہو چکی تھی، جب مسلمانوں کو جنگِ بدر میں غیر متوقع طور پر مشرکین پر فتح و کامرانی نصیب ہوئی تو وہ سخت مضطرب و پریشان ہوئے اور ان کے خلاف ریشہ دوانیوں میں لگ گئے۔ قبیلۂ بنی قینقاع اندرونِ مدینہ آباد تھا اور اس شہر کی معیشت اسی کے ہاتھوں میں تھی۔ یہی وہ قبیلہ تھا جس کی سازش و شرارت مسلمانوں پر سب سے پہلے آشکار ہوئی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدا میں انھیں نصیحت کی اور اس بات پر زور دیا کہ آنحضرتؐ کے ساتھ انھوں نے جو عہد و پیمان کیا ہے اس پر قائم رہیں۔ اس کے ساتھ ہی مشرکینِ قریش پر جو گزر گئی تھی اس سے بھی آپؐ نے انھیں آگاہ کیا۔ لیکن جب آپؐ نے دیکھا کہ وہ لوگ خودسری و بے حیائی پر اُتر آئے ہیں اور قانون کی پاسداری نیز مذہبی جذبات کی پاکیزگی کا احترام کرنے کے بجائے اُلٹا اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور مسلمانوں کی عزت و ناموس پر مسلسل اہانت آمیز حملہ کر رہے ہیں تو آپؐ نے نصف ماہِ شوال (دو ہجری) میں ان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا تاکہ اس قضیے کا فیصلہ ہو جائے۔

یہودی تعداد میں تقریباً سات سو سپاہی تھے جن میں سے تین سو زرہ پوش تھے۔ پندرہ دن تک مقابلہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھی کی تجویز پر ان کا مال و اسلحہ ضبط کر لیا اور انھیں مدینے سے باہر نکال دیا۔ (مغازی: ج ۱، ص ۱۷۶-۱۷۸)

"بنی قینقاع" کے شرپسندوں کو جب اسلحہ سے محروم اور شہر بدر کر دیا گیا تو مدینہ میں دوبارہ امن و اتحاد اور سیاسی پائیداری کا ماحول بحال ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی حکومت کے مرکز یعنی مدینہ میں رسولِ خدا کی سیاسی حیثیت و رہبرانہ طاقت پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہو گئی۔ اس کے

علاوہ قریش کے ان حملوں کے مقابل جو وہ انتقام جوئی کی غرض سے کیا کرتے تھے مسلمانوں کا دفاعی میدان کافی محکم و مضبوط ہو گیا۔ اور یہی بات قریش کے اس خط سے جو انھوں نے جنگ بدر کے بعد مدینہ کے یہودیوں کو لکھا تھا عیاں ہوتی ہے کہ جب مسلمانوں سے آیندہ انتقام جوئی کی غرض سے جنگ کی جائے تو ان اسلام دشمن عناصر سے جو خود مسلمانوں میں موجود ہیں جاسوسی اور تباہ کاری کا کام لیا جائے۔

رسولؐ خدا نے صرف مدینہ میں خیانت کار اور عہد شکن کا ہی قلع قمع نہیں کیا تھا بلکہ ان قبائل پر بھی کڑی نظر رکھے ہوئے تھے جو مدینہ کے اطراف میں آباد اور اسلام دشمن تحریکوں نیز سازشوں میں شریک تھے۔ چنانچہ جب بھی حملے کی ضرورت پیش آتی تو آپ کی تلوار بجلی کی مانند کوندتی ہوئی ان جتھوں پر گرتی اور ان کی سازشوں کو ناکام بنا دیتی۔ "بنی غطفان" اور "بنی سلیم" دو ایسے طاقتور قبیلے تھے جو قریش کے تجارتی راستے پر آباد تھے اور ان کا قریش کے ساتھ سازشی عہد و پیمان بھی تھا۔ ان کے ساتھ جو جنگ (جس جنگ میں آپؐ شریک ہوئے اُسے غزوہ کہا جاتا ہے) ہوئی وہ "غزوۂ بنی سلیم" کے نام سے مشہور ہے۔ قبائل "ثعلبہ" اور "محارب" کے ساتھ جو جنگ لڑی گئی وہ "غزوۂ ذی امر" کہلائی۔ قریش نے جنگ بدر کے بعد اپنا تجارتی راستہ بدل دیا تھا اور بحر احمر کے ساحل کے بجائے وہ عراق کے راستے سے تجارت کے لیے جانے لگے تھے۔ ان پر جو لشکر کشی کی گئی وہ "سریہ قردہ" کے عنوان سے مشہور ہوئی۔

مسلم سپاہ کی ہوش مندی اور ہر وقت پیش قدمی کے باعث نوعمر اسلامی حکومت اپنی جاسوسی، ہوشیاری اور لشکر کشی کی اِستعداد و اہلیت کی وجہ سے مدینہ کے گرد و نواح میں غالب آ گئی۔ اور اب وہ سیاسی، عسکری طاقت کے عنوان سے منظر عام پر آنے لگی۔

تجارتی راستوں پر مسلمانوں کی مستقل موجودگی کے باعث قریش کی اقتصادی و سیاسی طاقت سلب ہو گئی اور ان کے جتنے بھی تجارتی راستے تھے وہ مسلمانوں کے تحت تصرف میں آ گئے۔ اس عسکری مخابراتی کیفیت کی حفاظت و توسیع اس کے ساتھ ہی سپاہِ اسلام کا فطری و جبلی جذبہ، شجاعت و دلیری اور رسولِؐ خدا کا دانشورانہ دستور العمل ایسے عناصر تھے جن پر اس وقت بھی عمل کیا جاتا تھا جبکہ دینِ اسلام طاقت کے اعتبار سے اپنے عروج کو پہنچ چکا تھا۔ تحفظ و توسیع کا اس قدر پاس رکھا جاتا کہ ان مہینوں میں بھی جنھیں ماہِ حرام قرار دیا گیا تھا اس مقصد سے غفلت نہیں برتی جاتی تھی۔

رسولِ خدا کی دُخترِ نیک اختر کی شادی خانہ آبادی

جنگِ بدر کے بعد جو اہم واقعات رُونما ہوئے ان میں دینِ مبین اسلام کی نامور خاتون حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ رشتۂ ازدواج بھی قابلِ ذکر واقعہ ہے۔

دورِ جاہلیت کی ایک ناپسندیدہ رسم یہ بھی تھی کہ عرب بالخصوص شرفا اپنی بیٹیوں کے رشتے صرف ایسے آدمیوں سے کرتے تھے جنھیں دولت مندی، اقتدار پسندی اور جاہ و مرتبہ کے باعث شہرت حاصل ہوتی تھی۔

اس رسم کی بنیاد پر بعض شریف زادوں اور مقتدر صحابہ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حضرت فاطمہ علیہا السلام کے ساتھ اپنی شادی کا پیغام بھیجا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے گرانقدر مہر ادا کرنے کی بھی پیشکش کی۔ لیکن وہ لوگ اس بات سے بے خبر تھے کہ اسلام کی نظر میں ان کی جاہ و دولت، اشراف زادگی اور قبائلی ناموری کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا آپؐ کی وہ دُخترِ نیک اختر ہیں جن کی عظمت و منزلت آیۂ "مباہلہ" کی رُو سے بہت بلند ہے۔ (بحار الانوار: ج ۴۳، ص ۱۰۸)

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ○ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۶۱)

"علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملے میں تم سے حجت کرے تو اے نبیؐ! اس سے کہو کہ آؤ اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں، اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو"۔

اور آیۂ "تطہیر" کے مطابق آپؐ کو معصوم اور گناہ سے مبرا قرار دیا گیا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ○ (سورۂ احزاب: آیت ۳۳)

"اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیتؑ سے رجس کو دُور رکھے اور تمھیں پوری

طرح پاک رکھے"۔

ایسی صورت میں آپؑ کا شریکِ حیات ایسے ہی شخص کو بنایا جاسکتا ہے جو فضیلت، تقویٰ، ایمان، اخلاص، زہد اور عبادت میں آپؑ کا ہم پلہ ہو۔ چنانچہ جب بھی آپؑ کا رشتہ آتا تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے:

اِنَّمَا اَمرُهَا اِلٰی رَبِّهَا

"یعنی حضرت فاطمہ زہراؑ کا شادی کا مسئلہ خداوند تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے"۔ (بحار الانوار: ج ۴۳، ص ۱۲۵)

اور جب حضرت علی علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے لیے اپنا پیغام دیا تو آپؐ نے اپنی جانب سے اظہارِ رضامندی کردی مگر اس شرط کے ساتھ کہ حضرت فاطمہ زہراؑ بھی اس رشتے کو قبول فرمالیں۔ جب آنحضرتؐ نے اس بات کا ذکر اپنی دخترِ نیک اختر سے فرمایا تو حضرت فاطمہؑ خاموش رہیں۔ اس بنا پر رسولِؐ خدا نے اس سکوت کو رضامندی کی علامت سمجھا اور فرمایا:

اَللّٰهُ اَكبَرُ سُكُوتُهَا اِقرَارُهَا

"اللہ سب سے بڑا ہے۔ یہ سکوت ہی اقرار ہے"۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کی جانب رُخ کیا اور فرمایا کہ تمھارے پاس کیا اثاثہ ہے جس کی بنا پر میں اپنی لڑکی کو تمھاری زوجیت میں دے دوں۔

یہ سن کر حضرت علی علیہ السلام نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو آپؐ سے پنہاں اور پوشیدہ ہو۔ میرا کُل اثاثہ ایک تلوار، ایک زرہ اور ایک شترِ آب کش ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپؑ اپنی زرہ بکتر فروخت کردیں اور اس سے جو رقم حاصل ہو، اسے رسولِؐ خدا کے حوالے کردیں۔

زرہ بکتر فروخت کرنے سے جو رقم حاصل ہوئی اس میں سے کچھ رسولِؐ خدا نے بعض صحابہ کو دی اور کہا کہ اس سے وہ ضروریاتِ زندگی کا سامان خرید لائیں، باقی رقم کو آپؐ نے بطورِ امانت حضرت اُمِ سلمہؓ کے پاس رکھ دیا۔ (بحار الانوار)

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کا مہر

مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے شادی کے لیے جو رقم رسولِ خدا کو ادا کی وہ کسی طرح بھی پانچ سو درہم سے زیادہ نہ تھی اور یہی حضرت فاطمہ زہراؑ کا مہر تھا۔ چنانچہ اسی رقم سے جہیز اور دُلہن کا لباس و سامانِ آرائش خریدا گیا، نیز اسی رقم سے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا گیا۔

رقم کی یہ مقدار درحقیقت "مہر سنت" ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے عمدہ مثال، بالخصوص ان والدین کے لیے جو مہر کی کثیر رقم کا مطالبہ کر کے نوجوانوں کی شادی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ ان کے لیے اچھا سبق بھی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کی حیثیت کا انحصار مہر کی کثیر رقم اور بھاری جہیز پر ہے۔

رسولِ خدا نے اس اقدام کے ذریعے عام لوگوں کو انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور عورت کے معنوی و روحانی مرتبے کی جانب متوجہ کیا ہے۔ چنانچہ جب قریش نے یہ اعتراض کیا کہ فاطمہؑ کو بہت معمولی مہر کی رقم پر علیؑ کی زوجیت میں دے دیا تو آپؐ نے فرمایا: یہ اقدام حکمِ خدا کے ایما پر کیا گیا ہے۔ یہ کام میں نے انجام نہیں دیا بلکہ خداوند تعالیٰ کے حکم سے انجام پایا ہے۔

احمد ابن یوسفی دمشقی نے لکھا ہے کہ جب حضرت فاطمہ زہراؑ کو معلوم ہوا کہ مہر کی رقم اتنی معین کی گئی ہے تو آپؑ نے اپنے والد محترم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: عام لڑکیوں کی شادی اس وقت طے ہوتی ہے جب مہر کی رقم کے درہم مقرر کر لیے جاتے ہیں۔ اگر میں بھی ایسا ہی کروں تو میرے اور ان کے درمیان کیا فرق باقی رہ جائے گا۔ اس لیے میری آپؐ سے درخواست ہے کہ مہر کی رقم علیؑ کو ہی واپس کر دیجیے اور اس کے عوض خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ شفاعت کیجیے کہ میرے مہر کی رقم کے صدقے میں بروزِ قیامت آپؐ کی اُمت کے گناہگار بندوں کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

شادی کی رسومات

جب ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا تو حضرت علی علیہ السلام نے فیصلہ کیا کہ اپنی زوجہ مطہرہؑ کو وداع کر کے گھر لے آئیں۔ اس مقصد کے تحت آپؑ نے دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا اور اس میں شرکت کی دعوتِ عام دی اور جب شادی کی رسومات ختم ہو گئیں تو آنحضرتؐ نے اپنی دُخترِ نیک اختر

کی سواری کے لیے خچر کا بندوبست کیا اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ دلہن کے آگے آگے چلیں اور خود سواری کے پیچھے چلنے لگے اور اس طرح بنی ہاشم کے مردوں، عورتوں اور ازواجِ مطہرات نے حضرت فاطمہ زہراؑ کی سواری کے ساتھ ہمراہی کی۔

حضرت علی علیہ السلام کے گھر پہنچ کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پیاری بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کے اوصافِ حمیدہ حضرت فاطمہ زہراؑ سے بیان فرمائے اور اسی طرح آپؐ نے حضرت فاطمہ زہراؑ کی خوش شعاری حضرت علی علیہ السلام سے بیان فرمائی اور اس کے بعد آپؐ نے دونوں کے لیے دُعائے خیر فرمائی۔ (بحار: ج ۴۳، ص ۱۱۵ و ۱۱۶)

غزوۂ اُحد

ہجرت کے تیسرے سال کے دوران جو واقعات رُونما ہوئے ان میں غزوۂ اُحد قابلِ ذکر ہے۔ یہ جنگ ماہِ شوال میں وقوع پذیر ہوئی جو خاص اہمیت و عظمت کی حامل ہے۔ ہم یہاں اس جنگ کا اجمالی طور پر جائزہ لیں گے اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا تجزیہ کریں گے۔

غزوۂ اُحد کی اجمالی تاریخ

جنگِ بدر میں شرم ناک شکست کھانے کے بعد قریش نے اندازہ لگا لیا کہ رسولِ خدا کے ساتھ ان کی جو جنگ و پیکار چلی آرہی ہے اس نے نیا رُخ اختیار کرلیا ہے اور یہ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ چنانچہ دوسرے مرحلے پر جب انھوں نے نوعمر اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کا ارادہ کیا تو اس کے لیے انھوں نے وسیع پیمانے پر تیاری کی تاکہ اس طریقے سے اوّلاً ان مقتولین کا مسلمانوں سے بدلہ لے سکیں جو جنگ بدر میں مارے گئے تھے اور دوسرے یہ کہ چونکہ مسلمانوں نے مکہ اور شام کے درمیان واقع جس تجارتی شاہراہ کی ناکہ بندی کردی تھی اسے ان کے چنگل سے آزاد کرا کے اپنی اقتصادی مشکلات کا حل نکالیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی حاکمیت و بالادستی کو بحال کرلیں جو زمانے کے انقلاب کے تحت ان کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی اور اس کی ساکھ کو اپنے لوگوں نیز اطراف و جوانب کے قبائل پر قائم کرسکیں۔

جن محرکات کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ "کعب الاشرف" جیسے یہودیوں کی تگ ودو بھی اس جنگ کے شعلوں کو ہوا دینے میں موثر و کامیاب ثابت ہوئی۔

مشرکین کے سردار "دارالندوہ" میں جمع ہوئے اور وہاں انھوں نے لشکر کی روانگی جنگ کے مخارج اور اسلحہ کی فراہمی کے موضوع پر گفتگو کی۔ بالآخر بہت زیادہ کوشش کے بعد تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایسا لشکر تیار ہو گیا جس میں ۷۰۰ زرہ پوش اور باقی پیدل سپاہی شامل تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ۲۰۰ گھوڑے اور ۳۰۰ اُونٹ بھی جمع کر لیے۔ سپاہ میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے پانچ عورتیں بھی ساتھ ہو گئیں۔ چنانچہ اس ساز و سامان کے ساتھ یہ لشکر مدینے کی جانب روانہ ہوا۔ (المغازی: ج ۱ ص ۲۱۳-۲۱۴)

رسولِ خدا کے چچا حضرت عباس نے جو مکہ میں قیام پذیر تھے آنحضرت ﷺ کو قریش کی سازش سے مطلع کر دیا۔ دشمن کی طاقت وحیثیت کا اندازہ لگانے اور اس سے متعلق مزید اطلاعات حاصل کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے مہاجرین و انصار میں سے اہلِ نظر کو جمع کیا اور انھیں پوری کیفیت سمجھا کر اس مسئلے پر غور کیا کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اس سے متعلق دو نظریے زیر بحث آئے۔

الف: شہر میں محصور رہ کر عورتوں اور بچوں کی مدد حاصل کی جائے اور فصیل شہر کو دفاع کے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

ب: شہر سے باہر نکل کر کھلے میدان میں دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔

معمر اور منافق لوگ پہلے نظریے سے متفق تھے لیکن جوانوں کی تعداد چونکہ بہت زیادہ تھی اسی لیے وہ دوسرے نظریے کے حامی تھے اور اس پر ان کا سخت اصرار تھا۔ رسولِ خدا نے جانبین کے نظریات اور طرفین کے استدلال سننے کے بعد دوسرے نظریے کو پسند فرمایا اور یہ فیصلہ دیا کہ دشمن کا مقابلہ شہر سے باہر نکل کر کیا جائے۔ ۶ شوال کو آپؐ نے نماز جمعہ کی امامت فرمائی۔ فریضہ نماز ادا کرنے کے بعد آپؐ نے اصحاب کو صبر و شکیبائی اور استقامت و پائیداری کی تلقین فرمائی۔ لشکر ہزار افراد پر مشتمل تھا جس میں صرف ۱۰۰ سپاہی زرہ پوش تھے۔ آپؐ نے فوج کا علَم حضرت علی علیہ السلام کو دیا اور جہاد کی خاطر مدینے سے باہر تشریف لے گئے۔

جب لشکر اسلام "شواط" کی حدود میں پہنچا تو منافقین کا سردار عبداللہ بن ابی اپنے ۳۰۰

ساتھیوں کے ساتھ یہ بہانہ بنا کر علیحدہ ہو گیا کہ رسولِ خدا نے جوانوں کے اس نظریے کو اس کے مشورے پر ترجیح دی ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس مدینہ آ گیا۔ اس منافق کی رُوگردانی کے پسِ پشت دراصل یہ محرک کارفرما تھا کہ جنگ کے حساس و نازک موقعے پر پیغمبرِ خدا کا ساتھ چھوڑ کر آپؐ کی قیادت کو کمزور کر دے تاکہ سپاہِ اسلام کی صفوں میں تزلزل و اختلاف پیدا ہو جائے۔

اسی تفرقہ انگیز حرکت کے بعد قبیلہ "خزرج" کے دو طائفوں میں سے "بنی سلیمہ" کے دو طائفے اور قبیلہ "اوس" کے طائفہ بنی حارث کے لوگ بھی اپنی ثابت قدمی میں متزلزل ہونے لگے اور واپس جانا چاہتے ہی تھے کہ خدا کی مدد اور دوسرے مسلمانوں کی ثابت قدمی نے ان کے ارادے کو مضبوط کر دیا اور اس طرح منافقین کی بزدلانہ سازش ناکام ہو گئی۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے بھی سورۂ آلِ عمران میں اس مسئلے کی جانب اشارہ کیا ہے:

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۲۲)

"یاد کرو جب تم دو گروہ بزدلی پر آمادہ ہو گئے تھے، حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا، اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے"۔

ہفتہ کے دن سات شوال کو اُحد کے دامن میں دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ اگرچہ کوہِ اُحد لشکرِ اسلام کی پشت پر تھا مگر اس کے باوجود رسولِ خدا نے عبداللہ بن جبیر کے زیرِ فرمان پچاس کمانداروں کو درۂ عینین کے دہانے پر اس مقصد کے تحت مقرر کر دیا تھا کہ دشمن کو درے کے راستے سے میدانِ کارزار میں نہ آنے دیں۔

جنگ کا آغاز دشمن کے سپاہی "ابو عامر" کی تیراندازی سے ہوا۔ اسی کے بعد جنگ کی نوبت آئی۔ اس مرحلے میں مشرکین کے نو جانباز اور پرچم دار چند افراد کے ساتھ میدانِ کارزار میں اُترے اور سب کے سب حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔

دوسرے مرحلے پر دشمن کا پورا ریلا مسلم سپاہ پر حملہ آور ہوا، جس پر قریش نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی۔ اس مرتبہ عورتیں اشعار نیز نغمہ و سُرود کے ذریعے مردوں کو مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لیے ترغیب دلا رہی تھیں تاکہ اس ننگیں داغ کو جو جنگِ بدر میں ان کے دامن پر لگا تھا، مٹا سکیں۔ لیکن مجاہدینِ اسلام کی بہادرانہ استقامت و پائیداری اور دشمنوں کی صفوں پر ہر جانب

سے حملہ آوری بالخصوص امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، حضرت حمزہؓ اور حضرت ابودجانہؓ کی سرشکن پے درپے ضربوں کے باعث مشرکین کی سپاہ میں مقابلے کی تاب نہ رہی اور اس نے اپنی عافیت بھاگنے میں ہی سمجھی۔

جب مشرکین فرار کرنے لگے تو مسلمانوں کے بہت بڑے گروہ نے یہ سمجھا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اگرچہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخت تاکید تھی کہ جن سپاہیوں کو درہ عینین کی پہرہ داری پر مقرر کیا ہے وہ اپنی ذمہ داری سے ہرگز غافل نہ ہوں۔ مگر آنحضرتؐ کی تاکید اور فرمانداروں کی سخت کوشش کے باوجود دس افراد کے علاوہ وہ تمام سپاہی جو اس درہ کی نگرانی پر مامور تھے اپنی پہرہ داری کو چھوڑ کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔

خالد بن ولید دشمن کی سوار فوج کا فرمان دار تھا۔ فنِ حرب کی رُو سے درہ عینین کی کیا اہمیت ہے اس سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے کتنی ہی مرتبہ یہ کوشش کی تھی کہ سپاہِ اسلام کے گرد چکر لگائے لیکن مسلمان تیراندازوں نے اسے ہر مرتبہ پسپا کر دیا۔ اس نے جب مسلمانوں کو مالِ غنیمت جمع کرتے دیکھا تو سُرعت کے ساتھ کوہِ اُحد کا چکر لگایا اور ان باقی سپاہیوں کو قتل کر دیا جو وہاں موجود تھے۔ جب درے کی پاسبانی کے لیے کوئی سپاہی نہ رہا تو وہ وہاں سے اُتر کر نیچے آیا اور ان سپاہیوں پر اچانک حملہ کر دیا جو مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔

عورتوں نے جب خالد بن ولید کے سپاہیوں کو حملہ کرتے دیکھا تو انھوں نے بھی اپنے بال بکھیر دیے اور گریبان چاک کر ڈالے۔ وہ چیخ چیخ کر مشرکین کو اشتعال دلا رہی تھیں اور کوشش کر رہی تھیں کہ جو لوگ فرار کر گئے ہیں وہ واپس آ جائیں۔

دشمن کے ان دو اقدام کے باعث اس کی طاقت دوبارہ منظم ہو گئی۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں پر سامنے اور پشت سے حملہ کر دیا۔ اگرچہ مسلمانوں نے اپنا دفاع کرنا بھی چاہا مگر چونکہ وہ بکھر چکے تھے لہٰذا ان کی کوشش کارگر نہ ہوئی۔

اسی اثنا میں میدانِ جنگ سے یہ صدا بلند ہوئی کہ اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ "محمدؐ قتل کر دیے گئے ہیں"۔ جب یہ افواہ ہر طرف گشت کر گئی تو لشکرِ اسلام ان تین دستوں میں تقسیم ہو گیا۔

① ایک دستہ میدانِ جنگ سے ایسا گیا کہ واپس نہ آیا اور جب تین دن بعد اس کے افراد

رسولِ خدا کی خدمت میں پہنچے تو آنحضرتؐ نے ان کی سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: تم نے گویا تنگی سے نکل کر کشادہ راہ اختیار کی تھی۔ اس دستہ میں حضرت عثمان بن عفان بھی شامل تھے۔

۲ دوسرے دستے میں وہ لوگ شامل تھے جو فرار کر کے گردونواح کے پہاڑوں میں چھپ گئے تھے اور یہ انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیے کیا پیش آتا ہے۔ ان میں سے بعض حواس باختہ ہو کر یہ کہنے لگے کہ اے کاش ہم میں سے کوئی ہوتا جو "عبداللہ ابن ابی" کے پاس چلا جاتا اور وہ ابوسفیان سے ہماری امان کے لیے سفارش کرتا"۔ (طبری: ج ۲، ص ۵۲۰)

"انس ابن نضر" کو راہ میں کچھ ایسے لوگ مل گئے جو فرار کر چکے تھے۔ انھوں نے گھبرا کر ان سے دریافت کیا کہ تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟

انھوں نے جواب دیا: رسولِ خدا کو قتل کر دیا گیا ہے۔

اس پر انس نے جواب دیا کہ جب رسولِ خدا اس دنیا میں نہیں رہے تو یہ زندگی کس کام کی؟ اٹھو اور جہاں رسولِ خدا کا خون گرا ہے تم بھی اپنا لہو وہاں بہا دو۔

اس گروہ نے جو اکثریت پر مشتمل تھا نہ صرف انس کی بات کا مثبت جواب نہیں دیا بلکہ اسے رسولِ اکرم کا یہ قول بھی یاد آ گیا کہ اے لوگو فرار کر کے کہاں جا رہے ہو، خدا کا وعدہ ہے کہ فتح و نصرت ہمیں حاصل ہوگی لیکن انھوں نے رسولِ خدا کی ایک نہ سنی اور فرار کرتے ہی چلے گئے۔

سورہ آل عمران کی آیت ۱۵۳ میں بھی اس امر کی جانب اشارہ ہے:

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ

"یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمھیں نہ تھا اور تمھارے پیچھے رسول تم کو پکار رہا تھا"۔

۳ تیسرے گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جنھوں نے ایسے حساس و نازک موقعے پر بے نظیر ایثار و قربانی کی مثال پیش کی۔ اگرچہ دشمن نے رسولِ خدا کو ہر طرف سے نرغے میں لے رکھا تھا مگر وہ رسولِ خدا کے گرد پروانہ وار چکر لگا رہے تھے اور آپؐ کی ذاتِ گرامی کا ہر طرح تحفظ و دفاع کر رہے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نمایاں طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کر رہے تھے اور سب سے پیش پیش تھے۔ ایسے تاریخی شواہد و قرائن بھی موجود ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ سب ہی لوگ فرار کر چکے تھے اور چند لوگ رہ گئے تھے وہ فرار کر کے اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ لیکن امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام بے حد زخمی ہو جانے کے باوجود رسولؐ خدا کا تحفظ و دفاع کر رہے تھے۔ انھوں نے اس راہ میں ایسی استقامت و پائیداری کا مظاہرہ کیا کہ ان کی تلوار تک میدانِ جنگ میں ٹوٹ گئی۔ اس موقعے پر رسولؐ خدا نے اپنی وہ تلوار جس کا نام ذوالفقار تھا حضرت علی علیہ السلام کو عنایت فرمائی اور آپؑ نے اسی تلوار سے نبرد آزمائی جاری رکھی۔

یہ جذبۂ ایثار و قربانی اس قدر قابلِ قدر تھا کہ خداوند تعالیٰ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی مبارک باد دی۔ چنانچہ رسولؐ خدا نے اس فرمان کے ذریعے کہ "علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں" اس جذبۂ ایثار و قربانی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کا اظہار فرمایا۔

چنانچہ جب ہاتف غیبی کی یہ صدا آئی کہ لَا فَتٰی اِلَّا عَلِی لَا سَیفَ اِلَّا ذُوالفِقَار، تو سب لوگ بالخصوص فرار کرنے والے اور اپنی ہی فکر میں غرق لوگ اس بے نظیر جرأت مندانہ اقدام کی جانب متوجہ ہوئے۔ (تاریخ طبری: ج ۲، ص ۵۱۴)

جان نثارانِ اسلام کے سردارانِ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب دوسرے شخص تھے جو رسولؐ خدا کا تحفظ و دفاع کر رہے تھے اور اسی حالت میں وہ جبیر بن مطعم کے وحشی غلام کے ہاتھوں شہید ہوئے (السیرۃ النبویہ: ج ۳، ص ۱۲۹)۔ ابودجانہ اور اُمِ عمارہ عرف شیبہ بھی ان حساس و نازک لمحات میں رسولؐ خدا کے دوش بدوش رہے۔ (حوالۂ سابق)

سپاہ کی دوبارہ جمع آوری

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدنِ مبارک پر اگرچہ کاری زخم لگ چکے تھے اور آنحضرتؐ دشمن کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے مگر اس کے باوجود آپؐ نے نہ صرف میدانِ کارزار سے باہر قدم نکالا بلکہ مسلسل باآواز بلند اِلَی عِبَادِ اللہِ، اِلَی عِبَادِ اللہِ کہہ کر لوگوں کو میدانِ جنگ میں آنے کی دعوت دیتے رہے۔ بالآخر آپؐ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور اپنی عسکری طاقت کو دوبارہ منظم

کر کے مرکز اور محاذ کی صف اوّل میں لے آئے۔ ان سپاہیوں نے بھی تعداد کی کمی کے باوجود جنگ میں ایسے نمایاں کارنامے انجام دیئے کہ کفار کے دلوں میں اس کا رُعب و دبدبہ پیدا ہو گیا اور انھیں یہ خوف لاحق ہونے لگا کہ کہیں جنگ کا پانسہ نہ پلٹ جائے اور جو فتح انھیں حاصل ہوئی ہے وہ شکست میں نہ بدل جائے۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر ابوسفیان نے اپنے لشکر کو پسپا ہونے کا حکم دیا اور جنگ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ (الصحیح من سیرۃ النبی: ج ۴، ص ۲۷۶)

اس طرح جنگِ اُحد کا خاتمہ ہوا جس میں لشکرِ اسلام کے ستر سپاہی شہید ہوئے اور مشرکین کے بائیس یا تیئیس سپاہی مارے گئے۔

جنگِ اُحد سے جنگِ اَحزاب تک

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی شکست کے اسباب

پہلے مرحلے پر مسلمانوں کی فتح اور دوسرے مرحلے پر اس کے شکست میں بدل جانے کے بعض اسباب کے بارے میں قرآنِ مجید نے اشارہ کیا ہے۔ یہاں ہم مسلمانوں کی شکست کے اہم ترین عوامل کا ذکر کریں گے جس سے ان عوامل کی بھی وضاحت ہوجائے گی جن کی وجہ سے مسلمانوں کو پہلے مرحلے میں فتح نصیب ہوئی تھی۔

۱ سپاہ کے ایک گروہ میں عسکری نظم وضبط کا فقدان اور رسولِ خدا کے اس حکم سے رُوگردانی جس کے بارے میں آپؐ نے تاکید سے حکم دیا تھا اور درہ "عینین" کے تحفظ و دفاع کے لیے سخت ہدایت کی تھی:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۵۲)

"اللہ نے تائید نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے"۔

۲ ایمان کی کمزوری اور دنیا کی محبت، سپاہیوں کے دلوں میں رسولِ خدا کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوگئی تھی اور انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ رسولِ خدا ہمیں مالِ غنیمت میں شریک نہ کریں۔ اسی لیے وہ پناہ گاہوں کو خالی چھوڑ کر مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے اور اسی بنا پر انھوں نے مالِ غنیمت کو حکمِ رسولِ خدا اور دشمن سے نبرد آزمائی پر فوقیت دی۔

...... مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۵۲)

دوسرے مرحلے پر بہت بڑی تعداد میں سپاہ کا فرار کر جانا اور رسولؐ خدا کو تنہا چھوڑ دینا اور اس قسم کی باتیں کرنا کہ اے کاش! ہم عبداللہ ابن ابی کے پاس چلے گئے ہوتے تاکہ وہ ہمارے لیے ابوسفیان سے ہماری جان کی امان مانگتا...... ان کے یہ خیالات اس حقیقت کے آئینہ دار تھے کہ ان کے عقیدے میں کمزوری و سُستی ہے اور وہ دنیا کی محبت میں مبتلا ہیں۔

۴ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو جو فتح و نصرت حاصل ہوئی تھی انھوں نے اس سے جو مطلب اخذ کیا وہ درست نہ تھا۔ انھیں یہ گمان ہو گیا تھا کہ چونکہ دین و آئین حق پر مبنی ہے اس لیے انھیں کبھی دشمن کے ہاتھوں شکست نہ ہوگی اور وہ اسلحہ و جنگی وسائل سے خواہ کتنی ہی غفلت برتیں خداوند تعالیٰ بہر صورت غیبی مدد کے ذریعے مشرکین کے مقابلے ان سے دفاع کرے گا۔ (المیزان: ج ۴، ص ۴)

دوسری طرف وہ یہ سمجھتے تھے کہ ایمان کا اظہار ہی کامیابی و سعادت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے، اور اس گمان میں مبتلا ہو گئے تھے کہ جہاد راہِ خدا میں اِستقامت و پائیداری کے بغیر وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ دَرحالیکہ قرآن کا ان کے اس غلط گمان کے بارے میں صریح ارشاد ہے کہ:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَ يَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ ○ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۴۲)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اس نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں وہ کون لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں"۔

چنانچہ وہ اپنے اس گمان اور خیالِ خام کے باعث ہی دشمن کے معمولی دباؤ کی وجہ سے میدانِ کارزار سے فرار کر گئے اور انتہائی مایوسی کی حالت میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ هَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۵۴)

کیا اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصّہ ہے اور کیا اس دل آزار حالت کے باوجود ہمیں نصرت و فتح حاصل ہوگی؟

۴) جب قریش نے یہ افواہ پھیلائی کہ رسولؐ خدا کو قتل کر دیا گیا تو اس سے ایک طرف تو دشمن کی جرأت و گستاخی بڑھ گئی اور دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں پر رعب طاری ہوگیا کیونکہ انھیں یہ گمان ہونے لگا کہ اسلام محض ذاتِ رسولؐ کی وجہ سے قائم ہے اور اس گمان نے ہی ان کے دلوں سے جنگ جاری رکھنے کی خواہش و ولولے اور اسلام پر قائم رہنے کے عزم و ارادے کو سلب کرلیا اور نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ انھوں نے ایک دوسرے سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محمدؐ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ قریش تم پر چڑھائی کریں تم خود ہی ان کی طرف بڑھ جاؤ اور ان کے ساتھ تعاون کا اعلان کردو۔

تعمیری شکست

اس میں شک نہیں کہ مسلمان کو جنگِ اُحد میں شکست فاش ہوئی اور اس کے باعث ستر افراد شہادت سے ہمکنار ہوئے مگر اس کے باوجود یہی جنگ بعض اعتبار سے درس آموز اور تعمیری بھی ثابت ہوئی۔ قرآنِ مجید نے اس کا کلّی طور پر جس طرح جائزہ لیا ہے اور اس شکست سے متعلق رسولؐ خدا نے جو موقف اختیار کیا ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ شکست درحقیقت تعمیری تھی۔ کیونکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی توجہ ان غلطیوں کی جانب مبذول کرائی گئی جو ان سے سرزد ہوئی تھی اور ان کی کمزوریوں کو ان پر عیاں کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں یہ درس بھی دیا گیا کہ وہ خود کو کس طرح منظم کریں اور جو تلخ تجربات انھیں حاصل ہوئے ہیں انھیں مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنے حوصلے بلند کریں اور اس شکست کی تلافی کے لیے خود میں ضروری طاقت و اعتماد پیدا کریں تاکہ آیندہ جب بھی دشمن سے مقابلہ ہو تو تمھیں نصرت و کامیابی نصیب ہو۔

یہاں ہم آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ان بعض پہلوؤں کا جائزہ لیں گے جو تعمیری اور درس آموز ثابت ہوئے۔

الف: اس جنگ میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اگر قرآنِ مجید کی روشنی میں دیکھا جائے تو

اس میں خداوند تعالیٰ کی مرضی شامل تھی۔ وَ مَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ''جو نقصان لڑائی کے دن تمھیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا''۔ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۶۶)

اور وہی مرضی و مشیتِ الٰہی ہے جو نظامِ ہستی میں ''قانونِ علیت'' کے نام سے جاری و ساری ہے اور اس کی بنیاد پر ہر وجود کی مخصوص علت ہے لیکن اس شکست کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیا ہے اور ان کی اس بات کے جواب میں کہ یہ بلا کہاں سے آ کر ہماری جان کو لگ گئی، صریحاً فرمایا کہ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے) یعنی اس شکست کا سرچشمہ تمھاری اپنی ہی ذات ہے اور اس کے عامل کی تلاش تم اپنے ہی اندر کرو۔

پیغمبرؐ خدا کے حکم کی خلاف ورزی، پہرہ داری کے فرض سے غفلت جنگ ختم ہو جانے سے قبل مالِ غنیمت جمع کرنے میں دلچسپی و سرگرمی، میدانِ کارزار سے گریز اور جہاد سے رُوگردانی ایسے افعال ہیں جو تم سے ہی سرزد ہوئے ہیں اور یہ قانونِ الٰہی ہے کہ جو بھی سپاہی میدانِ جنگ میں سُستی دکھائے گا اور اپنے باخبر و ہمدرد فرماندار کے حکم سے چشم پوشی کرے گا اور دشمن کے بارے میں سوچنے کے بجائے اس کی نظر مالِ غنیمت پر رہے گی تو ناچار اس کی سزا شکست ہوگی۔

ب: قرآنِ مجید نے اس امر کی صراحت کرنے کے بعد کہ اس حادثے کے وقوع پذیر ہونے کا اصل عامل مسلمانوں کی سُستی تھی۔ انھیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ شکست وقتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کتابِ مقدس نے یہ بھی تنبیہ کی ہے کہ وہ اس شکست کے باعث سُست و رنجیدہ خاطر اور فتح سے مایوس و نااُمید نہ ہوں۔ وَلَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا (دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو)۔ اس کے بعد اس نے یہ ہدایت بھی کی کہ جب تم سُستی اور پریشان دلی سے نکل آؤ گے تو اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ''تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو''۔

اس آیت نے اس بات کی وضاحت کرنے کے علاوہ، کہ ایمان ہی وہ عامل ہے جسے ہر چیز پر برتری حاصل ہے۔ اس حقیقت کو بھی ان کے گوش گزار کر دیا کہ شکست کا اصل سبب ان میں روحِ ایمانی کا ضعف تھا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۴۰)

''اس وقت اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے

مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں"۔

دوسری جگہ اسی بات کو اس پیرائے میں بیان فرمایا ہے:

"جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ جنگِ بدر میں اس سے دوگنی مصیبت تمھارے ہاتھوں فریق مخالف پر پڑ چکی ہے۔ اے نبی! ان سے کہہ دیجیے کہ یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اس آیت میں خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں کی دلداری کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم نے جنگِ بدر میں دشمن کے ستر آدمی قتل کیے اور ستر آدمیوں کو ہی قیدی بھی بنایا اور یہ تعداد تمھاری طرف سے جنگِ اُحد میں کام آنے والوں کے دو برابر ہے۔ اس آیت کے ضمن میں خداوند تعالیٰ نے اس امر کی جانب بھی توجہ دلائی کہ اس قادرِ مطلق کو ہر چیز پر قدرت و توانائی حاصل ہے۔ اور اگر تم اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر لو تو جنگِ بدر کی طرح عنایتِ الٰہی تمھارے شاملِ حال رہے گی۔

ج: قرآنِ مجید نے اس شکست کے جو مثبت پہلو بیان کیے ہیں انھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

① جنگِ بدر کے ختم ہونے اور سپاہ میں سے چند لوگوں کی شہادت کے بعد بعض مسلمان یہ آرزو کرتے رہتے تھے کہ وہ بھی شہادت سے سُرخ رو ہوں اور باہمی گفتگو میں ان کی زبان پر بھی ذکر آجاتا کہ کاش یہ فخر ہمیں نصیب ہوتا، مگر انھی میں چند لوگ دروغ گو اور ظاہر پرست بھی تھے۔ چنانچہ جب جنگِ اُحد کا سانحہ پیش آیا تو وہ لوگ جو حقیقی معنوں میں مومن اور شہادت کے عاشق و تمنائی تھے وہ تو جی جان سے دشمن کے ساتھ نبرد آزما ہوئے مگر انھی میں جو لوگ افتراء پرداز و ظاہر دار تھے انھوں نے جیسے ہی اپنے لیے خطرہ محسوس کیا میدانِ کارزار سے فرار کر گئے اور ان کا اصلی چہرہ ہمیشہ کے لیے بے نقاب ہو گیا۔ جیسا کہ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○

"تم تو راہِ خدا میں شہید ہونے سے قبل موت کی تمنائیں کر رہے تھے، لو اب وہ تمھارے

سامنے آگئی اور تم نے اسے آنکھ سے دیکھ لیا"۔ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۴۳)

۷ اُحد کا سانحہ ایسا حقیقت نما آئینہ تھا جس نے ہر مسلمان کے اصلی چہرے کو آشکار ان کے درجات ایمان کو روشن اور رسولِ خدا سے کس حد تک تعلق خاطر تھا اسے ظاہر وعیاں کردیا۔ اس موقعے پر حقیقی مومن و منافقین کی پوری شناخت ہوگئی اور دونوں کی صفیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ نظر آنے لگیں...... لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا "تاکہ مومنوں کو بھی پہچان لیا جائے اور منافقوں کو بھی پہچان لیا جائے"۔

اس موقعے پر مومنوں کو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اندازہ ہوگیا، اور وہ اپنی اصلاح کے لیے کوشش کرنے لگے اور جنگِ اُحد ایسی آتش ثابت ہوئی جس کی تپش نے کثافتیں اور آلودگیاں دُور کرکے انھیں عیوب سے پاک وصاف کردیا۔ ولیمحص الذین امنوا "اور وہ آزمائش کے ذریعے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں سے الگ کردینا چاہتا تھا"۔

اس کے ساتھ ہی حضرت علی علیہ السلام، حضرت حمزہؓ، حضرت ابودجانہؓ، حضرت حنظلہؓ، حضرت اُمِ عمارہؓ وغیرہ جیسے صحابہ رسولؐ کے چہرے درخشاں ونمایاں ہوگئے۔ ان حضرات نے اپنے کردار سے ثابت کردیا کہ ان کے دلوں میں دینِ اسلام اور رسولِ خدا کے علاوہ کسی چیز کا خیال گمان تک نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ چہرے بھی سامنے آگئے جن کو قرآنِ مجید نے ان الفاظ میں یاد کیا ہے...... اھمتم انفسھم ان کی ساری اہمیت اپنی ذات ہی کے لیے تھی۔ انھیں بس اپنی ہی جان کی فکر تھی اور دینِ اسلام و پیغمبرِ خدا سے کوئی سروکار نہ تھا۔

آخری وہ بات جس کا استخراج قرآنِ مجید سے ہوتا ہے یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات کا ہر قوم وملت کی زندگی میں رُونما ہونا لازمی امر ہے تاکہ ہر شخص کے دل میں جو کچھ ہے وہ ظاہر و آشکار ہوجائے اور ان کی صفیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجائیں۔ اس کے علاوہ جب لوگ اس طرح کے حوادث سے دوچار ہوں گے تو ان کے ذریعے ان کی تربیت ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ان کے قلب پاک اور صفیں خالص ہوجائیں گی۔

لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ

"تمھارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے"۔ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۵۴)

طاقت کا اظہار

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی غیر متوقع شکست نے مدینہ کے منافقوں اور یہودیوں کو بہت گستاخ و بے باک بنا دیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں سے حقارت و سرزنش کے ساتھ زبان درازی تک کرنے لگے تھے۔ ان اندرونی سازشوں اور اِفترا پردازیوں کو ناکام بنانے کے لیے جن کے رُونما ہونے کا احتمال ہوسکتا تھا خداوند تعالیٰ کی طرف سے رسولؐ خدا کو حکم دیا گیا کہ وہ اتوار کے دن آٹھ شوال کو دشمن کا تعاقب کریں۔ اس مشق میں وہ لوگ بھی شریک کیے جاسکتے ہیں جو گذشتہ جنگ کے موقع پر میدانِ کارزار میں موجود تھے۔ (بحارالانوار: ج ۲۰، ص ۶۴)

اس شرط میں ممکن ہے یہ راز پنہاں ہو کہ رسولؐ خدا یہ چاہتے تھے کہ اس گروہ کو جو جہاد میں شرکت کرنے کے لیے لیت و لعل سے کام لے رہا تھا نفسیاتی و اجتماعی اعتبار سے تنبیہ کرسکیں اور ان سپاہیوں کے لیے یہ بھی درسِ عبرت ثابت ہو تاکہ گذشتہ جنگ میں ان سے جو تقصیر ہوئی تھی اس کی تلافی ہوسکے اور رسول اکرم ﷺ پر یہ امر واضح ہوجائے کہ وہ اپنے ایمان اور خلوص میں کس درجے پر ہیں۔ اس کے علاوہ رسولؐ خدا یہ بھی جانتے تھے کہ اس اقدام کے ذریعے کوئی جنگ واقع نہیں ہوگی اور دشمن مسلمانوں کے چنگل سے نکل کر فرار کر جائیں گے۔ رسولؐ خدا نے مجروحین کو اس جنگی مشق میں شرکت کی دعوت اس لیے دی تھی کہ ان کے حوصلے بلند ہوں اور ان میں خود اعتمادی پیدا ہوسکے۔

فوج بالخصوص مجروحین کو جو کاری زخم آئے تھے اور جس رنج و تکلیف سے وہ دوچار تھے اس کے کرب کو وہ ابھی تک محسوس کر رہے تھے۔ انھوں نے حکمِ خدا و رسولؐ پر لبیک کہا، اور آنحضرت ﷺ کے ہمراہ مدینے سے اپنی منزل "حمراء الاسد" کی جانب روانہ ہوگئے۔

قرآنِ مجید نے ان کے اس مخلصانہ اور ایثار پسندانہ اقدام کی ستائش کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ○ (سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۷۲)

"جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسولؐ کی پکار پر لبیک کہا، ان

میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے"۔

قریش کا وہ لشکر جو اس ارادے سے "روحا" اس میں اترا تھا کہ مدینہ جا کر اسے تہس نہس کر دے گا جب اسے لشکر اسلام کی روانگی کا علم ہوا اور بالخصوص "معبد خزاعی" نے اس کی کیفیت کو ابوسفیان سے بیان کیا تو اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور فرار کر کے مدینہ چلا گیا۔

مسلمانوں نے تین روز تک حمراء الاسد میں سپاہِ قریش کا انتظار کیا اور دشمن کے دل میں رُعب و ہیبت پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے ہر رات میں مختلف جگہوں پر آگ روشن کی۔ چنانچہ جب انھیں یہ اطمینان ہو گیا کہ دشمن مرعوب ہو کر فرار کر گیا ہے تو وہ واپس مدینہ آ گئے۔

سپاہِ اسلام کی یہ دلیرانہ جنگی مشق دشمنانِ دین، منافقین اور یہود کے حوصلوں پر اثرانداز ہوئی۔ اس کے جو منفی و مثبت اثرات نمایاں ہوئے ان کی کیفیت ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱. رسولِ خدا کی دُوراندیشی، تدبر و انتظامی صلاحیت، فرمانداری کا بوجھ، قطعی فیصلے کی قوت اور بہر صورت شرک و الحاد کے خلاف استقامت اور پائیداری سب پر روشن و عیاں ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی فرمانداری و قیادت جیسے اُوصاف بھی پہلے سے زیادہ ثابت و نمودار ہو گئے۔

۲. جن سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے تھے، ان کے دلوں میں دوبارہ حملے کی اُمنگ پیدا ہو گئی۔ گذشتہ چند روز قبل والی جنگ میں شکست کے باعث جو اضطراب و پریشان حالی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی وہ اب سپاہیوں کے دلوں سے قطعی زائل ہو گئی اور واپس مدینہ آ گئے۔

۳. وہ دشمن جو اپنی طاقت کے نشے میں چور اور اپنی عسکری طاقت کی برتری کے خیال میں مست مکہ کی جانب چلا جانا چاہتا تھا، راستے میں اس کے اسی باطل احساس نے اسے مجبور کیا کہ وہ دوبارہ مدینہ کی طرف رُخ کریں اور وہاں پہنچ کر وہ اسلام نیز رسولِ خدا کا کام تمام کر دیں مگر اس نے جب رسولِ خدا کی اس فوجی طاقت اور جنگی تیاری کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جس کی اسے ہرگز توقع نہ تھی تو اس پر دہشت و سراسیمگی طاری ہوئی۔ چنانچہ جس طرح جنگِ اُحد سے قبل وہ مایوس و ناکام مکہ واپس گیا تھا اس مرتبہ بھی اسی حالت میں فرار کر کے مکہ پہنچا۔

۳ مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی۔ اس کی خبر یہودیوں اور منافقین نے سارے شہر میں پھیلا دی تھی۔ وہ اپنی جگہ یہ فرض کیے ہوئے تھے کہ مسلمانوں پر ایسی کاری ضرب لگ چکی ہے کہ وہ اب رسولِ اکرم ﷺ کے اطراف سے متفرق ہوجائیں گے اور ان میں اتنا حوصلہ نہ رہے گا کہ اپنی عسکری کارروائی کو جاری رکھ سکیں۔ لیکن اپنی اس خام خیالی کے برعکس جب انھوں نے مسلمانوں کے جذبہ ایثار و قربانی اور دلیرانہ اقدام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو انھیں پہلے سے کہیں زیادہ مایوسی و ناامیدی ہوئی اور وہ لوگ جو مسلمانوں کو حقیر نظروں سے دیکھا کرتے تھے اب خود ہی ایسے ذلیل و خوار ہوئے کہ منہ چھپائے پھرتے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس وقت منافقین کے سرغنہ نے دستور کے مطابق یہ چاہا کہ رسولِ خدا کے ارشاد سے قبل زبان کھولے اور کچھ کہے تو لوگوں نے اس کے کُرتے کا دامن پکڑ کر اسے نیچے کھینچ لیا اور دشمن خدا کہہ کر اس پر لعن وطعن کی۔ (سیرۃ حلبیہ، ج ۲)

اُحد اور اَحزاب (خندق) کے درمیان فاصلہ

جنگِ اُحد اور جنگِ اَحزاب کے درمیان تقریباً دو سال کا فاصلہ تھا۔ اس عرصے میں مشرکین، بالخصوص مدینہ کے اطراف میں آباد قبائل اور یہودی اسلام کے خلاف سازش کرنے میں سرگرم عمل رہے اور رسول اکرم ﷺ پوری ذہانت و ہوش مندی اور مکمل آمادگی و ہمت کے ساتھ ان کے ہر حربے کا مقابلہ کرتے رہے۔ رسولِ خدا دینِ اسلام کی ترویج و اشاعت کی خاطر اطراف و جوانب میں آباد قبائل کے درمیان تبلیغی جماعتیں بھی بھیجتے رہے لیکن افسوس کہ وہ قبائل مبلغین اسلام کے ارشاداتِ عالیہ سے مستفید ہونے کے بجائے ان کے ساتھ جنگ کرتے تھے۔ سانحہ رجیع میں وہ چھ مبلغ جنھیں رسولِ خدا نے دینِ اسلام کی اشاعت کی خاطر روانہ کیا تھا قبائل "عضل" اور "قارہ" کے لوگوں کی وجہ سے شہید ہوئے۔ اسی طرح "بئر معونہ" کے جانکاہ حادثے میں تقریباً چالیس معلمین قرآن اور مبلغین اسلام قبیلہ "بنی لحیان" اور دیگر قبائل کے ہاتھوں شہادت سے ہمکنار ہوئے۔

دراصل یہ واقعات و حادثات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ رسولِ خدا کی کوشش یہی تھی

کہ دینِ اسلام کی اشاعت وترویج ہو۔ اگرچہ آنحضرتؐ اس واقعیت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اس خطے میں دشمن اس تحریک کو روکنے کے لیے اپنی لشکری طاقت کو استعمال کر رہا ہے اور اس راہ میں خطرات و دشواریاں بہت کم ہیں مگر اس کے باوجود آنحضرتؐ کی یہ تمنا تھی کہ کسی تصادم کے بغیر دینِ اسلام کی اشاعت وتبلیغ کے ذریعے لوگ توحید کی جانب کشاں کشاں چلے آئیں۔

رسولِ خدا نے جن سریوں اور غزوات میں دشمنوں کا مقابلہ کیا ان کی مختصر فہرست ذیل میں درج ہے:

۱۔ سریہ ابوسلمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سو پچاس مسلمانوں کے ساتھ شرکت فرمائی اور پہلی محرم سن چار ہجری کو قبیلہ بنی اسد سے مقابلہ ہوا۔

۲۔ سریہ عبداللہ بن انیس میں سفیان ابن خالد کے ساتھ "عرنہ" نامی مقام پر پانچ محرم سن ۴ ہجری کو مقابلہ ہوا۔

۳۔ غزوۂ بنی نضیر میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نضیر قبیلے کے یہودیوں کی شرپسندیوں اور خیانت کاروں کو روکنے نیز انھیں مدینہ سے شہر بدر کرنے کے لیے ربیع الاول سنہ چار ہجری میں شرکت فرمائی۔

۴۔ غزوۂ بدر موعد میں ابوسفیان کی دریدہ دہنی کا دندان شکن جواب دینے کے لیے جنگِ اُحد کے بعد بدر کے علاقہ میں بتاریخ ۱۶ ذی قعدہ سنہ چار ہجری میں شرکت فرمائی۔

۵۔ غزوۂ دومۃ الجندل میں ان شرپسندوں کی سرکوبی کے لیے رسولِ خدا نے شرکت فرمائی جنھوں نے مسافروں پر راستے تنگ کر دیئے تھے اور ان کے ساتھ ظلم وستم کا سلوک روا رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسلامی مرکزی حکومت پر بھی دست اندازی شروع کر دی تھی۔ یہ غزوہ ۲۵ ربیع الاول سنہ پانچ ہجری میں پیش آیا۔

غزوۂ احزاب

غزوۂ احزاب یا خندق رسولِ خدا کے خلاف دشمنانِ اسلام کا عظیم ترین اور وسیع ترین معرکہ تھا۔ اس جنگ میں قریش، یہود اور جزیرۃ العرب کے بہت سے بت پرست قبائل نے متحد ہو کر عہد و پیمان کیا تھا کہ مسلمانوں پر ایسا سخت حملہ کیا جائے کہ ان کا کام تمام ہو جائے۔

عملی طور پر یہ سازش اس وقت شروع ہوئی جب کہ یہودی قبیلہ ”بنی نضیر“ کے سرداروں کو دینِ اسلام کے ہاتھوں کاری ضرب لگی تھی اور انھیں مدینہ سے نکال کر باہر کر دیا گیا تھا۔ یہاں سے انھوں نے مکہ کا رُخ کیا تاکہ رسولِ خدا سے انتقام لینے کے لیے وہ قریش سے گفتگو کر کے ان سے مدد لیں۔

ابوسفیان نے ان کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا اور کہا کہ (ہمارے نزدیک عزیز ترین وہ افراد ہیں جو محمدؐ کے ساتھ دشمنی میں ہمارے معاون و مددگار ہیں) اس کے بعد انھوں نے باہمی طور پر عہد و پیمان کیا اور یہ قسم کھائی کہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور ان میں سے جب تک ایک مرد بھی زندہ رہے گا وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ و جدال کرتا رہے گا۔

قریش کو جنگ کے لیے آمادہ کرنے کے بعد یہی فتنہ انگیز یہودی نجد کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں قبیلہ غطفان اور قبیلہ بنی سلیم سے گفتگو کی اور ایک سال تک خیبر کا محصول ادا کرنے کا وعدہ کر کے انھیں بھی رسولِ خدا کے خلاف جنگ کرنے کی ترغیب دلائی۔

آخر کار اسلام کے خلاف متحدہ محاذ قائم ہو گیا اور تقریباً ایک ہزار ایسے جنگ آزما بہادروں سمیت (جن کا شمار قوی ترین اسلام دشمن عناصر میں ہوتا تھا) ابوسفیان کی قیادت میں اسلام کو نیست و نابود کرنے کی خاطر مدینہ کی جانب روانہ ہوئے۔

رسولِ خدا کو جب اس عظیم سازش کا علم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ خندق کھودی جائے۔ یہ تجویز پسند کی گئی اور فوراً ہی یہ کام شروع کر دیا گیا۔

اس زمانے میں مدینہ کا بیشتر علاقہ پہاڑوں، ایک دوسرے سے متصل مکانوں اور نخلستان سے گھرا ہوا تھا۔ چنانچہ یہی سب چیزیں مل کر فصیل کا کام کرتی تھیں۔ اس وقت حدِ فاصل کو وعبیدہ اور راتج کے درمیان کی جگہ اور اسی جانب سے حملہ ہو سکتا تھا۔ رسولِ خدا نے حکم دیا کہ دس دس آدمی مل کر چالیس چالیس ذراع خندق کھود ڈالیں۔

مسلمان پوری لگن اور خالص دلچسپی و تعلق خاطر کے ساتھ اس کام میں مشغول ہو گئے۔ اگر کوئی بہت ہی ضروری کام ہوتا تو وہ رسولِ خدا سے اجازت لے کر اپنے کام سے دست کش ہو کر اس جگہ سے جاتے جہاں انھیں معین کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى

اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (سورۂ نور: آیت ٦٢)

"مومن تو اصل وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ اے نبیؐ، جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسولؐ کے ماننے والے ہیں"۔

اس وقت حضرت سلمان فارسیؓ سب سے زیادہ محنت و ہمت سے کام لے رہے تھے۔ چنانچہ واقدی اور حلبی نے لکھا ہے کہ وہ دس آدمیوں کے برابر کام کر رہے تھے۔ ان کی اس لگن و جانفشانی کو دیکھ کر مہاجر و انصار دونوں کو ہی حیرت ہوتی تھی اور ہر گروہ ان کے بارے میں یہی کہتا کہ: "سلمان ہمارے اپنے ہیں" اور جب رسولؐ خدا نے ان گروہوں کی یہ گفتگو سنی تو فرمایا: سَلْمَانُ مِنَّا اَهلَ الْبَيت "سلمانؓ تو میرے اہلِ بیتؑ میں سے ہیں"۔

اگرچہ منافقین بھی بظاہر مومنین کے دوش بدوش خندق کھودنے کے کام میں لگے ہوئے تھے لیکن انھیں جب بھی موقع ملتا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر رسولؐ خدا سے اجازت لیے بغیر اپنے کام سے دست کش ہو جاتے اور مختلف بہانوں سے محاذِ حق کو کمزور کرنے کی جستجو میں لگے رہتے۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (سورۂ نور: آیت ٦٣)

"اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے چلے جاتے ہیں۔ رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے"۔

خندق کی کھدائی کا کام چھے روز میں یعنی احزاب کی سپاہ کے مدینہ پہنچنے سے تین روز قبل مکمل ہو گیا اور تین ہزار جنگجو مسلمان اس کی پشت پر اپنی اپنی جگہ متعین ہو گئے۔

کفار کی سپاہ کو جب یہ خندق نظر آئی تو وہ مجبوراً خندق کے اس پار ہی رک گئے اور وہیں ا

نھوں نے اپنے خیمے لگائے۔

اندرونِ مدینہ جنگی محاذ کھولنا

سپاہِ کفار کی کثرت، سامانِ خوراک کی کمی، مکہ و مدینہ کے درمیان دُوری اور اس قول نے جو قبیلہ "بنی نضیر" کے سرداروں نے قریش کو دیا تھا، لشکرِ کفار کے فرمان داروں کو اس بات پر مجبور کیا کہ مسلمانوں کو جلد از جلد شکست دینے کے لیے اندرونِ شہر محاذ قائم کریں۔ چنانچہ حی ابن اخطب بنی قریظہ کے حصار میں داخل ہوا اور اس کے سردار سے گفتگو کی۔ اسے شیطانی مکروفریب نے مجبور کیا کہ رسولِ خدا سے معاہدہ کیا تھا۔ اس کی خلاف ورزی کی اور اس طرح بنی قریظہ کے نوسو جنگجو سپاہی مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے، تاکہ خندق کے اس پار جو کفار کا لشکر پڑا ہوا ہے اسے فتح و نصرت حاصل ہو جائے۔

اس خبر کے پھیلنے سے مسلمانوں میں پریشانی و سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی، کیونکہ ایک طرف تو دشمن کے دس ہزار سپاہیوں نے ان کا محاصرہ کر رکھا تھا اور دوسری طرف "بنی قریظہ" کے یہودی عہد شکنی کر کے دشمن کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی منافقین نے بھی رسولِ خدا کو طعنے دینے شروع کر دیے۔ وہ آنحضرتؐ کا مذاق اُڑا کر کہتے تھے کہ محمدؐ تو ہمیں "خسرو" اور "قیصر" کے خزانوں کے سبز باغ دکھا رہے ہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ رفع حاجت تک کے لیے بھی اپنے گھروں سے باہر قدم نہیں نکال سکتے۔ خدا و پیغمبرؐ خدا نے ہمیں فریب کے علاوہ دیا ہی کیا ہے۔

قرآنِ مجید نے اس بحرانی کیفیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ (سورۂ احزاب: آیت ۱۰-۱۱)
>
> "جب دشمن اُوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئیں تو جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آگئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے، اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بُری طرح ہلا کر رکھ دیے گئے"۔

مومن اس کے باوجود خدا پر توکل اور رسول اکرم ﷺ سے وعدوں پر اعتماد کر کے ایمان و استقامت پر قائم رہے۔

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِیْمَانًا وَّ تَسْلِیْمًا ○ (سورۂ احزاب: آیت ۲۲)

"اور سچے مومنوں کا حال اس وقت یہ تھا کہ جب انھوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اُٹھے کہ "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی اور اس واقعے نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا"۔

لیکن منافق اور "ضعیف الایمان" لوگ ایسے مرعوب و وحشت زدہ ہوئے کہ وہ مختلف بہانے بنا کر یہ کوشش کرنے لگے کہ محاذِ جنگ سے فرار کر کے کسی طرح مدینہ سے چلے جائیں۔

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ یٰۤاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا وَیَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِیَّ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ ؕۛ وَ مَا هِیَ بِعَوْرَةٍ ۚۛ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ○ (سورۂ احزاب: آیت ۱۳)

"جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ "اے یثرب کے لوگو! تمھارے لیے ٹھہرنے کا اب موقع نہیں ہے۔ پلٹ چلو جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ "ہمارے گھر خطرے میں ہیں"، حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے دراصل وہ محاذ سے بھاگنا چاہتے تھے"۔

رسولِ خدا کی ذمہ داری اس وقت بہت سخت و دشوار تھی۔ ایک طرف تو آنحضرتؐ کو اس سپاہ کے مطابق جس کی تعداد سپاہِ اسلام سے دس گنا زیادہ تھی، اپنے کمزور محاذ کو مضبوط و آمادہ کرنا دوسری طرف ان غداروں کی سرکوبی تھی جو اندرونِ محاذ ریشہ دوانی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس سپاہ کی دلداری کے لیے جن کے دل مضطرب اور جانیں لبوں تک پہنچ گئی تھیں آپؐ کو حوصلہ افزائی کرنی تھی۔ ان تمام نامساعد حالات کے باوجود جو اس وقت رُونما ہو رہے تھے۔ آپؐ اپنے اصحاب کو فتح و کامرانی کی خوشخبری بھی دے رہے تھے جو ان ظاہری ناکامیوں کے پس پشت پنہاں تھیں۔

رسولِ خدا انتہائی سخت و دشوار حالات، یہاں تک کہ بنی قریظہ کی عہد شکنی کے بعد بھی اپنی سپاہ کے حوصلے بلند کرنے کے لیے برابر فتح و کامرانی کا یقین دلا رہے تھے۔

کفر و ایمان

تقریباً ایک ماہ تک مدینہ کا محاصرہ رہا اور قریش کی کوشش لاحاصل رہی۔ آخرکار سپاہِ مکہ کے پانچ عرب دلاور خندق کا وہ حصّہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کا عرض نسبتاً کم تھا۔ چنانچہ اسے انھوں نے عبور کیا اور سپاہِ اسلام کو جنگ کے لیے للکارا۔ سپاہِ اسلام میں جوش و اشتعال پیدا کرنے کے لیے عمرو ابن عبدود سب سے زیادہ رجزیہ اشعار پڑھ رہا تھا۔ اس نے بعد میں کہا کہ سپاہِ اسلام کو للکارنے کے لیے میں نے شور مچایا کہ میری آواز تک بیٹھ گئی۔

سپاہِ اسلام میں حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی للکار کا جواب دیتا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی شمشیر حضرت علی علیہ السلام کو عنایت فرمائی اور آپؑ کے حق میں دُعا کی۔ جس وقت حضرت علی علیہ السلام عمرو کے مقابل آئے تو رسولِ خدا نے فرمایا:

بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّهٗ اِلَی الشِّرْکِ کُلِّهٖ

"یعنی ایمانِ کامل اور سراپا شرک ایک دوسرے کے مقابل آگئے ہیں"۔

دونوں دلداروں نے رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے قبضۂ شمشیر کو ہاتھ میں لے لیا اور دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اسے مار گرایا۔

عمرو کے ساتھیوں نے جب اسے خاک و خون میں لوٹتے دیکھا تو وہ میدانِ جنگ سے بے تحاشا بھاگے۔ عمرو کے مارے جانے کے بعد قریش کے حوصلے پست ہو گئے۔ اَحزاب کے سرداروں نے جب اپنی انتقام جویانہ کارروائی اور دیگر ان عوامل میں جن کا آئندہ ذکر کیا جائے گا خود کو بے دست دیکھا تو انھوں نے محاصرہ کو جاری رکھنے کا خیال ترک کر دیا اور واپس مکہ چلے گئے۔

غزوۂ اَحزاب میں جانبازانِ اسلام میں سے چھے افراد نے جامِ شہادت نوش کیا اور مشرکین کے آٹھ سپاہی مارے گئے اور اس طرح ۲۳ ذی القعدہ سنہ ۵ ہجری کو یہ جنگ ختم ہوئی اور اَحزاب کا لشکر شرمناک شکست سے دوچار ہو کر اپنے گھروں کو سدھارا۔

غزواتِ اُحزاب، بنی قریظہ اور بنی مصطلق

لشکرِ اُحزاب (کفار) کی شکست کے اسباب

جنگِ اُحزاب میں اسلام کے خلاف شرک کی سب سے بڑی طاقت کے شکست کھا جانے کے مختلف اسباب وعوامل تھے جن میں سے چند ذیل میں درج ہیں:

۱ خداوند تعالیٰ کی آشکار اور پنہاں مدد:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (سورۂ اَحزاب۔ آیت ۹)

"ایمان لانے والو! اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے جب تم پر لشکر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر شدید آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم اس وقت کر رہے تھے"۔

۲ لشکرِ اُحزاب کے پہنچنے سے قبل خندق کا تیار ہو جانا جس کی وجہ سے نہ صرف دشمن شہر میں داخل نہ ہو سکا بلکہ اس کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور نفسیاتی طور پر یہ اس کے لیے کاری ضرب تھی۔

۳ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی دلیری وشجاعت مندی کے باعث مشرکین کا سب سے بڑا دلاور عمرو بن عبدود ہلاک ہوا۔ حضرت علی علیہ السلام کی تقدیر سازی کاری ضرب مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے میں نہایت مفید اور کفار کے حوصلے پست کرنے میں انتہائی کارآمد ثابت ہوئی۔

۴ "نعیم ابن مسعود" کی وجہ سے دشمن کی صفوں میں اختلاف وخلیج کا پیدا ہو جانا، وہ قریش و یہود کے درمیان سربرآوردہ اور قابلِ اعتماد شخص تھے۔ جنگ سے کچھ عرصہ قبل

تک وہ محاذِ کفر میں شامل رہے مگر ایک دن خفیہ طور پر رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دینِ اسلام سے مشرف ہونے کے بعد رسولِ خدا کی اجازت سے انھوں نے جنگی نیرنگی کا حربہ استعمال کیا اور لشکرِ کفار کے ذہنوں میں شک و وسواس پیدا کر کے اُحزاب کی تشکیل کو درہم برہم کر دیا۔

انھوں نے سب سے پہلے "بنی قریظہ" کے یہودیوں سے ملاقات کی اور گفتگو کے درمیان ان کے دلوں میں قریش کی طرف سے بدگمانی پیدا کر دی۔ اس کے ساتھ بات ہی بات میں انھوں نے قریش کو اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ سپاہِ اُحزاب کے سامنے یہ شرط رکھیں کہ ہم اس صورت میں تمھارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں کہ اپنے سرداروں میں سے چند افراد کو ہمارے پاس بطورِ یرغمال بھیجو۔

اس کے بعد وہ "ابوسفیان" کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ "بنی قریظہ" نے محمدؐ کے ساتھ جو عہد شکنی کی ہے اس پر وہ پشیمان ہیں۔ اپنے اس اقدام کی تلافی کے لیے انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم میں سے چند لوگوں کو بطورِ یرغمال پکڑ لیں اور انھیں محمدؐ کے حوالے کر دیں۔

"نعیم" کی کوشش کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ وہ دو گروہ جو باہمی طور پر متحد ہو گئے تھے اب ایسے بدظن ہو گئے کہ ایک نے دوسرے سے جو بھی پیشکش کی اسے رد کر دیا گیا۔ دشمن کے مقابل رسولِ خدا کی اِستقامت و پائیداری اگرچہ اس وقت مسلمان دشوار ترین مراحل سے گزر رہے تھے اور پوری فضا ان کے خلاف ہو چکی تھی مگر ان صبر آزما حالات کے باوجود لشکرِ اسلام اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ دشمن کو ذرہ برابر بھی رعایت دی جائے۔

۵ رسولِ خدا کی دانش مندانہ فرمانداری اور مسلسل میدانِ کارزار میں موجودگی عین وقت پر صحیح تدبر، سیاسی نیرنگی و جنگی مشق کے باعث بیرونی و اندرونی دشمن کے دلوں پر مایوسی کا چھا جانا۔

۶ فوجی نظم و ضبط، خندق کے نگہبانوں نیز گشتی پہرہ داروں کی زُود فہمی اور محاذِ جنگ کے متعلق تمام قواعد و آداب سے مکمل واقفیت۔

۷ سردی، دشمن کے جانوروں کے لیے چارے کی کمی، میدانِ کارزار کی مکہ سے دُوری، حملہ آور سپاہ کی جسمانی کوفت بالخصوص اس وقت جب کہ وہ بار بار سعی و کوشش کے بعد بھی

خندق کو عبور کرنے میں ناکام رہا۔

جنگ اُحزاب کا خاتمہ اور مسلمانوں کی یورش کا آغاز

اسلامی طاقت کے خلاف جو محاذ قائم کیے گئے اور اس کے خلاف جن امکانات کو بروئے کار لایا گیا ان میں جنگ اُحزاب، دشمن کی قوت نمائی کا آخری مظہر تھی۔ ایسی عظیم طاقت کا اسلام کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا فطری طور پر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اس دن کی فتح و نصرت کے آگے دشمن کے حوصلے قطعی پست پڑ گئے اور اس کی ہر اُمید مایوسی میں بدل گئی۔ چنانچہ یہ وہی چیز ہے جو جنگ اُحزاب کے ذریعے حاصل ہوئی۔ اور اسی وجہ سے رسولِ خدا نے مسلمانوں کو خوشخبری دی تھی کہ اس مرحلے پر پہنچ کر اسلامی تحریک کا از سرِ نو آغاز ہوگا اور اس ضمن میں فرمایا تھا کہ اَلْيَوْمَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَا ، یعنی اس کے بعد ہم ان سے جنگ کریں گے نہ کہ وہ ہم سے آکر جنگ کریں گے"۔ (ارشاد مفید: ص ۵۶)

اس کے بعد واقعات بھی اسی طرح پیش آئے جیسا کہ رسولِ خدا نے پیشین گوئی کی تھی۔ مسلمانوں کی فتح و نصرت نے سیاسی، عسکری اور اقتصادی اعتبار سے مشرکین کے پیکر پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ رسولِ خدا کی حینِ حیات تو ان میں اتنی بھی سکت باقی نہ رہی کہ اپنی کمر سیدھی کر سکیں اور اپنی اس شکست وریخت کی تلافی کر سکیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے ان مختلف پہلوؤں سے جن کا اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے وہ مقام و مرتبہ حاصل کر لیا کہ اپنی توانائی اور برتری کے بل پر ہر سازش کو اس سے پہلے کہ وہ وجود میں آئے نیست و نابود کر دیں۔

عہد شکن لوگوں کی سزا

لشکرِ اُحزاب اگرچہ وقتی طور پر مسلمانوں کے چنگل سے نکل کر فرار کر گیا لیکن وہ داخلی خیانت کار (یہود بنی قریظہ) جو دشمن کے سپاہ کی تعداد، کثیر سامانِ جنگ اور اس کے پُرفریب وعدوں کا شکار ہو گئے تھے اور اس کی فتح و نصرت کا انھیں پورا یقین تھا، اب بھی مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس خیال کے پیشِ نظر کہ وہ عدل و انصاف کے چنگل سے بچ کر نہ نکل جائیں انھیں اس کی خیانت کاریوں کی سزا دینی ضروری تھی۔

چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے ہی غزوۂ خندق سے واپس تشریف لائے فوراً ہی فرشتۂ وحی نازل ہوا، اور پیغمبر اکرم کو یہ ہدایت دی کہ آنحضرتؐ بنی قریظہ کے قلعہ کی جانب تشریف لے جائیں۔ لہٰذا رسولؐ خدا ۲۳ ذی القعدہ کو تین ہزار جنگجو افراد کو ساتھ لے کر دشمن کے قلعہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اس لشکر کے علم بردار حضرت علی علیہ السلام تھے اور تیزی کے ساتھ ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ (مغازی: ج ۲، ص ۴۹۶)

نمازِ عصر ادا کرنے کے بعد دشمن کے قلعے کا محاصرہ کیا جو پندرہ یا پچیس روز تک جاری رہا۔ اس عرصے میں دونوں طرف سے صرف تیر اندازی ہوتی رہی اور اس کے علاوہ کوئی واقعہ رُونما نہیں ہوا۔

یہودیوں نے جب دیکھا کہ اِستقامت میں کوئی فائدہ نہیں تو وہ کچھ غور و فکر کرنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اس طرح کی تجاویز پیش کیں کہ انھیں مدینہ سے چلے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ پہلے تو وہ اپنا مال و اسباب بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر بعد میں اس بات کے لیے بھی راضی ہوگئے کہ وہ اپنے ساز و سامان کو چھوڑ کر کوچ کر جائیں۔ لیکن رسولؐ خدا کو ابھی تک یہ یاد تھا کہ "بنی قینقاع" اور بنی نضیر نے مدینہ سے باہر نکل جانے کے بعد کیا کیا خیانت کاریاں کی تھیں اور آنحضرتؐ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر یہ لوگ عدل و انصاف کے چنگل سے نکل گئے تو ممکن ہے کہ اسلام کے خلاف نئی سازشیں تیار کرنے میں لگ جائیں۔ اسی لیے آپؐ نے ان کی تجاویز کو رَدّ کر دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ وہ بلا قید و شرط ہتھیار ڈال دیں۔

محاصرے کو جاری دیکھ کر بنی قریظہ کے واسطے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود کو تسلیم کر دیں چنانچہ انھوں نے قلعے کے دروازے کھول دیئے اور رسولؐ خدا کے حکم سے اسلحہ ان سے لے لیا گیا اور انھیں ایک گوشہ میں حراست میں لے لیا۔ رسولؐ خدا کی تجویز اور مقید یہودیوں کے مشورے سے قبیلہ اَوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ کو جو کہ جنگِ احزاب کے مجروحین میں سے تھے، عدالتِ پاداش کا حاکم مقرر کیا گیا۔

سعد نے مردوں کے قتل، عورتوں اور بچوں کی اسیری اور ان کے تمام مال و اسباب پر بطورِ مالِ غنیمت قابض ہو جانے کا حکم صادر کیا۔ جب سعد نے اپنا حکم صادر کر دیا تو رسولؐ خدا نے ان سے فرمایا کہ "سچ تو یہ ہے کہ ان کے بارے میں تم نے وہی حکم صادر کیا ہے جو خداوند نے

سات آسمانوں پر جاری کیا تھا"۔

حضرت سعد ایک مومن، متقی، دانش مند اور سیاستمدار شخص تھے۔ اسی لیے انھوں نے جو فیصلہ صادر کیا وہ اس دور کے اسلامی معاشرے سے واقفیت پر مبنی تھا اور چونکہ وہ خیانت کار و سازش گر عناصر کی کیفیت سے بخوبی واقف تھے اسی لیے انھوں نے اس پہلو کو بھی مدنظر رکھا۔ سعد نیز دیگر مسلمانوں پر بارہا ثابت ہو چکا تھا کہ یہودی شرپسند اور ضدی ہونے کے باعث ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ اگرچہ رسولؐ خدا نے ہمیشہ نرمی و درگزر سے کام لیا لیکن اس کے باوجود انھی لوگوں نے جنگِ اُحد اور جنگِ اَحزاب کے فتنے کو ہوا دی اور قتل و غارت گری نیز تمام نقصانات کے سبب بنے۔

کیا یہ تجربات اس مقصد کے لیے کافی نہ تھے کہ سعد ان خیانت کاروں کے بارے میں وہی اقدام کریں جو رسولؐ خدا "ابوعزہ" خیانت کار کے بارے میں فرما چکے تھے۔ اور وہی بات نہ دُہراتے جو رسولؐ خدا کی مبارک زبان سے نکل چکی تھی، یعنی مومن ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا اور وہ بھی (حی ابن خطب) جیسے خیانت کار کے بارے میں جس نے تختہ دار پر بھی نہایت گستاخی کے ساتھ رسولؐ خدا سے کہا تھا کہ اس دشمنی کے باعث جو میرے اور تیرے درمیان ہے میں خود کو قابلِ ملامت نہیں سمجھتا۔ (سیرۃ حلبیہ: ج۲، ص ۳۴۰)

اس کے علاوہ "بنی قریظہ" کی خیانت کاریوں پر اگر غور کیا جائے تو ہم پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ رسولؐ خدا نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اسلام و یہودیت کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اس کا سبب وہ عہد شکنی تھی جو اسلام کے ساتھ وہ ہمیشہ کرتے تھے۔ طائفہ "بنی قینقاع" و "بنی نضیر" کے علاوہ خیبر اور وادی القریٰ کے یہودیوں کے ساتھ رسولؐ خدا کا جو بزرگوارانہ رویہ رہا اور جس تحمل و بردباری کا آنحضرتؐ سلوک فرماتے رہے نیز "بنی قریظہ" کے ساتھ جو مسالمت آمیز معاہدہ آپؐ نے کیا وہ ان حقائق کو سمجھنے میں ہمیں مدد دیتا ہے۔

اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ دشمنانِ اسلام جب اسلام و یہودیت کی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے ان واقعات کو بطور سند بیان کرتے ہیں تو وہ یا تو اسلام اور سیرتِ رسولؐ خدا سے واقف نہیں ہوتے اور یا اس میں ان کی کوئی خاص غرض شامل ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ جن بعض مسلم مؤرخین نے اس واقعۂ قتل کی صحت کے بارے میں شک و

تردید کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کی تقدیر ساز جنگ میں یہود کی عظیم خیانت کاری کو نہایت ہی معمولی حادثے سے تعبیر کیا ہے بالفاظِ دیگر وہ رسولِ خدا کے کردار، ایمانِ کامل کے سراپا کو کفر کے رُوبرو لے آئے ہیں اور یہودیوں کو انھوں نے کفر کا پاسبان قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے (غزوۂ اُحد) اور (غزوۂ احزاب) میں ان کے مجرمانہ افعال سے بھی چشم پوشی کی ہے۔ ان کا یہ اقدام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کی جانب توجہ نہیں کی کہ یہودیوں کے اس اقدام میں ان کی کینہ توزی اور اسلام دشمنی، ہم "بنی قریظہ" کی اولاد یعنی یہودیوں کی موجودہ نسل اسرائیل اور ان تمام صیہونیت کے پیروکاروں میں دیکھتے ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

"بنی قریظہ" کی خیانت کاری اور انھیں اس کی سزا دیے جانے کے واقعے کو تمام مورخین کے علاوہ محدثین، مفسرین، نیز مفید مرحوم، ابن شہر آشوب، قمی، طبری، علامہ مجلسی اور معاصرین میں علامہ طباطبائی نے اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے اس بنا پر خیانت کاروں کو ان کے کیے کی سزا دیے جانے کے بارے میں کسی توجیہ یا خدشے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

غزوۂ بنی قریظہ کا سودمند پہلو

"بنی قریظہ" یہود کا قلع قمع کیے جانے کے بعد مسلمانوں کو یہ اطمینان حاصل ہوگیا کہ انھوں نے ان جاسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے جو کہ اندرونِ محاذ سرگرمِ عمل تھے اور اس کی وجہ سے اسلامی حکومت کے مرکز میں قائم مشرکین کی عسکری ومخابراتی ایجنسی سے کسی داخلی شورش کا خطرہ بھی باقی نہ رہا۔ اور چونکہ مالِ غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ اسلحہ بھی لگا تھا اسی لیے مسلمانوں کی اقتصادی و عسکری طاقت کو ایسی تقویت پہنچی کہ اس کی وجہ سے آئندہ فتوحات بالخصوص یہودیوں پر غلبہ پانے کی راہیں ہموار ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی رسولِ خدا کا مقام ومرتبہ بحیثیت قائد اور اسلامی طاقت کا رُعب ودبدبہ ہر دوست دشمن کے دل میں جم گیا۔

صلح ومحبت کا سال

سنہ ۶ ہجری کو "سن الاستئناس" یعنی اُنس ومحبت کا سال کہا جاتا ہے، چنانچہ یہ سال مسلمانوں کے لیے نہایت ہی پُرخیر وبرکت اور سازگار رہا۔ اس سال مسلمانوں نے تقریباً تیس

جنگی معرکے کیے اور بیش تر مواقع پر وہ فتح وکامیابی سے ہمکنار ہوئے اور دشمن کا بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔

ذیل میں ہم مختصر طور پر دو غزوات کا جائزہ لیں گے:

غزوۂ بنی مصطلق

قبیلہ ''بنی مصطلق'' کی چونکہ جنگِ اُحد میں قریش کے ساتھ ساز باز تھی اسی لیے انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے لیے جنگی سامان کی فراہمی شروع کر دی۔

رسولِ خدا کو جب ان کی سازش کا علم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لشکر کو آمادۂ جنگ ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ ماہِ شعبان سن ۶ ہجری میں مسلمانوں کے ایک گروہ کو ساتھ لے کر آپ دشمن کی جانب روانہ ہوئے۔ ''مریسع'' نامی مقام پر غنیم سے مقابلہ ہوا۔ اس معرکے میں سازشی گروہ کے دس افراد مارے گئے اور باقی چونکہ مقابلے کی تاب نہ لا سکے اس لیے راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی، اور چونکہ وہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ گرفتار ہو کر آئے تھے نیز ان کا مال جو تقریباً دو ہزار اُونٹوں اور پانچ ہزار بھیڑوں پر مشتمل تھا، بطورِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا۔

قیدیوں کو مدینہ منتقل کرنے کے بعد رسولِ خدا نے قبیلہ ''بنی مصطلق'' کے سردار ''حارث ابن ابی ضرار'' کی لڑکی ''جویریہ'' سے فدیہ ادا کرنے کے بعد نکاح کر لیا۔ مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ اس شادی کے ذریعے قبیلہ بنی مصطلق اور رسولِ خدا کے درمیان قرابت داری ہو گئی ہے تو انھوں نے فدیہ لیے بغیر ہی تمام قیدیوں کو یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ یہ بھی رسولِ خدا کے رشتہ دار ہیں۔

اس پُر برکت رشتۂ ازدواج اور رسولِ خدا نیز مسلمانوں کے حُسنِ سلوک کے باعث قیدیوں کے دل دینِ اسلام کی جانب مائل ہو گئے اور سب نے دینِ اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کیا اور ہنسی خوشی اپنے اپنے وطن واپس چلے گئے۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۳، ص ۳۰۷-۳۰۸)

صلح حدیبیہ

سنہ پانچ اور چھے ہجری کے دوران محاذِ حق پر مسلمانوں کو جو پے در پے فتوحات نصیب ہوئیں ان کے باعث سیاسی، اقتصادی، نیز عسکری اعتبار سے اسلام کی حیثیت جزیرہ نما عرب میں

پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم و پائیدار ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی رسولِ خدا کے لیے یہ امکانات قوی طور پر روشن ہو گئے کہ قریش کی سازشوں سے بلاخوف وخطر اور اسلحہ و ساز و سامان جنگ کے بغیر مکہ کا سفر اختیار کر کے زیارتِ کعبہ سے مشرف ہو سکیں۔ لہٰذا آپؐ نے اندرون و بیرون مدینہ اعلان کر دیا کہ لوگ اپنے اس عبادی، سیاسی سفر کی تیاری کریں۔ تقریباً چودہ سو سے سولہ سو سے زیادہ افراد نے اس سفر پر روانہ ہونے کے لیے آمادگی ظاہر کر دی۔

رسولِ خدا نے ان سے فرمایا: اس سفر پر جانے کا ہمارا مقصد جنگ نہیں بلکہ عمرہ کرنا ہے۔ لہٰذا ہر شخص اپنے ساتھ ایک تلوار اس وجہ سے لے سکتا ہے کہ یہ مسافروں کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بعد رسولِ خدا نے قربانی کے لیے ستر اونٹ اپنے ساتھ لیے۔

رسولِ خدا نے "ذوالحلیفہ" نامی مقام پر احرام باندھا اور پہلی ذی القعدہ سنہ ۶ ہجری خانہ خدا کی زیارت کی خاطر مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ (مغازی: ج ۲، ص ۵۷۲)

مخالفین

مسلمانوں کی اس مختصر تعداد کے ساتھ رسولِ خدا کا سفر مکہ اختیار کرنا اور وہ بھی عسکری ساز و سامان کے بغیر خطرات سے خالی نہ تھا کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ قریش اسلام پر کاری ضرب لگانے، نیز رسولِ خدا کو اپنے راستے سے ہٹانے کے علاوہ کچھ سوچتے ہی نہیں تھے اور گذشتہ چند سال کے دوران ان کا سابقہ رسولِ خدا کے ساتھ میدانِ جنگ میں اس طرح پڑا تھا کہ ہر بار منہ کی کھائی تھی۔ تو جب رسولِ خدا کو صحابہ کی اس مختصر جماعت کے ساتھ دیکھیں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر اسلحہ کے تشریف لا رہے ہیں تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے اور اسلام و پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام تمام کر دیں گے۔

چنانچہ اسی وجہ سے منافقین اور صحرانشین عربوں نے رسولِ خدا کے ساتھ مکہ جانے سے اجتناب کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر وہ مسلمانوں کی اس مختصر جماعت کے ساتھ بغیر اسلحہ کے جائیں گے تو ہرگز مدینہ واپس نہ آ سکیں گے اور جب قریش اس جماعت کو معمولی ساز و سامان کے ساتھ دیکھیں گے تو انھیں نیست و نابود کر دیں گے۔ (مغازی: ج ۲، ص ۵۷۴)

چنانچہ قرآن مجید نے ان کے گمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا

"بلکہ تم نے تو سمجھا کہ رسولؐ اور مومنین اپنے گھروں میں ہرگز پلٹ کر نہ آسکیں گے"۔ (سورۂ فتح: آیت ۱۲)

قریش کی مخالفت

مشرکین مکہ کو معلوم ہوگیا کہ رسولِ خدا ﷺ ان کے شہر کی طرف تشریف لا رہے ہیں، چنانچہ انھوں نے سپاہِ اسلام کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے خالد بن ولید کو ۲۰۰ سواروں کے ہمراہ رسولِ خدا کی جانب روانہ کیا۔

رسولِ خدا نے اس خیال کے پیش نظر کہ دشمن سے مقابلہ نہ ہو، راستہ کو بدل کر اپنا سفر جاری رکھا اور "حدیبیہ" نامی جگہ پر قیام فرمایا۔ لشکر "خالد" بھی رسولِ خدا کا تعاقب کرتا ہوا سپاہِ اسلام کے نزدیک پہنچ گیا اور وہیں اس نے پڑاؤ ڈالا۔

رسولِ خدا حرمت کے مہینے کا پاس و احترام کرتے ہوئے اس مقصد کے تحت جو آپؐ کے پیش نظر تھا، کوشاں تھے کہ کسی قسم کا تصادم نہ ہو۔

مذاکرات کا آغاز

پہلے قریش نے اپنے نمائندے رسولِ خدا کی خدمت میں بھیجے تاکہ یہ جاننے کے ساتھ کہ آنحضرت ﷺ نے یہ سفر کس مقصد سے اختیار کیا ہے۔ ضروری اطلاعات بھی حاصل کرلیں۔ رسولِ خدا نے نمائندگانِ قریش کو جواب دیتے ہوئے تاکید سے فرمایا کہ ہم جنگ کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ ہمارا تو مقصد عمرہ اور زیارتِ کعبہ سے مشرف ہونا ہے لیکن قریش نے ایسی سختی اختیار کی کہ وہ کسی طرح بھی پیغمبر اکرم ﷺ کی مسالمت آمیز روش کے ساتھ نرمی برتنا نہیں چاہتے تھے بلکہ انھوں نے رسولِ خدا کے اس نرم رویے کا غلط فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے لشکر کے پچاس سپاہیوں کو اس کام کے لیے مقرر کردیا کہ وہ سپاہِ اسلام کے نزدیک پہنچیں اور چند لوگوں کو گرفتار کرکے لے آئیں لیکن سپاہِ اسلام کے پاسبان چونکہ مستعد تھے۔ انھوں نے ان سب کو گرفتار

کرلیا اور رسولِ خدا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ رسولِ خدا نے انھیں یہ بتانے کے لیے کہ آپؐ کا رویہ صلح جویانہ ہے ان سب کو آزاد کر دیا۔

جب نمائندگانِ قریش کی آمد و رفت کا کوئی فائدہ نہ ہوا تو رسولِ خدا نے اپنے نمائندے قریش کی جانب روانہ کیے لیکن انھوں نے نمائندگان کے ساتھ بدسلوکی کی۔ ان میں سے ایک کے پیچھے اُونٹ دوڑا کر ان کی جان لینے کا قصد کیا اور دوسرے کو اپنے پاس روک لیا۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۳، ص ۳۳۵)

بیعتِ رضوان

جب رسولِ خدا کے آخری نمائندے (حضرت عثمانؓ) واپس نہ آئے تو اس افواج کو تقویت ملی کہ انھیں قتل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ بات رسولِ خدا اور مسلمانوں پر بہت شاق گزری۔

اس پر رسولِ خدا نے فرمایا: جب تک قریش کے معاملے کا تصفیہ نہ ہوگا ہم یہاں سے نہیں جائیں گے اور آنحضرتؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس مسئلے کے بارے میں آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کریں۔ مسلمین نے اس درخت کے نیچے جس کا نام "سمرہ" تھا یہ بیعت کی کہ مرتے دم تک ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ یہی وہ بیعت ہے جسے "بیعتِ رضوان" سے کہا گیا ہے اور قرآنِ مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ○ (سورۂ فتح: آیت ۱۸)

"اللہ مومنین سے اس وقت خوش ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے، ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا اسی لیے ان پر سکون نازل فرمایا اور ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی"۔

جب لوگ رسولِ خدا کے دست مبارک پر بیعت کر چکے تو معلوم ہوا کہ آپؐ کا نمائندہ قتل نہیں ہوا۔ اس وقت کے بعد قریش نے "سہیل بن عمرو" کو مصالحت کی غرض سے رسولِ خدا کی

خدمت میں روانہ کیا۔ طویل بحث و گفتگو کے بعد صلح کا پیمان کیا گیا جس کی بنیاد پر طرفین میں یہ عہد ہوا کہ دس سال تک ایک دوسرے سے جنگ نہ کریں گے۔ اس سال تو مسلمان اسی جگہ سے واپس مدینہ چلے جائیں لیکن آئندہ سال بیت اللہ کی زیارت کو آسکتے ہیں۔ مسلمین و مشرکین کو اپنی دینی رسومات ادا کرنے کی اجازت ہوگی۔ طرفین کو اس بات کی بھی اجازت ہوگی کہ وہ جس قبیلے سے بھی چاہیں اپنا عہد و پیمان کرلیں۔ اگر قریش کے کسی فرد نے مسلمانوں کی پناہ لی تو ان کے لیے یہ لازم ہوگا کہ وہ اسے واپس کریں لیکن قریش پر یہ پابندی عائد نہیں ہوگی کہ وہ بھی کسی مسلمان پناہ گزین کو واپس کریں۔

جب صلح کا عہد و پیمان ہوگیا تو رسولِ خدا اور مسلمانوں نے اپنی قربانی کے اُونٹوں کو نحر کیا۔ سروں کے بال ترشوا کر احرام سے باہر نکلے اور مدینہ واپس آگئے۔ (السیرۃ النبویہ، ج ۳، ص ۳۳۲)

صلح حدیبیہ کے سیاسی، اِجتماعی اور مذہبی فوائد

بعض مسلمانوں کی رائے کے برخلاف صلح حدیبیہ اسلام کی عظیم الشان فتح و کامرانی تھی۔ چنانچہ قرآن نے اسے "فتح مبین" کے عنوان و نام سے یاد کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ○ (سورۂ فتح: آیت ۱)

"اے نبیؐ! ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کردی"۔

اور رسولِ خدا نے اسے "اعظم الفتوح" یعنی فتوحات میں عظیم ترین فتح سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس دور کے اسلامی معاشرے کے لیے اس فتح و نصرت کے بہت سے عمدہ و سودمند نتائج برآمد ہوئے جن میں ہم بعض کا ذکر ذیل میں کریں گے۔

① رسولِ خدا کی پیش قدمی کے باعث ایک طرف تو صلح و امن کے امکانات روشن ہوگئے اور دوسری طرف مکہ کے توہم پرست لوگوں پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ رسولِ خدا کے دل میں حرمت کے مہینوں، شہر مکہ اور خانہ خدا کے لیے بہت زیادہ عقیدت و احترام ہے۔

② صلح حدیبیہ کی وجہ سے اسلام کو قبائلی سطح پر تسلیم کرلیا گیا اور قریش کے دلوں پر اس کی

طاقت وعظمت قائم ہوگئی۔ اس صلح کے باعث ہی جزیرہ نما عرب میں اسلام کے وقار کو بلندی حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے اثر ورسوخ کے امکانات وسیع ہو گئے۔

۳ مسلمانوں پر اس وقت تک جو پابندیاں عائد تھیں وہ ختم ہوگئیں۔ چنانچہ اس باہمی ربط و ضبط کا ہی نتیجہ تھا کہ لوگوں نے اسلام کے بارے میں پہلے سے کہیں زیادہ اب واقفیت حاصل کی۔

۴ جزیرہ نما عرب میں دینِ اسلام کی اشاعت کے لیے مناسب میدان ہموار ہوگیا۔ اب تک مختلف قبائل کے دلوں میں اسلام کے بارے میں جو غلط فہمی اور بدگمانی تھی ان کے افراد کو جب رسولؐ خدا نے صلح پسندی کی دعوتِ عام دی تو وہ لوگ اسلام کے بارے میں ازسرِ نو غور وفکر کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس کی وجہ سے وہ رسولؐ خدا نیز مسلمانوں کے زیادہ نزدیک آ گئے۔ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان تقریباً دو سال کا فاصلہ ہے اور یہ فتح اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے باعث مسلمانوں کے اثر ورسوخ میں روز بروز اضافہ ہوا۔

۵ اس فتح کے باعث ہی مسلمانوں پر "فتح خیبر" کی راہیں کھلیں۔ درحقیقت یہ یہود کا وہ سرطانی غدود تھا جو اسلامی حکومت کے لیے بہت بڑا خطرہ بنا ہوا تھا۔ مکہ کا شمار بھی اس دور کی محکم ترین اساس گاہ میں ہوتا ہے۔ اس کا بھی قلع قمع اسی فتح کے بعد ہوا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ عرب معاشرے میں جو انقلاب رُونما ہوا تھا اب وہ حجاز کے خدود سے باہر پہنچنے لگا۔ چنانچہ یہ صلح حدیبیہ کا ہی فیض تھا کہ رسولؐ خدا کو یہ موقع مل گیا کہ آنحضرتؐ ایران، روم، حبشہ جیسے ممالک کے حکمرانوں کو متعدد خط روانہ کریں اور انھیں دعوتِ اسلام دیں۔

جنگِ موتہ

حجاز سے یہود کے اثر ورسوخ کا خاتمہ

دنیا کے اربابِ اقتدار کو دعوتِ اسلام

صلح حدیبیہ کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کی جانب سے اطمینان خاطر ہو گیا۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ آنحضرتؐ حجاز کی محدود سرزمین کے باہر تبلیغ دین کے دامن کو وسعت دیں۔ چنانچہ آپؐ نے دنیا کے اربابِ اقتدار کو دینِ اسلام کی دعوت دینے کا عزم کر لیا اور ماہِ محرم سنہ سات ہجری میں چھے سفیر رسولِ خدا کے چھے خط لے کر ایران، روم، حبشہ، مصر، اسکندریہ و یمامہ کی جانب روانہ ہوئے۔

رسولِ خدا کے خطوط جب مذکورہ بالا ممالک کے بادشاہوں تک پہنچے تو ان میں سے ہر ایک کا مختلف ردِ عمل ظاہر ہوا۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور روم کے فرمانروا "ہرقل" نے آنحضرتؐ کے رسولِ خدا ہونے کی شہادت و گواہی دی اور کہا کہ انجیل سے ہمیں آپؐ کی آمد کے بارے میں خوشخبری مل چکی ہے۔ اور ہماری تو یہ آرزو تھی کہ آپؐ کی رکاب میں رہنے کا شرف حاصل کریں۔

مصر اور اسکندر کا فرمانروا "مقوقس" اگرچہ دینِ اسلام سے تو مشرف نہ ہو سکا لیکن رسولِ خدا کے خط کا جواب اس نے بہت نرم لہجے میں دیا اور ساتھ ہی چند تحائف بھی روانہ کیے۔ انھی میں حضرت "ماریہ قبطیہ" بھی شامل تھیں جن کے بطن سے رسولِ خدا کے فرزند حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ہوئی۔ (طبقات الکبریٰ: ج ۱، ص ۲۶۰)

"تخوم شام" کے حاکم "حارث بن ابی شمیر" یمامہ کے فرمانروا "سلیط بن عمروؓ" اور بادشاہِ ایران خسرو پرویز نے اس بنا پر کہ ان کے دلوں میں حکومت کی چاہ تھی، رسولِ خدا کے خط کا جواب نفی میں دیا۔

بادشاہِ ایران نے رسولِ خدا کے نامۂ مبارک کو چاک چاک کرنے کے علاوہ یمن کے فرمانروا کو اس وجہ سے کہ وہ اس کے تابع تھا اس کام پر مقرر کیا کہ دو افراد کو حجاز بھیجے تا کہ رسولِ خدا کے بارے میں تحقیقات کریں۔ (طبقات الکبریٰ: ج ۱، ص ۲۶۲)

رسولِ خدا جب "صلح حدیبیہ" کے فیض و برکت سے جنوبی منطقے (مکہ) کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو آپؐ نے فیصلہ کیا کہ وہ یہودی جو مدینہ کے شمال میں آباد ہیں، ان کے مسئلے کو یک طرفہ کر دیں کیونکہ ان کا وجود اسلامی حکومت کے لیے خطرہ ہونے کے علاوہ شمالی حدود میں اسلام کی توسیع و تبلیغ میں بھی مانع تھا۔ جن حالات کے تحت بڑی طاقتوں نے خواہ رسولِ خدا کے قطعی فیصلے اور عزم راسخ کی بنیاد پر دینِ اسلام قبول کیا تھا خواہ انھیں حکومت کی چاہ نے شدید ردِعمل کے لیے مجبور کیا۔ بہرصورت ضروری تھا کہ اسلامی حکومت کا اندرونی حلقہ ان خیانت کار عوامل اور ان غدار اقلیتوں سے پاک و صاف رہے جو دشمن کے ساتھ سازباز کیے ہوئے تھیں تا کہ جنگ اُحد "اَحزاب" جیسے واقعات دوبارہ رُونما نہ ہوں، اور ایسا میدان ہموار ہو جائے کہ بالفرض باہر سے کسی عسکری و اقتصادی خطرے کا احتمال ہو تو اس کا سدباب کیا جا سکے۔

غزوۂ خیبر

خیبر، یہودیوں کی مضبوط ترین عسکری اساس گاہ تھی کہ جس میں دس ہزار سے زیادہ جنگجو سپاہی مقیم تھے۔ رسولِ خدا نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے اس جگہ کو ان کے وجود سے پاک کیا جائے۔ چنانچہ ماہِ محرم سنہ ۷ ہجری میں سولہ سو جنگ آزما سپاہیوں کو ساتھ لے کر آپؐ مدینہ سے خیبر کی جانب روانہ ہوئے اور راتوں رات ان کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ اس لشکر کے پرچم دار بھی حضرت علی علیہ السلام ہی تھے۔

قلعہ داروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اہل و عیال کو ایک قلعے میں اور سازوسامان و خوراک دوسرے قلعے میں جس کا نام "ناعم" تھا محفوظ کر دیں۔ اس اقدام کے بعد انھوں نے ہر قلعے کے تیراندازوں کو حکم دیا کہ مسلم سپاہ کو قلعے کے اندر داخل ہونے سے روکیں اور اگر ضرورت پیش آئے تو اس دشمن سے جو قلعے کے باہر موجود ہے، جنگ کریں۔ (مغازی: ج ۲، ص ۶۳۷)

سپاہِ اسلام نے دشمن کے سات قلعوں میں سے پانچ قلعے فتح کر لیے جس میں تقریباً پچاس

مجاہدینِ اسلام زخمی ہوئے اور ایک کو شہادت نصیب ہوئی۔

باقی دو قلعوں کو فتح کرنے کے لیے رسولِ خدا نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کو پرچم دیا مگر انھیں اس مقصد میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اگلے دن حضرت عمرؓ کو سپاہ کی فرمانداری دی گئی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوسکے۔ تیسرے دن حضرت علی علیہ السلام کو قلعہ فتح کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ آپؑ نے پرچم سنبھالا اور دشمن پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

یہود کے بہادروں میں "مرحب" کا نام شجاعت و دلیری میں شہرت یافتہ تھا۔ وہ زرہ و فولاد میں غرق قلعے سے نکل کر باہر آیا۔ دو جانبازوں کے درمیان نبرد آزمائی شروع ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے پر وار کرتے اور کاری ضرب لگاتے رہے۔ اچانک حضرت علی علیہ السلام کی شمشیر براں مرحب کے سر پر پڑی جس کے باعث اس کے خود اور استخوانِ سر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

مرحب کے ساتھیوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ چنانچہ فرار کر کے قلعے میں پناہ گزین ہوئے، جہاں انھوں نے اپنے اُوپر اس کا دروازہ بھی بند کر لیا اور حضرت علی علیہ السلام نے اپنی روحانی طاقت اور قدرتِ خدا کی مدد سے قلعے کے اس دروازے کو جسے کھولنے اور بند کرنے پر بیس آدمی مقرر تھے اُکھاڑ لیا اور اسے باہر بنی ہوئی خندق پر رکھ دیا تاکہ سپاہی اس پر سے گزر کر قلعے میں داخل ہو سکیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے دشمن کے سب سے زیادہ محکم و مضبوط قلعہ (کاموس) کو فتح کر کے فتنۂ خیبر کا خاتمہ کر دیا اور یہودیوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ اس جنگ میں پندرہ مسلمان اور ترانوے یہودی تہِ تیغ ہوئے۔ (مغازی: ج ۲، ص ۷۰۰)

یہودیوں پر فتح پانے کے بعد اگر رسولِ خدا چاہتے تو تمام خیانت کاروں کو سزائے قتل دے سکتے تھے، انھیں شہر بدر اور ان کے تمام مال کو ضبط کیا جاسکتا تھا مگر آنحضرتؐ نے ان کے حق میں درگزشت اور فراخ دلی سے کام لیا۔ چنانچہ انھی کی تجویز پر انھیں یہ اجازت دے دی گئی کہ اگر چاہیں تو اپنے ہی وطن میں رہیں اور اپنے دینی اُحکام کو پوری آزادی کے ساتھ انجام دیں۔ بشرطیکہ ہر سال اپنی آمدنی کا نصف حصّہ بطور جزیہ اسلامی حکومت کو ادا کریں اور رسولِ خدا جب بھی مصلحت سمجھیں گے انھیں خیبر سے نکال دیں گے۔ (تاریخ ابن کثیر: ج ۳، ص ۳۷۵)

غزوۂ خیبر میں "حی بن اخطب" کی دختر صفیہ دورانِ جنگ مسلمانوں کی قید میں آئی تھیں۔

رسولِ خدا نے "غزوۂ خیبر" سے فراغت پانے کے بعد پہلے تو انھیں آزاد کیا اور ان سے نکاح کرلیا۔
اسی عرصے میں یہ اطلاع ملی کہ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب حبشہ سے واپس آگئے ہیں جسے سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان دو خبروں میں سے کس پر اپنی مسرت کا اظہار کروں۔ جعفر کی آمد پر یا خیبر کے فتح پر۔ (بحار الانوار: ج ۲۱، ص ۲۵)

فدک

خیبر کے یہودیوں پر فتح پانے کے بعد مسلمانوں کا سیاسی، اقتصادی اور نظامی مقام و مرتبہ بہت بلند ہوگیا۔ اس منطقے میں آباد یہودیوں پر کاری ضرب لگی اور ان پر مسلمانوں کا رُعب بیٹھ گیا۔

رسولِ خدا کو جب خیبر کے یہودیوں کی طرف سے یکسوئی ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو وفد کے ہمراہ فدک کے یہودیوں کے پاس روانہ کیا اور فرمایا کہ یا تو وہ دینِ اسلام قبول کریں یا جزیہ دیں اور یا جنگ کے لیے تیار ہوجائیں۔

فدک کے یہودی اپنی آنکھوں سے خیبر کے یہودیوں کی شکست و ریخت دیکھ چکے تھے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ انھوں نے رسولِ خدا کے ساتھ مصالحت کرلی ہے اسی لیے انھوں نے صلح کو قتل، قید و بند پر ترجیح دی اور اس بات کے لیے آمادہ ہوگئے کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو خیبر کے یہودیوں کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ رسولِ خدا نے ان کی درخواست قبول کرلی۔

چونکہ فدک کسی جنگ و خون ریزی کے بغیر فتح ہوگیا تھا اسی لیے اسے خالص رسولِ خدا کی ذاتی ملکیت میں شامل کرلیا گیا۔ اس جگہ کے متعلق ایسی بہت سی روایات موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے حکم سے رسولِ خدا نے فدک اپنی دخترِ نیک اختر حضرت فاطمہ علیہا السلام کو عطا کردیا۔ (تفسیر البرہان)

غزوۂ وادی القریٰ

رسولِ خدا ﷺ نے یہود کی خیبر اور فدک جیسی پناہ گاہوں کو نیست و نابود کرنے کے بعد وادی القریٰ کی تسخیر کا ارادہ کیا اور یہودیوں کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ قلعہ بند رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تو انھوں نے بھی اپنی شکست تسلیم کرلی۔ رسولِ خدا نے ان کے

ساتھ بھی وہی عہد و پیمان کیا جو اس سے قبل خیبر کے یہودیوں کے ساتھ کیا جاچکا تھا۔

"تیماء" کے یہودیوں نے کہ جو "تیماء یہود" کے نام سے مشہور تھا اور اس کے باشندے رسولِ خدا کے سخت دشمن تھے جب دوسرے بھائیوں کی یہ حالت دیکھی تو ان سے درسِ عبرت حاصل کیا اور اس سے قبل کہ رسولِ اسلام ان کی گوشمالی کے لیے ان کی جانب رُخ کریں وہ خود ہی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ وعدہ کر کے کہ "جزیہ" ادا کریں گے، رسولِ خدا سے معاہدہ صلح کرلیا اور اس طرح حجاز میں جتنے بھی یہودی آباد تھے انھوں نے اپنی شکست قبول کرلی اور یہ تسلیم کرلیا کہ اس منطقے کی اصل طاقت اسلام ہی ہے۔

مکہ کی جانب روانگی

جب حجاز میں اندرونی طور پر امن بحال ہوگیا اور دشمنوں کو اسلحہ سے بے دخل کر کے شورشوں اور سازشوں کا قلع قمع کردیا گیا نیز صلح حدیبیہ کو ایک سال گزر گیا تو رسولِ خدا نے فیصلہ کیا کہ اصحاب کے ہمراہ مکہ تشریف لے جائیں اور زیارتِ کعبہ سے مشرف ہوں۔ چنانچہ بتاریخ اوّل ذی القعدہ سنہ سات ہجری میں آنحضرتؐ دو ہزار مسلم افراد کے ہمراہ عمرہ کرنے کی نیت سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔

وہ قافلہ جو عمرہ کرنے کی نیت سے روانہ ہوا تھا اس کے آگے آگے سو مسلح گھڑسوار چل رہے تھے تاکہ دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ ہو تو وہ ان مسافرین کا دفاع کرسکیں جن کے پاس اتنا ہی اسلحہ تھا جسے عام مسافر وقت سفر ان دنوں رکھا کرتے تھے۔

جس وقت مسلح سپاہ اسلام کا پیش دستہ "مراہ ظہران" نامی مقام پر پہنچا تو قریش کے سرداروں کو مسافرین کی آمد کا علم ہوا۔ چنانچہ انھوں نے یہ اعتراض کیا کہ اسلحہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہونا صلح حدیبیہ کے معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔

اس پر رسولِ خدا نے فرمایا کہ ہم اسلحہ ساتھ لے کر حرم میں نہیں جائیں گے۔ مشرکین نے مکہ خالی کردیا اور اطراف کے پہاڑوں پر چڑھ گئے تاکہ رسولِ خدا اور اصحاب رسولِ خدا کی تبلیغ سے محفوظ رہتے ہوئے ان کی حرکات نیز افعال کا مشاہدہ کرسکیں۔

رسول اکرم ﷺ خاص جاہ و جلال کے ساتھ مکہ میں تشریف فرما ہوئے۔ جس وقت

آپؐ خانہ کعبہ کی جانب تشریف لے جا رہے تھے تو فضا لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کے نعروں سے ایسی گونج رہی تھی کہ جس سے مشرکین کے دلوں پر غیر معمولی رُعب وخوف طاری ہو گیا۔

ناقہ رسولِ اکرمؐ کی زمام حضرت عبداللہ بن رواحہ پکڑ کر چل رہے تھے۔ وہ نہایت ہی فخریہ انداز میں رجز یہ بیت پڑھ رہے تھے:

خَلُّوا بَنِی الْکُفَّارِ عَنْ سَبِیْلِہٖ خَلُّوا فَکُلَّ الْخَیْرِ فِیْ رَسُوْلِہٖ

"اے کفار کی اولاد! رسولِ خدا کے لیے راستہ صاف کر دو، انھیں آگے آنے کے لیے راستہ دو کیونکہ آنحضرتؐ ہر خیر کا منبع اور ہر نیکی کا سرچشمہ ہیں"۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اصحابِ رسولؐ پروانہ وار نثار تھے۔ چنانچہ آپؐ ان کے حلقے میں خاص رُعب ودبدبے کے ساتھ داخلِ مکہ ہوئے اور طواف کرنے کے لیے مسجد الحرام میں تشریف لے گئے۔

اس سیاسی عبادی سفر سے جس قدر ممکن ہو سکتا تھا فائدہ اُٹھانے کی خاطر رسولِ خدا نے فرمایا کہ زائرین زیادہ سے زیادہ اپنی دینی قوت کا مظاہرہ کریں۔ نیز جس وقت طواف کریں تو حرکت تیزی کے ساتھ کی جائے۔ احرام کے کپڑے کو اپنے جسم کے ساتھ اس طرح لپیٹیں کہ قوی وتنومند بازو لوگوں کو نظر آئیں تا کہ دیکھنے والوں پر ان کی ہیبت طاری ہو جائے۔ (ابن کثیر: ج ۳، ص ۴۳۲)

ظہر کے وقت حضرت بلالؓ کو اس کام کے لیے مقرر کیا گیا کہ وہ خانہ کعبہ کی چھت پر جائیں اور اذان دیں تا کہ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت اور رسولِ خدا کی عظمت مجسم کا اہلِ مکہ عینی مشاہدہ کر سکیں اور جو لوگ فرار کر کے پہاڑوں پر چلے گئے ہیں وہ یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ اب وقت فرار گزر چکا ہے، واپس آ جاؤ نماز اور فلاح وبہبود کی جانب آنے میں جلدی کرو۔

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ.....

حضرت بلالؓ کی اس آواز نے قریش کے سرداروں پر ہر کچل دینے والی ضرب اور ہر شمشیر براں سے زیادہ اثر کیا اور انتہائی طیش وغضب میں آ کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے باپ دادا اس غلام کی آواز سننے سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے اور انھیں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔

اس طرح "عمرۃ القضا" ادا ہوا جس کے ذریعے خانہ کعبہ کی زیارت بھی ہو گئی اور عبادت بھی۔ اس کے ساتھ ہی کفر کو اسلام کی طاقت کا اندازہ اور آئندہ سال فتح مکہ کا میدان بھی کامیابی

کے ساتھ ہموار ہوگیا۔ چنانچہ اس کے بہت سے سیاسی، عسکری اور ثقافتی اثرات نہ صرف اہلِ مکہ اور اطراف کے قبائل پر مترتب ہوئے بلکہ خود مسلمانوں کے قلوب پر نقش ہوئے۔

یہ سیاسی، عبادی تحریک قریش سرداروں کے دلوں پر ایسی شاق وگراں گزری کہ انھوں نے تین دن بعد ہی رسولِ خدا کی خدمت میں اپنا نمائندہ بھیجا اور کہا کہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے مکہ سے چلے جائیں۔

اس سفر میں رسولِ خدا نے مکہ کی "میمونہ" نامی خاتون سے رشتۂ ازدواج قائم کیا تاکہ قریش کا تعلق آپؐ کے ساتھ مستحکم اور دشمنی وعداوت کا جذبہ کم ہوجائے۔ کیونکہ قریش سرداروں سے قرابت داری تھی۔ یہی نہیں بلکہ رسولِ خدا نے یہ بھی چاہا کہ شادی کی رسومات مکہ ہی میں انجام پذیر ہوجائیں اور آپؐ قریش کو دعوتِ ولیمہ میں مدعو فرمائیں۔ اگر یہ کام انجام پذیر ہوجاتا تو اہلِ مکہ کو اپنی طرف سے مائل کرنے میں موثر اقدام ہوتا مگر افسوس اہلِ مکہ نے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ چنانچہ رسولِ خدا نے یہ رسم مکہ سے واپس آتے وقت "سرف" نامی مقام پر ادا کی۔

جنگِ موتہ

خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیماء جیسے یہود کے مراکز اور اہم مقامات مدینہ کے شمال اور مدینہ وشام کی شاہراہ کے درمیان واقع تھے۔ ان کا قلع قمع ہونے کے ساتھ ہی اسلام کے لیے سیاسی ومعنوی میدان شمالی سرحدوں کی جانب مزید فراہم ہوگئے۔

اس منطقے کی اہمیت اولاً اس وجہ سے تھی کہ وہ عظیم ترین تمدن جو اس زمانے میں سیاسی، عسکری، اجتماعی اور ثقافتی اعتبار سے انسانی معاشرے کا اعلیٰ وبرجستہ ترین تمدن شمار کیا جاتا تھا، یہیں پرورش پا رہا تھا۔ دوسری وجہ اس کا سرچشمہ آسمانی آئین وقانون تھا، یعنی وہ آئین وقانون جس کی دینِ اسلام سے بیش تر واقفیت وہم آہنگی ہونے کے علاوہ اس کے اور اسلام کے درمیان بہت سی مشترک اقدار تھیں اور یہ مقام دیگر مقامات کی نسبت بہتر طور پر اور زیادہ جلدی حالات کو درک کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ جغرافیائی اعتبار سے بھی یہ جگہ مدینہ سے نزدیک تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ رسولِ خدا نے فتح مکہ سے قبل روم کی جانب توجہ فرمائی۔

رسولِ خدا نے حضرت حارث بن عمیر کے ہاتھ خط بصرہ کے بادشاہ کے نام جو "قیصر" کا

دست پروردہ تھا، روانہ کیا۔ جس وقت رسولِ خدا کا یہ ایلچی موتہ نامی گاؤں پہنچا تو شرجیل غسانی نے اسے قتل کر دیا۔ یہ واقعہ رسولِ خدا پر انتہائی شاق گزرا اور آنحضرتؐ نے فوراً یہ فیصلہ کرلیا کہ اس کا سدباب کیا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے ماہ جمادی الاول سنہ ۸ ہجری میں تین ہزار سپاہ پر مشتمل لشکر موتہ کی جانب روانہ کر دیا۔

اس وقت تک مدینہ سے باہر جتنے بھی لشکر روانہ کیے گئے ان میں یہ سب سے بڑا لشکر تھا۔ رسولِ خدا سے رخصت کرنے کے لیے مسلمانوں اور سپاہ کے قرابت داروں کے ہمراہ مدینہ کے باہر تک تشریف لائے۔ حضرت زید بن حارثؓ کو فرمان دار کُل نیز حضرت جعفرؓ بن ابی طالبؑ وحضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو حضرت زیدؓ کا معاونِ اوّل و دوم مقرر کرنے کے بعد آپؐ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ جس معرکہ کو سر کرنے کے لیے جا رہے ہیں اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس کے ساتھ ہی آنحضرتؐ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

لشکرِ اسلام شام کی جانب روانہ ہوا۔ ''معان'' نامی مقام پر اطلاع ملی کہ قیصر کے دو لاکھ عرب اور رومی سپاہی ''قاب'' نامی مقام پر جمع ہو گئے ہیں۔ (معجم البلدان: ج۵، ص۱۵۳)

یہ خبر سننے کے بعد مسلمانوں میں تردّد پیدا ہو گیا اور یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ واپس چلے جائیں یا وہیں مقیم رہیں اور پورے واقعے کی اطلاع رسولِ خدا کو پہنچائیں۔ اسی مختصر سپاہ کو ساتھ لے کر اس فرض کو انجام دیں جس پر انھیں مقرر کیا گیا ہے اور سپاہِ روم کے ساتھ جنگ کریں۔

اس اثناء میں حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ سپاہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انھیں یہ ترغیب دلائی کہ اپنے فرض کو وہ ادا کریں اور سپاہِ روم کے ساتھ نبرد آزما ہوں۔ ان کی تقریر نے سپاہ کے اندر ایسا جوش و ولولہ پیدا کیا کہ سب نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ سپاہِ روم کے ساتھ جنگ کی جائے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ لشکرِ موتہ میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

حضرت زیدؓ نے پرچم سنبھالا اور جان پر کھیل کر دوسرے مجاہدین کے ساتھ شہادت کے شوق میں بجلی کی طرح کوندتے ہوئے سپاہِ دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن تجربہ کار اور جنگ آزمودہ تھا۔ اس کا لشکر نیزوں، تلواروں اور تیز رفتار تیروں سے آراستہ تھا اور اس طرف کلمہ توحید، جسے بلند و بالا کرنے کے لیے سپاہِ اسلام نے ہر خطرہ اپنی جان پر مول لیا اور سپاہِ روم پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے دین و آئین اور مقدس مقصد کو فروغ دینے کی خاطر جان تک دینے کے لیے دریغ نہیں کرتے ہیں۔

دشمن کا رُخ سپاہِ اسلام کے پرچم دار کی جانب تھا۔ اس نے اپنے نیزوں کے حلقے میں لے کر زمین پر گرا دیا۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے فوراً ہی پرچم کو لہرایا اور دشمن پر حملہ کر دیا۔ جس وقت انھوں نے خود کو دشمن کے نرغے میں پایا اور یہ یقین ہو گیا کہ شہادت قطعی ہے تو اس خیال سے کہ ان کا گھوڑا دشمن کے ہاتھ نہ لگے اس سے اُتر گئے اور پیدل جنگ کرنے لگے یہاں تک کہ ان کے دونوں ہاتھ قطع ہو گئے۔ آخر کار تقریباً اسی کاری زخم کھا کر شہادت سے سُرخرو ہوئے۔ حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ رواحہؓ نے پرچمِ اسلام کو سنبھالا اور سپاہِ روم کے قلب پر حملہ کر دیا۔ وہ بھی دلیرانہ جنگ کرتے کرتے شہادت سے ہمکنار ہوئے۔

خالد ابن ولید حال ہی میں مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ وہ بڑا ہی دلیر و جنگجو انسان تھا۔ سپاہ کی تجویز پر انھیں فرمان دارِ کل مقرر کر دیا گیا۔ جب انھیں جنگ کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو انھوں نے اب جنگی حربہ جس کی وجہ سے رومیوں میں تردّد پیدا ہو گیا اور اس نے اپنی فوج کو یہ سوچ کر پیچھے ہٹا دیا کہ آیا جنگ کی جائے یا نہیں؟ اور اپنی اس حکمت عملی سے انھوں نے دشمن کے دو لاکھ سپاہیوں سے سپاہِ اسلام کو نجات دلائی اور واپس مدینہ آ گئے۔ (مغازی: ج ۳، ص ۷۵۵)

ابن ہشام نے اس جنگ میں شہدا کی تعداد بارہ اور واقدی نے آٹھ نفر بیان کی ہے۔

جنگِ موتہ کے نتائج

جنگِ موتہ بظاہر مسلمانوں کی شکست اور فرمانداروں کی موت پر تمام ہوئی اور قریش نے اسے اپنی دانست میں مسلمانوں کی زبونی و ناتوانی سے تعبیر کیا۔ اس جنگ کے بعد وہ ایسے دلیر ہو گئے کہ انھوں نے قبیلہ "بنی بکر" کو اس وجہ سے مدد دینی شروع کر دی کہ اس کی ان لوگوں کے ساتھ ساز باز ہو چکی تھی جس کے پسِ پشت یہ فیصلہ تھا کہ وہ ان کے اور قبیلہ خزاعہ کے درمیان اس بنا پر کشت و کشتار کا بازار گرم کرا دیا کہ اس قبیلے کا رسولِ خدا کے ساتھ دوستی کا عہد و پیمان ہے۔ چنانچہ انھوں نے قبیلہ "خزاعہ" کے چند افراد کو قتل کر دیا اور صلح نامہ حدیبیہ سے بھی رُوگرداں ہو گئے۔ نیز رسولِ خدا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

جب ہم اس جنگ کی اہمیت و قدر کے بارے میں غور و فکر کریں گے تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ جنگ سیاسی طور پر اور دینِ اسلام کی اشاعت کے لیے نہایت سودمند و کارآمد ثابت ہوئی۔

کیونکہ اس وقت ایران اور روم جیسی دو بڑی طاقتوں کا اس عہد کی دنیا پر تسلط وغلبہ تھا۔ ان کے علاوہ جو بھی دوسری حکومتیں تھیں وہ سب انھی کی دست پرورده تھیں اور ان کے ساتھ ہم چشمی و برتری حاصل کرسکیں گی۔ ان دونوں حکومتوں میں بھی رومیوں کو ایرانیوں پر اس وجہ سے برتری حاصل تھی کہ انھوں نے ایران سے جنگ ونبرد میں مقابلہ کرکے مسلسل اور لگاتار فتوحات حاصل کی تھیں۔

جزیرہ نما عربستان کو ایران نے شرقی جانب سے اور روم نے مغرب کی طرف سے اس طرح اپنے حلقے اور نرغے میں لے رکھا تھا کہ جیسے انگوٹھی کے درمیان نگینہ اور ان دونوں ہی بڑی طاقتوں کے اس خطۂ ارض سے مفادات وابستہ تھے اور انھوں نے یہاں اپنی نوآبادیات بھی قائم کررکھی تھیں۔

جنگ موتہ نے ان دونوں بڑی طاقتوں بالخصوص روم کو یہ بات سمجھادی کہ اس کے اقتدار کا زمانہ اب ختم ہونا چاہتا ہے اور دنیا میں تیسری طاقت ''اسلام'' کے نام سے پورے کروفر کے ساتھ منظر عام پر آچکی ہے۔ اور اس کے پیروکار ایمان کے زیر سایہ اور اس خلوص وعقیدت کی بنا پر جوانھیں اس دین اور اس کے قائد سے ہے، اپنے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرلیتے ہیں اور اس کے حصول کی خاطر وہ دشمن کی کثیر تعداد اور سامانِ جنگ کی فراوانی سے ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہی وہ کیفیت تھی جس نے ان بڑی طاقتوں کے دلوں پر اسلام کا رُعب ودبدبہ قائم کردیا۔

دوسری طرف ان لوگوں کو جو جزیرہ نما عرب میں ان طاقتوں کے دست پرورده تھے عملی طور پر یہ معلوم ہوگیا کہ وہ انگشت شمار لوگ جو مقصد وارادے میں مضبوط ومحکم ہیں روم جیسی بڑی طاقت سے جس کی سپاہ کی تعداد کُل مسلمانوں کی تعداد سے ساٹھ گنا زیادہ ہے، ٹکر لے سکتے ہیں اور ان کے گھروں میں گھس کر انھیں ذلیل وخوار تک کرسکتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اب دشمنانِ اسلام کی عسکری طاقت کا اعتراف کرنے لگے اور اس کی عظمت کا جذبہ ان کے دلوں میں پیدا ہوگیا، اور اب انھیں یہ بخوبی اندازہ ہوگیا کہ آیندہ مسلمان ان کے سامنے زیادہ قوی وحوصلہ مندی کے ساتھ اب سے زیادہ وسیع وکشادہ تر میدانوں میں نبرد آزما ہونے کے لیے نمایاں طور منظر عام پر آنے لگیں گے۔

غزواتِ فتح و حنین اور طائف

غــزوۂ فتح

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے صلح حدیبیہ کے بعد یہودیوں کے خطرات دُور کرنے اور مدینہ کے شمال میں آباد عرب قبائل کے درمیان عراق، شام کی حدود تک اشاعتِ اسلام کو وسیع کرنے کے امکانات روشن ہو گئے۔ قلم رو اسلام میں اب تنہا جو طاقت باقی رہ گئی تھی اور جس کا وجود عربستان کے باہر ترویج اسلام کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا وہ قریش مکہ تھے۔ دشمن کی اس اساسی پاگاہ کی دو اہم ترین خصوصیات تھیں: پہلی تو یہ کہ یہ شہر بہت سے مسلمانوں نیز رسولِ خدا کا وطن تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ کعبہ ابراہیمؑ یعنی اساسی مرکز توحید اور ان کا قبلہ اسی شہر میں واقع تھا۔ ان دو وجوہ کے علاوہ مسلمانوں نے اپنی اسلامی زندگی کے دوران جو صدمات برداشت کیے ان میں سے اکثر و بیشتر اسی شہر کے لوگوں نے انھیں پہنچائے تھے۔ مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر مکہ کا شمار ان اہم ترین مراکز میں ہوتا تھا جنھیں رسولِ خدا جزیرہ نما عرب میں دشمن کے وجود سے پاک وصاف کر دینا چاہتے تھے اور یہی منصوبہ عرصے سے آنحضرتؐ کے پیش نظر تھا۔

غزوۂ حدیبیہ اور عمرۃ القضاء دو ایسے بڑے کامیاب معرکے تھے کہ جن کے باعث قریش کی عسکری بالادستی اور مکہ پر اجارہ داری ختم ہو گئی اور مسلمانوں کے لیے مکہ واپس آنے، مناسکِ حج ادا کرنے اور اشاعتِ دین کے لیے راہیں ہموار ہو گئیں مگر اس کے باوجود قریش کی سیاسی و ثقافتی برتری اور لعنتِ شرک و بت پرستی اب بھی مثلِ سابق وہاں موجود تھی۔

قریش کے خلاف تیسرا اور آخری قدم اُٹھانے کے لیے اب مسلمانوں کے سیاسی حالات و عسکری انتظامات قطعی طور پر موافق و سازگار تھے اور جو چیز اس راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ رسولِ خدا کسی قسم کی عہد شکنی نہیں کرنا چاہتے تھے مگر قریش نے اپنی طرف سے عہد و پیمان توڑنے میں چونکہ پیش دستی کی اور قبیلہ بنی بکر کی حمایت میں انھوں نے قبیلہ بنی خزاعہ کے بیس افراد کو محض اس بنا پر بے دردی سے قتل کر ڈالا کہ ان کا رسولِ خدا کے ساتھ باہمی معاہدہ تھا۔ لہٰذا یہ

دشواری بھی دُور ہو گئی۔ چنانچہ اب وہ وقت آن پہنچا کہ رسولِ خدا اس موقع سے فائدہ اُٹھائیں اور مکہ پر تسلط حاصل کر کے کعبہ کو بتوں سے پاک کریں۔ اپنی دیرینہ آرزو کو عملی جامہ پہنائیں تاکہ شرک کی سب سے بڑی اساس گاہ کے وجود کو اپنی قوم سے نیست و نابود کر دیں بالخصوص ان حالات میں جبکہ قبیلہ خزاعہ کا سردار اپنے ہم قبیلہ افراد کو ساتھ لے کر رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا اور اس نے ان رقت انگیز واقعات کو بیان کر کے جو اس کے قبیلے کے لوگوں پر گزرے تھے۔ قریش کی عہد شکنی کا ذکر کیا اور ان کے خلاف اس نے آنحضرت ﷺ سے مدد کی درخواست کی۔

رسولِ خدا ﷺ نے عمرو کو کوچ کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی آنحضرتؐ نے مکہ کی جانب اپنے ایلچی روانہ کیے تاکہ انھیں بھی اس میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے۔ کوچ کا حکم ملتے ہی دس ہزار سپاہی جمع ہو گئے اور یہ ایسی کثیر تعداد تھی جو اہلِ مدینہ نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی تھی۔

رسولِ خدا ﷺ نے قریش کو غفلت میں ڈالنے کے لیے تمام حفاظتی اقدامات کیے۔ ابتدا میں آپؐ نے اپنے قصد و ارادے کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ وہ تمام راستے جو مکہ کی طرف جاتے تھے ان کی سخت ناکہ بندی کر دی گئی۔ لوگوں کو دوسری جانب متوجہ کرنے کے لیے رسولِ خدا نے سپاہ کا ایک دستہ "ابوقتادہ" کی فرمانداری میں "اضم" نامی مقام کی جانب روانہ کیا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ آنحضرتؐ کا رُخ اسی جانب سے ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے بارگاہِ ایزدی میں التجا کی کہ قریش کی آنکھوں اور ان کے کانوں پر غفلت کا پردہ پڑ جائے اور ہوش انھیں اس وقت آئے جب وہ اچانک سپاہِ اسلام کو اپنے سروں پر مسلط پائیں۔ (مغازی: ج ۲، ص ۷۹۶)

یہ اقدام اس وجہ سے کیا گیا کہ دشمن اس سے قبل کہ اپنے دفاع کی خاطر اپنی عسکری طاقت کا استعمال کرے۔ خود ہی بغیر کسی تصادم کے حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور حرم مکہ یعنی مقدس و معنوی پناہ گاہِ ایزدی حتی الامکان خونریزی کے بغیر فتح ہو جائے۔

تمام حفاظتی اقدامات کے باوجود حاطب بن ابی بلیغہ نامی شخص نے قریش کو خط لکھ دیا اور "سارہ" نامی عورت کو خط دے کر قریش مکہ کی جانب روانہ کیا تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ رسولِ خدا کا احتمالی عزم و اقدام کیا ہو سکتا ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس شخص کی خیانت کا علم ہوگیا۔ چنانچہ آپؐ نے فوراً ہی حضرت علی علیہ السلام اور زبیر کو اس کام پر مقرر فرمایا کہ اس عورت سے خط حاصل کریں اور اسے واپس مدینہ لے آئیں۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۴ ص ۴۱۴)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۰ رمضان سنہ ۸ ہجری کو دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ چنانچہ جب آپؐ "مرالظہران" نامی مقام پر تشریف فرما ہوئے تو دشمن کو آپؐ کے آنے کا ذرا بھی علم نہ ہوسکا۔ یہاں رسولؐ خدا نے حکم دیا کہ سپاہی وسیع میدان میں منتشر و پراگندہ ہوجائیں اور ان میں سے ہر شخص آگ روشن کرے۔ رسولؐ خدا کے اس حربے نے اہلِ مکہ کو سخت وحشت و سراسیمگی میں مبتلا کردیا۔ (مغازی: ج ۲، ص ۸۱۴)

ابوسفیان کے ہمراہ کچھ قریش سردار مکہ سے نکل کر باہر آئے تاکہ حالات کا جائزہ لیں۔ راستے میں ان کی ملاقات سب سے پہلے رسولؐ خدا کے چچا حضرت عباسؓ سے ہوئی جو سپاہِ اسلام کے پہنچنے سے قبل ہی وہاں پہنچ گئے تھے اور ان سے حالات کے بارے میں پوچھا۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ رسولؐ خدا نے تم پر دس ہزار سپاہ کے ساتھ شب خون مارا ہے۔ اب تمہارے لیے راہِ نجات یہی ہے کہ دینِ اسلام قبول کرلو۔ ابوسفیان کے ساتھ "حکیم بن حزام" اور بدیل ورقا بھی تھے۔ یہی بات انھوں نے ان سے بھی کہی۔

یہ بات سن کر قریش کے سرداروں کے اوسان خطا ہوگئے اور حضرت عباسؓ سے اتنا ہی کہا کہ اب ہم آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔ حضرت عباسؓ انھیں رسولؐ خدا کی خدمت میں لے گئے۔ رسولؐ خدا نے ان سے قریش کی وضع و کیفیت کے بارے میں کچھ سوالات کیے اور ضروری اطلاعات حاصل کرنا چاہیں۔ نیز انھیں دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ انھیں رسولؐ خدا کی بات تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا اور اس رات وہ حضرت عباسؓ کے ساتھ ہی رہے۔ صبح کے وقت تمام سپاہ نے بآوازِ بلند اذان دی جسے سن کر ابوسفیان پر خوف طاری ہوگیا۔ اس کے بعد رسولؐ خدا کے حکم سے اسے ایک ٹیلے پر لے جایا گیا۔ سپاہی منظم دستوں کی شکل میں مسلح ہوکر سامنے سے گزرے اور اس نے اسلام کی شان و عظمت اور عسکری معنوی طاقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ (مغازی: ج ۲، ص ۸۱۸)

رسولؐ خدا نے اسلام کی طاقت کے جاہ و جلال کا مظاہرہ کرکے شرک کی استقامت و

پائیداری کے ہر ارادے کو پاش پاش کر دیا اور اب آپؐ نے یہ کوشش کی کہ ابوسفیان کے ذریعے قریش کی استقامت و پائیداری کو بھی چکنا چور کر دیں اور اس موقع سے پورا فائدہ اٹھالیں۔ چنانچہ اس کے بعد آپؐ نے ابوسفیان سے کہا کہ وہ قریش کے درمیان جائے اور ان سے کہہ دے کہ جو کوئی اسلحہ زمین پر رکھ کر اپنے گھر میں بیٹھے رہے گا یا مسجد الحرام میں پناہ لے گا اور یا ابوسفیان کے گھر میں پناہ گزین ہوگا اسے کسی قسم کی گزند نہیں ہوگی۔ (السیرۃ النبویہ ابن ہشام: ج ۴، ص ۴۶-۴۷)

رسولؐ خدا کا یہ اقدام اس امر کا باعث ہوا کہ قریش کے ان سرداروں نے جو سینہ سپر ہو کر سپاہ اسلام کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ جب ابوسفیان کی یہ کیفیت دیکھی تو انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

قریش کو زیر کرنے کے جتنے بھی مراحل ہو سکتے تھے وہ اب طے ہو چکے تھے اور وقت آن پہنچا تھا کہ رسولؐ خدا مکہ میں تشریف فرما ہوں۔ رسولؐ خدا کی یہ سعی و کوشش تھی کہ سپاہ اسلام شہر میں اس طرح داخل ہو کہ جہاں تک ہو سکے کوئی تصادم و حادثہ پیش نہ آئے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کُل سپاہ اسلام کو چار دستوں میں تقسیم کر کے ان میں سے ہر ایک پر ایک فرماندار مقرر فرمایا اور ہر دستے کو یہ حکم دیا کہ اندرونِ شہر اس راستے سے جائیں جو ان کے داخل ہونے کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے اور سب کو یہ ہدایت کر دی کہ اس کے علاوہ جو تم سے جنگ کرنا چاہے اس سے جنگ و پیکار نہ کرنا مگر اس کے ساتھ ہی دس ایسے افراد کے نام بھی آپؐ نے لیے جن کا خون بہانا جائز و مباح قرار دیا گیا۔ (مغازی: ج ۲، ص ۲۵)

اہلِ لشکر مقررہ راستوں سے مکہ میں داخل ہوئے۔ اندرونِ شہر ایک دشمن کی مختصر سی جماعت نے ہی استقامت و پائیداری کی کوشش کی مگر جب ان کے بہت سے سپاہی قتل ہو گئے تو ان کی استقامت و پائیداری کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ باقی سپاہ اسلام نے کسی خونریزی کے بغیر مکہ کو فتح کر لیا۔

اہلِ مکہ بالخصوص شرک کے حامی و طرفدار نہایت ہی اضطراب و بے چینی سے یہ انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیے کہ کب انجام کیا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے اُوپر اب تک وہ جو مظالم کر چکے تھے انھیں یاد کر کے انھیں اپنی موت سامنے آ رہی تھی۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے تو بتوں کو سرنگوں کیا اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ان لوگوں کے سامنے تقریر فرمائی جو وہاں موجود تھے۔ اس فتح و کامیابی پر خداوند تعالیٰ کی حمد و ستائش کرتے ہوئے آپؐ نے قریش سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو اور بتاؤ تمھارے دلوں میں کیا گمان و وسوسے ہیں؟

سب نے آہ و زاری کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: ہمیں آپؐ سے یہی توقع ہے کہ آپؐ ہمارے ساتھ خیر و نیکی کا سلوک فرمائیں گے۔ ہمیں یہی عرض کرنا ہے اور اس کے علاوہ ہمارے دلوں میں کوئی خیال و فکر نہیں۔ آپؐ ہمارے برادرِ محترم ہیں اور ہم آپ کو اپنے بھائی کا فرزند سمجھتے ہیں۔ باقی آپ کو اختیار ہے"۔ (مغازی: ج ۲، ص ۸۳۵)

رسولِ خدا نے انھیں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ میں تم سے اپنے بھائی حضرت یوسفؑ کی طرح چشم پوشی کرتا ہوں۔

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○

(سورۂ یوسف: آیت ۹۲)

"آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ اللہ تمھیں معاف کرے وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"۔

چنانچہ جب انھوں نے معافی کی درخواست کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ

"جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ (مغازی: ج ۲، ص ۸۳۵)

جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور شرک کے حامی و طرفدار لوگوں کے اعمال سے چشم پوشی کی تو مکہ کے لوگ جوق در جوق آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر دینِ اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ عرب خواتین نے بھی ان خاص آداب کے مطابق جو مقرر کیے گئے تھے رسولِ خدا سے بیعت کی۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے اس بے نظیر تبدیلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ (سورۂ نصر: آیت ۲)

"اے نبیؐ، دیکھو لوگے کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں"۔ (تفسیر المیزان: ج ۲، ص ۳۷۷)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خیال کے پیشِ نظر کہ بت پرستی ہر جگہ سے کُلّی طور پر نیست و نابود ہو جائے، لوگوں کو ہدایت کی کہ جس کسی کے پاس کوئی بت ہو وہ اسے پاش پاش کر دے۔ اس کے علاوہ آپؐ نے مکہ کے باہر بھی چند افراد کو بھیجا تاکہ جہاں کہیں بھی کوئی بت خانہ ہو اسے ویران کر دیں اور لوگوں کو دینِ اسلام کی دعوت دیں۔ (مغازی: ج ۲، ص ۸۷۳)

پیغمبرِ خدا رسولِؐ ہدایت و اصلاح نہ کہ انتقام جو

مسلمانوں کے ہاتھوں شہر مکہ کی تسخیر مشرکین کے سرداروں کی شکست و ریخت اور ان لوگوں کے ساتھ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غیر متوقع و بے مثال درگزر و چشم پوشی نے جو بیس سال سے زیادہ عرصہ تک اسلام سے دشمنی میں رسولِؐ خدا سے برسرِ پیکار رہے ثابت کر دیا کہ آنحضرتؐ کا مقصد گمراہ و نادان لوگوں کی ہدایت و اصلاح کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اور جنگ و تصادم کے واقعات پیش آئے ان میں آپؐ کا عزم ہدایت و اصلاح ہی تھا نہ کہ انتقام جوئی اور جاہ طلبی۔ چنانچہ ایسی عظیم الشان فتح کے باوجود صرف وہ دس افراد (چھے مرد اور چار عورتیں) جو سخت و سنگین جرائم کے مرتکب ہوئے تھے قابلِ سزا قرار دیے گئے اور "مہدور الدم" کے عنوان سے انھیں یاد کیا گیا۔ (مغازی: ج ۲، ص ۸۲۵)

ان میں سے بھی چار افراد کو قتل کر دیا گیا اور باقی کسی نہ کسی بہانے سے امان پانے میں کامیاب ہو گئے۔ اگرچہ ایسے موقعوں پر رہبرانِ انقلاب سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بالخصوص انھیں جو دشمن کے محاذ پر پیش پیش ہوتے ہیں تہِ تیغ کر دیتے ہیں لیکن جب ساری دنیا کے پیامبر یعنی "رحمۃ العالمین" سے بعض مسلمان سپاہیوں نے یہ کہا کہ اَلْیَوْمَ اَلْیَوْمَ الْمَلْحَمَۃ "آج کا دن انتقام لینے اور گھروں کو تہ و بالا کر دینے کا ہے"۔ تو آنحضرتؐ نے یہ شعار اختیار کیا: اَلْیَوْمَ اَلْیَوْمَ الْمَرْحَمَۃ "آج کا دن رحمت کا دن ہے"۔

چنانچہ اس کیفیت کو استاد حمید اللہ نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے۔ جب رسولِؐ خدا کسی شہر کا فاتح ہو تو اس سے اس عظمت و بزرگواری کے علاوہ اور کوئی توقع رکھنی ہی نہیں چاہیے۔

(رسول اکرمؐ در میدان جنگ)

غزوۂ حنین وطائف

شرک کی جب سب سے عظیم اساس گاہ کا قلع قمع ہوگیا اور "سواع مناۃ" اور "عزیٰ" جیسے بت کدے مسلمانوں کے ہاتھوں ویران ہو گئے تو اسلام کا عسکری و سیاسی اثر نفوذ تمام جزیرہ نما عرب پر چھا گیا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اکثر و بیشتر مشرکین قبائل نے اسلام کی اطاعت قبول کرلی اور اپنے عجز و انکساری کا اقرار کرلیا۔ ہوازن اور "ثقیف" ایسے دو قبیلے تھے جو اسلام سے نفرت کرنے میں پیش پیش اور جنگجوئی میں سب پر فوقیت رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ ان کے پاس اسلحہ جنگ بھی سب سے زیادہ رہتا تھا۔ انھیں یہ علم ہوا کہ مسلمانوں کو مشرکین پر فتح و نصرت حاصل ہوئی ہے تو وہ سخت سراسیمہ و پریشان خاطر ہوئے اور اب انھیں یہ خوف لاحق رہنے لگا کہ قریش کو مغلوب کرنے کے بعد سپاہ اسلام انھیں اپنے حملے کا نشانہ بنالیں گی۔ چنانچہ انھوں نے خود ہی پیش رفت کی اور مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار ہونے کا ارادہ کرلیا۔ ہوازن اور ثقیف کے لوگوں نے چند دیگر قبائل سے بھی عہد و پیمان کرلیا تھا۔

چنانچہ سب نے مجموعی طور پر طاقتور سپاہ کی شکل اختیار کر کے مالک بن عوف کی فرمان داری کے تحت رسولؐ خدا کے ساتھ جنگ و نبرد کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

دشمن نے اس خیال کے پیش نظر کہ محاذِ جنگ کی پشت سے اس کا کوئی تعلق نہ رہے اور مسلمانوں کے ساتھ جان توڑ کر جنگ کرے۔ اپنی عورتوں، بچوں اور مال وغیرہ کو اپنے سے دُور کر دیا۔ رسولؐ خدا کو جب دشمن کے ارادے کی اطلاع ہوئی تو آپؐ بتاریخ ۶ شوال سنہ ۸ ہجری میں بارہ ہزار سپاہیوں کا لشکر لے کر جس میں دس ہزار افراد مدینہ کے اور دو ہزار نو مسلم شامل تھے، دشمن کی جانب روانہ ہوئے۔

دونوں لشکروں کا مقابلہ حنین نامی مقام پر ہوا

مشرکین کا لشکر پہلے ہی وادیٔ حنین میں اُتر چکا تھا اور اس نے سارے ناکوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ وہ سپاہ اسلام کے اس پیش ہراول دستے پر جس کا فرماندار خالد بن ولید تھا، اچانک حملہ آور ہوا

اور اس دستے کو منتشر و پراگندہ کردیا۔ باقی مسلمانوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ صرف دس ہی ایسے تھے جو رسولؐ خدا کے دوش بدوش رہے۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۶۲)

ابوسفیان اور وہ قریش جو چند روز قبل ہی مسلمان ہوئے تھے مسلمانوں کی اس شکست پر بہت مسرور ہوئے اور اس پر تمسخر کرنے لگے۔ (تاریخ طبری)

اگرچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت تنہا رہ گئے تھے لیکن ان چند اصحاب کے ساتھ جو اس وقت آپؐ کے ساتھ تھے، میدانِ جنگ میں پوری استقامت و پائیداری کے ساتھ اپنی جگہ پر رہے اور جو لوگ فرار کرنے لگے تھے انھیں واپس آنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا: اے لوگو، کہاں بھاگے چلے جارہے ہو؟ واپس آجاؤ، میں محمدؐ بن عبداللہ رسولؐ خدا تمھیں بلا رہا ہوں۔ (السیرۃ ابن ہشام)

رسولؐ خدا کے ایما پر حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام بآوازِ بلند لوگوں تک پہنچایا جسے سن کر مسلمان ایک ایک کرکے واپس آنے لگے۔ رسولؐ خدا نے انھیں ازسرِنو مرتب کیا اور میدانِ جنگ دوبارہ شعلہ ور ہوگیا۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سب سے زیادہ جوش و خروش میں تھے اور دشمنوں کو خاک و خون میں ملا رہے تھے یہاں تک کہ قبیلہ ہوازن کے چالیس افراد آپؑ کی شمشیر سے ہلاک ہوئے۔ دوسرے مسلمانوں نے بھی شکست کی تلافیاں کیں اور چند لمحے فرار رہنے کی وجہ سے جو خفت ہوئی تھی اسے دُور کرنے کے لیے جان کی بازی لگادی۔ بالخصوص اس وقت جب کہ انھوں نے یہ دیکھا کہ اُمِ عمارہ، اُمِ سلیم، اُمِ سلیط اور اُمِ حارث جیسی دلیر خواتین بھی میدانِ کارزار میں اُتر آئی ہیں اور رسولؐ خدا کا مردانہ وار دفاع و تحفظ کررہی ہیں۔ (مغازی: ج ۲، ص ۹۰۲)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سپاہ میں مزید جوش و خروش پیدا کرنے کی خاطر اعلان فرمایا کہ "جو کوئی کسی کافر کو قتل کرے گا وہ مقتول کے لباس و اسلحہ کا مالک ہوگا"۔ (السیرۃ النبویہ ابن کثیر: ج ۳، ص ۶۲۰)

اس وقت ہوازن کا پرچم دار "ابوجرول" سرخ اُونٹ کے اُوپر سوار بلند نیزہ ہاتھ میں لیے سیاہ جھنڈا لہرا رہا تھا۔ وہ اپنے لشکر کے پیش پیش چل رہا تھا۔ ان عوامل کے باعث اور حضرت

علی علیہ السلام کے ہاتھوں اس کے قتل کی وجہ سے دشمن کے لیے فرار کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ فتح و ظفر اسلام کو نصیب ہوئی۔

اس جنگ میں چھے ہزار سپاہی قید ہوئے۔ ان کے علاوہ چوبیس ہزار اُونٹ، چالیس ہزار بھیڑ اور وزن میں چار ہزار اوقیہ (تقریباً ۸۵۰ کلوگرام) چاندی بطورِ مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آئی۔ باقی جو سپاہ بچی تھی وہ بھاگ کر "طائف"، "نخلہ" اور "اوطاس" کی طرف نکل گئی۔
(طبقات الکبریٰ: ج ۲، ص ۵۱ و ۵۲)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "بدیل بن ورقا" کو اس کام پر مامور فرمایا کہ وہ مالِ غنیمت کو "جعرانہ" نامی مقام پر لے جائیں، اس کی حفاظت کریں تاکہ جنگ ختم ہونے کے بعد اسے تقسیم کیا جاسکے اور آپؐ بذاتِ خود سپاہِ اسلام کو ساتھ لے کر "طائف" کی جانب روانہ ہوئے کیونکہ مالک بن عوف ثقیف کے دیگر لشکروں کے ہمراہ بھاگ کر اس طرف نکل گیا تھا، وہاں پہنچ کر آپؐ نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

قلعہ طائف کا محاصرہ تقریباً بیس روز تک جاری رہا۔ دشمن کی اِستقامت و پائیداری کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں نے منجنیقیں اور جنگی گاڑیاں بھی استعمال کیں لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ قلعے کے استحکام، اسلحہ، جنگ اور سامانِ خوراک کے ذخیرے کی وجہ سے دشمن کی اِستقامت و پائیداری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

رسولؐ خدا نے صحابہ کے مشورے سے محاصرہ جاری رکھنے کا خیال ملتوی کردیا اور جعرانہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ (مغازی: ج ۳، ص ۹۳۷)

اس فیصلے کی شاید یہ وجہ تھی کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمن کے وسائل و اسلحہ کا جائزہ لینے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا کہ طائف کو فتح کرنے کے لیے زیادہ وقت درکار ہے اور مدینہ سے آنحضرتؐ کوسوں دُور تھے۔ اس کے علاوہ مختلف افکار و خیالات کے بارہ ہزار سپاہیوں کو کافی عرصے تک قلعہ طائف کے اَطراف میں نہیں رکھا جاسکتا تھا کیونکہ ایک طرف تو لشکر کے لیے سامانِ خوراک کم ہوتا چلا جارہا تھا اور دوسری طرف ماہِ حرام اور حج کا زمانہ قریب چلا آرہا تھا۔ اس کے علاوہ چھے ہزار جنگی قیدیوں کے مسئلے کے بارے میں بھی غور کرنا تھا۔

مالِ غنیمت کی تقسیم

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب "جعرانہ" واپس تشریف لائے تو "ہوازن" کا وفد آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے دینِ اسلام قبول کرنے کے بعد رسولِ خدا سے درخواست کی کہ قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے۔ رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد اور ان کی دل جوئی کی خاطر ہوازن کے چھے ہزار قیدیوں کو فدیہ لیے بغیر آزاد کر دیا اور باقی غنیمت کو آپؐ نے قریش کے درمیان تقسیم کر دیا اور وہ لوگ جو حال ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے ان کے سرداروں کو آپؐ نے بیشتر حصہ عطا کیا تاکہ اس طریقے سے ان کے دل اسلام کی جانب بیشتر مائل ہو سکیں۔

جو لوگ چند روز قبل ہی مسلمان ہوئے تھے ان کے سرداروں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم داد و دہش بعض افراد بالخصوص انصار کو ناگوار گزری (اگرچہ اس مالِ غنیمت میں رسولِ خدا کا حصہ خمس، پانچواں تھا)۔ لیکن جب انھوں نے رسولِ خدا کی چند نصائح سنیں اور اس کی حکمت کے بارے میں انھیں علم ہوا تو وہ آنحضرتؐ کے اس اقدام سے مطمئن ہو گئے۔ (ارشاد: ص ۷۶ و ۷۷)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرہ کرنے کے ارادے سے "جعرانہ" میں احرام باندھا۔ عمرہ کرنے کے بعد آپؐ نے "عتاب بن اسید" کو مکہ کا فرماندار مقرر فرمایا اور حضرت معاذؓ بن جبل کو احکامِ دین کی تعلیم دینے کے لیے متعین فرمایا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ (تاریخ ابوالفداء: ج ۱، ص ۱۴۸)

غزوۂ حنین کی ابتدا میں شکست کے عوامل اور آخر میں مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب و علل

الف: ابتدائی مرحلے میں شکست

① کثرتِ سپاہ کی وجہ سے احساسِ تکبر اور غیبی مدد کی جانب سے غفلت و چشم پوشی، جس وقت بارہ ہزار افراد پر مشتمل سپاہِ اسلام مکہ سے نکل کر چلی اور اس کی شان و شوکت اور طاقت، حضرت ابوبکرؓ نے بھی دیکھی تو ان کی زبان پر یہ جملہ آ ہی گیا کہ: "طاقت کی کمی کے باعث بھی اب

ہم مغلوب نہ ہوں گے"۔

اس کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝ (سورۂ توبہ: آیت ۲۵)

"اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمہاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز اس کی دستگیری کی شان تم دیکھ چکے ہو، اس روز تمہیں اپنی کثرت کا غرہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھرا کر بھاگ نکلے"۔

۲ سپاہِ اسلام میں اہلِ مکہ کے ایسے افراد کی موجودگی جو حال ہی میں مسلمان ہوئے تھے ان میں سے بعض منافق تھے اور بعض محض مالِ غنیمت جمع کرنے کی خاطر سپاہِ اسلام کے ساتھ ہو گئے تھے۔ نیز کچھ لوگ بغیر مقصد و ارادہ کے مکہ سے باہر نکل آئے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ابتدائی مرحلے پر جب دشمن کا اچانک حملہ ہوا تو سب سے پہلے جو سر پر پیر رکھ کر بھاگے وہ یہی لوگ تھے اور یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے سپاہِ اسلام پر لعن و طعن شروع کر دی تھی، حتیٰ کہ بعض نے تو یہ بھی ارادہ کر لیا تھا کہ رسولِ خدا کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسے عناصر کی ان حرکات کا باقی سپاہ پر اثر انداز ہونا اور اس کی قوتِ ارادی و حوصلہ مندی میں ضعف آنا فطری و قدرتی امر تھا۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۶۲)

۳ دشمن کے سپاہی جس جگہ جمع تھے نیز جہاں دونوں لشکروں کے درمیان معرکہ ہوا اس جگہ کا محلِ وقوع، دشمن کی کمین گاہیں، درے اور پہاڑی شگاف، اذانِ فجر کے وقت جبکہ مطلع صاف و روشن نہیں تھا، غنیم کا اچانک حملہ وغیرہ ایسے عوامل تھے جن کے باعث مسلمانوں سے یہ قوتِ فیصلہ سلب ہوگئی کہ وہ کیا اقدام کریں۔

آخری فتح

۱ غیبی مدد اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے نصرت و کامیابی۔

اس کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ○

"پھر اللہ نے اپنا سکون اپنے رسولؐ پر اور مومنین پر نازل فرمایا ہے اور وہ لشکر اُتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کرتے ہیں"۔ (سورۂ توبہ: آیت ۲۶)

۲ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام اور دیگر ایثار پسند و جان نثار مردوں، نیز عورتوں کی میدانِ کارزار میں اِستقامت و پائیداری، اس کے ساتھ ہی میدانِ جنگ میں رسولِ خدا کا واپس سپاہ کو بلانا اور انھیں از سرِ نو منظم کرنا۔

۳ حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں دشمن کے پرچم دار اور دیگر مسلمانوں کے ہاتھوں دشمن کے سردار درید بن صمہ نامی کا قتل کیا جانا۔

maablib.org

غزوۂ تبوک

جزیرہ نما عرب میں شرک کے عظیم ترین مستقر کی شکست و ریخت کے ساتھ ہی حجاز کے سرداروں نے بھی رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح جب ملک کی شمالی حدود میں دینِ اسلام کی اشاعت کے امکانات روشن ہو گئے تو رومی حکومت کے ایوانوں میں وحشت و اضطراب کے باعث لرزہ پیدا ہونے لگا۔ اس کی عظیم ترین عسکری طاقت چونکہ انتہائی مرتب و منظم تھی اور جنگوں میں اپنے طاقتور حریف یعنی ملک ایران پر وہ پے در پے فتوحات حاصل کر چکا تھا اور اسے اپنی طاقت پر ناز و غرور بھی تھا۔ چنانچہ اپنی اس طاقت کے زُعم میں اس نے اپنے مسلح و منظم لشکر سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم ہو گیا کہ شہنشاہِ روم "ہرقل" نے عظیم لشکر جمع کر کے ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی ادا کر دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سرحدوں پر واقع "لخم"، "خذام"، "غسان" اور "عالمہ" صوبوں کے فرمانداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ نیز اس کا ہراول دستہ "بقا" تک آن پہنچا ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب یہ اطلاع ملی تو اس وقت موسم انتہائی گرم تھا اور لوگ خرما (کھجور) کی فصل جمع کر رہے تھے۔ ایک طرف راستے کی دُوری اور دوسری طرف سپاہِ روم کا اُژدہام ایسے عوامل تھے جن کے باعث سپاہ کو روانہ کرنا سخت و دشوار کام تھا بالخصوص ان واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو معرکہ موتہ کے موقعے پر پیش آ چکے تھے۔ لیکن ان لوگوں کے لیے جو واقعی مسلمان تھے اسلام کی قدر و قیمت، ذاتی آسائش و آرام اور مادی منفعت سے کہیں زیادہ تھی اور وہ اس کی فلاح کی خاطر تمام باتوں کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس خیال کے پیشِ نظر رسولِ خدا نے صحابہ کو جمع کیا اور مختصر طور پر دشمن کی اِستعداد اور اس کی عسکری بالادستی کے بارے میں مطلع کیا۔ اس کے ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر کی روانگی کے لیے سعی و کوشش شروع کر دی۔ چنانچہ

قبائل کے درمیان اور مکہ کی جانب رسولِ خدا کے نمائندے روانہ کیے گئے تاکہ وہ لوگوں کو مقدس جہاد میں شرکت کی دعوت دیں۔

ناسازگار حالات کے باوجود تیس ہزار جنگجو سپاہیوں نے جن میں دس ہزار سوار بھی تھے۔ رسولِ خدا کی پکار پر لبیک کہا۔ (مغازی: ج ۳، ص ۹۹۰، ص ۱۰۰۲)

رسولِ خدا نے جنگ کے اخراجات مہیا کرنے کے لیے مال دار لوگوں سے کہا کہ سپاہ کی مال واسلحہ کے ذریعے مدد کریں۔ اس کے علاوہ جب پیغمبرِ خدا کی طرف سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس سفر کے اختیار کرنے کا مقصد کیا ہے تو مسلمان اپنے اس اسلحہ اور ساز وسامان کے ساتھ لشکر کی خیمہ گاہوں میں جمع ہو گئے۔

رسولِ خدا کے فرمان پر لوگوں کے گوناگوں افکار ونظریات

جب ہم تاریخ کی کتابوں کے صفحات اور ان آیاتِ قرآنی پر نظر ڈالتے ہیں جو اس سلسلے میں نازل ہوئی ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس غزوہ کے بارے میں مسلمانوں کے افکار ونظریات مختلف گوناگوں تھے جس کی کیفیت ذیل میں درج ہے۔

۱۔ ان لوگوں کو جو مومن اور اپنے قول کے پابند تھے (اور اکثریت ان ہی پر مشتمل تھی) جیسے ہی رسولِ خدا کی دعوت کا علم ہوا تو اس ساز وسامان کے ساتھ جو ان کے پاس موجود تھا لے کر رسولِ خدا کی سپاہ میں شامل ہو گئے۔

۲۔ ایک گروہ ایسا بھی تھا جو رسولِ خدا کے ساتھ جانا تو چاہتا تھا مگر اس کے پاس سواری کے جانور نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے رسولِ خدا سے کہا کہ اگر سواری کا بندوبست ہو جائیں تو وہ چلنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب رسولِ خدا نے فرمایا کہ سواری کے جانور کا فراہم کرنا تو ممکن نہیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اشک بار اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس چلے گئے۔ (سورۂ توبہ)

۳۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے فرمانِ رسولؐ کے سامنے سر ہی نہیں جھکایا بلکہ سپاہ کی روانگی میں جس حد تک ممکن ہو سکتا تھا خلل اندازی سے بھی باز نہ آئے۔ چنانچہ وہ مجاہدین جو جنگ میں شرکت کرنا چاہتے تھے ان سے یہ لوگ کہتے کہ اس تپتے ہوئے

موسم میں جنگ پر مت جاؤ۔ اس کے علاوہ جو لوگ ان مجاہدین کو مالی مدد دینا چاہتے تو ان کا بھی یہ لوگ مذاق اُڑاتے۔ کسی پر یہ ریاکار ہونے کا الزام لگاتے اور کسی کی یہ کہہ کر حوصلہ شکنی کرتے کہ تمھارے پاس سامانِ سفر بہت کم ہے، جنگ پر جا کر کیا کرو گے۔ (تفسیر البرہان: ج ۲، ص ۱۴۸)

۴ کچھ لوگ ایسے بھی آرام طلب تھے جو جنگ سے فرار کرنے کی غرض سے رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کوئی بے بنیاد بہانہ تراش کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ درخواست کرتے کہ انھیں مدینہ میں ہی رہنے دیا جائے۔ (سورۂ توبہ: آیت ۹۰)

۵ بعض نے سپاہِ اسلام کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے سے اختلاف کیا لیکن اس اختلاف کی بنیاد میں ان کی بدنیتی شامل نہیں تھی بلکہ اس کا سرچشمہ جنگ کے معاملے میں ان کی سستی و کاہلی انکاری تھی۔ دشمن کے ساتھ جنگ کرنے سے زیادہ اپنے درختوں کے میوؤں کے ساتھ دلچسپی تھی اور یہ کہتے تھے کہ ہم فصل جمع کرنے کے بعد ہی جنگ میں شرکت کریں گے۔ (ایضاً، آیت ۱۱۸)

تبوک کی جانب روانگی

منافقین کی ہر رخنہ اندازی اور اِفتراء پردازی کے باوجود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کر دیا اور بتاریخ ۹ رجب سنہ ۹ ہجری قمری اس عظیم لشکر کے ہمراہ، جسے اس دن تک مدینہ میں کسی کی آنکھ نہیں دیکھا تھا، آنحضرتؐ نے شمال کی جانب طویل راہ اختیار کر لی۔

تاریخ کی کتابوں میں درج ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو مدینہ میں اپنا جانشین اسی وجہ سے مقرر کیا کہ آنحضرتؐ کو عربوں کی بدنیتی کے بارے میں بخوبی علم تھا جن کے ساتھ آپؐ نے جنگ کی تھی اور ان کے بہت سے رشتہ داروں کو تہِ تیغ کیا تھا۔ اس کے علاوہ آپؐ مدینہ کے ان منافقین کی کارستانیوں سے بھی بے خبر نہ تھے جنھوں نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس جنگ میں شرکت کرنے سے اجتناب کیا تھا اور یہ احتمال تھا کہ جب رسولِ خدا کافی عرصے تک مدینہ سے باہر تشریف فرما رہیں گے تو آپ کی غیر موجودگی نیز وہ مسلمانوں کی تنہائی کا غلط فائدہ اُٹھاتا

چاہیں گے، اور مدینہ پر حملہ کر دیں گے۔ رسولِ خدا کی طرح حضرت علی علیہ السلام کی مدینہ میں موجودگی دشمنوں کو خوف زدہ رکھنے، ان کی سازشوں کو ناکام بنانے اور مرکزی حکومت کی حفاظت و پاسداری کے لیے اشد ضروری تھی۔

چنانچہ یہی وجہ تھی جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا تو اس سلسلے میں آپؐ نے فرمایا:

إِنَّ الْمَدِيْنَةَ لَا تَصْلُحُ إِلَّا بِيْ أَوْ بِكَ

"یعنی مدینہ میرے یا تمھارے بغیر اصلاح پذیر نہ ہوگا"۔ (ارشاد مفید: ص ۸۳)

سپاہِ اسلام کے سامنے چونکہ اقتصادی راستے کی دوری، سواری کے جانوروں کی کافی کمی، سخت گرمی، جھلسا دینے والی ہوا کی تپش جیسی مشکلات تھیں اسی لیے اس لشکر کو "جیش العسرۃ" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ سپاہ ان تمام سختیوں کو برداشت کرتی ہوئی "تبوک" نامی مقام پر پہنچ گئی مگر یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دشمن کا دُور دُور تک پتہ نہیں۔ گویا ہرقل کو جب اسلام کی عظیم سپاہ کی روانگی کا علم ہوا تو اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ پسپا ہو کر اپنے ملک کی حدود میں چلا جائے لیکن سپاہِ اسلام نے وسیع پیمانے پر انتہائی تیزی کے ساتھ شمالی حدود کے کنارے پہنچ کر اور بیس روز تک وہاں قیام پذیر رہ کر دشمنانِ اسلام کو بہت سے پند آموز سبق سکھا دیے، جن میں سے چند کا ہم یہاں ذکر کریں گے:

① روم کی شہنشاہیت اور اس کے پروردہ سرحدی حکمرانوں پر اسلام کی طاقت و عظمت قطعی طور پر آشکار و عیاں ہوگئی اور یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مسلمانوں کی عظیم عسکری طاقت اس حد تک ہے کہ اگر دنیا کے طاقتور ترین لشکر سے بھی ٹکر لینے کی نوبت آجائے تو اس کا مقابلہ کرنے میں انھیں ذرا بھی باک نہیں۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ بعض سرحدی صوبوں کے فرمانروا اس اطلاع کے ملتے ہی کہ لشکرِ اسلام سرزمینِ تبوک تک پہنچ گیا ہے، رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس عہد و پیمان کے ساتھ کہ وہ کسی طرح کا تعرض نہ کریں گے۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ ہر سال معقول رقم حکومتِ اسلامی کو بطور خراج ادا کریں گے۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۴، ص ۱۶۹)

② مدینہ و تبوک کے راستے پر "دومۃ الجندل" نامی محکم قلعہ بنا ہوا تھا جس پر "اکیدر" نامی

عیسائی بادشاہ کی حکمرانی تھی۔ چونکہ اس کے تعلقات ہرقل کے ساتھ خوشگوار تھے، اسی لیے اس کا شمار ان مراکز میں ہوتا تھا جو مسلمانوں کے لیے خطرات پیدا کر سکتے تھے۔ چنانچہ رسولِ خدا نے خالد بن ولید کو تبوک سے چار سو بیس سواروں کے دستے کے ساتھ دومۃ الجندل کی جانب روانہ فرمایا تاکہ وہاں پہنچ کر انھیں اسلحہ سے بے دخل کر دے۔ خالد نے دشمن کے اسلحے پر قبضہ کرنے کے بعد اس منطقے کے فرمانروا کو گرفتار کرلیا اور اسے مالِ غنیمت کے ساتھ لے کر رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسولِ خدا ﷺ نے اسے اس شرط پر آزاد کر دیا کہ وہ "جزیہ" ادا کیا کرے گا۔ (حوالہ سابق)

۳ اس غزوہ کے باعث دینِ اسلام و رسولِ خدا کا نام نامی روم کے عیسائیوں کی زبان پر جاری رہنے لگا اور اس کا چرچا تازہ ترین خبر کی طرح ہر جگہ رہتا۔ چنانچہ ایسا میدان ہموار ہو گیا کہ رومی دینِ اسلام کو عالمی طاقت سمجھنے لگے۔

۴ جزیرہ نما عرب میں وہ عرب و مشرکین جو دینِ اسلام قبول کرنے کی سعادت سے محروم رہ گئے اب انھیں بھی دینِ اسلام کی قوت کا پوری طرح اندازہ ہونے لگا تھا اور یہ بات اچھی طرح ان کی سمجھ میں آ گئی کہ جب رومیوں کا طاقت ور لشکر اپنے پورے جنگی ساز و سامان کے باوجود لشکرِ اسلام کا مقابلہ نہ کر سکا تو ایسی زبردست طاقت کے سامنے ان کا سینہ سپر رہنا لاحاصل ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر ان قبائل نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اس سے قبل کہ رسولِ خدا ان کی خبر لینے آئیں وہ خود ہی اپنے نمائندے رسولِ خدا کی خدمت میں روانہ کر دیں اور چاہا کہ یا تو دینِ اسلام قبول کرلیں اور یا ایسا عہد و پیمان کریں جس کی رُو سے اسلامی حکومت ان کے معاملات میں معترض نہ ہو۔ چونکہ بیشتر وفد غزوۂ تبوک کے بعد سنہ ۹ ہجری میں رسولِ خدا کی ملاقات سے مشرف ہوئے۔ اسی وجہ سے سنہ ۹ ہجری کو "سنۃ الوفود" کہا جانے لگا۔ (السیرۃ النبویہ: ج ۴، ص ۲۰۵)

اس کے علاوہ رومی لشکر مسلمانوں کا مقابلہ کرنے سے پہلے ہی چونکہ فرار کر گیا تھا، لہٰذا سپاہ کے حوصلے اس واقعے سے بہت زیادہ بلند ہونے لگے۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے روم پر حملے کیے تو اس سے بہت سے عمدہ اثرات رُونما ہوئے۔

پہلا تو یہی کہ ان کے حوصلے اتنے قوی ہو گئے کہ وہ کسی بھی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتے

تھے اور شاید اسی حوصلہ مندی کی وجہ سے انھوں نے یہ اقدام کرنا چاہا کہ اپنا اسلحہ فروخت کردیں کیونکہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "اب جہاد کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے" مگر رسولؐ خدا نے انھیں اس اقدام سے منع فرمایا۔ (طبقات الکبری: ج ۲، ص ۱۶۷)

مدینہ کے رہنے والوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ اسلام کو رومیوں پر فتح حاصل ہوئی ہے تو وہ ایسے مسرور ہوئے کہ بقول "حلبی" عورتوں، بچوں اور نوجوانوں نے یہ ترانے گا کر لشکرِ اسلام کا استقبال کیا۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوِدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ
اَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِيْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ مُطَاعٍ

"ہم پر بدر نے ثنیات الوداع سے طلوع کیا، جب تک کوئی خدا کو پکارنے والا ہے، ہم پر شکر واجب ہے۔ اے ہم میں مبعوث ہونے والے نبی آپؐ ایسا حکم لے کر آئے ہیں کہ جس کی اطاعت ضروری ہے"۔

دوسرا یہ کہ مسلمان اتنا طویل پُرمشقت سفر کرنے کے باعث چونکہ اس کی مشکلات و خصوصیات سے واقف ہوگئے تھے اسی لیے مستقبل میں شام کو فتح کرنے کا راستہ ان کے لیے ہموار ہوگیا اور شاید یہی وجہ تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد دیگر ممالک کو فتح کرنے سے قبل مسلمان شام کو فتح کرنے کی جانب متوجہ ہوئے۔

نفاق کا چہرہ بے نقاب

صدرِ اسلام کی دیگر جنگوں کے مقابل "غزوۂ تبوک" سب سے زیادہ منافقین کی جولان گاہ اور ان کے خیانت کارانہ و مجرمانہ افعال کی آزمائش گاہ ثابت ہوا۔ چنانچہ انھوں نے جتنی بھی بدعمالیاں اور بدعنوانیاں کیں خداوند تعالیٰ نے دوسری جنگوں کے مقابل ان کے اتنے ہی بُرے ارادوں اور ان کے منافقانہ چہروں کو بے نقاب کیا اور شاید اسی وجہ سے اس غزوہ کو "فاضحہ" (رُسوا کن) کہا گیا ہے۔ (السیرۃ الحلبیہ: ج ۳، ص ۱۳۹)

اس سے قبل کہ سپاہِ اسلام "تبوک" کی جانب روانہ ہو۔ منافقین نے جو بھی مواقع تلاش

کیے اور جو بھی خیانت کاریاں ان سے سرزد ہوئیں، ان کے بعض نمونے پیش کیے جا چکے ہیں۔ انھوں نے انھی خیانت کاریوں اور اپنی بداعمالیوں پر اکتفا نہ کی بلکہ جتنے عرصے تک لشکرِ اسلام غزوہ تبوک پر رہا ان کی سازشیں بھی جاری رہیں۔ چنانچہ ذیل میں ہم اس کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

۱ منافقین کے ایک گروہ نے "سویم" نامی یہودی کے گھر پر جلسہ کیا جس میں انھوں نے اس مسئلے پر غور وفکر کیا کہ جنگی اُمور اور لشکر کی روانگی میں کس طرح خلل اندازی کی جائے۔ چنانچہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو آنحضرتؐ نے چند لوگوں کو اس کے گھر کی طرف روانہ کیا جنھوں نے اسے نذرِ آتش کردیا۔ (حوالہ سابق، ص ۱۶۰)

۲ اس وقت سپاہِ اسلام "ثنیۃ الوداع" نامی لشکرگاہ میں جمع ہوئی تو منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں اور ان یہودیوں کے ہمراہ جن سے ان کا معاہدہ تھا کوہِ رکاب کے کنارے اپنا خیمہ لگایا اور رسولِ خدا کے خلاف اس طرح زہر اُگلنا شروع کیا:

> "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کی سوجھی ہے اور وہ بھی اس جھلسا دینے والی گرمی میں اور اتنی دُور جاکر۔ ادھر سپاہِ اسلام کا یہ حال ہے کہ اس میں جنگ کی ذرا بھی تاب و مجال نہیں۔ رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کو ہنسی کھیل سمجھ لیا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جتنے بھی ساتھی ہیں سب ہی کل قیدی ہوں گے اور سب کی مُشکیں کسی ہوئی نظر آئیں گی۔

وہ اپنی اس خیانت کارانہ گفتار اور بدکرداری سے چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے حوصلے پست کردے اور انھیں اس مقدس جہاد پر جانے سے باز رکھے۔ مگر اس کی یہ نیرنگی و حیلہ گری کارگر ثابت نہ ہوئی اور بہت ہی یاس و ناامیدی کی حالت میں مدینہ پہنچا۔ (مغازی: ج ۳، ص ۹۹۵)

۳ سپاہِ اسلام جب تبوک کی جانب روانہ ہوئی اور حضرت علی علیہ السلام مدینہ میں قیام فرما رہے تو منافقوں کو اپنی تمام کوششیں ناکام ہوتی نظر آئیں۔ چنانچہ اب وہ اس فکر میں رہنے لگے کہ کس طرح ایسا ماحول پیدا کریں اور اس قسم کی افواہیں پھیلا دیں کہ حضرت علی علیہ السلام مرکزی حکومت سے دُور چلے جائیں تاکہ رسولِ خدا اور حضرت علی علیہ السلام کی غیر موجودگی میں پورے اطمینان کے ساتھ اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے جب یہ افواہیں سنیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی سرد مہری اور بے التفاتی کی وجہ سے محاذِ جنگ پر لے کر نہیں جا رہے ہیں آپؑ رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام واقعات آنحضرتؐ کے سامنے بیان کیے جنھیں سن کر رسولِ خدا نے فرمایا:

وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں تو تمھیں اس وجہ سے چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہاں جو کچھ ہے تم اس کی حفاظت و نگہبانی کرو۔ کیا تمھیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ تم میرے لیے ایسے ہی ہو جیسے موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ تھے۔ بس میرے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

اس کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے ارشاد فرمایا کہ آپؑ واپس مدینہ چلے جائیں اور آنحضرتؐ کے جانشین کی حیثیت سے "دارالہجرہ" میں اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ مقیم رہیں۔

۴ سپاہِ اسلام کے خوف سے لشکرِ روم کی مغلوبی نیز ان فتوحات کے باعث جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تبوک میں مقیم رہنے کے دوران حاصل ہوئیں۔ منافقین کا حسد و کینہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ اسی لیے جس وقت سپاہِ اسلام تبوک سے واپس آ رہی تھی تو ان منافقین نے نہایت ہی خطرناک چال چلنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی سازش یہ تھی کہ جب رسولِ خدا رات کی تاریکی میں بلند درے سے گزریں گے تو منافقین میں سے دس بارہ آدمی آنحضرتؐ کی گھات میں بیٹھ جائیں گے تاکہ جیسے ہی آپؐ کی سواری کا اُونٹ اس راستے سے گزرے تو اسے بھڑکا دیں اور آنحضرتؐ اس گہرے درے میں گر کر ہلاک ہو جائیں، لیکن خداوند تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی سازش سے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ جب منافقین نے یہ دیکھا کہ رسولِ خدا کو ان کی سازش کا علم ہو گیا ہے تو وہ وہاں سے فرار کر گئے اور اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ اگرچہ رسولِ خدا نے ان سب کو پہچان لیا تھا اور صحابہ نے بھی چاہا کہ انھیں قتل کر دیا جائے مگر رسولِ خدا نے انھیں معاف کر دیا۔ (السیرۃ الحلبیہ: ج ۳، ص ۱۴۳)

۵ منافقین اپنے جرائم کی پردہ پوشی کرنے کے لیے ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے کہ ہمیشہ دین کا لباس پہنے رہیں۔ مذہب کے پردے میں اپنے ان مجرمانہ افعال کو جاری رکھنے کے لیے انھوں نے محلہ "قبا" میں مسجد (اس مسجد کا نام ضرار تھا) کے نام سے ایک سازشی مرکز قائم کیا تاکہ وہاں سے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکیں۔ رسولِ خدا کی تبوک کی طرف روانگی سے پہلے

انھوں نے مسجد کی تعمیر شروع کی اور رسولِ خدا ﷺ کو اس کے بارے میں مطلع کر دیا۔ جس وقت آنحضرتؐ واپس تشریف لا رہے تھے تو مدینہ کے نزدیک قاصد غیب وحی لے کر نازل ہوا اور آیاتِ قرآنی کے ذریعے مسجد بنانے والوں کے گمراہ کن ارادوں سے مطلع کر دیا۔ رسولِؐ خدا نے حکم صادر فرمایا کہ اس مسجد کو آگ لگا کر خاکستر کر دیں اور جو کچھ وہاں بچ رہے اسے تباہ و برباد کر دیں اور اس جگہ کو ڈلاؤ کے طور پر استعمال کریں۔ (سورۂ توبہ)

غزوۂ تبوک میں مسلمانوں کی فتح و نصرت، اس جنگ کے بارے میں منافقین نے جو اندازے لگائے تھے وہ سب باطل ثابت ہوئے۔ جنگ کے دوران ان کی سازشوں کی ناکامی، مسجد ضرار کی ویرانی، اسلام دشمن عناصر کے چہروں سے ریا کی نقاب کشائی اور آیاتِ قرآنی (توبہ) میں ان کی خصوصیات کے بارے میں جو نشان دہی کی گئی تھی ان کے باعث کفر کے پیکر پر پے در پے ایسی سخت ضربات لگیں کہ اس کا سر کچل گیا اور وہ خیانت کار و خطرناک گروہ جو اسلامی معاشرے میں پَل رہا تھا منہ کے بل گرا اور وہ لوگ جو محاذِ نفاق کی جانب رسولِؐ خدا کے خلاف نبرد آزمائی کر رہے تھے سخت مایوسی و ناامیدی کے شکار ہوئے۔ چنانچہ یہ مسلسل ناکامیوں، نامرادیوں کا ہی نتیجہ تھا کہ منافقین کا سرغنہ عبداللہ بن ابی غزوۂ تبوک کے ایک ماہ بعد ہی غموں میں گھل گھل کر مر گیا۔ (مغازی)

سنہ ۹ ہجری کے اواخر میں زمانہ حج کے شروع ہونے سے قبل قاصد پیغامِ وحی نے سورۂ توبہ کی چند ابتدائی آیات رسولِؐ خدا کو پڑھ کر سنائیں۔ ان آیات میں خدا اور رسولِؐ خدا کی مشرکین سے بیزاری، مسلمانوں کے ساتھ ان کے قطع تعلق اور ان معاہدوں کو منسوخ کرنے کے بارے میں ہدایت کی گئی جو مسلمانوں نے ان کے ساتھ کیے تھے۔

رسولِؐ خدا نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج مقرر کر کے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ مشرکین تک سورۂ توبہ کی آیات پہنچا دیں۔ لیکن جب وہ روانہ ہو گئے تو دوبارہ فرشتہ وحی نازل ہوا اور یہ پیغام سنایا کہ اس کام کو پیغمبرؐ خدا یا خاندانِ رسالت کے کسی فرد کے علاوہ کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ چنانچہ رسولِؐ خدا نے حضرت علی علیہ السلام کو بلایا اور اس کام پر مقرر فرمایا کہ مشرکین تک یہ آیات پہنچا دیں۔

حضرت علی علیہ السلام راستے میں ہی حضرت ابوبکرؓ سے جا ملے اور ان سے فرمایا کہ یہ آیات مجھے

عنایت کر دیں اور مذکورہ آیات کو لے کر خود مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ جب مناسکِ حج کا زمانہ آگیا تو آپؑ نے مسلمانوں اور کفار کے مجمع کثیر میں آیات کی تلاوت فرمائیں اور اس کے ساتھ ہی رسولِ خدا کا پیغام بھی پہنچا دیا۔ اس پیغام میں جو باتیں کہی گئی تھیں وہ یہ ہیں کہ:

۱ کافر جنت میں داخل نہ ہوں گے۔

۲ آیندہ مشرکین کو مکہ میں داخل ہونے اور مناسکِ حج ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

۳ آیندہ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہوگی کہ وہ برہنہ خانہ کعبہ کا طواف کرے۔

۴ جن لوگوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہد و پیمان کیے ہیں وہ مدتِ معینہ تک ہی معتبر و قابلِ عمل ہیں۔ اور جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کیا گیا ہے انھیں چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اس عرصے میں اپنے معاہدے کے بارے میں غور کریں۔ اور جب یہ عرصہ گزر جائے گا تو کسی بھی مشرک کے ساتھ عہد و پیمان نہ کیا جائے گا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۱۹۰-۱۹۱)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو یہ صریح وقطعی اقدام کیا اس کی شاید وجہ یہ تھی کہ اس وقت سے جب کہ یہ پیغام مشرکین کو پہنچایا گیا، نزولِ رسالت تک تقریباً بائیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور اس طویل عرصے میں رسولِ خدا کی تمام تر سعی و کوشش رہی کہ مشرکین راہِ راست پر آجائیں۔ چنانچہ اس کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ بت پرستوں کے شرک اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ وجدال کی اصل وجہ ان کی ضد اور ذاتی دشمنی تھی۔ اور اب اس چیز کی سخت ضرورت تھی کہ اسلامی معاشرہ جس قدر جلد ہو سکے ایسے عناصر سے پاک ہو جائے۔ اگر کسی زمانے میں پیغمبر اکرمؐ نے سیاسی حالات کے تحت مجبور ہو کر مشرکین کے ساتھ عہد و پیمان کیا تو اس کے بعد آنحضرتؐ کے لیے ضروری نہ تھا کہ اس وقت جب کہ تمام منطقہ دینِ اسلام کے تحت اثر آچکا تھا اور اس نے صرف اندرونی ہی نہیں بلکہ بیرونی محاذوں پر عظیم ترین فتح ونصرت حاصل کر لی تھی۔ ایسے عناصر کو اسلامی معاشرے کے اندر برداشت کریں اور وہ توہمات وخرافات اور خلل اندازی کے پردے میں زمین پر فساد بپا کرتے رہیں۔ انھیں چار ماہ کی مہلت اس لیے دی گئی تھی کہ انھیں اپنے بارے میں سوچنے کے لیے کافی وقت مل سکے اور اپنے توہمات وخرافات سے دست بردار ہونے کے

بارے میں غور وفکر کر سکیں۔

رسولِ خدا کا قطعی فیصلہ سورۂ توبہ کی آیات کا نزول اور مشرکین کے مقابل رسولِ خدا کا جرأت مندانہ مگر انسان دوستی پر مبنی اقدام بالخصوص چار ماہ کا عرصہ اس امر کا باعث ہوا کہ وہ اپنے بارے میں سوچیں اور موقع سے فائدہ اُٹھائیں۔ اس کے ساتھ ہی دینِ اسلام کی آسمانی تعلیمات اور اپنے خرافات پر مبنی طور وطریقے کے بارے میں غور وفکر کرنے کے بعد دینِ اسلام کی آغوش میں چلے آئیں۔

حجۃ الوداع، جانشین کا تعین اور رحلت پیغمبر اکرمؐ

حجۃ الوداع

اسلام کے ہاتھوں تبوک میں سلطنت روم کی بیخ کنی جزیرہ نما عرب میں شرک و بت پرستی کی شکست و ریخت اور مشرکین کے نہ صرف مکہ میں داخل ہونے بلکہ مناسک حج میں شرکت کرنے پر مکمل پابندی کے بعد جب زمانہ حج نزدیک آیا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کام پر مقرر کیا گیا۔ خدا کا حکم ہوا کہ بذاتِ خود ہجرت کے دسویں سال میں مناسک حج ادا کریں تاکہ اسلام کی طاقت کو زیادہ ظاہر و نمایاں کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو ہدایت فرمائیں کہ وہ عہد جاہلیت کے آداب و رسوم کو ترک کر کے سنت ابراہیمی کے مطابق اسلامی طریقے پر ارکانِ حج ادا کریں۔ اسی ضمن میں آنحضرتؐ اساسی و لازمی اصول بالخصوص مستقبل میں اسلام کے مسئلہ راہبری و قیادت کے بارے میں براہِ راست مسلمانوں کو ہدایت فرمائیں تاکہ سب پر حجت تمام ہو جائے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس کام پر مامور کیا گیا کہ آنحضرتؐ تمام مسلمانوں کو حج بیت اللہ پر چلنے کے لیے آمادہ کریں اور انھیں اس عظیم اسلامی اجتماع میں شرکت کرنے کی دعوت دیں، چنانچہ اس بارے میں خداوند تعالیٰ اپنے نبیؐ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

> وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ○ (سورۂ حج: آیت ۲۷)
>
> "اور لوگوں کے درمیان حج کا اعلان عام کر دو کہ وہ تمھارے پاس ہر دُور دراز مقام سے پیدل اور اُونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں"۔

جس وقت یہ اعلان کیا گیا اگرچہ اس وقت مدینہ اور اس کے اطراف میں چیچک کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور بہت سے مسلمان اس مرض کی وجہ سے ارکانِ حج ادا کرنے کے لیے شرکت نہیں

کر سکتے تھے۔ مگر جیسے ہی انھوں نے رسولِ خدا کا یہ پیغام سنا، مسلمان دُور و نزدیک سے کثیر تعداد میں مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے تا کہ رسولِ خدا کے ساتھ مناسکِ حج ادا کرنے کا فخر حاصل کر سکیں۔ مؤرخین نے ان کی تعداد چالیس ہزار سے ایک لاکھ چوبیس ہزار تک اور بعض نے اس سے بھی زیادہ لکھی ہے۔ (سیرۃ حلبیہ: ج ۳، ص ۲۵۷)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابودجانہؓ کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر فرمایا اور ہفتہ کے دن پانچ ذی القعدہ کو مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ اس سفر میں مسلمانوں کا ذوق و شوق تھا کہ ان میں سے کثیر تعداد نے مدینہ و مکہ کے درمیان کا فاصلہ پیدل چل کر طے کیا۔ (ارشاد مفید: ص ۹۱)

یہ قافلہ بتاریخ چہارم ذی الحجہ منگل کے دن مکہ میں داخل ہوا جہاں اس نے عمرہ کے ارکان ادا کیے۔ آٹھ ذی الحجہ تک مسلمانوں کی دوسری جماعت بھی مکہ پہنچ گئی جس میں حضرت علی علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھی بھی شامل تھے۔ اس وقت آپؑ یمن کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عظیم اسلامی اجتماع میں سنتِ ابراہیمی کے مطابق مناسکِ حج ادا کرنے کی تعلیم دینے کے ساتھ یہ بھی ہدایت فرمائی کہ کس طرح صحیح طور پر ارکانِ حج پر عمل پیرا ہوں۔ آنحضرتؐ نے مکہ کے منیٰ اور میدانِ عرفات میں مختلف مواقع پر تقاریر فرما کر آخری مرتبہ مسلمانوں کو پند و نصائح اور ارشاداتِ عالیہ سے نوازا۔ ان تقاریر میں آپؐ نے انھیں یہ نصیحت فرمائی کہ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کریں، قتلِ نفس کا پاس رکھیں، سود کی رقم کھانے، دوسروں کا مال غصب کرنے سے بچیں۔ دورِ جاہلیت میں جو خون بہایا گیا تھا اس سے چشم پوشی کو ہی بہتر سمجھیں۔ کتاب اللہ پر پابندی سے عمل پیرا ہوں۔ ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ سلوک کو افضل جانیں۔ نیز استقامت و پائیداری کے ساتھ اَحکامِ الٰہی و قوانین دینِ مقدس اسلام پر کاربند رہیں۔

اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا: حاضرین ان لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں ہیں یہ پیغام پہنچا دیں کہ میرے بعد کوئی نبیؐ و پیغمبر نہیں ہوگا اور تمھارے بعد کوئی اُمت نہ ہوگی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات تاکید سے کہی کہ اے لوگو! میری بات کو اچھی طرح سنو اور اس پر خوب غور و فکر کرو کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اس کے بعد میری تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔ ان الفاظ کے ذریعے آنحضرتؐ لوگوں کو مطلع کر رہے تھے کہ وقتِ رحلت نزدیک آ گیا ہے اور شاید اسی وجہ

سے اس حج کو "حجۃ الوداع" کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔

جانشین کا تعین

مناسک حج مکمل ہو گئے اور رسولِ خدا ﷺ واپس مدینہ کی طرف روانہ ہوئے لیکن جو فرض آنحضرتؐ پر واجب تھا وہ ابھی ادا نہیں ہوا تھا۔ مسلمانوں نے یہ سمجھ کر کہ کام انجام پذیر ہو چکا ہے اسی لیے ان میں سے ہر ایک شخص نے اس سفر سے معنوی فیض کسب کیا اور اب ہر ایک کی یہی تمنا تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے تپتے ہوئے بے آب و ویران ریگزاروں کو پار کر کے واپس وطن پہنچ جائے لیکن رسولِ خدا نے چونکہ اپنی عمرِ عزیز کے تیئیس سال اوّل سے آخر تک رنج و تکالیف میں گزار کر آسمانی آئین یعنی دینِ اسلام کی اشاعت و ترویج کے ذریعے انسانوں کو پستی و گمراہی اور جہالت و نادانی کی دلدل سے نکالنے میں صرف کیے تھے اور آپ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔ آپ یہی چاہتے تھے کہ پراگندہ انسانوں کو ایک پرچم کے نیچے جمع کر لیں۔ انھیں اُمت واحد کی شکل میں لے آئیں مگر اس کے بعد اب دوسرا خیال درپیش تھا کہ اب آنحضرت ﷺ کے سامنے اسلام کا مستقبل اور رہبر کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔ بالخصوص اس صورت میں جبکہ آپؐ کے رُوبرو یہ حقیقت بھی تھی کہ اس پُرافتخار زندگی کے چند روز ہی باقی رہ گئے ہیں۔

رسولِ خدا ﷺ ہر شخص سے زیادہ اپنے معاشرے کی سیاسی اور ثقافتی وضع و کیفیت سے واقف و باخبر تھے۔ آپؐ کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ آسمانی تعلیمات آپؐ کی دانشورانہ قیادت و رہبری اور حضرت علی علیہ السلام جیسے اصحاب کی قربانی کے باعث قبائل کے سردار و شرفا قریش اسلام کے زیرِ پرچم جمع ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک بعض کے دل و دماغ مکمل طور پر تسلیمِ حق نہیں ہوئے ہیں اور وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ جب بھی موقع ملے اندر سے اس دین پر ایسی کاری ضرب لگائیں کہ بیرونی طاقتوں کے لیے اس پر حملہ کرنے کے لیے میدان ہموار ہو جائے۔

کوئی ایسا ہی لائق و شائستہ شخص جو آنحضرت ﷺ کی مقرر کردہ شرائط کو پورا کر سکے۔ اس آیتِ قرآنی کی روشنی میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ دینِ اسلام کو بے حد کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ نیز اُمت اسلامی کی کشتی کو اختلافات کی پُرجوش و خروش اور داخلی کشمکش سے نجات دلا کر ساحل تک پہنچانے میں معاون و مددگار ہو سکتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ اگرچہ جانتے تھے کہ اُمت مسلمہ میں وہ کون شخص ہے جو آپ کی جانشینی اور مستقبل میں اس اُمت کی رہبری کے لیے مناسب وموزوں ہے اور خود آنحضرتؐ نے کتنی ہی مرتبہ مختلف پیرائے میں یہ بات لوگوں کے گوش گزار بھی کر دی تھی لیکن ان حقائق کے باوجود اس وقت کے مختلف حالات اس امر کے متقاضی تھے کہ جانشینی کے لیے خداوند تعالیٰ کی طرف سے جدید حکم واضح وصریح الفاظ میں نازل ہوا۔ آنحضرتؐ یہ بات بھی خوب جانتے تھے کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ آنحضرتؐ کی مدد فرمائے گا تاکہ اس فرض کی ادائیگی میں آپؐ کی طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔

کیونکہ رسالت کی طرح مقامِ خلافت و امامت بھی الٰہی منصب ہے اور حکمت الٰہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اس منصب کے لیے کسی لائق شخص کو ہی منتخب کیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی رسولِ خدا کو خدشہ بھی لاحق تھا کہ اگر یہ عظیم اجتماع پراگندہ ہو گیا اور ہر مسلمان اپنے اپنے وطن چلا گیا تو پھر کبھی ایسا موقع نہ مل سکے گا کہ کسی جانشین کے مقرر کیے جانے کا اعلان ہو سکے اور آپؐ کا پیغام لوگوں تک پہنچ سکے۔

قافلہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گیا تھا اور بتاریخ ۱۸ ذی الحجہ "جحفہ" کے نزدیک "غدیرِ خم" پر پہنچا اور یہ وہ جگہ ہے جہاں مدینہ سے مصر و عراق کی جانب جانے والی راہیں ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہیں۔ اس وقت فرشتہ وحی نازل ہوا اور رسولِ خدا کو جس پیغام کی توقع تھی وہ ان الفاظ میں پہنچا دیا:

يَآيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (سورۂ مائدہ: آیت ۶۷)

"اے رسولؐ! جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچائے گا"۔

گرمی سخت تھی اور کافی طویل قافلہ زنجیر کے حلقوں کے مانند پیوستہ اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ رسولِ خدا کے حکم سے یہ قافلہ رُک گیا اور سب لوگ یک جا جمع ہو گئے اور سب لوگ یہ جاننے کے متمنی تھے کہ کون سا اہم واقعہ رُونما ہوا ہے۔

رسول خدا ﷺ نے پہلے تو نمازِ ظہر کی امامت فرمائی اور اس کے بعد ایک اُونچی جگہ پر

جو اُونٹ کے کجاوں (پالانوں) سے بنائی گئی تھی تشریف فرما ہوئے۔ اس موقعے پر آپؐ نے مختلف مسائل کے بارے میں مفصل خطبہ دیا اور ایک بار پھر لوگوں کو یہ نصیحت فرمائی کہ کتاب اللہ اور اہلِ بیتؑ رسولؐ کی پوری دیانت داری کے ساتھ پیروی کریں کیونکہ یہی دونوں ''متاعِ گرانمایہ'' بیش قیمت مال ہیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے اصل مقصد کی جانب توجہ فرمائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کا دستِ مبارک اپنے دستِ مبارک میں لے کر اس طرح بلند کیا کہ سب لوگوں نے رسولؐ خدا نیز حضرت علی علیہ السلام کو ایک دوسرے کے دوش بدوش دیکھا۔ چنانچہ انھوں نے سمجھ لیا کہ اس اجتماع میں کسی ایسی بات کا اعلان کیا جائے گا جو حضرت علی علیہ السلام کے متعلق ہے۔

رسولؐ خدا نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے مومنو! تم لوگوں میں سے کون سا شخص سب سے زیادہ برتر و بالا ہے؟

مجمع نے جواب دیا: خدا اور رسولؐ خدا ہی بہتر جانتے ہیں۔

اس پر رسولؐ خدا نے فرمایا: میرا مولا خدا ہے اور مَیں مومنین کا مولا ہوں، میں سب سے بہتر ہوں اور سب پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔ جس کا مَیں مولا ہوں، یہ علیؑ اس کے مولا ہیں۔ اے خداوندا! جو علیؑ کے دوست ہوں انھیں تو عزیز رکھ اور جو علیؑ کے دشمن ہوں تو ان کے ساتھ دشمنی کا سلوک کر۔ علیؑ کے دوستوں کو فتح و نصرت عطا فرما اور دشمنانِ علیؑ کو ذلیل و خوار کر۔

رسولؐ خدا کا خطبہ ختم ہو جانے کے بعد مسلمان حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رسولؐ خدا کی طرف سے مرتبہ خلافت و قیادت تفویض کیے جانے پر مبارک باد پیش کی اور آپؑ سے مولائے مسلمین کہہ کر ہم کلام ہوئے۔ خداوند تعالیٰ نے بھی حضرت جبرائیلؑ کو بھیج کر اور مندرجہ ذیل آیت نازل فرما کر لوگوں کو اس نعمتِ عظمیٰ کی بشارت دی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (سورۂ مائدہ: آیت ۳)

''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا ہے''۔

اس روز سے (۱۸ ذی الحجہ) کو مسلمان اور حضرت علی علیہ السلام کے پیروکار ''عیدِ غدیر'' کے نام

سے ہر سال جشن مناتے ہیں اور اس عید کا شمار اسلام کی عظیم عیدوں میں ہوتا ہے۔

رسولؐ خدا کی آخری عسکری کوشش

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع سے واپس آنے کے بعد خداوند تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ دو اہم فرائض (فریضۂ حج اور حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی کے اعلان) کے انجام دینے کے بعد اگرچہ بہت زیادہ اطمینان محسوس کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود آپؐ کی دُور رَس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ابھی اُمت مسلمہ کے سامنے ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے وہ فتنہ وفساد سے دوچار رہے گی۔ چنانچہ یہی فکر آنحضرتؐ کے لیے تشویش کا باعث تھی۔

سنہ ۱۱ ہجری کے اوائل میں جب کچھ لوگوں نے یہ خبر سنی کہ سفر کی وجہ سے رسولؐ خدا کی طبیعت ناساز ہے تو انھوں نے نبوت کا دعویٰ کر کے فتنہ وفساد وغوغا برپا کر دیا۔ چنانچہ مسیلمہ نے یمامہ میں اسود عنسی نے یمن میں اور طلحہ نے بنی اسد کے شہروں میں لوگوں کو فریب دے کر گمراہ کرنا شروع کر دیا۔

مسیلمہ نے تو رسولؐ خدا کو خط بھی لکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ اسے بھی امر نبوت میں شریک کر لیا جائے۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۱۴۶)

دوسری طرف ان لوگوں کو، جو کل تک کافر اور آج منافق تھے اور جن کے دلوں میں پہلے سے ہی اسلام کے خلاف بُغض وکینہ بھرا ہوا تھا، جب یہ معلوم ہوا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے پیشوائے اسلام اور جانشین پیغمبرؐ ہونے کا اعلان کر دیا ہے تو ان کا غم وغصہ کہیں زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ جب انھیں یہ علم ہوا کہ رسولؐ خدا کی طبیعت ناساز ہے اور آنحضرتؐ کی رحلت عنقریب ہی واقع ہونے والی ہے تو ان کا جوش وخروش کئی گنا ہو گیا۔

ان واقعات کے علاوہ، مشرقی روم کی پُرزور وخودسر حکومت اور اس کی نوآبادیات کو مسلمانوں کے ساتھ چند مرتبہ نبرد آزمائی کرنے کے بعد ان کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا اور ان سے کاری ضربیں کھا چکے تھے اسی لیے ان کا وجود مدینہ کی حکومت کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا کیونکہ سیاسی عوامل سے قطع نظر اس خاص مذہبی حساسیت کے باعث بھی جو عیسائی سربراہوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف تھی وہ شمالی سرحدوں پر ہمیشہ بدامنی پھیلائے رکھتے تھے۔

ان حالات میں بقول رسول اکرمؐ فتنہ و فسادات سیاہ رات کی طرح یکے بعد دیگرے اسلامی معاشرے پر چھانے شروع ہو گئے ہیں۔ (ارشاد مفید: ص ۹۷)

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے انھیں خاموش کرنے کے لیے بعض اقدامات بھی کیے اور یہی آپ کی سعی و کوشش کا آخری ثمرہ تھا۔

رسولِ خدا نے یمن "یمامہ" اور قبیلہ بنی اسد کے درمیان فرماندار نمائندگان روانہ کرنے کے علاوہ حکم بھی صادر فرمایا کہ اٹھارہ یا انیس سالہ "اسامہ بن زید" نامی فرماندار کی زیر قیادت طاقتور سپاہ روانہ کی جائے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے حضرت اسامہ کی تحویل میں پرچم دینے کے بعد فرمایا کہ پوری اُمت مسلمہ کے ساتھ جس میں مہاجر و انصار شامل ہوں اپنے والد زید بن حارث کی شہادت گاہ کی جانب جو بلادِ روم میں ہے، روانہ ہوں۔ (مغازی: ج ۳، ص ۱۱۷)

حضرت اسامہ کو فرماندار مقرر کرنے کی وجوہ ان کی مہارت و لیاقت کے علاوہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ:

① رسولِ خدا ﷺ کی جانب حضرت اسامہؓ کو فرماندار مقرر کرنے کی وجہ آنحضرتؐ کی جانب سے ان خرافات کے خلاف عملی جدوجہد تھی جو دَورِ جاہلیت سے بعض صحابہ کے ذہنوں میں بسے تھے کیونکہ ان کی نظر میں کسی مقام و مرتبے کا معیار یہی تھا کہ صاحب جاہ و مرتبہ معمر شخص ہو اور کسی قبیلے کی سرداری سے وابستہ شخص ہی اس کا حق دار ہو سکتا ہے۔

② حضرت زید ابن حارث کی شہادت چونکہ رومیوں کے ہاتھوں تھی اسی لیے ان کے دل میں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کا جوش و ولولہ بہت زیادہ تھا۔ رسولِ خدا کی یہ کوشش تھی کہ ان کے اس جوش و ولولے میں مزید شدت و کثرت ہو۔ چنانچہ اسی وجہ سے جب آنحضرتؐ نے فرمانداری کی ذمہ داری ان کی تحویل میں دی تو اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اپنے باپ کی شہادت گاہ کی جانب روانہ ہو جاؤ۔ (شرح نہج البلاغہ: ج ۳، ص ۱۵۹)

③ اگر اس وقت کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سپاہ کی فرمانداری مہاجر و انصار میں سے کسی معمر شخص کی تحویل میں دے دی جاتی تو اس بات کا امکان تھا کہ وہ شخص اس عہدے سے سوئے استفادہ کرتا اور اسی وجہ سے خود کو پیغمبر اکرم ﷺ کا خلیفہ و جانشین سمجھنے لگتا۔ لیکن حضرت اسامہؓ کی یہ حیثیت نہیں تھی اور نہ ان کے خلیفہ بننے کا

کوئی امکان تھا۔

حضرت اسامہؓ نے رسولِ خدا کے حکم کے مطابق "جرب" نامی مقام پر خیمے نصب کیے اور دیگر مسلمانوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ رسولِ خدا نے مسلمانوں بالخصوص مہاجر و انصار کے سرداروں کو حضرت اسامہؓ کے لشکر میں شامل کرنے کے لیے بہت زیادہ اہتمام سے کام لیا اور جو لوگ اس اقدام کے مخالف تھے انھیں آنحضرتؐ نے مطعون بھی کیا۔

حضرت اسامہؓ کی عسکری طاقت کو تقویت دینے کے علاوہ اس اہتمام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آنحضرت ﷺ چاہتے تھے کہ وقتِ رحلت وہ لوگ مدینہ میں موجود نہ ہوں جو اُمت میں اختلاف پیدا کرنے اور منصبِ خلافت کے حصول کی فکر میں ہیں تاکہ حضرت علی علیہ السلام کی قیادت و پیشوائی کے بارے میں فرمانِ خدا و رسولؐ جاری کیے جانے کے لیے راستہ ہموار ہے۔ (ارشاد مفید: ص ۹۶)

لیکن افسوس بعض مسلمانوں نے کہ جنھیں رسولِ خدا مدینہ سے باہر بھیجنے کے لیے کوشاں تھے یہ بہانہ بنا کر حضرت اسامہؓ بہت کم عمر ہیں مخالفت شروع کر دی اور ان کے خیمہ گاہ کی طرف جانے سے انکار کر دیا۔ نیز یہ دیکھ کر رسولِ خدا کی طبیعت ناساز ہے تو انھوں نے حضرت اسامہؓ کے لشکر کو روم کی طرف جانے سے یہ کہہ کر روکنا چاہا کہ چونکہ اس وقت رسولِ خدا بہت علیل ہیں لہٰذا ان حالات کے تحت ہمارے دلوں میں آپؐ سے جدائی کی تاب و طاقت نہیں ہے۔ (الملل والنحل: ج۱)

رسولِ خدا ﷺ کو منافقین کے اس رویے سے سخت تکلیف پہنچی۔ آپؐ طبیعت کی ناسازی کے باوجود مسجد میں تشریف لے گئے اور مخالفت کرنے والوں سے فرمایا کہ "اسامہؓ کو فرماندار مقرر کیے جانے کے بارے میں مَیں یہ کیا سن رہا ہوں۔ اس سے پہلے جب ان کے باپ کو فرماندار مقرر کیا تھا تو اس وقت بھی تم طعن و تشنیع کر رہے تھے۔ خدا گواہ ہے کہ وہ لشکر کی فرمانداری کے لیے مناسب تھے اور اسامہ بھی اس کے اہل ہیں۔ (طبقات الکبریٰ: ج ۲، ص ۱۹۰)

رسولِ خدا ﷺ اس وقت جب کہ آپؐ صاحبِ فراش تھے تو ان لوگوں سے جو عیادت کے لیے آتے تھے مسلسل یہی فرماتے کہ "أنفذُ وا ابعثْ اُسامَۃ" لیکن آنحضرتؐ کی یہ سعی و کوشش بے سود ثابت ہوئی کیونکہ صحابہ میں جو سردار تھے انھوں نے قدرِ سہل انگاری سے کام لیا کہ

آنحضرتؐ کی رحلت واقع ہوگئی اور سپاہ واپس مدینہ آ گئی۔

رسولِؐ خدا کی رحلت

رسولِ خدا ﷺ کے مزاج کی ناسازی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ علالت کے دوران آنحضرتؐ بقیع کی جانب تشریف لے گئے اور جو لوگ وہاں اَبدی نیند سو رہے تھے ان کی طلبِ مغفرت کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی جانب رُخ کیا اور فرمایا کہ جبرائیلؑ سال میں ایک مرتبہ مجھے قرآن پیش کرتے تھے لیکن اس مرتبہ انھوں نے دو مرتبہ قرآن پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوسکتی کہ میری رحلت قریب ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: اے علیؑ! مجھے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ دنیا کے خزانوں، اس کی جاویدانی زندگی اور بہشت کے درمیان سے کسی کا انتخاب کرلوں۔ میں نے ان میں سے بہشت اور دیدارِ پروردگار کو چُن لیا ہے۔

رسولِؐ خدا بسترِ علالت پر فروکش اور انتہائی اِشتیاق کے ساتھ فرمانِ حق کا انتظار فرما رہے تھے لیکن یہ اشتیاق آنحضرتؐ کو اُمت کی ہدایت کے خیال اور اس کے درمیان اختلاف کی وجہ سے فتنہ پیدا کرنے کے اندیشے سے نہ روک سکا۔ صحابہ میں سے بعض برگزیدہ حضرات آپؐ کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے۔ ان سے رسولِؐ خدا نے یہی ارشاد فرمایا کہ "قلم دوات لے آؤ تاکہ میں تمھارے لیے ایسی چیز لکھ دوں جس سے تم کبھی گمراہ نہ ہوگے"۔

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسولِؐ خدا پر مرض کا غلبہ ہے۔ قرآن تو ہمارے پاس ہے ہی، ہمارے لیے یہی کتاب اللہ کافی ہے۔

حاضرین میں سے بعض نے حضرت عمر کے نظریے سے اختلاف کیا اور بعض ان کے جانبدار ہوگئے۔ رسولِؐ خدا کے لیے ان کی یہ جسارت و بے باکی سخت پریشان خاطری کا باعث ہوئی اور فرمایا کہ "میری نظروں سے دُور ہو جاؤ"۔

بعض صحابہ کی علانیہ مخالفت نے اگرچہ رسولِ خدا ﷺ کو وصیت لکھنے سے باز رکھا لیکن آنحضرتؐ نے اپنا مدعا دوسرے طریقے سے بیان کر دیا۔ اگرچہ مرض کا غلبہ تھا مگر درد و تکلیف کے باوجود آنحضرتؐ مسجد کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں منبر پر تشریف فرما ہو کر آخری مرتبہ لوگوں

سے خطاب فرمایا۔ یہ آنحضرتؐ کا آخری خطبہ تھا۔

"اے لوگو! میں تمھارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔

ان میں سے ایک کلام اللہ ہے اور دوسرے میرے اہل بیتؑ"۔

بالآخر اس سفیر حق کی روح مقدس تریسٹھ سالہ جدوجہد زندگی بسر کرنے کے بعد بروز ہفتہ ۲۸ صفر سنہ ۱۱ ہجری کو اس وقت جب کہ آنحضرتؐ کا سر مبارک حضرت علی علیہ السلام کی آغوش میں تھا، عالمِ ملکوت کی جانب پرواز کر گئی۔ (ارشاد مفید: ص ۱۰۰ و ۱۰۱)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے آپؐ کے جسد مبارک کو غسل دیا اور کفن پہنایا۔ اس کے بعد آپؐ کے چہرۂ مبارک کو کھول دیا۔ اگرچہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے مگر اسی حالت میں آپ نے فرمایا:

یارسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں۔ آپؐ کی رحلت کے باعث نبوت، وحی الٰہی اور آسمانی پیغامات کی آمد کا رشتہ منقطع ہوا...... اگرچہ آپؐ نے ہمیشہ صبر کی تلقین کی اور عجلت و بے تابی سے منع فرمایا مگر آج صبر و تحمل کا یارا نہیں۔ بے اختیار ایسے آنسو بہے چلے جا رہے ہیں کہ ان کا سرچشمہ خشک ہو گیا۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۳۳۵)

اس کے بعد آپؑ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حضرت علی علیہ السلام کے بعد صحابہ نے یکے بعد دیگرے کئی جماعتیں بنا کر نماز ادا کی۔ اس کے بعد اسی حجرے میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت ہوئی تھی اس جسدِ پاک کو سپردِ خاک کر دیا۔ (ارشاد مفید: ص ۱۰۱)

خداوند و ملائکہ اور کُل مومنین کی طرف سے آپؐ پر اور خاندانِ رسالتؐ پر ہزار ہزار سلام!

غزوہ بنی قینقاع

بدر کی زبردست لڑائی نے اس علاقہ کے جنگی توازن کو مسلمانوں کے نفع میں بدل دیا۔ اس جنگ کے بعد منافقین اور یہودی مسلمانوں کی اس فتح مبین پر رشک کرنے لگے اس لیے کہ وہ مسلمانوں کی ترقی سے سخت خائف تھے۔ انھوں نے جو معاہدے رسولؐ خدا سے کر رکھے تھے اس کے برخلاف مسلمانوں اور اسلام کو بدگوئی اور دُشنام طرازی کا نشانہ بنایا اور مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے قریش کو مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے بھڑکانے لگے۔ ان کے شعرا نے اپنے ہجویہ قصیدے میں مسلمان عورتوں کے وصف کو کفار کے لیے بیان کر کے مسلمانوں کے ناموس کی زبردست اہانت کی۔

رسولؐ خدا نے "مفسدین فی الارض" (زمین پر فساد پھیلانے والوں) کے لیے قتل کا حکم صادر فرمایا اور وہ لوگ قتل کر دیے گئے۔ (طبقات ابن سعد، ج ۲، ص ۲۷ و ۲۸)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بخوبی جانتے تھے کہ یہودی آیندہ انتقامی جنگ میں مدینہ سے باہر کے دشمنوں کے لیے راستہ ہموار کریں گے اور اسلام پر پس پشت خنجر کا وار کریں گے۔ اس لیے آپؐ اس مشکل سے بچنے کے لیے راستہ ڈھونڈتے رہے اور سیاسی و دفاعی طاقت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کی کوشش فرماتے رہے۔

مدینہ کے یہودیوں میں بنی قینقاع کے یہودیوں نے سب سے بڑھ چڑھ کر پیغمبر اکرمؐ کے خلاف پروپیگنڈے کی سرد جنگ چھیڑ رکھی تھی اور انھوں نے توہین آمیز اور ضرر رساں نعرے بلند کر کے عملی طور پر اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا تھا۔

رسولؐ خدا نے ان پر حجت تمام کرنے کی غرض سے بازار بنی قینقاع کے بڑے مجمع میں اپنی تقریر میں ان کو نصیحت کی اور اس عمومی معاہدے پر کاربند رہنے کی تاکید فرمائی جو طرفین کے درمیان ہوا تھا اور فرمایا کہ قریش کی سرگزشت سے عبرت حاصل کرو اس لیے کہ مجھ کو یہ خوف ہے

کہ جس سیلاب نے قریش کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس سے تم بھی محفوظ نہیں رہ سکو گے۔ لیکن پیغمبرؐ خدا کی نصیحتیں یہودیوں کے لیے بے اثر تھیں۔ انھوں نے گستاخانہ انداز میں کہا کہ اے محمدؐ! آپؐ نے ہمیں قریش سمجھ رکھا ہے؟ ناتجربہ کاروں سے جنگ میں کامیابی کے بعد آپؐ مغرور ہو گئے ہیں (معاذ اللہ)۔ خدا کی قسم! اگر ہم جنگ کے لیے اُٹھے تو آپؐ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم مرد میدان ہیں یا کوئی اور؟

رسولؐ خدا ان تمام گستاخیوں اور جسارتوں کے باوجود اپنے غصہ کو پی گئے اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ مسلمانوں نے بھی بردباری سے کام لیا تاکہ وہ دیکھیں کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے؟

ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ فتنہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ ایک مسلمان عورت بنی قینقاع کے بازار میں گئی۔ کچھ زیورات خریدنے کی غرض سے ایک سنار کی دکان کے سامنے بیٹھ گئی۔ یہودیوں نے چاہا کہ اس کا چہرہ کھول دیں لیکن عورت نے انکار کیا۔ ایک یہودی نے اس عورت کی لاعلمی میں اس کے کپڑے کے کنارے کو آہستہ سے اس کی پشت پر باندھ دیا۔ جب وہ عورت کھڑی ہوئی تو اس کا جسم عریاں ہو گیا۔ تمام یہودی ہنسنے لگے۔ عورت نے فریاد شروع کی اور مسلمانوں کو مدد کے لیے پکارا۔ ایک مسلمان نے اس یہودی کو جس نے یہ حرکت کی تھی قتل کر ڈالا۔ یہودیوں نے بھی حملہ کر کے اس مسلمان کو قتل کر ڈالا۔

مسلمان خون کا انتقام لینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بات بڑھ گئی۔ بنی قینقاع کے یہودیوں نے دکانیں بند کر دیں اور اپنے قلعوں میں چھپ گئے۔ رسولؐ خدا نے "ابولبابہ" کو اپنی جگہ معین فرمایا اور انھوں نے لشکرِ اسلام کے ہمراہ ۱۵ شوال بروز شنبہ سنہ ۲ ہجری (بدر کے ۲۸ دن بعد) بنی قینقاع کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ پندرہ روز تک جاری رہا یہاں تک کہ یہودیوں نے تنگ آکر اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ رسولؐ خدا نے منافقین کے لیڈر عبداللہ بن ابی کے بڑے اصرار اور سماجت کی وجہ سے ان کے قتل سے درگزر کیا اور ان کو شام کے مقام "اذراعات" میں شہر بدر کر دیا۔ ان کے اموال کو مسلمانوں کے لیے مالِ غنیمت قرار دیا اور خمس نکالنے کے بعد مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ (حوالہ سابق: ج ۲، ص ۴۷)

حضرت فاطمہ زہرا کا حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ عقد

اسلام کی واحد عظیم خاتون حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا عقد ہجرت کے دوسرے سال بدر کی لڑائی کے دو ماہ بعد حضرت علی علیہ السلام سے ہوا۔ شادی کے مراسم نہایت سادہ مگر معنوی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوئے۔ حضرت فاطمہ علیہا السلام کا مہر ۵۰۰ درہم تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زرہ چار سو درہم میں فروخت کی اور مہر کے ایک حصّہ کے عنوان سے رسولِ خدا کی خدمت میں درہم پیش کیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں سے کچھ پیسے اپنے اصحاب کو دیے تاکہ وہ بازار سے حضرت زہرا کے جہیز کا سامان خرید لائیں۔ انھوں نے بازار سے مندرجہ ذیل چیزیں جہیز کے لیے خریدیں:

۱ سات درہم کا ایک پیراہن ۲ ایک اوڑھنی "روسری" ۳ ایک کالی چادر "قطیفہ"
۴ ایک عربی چارپائی جو لکڑی اور لیف خرمہ (کھجور کے پتّے) کی بنی ہوئی تھی۔
۵ دو توشک جس کا اُوپری حصّہ کتان مصری کا بنا ہوا تھا اور اس میں سے ہر ایک توشک میں لیف خرما اور اُون بھرا ہوا تھا۔
۶ چار تکیے جس میں دو پشمی اور دوسرے دو تکیے خرمے کی چھال سے بھرے گئے تھے۔
۷ پردہ ۸ چٹائی ۹ چکّی (ہاتھ سے چلانے والی) ۱۰ ایک بڑا طشت ۱۱ کھال کی ایک مشک ۱۲ ایک لکڑی کا پیالہ (دودھ کے لیے) ۱۳ ایک مشک ۱۴ لوٹا ۱۵ چند بڑے برتن ۱۶ چند مٹی کے کوزے ۱۷ چاندی کا دست بند۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب جب بازار سے لوٹے تو انھوں نے سامان حضورؐ کے سامنے رکھا۔ آپؐ نے جب اپنی بیٹی کا جہیز دیکھا تو فرمایا: "خدایا ان لوگوں کی زندگی کو مبارک قرار دے جن کے زیادہ تر ظروف مٹی کے ہیں"۔ (کشف الغمہ: ج ۱، ص ۳۵۹)

اس بابرکت شادی کا پہلا ثمرہ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام ہیں۔ آپ ۱۵ رمضان المبارک تیسری ہجری کو جنگ اُحد سے پہلے متولد ہوئے۔ (کشف الغمہ: ج ۱، ص ۴۷۴)

غزوہ سویق

پانچ ذی الحجہ سنہ ۳ ہجری ق، مطابق ۱۵ خرداد سنہ ۳ ہجری ش، بدر کی لڑائی کی ذلت آمیز

شکست کے بعد ابوسفیان نے یہ نذر کی کہ جب تک میں محمدؐ سے جنگ نہیں کر لیتا اور بدر کا انتقام نہیں لے لیتا اس وقت تک عورتوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ لہٰذا اس نے قبیلۂ قریش کے دوسو سواروں کو جمع کر کے مدینہ کی جانب کوچ کیا۔

چونکہ دوسو سواروں کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں تھی اس لیے شہر سے دُور اس نے لشکر روکا اور تاریکی شب سے فائدہ اُٹھا کر "سلام بن مشکم" کے پاس پہنچا جو کہ بنی نضیر کا ایک بڑا آدمی تھا۔ اس نے ابوسفیان کو مسلمانوں کے دفاعی مقامات کی کمزوری سے آگاہ کیا۔

ابوسفیان اپنے لشکرگاہ کی طرف پلٹ آیا اور وہ اپنے کچھ سپاہیوں کے ساتھ حملہ کرتے ہوئے مدینہ کی طرف بڑھا اور "عریض" نامی جگہ کو لوٹ لیا۔ دو گھروں، چار درختوں اور کھیتوں میں آگ لگا دی اور نخلستان میں کام کرنے والے مسلمانوں کو قتل کر دیا۔

جب دشمنوں کے تجاوز کی خبر پیغمبرؐ خدا کو پہنچی تو آپؐ نے بغیر تاخیر کے "ابولبابہ" کو اپنی جانشینی میں مدینہ میں چھوڑا اور مہاجرین و انصار میں سے دوسو آدمیوں کا لشکر لے کر دشمن کے تعاقب میں نکل پڑے۔ رسولِ خدا نے "قرقرۃ الکدر" تک دشمن کا پیچھا کیا لیکن دشمن فرار ہو چکا تھا اور بھاگتے ہوئے "سویق" کے تھیلے کو گراں باری سے بچنے کے لیے راستہ ہی میں پھینک گیا تھا۔ اس وجہ سے یہ غزوہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہوا۔ (مغازی: ج ۱، ص ۱۸۱)

غزوۂ بنی سلیم

۱۵ محرم سنہ تین ہجری مطابق ۲۴ تیر ماہ سنہ ۳ ہجری شمسی، رسولِ خدا کی خدمت میں یہ خبر پہنچی کہ غطفان و بنی سلیم مکہ اور شام کے درمیان بخاری کے راستہ میں "اطرافِ قرقرۃ الکدر" میں مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

رسولِ خدا دوسو افراد کے ساتھ ان کی طرف بڑھے۔ دشمن نے جب لشکرِ اسلام کو اپنے نزدیک ہوتے ہوئے محسوس کیا تو تاریکی شب سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا۔ لشکرِ اسلام نے دشمنوں کے پانچ سو اُونٹ غنیمت میں حاصل کیے اور مدینہ کی طرف لوٹ گیا۔

قردہ میں سریہ زید بن حارثہ

یکم جمادی الثانی سنہ ۳ ہجری ق، مطابق یکم آذر سنہ ۳ ہجری ش، جنگِ بدر اور یثرب میں

تحریکِ اسلامی کے نفاذ کے پھیلاؤ کے بعد، قریش کا مغربی تجارتی راستہ جو مکہ سے شام کی جانب جاتا تھا غیر محفوظ ہو گیا۔ قریش نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے اور اپنے قافلہ کے تحفظ کے لیے وہ اس راستے کو چھوڑ دیں گے اور طولانی، مشرقی راستہ طے کریں گے۔ یہ راستہ نجد کی آبادیوں سے ہو کر عراق سے شام جاتا تھا۔ انھوں نے اس راستے سے گزرنے کے لیے ایک ''رہنما کا انتظام کیا۔

پہلا قافلہ جو اس راستے سے شام گیا وہ صفوان بن اُمیہ اور دوسرے رہبرانِ قریش کی رہبری میں گیا تھا۔ رسولِ خدا اس قافلہ کی روانگی سے آگاہ ہو گئے اور انھوں نے بلا تاخیر سو سواروں پر مشتمل ایک مضبوط لشکر تشکیل دیا اور زیدؓ بن حارثہ کو اس کا کمانڈر مقرر فرمایا تا کہ اس نئے راستے پر پہلے سے پہنچ کر قریش کے قافلہ کا راستہ بند کر دیں۔ جناب زید نجد کی طرف گئے، اُونٹوں کے نشانِ قدم کے ذریعے قافلے کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ مقام قردۃ تک پہنچے اور کارواں کو جا لیا۔

قافلہ کے نگراں اور سربراہ افراد بھاگ کھڑے ہوئے اور پورا قافلہ بلا مقابلہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا اور قافلہ کے دو نگہبان اسیر ہوئے۔ خمس نکالنے کے بعد بقیہ مال جو کہ اسی ہزار درہم تھے اس جنگی گروہ کے سپاہیوں کے درمیان تقسیم ہوا۔ (مغازی: ج ۱، ص ۱۹۷)

غزوہ غطفان

نجد میں ذی امر کے مقام پر ریاض سے گیارہ کلومیٹر شمال مغرب میں ۱۲ ربیع الاوّل سنہ ۳ ہجری ق، مطابق ۱۴ شہریور سنہ ۳ ہجری ش، کو یہ غزوہ ہوا۔

رسولِ خدا کو خبر ملی کہ ''بنی ثعلبہ'' اور ''بنی محارب'' کی ایک بڑی جمعیت نے مقام ذی امر میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور ''دعثور'' نامی شخص کی قیادت میں مدینہ پر حملہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ رسولِ خدا چار سو پچاس جنگجو افراد کو جمع کر کے دشمن کی طرف بڑھے۔ دشمن یہ اطلاع ملتے ہی پہاڑیوں میں بھاگ گئے اور کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔

جنگ اُحد کے مقدمات

شنبہ ۷ شوال سنہ ۳ ہجری ق، مطابق ۶ فروردین سنہ ۴ ہجری ش، میں جنگ شروع ہونے کے اسباب۔

یہاں مرکز اسلام "مدینہ" پر لشکر قریش کے جنگی حملے کے اسباب کی طرف مختصر طور پر اشارہ کیا جارہا ہے:

① جنگ بدر میں مسلمانوں کی شاندار فتح قریش اور یہود و منافقین کے لیے باعث ننگ اور ناگوار خاطر تھی۔ قریش نے نہ صرف یہ کہ اپنے ان سربرآوردہ افراد کو، بلکہ اپنی سرداری ہیبت اور اس نفوذ کو، جو عرب کے درمیان تھا اپنے ہاتھوں گنوا دیا تھا۔ جاہل عرب کے لیے جو اپنی سرداری کو اپنا "جھوٹا" قومی افتخار سمجھتے تھے بڑے رنج کا باعث تھا۔

② قریش اور ان کے کشتوں کے وارثوں کے دلوں میں کینہ اور انتقام کی آگ شعلہ ور تھی اور قریش کے سرداروں نے کشتگان بدر پر رونے کو حرام قرار دیا تھا تاکہ مناسب موقع سے ان کے جذبات کے آتش فشانوں کے پھٹنے سے منظم طریقے سے اسلام کے خلاف مسلمانوں سے انتقام لیا جاسکے۔

③ یہودیوں کے لیے اسلام کا پھیلنا خوش آیند نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے مشرکین قریش کو بھڑکانے میں بڑا زبردست رول ادا کیا۔ بطور نمونہ ملاحظہ ہو: کعب بن اشرف بدر کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف دوڑا اور وہاں اس نے قریش کے مقتولین کے لیے شعر پڑھا اور جگر مچھ کے آنسو بہا کر ان کے مقتولوں کا داغ تازہ کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے اس نے پاک باز مسلمان عورتوں کی خوبصورتی کا نقشہ شعر کے قالب میں ڈھال کر ان کے سامنے پیش کیا تاکہ مشرکین کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے اور ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو اسیر بنانے پر آمادہ کرے۔

④ اقتصادی محاصرہ کی لائن کا توڑنا۔ قریش کا اقتصادی نظام تجارت کے پایہ پر استوار تھا۔ تجارتی راستوں کے غیر محفوظ ہونے اور مسلمانوں کے حملہ کے ڈر سے ان کی تجارت خطرے میں پڑ گئی تھی اور ان کے لیے اقتصادی نظام کو برقرار رکھنا مشکل ہوگیا تھا اس لیے اس محاصرہ کو توڑنا اور خود کو اس تنگی سے باہر نکالنا بہت ضروری تھا۔

⑤ آئندہ کے لیے پیش بندی۔ قریش اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اگر مسلمانوں کو قدرت حاصل ہوگئی تو وہ ان کو نہ چھوڑیں گے اور قریش کی اذیتوں اور عداوتوں کا چند برسوں میں ضروری جواب دیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ان کو معلوم تھی کہ بت

پرستوں کے ہاتھوں سے مسجد الحرام کو آزاد کرانے کے لیے وہ کسی بھی کوشش سے دریغ نہ کریں گے۔

یہ ساری باتیں سبب بنیں کہ قریش حملہ میں پیش قدمی کریں تا کہ اپنے خیال سے وہ اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کا کام تمام کر دیں۔

پہلا قدم، جنگی بجٹ کی فراہمی

اس وسیع جنگی منصوبہ میں پہلا عملی قدم حملوں کی تیاری کے لیے زیادہ سے زیادہ بجٹ فراہم کرنا تھا۔ قریش، دارالندوہ قریش کے مشورہ کرنے کی جگہ میں جمع ہوئے اور بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ پچاس ہزار طلائی دینار اس حملے کے لیے جمع کیے جائیں۔ یہ بجٹ اس تجارتی کارواں کے منافع سے مہیا کیا جائے جس کو بدر سے پہلے ابوسفیان مکہ میں صحیح و سالم لے آیا تھا۔ (مغازی)

قرآن مجید اس سلسلے میں کہتا ہے کہ بے شک کافر اپنے اموال کو خرچ کرتے ہیں تا کہ لوگوں کو خدا کے راستے سے باز رکھیں۔ وہ لوگ ان اموال کو خرچ کر رہے ہیں لیکن یہ ان کی حسرت کا باعث ہوگا۔ ''اس کے بعد ان کو شکست ہوگی اور اس دنیا میں کافر جہنم میں جائیں گے''۔ (انفال: آیت ۳۶)

قوتوں کی جمع آوری

کفارِ قریش جنھوں نے نزدیک سے اسلامی سپاہیوں کی شجاعت اور جذبہ شہادت کو دیکھا تھا۔ انھوں نے یہ تہیہ کیا کہ پوری توانائی کے ساتھ جنگ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور قریش کے علاوہ مکہ کے اطراف و جوانب کے دوسرے قبائل عرب کے بہادروں کو بھی اس جنگ میں شریک کریں۔ چار آدمیوں کو انھوں نے بادیہ نشین عرب قبائل کے درمیان بھیجا تا کہ وہ ان کے ساتھ مل کر لڑنے اور مدد کرنے کی دعوت دیں۔ یہ چار آدمی عمرو بن عاص، ہبیرہ بن ابووہب، ابن الزبعری اور ابوعزہ تھے۔

ابوعزہ شروع میں اس ذمہ داری کو قبول نہیں کر رہا تھا، وہ کہتا تھا کہ جنگِ بدر کے بعد محمدؐ نے تنہا مجھ پر احسان کیا اور مجھ کو بغیر تاوان کے آزاد کر دیا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ

آپ مقابل میں آنے والے کسی بھی دشمن کی میں مدد نہیں کروں گا۔ میں اپنے پیمان کا وفادار ہوں۔ لیکن لوگوں نے اس کو قانع کر دیا اور وہ بادیہ نشین قبائل کے درمیان چلا گیا۔ وہاں اس نے شعر پڑھ پڑھ کر لوگوں کو رسولؐ خدا کے ساتھ لڑنے کے لیے آمادہ اور جمع کیا۔ دوسرے تین آدمیوں نے بھی قبائل کو لڑائی پر ابھار کر انھیں جمع کیا۔ انجام کار قبائل ''کنانہ'' اور ''تہامہ'' کے لوگ رسولؐ خدا سے قریش کے ساتھ مل کر جنگ کرنے پر تیار ہو گئے۔ (مغازی: ج ا، ص ۲۰۱)

سیاسی پناہ گزین

رسولؐ خدا کی مدینہ ہجرت کے بعد ابو عامر فاسق جو اپنے قبیلہ اوس کے پچاس افراد کے ساتھ مشرکین کے سربرآوردہ افراد کی پناہ میں تھا وہ ان افراد کو رسولؐ خدا سے جنگ کرنے پر ابھارتا رہا۔ وہ اپنے قبیلہ کے افراد کے ساتھ مشرکین کی تیاریوں میں شریک تھا۔ اس نے کہا کہ یہ پچاس افراد میرے قبیلہ کے ہیں اور جس وقت ہم سرزمین مدینہ پر پہنچیں گے اس وقت قبیلۂ اوس کے تمام افراد ہماری طرف داری کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

مدینہ کا قصد

قریش نے مکمل تیاری کے بعد اپنے سپاہیوں کو روانہ کیا۔ یہ لشکر تین ہزار افراد پر مشتمل تھا جس میں سات سو زرہ پوش، دو سو گھڑ سوار اور تین ہزار شتر سوار بے پناہ اسلحہ، اس جنگی قافلہ میں پندرہ عورتیں شریک تھیں تاکہ گا بجا کر ان کے جذبات کو برانگیختہ کریں۔

مشرکین کے لشکر کا سپہ سالار ابوسفیان تھا اور خالد بن ولید نے سواروں کی افسری کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی۔ عکرمہ بن ابی جہل خالد کے معاون کی حیثیت سے اس بار لشکرِ مشرکین ہر طرح کے ایسے اختلافات سے اجتناب کر رہا تھا جو ان کو دو گروہوں میں بانٹ دیتا ہے۔

عباس کی رپورٹ

جس وقت سپاہیوں نے کوچ کا ارادہ کیا اس وقت عباس بن عبدالمطلب رسولؐ خدا کے چچا جنھوں نے اپنا اسلام چھپا رکھا تھا اور بہت قریب سے ان کے کوچ کے نگران اور ان کی تیاریوں کے شاہد تھے۔ ایک خط رسولؐ کو لکھا اور مشرکین کے سپاہیوں کی جنگی حالت کی اطلاع دی۔

عباس نے قبیلۂ بنی غفار کے ایک معتمد شخص کے ذریعے وہ خط بھیجا۔ اس فرستادہ نے اتنی تیزی سے راستہ طے کیا کہ مکہ اور مدینہ کے درمیانی فاصلہ کو صرف تین دن میں طے کرلیا۔ جب یہ سوار مدینہ پہنچا تو اس وقت پیغمبرؐ اسلام مقامِ قبا میں تھے۔ وہ حضرتؐ کے پاس پہنچا اور اس نے خط دیا۔ رسولؐ خدا نے وہ خط ایک شخص کو دیا تاکہ وہ اسے حضرتؐ کو سنائے۔ پھر آپؐ نے اس سے فرمایا کہ اس کا مضمون کسی کو بتایا نہ جائے۔

مدینہ کے یہودی اور منافقین اس نامہ بر کے آنے سے آگاہ ہو گئے اور یہ مشہور کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بری خبر پہنچی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں لوگ قریش کی لشکرکشی سے باخبر ہو گئے۔

سپاہِ قریش راستہ میں

سپاہِ قریش کے ساتھ جو عورتیں تھیں وہ جس منزل پر قیام کرتیں گانا بجانا شروع کر دیتیں، مقتولین قریش کی یاد دلا کر سپاہیوں کو بھڑکاتی رہتی تھیں۔ قریش کے سپاہی جہاں کہیں بھی پانی کے کنارے رُکتے اُونٹوں کو کاٹ کر ان کا گوشت کھاتے۔ (مغازی، ج ۱، ص ۲۰۵-۲۰۶)

عمرو بن سالم خزاعی نے مکہ اور مدینہ کے راستے کے درمیان مقام "ذی طویٰ" میں قریش کو خیمہ زن دیکھا، وہ مدینہ آئے اور انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی خبر پیغمبرؐ خدا کو دی۔ (مغازی، ج ۱، ص ۲۰۵)

اطلاعات کی فراہمی

شب پنج شنبہ پانچ شوال سنہ ۳ ہجری ق کو دو گشتی سراغ رساں "انس اور مونس" فضالہ کے بیٹوں کو دشمنوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کے لیے بھیجا۔ ان دونوں نے قریش کو مقامِ عقیق میں دیکھا اور ان کے پیچھے ہو لیے یہاں تک کہ انھوں نے مقامِ "وطاۃ" میں لشکر کا پڑاؤ ڈالا۔ یہ لوگ وہاں سے پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں رپورٹ پیش کرنے کے لیے واپس آ گئے۔ (مغازی: ج ۱، ص ۲۰۶)

دشمن کے لشکر کے ٹھہرنے کی جگہ

سپاہ مشرکین نے مقام وطاء میں اُحد کے نزدیک پڑاؤ ڈالا۔ دشمنوں کے صرف ٹھہر جانے کی بنا پر رسولِ اسلام نے حباب بن منذر کو پوشیدہ طور پر اس بات پر مامور فرمایا کہ وہ دشمن کی قوت کا اندازہ کریں اور ضروری اطلاعات جمع کر کے اس کی رپورٹ دیں۔ رسولِ خدا نے اس بات کی تاکید کی کہ اپنی رپورٹ دوسروں کے سامنے بیان نہ کرنا مگر یہ کہ دشمن کی تعداد کم ہو تو اس وقت کوئی حرج نہیں ہے۔

حباب دشمن کے سپاہیوں کے قریب پہنچے اور نہایت دقیق نظر سے ان کا جائزہ لیا۔ پھر واپس آئے اور پیغمبرؐ خدا سے تنہائی میں ملاقات کی اور کہا کہ حضورؐ! میں نے ایک بڑا لشکر دیکھا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ کم و بیش تین ہزار افراد ہیں، دو سو گھوڑے ہیں اور زرہ پوش سپاہیوں کے بارے میں میرا تخمینہ ہے کہ سات سو کے قریب ہوں گے۔ رسولِ خدا نے پوچھا کہ تم نے عورتوں کو بھی دیکھا؟ انھوں نے کہا کہ ہم نے ایسی عورتیں دیکھی ہیں جن کے پاس گانے بجانے کے سامان بھی ہیں۔

پیغمبرؐ خدا نے فرمایا کہ یہ عورتیں مردوں کو لڑائی پر اُکسانا اور مقتولینِ بدر کو انھیں یاد دلانا چاہتی ہیں۔ اس سلسلے میں تم کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔ خدا ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔ وہ بہترین حفاظت کرنے والا ہے۔ خدایا! ہماری روانگی اور ہمارا حملہ تیری مدد سے ہوگا۔ (مغازی: ج ۱، ص ۲۰۷ و ۲۰۸)

مدینہ میں تیاریاں

شب جمعہ ۶ شوال سنہ ۳ ہجری اوس و خزرج کے سربرآوردہ افراد سعد بن معاذ، اسید بن حضیر اور سعد بن عبادہ چند افراد کے ساتھ مسلح ہو کر مسجد میں اور پیغمبرؐ خدا کے گھر کے دروازے پر نگہبانی کے لیے کھڑے ہو گئے۔

مشرکین کے شب خون مارنے کے خوف سے صبح تک شہر مدینہ کی نگرانی کی جاتی رہی۔

فوجی کمیٹی کی تشکیل

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس فکر میں تھے کہ اگر مسلمان مدینہ میں رہ جائیں اور شہر میں رہ کر

دفاع کریں تو مسلمانوں کی قدر و قیمت گر جائے گی اور دشمن گستاخ ہو جائیں گے اور کیا تعجب ہے کہ جب دشمن شہر کے نزدیک ہوں تو ایسی صورت میں ایک داخلی سازش کے ذریعے منافقین اور یہود دشمن کی فتح یابی کے لیے زمین ہموار کر دیں۔ دوسری طرف شہر میں رہنے کا فائدہ یہ ہے کہ قریش اس بات پر مجبور ہوں گے کہ شہر پر حملہ کر دیں اور اس صورت میں جنگی ٹیکنیک کو بروئے کار لانے سے دشمن پر میدان تنگ ہو جائے گا اور وہ شکست کھا جائیں گے اور شہر میں رہنا سپاہیوں میں دفاع کے لیے زیادہ سے زیادہ جوش پیدا کرے گا۔

قریش بھی اسی فکر میں تھے کہ اگر مسلمان مدینہ میں رہ گئے تو درختوں کو کاٹ کر نخلستان میں آگ لگا کر ان کو ناقابلِ تلافی اقتصادی نقصان پہنچ جائے گا۔

رسولِ خدا نے دفاعی حکمت عملی کے تعیین کے لیے اپنے اصحاب سے مشورہ کے لیے ایک میٹنگ طلب کی۔ اس میں حضورؐ نے اعلان کیا کہ اگر آپ لوگ مصلحت سمجھیں تو ہم مدینہ میں رہیں اور دشمنوں کو اسی جگہ چھوڑ دیا جائے جہاں وہ اُترے ہیں تاکہ اگر وہ وہیں رہیں تو زحمت میں جتلا رہیں اور اگر مدینہ پر حملہ کریں تو ہم ان کے ساتھ جنگ کریں۔

عبداللہ بن ابی نے اُٹھ کر کہا: یارسول اللہ! ابھی تک دشمن اس شہر پر فتح یاب نہیں ہوئے ہیں اور کوئی دشمن اس پر کامیابی نہیں حاصل کر سکا ہے۔ ماضی میں ہم نے دشمن کے ساتھ جب بھی میدان میں لڑائی کی ہے شکست سے دوچار ہوئے ہیں اور جب بھی دشمن نے یہ چاہا ہے کہ وہ ہمارے شہر میں آئے تو ہم نے ان کو شکست دی ہے۔ لہٰذا آپ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ اس لیے کہ اگر وہ وہیں رہے تو بدترین قید میں ہیں اور اگر انھوں نے ہم پر حملہ کر دیا تو ہمارے بہادر ان سے لڑیں گے اور ہماری عورتیں اور بچے کوٹھوں سے ان پر پتھراؤ کریں گے اور اگر وہ پلٹیں گے تو شکست خوردہ، نااُمید اور بغیر کسی فائدے کے واپس جائیں گے۔ مہاجر و انصار کے بزرگ افراد حسنِ نیت کے ساتھ اسی خیال سے متفق تھے لیکن نوجوان جن کی تعداد زیادہ تھی شہادت کے مشتاق تھے۔ خاص کر وہ لوگ جو بدر کی لڑائی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ وہ دشمن سے رُوبرو لڑنے کے لیے بے قرار تھے اور رسولِ خدا سے یہ خواہش ظاہر کر رہے تھے کہ ہمیں دشمن سے مقابلہ کے لیے میدانِ کارزار میں لے چلیں۔

اس اکثریت میں لشکرِ اسلام کے دلیر سردار حضرت حمزہؓ تھے۔ انھوں نے فرمایا: اس خدا کی

قسم! جس نے قرآن کو نازل فرمایا۔ ہم اس وقت تک کھانا نہیں کھائیں گے جب تک شہر سے باہر دشمنوں سے نبرد آزمائی نہ کرلیں۔

جوان سال افراد کچھ اس طرح کا استدلال پیش کر رہے تھے کہ اے خدا کے پیغمبرؐ! ہم اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ کہیں دشمن یہ نہ خیال کر بیٹھیں کہ ہم ان کے سامنے آنے سے ڈر گئے اور ہم شہر سے باہر نکلنا نہیں چاہتے۔ ہم کو یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ قریش اپنے وابستگان کی طرف واپس جائیں اور کہیں کہ ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یثرب میں مقید کر دیا اور اس طرح اعراب کو ہمارے سلسلے میں دلیر بنا دیں۔ (مغازی: ج۱، ص ۲۱۹)

فیصلہ کن ارادہ

جوانوں کے اصرار کی بنا پر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اکثریت کی رائے کو قبول فرمایا۔ پیغمبرؐ خدا نے مسلمانوں کو نماز جمعہ پڑھائی اور اپنے خطبہ میں ان کو جہاد کی دعوت دی اور ان کو حکم دیا کہ وہ دشمن سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ پھر آپؐ نے نماز عصر جماعت کے ساتھ پڑھائی۔ اس کے بعد فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے، جنگی لباس زیب تن فرمایا۔ اپنی ٹوپی خود سر پر رکھی، تلوار کو کمر سے حمائل کیا۔ جب اس صورت سے آپ گھر سے باہر تشریف لائے تو وہ لوگ جو باہر نکلنے کے سلسلے میں اصرار کر رہے تھے، شرمندہ ہوئے اور اپنے دل میں کہنے لگے کہ جس بات کی طرف پیغمبرؐ کا میلان نہیں تھا، ہمیں اس کے خلاف اصرار کرنے کا حق نہیں تھا۔ اس وجہ سے وہ رسولِ خدا کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اب اگر آپ چاہیں تو مدینہ میں رہیں۔

رسولِ خدا نے فرمایا: یہ مناسب نہیں ہے کہ پیغمبرؐ لباس جنگ پہن لے اور قبل اس کے کہ خدا دشمنوں کے ساتھ جنگ کی سرنوشت کو روشن کرے۔ وہ لباسِ جنگ کو اُتار پھینکے۔ اب ہم جو کہہ رہے ہیں وہ کرتے جاؤ خدا کا نام لے کر جادۂ پیما ہو جاؤ۔ اگر صابر رہو گے تو کامیاب رہو گے۔

لشکرِ اسلام کی روانگی

روانگی کے وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین نیزے طلب فرمائے اور ان میں تین پرچم باندھے مجاہدین کا عمومی پرچم تھا جو کہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کو دیا۔ قبیلہ "اوس" کا پرچم "اسید بن حضیر" اور قبیلۂ خزرج کا پرچم "سعد بن عبادہ" کے سپرد کیا۔ رسولِؐ خدا جمعہ کے دن عصر کے وقت ایک ہزار افراد کے ساتھ اس حالت میں مدینہ سے باہر نکلے کہ آپ خود گھوڑے پر سوار تھے اور نیزہ ہاتھ میں تھا۔ مسلمانوں کے درمیان صرف سو افراد کے جسم پر زرہ تھی۔

جب لشکرِ اسلام مقام شیخان پر پہنچا تو ناگہاں ایک گروہ ھمہمہ کرتا ہوا پیچھے سے آن پہنچا۔ رسولِؐ خدا نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسولؐ! یہ عبیداللہ بن ابی کے ہم پیمان یہودی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ان تک یہ بات پہنچا دو کہ ہم نصرت سے بے نیاز ہیں۔ اس کے بعد فرمایا: مشرکین سے جنگ کرنے کے لیے مشرکین سے مدد نہ لی جائے۔

لشکرِ توحید کے کیمپ میں

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شیخان کے پاس پڑاؤ ڈالا اور محمد بن مسلمہ کو پچاس افراد کے ساتھ لشکرِ اسلام کے خیموں کی محافظت کے لیے مامور فرمایا۔ اس مقام پر خود اپنی مرضی سے جنگ میں شرکت کرنے والے نوجوان آپؐ کے پاس آئے اور جنگ میں شرکت کی اجازت چاہی، رسولؐ خدا نے جنگ میں ان کی شرکت کی موافقت نہیں فرمائی۔ حضرتؐ سے ان لوگوں نے کہا کہ رافع بن خدیج ایک ماہر تیر انداز ہے اور رافع نے بھی اونچے جوتے پہن کر اپنے قد کی بلندی کا مظاہرہ کیا۔ رسولؐ خدا نے رافع کو شرکت کی اجازت دے دی۔ سمرہ بن جندب نے اعتراض کیا اور کہا کہ میں رافع سے زیادہ قوی ہوں۔ میں ان سے کشتی لڑنے کے لیے تیار ہوں۔

رسولؐ خدا نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ کشتی لڑو۔

سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا تو رسولِ خدا نے ان کو بھی شرکت کی اجازت دے دی۔
(مغازی: ج۱،ص ۲۱۶)

عبداللہ بن جحش نے پیغمبرؐ خدا سے عرض کیا: یارسول اللہ! دشمنوں نے وہاں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ میں نے پہلے ہی خدا کی بارگاہ میں یہ دُعا کی تھی کہ دشمنوں سے مقابلہ ہو اور وہ مجھ کو قتل کر دیں، میرا پیٹ پھاڑ ڈالیں، میرے جسم کو مثلہ کر دیں تاکہ میں ایسی حالت میں خدا کا دیدار کروں اور جس وقت وہ مجھ سے پوچھے کہ کس راہ میں تیری یہ حالت کی گئی ہے؟ تو میں کہوں کہ اے خدا! تیری راہ میں۔ (مغازی: ج ۲،ص ۲۱۹)

عمرو بن جموح ایک لنگڑے انسان تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے جو پیغمبرؐ خدا کے ساتھ جنگوں میں شیر کی طرح لڑتے تھے۔ جب جنگ اُحد پیش آئی تو ان کے عزیز و اقارب نے ان کو شرکت سے منع کیا اور ان سے کہا کہ تمھارے پیر میں لنگ ہے فریضۂ جنگ کا بار تمھارے دوش پر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ تمھارے بیٹے تو پیغمبرؐ خدا کے ساتھ جا ہی رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ "وہ لوگ تو جنت میں چلے جائیں اور میں یہاں تمھارے پاس رہ جاؤں؟ ان کی بیوی نے دیکھا کہ ہتھیار سج رہے ہیں اور زیرِ لب یہ دعا کر رہے ہیں کہ: "خدایا! مجھ کو میرے گھر واپس نہ پلٹا"۔ ان کے بیٹوں نے ان سے اصرار کیا کہ وہ جنگ میں شرکت سے اجتناب کریں وہ پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں پہنچے اور کہا: اے رسولِ خدا! میرے لڑکے نہیں چاہتے کہ میں آپ کے ساتھ اس جنگ میں شرکت کروں۔ بخدا میری خواہش ہے کہ اس لنگ زدہ پیر کو بہشت کی زمین پر گھسٹوں۔

پیغمبرؐ خدا نے فرمایا: خدا نے تجھ کو معذور رکھا ہے اور جہاد کے فریضہ کا بار تیرے کندھوں سے اُٹھ گیا ہے۔

انھوں نے قبول نہیں کیا۔ نتیجتاً رسولِ خدا نے ان کے بیٹوں سے فرمایا: اگر تم ان کو نہ روکو تو تمھارے اُوپر کوئی گناہ نہیں ہے۔ شاید خدا ان کو شہادت نصیب کرے۔ آفتاب غروب ہوا۔ جنابِ بلالؓ نے اذان دی۔ رسولِ خدا نے مجاہدینِ اسلام کے ساتھ نماز جماعت ادا کی۔ اس طرف دشمن کی لشکرگاہ میں عکرمہ بن ابی جہل کو چند سواروں کے ساتھ خیموں کی حفاظت پر مامور کر دیا گیا۔

منافقین کی خیانت

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح سویرے شیخاں سے احد کی طرف (چھ کلومیٹر مدینہ سے) روانہ ہوئے۔ مقام شوط پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافقین کا سرغنہ اپنے چاہنے والے تین سو افراد کے ساتھ مدینہ لوٹ گیا۔ اس نے اپنے بہانے کی توجیہہ کے لیے کہا کہ محمدؐ نے جوانوں کی بات سنی، ہماری بات نہیں سنی۔ اے لوگو! ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کس لیے اپنے آپ کو قتل کیے جانے کے لیے پیش کردیں۔ عبداللہ بن عمرو بن حرام ان کے پیچھے پڑ گئے اور کہا:

اے قوم والو! خدا سے ڈرو، ایسے موقع پر جب دشمن نزدیک ہیں، اپنے قبیلہ اور پیغمبرؐ خدا کو تنہا نہ چھوڑو۔ لوگوں نے کہا کہ ہم اگر یہ جانتے کہ لڑائی ہونے والی ہے تو ہم تم کو نہ چھوڑتے۔ لیکن ہم کو معلوم ہے کہ کسی طرح کی جنگ نہیں ہوگی۔

عبداللہ بن عمرو نے جو کہ ان سے نااُمید ہو چکے تھے، کہا کہ تم خدا کے دشمن ہو، خدا تم کو اپنی رحمت سے دُور کرے اور اپنے پیغمبرؐ کو تم سے بے نیاز کردے۔

ان تین سو افراد کے چلے جانے کے بعد قبیلہ بنی حارثہ اور قبیلہ بنی سلمہ کے افراد بھی سست پڑ گئے۔ ان کا خیال بھی واپس جانے کا تھا کہ خدا نے ان کو استوار رکھا۔

صف آرائی

روز شنبہ سات شوال سنہ ۳ ہجری کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُحد میں نماز صبح ادا کرنے کے بعد لشکر کی صف آرائی شروع کردی۔ کوہ اُحد کو پیچھے اور مدینہ کو اپنے سامنے قرار دیا۔ سپاہیوں کو مکمل طور پر ترتیب دینے کے بعد آپؐ نے تقریر فرمائی اور کہا کہ تعریف اور جزا اس شخص کے لیے ہے جو اپنے فریضہ کو صبر و سکون اور واقفیت و یقین کے ساتھ انجام دیتا ہے، اس لیے کہ جہاد ایک سخت اور دُشوار کام ہے۔ اس میں بڑی مشکلات و پریشانیاں ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اس میں صابر رہیں۔ مگر وہ لوگ جن کو خدا ہدایت و تقویت دے۔ خدا اس کا دوست ہے جو اس کا فرماں بردار ہے اور شیطان اس کا دوست ہے جو اس کی پیروی کرتا ہے۔

ہر چیز سے پہلے جہاد میں، اِستقامت رکھو اور اس وسیلہ سے ان سعادتوں کو اپنے لیے فراہم کرو جن کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔ اختلاف، کش مکش اور ایک دوسرے کو کمزور بنانے کا ارادہ ترک

کرو کیونکہ یہ باتیں حقارت و ناتوانی کا سبب ہیں۔

پیغمبرؐ خدا نے عبداللہ بن جبیر کو پچاس تیر اندازوں کے ساتھ درہ کوہ عینین کی پاسبانی پر معین فرمایا اور اس تنگ راستے کی حفاظت کے لیے جنگی حکمت عملی بتاتے ہوئے فرمایا کہ چاہے ہم فتح یاب ہوں اور چاہے شکست کھا جائیں تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا اور دشمن کے سواروں کو تیر اندازی کے ذریعے ہم سے دُور کرتے رہنا تا کہ وہ پیچھے سے ہم پر حملہ نہ کریں۔ اگر ہم قتل کر دیے جائیں تو ہماری مدد نہ کرنا اور اگر ہم فتح یاب ہو جائیں اور ہم مالِ غنیمت حاصل کرنے لگیں تم ہمارے پاس نہ آنا، تم اپنی جگہ مضبوطی سے ڈٹے رہنا، یہاں تک کہ ہمارا کوئی حکم آ جائے۔ (مغازی: ج ۱، ص ۲۲۰ تا ۲۲۳)

دشمن اپنی صفوں کو منظم کرتے ہیں

ابوسفیان نے بھی اپنی صفوں کو منظم کر لیا۔ پیادہ زرہ پوش دستہ خالد بن ولید کی کمان میں لشکر کے درمیان میں کچھ سواروں کا لشکر داہنی جانب اور ایک گروہ کو عکرمہ بن ابی جہل کی سرکردگی میں بائیں جانب قرار دیا اور سیاہ پرچم اس نے قبیلہ بنی عبدالدار کے افراد کے سپرد کیا اور شرک و الحاد کے وجود کی حفاظت کے لیے حکم دیتے ہوئے کہا کہ لشکر کی کامیابی پرچم داروں کی استقامت میں پوشیدہ ہے۔ ہم نے بدر کے دن اسی وجہ سے شکست کھائی تھی۔ اب اگر اپنے آپ کو تم اس کے لائق ثابت نہیں کرو گے تو پرچم داری کا یہ فخر کسی اور قبیلہ کو نصیب ہوگا۔ ان باتوں سے اس نے بنی عبدالدار کے جاہلی احساسات کو مہمیز کیا یہاں تک کہ وہ آخری دم تک جان کی بازی لگانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔

اب خونچکاں جنگ کے دہانہ پر دونوں لشکر توحید و شرک ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں اور ان دونوں لشکروں کی توانائیوں کی نسبت آپس میں مندرجہ ذیل ہے:

لشکر اسلام سپاہ ۷۰۰...... لشکر مشرکین ۳۰۰۰...... مسلمانوں کے مقابل کفار کی نسبت تقریباً ایک پر ساڑھے چار۔ (مغازی: ج ۱، ص ۲۲۳)

جنگ کیسے شروع ہوئی؟

دونوں لشکروں کے درمیان ابو عامر کی وجہ سے پہلا معرکہ ہوا وہ اُحد کے دن آگے بڑھتا

ہوا لشکر کے مقابل گیا اور آواز دی کہ اے اوس! میں ابو عامر ہوں۔

لوگوں نے کہا کہ اے فاسق! تیری آنکھیں اندھی ہو جائیں۔

ابو عامر اس غیر متوقع جواب کے سننے سے اہلِ مکہ کے درمیان ذلیل ہو گیا۔

اس نے کہا کہ میرے ذریعے میرے قبیلہ کو گزند پہنچی ہے۔ اس کے بعد اس نے مسلمانوں سے جنگ کا آغاز کر دیا۔ لشکرِ اسلام نے اس پر اور اس کے ساتھیوں پر سنگ باری کی۔ اس کے بیٹے حنظلہ جو لشکرِ اسلام میں تھے۔ انھوں نے رسولِ خدا سے اجازت مانگی تا کہ اپنے باپ کو قتل کر دیں لیکن رسولِ خدا نے اجازت نہیں دی۔ (حوالہ سابق)

ابو عامر کے بیٹھ رہنے کے بعد طلحہ بن ابی طلحہ مشرکوں کا پرچم دار جسے سیاہ مینڈھا کہا جاتا تھا، غرور کرتے ہوئے آگے بڑھا اور اس نے چلا کر کہا کہ تم کہتے ہو کہ تمھارے مقتولین دوزخ میں اور ہمارے مقتولین بہشت میں جائیں گے۔ اس صورت میں کیا کوئی ہے جس کو میں بہشت میں بھیج دوں یا وہ مجھ کو دوزخ میں پہنچا دے؟

حضرت علی علیہ السلام اس کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جنگ شروع ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں سیاہ مشرک کا پرچم دار شمشیرِ علیؑ کی بدولت کیفر کردار کو پہنچا۔ رسولِ خدا خوش ہو گئے اور مجاہدینِ اسلام نے صدائے تکبیر بلند کی۔

طلحہ کے بھائی نے پرچم اُٹھا لیا اور آگے بڑھا۔ درآں حالیکہ دوسرے چند افراد پرچم اُٹھانے اور سرنگوں ہو جانے کی صورت میں وجود شرک کا دفاع کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ (مغازی: ج ۱، ص ۲۲۳)

دشمن کے حرکت میں آنے کا سبب موسیقی

اسلام کے مجاہد اپنے مقدس دین کے دفاع کے لیے لڑ رہے تھے اور اپنے دل و دماغ میں شہادت کی آرزو کو پروان چڑھا رہے تھے لیکن مشرکوں کے سپاہیوں کا مقصد پست مادی آرزوؤں کا حصول اور انتقام کے سوا کچھ نہ تھا۔ مشرکین کے نامور افراد اپنے سپاہیوں کے ان ہی جذبات کی جنگ کے وقت تقویت کر رہے تھے اور یہ ذمہ داری ان آوارہ عورتوں کی تھی جو آلاتِ موسیقی بجاتیں اور مخصوص آواز میں ترانے گاتی تھیں تا کہ غریزہ جنسی کی آڑ لے کر ان کو بھڑکائیں اور دوسری طرف

ان کے کنبے کی انتقامی آگ کو شعلہ ور کردیں اور وہ لوگ نفسیاتی طور پر متاثر ہو کر جنگ کو جاری رکھیں۔

جو شعر یہ بدقماش عورتیں پڑھ رہی تھیں اس کا مطلب کچھ اس طرح تھا: ہم طارق کی بیٹیاں (ستارہ سحری) ہیں۔ ہم بہترین فرش پر قدم رکھتے ہیں۔ اگر دشمن کی طرف بڑھو گے تو ہم تمھارے گلے لگ جائیں گے۔ اگر دشمن کو پیٹھ دکھاؤ گے اور فرار کرو گے تو ہم تم سے جدا ہو جائیں گے۔

عام حملہ

حضرت علی علیہ السلام نے پھر نئے پرچم دار پر حملہ کیا اور وہ بھی اپنے گندے خون میں لوٹنے لگا۔ رسولِ خدا کے حکم سے عام حملہ شروع ہوا۔ مجاہدینِ اسلام ایسی شجاعت سے لڑ رہے تھے جس کی تعریف بیان سے باہر ہے اور اسی درمیان چند افراد جیسے علیؑ، حمزہؓ اور ابودجانہ بے خوفی کی عظیم مثال تاریخ بشریت میں ثبت کرتے جا رہے تھے۔ سپاہِ دشمن پر بجلیاں گرا رہے تھے۔ ان کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ پرچم داروں کے پیر اکھاڑ دیں، جنگ زیادہ تر اسی حصہ میں ہو رہی تھی اس لیے کہ اس زمانے میں پرچم کا سرنگوں ہو جانا شکست کے برابر اور خاتمۂ جنگ سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے مشرکین کے پرچم دار اپنی انتہائی شجاعت کا مظاہرہ کر رہے تھے اور بنی عبدالدار کے قبیلہ کے افراد نہایت غیظ و غضب کے عالم میں اپنے پرچم دار کے اردگرد جنگ کر رہے تھے اور جب کوئی پرچم دار قتل ہو جاتا تھا تو احتیاطی فوجیں بلا فاصلہ جلدی سے بڑھ کر پرچم کھول دیتی تھیں۔ اس درمیان دشمن کے شہ سواروں نے تین مرتبہ سپاہیانِ اسلام کے محاصرہ کو توڑنا چاہا اور ہر بار عبداللہ بن جبیر کے لشکر نے مردانہ وار، نہایت بہادری اور تیر اندازی کے ذریعے ان کو پیچھے دھکیل دیا۔

حضرت علی علیہ السلام کی تلوار، حضرت حمزہؓ کی دلیری اور عاصم بن ثابت کی تیر اندازی سے بنی عبدالدار کے پرچم داروں میں سے نو افراد یکے بعد دیگرے قتل ہو گئے تھے۔ رُعب و دہشت نے مشرکین کے سپاہیوں کو گھیر رکھا تھا۔ آخری بار انھوں نے صواب نامی غلام کو پرچم دیا۔ صواب سیاہ چہرہ اور وحشت ناک ہیولے کے ساتھ پیغمبرِ خدا کی طرف بڑھا، آنکھیں سرخ تھیں اور منہ سے کف (جھاگ) جاری تھا۔ لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اس پر حملہ کیا اور تلوار کی ایسی ضربت اس کی کمر پر لگائی کہ وہ ڈھیر ہو گیا۔

مسلمانوں نے مشرکین کی صفوں کو درہم برہم کر دیا۔ وہ عورتیں جو دف بجا رہی تھیں اور

گانے گا رہی تھیں، دف پھینک کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گئیں۔ مشرکین کے لشکر میں فرار اور شکست کے آثار رُونما ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان میں زیادہ تر لوگ بھاگ گئے اور اس طرح جنگ کا پہلا مرحلہ مشرکین کی شکست اور مجاہدینِ اسلام کی کامیابی پر تمام ہوا۔

فتح کے بعد شکست

راہِ خدا میں جہاد، رضائے خدا کا حصول اور آئین اسلام کی نشر و اشاعت کے علاوہ مجاہدینِ اسلام کا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ وہ آخری وقت تک بہادری کے ساتھ جنگ کرتے رہے اور نتیجہ میں فتح یاب ہوئے۔ لیکن فتح کے بعد بہت سے مسلمان اس مقصد سے ہٹ گئے اور ان کی نیت بدل گئی۔ قریش نے جو مالِ غنیمت چھوڑا تھا اس نے بہت سے لوگوں کے اخلاص کی بنیادیں ہلا دیں، انھوں نے فرمانِ رسولؐ اور اپنے جنگ کے مقصد کو بھلا دیا۔ دشمنوں کے تعاقب سے چشم پوشی کر کے مالِ غنیمت کی جمع آوری میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے اپنی جگہ یہ سوچ لیا تھا کہ کام ختم ہو گیا۔

درہ کی پشت پر جو نگہبان موجود تھے انھوں نے جب مجاہدین کو مالِ غنیمت جمع کرتے دیکھا، تو جنگی حکمت عملی کے اعتبار سے اس اہم درہ کی حفاظت کی اہم ذمہ داری کو بھلا دیا اور کہا کہ ہم یہاں کیوں رُکے رہیں؟ خدا نے دشمن کو شکست دی اور اب تمھارے بھائی مالِ غنیمت جمع کر رہے ہیں۔ چلو تاکہ ہم بھی ان کے ساتھ شرکت کریں۔ عبداللہ ابن جبیر نے یاد دلایا کہ کیا رسولؐ خدا نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اگر ہم قتل کر دیے جائیں تو ہماری مدد نہ کرنا اور اگر ہم کامیاب ہو گئے اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگے جب بھی ہمارے ساتھ شرکت نہ کرنا اور پسِ پشت سے ہماری حفاظت کرتے رہنا؟ عبداللہ نے ان کو بہت سمجھایا کہ تم کمانڈر کے حکم سے سرتابی نہ کرو لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ انھوں نے غنیمت کے لالچ میں اپنی جگہ کو چھوڑ دیا اور اس سے دُور نکل آئے۔ عبداللہ صرف دس افراد کے ساتھ وہاں باقی رہ گئے۔

خالد بن ولید نے جو کہ دشمن کی فوج کے شہ سواروں کا سردار تھا۔ جب درہ کو خالی دیکھا تو اس نے اپنے ماتحت فوجیوں کو لے کر حملہ کر دیا اور چند بچے ہوئے تیر اندازوں پر ٹوٹ پڑا۔ عکرمہ بن ابی جہل نے اپنی ٹولی کے ساتھ خالد بن ولید کی پشت پناہی کی، جن تیر اندازوں نے درہ نہیں چھوڑا تھا۔ انھوں نے مردانہ وار مقابلہ کیا یہاں تک کہ ان کے ترکش کے تمام تیر خالی ہو گئے۔ اس

کے بعد انھوں نے نیزے اور پھر شمشیر سے جنگ کی یہاں تک کہ سب شہید ہو گئے۔

جب سپاہیان اسلام یہاں اطمینان کے ساتھ مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول تھے اس وقت خالد بن ولید لشکر اسلام کی پشت پر تھا۔ ایک طرف مشرکین اپنے فرار کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس نے جنگی حکمت عملی والے اہم حصّہ کو فتح کر لیا تھا۔ وہ چلا چلا کر شکست خوردہ لشکرِ قریش کو مدد کی دعوت دے رہا تھا۔ اسی ہنگام میں بھاگنے والوں کی عورتوں میں ایک عورت نے کفر کے سرنگوں پرچم کو لہرا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قریش کا بھاگا ہوا لشکر واپس آ گیا اور شکست خوردہ لشکر پھر سے منظم ہو گیا۔

سپاہ اسلام افراتفری اور بدنظمی کی وجہ سے تھوڑی ہی دیر میں سامنے اور پیچھے سے محاصرہ میں آ گئی اور پھر نئے سرے سے دو لشکروں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ مسلمان حواس باختہ ہو گئے اور اس طرح وہ دشمن کے ہاتھ سے مارے گئے اور بدحواسی کے عالم میں نہ پہچاننے کی بنا پر ایک دوسرے کو بھی مار دیتے تھے۔

اس غیر مساوی جنگ کے ہلڑ ہنگامہ میں جو دوبارہ شروع ہو چکی تھی ابن قمہ نے اسلام کے لشکر کے افسر مصعب بن عمیر پر حملہ کر دیا جو پیغمبرؐ خدا کا دفاع کر رہے تھے اور وہ خدا سے عہد و پیمان کی راہ میں اپنے خون میں غلطاں ہو گئے۔

مصعب نے لڑائی کے وقت اپنے چہرہ کو چھپا رکھا تھا تاکہ وہ پہچانے نہ جائیں۔ ابن قمہ نے سوچا کہ اس نے پیغمبرؐ خدا کو قتل کر دیا ہے، اس وجہ سے وہ چلایا کہ اے لوگو! محمدؐ قتل کر ڈالے گئے۔ اس خبر سے قریش اس قدر خوش تھے کہ آپس میں شور و غل مچا کر کہہ رہے تھے: محمدؐ قتل ہو گئے، محمدؐ قتل ہو گئے۔ (مغازی: ج۱، ص۲۲۹ و ۲۳۲)

اس بے بنیاد خبر کا پھیلنا دشمن کی جرأت کا باعث بنا اور لشکرِ قریش سیلاب کی طرح اُمنڈ پڑا اور مشرکین کی عورتوں نے مصعب کے جسم پاک اور شہدا میں سے بہت سے افراد کے جسد اطہر کو مثلہ کر دیا۔

دوسری طرف اس خبر نے جنگ کی حالت میں مجاہدینِ اسلام کو بہت بڑا روحانی صدمہ پہنچایا وہ اس طرح کہ اکثر لوگوں نے ہاتھ روک لیا اور پہاڑ پر پناہ لینے کے لیے بھاگ گئے۔ بعض ایسے حواس باختہ ہوئے کہ انھوں نے سوچا کہ کسی کو فوراً مدینہ میں عبداللہ بن ابی کے پاس بھیجیں تاکہ

پیغمبرؐ خدا مسلمانوں کو اپنی طرف بلا رہے تھے اور فرماتے تھے: اے بندگانِ خدا! میری طرف آؤ، اے فلاں فلاں تم میری طرف آؤ۔ لیکن اس دستہ نے اپنی جان بچائی جس کے پاس ایمان نہیں تھا اور جیسے بھاگ رہا تھا ویسے ہی بھاگتا رہا۔ ان میں سے بعض پہاڑ پر بھاگتے وقت اپنے خیال میں وعدۂ فتح سے بدگمان ہو گئے اور جاہل افکار نے ان کا پیچھا کرنا شروع کیا۔ بعض نے قرار پر فرار کو ترجیح دی اور مدینہ چلے گئے اور تین دن تک اپنے آپ کو چھپائے رکھا۔ (تاریخ کامل: ج ۲، ص ۱۰۹)

پیغمبرؐ خدا کا دفاع کرنے والوں کی شجاعت

درہ میں چند افراد باقی رہ گئے تھے اور ایسی شجاعت کے ساتھ دشمن کے پے در پے حملے کو دفع اور پیغمبرؐ خدا سے دفاع کر رہے تھے جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ حضرت علی علیہ السلام نے ایک لحظہ کے لیے بھی میدان کو نہیں چھوڑا۔ آپؑ اپنی تلوار سے پے در پے دشمن کے سر پر موت کا مینہ برسا رہے تھے اور ایک دستہ کو قتل کر کے دوسرے دستہ کو فرار پر مجبور کر رہے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام نے بہت زخم کھائے تھے لیکن پھر بھی نہایت تیزی کے ساتھ شیر کی طرح غرا کر شکار پر حملہ کرتے تھے اور پروانہ وار پیغمبرؐ کے گرد چکر لگا رہے تھے، مبادا کوئی ان کی شمع وجود کو جو نورِ خدا ہے، خاموش نہ کر دے۔ ایسا منظر بار بار آتا رہا۔ خدا اس بہادری کا شاہد ہے، جبرائیلؑ نے آسمان سے آواز بلند کی:

لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار

اور تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے۔ اہلِ سنت کے مورخ ابن ہشام لکھتے ہیں: اُحد کی جنگ میں حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں قریش کے زیادہ تر افراد قتل ہوئے۔ (سیرۃ ابن ہشام: ج ۲، ص ۱۰۰)

اُحد کے معرکہ میں بہادری کا جوہر دکھانے والوں میں سے جناب حمزہؓ بن عبدالمطلب سردارِ لشکرِ اسلام بھی تھے جنھوں نے رسولِ خدا کا دفاع کرتے ہوئے بہت سے مشرکین کو واصلِ جہنم کیا۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے وحشی سے جو جبیر ابن مطعم کا غلام تھا، سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم محمدؐ، حمزہؓ یا پھر علیؑ کو قتل دو تو آزاد ہو جاؤ گے۔ وہ رسولِ خدا تک تو نہ پہنچ سکا اور علیؑ بھی میدانِ جنگ میں

طر جوکنا مہ کو کھا کہ وہ شدت غنظ غضب میں اپنی

طرف سے بے خبر ہیں تو وہ ان کا تعاقب کرنے لگا۔ جناب حمزہؓ شیر کی طرح قلب لشکر پر حملہ کر رہے تھے اور جس شخص تک پہنچے اس کو خاک و خون میں غلطاں کر دیتے تھے۔

وحشی ایک پتھر کی آڑ میں چھپ گیا اور جب حمزہؓ معروفِ جنگ تھے اس وقت اس نے اپنے نیزہ کا نشانہ ان کی طرف لگا کر ان کو شہید کر دیا اور ابوسفیان کی بیوی نے جنابِ حمزہؓ کے جسم پاک کو مثلہ کیا۔

لشکرِ توحید کا دفاع کرنے والوں میں سے ایک ابودجانہؓ بھی تھے۔ مسلمانوں کے میدانِ جنگ میں واپس آجانے کے بعد جب آتشِ جنگ دوبارہ بھڑکی تو رسولؐ خدا نے ایک تلوار لی اور فرمایا کہ کون ہے جو اس تلوار کو لے اور اس کا حق ادا کرے؟ چند افراد اُٹھے لیکن ان میں سے کسی کو آپؐ نے تلوار نہیں دی اور پھر اپنی بات دُہرائی۔ اس دفعہ ابودجانہؓ اُٹھے اور انھوں نے کہا: یا رسولؐ اللہ! میں آمادہ ہوں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس شمشیر کا حق یہ کہ اسے دشمن کے سر پر اتنا مارو کہ یہ ٹیڑھی ہوجائے اور اس بات سے مکمل طور پر ہوشیار رہو کہ کہیں دھوکہ میں تم کسی مسلمان کو قتل نہ کر دینا۔ یہ کہہ کر آپؐ نے وہ تلوار ان کو عطا فرمائی۔ (سیرۃ ابن ہشام: ج ۲، ص ۶۸)

ابودجانہؓ نے ایک سرخ رنگ کا کپڑا اپنے سر پر باندھا اور دشمن کی طرف مغرور حملہ آور ہوئے۔ رسولؐ خدا نے فرمایا کہ اس طرح کی چال کو خدا دشمن رکھتا ہے مگر یہ کہ جنگ کے ہنگام ہو، ابودجانہ نے راہِ خدا میں قلب دشمن پر حملہ کیا اور ان کے سروں پر اتنی تلوار ماری کہ تلوار خم ہوگئی۔

اُمِ عمارہ شیر دل خاتون

اُمِ عمارہ وہ خاتون ہیں جو مدینہ سے سپاہِ اسلام کے ساتھ آئی تھی تاکہ محاذ کے پیچھے خواتین کے ساتھ رہ کر لشکرِ اسلام کی مدد کرنے والوں کے عنوان سے نصرت کریں۔ ان کے زخموں کی مرہم پٹی کا انتظام کریں۔ زخمیوں کے زخموں پر پٹی باندھیں اور مجاہدین کو پانی پہنچائیں۔

اگرچہ جہاد عورتوں کے لیے واجب نہ تھا مگر جب اُمِ عمارہ نے دیکھا کہ لوگ رسولؐ خدا کے پاس سے پراگندہ ہوگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگ و خون کے درمیان تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا، ان کی جان خطرے میں ہے۔ وجودِ اسلام خطرے میں گھرا ہوا ہے تو ایک بھاگنے والے

کی تلوار اُچک لی اور مردانہ انداز میں دشمن کے لشکر کی طرف بڑھیں اور ہر طرف اس طرح لڑ رہی تھیں کہ رسولِ خدا کی جان محفوظ رہے۔ پیغمبرؐ خدا اس شیر دل عورت کی شجاعت سے بہت خوش ہوئے اور آپ نے فرمایا کہ نسیبہ (اُم عمارہ) دختر کعب کی منزلت آج کے دن میرے نزدیک فلاں فلاں سے زیادہ بلند ہے۔ (مغازی)

چند افراد کی فداکاری کے باوجود جو کہ رسولِ خدا کے لیے سپر بنے ہوئے تھے۔ آپؐ شدید زخمی ہوئے۔ عتبہ نے چار پتھر پھینک کر آپؐ کے چند دانتوں کو شکستہ کر دیا۔ ابن قمہ نے آپؐ کے چہرہ پر شدید زخم لگایا اور وہ زخم ایسا لگا کہ خود کی زنجیروں کی کڑیاں آپ کے گالوں میں پیوست ہو گئیں۔ پیغمبرؐ خدا زخموں کی بنا پر کافی کمزور ہو گئے اور آپؐ نے ظہر کی نماز بیٹھ کر ادا کی۔

میدان چھوڑ دینے والوں میں سب سے پہلے شخص جنھوں نے رسولِ خدا کو پہچانا وہ کعب بن مالک تھے۔ انھوں نے چلا کر کہا کہ پیغمبرؐ خدا زندہ ہیں لیکن رسولِ خدا نے ان کو حکم دیا کہ چپ رہو۔ آنحضرتؐ کو درہ کے دہانہ تک لے جایا گیا۔ جب آپؐ وہاں پہنچے تو جو مسلمان وہاں سے بھاگ گئے تھے بہت شرمندہ ہوئے۔ ابوعبیدہ جراح نے رسولِ خدا کے چہرہ میں در آنے والی زنجیروں کی کڑیوں کو باہر نکالا۔ علیؑ اپنی سپر میں پانی بھر کر لائے اور رسولِ خدا نے اپنا سر اور چہرہ دھویا۔

لشکر کی جمع آوری

جب رسولِ خدا ﷺ درہ کے دہانے پر پہنچ گئے تو آپؐ نے مسلمانوں کو بلایا۔ جب لشکرِ اسلام نے رسولِ خدا کو زندہ دیکھا تو گروہ، گروہ اور فرد، فرد ان کے گرد آنے لگے۔ رسولِ خدا نے ان کو جہاد، راہِ خدا میں جنگ اور پہلی جگہوں پر واپسی کی دعوت دی۔

شکست کے بعد پھر سے اسلامی فوجیں منظم ہو گئیں اور افراد نیز سامانِ جنگ کی کمی کے باوجود، دوبارہ حملہ شروع کر دیا۔ جنگ کی آگ نے جنگ بھڑکانے والوں کو پھر سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اسلامی لشکر کی شجاعت و بہادری نے دوبارہ دشمن کے سیاہ قلب کو خوف و وحشت میں مبتلا کر دیا۔ مشرکین کے لشکر سردار ابوسفیان نے اس خطرے کے باعث کہ کہیں مجاہدینِ اسلام آغازِ جنگ

کی طرح پھر سے ان پر جھپٹ پڑیں۔ جنگ بندی کے حکم کے ساتھ جنگ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

شہیدوں کے پاکیزہ جسم کے ساتھ کیا سلوک ہوا؟

جنگ کے خاتمہ اور میدانِ جنگ کے خالی ہو جانے کے بعد قریش کی اوباش عورتیں اور مشرکین کے سپاہی، شہیدوں کے پاکیزہ اجسام کی طرف بڑھے اور اپنے انتقام کی آگ کو بجھانے کے لیے انھوں نے لرزا دینے والے مظالم کیے۔ شہیدوں کے طاہر جسم کو مثلہ کر دیا۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ، ان کی عورتوں کی پیش رو تھی اور اس نے جنابِ حمزہؓ اور تمام شہیدوں کے اعضا کاٹ کر گلوبند اور دست بند بنا لیا تھا۔ جب ہند جنابِ حمزہؓ کے جسد اطہر کے پاس پہنچی تو اس نے ان کے سینہ کو چاک کر کے ان کا جگر نکال کر دانت سے چبانا چاہا لیکن اس کو چبا نہ سکی۔ آخر میں اس نے زمین پر پھینک دیا۔

اس بدترین جرم کے ارتکاب کے بعد وہ "ہند جگر خوار" کے نام سے مشہور ہوگئی۔ بجز حنظلہ جن کا باپ (ابوعامر) سپاہِ مشرکین میں تھا، تمام شہیدوں کے جسم کو مثلہ کر دیا گیا۔ (سیرۂ حلبی: ج ۲، ص ۲۴۴)

طرفین کے نقصانات کا تخمینہ

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی طرف سے ستر آدمیوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اس میں سے چار افراد مہاجرین اور بقیہ انصار میں سے تھے۔ تقریباً ستر افراد زخمی ہوئے۔ مشرکین میں سے ۲۲ سے ۲۶ افراد تک ہلاک ہوئے جن میں آدھے افراد شمشیرِ علیؑ سے قتل ہوئے تھے۔ (ارشاد مفید: ص ۴۳)

مفہوم شہادت

منافقین مدینہ میں سے "قرمان" نامی ایک شخص جب رسولؐ خدا کے سامنے آیا تو آپؐ نے فرمایا: "یہ جہنمی ہے"۔

جب جنگِ اُحد چھڑی تو قرمان لشکرِ اسلام سے رُوگردانی کر کے عبداللہ بن ابی اور دیگر منافقین سے جاملا۔ جب وہ مدینہ آیا تو عورتوں نے اس کی سرزنش کی، اس کو غیرت محسوس ہوئی اور

وہ اسلحہ سجا کر اُحد کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے مردانہ وار جنگ کی اور نہایت شجاعت اور دلیری کے ساتھ چند مشرکین کو قتل اور زخمی کیا۔ جنگ کے آخری لمحات میں بہت زیادہ زخمی ہو کر میدانِ جنگ میں زمین پر گر پڑا۔ مسلمان اس کی طرف دوڑے اور کہا: شہادت تمھیں مبارک ہو۔ اس نے کہا کہ میں کیوں خوش ہوں؟ میں نے صرف اپنے قبیلہ کے شرف کے لیے جنگ کی ہے۔ اگر میرا قبیلہ نہ ہوتا تو میں جنگ نہ کرتا۔ زخموں کے درد کو اس سے زیادہ تحمل نہ کر سکا۔ لہٰذا ترکش سے ایک تیر نکال کر اس نے خودکشی کر لی۔ (مغازی: ج ۱، ص ۲۲۳-۲۲۴)

نفسیاتی سرد جنگ

لوگوں کے افکار و عقائد میں نفوذ کرنے کے لیے مساعد حالات کی ضرورت ہوتی ہے اور افکار کے نفوذ اور تخریب کاری کے لیے شکست اور مصیبتوں میں مبتلا ہونے والے زمانہ جیسا مناسب اور کوئی زمانہ نہیں ہے، موقع کی تلاش میں رہنے والے دشمن نے اس اصل پر تکیہ کرتے ہوئے شکست کے آخری لمحات کو اپنے عقائد کی نشر و اشاعت کے لیے غنیمت سمجھا اور اسلام مخالف نعروں کے ذریعے سادہ لوح افراد کو دھوکا دینے اور انھیں متاثر کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے کہ یہ ایسا موقع ہے جب غلط پروپیگنڈہ نہایت آسانی کے ساتھ شکست خوردہ قوم کے دلوں میں اثر کر سکتا ہے۔

ابوسفیان اور عکرمہ بن ابی جہل نے اُعلُ هُبَل ہبل سرفراز رہے گا کا نعرہ بلند کیا، یعنی ہمارے بتوں نے ہم کو کامیاب کیا۔

رسولِ خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ تم کہو: اَللّٰہُ اَعلٰی وَاَجَل "خدا برتر اور بزرگ ہے"۔ مشرکین کے نعرے بدل گئے۔ ابوسفیان نے چلانا شروع کیا: نَحنُ لَنَا العزّٰی وَلَا عزّٰی لَکُم "ہمارے پاس عزّیٰ نامی بت ہے لیکن تمھارے پاس نہیں ہے"۔

رسولِ خدا نے فرمایا کہ تم بھی بلند آواز سے کہو: اَللّٰہُ مَولَانَا وَلَا مَولٰی لَکُم "اللہ ہمارا مولا ہے اور تمھارا کوئی مولا نہیں ہے"۔

مشرکین کا نعرہ دوبارہ بدل گیا۔ ابوسفیان نے نعرہ بلند کیا کہ "یہ دن روزِ بدر کا بدل ہے"۔ مسلمانوں نے پیغمبرِ خدا کے حکم سے کہا کہ یہ دونوں دن آپس میں برابر نہیں ہیں۔ ہمارے مقتولین

بہشت میں اور تمھارے مقتولین جہنم میں ہیں۔ ابوسفیان نے کہا کہ ہمارا اور تمھارا آئندہ سال مقام بدر میں وعدہ رہا۔ (بحارالانوار: ج ۲۰، ص ۴۴)

کہاں جا رہے ہو؟

جنگ کی آگ بجھ گئی، دونوں لشکر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ مشرکین کے لشکر نے کوچ کا ارادہ کیا۔ پیغمبرؐ خدا سوچنے لگے، دیکھیں یہ لوگ کہاں جاتے ہیں؟ آیا یہ لوگ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں یا مکہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں؟ موضوع واضح ہونے کے لیے رسولؐ خدا نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: اے علیؑ! تم جا کر دشمن کی خبر لاؤ۔ اگر تم نے دیکھا کہ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور اُونٹوں کو کھینچتے ہوئے لے جاتے ہیں تو سمجھنا کہ مدینہ پر حملے کا قصد ہے۔ اس صورت میں خدا کی قسم ہم ان سے لڑیں گے اور اگر وہ اُونٹوں پر سوار ہوئے اور گھوڑوں کو کھینچتے ہوئے لے چلے تو سمجھنا کہ مکہ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام دُور سے دشمن کی تاک میں تھے اور دیکھ رہے تھے کہ وہ اُونٹوں پر سوار ہو گئے اور اپنے دیار کی طرف پلٹ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ (بحارالانوار: ج ۲۰، ص ۹۷)

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی شکست کے اسباب کا جائزہ

جنگ کے پہلے مرحلے میں سپاہِ اسلام کی فتح اور بعد کے مرحلے میں ان کی شکست کی وجہ اُحد کے واقعات دیکھنے کے بعد بڑی آسانی سے واضح ہو جاتی ہے لیکن یہاں وحی کی زبان سے مسلمانوں کی شکست کی وجوہ مختصراً بیان کی جاتی ہیں۔ وہ وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

① جنگ کے لیے منظم نہ ہونا سردار کی نافرمانی، جنگی اعتبار سے اہم جگہ کو چھوڑ دینا مسلمانوں کی شکست کی اہم وجوہات ہیں۔ قرآن کہتا ہے: خدا نے (اُحد میں دشمنوں پر) فتح یابی کا تم سے سچا وعدہ کیا۔ اس موقع پر تم اس کے فرمان کے مطابق جنگ کر رہے تھے (اور یہ کامیابی جاری تھی) یہاں تک کہ تم سست ہو گئے اور اپنے کام میں نزاع کرنے لگے۔ جس چیز کو تم دوست رکھتے تھے (دشمن پر غلبہ) اس چیز کو تمھیں دکھا دیا گیا۔ پھر اس کے بعد تم نے نافرمانی کی۔ (آلِ عمران: آیت ۱۵۲)

② ایمان کی کمزوری اور دنیا پرستی، نئے نئے مسلمان ہونے والوں میں ایک گروہ نے دشمن کا پیچھا کرنے کے بجائے مالِ غنیمت جمع کرنے کو ترجیح دی اور اسلحہ رکھ کر غنیمت جمع کرنے لگا۔ قرآن مندرجہ بالا آیات کے آخر میں کہتا ہے: ''تم میں سے بعض دنیا طلب تھے اور بعض آخرت کے خواہاں۔ اس کے بعد اللہ نے تم کو ان سے منصرف کر دیا (اور تمھاری کامیابی شکست پر تمام ہوئی) تا کہ تم کو آزمائے۔ (حوالہ سابق)

③ پیغمبر خدا کے قتل کی افواہ اور وہ اس طرح کہ بعض مسلمان تو اسلام کی بنیاد ہی سے ناامید ہو گئے تھے۔ قرآن اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ ''محمدؐ صرف رسولِ خدا ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسولؑ گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ مر جائیں یا شہادت پا جائیں تو کیا تم اپنے جاہلیت کے دین پر پلٹ جاؤ گے''۔ (آلِ عمران: آیت ۱۴۴)

شہیدوں کی میت پر

لشکرِ مشرک کے میدانِ جنگ سے نکل جانے کے بعد رسولِ خدا لشکرِ اسلام کے مجاہدین کے ساتھ شہیدوں کی میت پر حاضر ہوئے تا کہ ان کو سپردِ خاک کریں۔ جب حضرتؐ نے شہیدوں کے مثلہ اجسام، خصوصاً سید الشہداء حضرت حمزہؓ کے پارہ پارہ بدن کو دیکھا تو ان کا دل غم سے پاش پاش ہو گیا اور مشرکین کی طرف سے آپؐ کے دل میں مزید غصہ اور نفرت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں مسلمانوں نے یہ عہد کیا کہ اگر دوسری لڑائی میں وہ مشرکین پر فتح پائیں گے تو ایک دی کے بدلے میں کافروں کے تین اجسام کو مثلہ کریں گے لیکن درج ذیل آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں نے اس خیال کو ترک کر دیا۔

اگر تم چاہتے ہو کہ ان کو سزا دو تو اپنی سزا میں میانہ روی اختیار کرو اور حدِ اعتدال سے خارج نہ ہو جاؤ۔ اور اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔ (شرف النبیؐ: ص ۳۴۷)

پھر رسولِ خدا حضرت حمزہؓ کے پاکیزہ جسم پر نماز پڑھتے ہیں اور ان کے پہلو میں ایک ایک کو لٹا کر ہر ایک پر الگ الگ نماز پڑھتے ہیں اس طرح ستر نمازیں پڑھی گئیں۔ (مغازی)

حضرت حمزہؓ کی بہن صفیہ اپنے شہید بھائی کا جنازہ دیکھنے آئیں تو ان کے بیٹے زبیر نے ان کو روکنا چاہا (تا کہ بہن اس حال میں بھائی کو نہ دیکھے) لیکن جنابِ صفیہ نے فرمایا کہ ''مجھے معلوم ہے

کہ میرے بھائی کو مثلہ کیا گیا ہے۔ بخدا اگر میں ان کے سرہانے پہنچوں گی تو اپنے غمگین ہونے کا اظہار نہیں کروں گی اور راہِ خدا میں اس مصیبت کو برداشت کروں گی۔ لوگوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے بھائی کے سرہانے آئیں اور ان کے لیے خدا سے دُعائے مغفرت کی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ قبریں کھودی جائیں اور ان اجسام کو ان میں دفن کر دیا جائے۔ شہدا اپنے لباس کے ساتھ دفن ہوئے اور جس کے پاس مناسب لباس نہ تھا ان کے جسم کو ایک پارچہ سے ڈھک دیا گیا۔ اکثر شہدا کو اسی میدانِ جنگ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ کچھ لوگ اپنے شہدا کو مدینہ لے گئے۔ اس طرح سے پہلا شہیدوں کا قبرستان مدینہ کے نزدیک کوہِ اُحد کے دامن میں بنا۔ (مغازی واقدی: ج ۱، ص ۲۶۷)

ان کو یہیں دفن کردو، ان کی دُعا مستجاب ہوئی

ہند، عمرو بن حزام کی بیٹی، جس کے شوہر عمر بن جموح، بیٹے خلاد اور بھائی عبداللہ عمرو اس مقدس جہاد میں شہید ہوئے تھے، اُحد میں آئیں تاکہ اپنے عزیزوں کے جنازہ کو مدینہ لے جائیں۔ ہند نے ان تینوں کے جنازہ کو اُونٹ پر رکھا اور مدینہ کا راستہ لیا۔ مدینہ جاتے وقت کچھ عورتیں ملیں جو پیغمبرؐ خدا کی صحیح خبر پانے کے لیے اُحد کی طرف آ رہی تھیں۔ عورتوں نے ہند سے رسولؐ خدا کا حال دریافت کیا۔ اس نے نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا: الحمدللہ! رسولؐ خدا زندہ ہیں (گویا اس نعمت کے مقابل تمام مصیبتیں ہیچ تھیں)۔ دوسرا مژدہ یہ ہے کہ خدا نے کافروں کے رُخ کو پھیر دیا جبکہ وہ غیظ و غضب سے بھرے ہوئے تھے۔ عورتوں نے اس سے پوچھا کہ یہ جنازے کس کے ہیں؟ اس نے کہا کہ ایک میرا شوہر، دوسرا میرا بیٹا اور تیسرا میرا بھائی ہے۔

وہ عورت اُونٹ کی مہار کو مدینہ کی طرف کھینچ رہی تھی لیکن اُونٹ بڑی مشکل سے راستہ طے کر رہا تھا۔ ان عورتوں میں سے ایک نے کہا کہ شاید اُونٹ کا بار بہت گراں ہے۔ ہند نے جواب دیا: نہیں یہ اُونٹ بہت آسانی سے دو اُونٹوں کا بار اُٹھاتا ہے۔ ہند جب اُونٹ کو اُحد کی طرف پلٹاتی تو اُونٹ بڑی آسانی سے چلنے لگتا۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہ کیا بات ہے؟ رسولؐ خدا کے پاس دوڑی ہوئی آئی اور آپ سے ماجرا بیان کیا۔ حضرتؐ نے ہند سے سوال کیا کہ جب تیرا شوہر گھر سے باہر نکلا تو اس نے خدا سے کیا مانگا تھا؟ ہند نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! وہ جب گھر سے

باہر نکلے تھے تو اس وقت ان کی دُعا تھی: خدایا! مجھے میرے گھر واپس نہ پلٹانا۔ رسولِ خدا نے کہا کہ تیرے شوہر کی دُعا مستجاب ہوئی۔ خدا نہیں چاہتا کہ یہ جنازہ گھر کی طرف واپس جائے۔ تم تینوں جنازوں کو اُحد ہی میں دفن کردو اور یہ جان لو کہ یہ تینوں افراد دوسری دنیا میں بھی ساتھ ہی رہیں گے۔ ہند نے سسکتے ہوئے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ خدا سے دعا کیجیے کہ میں بھی ان کے پاس رہوں۔ (مغازی: ج ۱، ص ۲۶۴ و ۲۶۶)

مدینہ کی طرف

جب رسولِ خدا ﷺ اپنے شہید اصحاب کو دفن کر چکے تو انھوں نے مدینہ کی طرف روانہ ہو جانے کا حکم دیا۔ بہت سے مسلمان زخمی تھے۔ جنابِ فاطمہ زہراؑ کے ساتھ زخمیوں کے مداوا کے لیے اُحد میں جو چودہ عورتیں آئی تھیں۔ وہ آنحضرتؐ کے ساتھ تھیں۔

کچھ لوگ پیغمبرِ خدا کے دیدار اور استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے تا کہ رسول اللہ کی سلامتی کا اطمینان حاصل کریں۔ قبیلہ بنی دینار کی ایک عورت نے جب اپنے باپ، شوہر اور بھائی کے شہید ہو جانے کی خبر سنی تو اس نے کہا کہ رسولِ خدا کی کیا خبر ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ رسولِ خدا ٹھیک ہیں۔ اس عورت نے کہا کہ ذرا مجھے راستہ دے دو تا کہ میں خود ان کی زیارت کروں اور جب اس نے پیغمبر اکرمؐ کو زندہ و سلامت دیکھا تو کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! جب آپؐ زندہ ہیں تو اب اس کے بعد ہر مصیبت آپؐ کے وجود کی وجہ سے ہیچ ہے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۹۹)

حمنہ بنت جحش رسولِ خدا کے پاس آئیں تو آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: حمنہ! میں تجھے تعزیت دے رہا ہوں۔ انھوں نے پوچھا کہ کس کی تعزیت؟ آپؐ نے فرمایا: تمھارے ماموں حمزہؑ کی۔ حمنہ نے کہا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ انھیں شہادت مبارک ہو۔ رسولِ خدا نے فرمایا: میں پھر تعزیت پیش کرتا ہوں۔ حمنہ نے عرض کیا: کس کی تعزیت؟ رسولِ خدا نے فرمایا: تمھارے بھائی عبداللہ بن جحش کی۔ حمنہ نے کہا: خدا ان کی مغفرت کرے اور ان پر اپنی رحمت نازل کرے اور ان کو بہشت مبارک ہو۔ آنحضرتؐ نے پھر فرمایا: میں پھر تم کو تعزیت پیش کرتا ہوں۔ حمنہ نے پوچھا: کس کی تعزیت؟ آپؐ نے فرمایا: تمھارے شوہر مصعب بن عمیر کی۔ حمنہ نے ایک آہ سرد بھری اور گریہ کرنا شروع

کیا۔ رسولِ خدا نے فرمایا کہ شوہر جو مقام عورت کے دل میں رکھتا ہے وہ کسی کا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد لوگوں نے حمنہ سے پوچھا کہ تم اس قدر کیوں غم زدہ ہو گئیں؟ حمنہ نے کہا کہ میں نے اپنے بچوں کی یتیمی کو یاد کیا تو میرا دل بھر آیا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۹۸)

شہید عمرو بن معاذ کی ماں کبشہ آگے بڑھیں اور انھوں نے بڑے غور سے رسول اللہ کا چہرہ دیکھا اور اس کے بعد کہا: اب جب میں نے آپ کو صحیح سالم دیکھ لیا تو مصیبت کا اثر میرے دل سے زائل ہو گیا۔ رسولِ خدا نے ان کے بیٹے عمرو بن معاذ کی شہادت پر ان کو تعزیت پیش کی، دلاسہ دیا اور فرمایا: اے عمرو کی ماں! میں تمھیں مژدہ سناتا ہوں اور تم شہیدوں کے اہل و عیال کو مژدہ سنا دو کہ ان کے شہدا بہشت میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ہر ایک اپنے عزیزوں اور خاندان والوں کی شفاعت کرے گا۔

عمرو کی ماں نے کہا: اے پیغمبرِ خدا! میں خوش ہو گئی اور اس کے بعد عرض کیا: اے پیغمبرِ خدا! اس کے پسماندگان کے لیے آپ دُعا فرمائیے۔ رسولِ خدا نے اس طرح دعا کی: ''خدایا! ان کے دلوں سے غم کو زائل کر دے، ان کے مصیبت زدہ دل کے زخموں پر مرہم رکھ اور ان کے پسماندگان کے لیے بہترین سرپرست قرار دے''۔ (مغازی: ص ۳۱۵-۳۱۶)

نمازِ مغرب کا وقت آن پہنچا

بلالؓ نے اذان دی، رسولِ خدا مسجد میں اس حالت میں تشریف لائے کہ لوگ ان کے شانوں کو پکڑے ہوئے تھے۔ آپؐ نے نماز پڑھی۔ واپسی پر دیکھا کہ نالہ و شیون (رونے دھونے کی آواز) میں شہرِ مدینہ ڈوبا ہوا ہے۔ لوگ اپنے شہیدوں کی عزاداری اور ان پر رونے میں مصروف ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا: لیکن حمزہؓ کا کوئی نہیں ہے جو ان پر گریہ کرے۔ مدینہ کی عورتیں رسولِ خدا کے گھر آگئیں اور مغرب سے رات گئے تک نوحہ و عزاداری میں مصروف رہیں۔

شہیدوں کی ایک جھلک

صرف ایک سجدہ وہ بھی محرابِ عشق میں خون بھرا سجدہ

انصار میں سے عمرو بن ثابت نامی ایک شخص جن کی عرفیت ''اصیرام'' تھی، ہجرت کے بعد جب ان کے سامنے اسلام پیش کیا گیا تو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب رسولؐ خدا اُحد کے لیے نکلے تو ان کے دل میں نورِ ایمان جگمگا اُٹھا، انھوں نے تلوار اُٹھائی اور نہایت سُرعت کے ساتھ لشکرِ اسلام سے جا ملے، مردانہ وار جنگ کی اور زخموں کی تاب نہ لا کر گر پڑے۔ جب مسلمانوں نے اپنے مقتول سپاہیوں کو میدانِ جنگ میں ڈھونڈنا شروع کیا تو اس وقت ان کو بھی دیکھا کہ ابھی زندہ ہیں، لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے قبیلہ کی حمایت میں جنگ کی ہے یا تم مسلمان ہو گئے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ میں نے میدانِ جہاد میں قدم رکھ دیا ہے اور اب اپنے خون میں غلطاں ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ وہ شہید ہو گئے۔ جب ان کا واقعہ رسولؐ خدا سے بیان کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔ جی ہاں قبل اس کے کہ وہ نماز پڑھے اور خدا کے لیے سجدہ کرے، اس نے جنت کی راہ لی۔ اس نے صرف ایک سجدہ کیا۔ وہ بھی خوں بھرا سجدہ محرابِ عشق میں۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۹۰)

ایک مال دار عقل مند کی شہادت

''مخیرق'' ایک یہودی دانش مند اور مال دار آدمی تھے۔ خرمے کے درخت اور اچھے خاصے مال و متاع کے مالک تھے۔ جب اُحد کا دن آیا تو انھوں نے یہودیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ خدا کی قسم! تمھیں خوب معلوم ہے کہ محمدؐ کی نصرت تم پر واجب ہے۔ یہودیوں نے عذر پیش کیا کہ آج شنبہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ تمھارے پاس اب دوسرا شنبہ نہیں ہے۔ پھر انھوں نے لباسِ جنگ زیب تن کیا، اپنے جسم پر ہتھیار سجائے اور اُحد کی طرف روانہ ہونے کے لیے تیار ہوئے۔ نکلنے سے

پہلے اپنے رشتہ داروں سے کہا کہ اگر میں آج قتل کردیا جاؤں تو میرے سارے مال کا اختیار محمدؐ کو ہے، وہ جہاں خرچ کریں۔ اس کے بعد وہ اُحد کی طرف چل پڑے اور مجاہدین راہِ خدا سے جا ملے، جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ رسولؐ خدا نے ان کی وصیت کے مطابق ان کے مال کو اپنی تحویل میں لے لیا اور ابن اسحاق کی تحریر کے مطابق رسولؐ خدا کے بہت سے اوقاف اور مدینہ میں جو اُمورِ خیریہ انجام دیے ہیں وہ انھی کے اموال سے تھے۔ (تاریخ طبری: ج ۲، ص ۵۳۱)

ایک عارف بوڑھے کی شہادت

خیثمہ بوڑھے تھے مگر صاحب معرفت تھے۔ ان کے بیٹے بدر کی لڑائی میں شہادت کے درجہ پر فائز ہو چکے تھے۔ لشکرِ اسلام کی اُحد کی طرف روانگی سے قبل انھوں نے رسولؐ خدا سے عرض کیا: کل رات خواب میں میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا کہ وہ بہشت کے باغوں میں چلا جا رہا ہے۔ بہشت کے درختوں کے نیچے اس کی نہروں کے کنارے ٹہل رہا ہے۔ میرے بیٹے نے مجھ سے کہا کہ بابا جان! ہمارے پاس آجایئے کہ ہم نے خدا کے وعدہ کو سچا پایا۔ اے اللہ کے رسولؐ! میں اس بات کا مشتاق ہوں کہ اپنے بیٹے کے پاس پہنچ جاؤں۔ اے پیغمبرؐ خدا! میری ڈاڑھی سفید ہے، میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے دُعا فرمائیں کہ خدا مجھے شہادت نصیب کرے۔ پیغمبرؐ خدا نے فرمایا: خدایا! اس شخص کی آرزو پوری کرے۔ چنانچہ وہ اُحد کی جنگ میں شہید ہو گیا۔

حجلۂ خون

حنظلہ پچیس سالہ جوان، جنگ اُحد کی آگ بھڑکانے والوں میں سے ایک شخص ابو عامر فاسق کے بیٹے تھے۔ جس وقت رسولؐ خدا کی طرف سے جہاد کے لیے عام تیاری کا اعلان ہوا۔ اس وقت جنابِ حنظلہ، عبداللہ بن ابی کی لڑکی سے شادی کرنے جا رہے تھے۔ ان کے باپ کے برخلاف جو کافر اور منافق تھا، یہ دولہا دلہن اسلام اور پیغمبرؐ خدا پر مکمل ایمان رکھتے تھے۔ جس وقت محاذِ جنگ پر جانے کی دعوت کی صدا جنابِ حنظلہ کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس وقت وہ حیران ہو گئے کہ اب کیا کریں؟ ابھی تو شادی کے مراسم ادا ہوئے ہیں۔ اب وہ حجلۂ عروسی میں جائیں یا محاذ

جنگ پر؟ انھوں نے بہتر سمجھا کہ رسولِ خدا سے اجازت لے لیں تا کہ شب زفاف مدینہ میں رہیں اور اس کے دوسرے دن میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائیں۔

پیغمبرؐ خدا نے اجازت دے دی۔ صبح سویرے غسل کرنے سے پہلے، اپنی دلہن سے محاذ جنگ پر جانے کے لیے خدا حافظ کہا۔ دلہن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اپنے شوہر سے اس نے چند منٹ ٹھہرنے کو کہا اور اپنے ہمسایوں میں سے چار آدمیوں کو بلا لائی تا کہ وہ اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان گواہ رہیں۔ حنظلہ نے دوسری بار خدا حافظ کہا اور محاذِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔

دلہن نے ان گواہوں کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان شگافتہ ہو گیا اور میرے شوہر اس میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد آسمان پھر جڑ گیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ شہادت کے درجے پر پہنچیں گا۔

جنابِ حنظلہؓ لشکرِ اسلام سے جا ملے اور انھوں نے ابوسفیان پر حملہ کیا۔ ایک تلوار جو اس کے گھوڑے پر پڑی تو وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ابوسفیان کی چیخ پکار پر چند مشرکین اس کی مدد کو بڑھے اور اس طرح ابوسفیان کی جان بچ گئی۔ دشمن کے ایک سپاہی نے جنابِ حنظلہ کو نیزہ مارا۔ حنظلہؓ نے نیزہ کا شدید زخم لگنے کے باوجود اس نیزہ بردار پر حملہ کیا اور تلوار سے اس کو قتل کر ڈالا۔ نیزہ کے زخم نے آخرکار اپنا کام کر ڈالا اور جنابِ حنظلہ حجلۂ خون میں عروسِ شہادت سے جا ملے۔

پیغمبرؐ خدا نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ حنظلہ کو فرشتے غسل دے رہے تھے، اس وجہ سے ان کو حنظلہ غسیل الملائکہ کہتے ہیں۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۷۴)

دولہا دلہن کو اخلاص اور ان کا ایمان واقعی بڑا تعجب انگیز ہے۔ ہمارے محاذِ جنگ پر لڑنے والے پیکر ایثار و قربان مجاہدین، ان کے خاندان والوں اور ان کی بیویوں کے لیے الہام بخش اور مقاومت کا نمونہ ہے۔

مدینہ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں

جنگ اُحد کے سلسلہ میں عبداللہ بن ابی اور اس کے تمام منافق ساتھیوں نے سرزنش اور شماتت شروع کر دی اور جو مصیبت مسلمانوں کے سروں پر آن پڑی تھی۔ اس پر یہ لوگ خوش تھے۔ یہودی بھی بدزبانی کرنے لگے اور کہنے لگے کہ محمدؐ سلطنت حاصل کرنا چاہتے ہیں، آج تک کوئی

پیغمبرؐ اس طرح زخمی نہیں ہوا۔ وہ خود بھی زخمی ہوئے اور ان کے اصحاب بھی مقتول اور زخمی ہیں۔

وہ رات بڑی حساس رات تھی۔ ہر آن یہ خطرہ منڈلا رہا تھا کہ کہیں منافقین اور یہود، مسلمانوں اور اسلام کے خلاف شورش نہ برپا کر دیں اور اختلاف پیدا کر کے اس شہر کے سیاسی اتحاد وثبات کو نہ ختم کر دیں۔

مدینہ سے ۲۰ کلومیٹر دور حمراء الاسد میں جنگی مشق

(یک شنبہ ۸ شوال سنہ ۳ ہجری قمری) ہر طرح کی داخلی وخارجی ممکنہ سازش کی روک تھام اور مکمل طور پر ہوشیار اور آمادہ رہنے کے لیے اوس وخزرج کے سربرآوردہ افراد نے مسلح افراد کی ایک جماعت کے ساتھ مسجد اور خانہ پیغمبرؐ کے دروازے پر رات بھر پہرہ دیا۔ یک شنبہ کی صبح کو رسولؐ خدا نے نماز صبح ادا کر کے جناب بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو دشمن کے تعاقب کے لیے بلائیں اور اعلان کریں کہ ان لوگوں کے سوا اور کوئی ہمارے ساتھ نہ آئے جو کل جنگ میں شرکت کر چکے ہیں۔

بہت سے مسلمان شدید زخمی تھے لیکن فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور جنگی لباس زیب تن کر کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر تیار ہو گئے۔ پیغمبرؐ خدا نے پرچم حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں دیا اور عبداللہؓ بن ام مکتوم کو مدینہ میں اپنا جانشین معین فرمایا۔ اس حیرت انگیز روانگی کی وجہ یہ تھی کہ رسولؐ خدا کو یہ پتا چل گیا تھا کہ قریش کے سپاہیوں نے مدینہ لوٹ کر (اسلام ومسلمانوں کا) کام تمام کر دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حمراء الاسد تک پہنچے اور وہاں آپؐ نے حکم دیا کہ ہمارے سپاہی وسیع میدان میں بکھر جائیں اور رات کے وقت اس وسیع وعریض زمین پر آگ روشن کر دیں تاکہ دشمن کو یہ گمان ہو کہ ایک بہت بڑا لشکر ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ رسولؐ خدا تین رات وہاں ٹھہرے رہے اور ہر رات اس عمل کو دہرایا جاتا رہا۔

اس جگہ معبد خزاعی نے پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں پہنچ کر خبر دی کہ قریش دوبارہ مدینہ پر حملہ کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔ پھر معبد نے ابوسفیان سے جا کر کہا کہ میں نے لشکر بے کراں اور غیظ و غضب سے تمتماتے چہرے دیکھے ہیں۔ ابوسفیان اس خبر سے وحشت زدہ ہو گیا اور مدینہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے باز رہا۔

اس جنگی مشق (پریڈ) نے مجاہدینِ اسلام اور اہلِ مدینہ کے حوصلوں کو بڑھایا۔ ان کے دل سے خوف کو دُور کیا اور دشمن کے دل میں اور زیادہ خوف بٹھا دیا اور وہ اس طرح کہ جب تین دن کے بعد مسلمان مدینہ پلٹ کر آئے تو ان کی حالت ایسی تھی کہ گویا ایک بہت بڑی فتح حاصل کر کے لوٹے ہیں۔ (طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۴۸)

ابوعزہ شاعر کی گرفتاری

بلبل خاں ابوعزہ نامی شاعر جو کہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو کر آیا تھا، رسولِ خدا نے بغیر تاوان کے اسے اس شرط پر آزاد کر دیا تھا کہ وہ کسی کو مسلمانوں کے خلاف نہیں ورغلائے گا لیکن اس نے عہد شکنی کی اور جنگِ اُحد کے لیے مشرکین کو اسلام کے خلاف لڑنے کی اپنے اشعار کے ذریعے دعوت دیتا رہا۔ وہ حمراء الاسد میں لشکرِ اسلام کی اسیری میں آ گیا اور دوبارہ معافی کا خواستگار ہوا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبول نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ اس کے بعد آپؐ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ (سیرتِ حلبی: ج ۲، ص ۲۵۹)

جنگِ اُحد کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئیں وہ سورہ آلِ عمران کی ۶۰ آیتیں (۱۲۰ سے ۱۷۹ تک) ہیں۔ اس سال جو اہم واقعات رُونما ہوئے ان میں سے پیغمبرؐ خدا کا حفصہ بنت عمر کے ساتھ ماہ شعبان میں عقد اور زینب بنت خزیمہ کے ساتھ آپؐ کا نکاح ہے۔ (سیرت حلبی: ج ۲، ص ۲۵۸)

سریہ ابوسلمہ بن عبدالاسد

(پنج شنبہ یکم محرم سنہ ۴ ہجری قمری) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کو سوچ رہے تھے کہ شکست اُحد کی کمی کا جبران، فداکاری اور زبردست اور وسیع پیمانے پر جنگی اور سیاسی کوششوں سے ہونا چاہیے۔ دوسری طرف منافقین اور یہود اسلام کے داخلی نظام کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ حلیف و ہم عہد قبیلے اپنے کام میں سُست پڑ گئے تھے۔ اگر رسولِ خدا ایک جنگی اور سیاسی قابلِ قدر مشق یا حملہ نہ کرتے تو مدینہ کی مثال اس مجروح کی ہوتی جو حجاز کے بیابان میں پڑا ہو اور اپنا دفاع نہیں کر سکتا ہے اور بدو مُردہ خواروں اور قریش و بنی کنانہ اور ان کے حلیف عرب و

یہود کے کینہ توز بھیڑیوں کے لیے لذیذ لقمہ بن جاتا ہے۔

اسی حالت میں قبیلہ طی کے ایک شخص نے پیغمبرؐ خدا کو خبر دی کہ بنی اسد مدینہ پر حملہ کرنے اور مسلمانوں کے مال کو لوٹنے کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ رسولِ خدا نے ابوسلمہ کو سردار لشکر بنایا اور پرچم ان کے ہاتھ میں دے کر ایک سو پچاس مجاہدین کو ان کے ہمراہ کیا اور حکم دیا کہ راتوں کو خفیہ راستوں سے سفر کریں اور دن میں پناہ گاہوں میں سو جائیں اور دشمن کے سروں پر اچانک بجلی کی طرح گر پڑیں تا کہ دشمن کو دوسرے قبیلوں سے مدد لینے کی فرصت نہ مل سکے۔

ابوسلمہ حضرتؐ کے حکم کے مطابق روانہ ہوئے اور مدینہ سے ۳۳۰ کلومیٹر کی دوری پر مقام "قطن" کے اطراف میں پہنچے وہاں ان کو پتہ چلا کہ دشمن ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ ابوسلمہ نے اُونٹوں اور بھیڑوں کے ایک باقی ماندہ گلہ کو جمع کیا اور بہت زیادہ مالِ غنیمت لے کر مدینہ پلٹ آئے۔ اُحد کے بعد اس کامیابی کا یہودیوں اور منافقین پر مثبت اثر ہوا۔ دشمن کے اُوپر منہ توڑ حملہ کرنے والے اور ہم پیمان قبیلہ کے لیے دفاعی تکیہ گاہ کے عنوان سے لشکرِ اسلامی دوبارہ نمایاں ہوا۔ (طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۳۴۰)

سریہ عبداللہ بن انیس انصاری

(تاریخ دوشنبہ ۵ محرم سنہ ۴ ہجری قمری) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ سفیان بن خالد نے مقام عرنہ میں جانبازانِ اسلام سے لڑنے کے لیے کچھ لشکر آمادہ کر رکھا ہے۔ رسولِ خدا نے اس جنگی سازش کو ناکام بنانے کے لیے عبداللہ بن انیس کو حکم دیا کہ عرنہ جائیں اور اس کو قتل کر دیں۔

عبداللہ کہتے ہیں کہ اس ذمہ داری کے بعد میں نے تلوار سنبھالی اور چل پڑا۔ یہاں تک عصر کے وقت اس کے قریب پہنچ گیا۔ جب اس کے نزدیک گیا تو اس نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک آدمی ہوں۔ میں نے سنا ہے تم مسلمانوں سے جنگ کے لیے لشکر جمع کر رہے ہو، میں تم سے ملنے آیا ہوں۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ اس طرح ہم اس کے ساتھ چلتے رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بالکل تنہا ہو گیا اور ہم نے اس پر مکمل طور پر دسترس حاصل کر لی تو ہم نے تلوار سے حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا۔ جب رسولِ خدا کے پاس پہنچے تو انھوں نے فرمایا کہ ہمیشہ سرخ رو اور سربلند رہو۔ (طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۵۱)

رجیع کا واقعہ

(ماہِ صفر سنہ ۴ ہجری قمری) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنانے اور امن وامان قائم رکھنے کی غرض سے جنگی دستوں کو بھیجنے کے ساتھ ساتھ مناسب موقع سے ثقافتی اور تبلیغاتی دستے بھی ان قبائل کی طرف بھیجتے رہتے تھے جو لاتعلق تھے، تاکہ اسلام کے معارف کی نشرواشاعت ہو سکے اور کبھی خود قبائل کی درخواست پر بھی مبلغ بھیجے جاتے تھے۔

رجیع کا واقعہ اُحد کے بعد اس طرح پیش آیا کہ قبیلہ ''عضل'' اور ''قارہ'' کا ایک وفد رسولؐ خدا کے پاس پہنچا اور آپؐ سے کہا کہ ہمارے قبیلے کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں اپنے اصحاب کی ایک جماعت آپؐ ہمارے یہاں بھیج دیں تاکہ وہ ہم کو قرآن اور احکام اسلام سکھائیں۔

رسولؐ خدا نے فریضۂ الٰہی کے بموجب چھے افراد کو ان کے ساتھ بھیجا اور مرثد بن ابی مرثد غنوی کو اس جماعت کا قائد معین فرمایا۔ مبلغین اسلام احکامِ الٰہی پہنچانے کے لیے ان دونوں قبیلوں کی طرف روانہ ہوئے کہ ان کے ایک ہاتھ میں اسلحہ اور دوسرے میں قرآن کے نوشتے اور سینے میں علومِ الٰہی اور عشقِ خدا تھا۔ مکہ سے ستر کلومیٹر کی جانب جب چشمہ رجیع پر پہنچے تو دونوں قبیلوں نے اپنا پیمان توڑ دیا اور ھذیل کی مدد سے ان پر حملہ کر دیا۔

معلمین قرآن نے اپنا دفاع کیا لیکن حملہ آوروں نے کہا کہ ہم تمھیں قتل نہیں کریں گے، ہم تم کو قریش کے ہاتھوں زندہ بیچ دیں گے اور اس کے مقابل ان سے کچھ چیزیں حاصل کریں گے۔ تین مبلغین نے کسی بھی طرح اپنے کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کیا اور نہایت بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ دوسرے تین افراد زید، خبیب اور عبداللہ نے اپنے کو ان کے حوالے کر دیا۔ حملہ آور تینوں کو مکہ کی طرف لے گئے تاکہ ان کو قریش کے ہاتھوں فروخت کر دیں۔ ابھی آدھے راستہ ہی پہنچے تھے کہ عبداللہ نے تلوار پر قبضہ کر کے جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان لوگوں نے دوسرے دو اسیروں کو مکہ کے بڑے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ زید کو صفوان بن اُمیہ نے پچاس اُونٹ کے بدلے خریدا تاکہ وہ ان کو اپنے باپ امیہ بن خلف کے خون کے انتقام میں قتل کر دے اور خبیب کو عقبہ بن حارث نے آٹھ مثقال سونے کے عوض خریدا تاکہ وہ ان کو اپنے باپ کے انتقام میں دار پر چڑھا دے جو بدر میں مارا گیا تھا۔

زید کی حیات کے آخری لمحہ میں ابوسفیان آگے بڑھا اور اس نے کہا کہ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمھاری جگہ محمدؐ قتل ہو جائیں؟

زید نے کہا کہ خدا کی قسم! مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ محمدؐ کے پیر میں ایک کانٹا بھی چبھے یا ان کو کوئی آزار پہنچائے اور میں صحیح وسالم بچ جاؤں۔

ابوسفیان نے کہا کہ میں نے ابھی تک محمدؐ جیسا کسی کو نہیں دیکھا جو اپنے اصحاب میں اس طرح کی محبوبیت رکھتا ہو۔

خبیب نے بھی چند دنوں تک زندان رہ کر شہادت پائی۔ شہادت کے وقت انھوں نے اجازت مانگی تا کہ دو رکعت نماز ادا کرلیں۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر مجھے اس بات کا خوف نہ ہوتا کہ تم گمان کرو گے کہ میں موت سے ڈر گیا تو میں اور زیادہ نمازیں پڑھتا۔ پھر آسمان کی جانب رُخ کر کے دُعا کی۔ تختہ دار پر لٹکانے کے بعد ان کے سامنے کافروں نے یہ پیش کش رکھی کہ اسلام کو چھوڑ دیں۔ انھوں نے جواب میں خدا کی وحدانیت کی گواہی دی اور کہا کہ خدا کی قسم! روئے زمین کی ساری چیزیں مجھے دے کر اگر یہ کہا جائے کہ اسلام چھوڑ دو تو بھی میں اسلام نہیں چھوڑوں گا۔ اس مجاہد اور شہید کا پاکیزہ جسم ایک مدت تک تختہ دار پر لٹکا رہا۔ آخرکار خفیہ طور پر کسی نے اُتارا اور دفن کر دیا۔ (تاریخ طبری: ج ۲، ص ۵۳۰ و ص ۵۴۲)

بئر معونہ کا واقعہ

صفر سنہ چار ہجری میں مدینہ میں کچھ نوجوان رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآنی و اسلامی علوم کا درس لیتے اور مسجد میں دینی بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے تھے۔ قرآنِ مجید سے ان کی واقفیت اتنی تھی کہ وہ مبلغ اسلام ہو سکتے تھے۔

ایک دن قبیلۂ بنی عامر کا ابو براء نامی ایک شخص رسولِ خدا کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا کہ اگر آپؐ اپنے اصحاب میں سے کچھ افراد کو نجد کی سرزمین پر بھیج دیں تو مجھے اُمید ہے کہ وہ لوگ آپ کی دعوت قبول کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نجد والوں سے اپنے اصحاب کے بارے میں ڈرتا ہوں۔ ابو براء نے کہا کہ میں ان کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ وہ لوگ میری پناہ میں رہیں

گے۔ رسولؐ خدا نے اسلام سے آشنائی رکھنے والے چالیس معلمین قرآن کو منذر بن عمرو کی سرکردگی میں ایک رہنما کے ساتھ سرزمین نجد کی طرف روانہ کیا تاکہ وہاں اسلامی حقائق کی تبلیغ کریں۔

جب یہ لوگ بئر معونہ پہنچے تو اس جماعت کے ایک شخص نے رسولؐ خدا کا خط قبیلہ بنی عامر کے سردار کے سامنے پیش کیا۔ سردار قبیلہ نے رسولؐ خدا کا خط پڑھے بغیر نامہ بر کو قتل کردیا اور بنی عامر سے اس نامہ بر کے ساتھ آنے والوں کو قتل کرنے کے سلسلے میں مدد مانگی۔ انھوں نے کہا کہ ہم ابوبراء کے امان کو نہیں توڑیں گے۔ اس نے فوراً قبائل بنی سلیم سے اس سلسلے میں نصرت چاہی۔ انھوں نے ایک دستہ ان مبلغین اسلام سے مقابلے کے لیے بھیج دیا۔ ان چالیس افراد نے مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔ ان میں سے صرف ایک شخص عمرو بن اُمیہ نامی مجروح ہوگئے اور اس معرکہ کے بعد وہ کسی طرح مدینہ پہنچے۔

انھوں نے راستہ میں قبیلہ عامر کے دو افراد کو دیکھا اور اپنے شہید دوستوں کے انتقام میں ان دونوں کو قتل کردیا۔ جب یہ مدینہ پہنچے اور انھوں نے ان مبلغین کی شہادت کے واقعہ کو رسولؐ خدا سے نقل کیا تو آپ بہت غمگین ہوئے اور ان مجرمین پر نفرین کی۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۱۹۳)

سریہ عمرو بن اُمیہ

حادثۂ رجیع کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دردانگیز حادثہ میں شہید ہونے والے شہیدوں کے خون کا انتقام لینے اور جرائم کا ارتکاب کرنے والے ان اصلی مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے عمرو بن اُمیہ ضمری کو ایک آدمی کے ساتھ مامور کیا کہ وہ مکہ جا کر ابوسفیان کو قتل کر دیں۔ وہ لوگ مکہ پہنچے اور رات کے وقت شہر میں داخل ہوئے لیکن مکہ والوں میں سے ایک شخص نے انھیں پہچان لیا۔ مجبوراً ان لوگوں نے شہر سے باہر نکل کر ایک غار میں پناہ لی اور واپسی میں انھوں نے دو قریش کے نمک خوار اور ایک جاسوس کو گرفتار کیا اور انھیں مدینہ لے آئے۔ (تاریخ طبری: ج ۲، ص ۵۴۲)

غـزوۂ بنی نضیر

(تاریخ ربیع الاول سنہ چار ہجری) مدینہ واپسی کے وقت واقعۂ بئر معونہ میں بچ جانے

والے شخص عمرو بن اُمیہ کے ہاتھوں بنی عامر کے دو آدمیوں کے قتل نے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی کیونکہ اس نے غلطی سے بے قصور افراد کو قتل کر دیا تھا جو عہد و پیمان بنی عامر نے رسولِ خدا سے کیا تھا۔ اس کے مطابق مسلمانوں کو ان مقتولین کا خون بہا ادا کرنا چاہیے تھا۔ ایک طرف بنی نضیر کے یہودی مسلمانوں کے ہم پیمان تھے اور بنی عامر سے بھی معاہدہ رکھتے تھے۔ لہٰذا اپنے پیمان کے مفاد کے مطابق ان لوگوں کو بھی خون بہا ادا کرنے میں مسلمانوں کی مدد کرنی چاہیے۔

بئر معونہ اور رجیع کے منحوس واقعہ کے بعد، جو کہ چند دنوں پہلے پیش آیا تھا، یہودی منافقین کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا مذاق اُڑانے لگے تھے اور کہتے تھے کہ جو پیغمبرؐ خدا کا بھیجا ہوا ہوتا ہے وہ شکست نہیں کھاتا۔ یہ لوگ ہر آن شورش برپا کرنے کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔

اب بنی نضیر کے یہودیوں کی بری نیتوں سے خداوند عالم کے آگاہ کرنے کا بہترین وقت آ گیا تھا۔ بنی نضیر سے رسولِ خدا عہد و پیمان کے مطابق مقتولین کی دیت ادا کرنے میں مدد طلب کرنے کے لیے اپنے چند اصحاب کے ساتھ بنی نضیر کے قلعہ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ظاہراً تو رسولِ خدا کی پیش کش کا استقبال کیا لیکن خفیہ طور پر انھوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا اور یہ ارادہ کر لیا کہ مناسب موقع ہاتھ آیا ہے اس سے فائدہ اُٹھائیں اور پیغمبرؐ خدا کی شمع حیات کو گل کر دیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گھر کی دیوار کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے "عمرو" نامی ایک شخص کو بھیجا کہ وہ کوٹھے سے ایک پتھر آپؐ کے سرِ اقدس پر گرا دے۔ فرشتۂ وحی نے رسولِ خدا کو آگاہ کر دیا۔ آپؐ اسی حالت میں جس حالت میں ان کے مشکوک افراد کی رفت و آمد کا نظارہ فرما رہا تھے اطمینان سے ان کے درمیان سے اُٹھے اور اکیلے ہی مدینہ کی طرف چل دیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب جو آپؐ کی تاخیر سے پریشان ہو گئے تھے، مدینہ لوٹ آئے۔

رسولِ خدا نے محمد بن مسلمہ کو بنی نضیر کے پاس بھیجا اور ان لوگوں سے کہلوایا کہ مدینہ کو دس دن کے اندر چھوڑ دیں۔ جب بنی نضیر کے سربرآوردہ افراد نے اس پیغام کو سنا تو ان کے درمیان ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور ہر آدمی اپنا نظریہ پیش کرنے لگا وہ لوگ مدینہ سے نکلنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ عبداللہ ابن ابی نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو اور اپنا دفاع کرو۔ میں دو ہزار افراد کو تمھاری مدد کے لیے بھیجتا ہوں اور بنی قریظہ کے یہودی بھی ہمارا تعاون کریں گے۔

منافقین کے لیڈر کے پیغام نے یہودیوں کو ہٹ دھرمی پر باقی رہنے اور اپنا دفاع کرنے کے ارادے میں اور پکا بنا دیا اور ان کی تشویق ہوئی۔ لہٰذا قبیلہ بنی نضیر کے سردار حی بن اخطب نے رسولؐ خدا کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم جانے والے نہیں ہیں۔ آپ کو جو کرنا ہو کر لیجیے۔ رسولؐ خدا نے ان تک کسی طرح کی مدد اور قوت پہنچنے سے پہلے ہی بنی نضیر کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ چھٹے دن کے محاصرہ میں یہودیوں کا قلعہ کے باہر سے ہر طرح کا رابطہ منقطع ہوگیا۔ آخرکار ان لوگوں نے منافقین اور بنی قریظہ کی کمک سے مایوس ہوکر مجبوراً اپنے آپ کو لشکرِ اسلام کے حوالے کر دیا۔ رسولؐ خدا نے ان کو اس بات کی اجازت دی کہ اسلحہ کے علاوہ اپنے منقولہ اموال میں سے جتنا وہ چاہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔

حریص یہودی جو بھی لے جاسکتے تھے انھوں نے اپنے اُونٹوں پر لادا یہاں تک کہ گھر کے دروازوں کو چوکھٹ بازو کے ساتھ ساتھ اُکھاڑ کر اُونٹ پر لاد لیا۔ ان میں سے کچھ لوگ خیبر کی طرف اور کچھ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ ان میں سے دو مسلمان بھی ہوئے۔ یہودیوں کے غیر منقول اموال اور قابلِ کاشت زمینیں پیغمبرؐ خدا کے ہاتھ آئیں۔ آپؐ نے انصار کو بلایا۔ ان کی بچی خدمتوں اور ایثار و قربانیوں کو سراہا اور فرمایا کہ مہاجرین تمھارے گھروں میں تمھارے مہمان ہیں۔ ان کی رہائش کا بار تم اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہو۔ اگر تم راضی ہو تو بنی نضیر کے مالِ غنیمت کو میں مہاجرین کے درمیان تقسیم کردوں۔ وہ لوگ بھی تمھارا گھر خالی کر دیں؟

سعد بن معاذ اور سعد بن عباد قبیلہ اوس و خزرج کے دونوں سرداروں نے جواب دیا۔ اے رسولؐ اللہ! مالِ غنیمت کو ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان بانٹ دیجیے اور وہ بدستور ہمارے گھروں میں مہمان رہیں۔ رسول اللہ نے بنی نضیر کے تمام اَموال اور قابلِ کاشت زمینوں کو مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا اور انصار میں سے صرف دو افراد یعنی ''سہل بن حنیف اور ابودجانہ'' کو جو کہ بہت زیادہ تہی دست تھے۔ کچھ حصّہ عنایت فرمایا۔ بنی نضیر کے یہودیوں کی پیمان شکنی کے بارے میں خاص کر سورۂ حشر نازل ہوا۔ (سیرت ابن ہشام)

دہشت گردی کا انتقام

بنی نضیر کے واقعہ کے بعد ''یامین بن عمیر'' جو یہودی سے مسلمان ہوگیا تھا اس سے رسولؐ

خدا نے کہا کہ تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارا چچازاد بھائی میرے بارے میں کیا ارادہ رکھتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ میرا خاتمہ کردے؟ یامین بن عمیر نے ایک شخص کو دس دینار دیئے اور اس سے کہا کہ عمرو بن جحاش (وہی یہودی جس نے رسولِ خدا کے سر پر پتھر گرانے کا ارادہ کیا تھا) کو قتل کردے۔ وہ شخص گیا اور اس نے اس ذلیل یہودی کو اس کی سزا تک پہنچا دیا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۲۰۳)

غزوۂ بدر موعد

(یکم ذیقعدہ سنہ ۴ ہجری قمری) جنگِ اُحد ختم ہوجانے کے بعد ابوسفیان نے جو کامیابی سے سرمست تھا، مسلمانوں کو دھمکایا کہ وہ آئندہ سال بدر میں ان سے مقابلہ کرے گا۔ ایک سال گزر چکا تھا اور مسلمان مختلف جنگوں میں کچھ نئی کامیابیاں حاصل کرچکے تھے اور ابوسفیان جو ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی جنگ نہ چھڑ جائے اور شکست سے دوچار ہونا پڑے۔ بدر تک پہنچنے کے لیے وہ ایک بہانہ تراش رہا تھا اور چاہتا تھا کہ مسلمانوں کو متفرق کردے۔ ابوسفیان نے اس ہدف تک پہنچنے کے لیے ایک سیاسی چال چلی۔ نعیم نامی ایک شخص کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ مدینہ جائے اور افواہیں پھیلائے تاکہ لشکرِ اسلام کے حوصلے پست ہوجائیں۔

ابوسفیان کے فرستادہ نے مدینہ پہنچنے کے بعد اپنی نفسیاتی جنگ کا آغاز کردیا۔ موقع کی تلاش میں رہنے والے منافقین نے اس کی افواہوں کو پھیلانے میں مدد کی اور لشکرِ ابوسفیان کے عظیم حملے کی جھوٹی خبر نہایت آب وتاب کے ساتھ لوگوں کے سامنے بار بار بیان کرنے لگے۔ لیکن اس نفسیاتی جنگ نے رسولِ خدا اور ان کے باوفا اصحاب کے دل پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں کیا۔

رسولِ خدا نے اس جماعت کے مقابل جو ذرا ہچکچاہٹ کا اظہار کررہی تھی، فرمایا: اگر کوئی میرے ساتھ نہیں جائے گا تو میں تنہا جاؤں گا۔ پھر رسولِ خدا نے پرچم اسلام حضرت علی علیہ السلام کے سپرد کیا اور پندرہ سو افراد کے ساتھ مدینہ سے ۱۶۰ کلومیٹر بدر کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس حالت میں کہ آپؐ کے ساتھ صرف دس گھوڑے تھے۔

اپنی سازش کی ناکامی اور مسلمانوں کی آمادگی کی خبر سن کر ابوسفیان بھی دو ہزار افراد کے ساتھ بدر کی طرف روانہ ہوا لیکن مقام عسفان میں خشک سالی اور قحط کو بہانہ بنا کر خوف و دہشت کے ساتھ مکہ لوٹ گیا۔

مسلمان جو بدر میں ابوسفیان کے انتظار میں وقت گزار رہے تھے مقام بدر میں سیزن کے زمانہ میں انھوں نے اپنا تجارتی سامان فروخت کر دیا اور ہر دینار پر ان کو ایک دینار نفع ملا اور یہ لوگ سولہ دنوں کے بعد مدینہ پلٹ آئے۔

اس طرح سے کفارِ قریش کے دل مین خوف و وحشت کی لہر دوڑ گئی اور بدر کی شکست کے آثار محو ہو گئے۔ اس لیے کہ قریش کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی کہ اسلام کا لشکر اب شکست کھانے والا نہیں ہے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۲۲۰)

سنہ چار ہجری میں رُونما ہونے والے دوسرے واقعات مندرجہ ذیل ہیں:

① ۳ شعبان کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت باسعادت۔ (مروج الذھب: ج ۲، ص ۲۸۹)

② حضرت علی علیہ السلام کی والدہ گرامی جنابِ فاطمہؑ بنت اسد کی وفات، کہ جن کے مادری حق کا بار رسولؐ خدا پر تھا۔

③ پیغمبرؐ خدا کی ایک بیوی زینب بنت خزیمہ کا انتقال۔

④ رسولؐ خدا کا جنابِ اُمِ سلمہ، ہند بنت ابی امیہ سے نکاح، جو رسولؐ خدا کی بیویوں میں ایک پارسا اور عقل و دانش سے مالا مال بیوی تھیں، شیعہ اور سُنّی دونوں نے ان سے بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں۔

غـزوۂ ذاتـ الرقاع

(بتاریخ چہار شنبہ دسویں محرم سنہ ۵ ہجری) غزوۂ بنی نضیر کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر ملی کہ قبیلہ غطفان یعنی بنی ثعلبہ اور بنی محارب نے مسلمانوں سے جنگ کے لیے کچھ لشکر جمع کر رکھا ہے۔ رسولؐ خدا نے اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے مدینہ میں جناب ابوذرؓ کو اپنا جانشین بنایا اور خود چار سو کا لشکر لے کر نجد کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ دشمن کے عظیم لشکر کے رُوبرو ہوئے مگر دشمن کو خوف و دہشت نے گھیر لیا اور کسی طرح کے ٹکراؤ سے پہلے ہی متفرق ہو گئے۔

اس سفر میں اس اضطراری حالت میں چونکہ دشمن کے حملے کا خوف تھا اس لیے رسولؐ خدا نے لشکرِ اسلام کے ساتھ نمازِ خوف ادا کی۔ پیغمبرؐ خدا کے سفر کی کُل مدت پندرہ روز تھی۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۲۱۳)

غزوۂ دومۃ الجندل

(روانگی یک شنبہ ۲۵ ربیع الاول سنہ ۵ ہجری، مدینہ میں واپسی ۲۰ ربیع الثانی) مخبروں نے رسولِ خدا ﷺ کو خبر دی کہ دومۃ الجندل میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں اور مسافروں کا راستہ روکنے کے علاوہ ان پر ظلم وستم بھی ڈھا رہے ہیں ان کا قصد یہ ہے کہ مدینہ پر حملہ کر دیں۔ رسولِ خدا نے سباع بن عرفطہ غفاری کو مدینہ میں اپنا جانشین معین فرمایا اور ہزار آدمیوں کے لشکر کے ساتھ دومۃ الجندل کی طرف روانہ ہو گئے۔

آنحضرت ﷺ کے سپاہی راتوں کو راستہ طے کرتے اور دن کو دروں میں چھپ کر آرام کرتے تھے۔ دشمن کو لشکرِ اسلام کی روانگی کا پتا چل گیا اور ان پر ایسا رُعب طاری ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور اس علاقے سے دشمن تیزی سے بھاگ گئے۔

رسولِ خدا اس علاقہ میں قیام پذیر رہے اور آپؐ نے مختلف دستوں کو اطراف و جوانب میں بھیجا تا کہ خبر ملنے پر دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنا دیں۔ آپؐ پچیس روز کے بعد مدینہ پلٹ آئے۔ لوٹتے وقت فراز نامی شخص سے، جس کا قبیلہ قحط سے متاثر ہوا تھا۔ آپؐ نے معاہدہ کیا اور ان کو اجازت دی کہ وہ مدینہ کے اطراف کی چراگاہوں سے استفادہ کریں۔

اس غزوہ کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ سے دُور دراز کے علاقوں تک جادہ پیمائی اور خشک و ہولناک صحراؤں سے عبور کرنے میں مسلمانوں کی طاقت کا مظاہرہ ہوا اور دوسری طرف اسلام مشرقی روم کی سرحدوں تک نفوذ کر گیا اور یہ فوجی تحریک رومیوں کی تحقیر کا موجب بنی۔ مسعودی کی تحریر کے مطابق تاریخ اسلام میں روم کی بڑی طاقت کے ہاتھوں کی کھلونا حکومت کے ساتھ فوجی مقابلے کے لیے یہ پہلا قدم تھا۔ (التنبیہ والاشراف: ص ۲۱۵)

غزوۂ خندق (احزاب)

(تقریباً ۲۳ شوال سنہ پانچ ہجری) بنی نضیر کے یہودی جنھوں نے اپنی کینہ توزی اور انتقام کے خیال سے مدینہ کو چھوڑا تھا وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ جب یہ لوگ خیبر پہنچے تو ان کے سردار حی بن اخطب اور کنانہ بن ابی الحقیق، ابو عامر فاسق اور ایک دوسری جماعت کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ قریش اور ان کے تابعین کو رسولِ خدا سے جنگ کی دعوت دی۔ انھوں نے

قریش سے کہا کہ محمدؐ کی طرف سے تمھارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اگر فوراً انھوں نے پسپا کر دینے والے لشکر کی تیاری نہیں کی تو محمدؐ ہر جگہ اور ہر شخص پر غالب آجائیں گے۔

ایک طرف بدر موعد میں قریش کی شکست و سرنگونی اور جنگی قرارداد کے مطابق لشکرِ اسلام کے خوف سے ان کا حاضر نہ ہونا اور لشکرِ اسلام کی پے در پے کامیابی نے قریش کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ بڑھتی ہوئی جنگی طاقت کے پیش نظر بنیادی طور پر اسلامی تحریک کی سرکوبی کی فکر کرنی چاہیے۔ اس وجہ سے قریش خود اس بات کی فکر میں تھے کہ وہ ایک عظیم لشکر فراہم کریں اور اب بہترین موقع آن پہنچا تھا اس لیے کہ یہودیوں نے اعلان کر دیا تھا کہ ہم تمھارے ساتھ رہیں گے۔ یہاں تک کہ محمدؐ کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں گے۔ اس وجہ سے قریش کے سرداروں کے ساتھ کعبہ میں گئے اور وہاں انھوں نے قسم کھائی کہ ایک دوسرے کو بے سہارا نہیں چھوڑیں گے اور پیغمبرؐ خدا سے مقابلے کے لیے آخری فرد کی زندگی تک ایک دل اور ایک زبان ہو کر ڈٹے رہیں گے۔ قریش نے یہودیوں کے سربرآوردہ افراد سے پوچھا کہ تم قدیم کتاب کے جاننے والے اور عالمِ دین ہو، تم فیصلہ کرو کہ ہمارا دین بہتر ہے یا محمدؐ کا؟ یہودیوں کے نیرنگ باز سرداروں نے جواب دیا کہ تمھارا دین بہتر ہے اور تم حق پر ہو۔

یہ یہودی توحید پر اپنے ایمان کے باوجود ایسی بات کہہ کر سخت گناہ کے مرتکب ہوئے اور انھوں نے اپنی سیاہ تاریخ میں ننگ و عار والے ایک بہت بڑے دھبے کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح کہ ایک یہودی مصنف ڈاکٹر اسرائیل اپنی کتاب ''تاریخ عربستان'' میں لکھتا ہے کہ ہرگز یہ بات مناسب نہیں تھی کہ یہودی ایسی خطا کے مرتکب ہوتے اور قریش ان کی خواہش کو رد کر دیتے۔ اس کے علاوہ ہرگز یہ بات صحیح نہیں تھی کہ ملت یہود بت پرستی کے پاس پناہ لیتی اس لیے کہ یہ روش توریت کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ (حیات محمد ڈاکٹر ہیکل: ص ۲۹۷)

قرآن اس اتحاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جن کو کتاب سے کچھ حصہ دیا گیا ہے۔ وہ کس طرح بتوں اور طاغوت پر ایمان لاتے ہیں اور کافرین و مشرکین سے کہتے ہیں کہ تمھارا راستہ مومنین کی بہ نسبت حقیقت سے زیادہ نزدیک ہے۔

یہودی سرداروں سے مشرکین مدد کا وعدہ کر لینے اور روانگی کی تاریخ معین کر لینے کے بعد یہودیوں نے بھی ان سے وعدہ کیا کہ بنی قریظہ کے یہودیوں کو جو اس وقت ساکن تھے،

مدد کے لیے بلائیں گے اور لوگوں کو پیمان شکنی اور جنگ پر آمادہ کرنے کے بعد وہ لوگ قبیلہ غطفان کی طرف روانہ ہوئے۔ قبیلہ غطفان کے افراد نے ان کی ہمراہی کے علاوہ اپنے ہم عہد بنی سلیم کو مدد کے لیے بلایا۔ (تاریخ طبری: ج ۲، ص ۵۶۶)

یہودیوں کی تحریک پر، تحریک اسلامی کی مخالفت میں یہ بہت بڑا متحدہ محاذ تیار ہو گیا اور مختلف جماعتوں اور گروہوں کے لوگ، چاہے وہ مشرکین ہوں، مستکبرین ہوں، یہود و منافقین ہوں، مدینہ سے فرار کرنے والے ہوں۔ قریش کے مختلف قبائل کے افراد ہوں یا بنی سلیم بنی غطفان، بنی اسد، سب نے آپس میں مل کر اسلام کے خلاف جنگ لڑنے کو تدارک کا راستہ سمجھا تاکہ نورِ خدا کو خاموش کر دیں، جنگی اخراجات اور لازمی اسلحہ کی فراہمی یہود کی طرف سے تھی۔

لشکرِ اَحزاب کی مدینہ کی طرف روانگی

مختلف قبیلوں اور گروہوں سے اس جنگی عہدو پیمان میں شرکت کرنے والے افراد کی مجموعی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی اور لشکر کی کمان ابوسفیان کے ہاتھوں میں تھی۔ مختلف گروہوں کے جنگ جو افراد اسلحہ سے لیس روانگی کے لیے تیار تھے۔ اس زمانے کے جنگی ایمونیشن اور ساز و سامان سے لیس اتنا بڑا لشکر سرزمینِ حجاز نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ماہِ شوال سنہ پانچ ہجری میں ابوسفیان نے اَحزاب کے سپاہیوں کو تین الگ الگ دستوں میں یثرب کی جانب روانہ کیا۔

لشکر کی روانگی سے رسولِ خدا کی آگاہی

جب یہ لشکر مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوا تو قبیلہ خزاعہ کے چند سوار نہایت سرعت کے ساتھ پیغمبرؐ خدا کے پاس پہنچے اور سپاہِ اَحزاب کی روانگی کی خبر دی۔ رسولِ خدا نے آمادگی اور لشکر کی جمع آوری کے اعلان کے ساتھ جنگی ٹیکنیک اور دفاعی طریقہ کار کے تعین کے لیے اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا۔ اس جنگی مشورہ میں یہ بات پیش ہوئی کہ مدینہ سے باہر نکل کر ان سے جنگ کی جائے یا مدینہ کے اندر موجود رہیں اور شہر کو ایک طرح سے محصور بنا دیں؟

سلمان فارسیؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! جب ہم ایران میں تھے تو اس وقت اگر دشمن کے شہ سواروں کے حملے کا خطرہ ہوتا تھا تو ہم شہر کے چاروں طرف خندق کھود دیتے تھے۔

دفاع کے لیے جو مجلس مشاورت منعقد ہوئی تھی اس میں سلمانؓ کی رائے کو مان لیا گیا۔ رسولِ خدا نے سلمان فارسیؓ کے نقشے کے مطابق خندق کھودنے کا حکم دیا۔ (مغازی: ج ۲، ص ۴۴۴)

اس زمانے میں مدینہ تین طرف سے طبعی رکاوٹوں جیسے پہاڑوں، نخلستان کے جھنڈ اور نزدیک نزدیک بنے ہوئے گھروں سے گھرا ہوا تھا۔ صرف ایک طرف سے کھلا اور قابلِ نفوذ تھا۔

رسولِ خدا نے دس آدمیوں کو چالیس ہاتھ کے ایک قطعہ ارض کو کھودنے پر مامور کیا۔ جزیرۃ العرب کی گرم اور جھلسا دینے والی ہوا کے برخلاف مدینہ، صحرا کی طرح سرد اور تکلیف دہ ہے۔ جس دن خندق کی کھدائی ہو رہی تھی اس دن صبح سویرے جب آفتاب بھی نہیں نکلا تھا، جاڑے کی سخت سردی میں تین ہزار مسلمان، لبوں پر پُرشور نعرہ اور دلوں میں حرارتِ ایمانی کے جوش و ولولہ کے ساتھ کام میں مشغول ہو گئے اور غروبِ آفتاب تک کام کرتے رہے۔ رسولِ خدا بھی تمام مسلمانوں کے ساتھ کام میں مشغول تھے۔ پھاوڑے چلاتے مٹی کو زنبیل میں ڈال کر کاندھوں پر رکھ کر باہر لاتے تھے۔ سلمانؓ نہایت تیزی سے چند آدمیوں کے برابر کام کر رہے تھے۔ مہاجر و انصار ہر ایک نے کہا کہ سلمانؓ ہم میں سے ہیں لیکن رسولِ خدا نے فرمایا: سلمانؓ ہم اہلِ بیتؑ میں سے ہیں۔ (سیرتِ حلبی: ج ۳، ص ۳۱۲)

خندق کھودتے کھودتے سلمانؓ کے سامنے ایک بہت بڑا سفید پتھر آ گیا۔ خود انھوں نے اور دوسرے افراد نے بھی کافی کوشش کی مگر وہ پتھر اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ رسولِ خدا کو خبر ہوئی تو آپ خود تشریف لائے اور کلہاڑی سے اس پتھر پر ایک ضرب لگائی۔ اس ضرب کی وجہ سے ایک بجلی چمکی اور پتھر کا ایک حصہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔ پیغمبرؐ خدا نے صدائے تکبیر بلند کی۔ جب دوسری اور تیسری بار آپ نے کلہاڑی چلائی تو ہر ضرب سے بجلی چمکی اور پتھر کے ٹکڑے ہونے لگے۔ رسولِ خدا ہر بار صدائے تکبیر بلند کرتے رہے۔ جنابِ سلمانؓ نے سوال کیا کہ آپ بجلی چمکتے وقت تکبیر کیوں کہتے ہیں؟

رسولِ خدا نے فرمایا: جب پہلی بار بجلی چمکی تو یمن اور صنعاء کے محلوں کو میں نے کھلتے دیکھا۔ دوسری مرتبہ بجلی کے چمکنے میں شام و مغرب کے کاخہائے سرخ کو فتح ہوتے دیکھا اور جب تیسری بار بجلی چمکی تو میں نے دیکھا کہ کاخ ہائے کسریٰ میری اُمت کے ہاتھوں مسخر ہو جائیں گے۔

مومنین رسولؐ خدا کے کیے ہوئے وعدے سے خوش ہو گئے اور انھوں نے "بشارت بشارت" کی آواز بلند کی لیکن منافقین نے مذاق اڑایا اور کہا کہ حالت یہ ہے کہ دشمن ہر طرف سے ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور ہم میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ ہم اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے باہر نکل سکیں اور محمدؐ کاخ ہائے ایران و روم کی فتح کی گفتگو کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ باتیں فریب سے زیادہ نہیں ہیں (معاذ اللہ)۔ قرآن منافقین کے بارے میں کہتا ہے: منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری (نفاق) ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدے جو خدا اور اس کے رسولؐ کر رہے ہیں یہ دھوکہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ (تاریخ طبری: ج ۲، ص ۵۲۹)

منافقین خندق کھودنے میں مسلمانوں کی مدد کر رہے تھے مگر ان کی کوشش تھی کہ کسی بہانے سے اپنے کاندھوں کو اس بوجھ سے خالی کر لیں۔ اس طرح وہ اپنے نفاق کو آشکار کر رہے تھے۔

خندق کی کھدائی تمام ہوئی، اس کا طول بارہ ہزار ہاتھ، تقریباً چار پانچ کلومیٹر، گہرائی پانچ ہاتھ اور اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ ایک سوار گھوڑے کو جست دے کر پار نہیں کر سکتا تھا۔ آخر میں خندق کے بیچ میں کچھ دروازے بنا دیے گئے اور ہر دروازہ کی نگہبانی کے لیے ایک قبیلہ معین کر دیا گیا۔ زبیر بن عوام کو دروازے کے محافظین کی سرپرستی پر معین کیا گیا۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۵۰)

مسلمانوں نے بھی خندق کے پیچھے اپنے لیے محاذ بنا لیے اور شہر کے دفاع کے لیے تیرانداز مکمل آمادگی کے ساتھ موجود تھے۔

مدینہ لشکر کفار کے محاصرے میں

کفر کا حملہ آور لشکر ابوسفیان کی سرکردگی میں خندق کے چھے دن بعد سیلاب کی طرح مدینہ پہنچ گیا۔ انھوں نے شہر کے چاروں طرف اور اپنے آگے ایک بڑی خندق دیکھی تو مسلمانوں کی اس دفاعی ٹیکنیک پر ان کو تعجب ہوا۔ جنگی دیدہ وروں نے کہا: یہ فوجی ٹیکنیک محمدؐ نے ایرانیوں سے سیکھی ہے اس لیے کہ عرب اس ڈھنگ سے واقف نہیں ہیں۔ ان لوگوں نے مجبوراً اپنے خیمے خندق کے سامنے لگا لیے۔ دشمن کے لشکر کے خیموں سے سارا بیابان سیاہ ہو گیا۔ لشکرِ اسلام نے بھی خندق کے اس طرح خیمے لگا لیے اور دشمن سے مقابلے اور ان کے حملے سے بچنے کے لیے تیار ہو گئے۔

بنی قریظہ کی عہد شکنی

لشکرِ اُحزاب اور اس کے کمانڈر ابوسفیان جن کے سروں میں مسلمانوں پر برق رفتاری سے کامیابی حاصل کرنے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ خندق جیسی بڑی رکاوٹ کے سامنے آجانے سے اب راستہ کی تلاش میں لگ گئے تاکہ لشکر کو خندق کے پار پہنچا سکیں۔

حی بن اخطب یہودی جو قبیلۂ بنی نضیر کا شہر بدر کیا ہوا سردار اور جنگ کی آگ بھڑکانے کا اصلی ذمہ دار تھا۔ خندق کی موجودگی سے سپاہِ اُحزاب کا حملہ ناکام ہوتے دیکھ کر سب سے زیادہ خوف زدہ تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ جلد سے جلد اُحزاب کی کامیابی کا کوئی راستہ مل جائے۔ اس نے مدینہ کے اندر سے محاذ کھولنے کا ارادہ کیا۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بنی قریظہ کے وہ یہودی جو مدینہ میں مقیم تھے، بہترین وسیلہ تھے۔ اس نے رئیس قبیلہ سے گفتگو کرنے کا ارادہ کیا۔ قلعہ بنی قریظہ کی طرف گیا اور قلعہ کے بند دروازوں کے پیچھے سے گفتگو کی، لیکن قبیلہ بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد نے جواب دیا کہ ہم نے محمدؐ سے عہد و پیمان کیا ہے اور ہم یہ معاہدہ نہیں توڑ سکتے اس لیے کہ سوائے سچائی اور وفاداری کے ان سے ہم نے اور کچھ نہیں دیکھا ہے۔

حی، کعب کے احساسات کو بھڑکانے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے اپنے لیے قلعہ کا دروازہ کھلوا لیا۔ قلعہ میں داخل ہوا اور بنی قریظہ کے بزرگ افراد کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ رسولِ خدا سے کیے ہوئے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیں اور اپنی فوجیں نیز دوسرے سامان حملہ آوروں کو دے دیں۔

رسولِ خدا ﷺ کو جب بنی قریظہ کے یہودیوں کی پیمان شکنی کی خبر ملی تو آپ نے قبیلۂ اوس و خزرج کے دو بزرگ افراد سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کو مزید تحقیقات کے لیے قلعہ بنی قریظہ روانہ کیا۔ وہ لوگ اس بات پر مامور تھے کہ اگر یہ رپورٹ صحیح ہو تو خفیہ طور پر اس نتیجے کی اطلاع رسولِ خدا کو دیں۔ انھوں نے واپسی پر خفیہ کوڈ (عضل) و (قارہ) کے الفاظ کے ساتھ یہودیوں کی پیمان شکنی کی خبر آنحضرت ﷺ کو دی۔ (مغازی: ج ۲، ص ۴۵۴)

اضطراری حالت

اسلامی تحریک ایک حساس موڑ پر تھی۔ ایک طرف دس ہزار دشمن کی فوج اسلحوں سے لیس

شہر کے سامنے خیمہ زن اور ہر لحظہ اس بات کا امکان کہ خندق کو پار کر کے دشمن کہیں شہر میں کشت و خون کا بازار نہ گرم کردے اور دوسری طرف قبیلۂ بنی قریظہ کے خائن یہودی پیمان شکنی کر کے مسلمانوں کی پیٹھ میں پیچھے سے خنجر گھونپنے کے لیے آمادہ، نتیجے مسلمان بچوں اور عورتوں پر شہر میں یہودیوں کے حملے کا اندیشہ، کفار کے لشکر کا خندق عبور کر لینے کے خطرے سے زیادہ تھا۔

اس ہنگامے میں منافقین شیطانی قہقہوں، طعنوں اور اشارے وکنایے سے مسلمانوں کے زخم پر نمک پاشی، لوگوں کو دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی تشویق، اپنے گھروں کے دفاع کا سامان نہ ہونے کا بہانہ بنا کر فرار کا قصد اور اپنی دفاعی جگہوں کو چھوڑ دینے کا ارادہ کر رہے تھے۔

قرآن اس سلسلے میں کہتا ہے:

"جب ایک گروہ (منافقین اور سیاہ قلب افراد) نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! اب سرزمینِ یثرب تمھارے رہنے کی جگہ نہیں، لہٰذا پلٹ جاؤ اور ان میں سے ایک گروہ رسولؐ خدا سے اجازت مانگ رہا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے گھر کھلے ہوئے ہیں، دفاع کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان کا ارادہ ومقصد فرار کے سوا اور کچھ نہیں"۔ (احزاب: ۱۳)

لیکن خدا و رسولؐ پر ایمان رکھنے والے جاں باز نہ صرف یہ کہ ایسے طوفانوں سے لرزاں نہیں ہوئے بلکہ اور زیادہ مستحکم ہو گئے۔ قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے:

"جب مسلمانوں نے احزاب کے لشکر کو دیکھا تو کہا کہ یہ وہی ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کیا ہے اور اس واقعہ نے ان کے ایمان وتسلیم کو بڑھانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا"۔

اس حساس موقع پر رسولِ خدا ﷺ مسلسل اپنی شعلہ بار تقریروں سے اسلام کے جاں بازوں کے حوصلے بڑھاتے رہے۔ ان کے فرائض کو انھیں یاد دلاتے رہے اور فرماتے تھے: اگر تم صبر سے کام لوگے اور خدا پر بھروسہ کروگے تو کامیاب رہوگے اور ان لوگوں کو خدا اور اس کے پیغمبرؐ خدا کی فرماں برداری کی طرف توجہ دلاتے رہے۔

ایسی حالت میں جاں بازانِ اسلام اپنے محاذ کی نگہبانی اور تحفظ کی خاطر خندق کے اس طرف بنی قریظہ کے شب خون مارنے کے خطرے کو ناکام بنانے کے لیے پانچ سو جان بازوں کا

ایک گشتی دستہ لے کر پوری تیاری کے ساتھ گشت لگاتے رہے اور راتوں کو اپنے نعرۂ تکبیر سے دشمن کے دلوں میں خوف و ہراس ڈالتے رہے۔ اس طرح غفلت کے عالم میں دشمن کو حملہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا اور مدینہ سے حملے کا خطرہ ٹل گیا۔

ایمان و کفر کا آمنا سامنا

خندق کے اس پار لشکرِ احزاب بہت دنوں تک یوں ہی پڑا رہا لیکن نہ پیادوں میں سے کوئی خندق عبور کر سکا اور نہ سواروں میں سے۔ آخرکار لشکرِ شرک میں سے پانچ آدمی، عمرو بن عبدود، عکرمہ بن ابی جہل، ہبیرہ بن ابی وہب، نوفل بن عبداللہ، ضرار بن خطاب، جنگی لباس پہننے کے بعد یہ لوگ مخصوص غرور و تکبر کے ساتھ اپنے اتحادیوں کے خیمے کے کنارے سے گزرے اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج پتا چل جائے کہ حقیقی بہادر کون ہے؟

اس کے بعد انھوں نے ایڑ لگا کر اپنے گھوڑوں کو اس حصے کی طرف اڑایا جو خندق کا کم چوڑا حصہ تھا۔ جانبازوں کا دفاع ان کو نہ روک سکا۔ عمرو بن عبدود نے بلند آواز سے مبارز طلبی کی اور مذاق اڑانے والے لہجے میں بولا: اے بہشت کے دعویدارو! کہاں ہو؟ کیا کوئی ہے کہ جسے میں بہشت کو روانہ کر دوں یا وہ مجھے جہنم بھیج دے؟ وہ اپنی بات کی تکرار کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے کہا: میں نے اتنی آواز دی کہ تھک گیا اور میری آواز میں گرفتگی آ گئی ہے۔

اس موقع پر پیغمبرؐ خدا نے مسلمانوں کی طرف رُخ کیا اور فرمایا: کیا کوئی ہے جو اس کے شر کو ہمارے سروں سے دُور کرے؟ حضرت علی علیہ السلام نے آمادگی کا اعلان کیا۔ رسولؐ خدا نے ان کو اجازت نہ دی اور اپنی بات پھر آپؐ نے دُہرائی۔ مجاہدینِ اسلام کے درمیان سکوت کی حکمرانی تھی۔ کسی کے اندر بھی قریش کے بڑے پہلوان سے مقابلے کی جرأت نہ تھی۔ تیسری بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا اور اس موقع پر بھی علیؑ ہی تھے جنھوں نے آمادگی کا اعلان کیا۔

نتیجے میں پیغمبرؐ خدا نے حضرت علی علیہ السلام کو اجازت دے دی اور اپنا عمامہ ان کے سر پر رکھا، اپنی تلوار ان کو عطا کی۔ جب حضرت علی علیہ السلام قریش کے اس بہادر سے لڑنے کے لیے چلے تو رسولؐ خدا نے فرمایا:

بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّهٗ اِلَی الْکُلِّ کُفْر

"اب کُلِ ایمان کُلِ شرک کے مقابل ہے"۔

اس زمانے کے آئین رزم کے مطابق اسلام و شرک کے دونوں بہادروں نے رجز خوانی کی۔ اس کے بعد تلوار نیام سے باہر نکال کر حملہ آور ہو گئے۔ جنگ کے وقت میدان میں اتنی گرد اڑ رہی تھی کہ دونوں میں سے کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام کے نعرۂ تکبیر کی آواز گونجی۔ پیغمبر خدا نے فرمایا: خدا کی قسم! حضرت علی علیہ السلام نے اس کو قتل کر دیا۔

واقعہ اس قدر برق آسا اور حیرت انگیز تھا کہ عمرو کے ساتھی اس کے قتل کو دیکھنے کے بعد فوراً فرار کر گئے۔ نوفل بن عبداللہ خندق کو پار کرنے کے لیے کودتے وقت اس میں گر پڑا اور جان بازان اسلام نے اس پر سنگ باری کر دی۔ وہ چلانے لگا کہ عرب کا قتل جواں مردی کے ساتھ ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نہایت سُرعت سے خندق میں کود پڑے اور اس کو بھی قتل کر ڈالا۔

خندق کے دن حضرت علی علیہ السلام کی ضربت آئین اسلام کے استقرار کا سبب بنی۔ اس لیے کہ اگر حضرت علی علیہ السلام عمرو بن عبدود کو قتل نہ کر دیتے تو لشکر اَحزاب کی مسلمانوں کے سلسلے میں جرأت بڑھ جاتی اور ان میں سے دوسرے افراد بھی خندق کو پار کر کے حیاتِ اسلام کا خاتمہ کر دیتے۔

رسولِ خدا نے اس ضربت کی فضیلت میں فرمایا: روز خندق حضرت علی علیہ السلام کی ضربت تمام جن و انس کی عبادت سے افضل ہے۔ (مستدرک حاکم: ج ۳، ص ۳۲)

اس کے دوسرے دن خالد بن ولید نے شکست کے جبران کے لیے خندق کے کم چوڑے حصے کی طرف سے اپنے شہ سواروں کے دستہ کو خندق عبور کرانا چاہا لیکن مجاہدینِ اسلام کے مردانہ وار دفاع نے جو غروب تک جاری رہا، دشمن کے ہر طرح کے ابتکار عمل کی قوت کو سلب کر لیا۔

دشمن کی صفوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش

ایک طرف دشمن کے حوصلے بہت زیادہ کمزور ہو چکے تھے اور دوسری طرف مسلمان بھی بہت زیادہ دباؤ محسوس کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں رسولِ خدا نے کوشش کی تھی کہ دشمن کی صفوں میں اختلاف پیدا ہو جائے اور اَحزاب کے فوجی اتحاد کا شیرازہ بکھر جائے۔ اس غرض سے آپؐ نے قبائل غطفان کے سربرآوردہ افراد کے پاس پیغام بھیجا کہ کیا تم لوگ اس کام کے لیے تیار ہو کہ مدینہ کے خرمہ کا تیسرا حصہ میں تم کو دے دوں اور تم اپنے خاندان کی طرف پلٹ جاؤ اور

دوسرے قبیلوں میں بھی اس بات کی تبلیغ کرو کہ وہ جنگ سے دست بردار ہو جائیں؟ ان لوگوں نے مصلحت کے لیے نصف خرمہ کا مطالبہ کیا اور پیغمبرؐ خدا کے پاس مذاکرہ کے لیے حاضر ہو گئے۔ رسولؐ خدا نے کاغذ، قلم اور دوات لانے کا حکم دیا تا کہ ۱/۳ کی قرارداد لکھی جائے۔

اس وقت مدینہ کے سربرآوردہ افراد سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ آ گئے۔ انھوں نے کہا: یا رسولؐ اللہ! یہ حکم خدا کی طرف سے ہے یا آپؐ کا ذاتی نظریہ ہے، ہم اس کے فرمانبردار ہیں لیکن گر آپؐ ہمارا نظریہ جاننا چاہتے ہیں تو ہم ان کو باج (ٹیکس) نہیں دیں گے۔ جاہلیت کے زمانے میں جب ہم مشرک تھے تو اس وقت خریدنے یا مہمان بننے کے علاوہ ہمارا خرما ان تک نہیں پہنچا تھا۔ اب جب ہم اسلام سے سرفراز ہیں تو کیا ان کو ٹیکس ادا کریں۔ ہمارے اور ان کے درمیان تلوار کو فیصلہ کرنا چاہیے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۲۳۴)

غطفان کے قبیلہ کے سربرآوردہ افراد جب خالی ہاتھ واپس جا رہے تھے اس وقت وہ اپنے آپ سے باتیں کرتے جا رہے تھے کہ ان لوگوں نے جنگ جاری رکھنے کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی اختیار نہیں کیا اور آخری فرد تک اپنے ہدف کے دفاع کے لیے تیار رہے اور ایک ہم ہیں کہ اس سخت سردی اور خشک بیابان میں اپنے اُونٹ اور گھوڑوں کو فنا کر رہے ہیں۔

بنی قریظہ اور مشرکین کے درمیان پھوٹ

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین کے ان قبائل کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو آپؐ کے ساتھ جنگ لڑنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے تا کہ بنی قریظہ کے یہودیوں کے مشرکین سے تعلقات بگڑ جائیں اور آپس میں ایک دوسرے کو بدظن کر کے ان کے فوجی اتحاد میں تزلزل پیدا کر دیں۔ اسی وقت ایک مناسب موقع بھی ہاتھ آ گیا۔ دشمن کے محاذ کا ایک آدمی جس کا نام نعیم بن مسعود تھا مسلمان ہو گیا۔ وہ ایک طرف تو بنی قریظہ کے یہودیوں سے اچھے تعلقات رکھتا تھا اور دوسری طرف مشرکین کے لیے مکمل طور پر قابلِ اطمینان تھا۔ وہ جس کے دل میں نورِ ایمان جگمگا رہا تھا، رات کے اندھیرے میں اپنے خیمہ سے باہر نکلا اور پیغمبرؐ خدا کے خیمہ میں پہنچ گیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن میرے قبیلہ والے میرے مسلمان ہونے سے بے خبر ہیں۔ آپؐ جو حکم فرمائیں میں اس کی تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔

رسولِ خدا نے اس سے فرمایا: جہاں تک ہو سکے جنگ میں دشمن کے ارادے کو کمزور بنا دو، ان کو پراگندہ کردو اس لیے کہ جنگ ایک فریب ہے۔

نعیم بن مسعود محلہ بنی قریظہ میں پہنچا۔ یہ ان لوگوں کا ندیم رہ چکا تھا اور کہا کہ اے بنی قریظہ! تم اپنے ساتھ میری دوستی اور یک رنگی سے واقف ہو۔ ان لوگوں نے کہا: ہم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں اور تمھارے بارے میں بدگمان نہیں ہیں۔

نعیم نے کہا: جو بات میں تم سے کہنے جارہا ہوں اس کی شرط یہ ہے کہ تم میرے راز کو چھپا کر رکھو گے اور وہ یہ کہ جنگ دشوار طلب ہے اور قریش وغطفان جنگ میں سست پڑ رہے ہیں۔ عمر بن عبدود ان کا پہلوان مارا گیا اور قبیلۂ غطفان کے لوگ محمدؐ سے خفیہ طور پر یہ ساز باز کر رہے ہیں کہ وہ مدینہ کے خرما کا آدھا محصول لے لیں اور اپنی راہ لیں۔ ایسی صورت میں اگر قریش وغطفان کو موقع ملا تو ممکن ہے فتح یاب ہو جائیں اور اگر ہار گئے تو اپنا بوریہ بستر لے کر اپنے وطن چلے جائیں گے۔ اس صورت میں تم ایسا کام نہیں کر سکتے۔ تمھارے بال بچے، گھربار، کھیتی باڑی اور تمھارے نخلستان یہاں ہیں۔ قریش وغطفان کی شکست کی صورت میں محمدؐ تم سب کا محاصرہ کرلیں گے اور تمھاری امانتیں تم کو نہیں دیں گے۔ اس لیے تم قریش وغطفان کو ساتھ لے کر جنگ نہ کرو مگر یہ کہ ان کے سربرآوردہ افراد کو یرغمال بنا کر اپنے پاس رکھ لو۔ اس طرح ان کو محمدؐ کے ساتھ معاہدۂ صلح کرنے کے لیے نہ چھوڑ دو تا کہ وہ تم کو بے سہارا چھوڑ کر اپنے کام میں لگ جائیں۔

بنی قریظہ کے یہودیوں نے کہا کہ تم ہم کو بہت پُرخلوص مشورہ دے رہے ہو، ہم تمھارا شکریہ ادا کرتے ہیں اور تمھارے نظریے کو عملی جامہ پہنائیں گے۔

نعیم وہاں سے ابوسفیان اور قریش وغطفان کے دوسرے برسرآوردہ افراد کے پاس آیا اور کہا: ایک بات میں نے سنی ہے جو ازراہِ خیرخواہی تمھیں بتانا چاہتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ اس راز کو چھپا کر رکھنا۔

ان لوگوں نے کہا: بہت خوب، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟

نعیم نے کہا: بنی قریظہ محمدؐ کے ساتھ اپنی پیمان شکنی پر پشیمان ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو بھول ان سے ہوئی ہے اس کا جبران کرلیں۔ انھوں نے محمدؐ کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہم قریش وغطفان کے ستر سرکردہ افراد کو پکڑ کر آپ کے حوالے کر دیں گے تا کہ آپ ان کو قتل کر دیں۔ اس کے بعد جنگ

کے خاتمے تک باقی افراد کو ختم کرنے کے لیے ہم لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔

انھوں نے بھی یہ پیش کش قبول کرلی ہے اب ہوشیار رہنا۔ اگر یہود تم سے ضمانت کے طور پر کچھ افراد مانگیں تو ایک آدمی بھی ان کے حوالے نہ کرنا۔

ایک طرف احزاب کے سرکردہ افراد نے جو ٹھنڈی راتوں اور یثرب کے بے آب و گیاہ بیابان میں اپنی طاقتوں کو ضائع کر رہے تھے، بنی قریظہ کی طرف اپنے نمائندے بھیجے اور ان سے کہلوایا کہ ہم تمھاری طرح اپنے گھر میں نہیں ہیں۔ ہمارے چوپائے دانہ اور گھاس کی کمی کی بنا پر تلف ہوئے جا رہے ہیں، لہٰذا جنگ کے لیے نکلنے میں جلد سے جلد ہمارے ساتھ تعاون کا اعلان کرو تاکہ مل جل کر مدینہ پر حملہ کر دیں اور اس جنگ سے چھٹکارا مل جائے۔

یہودیوں نے جواب دیا: پہلی بات تو یہ ہے کہ آج شنبہ ہے اور ہم ایسے دن میں کسی کام میں ہاتھ نہیں لگاتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم تمھارے ساتھ مل کر جنگ نہیں کریں گے۔ لیکن ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ تم اپنے اشراف میں سے کسی کو ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اطمینان کے ساتھ محمدؐ کے ساتھ جنگ کریں۔ اس لیے کہ ہمیں ڈر ہے کہ اگر تم جنگ سے عاجز آجاؤ گے تو تم محمدؐ کے ساتھ سازباز کرلو گے اور ہم کو بے سہارا چھوڑ دو گے۔ ہم تنہا ان سے جنگ کی طاقت نہیں رکھتے اس طرح کہیں کے نہ رہ جائیں گے۔

جب قریش اور غطفان کے نمائندے واپس آئے اور مذاکرات کے نتیجے سے آگاہ کیا تو ان لوگوں نے کہا: بخدا نعیم ابن مسعود نے سچ کہا تھا۔ لہٰذا انھوں نے پھر سے پیغام بھیجا کہ ہم ایک آدمی کو بھی تمھارے حوالہ نہیں کریں گے اگر تم واقعی اہلِ نبرد ہو تو آؤ محمد سے جنگ میں ہماری مدد کرو۔

بنی قریظہ نے بھی اس پیغام کو سننے کے بعد ان کے بارے میں شک کیا اور کہا کہ نعیم سچ کہہ رہا تھا۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہم کو محمدؐ کے ساتھ اُلجھا دیں اور خود اگر موقع مل جائے تو اس سے فائدہ حاصل کریں ورنہ ہم کو بے سہارا چھوڑ دیں اور اپنے شہر کی طرف واپس پلٹ جائیں۔ پھر ایسی صورت میں محمدؐ سے مقابلے کی سکت ہم میں نہیں ہے۔ بنی قریظہ کے یہودیوں نے قریش اور غطفان کے سرداروں کو پھر سے پیغام دیا کہ جب تک ہم کو کچھ لوگ ضمانت کے طور پر نہ دو گے اس وقت تک ہم تمھارے ساتھ مل کر محمدؐ سے جنگ نہیں کریں گے۔

دشمن کے درمیان تفرقہ پھیل گیا۔ دل خوف و ہراس سے لبریز ہو گئے۔ ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی میں مبتلا ہو گیا اور جنگ جاری رکھنے کی تردید شروع ہو گئی۔ اس طرح خدا نے ان لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد سے باز رکھا۔ جاڑے کی اس سرد رات میں خدائی مدد لشکرِ توحید کو مل گئی اور خدا کے اِذن سے بہت تیز ہوائیں چلیں اور دشمنوں کے خیموں کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ آگ بجھا دی، ان کی دیگ اُلٹ گئی اور شدید گرد و غبار نے فضا کو تاریک بنا دیا۔ (طبری: ج ۲، ص ۵۷۸)

دشمن کے درمیان لشکرِ اسلام کا سپاہی

مختلف اَحزاب کے سرداروں کے درمیان جو اختلاف ہو گیا تھا اس کی اطلاع ملنے کے بعد اسی سردی اور طوفان کے عالم میں رسولؐ خدا نے جنابِ حذیفہؓ بن یمان کو معین فرمایا کہ وہ دشمن کے درمیان جا کر ان کے حالات کی اطلاع حاصل کریں۔

جنابِ حذیفہ فرماتے ہیں کہ میں نکلا اور رات کی تاریکی میں دشمن کے خیموں میں وارد ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ شدید گرد و غبار اُڑ رہا ہے اور خدا کے لشکر یعنی (ہوا) نے نہ کوئی دیگ چھوڑی ہے اور نہ کوئی خیمہ باقی رکھا ہے اور نہ آگ جل رہی ہے۔ میں اَحزاب کے سربرآوردہ افراد کے درمیان پہنچا اور وہیں بیٹھ گیا۔ ابوسفیان کھڑا ہوا اور اس نے کہا: ہر آدمی اس بات سے ہوشیار رہے کہ اس کے پہلو میں جو بیٹھا ہے وہ کون ہے؟ حذیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے فوراً اس آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا جو میرے پاس بیٹھا تھا اور میں نے اس سے پوچھا کہ تُو کون ہے؟ اس نے کہا: میں معاویہ ابن ابی سفیان ہوں۔ جو آدمی میرے بائیں جانب بیٹھا تھا میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے پوچھا کہ تُو کون ہے؟ اس نے کہا: میں عمرو بن عاص ہوں۔

پھر ابوسفیان نے کہا کہ ہم اس سے زیادہ پائیداری کا مظاہرہ نہیں کر سکتے کہ اس شدید سردی میں یہاں ٹھہریں۔ ہماری سواریاں ہمارے گھوڑے کمزور ہو گئے اور ہمارے آدمی بیمار پڑ گئے۔ دوسری طرف یہودیوں نے ہمارے ساتھ خیانت کی اور محمدؐ کے ساتھ سازباز کر لی ہے۔ شدید طوفانوں کو دیکھو کہ جس نے ہمارے لیے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا۔ یہ طوفان، ہماری آگ کو بجھا رہا ہے۔ ہمارے خیموں کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس بات کا خوف ہے کہ کہیں خود سپاہیوں

میں داخلی جنگ نہ چھڑ جائے۔ اس بنا پر ہم کو اپنا اثاثہ باندھ کر مکہ پلٹ جانا چاہیے۔

ابھی سپیدۂ سحری نمایاں نہیں ہوا تھا کہ دس ہزار کے لشکر نے نہایت ذلت کے ساتھ فرار کو ثابت قدم رہنے پر ترجیح دی اور مکہ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس طرح خدا نے مسلمانوں کی قسمت میں نصرت اور دشمنوں کے نصیب میں بکھرنا اور شکست اٹھانا قرار دیا۔

۲۳ ذی القعدہ چہارشنبہ کی صبح کو پیغمبرؐ خدا اور لشکرِ اسلام کے سامنے کفار کی فوج میں سے کوئی بھی باقی نہ تھا۔ سب بھاگ چکے تھے۔ پیغمبرؐ خدا نے اجازت دے دی کہ مسلمان محاذ کو چھوڑ دیں اور شہر کی طرف لوٹ چلیں۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۲۴۲)

شہدائے اسلام اور کشتگانِ کفر

اس جنگ میں آپس کے ٹکراؤ اور تیر اندازی کے نتیجے میں لشکرِ اسلام کے چھے آدمی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان میں سے ایک سعدؓ بن معاذ تھے جن کے ہاتھ کی نس کو ایک تیر نے کاٹ ڈالا تھا۔ وہ بنی قریظہ والے واقعہ تک زندہ تھے۔ چند روز بعد شہید ہو گئے۔ مشرکین احزاب میں سے بھی تین افراد قتل ہوئے جن میں سے دو کی ہلاکت حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی۔

جنگ احزاب کے بارے میں سورۂ احزاب ۹ سے ۲۵ تک کی آیتیں نازل ہوئیں۔

سپاہِ احزاب کی شکست کے اسباب

① لشکرِ اسلام کا خندق کھودنا۔

② احزاب کے بہادر اور شجاع پہلوان عمرو بن عبدود کا قتل جس نے کفار کے حوصلوں پر بڑا اثر ڈالا۔

③ لشکرِ اسلام کا ثبات قدم اور پائیداری اور اپنے محاذ کی باقاعدہ نگہبانی اور شہر مدینہ کی مکمل حفاظت۔

④ محاصرہ کرنے والوں کے لشکر اور چوپایوں کے لیے آذوقہ (گھاس اور خوراک) کی کمی۔

⑤ موسم کا ناسازگار ہونا اور جاڑوں کی شدید سردی میں حملے ہونے جو اہلِ مکہ کے لیے ناسازگار تھا۔

۶ دشمن کے جنگی اتحاد شیرازہ کا منتشر ہو جانا جو لشکرِ اسلام کے کمانڈر حضرت رسولؐ خدا کی فراست (دانائی و عقل مندی) کا نتیجہ تھا۔

۷ غیبی امداد: قرآن اس سلسلے میں کہتا ہے: "اے مومنو! تم پر جو خدا کی نعمتیں تھیں تم ان کو یاد کرو اس وقت جب تمھارے ساتھ جنگ کے لیے لشکر آیا ہوا تھا تو میں نے ہوا کو بھیجا اور اس لشکر کو جس کو تم نہیں دیکھتے تھے اور تم جو کچھ کرتے ہو، خدا اس سے آگاہ ہے"۔
(سورۂ احزاب: آیت ۹)

جنگ احزاب کا خاتمہ، قریش کے لیے مصیبتوں کا آغاز تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو قریش اور مشرکین میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کی طاقت نہیں رہ گئی تھی اور دیہاتی اعراب کے درمیان ان کی حیثیت بہت گر گئی تھی اور دوسری طرف جزیرۃ العرب میں تحریک اسلامی کی حالت روز بروز مستحکم و مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بعد ابتکار عمل لشکرِ اسلام کے ہاتھوں میں تھا۔ رسولؐ خدا نے فرمایا کہ اس کے بعد ان (قریش) سے ہم جنگ کریں گے۔ یہ لوگ جنگ کی ابتدا نہیں کر سکتے۔

جنگ احزاب کے بعد قریش کے اقتصادیات بہت زیادہ کمزور ہو گئے تھے جبکہ حکومت اسلامی اقتصادی اعتبار سے مضبوط ہو گئی تھی۔ چنانچہ رسولؐ خدا نے مکہ کے قحط زدہ افراد کے لیے مالی امداد روانہ فرمائی۔

غزوۂ بنی قریظہ

چہارشنبہ ۲۳ ذی القعدہ پانچ ہجری کو احزاب کا شکست خوردہ لشکر مایوسی کے عالم میں مدینہ سے بھاگ گیا۔ خندق کھودنے اور بیرونی دشمنوں سے مقابلہ کرنے میں ہفتوں کی مسلسل اور ان تھک کوشش کے بعد مسلمان اپنے گھروں کو لوٹے تاکہ آرام کریں۔ لیکن مدینہ میں ابھی پورے طریقے سے اطمینان برقرار نہیں ہونے پایا تھا کہ رسولؐ خدا نے وحی کے ذریعے اطلاع ملنے کے بعد بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو جمع کرنے کے لیے اس طرح عام اعلان کریں کہ جو خدا اور رسولؐ کا پیرو ہے وہ نمازِ عصر قلعہ بنی قریظہ کے پاس پڑھے۔

اسی دن عصر کے وقت رسولؐ خدا تین ہزار جاں بازوں کے ساتھ بنی قریظہ کے قلعہ کی

طرف چل پڑے۔ لشکرِ اسلام کے آگے آگے مجاہدینِ اسلام کے علَم کو اُٹھائے ہوئے حضرت علی علیہ السلام چل رہے تھے۔ چنانچہ آپ بقیہ مسلمانوں کے پہنچنے سے پہلے ہی چند افراد کے ساتھ قلعہ کے پاس پہنچ گئے۔

لشکرِ اسلام نے قلعہ بنی قریظہ کا محاصرہ کرلیا۔ محاصرہ ۱۵ روز تک رہا۔ اس مدت میں چند بار تیر اندازی کے علاوہ کوئی حملہ نہیں ہوا۔ بنی قریظہ کے یہودی سمجھ گئے کہ لشکرِ اسلام سے مقابلہ کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ لہٰذا اپنے نمائندے کو رسولِ خدا کے پاس بھیجا اور رسولِ خدا سے اس جگہ سے کوچ کرنے اور اپنے مال و اسباب کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ رسولِ خدا نے ان کی پیشکش کو رد کر دیا۔ انھوں نے دوبارہ درخواست کی کہ ان کو مدینہ ترک کرنے اور اپنے اَموال سے صرفِ نظر کرنے کی اجازت دی جائے لیکن رسولِ خدا جانتے تھے کہ اگر بنی قریظہ کے یہودیوں کو بھی بنی قینقاع اور بنی نضیر کے یہودیوں کی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ مسلمانوں کے چنگل سے نکلتے ہی دیہاتی اعراب کو بھڑکا کر مسلمان اور اسلام کے خلاف نئی سازشوں کا آغاز کردیں گے۔ جس طرح بنی قینقاع کی تحریک پر جنگِ اُحد کی آگ بھڑکی اور بنی نضیر کی تحریک پر خندق (اَحزاب) کی ہمہ جانبہ سازش ہوئی۔ اس وجہ سے پیغمبرِ خدا نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ تم بغیر کسی قید و شرط کے اپنے کو ہمارے حوالے کردو۔ (طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۷۴)

ایک مسلمان خیانت کرتا ہے

ایک طرف تو یہودی محاصرے کی وجہ سے تنگ آچکے تھے اور دوسری طرف ان کے دل میں خوف و وحشت بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے دیرینہ دوست اور ہمسائے "ابولبابہ" کے متعلق رسولِ خدا سے درخواست کی کہ ابولبابہ کو مشورہ کے لیے ہمارے پاس بھیجیے۔ رسولِ خدا نے یہ درخواست قبول کرلی اور ابولبابہ کو اجازت دے دی کہ وہ قلعہ بنی قریظہ جائیں۔ جب ابولبابہ وہاں پہنچے تو یہودیوں نے ان کے گرد حلقہ بنا لیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں نے رونا شروع کردیا۔ ان کی آہ و زاری نے ابولبابہ کو متاثر کیا۔ ان کے مردوں نے ابولبابہ سے سوال کیا کہ کیا اس میں صلاح ہے کہ ہم بلا قید و شرط اپنے کو رسولِ خدا کے سپرد کردیں یا صلاح نہیں ہے؟

ابولبابہ اپنے احساسات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں، لیکن انگلی سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا کہ تم اپنے کو ان کے حوالے کردو گے تو تمھاری گردن اُڑا دی جائے گی۔

ابولبابہ اپنی اس بات سے، جس کے ذریعے یہودیوں کو رسولؐ خدا کے حوالے کرنے سے منع کیا تھا۔ خدا اور رسولؐ کی بارگاہ میں بہت بڑی خیانت کے مرتکب ہوئے تھے۔ ناگہاں ان کو پتا چلا کہ وہ تو بہت بڑے گناہ کے مرتکب ہوگئے، فوراً قلعہ سے باہر آئے۔ چونکہ رسولؐ خدا کا سامنا کرتے ہوئے انھیں شرم آرہی تھی اس لیے سیدھے مسجد میں پہنچے اور اپنے کو مسجد کے ایک ستون سے رسّی کے ذریعے باندھ دیا کہ شاید خدا ان کی توبہ قبول کرلے۔ ابولبابہ کے واقعہ کی خبر لوگوں نے رسولؐ خدا کو دی۔ آپؐ نے فرمایا: اگر مسجد جانے سے پہلے وہ میرے پاس آتے تو میں خدا سے ان کے لیے استغفار کرتا، اب اسی حالت پر رہیں یہاں تک کہ خدا ان کی توبہ قبول کرلے۔ ابولبابہ کی خیانت کے بارے میں آیت نازل ہوئی:

"اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو دین کے کام میں خدا و رسولؐ سے خیانت نہ کرو اور اپنی امانت میں خیانت نہ کرو درآں حالیکہ تم جانتے ہو"۔ (انفال: ۲۷)

ابولبابہ چھے دن تک، دن میں روزہ رکھتے، نماز کے وقت ان کی بیٹی ستون سے ان کے ہاتھ پیر کھول دیتی۔ طہارت اور فریضہ کی ادائیگی کے بعد ان کو دوبارہ مسجد کے ستون سے باندھ دیتی تھی یہاں تک کہ پیکر وحی، بشارت کے ساتھ آن پہنچا کہ ابولبابہ کی توبہ قبول ہوگئی۔ ان کی توبہ کے بارے میں آیت نازل ہوئی کہ:

"ان میں ایک دوسرے گروہ نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا اور نیک و بد اعمال کو باہم ملا دیا ہے۔ شاید خدا ان کی توبہ قبول کرلے۔ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے"۔ (توبہ: ۱۰۲)

لوگوں نے خوشی میں چاہا کہ ابولبابہ کی رسیوں کو کھول دیں لیکن انھوں نے کہا کہ رسولؐ خدا میری رسیوں کی گرہیں کھولیں گے جب آنحضرت ﷺ نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے تو آپؐ نے ان کی رسی کی گرہوں کو کھول دیا۔ ابولبابہ تمام عمر نیکی اور اچھے عمل پر باقی رہے اور پھر کبھی

بھی محلہ بنی قریظہ میں قدم نہیں رکھا۔

بنی قریظہ کا اپنے آپ کو رسولؐ خدا کے حوالے کرنا

یہودیوں سے مذاکرات اور گفتگو کسی منزل تک نہ پہنچ سکی۔ کچھ دن تک انھوں نے اپنے آپ کو رسولؐ خدا کے حوالے کرنے سے انکار کیا۔ رسولؐ خدا نے لشکرِ اسلام کو آمادہ رہنے کا حکم دیا تاکہ حملہ کر کے ان کے قلعہ کو فتح کیا جائے۔ یہودیوں نے سمجھ لیا کہ لشکرِ اسلام کا حملہ اور ان کی کامیابی یقینی ہے۔ بھاگنے کا کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔ مجبوراً قلعہ کے دروازوں کو کھول دیا اور بلاقید وشرط اپنے کو لشکرِ اسلام کے حوالے کر دیا۔ (مغازی: ج ۲، ص ۵۰۹)

حضرت علی علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ میں داخل ہوئے اور ان سے مکمل طور پر ہتھیار رکھوا لیے۔ پھر رسولؐ خدا نے مردوں کو قید خانہ میں منتقل کرنے کا حکم صادر فرمایا اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری محمد بن مسلمہ کے سپرد کی۔ عورتوں اور بچوں کو رسولؐ خدا کے حکم کے مطابق دوسری جگہ نگرانی میں رکھا گیا۔ (حوالۂ سابق)

سعد بن معاذ کا فیصلہ

بنی قریظہ کے یہودی چونکہ قبیلۂ اوس کے ہم پیمان تھے، لہٰذا انھوں نے پیش کش کی کہ ان کے بارے میں سعد بن معاذ فیصلہ کریں وہ لوگ اس فکر میں تھے کہ شاید گذشتہ دوستی کی بدولت سعد بن معاذ ان کی سزا میں تخفیف کے قائل ہو جائیں گے۔

قبیلۂ اوس کے لوگوں نے رسولؐ خدا سے نہایت اصرار کے ساتھ یہ درخواست کی کہ اس گروہ کو آزاد کر دیں، وہ لوگ قبیلۂ خزرج سے رقابت کی بنا پر اپنی بات پر اصرار کر رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبرؐ خدا نے بنی قینقاع کو عبداللہ بن ابی خزرجی کی خواہش پر آزاد کر دیا تھا۔ رسولؐ خدا نے ان لوگوں سے بھی فرمایا: کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ تمھارے بزرگ سعد بن معاذ ان کے بارے میں فیصلہ کر دیں؟ سب نے کہا کہ ہاں، اے اللہ کے رسولؐ! ہم بھی ان کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیں گے۔ (ارشادِ مفید: ص ۵۸)

رسولؐ خدا نے معاذ کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ وقت ہاتھ کی رگ کٹ

جانے سے زخمی حالت میں بستر پر اس "رمیدہ" نامی عورت کے خیمہ میں لیٹے تھے جس نے مجروحین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اوس کے جوانوں نے ان کو چارپائی پر لٹایا اور رسولِ خدا کی خدمت میں لے چلے۔ راستے میں انھوں نے سعد سے درخواست کی کہ اپنے ہم پیمان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ انھوں نے جواب میں فرمایا کہ سعد کے لیے وہ زمانہ آن پہنچا ہے کہ جس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے سعد ڈرنے والا نہیں ہے۔

جب سعد لشکرگاہ میں پہنچے تو حضرتؐ نے فرمایا کہ تم اپنے بزرگ کے احترام میں کھڑے ہو جاؤ۔ حاضرین اٹھ کھڑے ہوئے۔ سعد نے رسولِ خدا کے مبنی بر عدالت حکم کے بعد مہاجر و انصار سے یہ عہد لیا کہ وہ جو حق سمجھیں گے اس کا اجرا ہوگا اور بنی قریظہ کے یہودیوں نے بھی اس کو قبول کیا۔

اس کے بعد سعد نے بہ آواز بلند اعلان کیا کہ یہودیوں کے مرد قتل کر دیے جائیں، عورتیں اور بچے اسیر بنا لیے جائیں اور ان کے اموال کو ضبط کر لیا جائے۔

رسولِ خدا نے فرمایا: سعد نے قانونِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔

سعد کے فیصلے کی دلیلیں

① یہودیوں کی دینی کتاب (توریت) کا فیصلہ جو بلاشک وشبہ یہودیوں کو قبول ہوگا اس لیے کہ توریت میں آیا ہے کہ جب تم جنگ کے ارادے سے کسی شہر کا قصد کرو تو پہلے ان کو صلح کی دعوت دو۔ اگر وہ لوگ جنگ کو ترجیح دیں تو شہر کا محاصرہ کرو اور جب شہر پر تسلط ہو جائے تو تمام مردوں کو تہِ تیغ کر دو اور عورتوں، بچوں، جانوروں اور جو کچھ بھی شہر میں ہو اس کو مالِ غنیمت میں شامل کر لو۔ (تورات سفر تثنیہ، فصل ۳۰)

② مدینہ میں وارد ہونے کے بعد پیغمبرؐ خدا کا یہودیوں سے معاہدہ، جس معاہدے پر فریقین کے دستخط ہوئے تھے اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ جب یہود پیغمبرؐ خدا اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کوئی قدم اٹھائیں یا اسلحہ اور سواری ان کے دشمنوں کو دیں تو پیغمبرؐ خدا کو ان کا خون بہانے، ان کے اموال کو ضبط کرنے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۴ سعد اور سارے دُور اندیش مسلمان اس بات کو جانتے تھے کہ اگر وہ لوگ اس مہلکہ سے جان بچا کر نکل گئے تو قینقاع کے یہودیوں کی طرح، کہ جنھوں نے اپنی تحریک پر اُحد کی جنگ چھیڑ دی تھی اور بہت سے لوگوں کی شہادت کا سبب بن گئے تھے اور بنی نضیر کی طرح کہ جنھوں نے جنگِ اَحزاب کا فتنہ کھڑا کر دیا اور قریب تھا کہ اسلام کی بنیاد کو اُکھیڑ دیں۔ یہ لوگ بھی اسلام کے خلاف عظیم اتحادی لشکر بنا لیں گے اور ان خطرناک عناصر کا زندہ رہنا اسلامی تحریک کے لیے مفید نہیں تھا۔

پیمان شکن ضرور شکستہ حالی کا شکار ہوتا ہے

رسولِ خدا نے حکم دیا کہ اسیروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ اس لیے زیادہ مقدار میں ٹھنڈا پانی ان کے سامنے رکھا گیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق خندق کھودی گئی اور سات سو بدبخت جنگ جو یہودیوں کو، جو صلح و آشتی، جیو اور جینے دو کے خصوصی سلوک کے باوجود پیمان شکنی کے ذریعے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کا قصد رکھتے تھے، حضرت علی علیہ السلام اور زبیر کی تلوار نے فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔ کچھ لوگ قبیلۂ اوس کے افراد کے ذریعے ہلاک ہوئے۔ جی ہاں! عہد شکنی کرنے والا ضرور کیفرِ کردار تک پہنچتا ہے۔ قتل کیے جانے والوں میں ایک وہ عورت بھی تھی جس نے محاصرے کے دنوں میں قلعہ کے اُوپر سے پتھر گرا کر خلاد بن سوید کو شہید کر دیا تھا۔

(مغازی: ج ۲، ص ۵۱۳)

اس گروہ کے خاتمے کے بعد مدینہ خائن عناصر کے وجود اور مسلح داخلی ریشہ دوانی کرنے والے اس گروہ سے پاک ہو گیا جو ملک میں رہ کر دوسروں کے مفاد میں کام کرتے تھے۔

اسیر اور مالِ غنیمت

بنی قریظہ سے جو مالِ غنیمت ہاتھ لگا تھا اس میں پندرہ سو تلواریں، تین سو زرہیں، دو ہزار نیزے، دھات اور چمڑے کی بنی ہوئی پندرہ سو سپر، بہت زیادہ لباس، برتن اور گھر کے سامان، نیز بہت زیادہ شراب تھی جس کو زمین پر بہا دیا گیا۔ (بحار الانوار: ج ۲۰، ص ۲۱۲)

رسولِ خدا نے مالِ غنیمت کا خمس نکالنے کے بعد بقیہ مال مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دیا۔ پھر

آپؐ نے سعد بن عبادہ کو بنی قریظہ کے اسیروں کے ساتھ شام بھیجا تا کہ ان کو بیچنے کے بعد سپاہِ اسلام کے لیے گھوڑے اور اسلحے مہیا کیے جائیں۔ یہ جنگ آٹھ ذی الحجہ سنہ پانچ ہجری قمری کو تمام ہوئی۔

سنہ ۶ ہجری کا آغاز

یہ سال سیاسی اور جنگی اعتبار سے تاریخ اسلام میں اہم ترین سال شمار کیا جاتا ہے، اس لیے کہ لشکرِ احزاب کی شکست اور ہجرت کے پانچویں سال یہودیوں پر مسلمانوں کی کامیابی کے بعد لشکر اسلام کے حملے شروع ہوئے۔ اس طرح کہ اس سال ۲۴ جنگی دستے (سریہ) مختلف ذمہ داریوں کے ساتھ بھیجے گئے اور ان میں سے بہت سے گروہ اہم کامیابی اور بہت زیادہ مالِ غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس آئے۔ اس سال چار غزوات واقع ہوئے، کُل ۲۸ جنگی حملے یا جنگی مہم اس سال واقع ہوئیں اور صلح حدیبیہ کا اہم معاہدہ بھی اسی سال طے پایا۔ اب ہم اختصار کے ساتھ اس سال کے اہم جنگی واقعات بیان کر رہے ہیں۔

غزوۂ بنی لحیان

سنہ چار ہجری میں رجیع کا بدترین واقعہ جو بنی لحیان کے ہاتھوں مبلغین اسلام کی شہادت پر ختم ہوا۔ اس نے رسولِؐ خدا کو اسی واقعہ کے عاملین کی تنبیہ کے لیے آمادہ کر دیا۔ اب دو سال بعد سہ شنبہ یکم ربیع الاول سنہ چھے ہجری کو رسولِؐ خدا نے مکتوم کو مدینہ میں اپنا جانشین معین فرمایا اور لشکرِ اسلام کے ہزار افراد کے ساتھ نزدیک ترین راستہ سے شمال کی طرف روانہ ہو گئے اور ایسا ظاہر کیا کہ جیسے آپ شام جا رہے ہوں۔ لیکن منزلیں طے کرنے کے بعد آپ داہنی طرف مڑ گئے اور نہایت تیزی سے بنی لحیان کی طرف آ گئے۔ مگر لشکرِ اسلام کی آمد سے دشمن پہلے سے آگاہ تھے۔ وہ پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے تھے۔ رسولِؐ خدا نے ایک جنگی مشق کی اور لشکرِ اسلام کے دوستوں کے ساتھ راہِ مکہ میں "عسفان" کی طرف روانہ ہوئے اور پھر آپؐ نے دو جاسوسوں کو مامور کیا کہ وہ قریش کی اطلاع لائیں۔ جو قبائل قریب قریب آباد تھے اس جنگی مشق نے ان کے حوصلوں پر بڑا اثر کیا اور قریش کی شان و شوکت اور ان کا وقار ان کی نظروں سے گر گیا۔ لشکرِ اسلام اس مشق کے بعد واپس آ گیا۔

زمین پر فساد پھیلانے والوں کا قتل

(تاریخ شوال سنہ چھے ہجری) قبیلۂ عرینہ سے آٹھ آدمی مدینہ آئے اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ مدینہ کی آب و ہوا ان کو راس نہیں آئی اور وہ بیمار پڑ گئے۔ رسولؐ خدا نے ان کو اپنے اُونٹوں کی چراگاہوں پر بھیج دیا تاکہ وہ لوگ کھلی ہوا میں تازہ دودھ پی کر صحت مند ہو جائیں۔

چند دنوں تک جوان لوگوں نے اُونٹوں کا دودھ استعمال کیا تو تندرست و توانا ہو گئے لیکن بجائے اس خدمت کی قدردانی کے انھوں نے رسولؐ خدا کے چرواہے یسار کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور سر قلم کر دیا۔ زبان اور آنکھوں میں کانٹے چبھو دیے اور پھر رسولؐ خدا کے تمام اُونٹوں کو چرا لے گئے۔

آپؐ نے ''کرز بن جابر'' کو بیس افراد کے ساتھ ان کا پیچھا کرنے کے لیے بھیجا۔ کرز اور اس کے ساتھی ان کو اسیر کر کے مدینہ لائے۔ رسولؐ خدا نے حکم دیا کہ زمین پر فساد پھیلانے والوں کے ہاتھ پیر کاٹ کر، دار (سولی) پر لٹکا دیا جائے اور اس طرح سے ان کو خیانت کی سزا مل گئی اور یہ آیت مفسدین کے لیے نازل ہوئی کہ:

> ''ان لوگوں کی سزا، جو خدا اور رسولؐ کے ساتھ جنگ کرتے اور زمین پر فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا دار پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پیر اس طرح کاٹے جائیں کہ اگر داہنا پیر ہو تو بایاں ہاتھ ہو اور داہنا ہاتھ ہو تو بایاں پیر ہو۔ یا ان کو شہر بدر کر دیا جائے ان کے لیے دنیا میں تباہی اور آخرت میں دردناک عذاب ہے''۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۳۳)

غزوۂ بنی مصطلق یا مریسیع

(شعبان سنہ چھے ہجری) رسولؐ خدا کو خبر ملی کہ بنی مصطلق سپاہ اسلام سے جنگ کرنے کی غرض سے اسلحے اور طاقتیں جمع کرنے کی فکر میں ہیں۔ رسولؐ خدا نے اس رپورٹ کی صحت کی تحقیق کے لیے ''بریدہ بن حصیدہ اسلمی'' کو اس علاقے میں بھیجا۔ بریدہ بنی مصطلق کی طرف روانہ ہوئے اور انجان بن کے قبیلہ کے سردار سے رابطہ قائم کیا اور واپسی پر ایک رپورٹ میں اس خبر کے صحیح

ہونے کی تائید کی۔

رسولِ خدا نے ابوذرؓ غفاری کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا اور ہزار جاں بازوں کے ساتھ دوشنبہ کے دن دوسری شعبان کو دشمن کی طرف چل پڑے اور چاہ مریسیع کے پاس خیمہ زن ہوئے۔ اس غزوہ میں کچھ وہ منافقین بھی مالِ غنیمت کی لالچ میں لشکرِ اسلام کے ساتھ ہو گئے، جو کسی جنگ میں حضرتؐ کے ساتھ نہیں تھے۔

مقامِ مریسیع میں دونوں لشکروں کی صفیں آراستہ ہوئیں۔ فرمانِ رسولِ خدا کے بموجب تھوڑی دیر تک تیر اندازی کے نتیجے میں بنی مصطلق ہار گئے اور ان میں کا ایک آدمی بھی فرار نہ کر سکا۔ ان کے دس آدمی مقتول اور بقیہ اسیر ہوئے اور اس حملے میں ایک مسلمان بھی شہید نہیں ہوا۔ اس جنگ میں دو ہزار اُونٹ، پانچ ہزار گوسفند ہاتھ آئے اور دو سو خاندان اسیر ہوئے۔

حادثہ

جنگ ختم ہونے کے بعد لوٹتے وقت ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا۔ اگر رسولِ خدا اس پر مخصوص مہارت کے ساتھ قابو نہ پا گئے ہوتے تو اسلام کے لیے ایک نیا خطرہ بن جاتا۔ پانی کے بارے میں جہجاہ غفاری غلام عمر بن خطاب جو مہاجرین میں سے تھے، اور سنان جہنی جو انصار میں تھے، آپس میں اُلجھ گئے۔ سنان نے مدد کے لیے آواز دی: اے انصار! اور جہجاہ نے مدد کے لیے پکارا: اے مہاجرین! نزدیک تھا کہ بہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔ منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے موقع کو غنیمت جانا اور اپنے آس پاس کے لوگوں سے بولا:

خدا کی قسم! ہمارا اور ان جلابیب کا معاملہ اس مثل جیسا ہے کہ اپنے کتے کو موٹا کرو تا کہ وہ تمھی کو کاٹ کھائے۔ لیکن خدا کی قسم! جب ہم مدینہ پلٹ کر جائیں گے تو چونکہ ہم مدینہ کے باعزت لوگ ہیں اس لیے ان زبوں حال اور بے چارہ مہاجرین کو باہر نکال دیں گے۔ (طبقات: ج ۲، ص ۶۰۳، منافقون: آیت ۸)

زید بن ارقم نے حضورؐ کو خبر دی

زید بن ارقم نے جب عبداللہ بن ابی کی باتیں سنیں تو رسولِ خدا کے پاس گئے اور اس کی

سازش آمیز اور منافقانہ باتوں کو پیغمبرؐ خدا کے سامنے نقل کر دیا۔ رسولؐ خدا نے زید کی خبر کے بارے میں وحی کے ذریعے اطمینان حاصل کر لینے کے بعد زید کے کان کو پکڑ کر کہا کہ یہ اس شخص کے کان ہیں جس نے اپنے کانوں کے ذریعے خدا سے وفا کی ہے۔

عبداللہ بن ابی نے جب زید کی رپورٹ کی خبر سنی تو رسولؐ اللہ کے پاس پہنچا اور حضرتؐ کے سامنے جھوٹی قسم کھا کر کہنے لگا کہ میں نے ایسی بات نہیں کہی ہے اور چونکہ وہ اپنے قبیلہ کے درمیان بزرگوں اور صاحب احترام شخصیتوں میں شمار کیا جاتا تھا اس لیے انصار میں سے کچھ لوگ پیغمبرؐ خدا کے حضور میں پہنچے۔ ابی کے فرزند کی حمایت میں انھوں نے کہا کہ شاید زید نے ایسی بات کا وہم کیا ہو یا ان کے کانوں نے غلط سنا ہو۔ یہاں تک کہ سورۂ منافقون کے نازل ہونے کے بعد اس پاک دل نوجوان کو اطمینان حاصل ہوا اور عبداللہ بن ابی ذلیل ہوا۔ (تاریخ طبری: ج ۲، ص ۶۰۶)

عمر بن خطاب نے اس واقعہ کو سننے کے بعد رسولؐ خدا سے خواہش ظاہر کی کہ عبداللہ بن ابی کو قتل کر دیا جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسی صورت میں دشمن کہیں گے کہ محمدؐ اپنے اصحاب کو قتل کر رہے ہیں۔ مصلحت یہ ہے کہ ہم جلد سے جلد نکل چلیں تا کہ باطل اندیشے دلوں سے رخت سفر باندھ کر نکل جائیں۔

کوچ کا حکم ہونے کے بعد لشکرِ اسلام ایک رات مسلسل چلتا رہا۔ یہاں تک کہ آفتاب ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس وقت ٹھہرنے کا حکم دیا گیا۔ جاں باز اسلام تھکن کی وجہ سے خاک پر پڑ رہے اور گہری نیند سو گئے۔ اس اطمینان اور خوشی کے ساتھ جو ایک لمبی اور غیر معمولی تھکن کے بعد روح و اعصاب کو حاصل ہوتی ہے۔ کدورتیں دلوں سے نکل گئیں اور کینہ کی آگ خود بخود بجھ گئی۔

باپ اور بیٹے میں فرق

عبداللہ بن ابی کے بیٹے نے سمجھا کہ رسولؐ خدا اس کے باپ کے قتل کا فرمان صادر کریں گے تو فوراً رسولؐ خدا کے پاس آیا اور کہنے لگا: یارسولؐ اللہ! سب لوگ جانتے ہیں کہ کوئی بھی میری طرح باپ سے نیک برتاؤ نہیں کرتا لیکن آپؐ کا فرمان یہ ہے کہ وہ قتل کیا جائے تو آپؐ حکم دیں میں خود قتل کروں گا۔

رسولؐ خدا نے جواب دیا: نہیں، تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ پیغمبرؐ خدا کے بزرگانہ

سلوک نے ابن ابی کے دوستوں کے درمیان اس کی حیثیت و شخصیت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ کھلم کھلا اس کی سرزنش کرنے لگے۔

رسولِ خدا نے عفو و درگزر کے حربے سے خطرناک داخلی دشمن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ ایک دن جنابِ عمرؓ سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ جس دن تم اس کو قتل کرنے کے لیے کہہ رہے تھے اگر میں اس کو قتل کر دیتا تو اس کے دفاع میں بجلیاں کوندتیں۔ لیکن اگر آج ہم اس کے قتل کا حکم دے دیں تو لوگ اس کی جان کو آجائیں گے۔ (تاریخ طبری: ج ۲، ص ۶۰۸)

بنی مصطلق، اسلامی تحریک میں شامل

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مالِ غنیمت اور اسیروں کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کیا تو اس وقت رئیس قبیلہ حارث بن ضرار کی بیٹی جویریہ ایک مسلمان کے حصہ میں آئیں۔ انھوں نے اپنے آقا سے قرارداد کر لی کہ میں اتنی رقم لے کر آزاد ہو جاؤں گی لیکن ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ان کی صرف ایک اُمید تھی پیغمبرؐ خدا کا لطف و مہربانی۔ پیغمبرؐ خدا کے پاس آئیں اور کہا: میں حارث کی بیٹی ہوں اور اسیر ہو کر آئی ہوں اور اس وقت میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ کچھ پیسے ادا کر کے میں آزاد ہو جاؤں۔ اے اللہ کے رسولؐ میں آئی ہوں کہ اس پیسے کو ادا کرنے میں آپؐ میری مدد فرمائیں۔ رسولِ خدا نے فرمایا: کیا تم کو یہ پسند ہے کہ میں تمھارے لیے اس سے بہتر کام انجام دوں؟ جن پیسوں کی تم قرض دار ہو اس کو میں ادا کروں پھر تم سے شادی کر لوں۔ جویریہ اس پیش کش سے مسرور ہو گئیں۔

جویریہ سے رسولِ خدا کی شادی کی خبر اصحاب میں پھیل گئی۔ کئی لوگوں نے بنی مصطلق کے پیغمبرؐ خدا کے رشتہ دار بن جانے کے احترام میں اپنے اسیروں کو آزاد کر دیا۔ جب بنی مصطلق نے لشکرِ اسلام کا یہ بڑا پن اور درگزر دیکھا تو وہ لوگ مسلمان ہو گئے اور ایک بابرکت شادی کی بنا پر سب کے سب اسلامی تحریک میں شامل ہو گئے۔ (تاریخ: ج ۲، ص ۶۲)

ایک فاسق کی رُسوائی

بنی مصطلق کے مسلمان ہو جانے کے بعد رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولید بن عقبہ بن ابی

معیط کو ان کی طرف زکوۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ بنی مصطلق نے جب یہ سنا کہ پیغمبرؐ خدا کا نمائندہ ان کی طرف آرہا ہے تو وہ ان کے استقبال کے لیے دوڑ پڑے۔ لیکن ولید ڈر گیا اور اس نے خیال کیا کہ وہ لوگ جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ لہٰذا اس نے مدینہ واپس آکر رسولؐ خدا سے کہا کہ وہ لوگ مجھے قتل کر ڈالنا چاہتے تھے اور انھوں نے زکوۃ ادا کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

بنی مصطلق کے ساتھ دوبارہ جنگ کی باتیں لوگوں کی زبان پر چڑھ گئیں۔ اس واقعہ کے بعد بنی مصطلق کا ایک وفد مدینہ آیا اور اس نے حقیقت بیان کی۔ اس واقعہ کے بارے میں آیت اتری:

> ''اے ایمان لانے والو! اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نادانی کی بنا پر لوگوں کی جان و مال کو نقصان پہنچا دو۔ پھر جب معلوم ہوا کہ فاسق نے جھوٹ بولا تھا جو کچھ کیا ہے اس پر تم کو پشیمانی ہو''۔ (حجرات:۶)

پیغمبرؐ خدا کی بیوی پر تہمت (حدیث افک)

رسولؐ خدا جب سفر میں جانا چاہتے (حتیٰ کہ جنگ کے لیے سفر میں بھی) تھے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ نکالتے تھے جس کے نام قرعہ نکل آتا اس بیوی کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

غزوۂ بنی مصطلق میں جنابِ عائشہؓ کے نام قرعہ نکلا۔ آپ انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ جنگ سے واپسی کے وقت جب مدینہ کے قریب پہنچے تو وہیں ٹھہر گئے اور آرام کرنے لگے۔ اسی اثنا میں حضرت عائشہؓ اس بات کی طرف متوجہ ہوئیں کہ ان کا گلوبند گم ہو گیا ہے۔ اس کو ڈھونڈنے کے لیے آپ خیمہ گاہ سے دُور چلی گئیں۔ جب واپس پلٹیں تو لشکرِ اسلام کا قافلہ وہاں سے کوچ کر چکا تھا اور تنہا حضرت عائشہؓ رہ گئی تھیں۔ ایک متقی اور نیک شخص جس کا نام صفوانؓ بن معطل تھا وہ لشکرِ اسلام کے پیچھے پیچھے اطلاعات حاصل کرنے کے لیے چلا کرتے تھے۔ وہاں پہنچے اور حضرت عائشہؓ کو دیکھا کہ وہ وہاں تنہا ہیں۔ نہایت ادب سے وہ اُونٹ سے نیچے اُترے، اُونٹ کو زمین پر بٹھایا اور خود دُور کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ اُونٹ کی پشت پر سوار ہو گئیں۔ انھوں نے اُونٹ کی مہار پکڑی اور راستہ میں ایک حرف بھی گفتگو کیے بغیر ان کو مدینہ لے آئے۔

جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو منافقین نے عبداللہ بن ابی کی قیادت میں صفوانؓ اور حضرت عائشہ کے بارے میں تہمتیں تراشیں، ناواقف ان تہمتوں کو لے اُڑے۔ مدینہ میں تہمتوں اور افواہوں کا بازار گرم تھا اور ہر آدمی ایک الگ بات کہتا تھا۔ حضرت عائشہؓ بیمار ہو گئیں اور اس تہمت کے غم میں جو بے گناہی کے باوجود ان پر لگایا گیا تھا، روتی تھیں اور کسی وقت ان کو چین نہ تھا۔ قریب تھا کہ اس موضوع پر فتنہ برپا ہو جائے کہ سورۂ نور کی (۱۱ سے ۲۷ تک) آیات نازل ہوئیں اور حضرت عائشہؓ کو یہ خوش خبری سنائی گئی کہ خدا تمھاری پاکیزگی پر گواہ ہے۔ (طبری: ج ۲، ص ۶۱۱)

پھر رسولِ خدا نے تہمت لگانے والوں پر حد جاری کی۔ جن لوگوں پر حد جاری کی گئی ان میں حسان بن ثابت اور حمنہ کا نام نظر آتا ہے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۳۰۹)

ابن اسحاق کہتا ہے کہ بعد میں معلوم ہوا کہ صفوانؓ بن معطل دراصل مردانگی ہی سے عاری تھا اور عورتوں کے ساتھ نزدیکی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ مرد پارسا کسی جنگ میں شہید ہو گیا۔ (حوالۂ سابق، ج ۳، ص ۳۱۹)

صلح حدیبیہ کا پیمان

(ذی قعدہ سنہ سات ہجری) راہِ مکہ میں لشکرِ اسلام کی پے در پے کامیابی اور مشرکینِ مکہ کی گوشہ گیری نے پیغمبرؐ خدا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ دوسری بار جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کی حیثیت و وقار کے استحکام کے لیے اقدام کریں۔ آپؐ نے حکم دیا کہ مسلمان سفرِ حج کے لیے تیار ہو جائیں اور ہمسایہ قبائل جو ابھی تک حالتِ شرک پر باقی تھے۔ ان سے آپؐ نے مسلمانوں کے ساتھ اس سفر میں چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے عذر پیش کیا اور ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔

اس سفر میں عبادی اور معنوی خصوصیتوں کے علاوہ مسلمانوں کے لیے وسیع اجتماعی اور سیاسی مصلحتیں بھی تھیں۔ اس لیے کہ عرب کے متعصب قبائل نے مشرکین کے غلط پروپیگنڈا کی بنا پر یہ سمجھ رکھا تھا کہ اس خانۂ کعبہ کے لیے جو سلف کی یادگار اور ان کے افتخار کا مظہر ہے، رسولِ خدا کسی طرح اس کی قدر و منزلت کے قائل نہیں ہیں اور اس وجہ سے اسلام کی اشاعت سے شدت کے

ساتھ ہراساں تھے۔ اب غلط خیالات کے پردے چاک ہوئے اور انھوں نے دیکھ لیا کہ رسولؐ خدا حج کو ایک فریضہ واجب جانتے ہیں۔ ایک طرف اگر قریش مانع نہیں ہوئے اور زیارتِ کعبہ کی توفیق ہوگئی تو یہ مسلمانوں کے لیے بڑی کامیابی ہوگی کہ وہ چند سال کے بعد ہزاروں مشرکین کی آنکھوں کے سامنے اپنی عبادت کے مراسم ادا کریں گے۔ دوسری طرف قریش مسلمانوں کے مکہ میں داخل ہونے سے اگر مانع ہوئے تو اعراب کے جذبات طبعی طور پر مجروح ہوجائیں گے کہ ان لوگوں نے مسلمانوں کو فریضۂ حج انجام دینے کے لیے کیوں نہ آزاد چھوڑا۔ یہ سفر چونکہ جنگی سفر نہ تھا اس لیے رسولؐ خدا نے حکم دیا کہ ایک مسافر صرف ایک تلوار اپنے ساتھ رکھے اور بس۔

رسولؐ خدا نے قربانی کے لیے ستر اُونٹ مہیا کیے۔ پھر رسولؐ اللہ چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور مقام ذوالحلیفہ میں احرام باندھا۔

آپؐ نے عباد بن بشر کو بیس مسلمانوں کے ساتھ ہراول دستہ کے عنوان سے آگے بھیج دیا تاکہ جو راستے میں تھے ان لوگوں کے کانوں تک لشکرِ اسلام کی روانگی کی خبر پہنچادیں اور اگر ان لوگوں نے کوئی سازش کی تو اس کی خبر رسولؐ خدا کو دیں۔ (طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۹۵)

قریش کا موقف

جب قریش رسولؐ خدا کی روانگی سے آگاہ ہوئے تو انھوں نے بتوں (لات و عزیٰ) کی قسم کھائی کہ ان کو مکہ میں آنے سے روکیں گے۔ قریش کے سرداروں نے رسولؐ خدا کو روکنے کے لیے خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے ساتھ مقام ''کراع الغمیم'' بھیجا۔ انھوں نے وہاں مورچے سنبھال لیے۔ رسولؐ خدا قریش کے موقف سے آگاہی کے بعد چونکہ یہ چاہتے تھے کہ خونریزی کے ذریعے اس مہینہ اور حرم کی حرمت مجروح نہ ہو۔ اس لیے آپؐ نے راہنما سے فرمایا کہ کارواں کو اس راستہ سے لے چلو کہ جس راستہ میں خالد کا لشکر نہ ملے۔

راہنما قافلۂ اسلام کو نہایت دشوار گزار راستوں سے لے گیا یہاں تک کہ یہ لوگ مکہ سے ۲۲ کلومیٹر دور حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو یہ حکم دیا کہ یہیں اتر پڑیں اور اپنے خیمے لگالیں۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۳۲۲)

قریش کے نمائندے پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں

قریش نے چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری مقصد سے باخبر ہو جائیں اس لیے انھوں نے اپنے یہاں کی اہم شخصیتوں کو رسولؐ خدا کی خدمت میں بھیجا۔ قریش کی نمائندگی میں پہلے گروپ میں "بدیل بن خزاعی" قبیلہ خزاعہ کے افراد کے ساتھ آیا۔ جب وہ رسولؐ خدا سے ملا تو آپؐ نے فرمایا: میں جنگ کے لیے نہیں آیا ہوں۔ میں تو خانہ خدا کی زیارت کے لیے آیا ہوں۔ نمائندے واپس چلے گئے اور انھوں نے یہ اطلاع قریش کو پہنچا دی لیکن قریش نے کہا: خدا کی قسم! ہم ان کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ خواہ زیارت خانہ خدا ہی کی غرض سے کیوں نہ آئے ہوں۔ دوسرے اور تیسرے نمائندے بھیجے گئے اور انھوں نے بھی بدیل ہی والی رپورٹ پیش کی۔

قریش کے تیسرے نمائندے حلیس بن علقمہ عرب کے تیراندازوں کے افسر نے کہا کہ ہم نے ہرگز تم سے یہ معاہدہ نہیں کیا کہ ہم خانہ خدا کے زائرین کو روکیں۔ خدا کی قسم! اگر تم لوگ محمدؐ کو آنے نہ دو گے تو میں اپنے تیرانداز ساتھیوں کے ساتھ تمھارے اُوپر حملہ کر کے تمھاری اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ قریش اپنے اندر اختلاف رُونما ہونے سے ڈر گئے اور انھوں نے حلیس کو اطمینان دلایا کہ ہم کوئی ایسا راستہ منتخب کریں گے جو تمھاری خوشنودی کا باعث ہوگا۔

قریش کا چوتھا نمائندہ عروہ بن مسعود تھا جس پر قریش اطمینانِ کامل رکھتے تھے۔ وہ جب رسولؐ خدا سے ملا تو اس نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی باتوں میں قریش کی طاقت کو زیادہ اور اسلام کی قوت کو کم کر کے پیش کرے اور مسلمانوں کو جھک جانے اور بلاقید و شرط واپس جانے پر آمادہ کرلے لیکن جب وہ واپس گیا تو اس نے قریش سے کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ اور سلطان حبشہ جیسے بڑے بڑے بادشاہوں کو دیکھا ہے مگر جو بات محمدؐ میں ہے وہ کسی میں نہیں ہے۔

میں نے دیکھا کہ مسلمان ان کے وضو کا ایک قطرہ پانی بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے۔ وہ لوگ تبرک کے لیے اس کو بھی جمع کرتے ہیں اور اگر ان کا ایک بال بھی گر جائے تو ان کے اصحاب اس کو فوراً تبرک کے لیے اُٹھا لیتے ہیں، لہٰذا اس خطرناک موقع پر نہایت عاقلانہ ارادہ کرنا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۳۲۵)

رسولؐ خدا کے سفراء

رسولؐ خدا نے ایک تجربہ کار شخص کو جس کا نام "خراش" تھا اپنے اُونٹ پر سوار کیا اور قریش کے پاس بھیجا۔ لیکن ان لوگوں نے اُونٹ کو پئے کر دیا اور نمائندہ پیغمبرؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا، مگر یہ حادثہ تیر اندازان عرب کے ایک دستہ کی وساطت سے ٹل گیا۔

قریش کی نقل و حرکت یہ بتا رہی تھی کہ ان کے سر میں جنگ کا سودا سمایا ہوا ہے۔ رسولؐ خدا مسئلہ کو صلح کے ذریعے حل کرنے سے مایوس نہیں ہوئے۔ لہٰذا آپؐ نے قریش کے پاس ایسے شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا جس کا ہاتھ کسی بھی جنگ میں قریش کے خون سے آلودہ نہ ہوا ہو۔ لہٰذا آپؐ نے عمرؓ بن خطاب کو حکم دیا کہ وہ قریش کے پاس جائیں۔ انھوں نے عذر ظاہر کیا۔ رسولؐ خدا نے عثمانؓ بن عفان کو، جن کی اشرافِ قریش سے قریب کی رشتہ داری تھی، اشراف قریش کے پاس بھیجا۔ عثمان قریش کے ایک آدمی کی پناہ میں مکہ میں وارد ہوئے اور پیغمبرؐ خدا کے پیغام کو قریش کے سر برآوردہ افراد تک پہنچایا۔ انھوں نے پیش کش رد کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت عثمانؓ کو بھی اپنے پاس روک لیا۔ انھیں واپس جانے کی اجازت نہیں دی۔ مسلمانوں کے درمیان یہ افواہ اُڑ گئی کہ قریش نے عثمان کو قتل کر دیا۔ (ایضاً، ص ۳۲۸-۳۲۹)

بیعت رضوان

پیغمبرؐ خدا کے نمائندہ کے آنے میں تاخیر کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان عجیب اضطراب اور ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس بار مسلمان جوش و خروش میں آ کر انتقام پر آمادہ ہو گئے۔ پیغمبرؐ خدا نے ان کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے فرمایا۔ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے تاوقتیکہ کام کو ایک ٹھکانے نہ لگا دیں۔ اس خطرناک وقت میں اگرچہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے لیے ضروری ہتھیار اور ساز و سامان نہ تھا۔ پھر بھی رسولؐ خدا نے یہ ارادہ کیا کہ اپنے اصحاب کے ساتھ عہد و پیمان کی تجدید کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے اور تمام اصحاب نے سوائے ایک کے آپؐ کے ہاتھ پر بعنوانِ بیعت ہاتھ رکھا اور قسم کھائی کہ خون کے آخری قطرے تک اسلام کا دفاع کریں گے۔

یہ وہی بیعت رضوان ہے جس کے بارے میں قرآن میں اس طرح آیا ہے:

"خداوند عالم ان مومنین سے، جنھوں نے تمھارے ساتھ درخت کے نیچے بیعت کی ہے۔ خوش ہو گیا اور ان کے وقار و خلوص سے آگاہ ہو گیا۔ اللہ نے ان کے اُوپر ان کی روح کے سکون کی چیز نازل کی اور اجر کے عنوان سے عنقریب ان کو فتح عطا کرے گا"۔ (سورۂ فتح: آیت ۱۸)

بیعت کی رسم ختم ہوئی ہی تھی کہ حضرت عثمانؓ پلٹ آئے اور قریش کے وہ جاسوس جو دُور سے بیعت کا واقعہ دیکھ رہے تھے، ہاتھ پیر مار کر رہ گئے۔ قریش کے سربرآوردہ افراد نے سہیل بن عمرو کو صلح کی قرارداد معین کرنے کے لیے بھیجا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۳۳۰)

صلح نامہ کا مضمون

جب سہیل بن عمرو رسولِ خدا کی خدمت میں پہنچا تو یوں گویا ہوا: قریش کے سربرآوردہ افراد کا خیال ہے کہ آپؐ اس سال یہاں سے مدینہ واپس چلے جائیں اور حج و عمرہ کو آئندہ سال پر اُٹھا رکھیں۔

پھر مذاکرات کا باب کھل گیا اور سہیل بن عمرو بات بات پر بے موقع سخت گیری سے کام لے کر پریشانی کھڑی کرتا رہا۔ جب کہ پیغمبرؐ خدا چشم پوشی کے رویے کو اس لیے نہیں چھوڑ رہے تھے کہ کہیں صلح کا راستہ ہی بند نہ ہو جائے۔ مکمل موافقت کے ایک سلسلہ کے بعد رسولِ خدا نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: صلح نامہ لکھو۔ حضرت علی علیہ السلام نے رسولِ خدا کے حکم سے صلح نامہ لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سہیل نے کہا کہ ہم اس جملہ سے آشنا نہیں ہیں۔ آپ بِسمِكَ اللّٰهُمَّ لکھیں (یعنی تیرے نام سے اے خدا)۔ رسولِ خدا نے موافقت کی۔ پھر حضرت علی علیہ السلام نے پیغمبرؐ خدا کے حکم سے لکھا کہ یہ وہ صلح ہے جسے رسولِ خدا محمدؐ انجام دے رہے ہیں۔

سہیل بولا: ہم آپؐ کی رسالت اور نبوت کو قبول نہیں کرتے۔ اگر اس کو قبول کرتے تو آپؐ سے ہماری لڑائی نہ ہوتی۔ آپ اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھیں۔ (بحار الانوار: ج ۲، ص ۳۳۳ و ۳۳۵)

رسولِ خدا نے حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس جملہ کو مٹا دیں لیکن حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میرے ہاتھوں میں آپؐ کا نام مٹانے کی طاقت نہیں ہے۔ رسولِ خدا نے اپنے ہاتھوں سے

اس جملے کو مٹا دیا۔[1]

۱. قریش اور مسلمان دونوں اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ دس سال تک ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے تا کہ اجتماعی امن وامان اور عربستان میں عمومی صلح قائم ہو جائے۔

۲. جب کوئی قریش کا آدمی مسلمانوں کی پناہ میں چلا جائے تو محمدؐ اس کو واپس کر دیں گے لیکن اگر مسلمانوں میں سے کوئی قریش کی پناہ میں آجائے تو قریش پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اس کو واپس کریں۔

۳. مسلمان اور قریش دونوں، جس قبیلہ کے ساتھ چاہیں عہد و پیمان کر سکتے ہیں۔

۴. محمدؐ اور ان کے اصحاب اس سال مدینہ واپس جائیں لیکن آئندہ سال زیارتِ خانۂ خدا کے لیے آسکتے ہیں۔ مگر اس کی شرط یہ ہے کہ تین دن سے زیادہ مکہ میں قیام نہ کریں اور مسافر جتنا ہتھیار لے کر چلتا ہے اس سے زیادہ ہتھیار اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۲۳۲)

۵. وہ مسلمان جو مکہ میں مقیم ہیں اس پیمان کی رُو سے اپنے مذہبی اُمور کو آزادی سے انجام دے سکتے ہیں اور قریش کوئی بھی انھیں آزار پہنچائیں گے اور نہ ہی اس بات پر مجبور کریں گے کہ وہ اپنے مذہب سے پلٹ جائیں۔ ان کے دین کا مذاق نہیں اُڑائیں گے اس طرح وہ مسلمان جو مدینہ سے مکہ وارد ہوں ان کی جان و مال محترم ہے۔ (بحارالانوار: ج ۲۰، ص ۳۵۰)

اس قرارداد کی دو کاپیاں کی گئیں: ایک کاپی رسولِؐ خدا کی خدمت میں پیش ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ نے جانوروں کو ذبح کرنے کا حکم دیا اور خود آپؐ نے وہیں سر مونڈا۔ پھر انیس دن کے بعد آپؐ مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

مخالفینِ صلح

پیمانِ صلح کچھ مسلمانوں خصوصاً مہاجرین کی ناراضگی کا باعث ہوا۔ ہر چیز سے زیادہ صلح نامہ کی دوسری شرط سے مسلمانوں کو تکلیف ہوئی کہ جس میں مسلمانوں کے پاس پناہ لینے والوں کو واپس

[1] نوٹ: اگر رسولِؐ خدا اُمّی (اَن پڑھ) تھے تو کیا حضرت علی علیہ السلام نے ان کا ہاتھ پکڑ کر یہ الفاظ مٹائے۔

کر دینے کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ مخالفین صلح میں سب سے آگے عمرؓ بن خطاب تھے۔ واقدی کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ اور ان کے ہم نوا افراد رسولؐ خدا کی خدمت میں پہنچے اور کہا: یا رسولؐ اللہ! کیا آپؐ نے نہیں کہا تھا کہ جلد ہی آپؐ مکہ میں وارد ہوں گے اور کعبہ کی کنجی لے لیں گے اور دوسروں کے ساتھ عرفات میں وقوف کریں گے؟ اور اب حالت یہ ہے کہ نہ ہماری قربانی خانہ خدا تک پہنچی اور نہ ہم خود پہنچے۔

رسولؐ خدا نے حضرت عمرؓ کو فرمایا: کیا میں نے اسی سفر میں خانہ خدا تک پہنچنے کے لیے کہا تھا؟

حضرت عمر نے کہا: نہیں۔

پھر رسولؐ مقبول نے حضرت عمرؓ کی طرف رُخ کیا اور فرمایا: آیا اُحد کا دن بھول گئے جس دن تم بھاگ رہے تھے، اپنے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے تھے اور میں تمھیں پکار رہا تھا؟ کیا تم اُحزاب کا دن بھول گئے؟ کیا تم فلاں دن بھول گئے؟

مسلمانوں نے کہا: یا رسولؐ اللہ! جو آپؐ نے سوچا ہے وہ ہم نے نہیں سوچا ہے۔ آپؐ خدا اور اس کے حکم کو ہم سے بہتر جانتے ہیں۔

اسی طرح جب صلح نامہ لکھا گیا تو حضرت عمرؓ اپنی جگہ سے اُٹھ کر رسولؐ خدا کے پاس آئے اور کہا: یا رسولؐ اللہ! کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: بے شک ہم مسلمان ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر دین خدا میں ہم کیوں ذِلّت اور پستی برداشت کریں؟

آپؐ نے فرمایا: میں خدا کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہوں، اس کے حکم کی مخالفت ہرگز نہیں کروں گا اور وہ بھی ہم کو تباہ نہیں کرے گا۔

حضرت عمر بن خطاب نقل کرتے ہیں کہ میں نے کبھی بھی حدیبیہ کے دن کی طرح اسلام کے بارے میں شک نہیں کیا۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۶۰۷)

ابوبصیر کی داستان اور شرطِ دوم کا ختم ہو جانا

ابوبصیر نامی ایک مسلمان جو مدت سے مشرکین کی قید میں زندگی گزار رہے تھے مدینہ بھاگ آئے۔ قریش نے پیغمبرؐ خدا کے پاس خط بھیجا اور یاد دلایا کہ صلح حدیبیہ کی شرط دوم کے

مطابق ابوبصیر کو آپؐ واپس کر دیں۔ خط کو بنی عامر کے ایک شخص کے حوالے کیا اور اپنے غلام کو اس کے ساتھ کر دیا۔

رسولِ خدا نے جو معاہدہ کیا تھا اس کے مطابق ابوبصیر سے کہا: تمہیں مکہ لوٹ جانا چاہیے کیونکہ ان کے ساتھ حیلہ بازی سے کام لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ خدا تمہاری اور دوسروں کی آزادی کا وسیلہ فراہم کرے گا۔

ابوبصیر نے کہا: کیا آپ مجھ کو مشرکین کے سپرد کر رہے ہیں تاکہ وہ مجھ کو دین خدا سے بہکا دیں؟ رسولِ خدا نے پھر وہی بات دہرائی اور ان کو قریش کے نمائندہ کے سپرد کر دیا۔ جب وہ لوگ مقام ذوالحلیفہ میں پہنچے تو ابوبصیر نے ان محافظین میں سے ایک کو قتل کر دیا۔ اور اس کی تلوار اور گھوڑے کو غنیمت کے طور پر لے لیا اور مدینہ لوٹ آئے۔ جب رسولِ خدا کی خدمت میں پہنچے تو کہا: یارسولَ اللہ! آپؐ نے اپنے عہد کو پورا کیا اور مجھے اس قوم کے سپرد کر دیا۔ میں نے اپنے دین کا دفاع کیا تاکہ میرا دین برباد نہ ہو۔

ابوبصیر چونکہ مدینہ میں نہیں رہ سکے اس لیے آپ صحرا کی طرف چلے گئے اور دریائے سرخ کے ساحل پر مکہ سے شام کی طرف جانے والے قافلوں کے راستے میں چھپ گئے۔ جو لوگ مکہ میں مسلمان ہوئے تھے اور قرارداد کے مطابق مدینہ نہیں آسکتے تھے وہ ابوبصیر کے پاس چلے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد زیادہ ہوگئی۔ گروہ قریش کے تجارتی قافلوں پر حملہ کر کے ان کو نقصان پہنچانے لگے۔ قریش نے اس آفت سے بچنے کے لیے پیغمبرؐ خدا کو خط لکھا اور ان سے عاجزانہ طور پر یہ خواہش کی کہ ابوبصیر اور ان کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیں اور پناہ گزینوں کو واپس کرنے والی شرط صلح نامہ کے متن سے حذف ہو جائے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۳۳۷)

صلح حدیبیہ کے نتائج کا تجزیہ

① پے در پے جنگ ایک دوسرے سے براہ راست ملاقات سے رکاوٹ بنی ہوئی تھی لیکن اس صلح نے فکروں کے آزادانہ ارتباط اور اعتقادی بحث و مباحثہ کا راستہ کھول دیا۔ یہ عرب معاشرہ میں اسلام کی نئی منطق اور دلوں میں اسلام کے نفوذ کی وسعت کا ذریعہ بنی اور وہ اس طرح کہ صلح حدیبیہ والے سال پیغمبرؐ خدا کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد چودہ سو

تھی اور فتح مکہ والے سال دس ہزار افراد رسولِ خدا کے ساتھ تھے۔

۲ صلح کے ذریعے داخلی امن وامان قائم ہو جانے کے بعد اسلام کی عالمی تحریک کو سرحدوں کے پار لے جانے اور عالمی پیغام کو نشر کرنے کے لیے رسولِ خدا کو موقع مل گیا۔

۳ یہ صلح درحقیقت تحریکِ اسلامی کو مٹانے کے لیے وجود میں آنے والے ہر طرح کے نئے جنگی اتحاد کے لیے مانع بن گئی۔ لہٰذا لشکرِ اسلام کے لیے ایک ایسا موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ اپنے بڑے دشمن جیسے خیبر کے یہودی کو اپنے راستے سے ہٹا سکیں۔

خاص کر صلح کے فوائد کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: پیغمبرؐ خدا کی زندگی میں کوئی واقعہ صلح حدیبیہ سے زیادہ فائدہ مند نہیں تھا۔ (فروغ ابدیت، ج ۲، ص ۶۰۰)

پیغمبرؐ اسلام کے عالمی پیغام کا اعلان

محرم سنہ سات ہجری قمری صلح حدیبیہ کے معاہدہ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنوب (مکہ) کی طرف سے مطمئن کر دیا اور اس اطمینان کے سبب عرب کے سربرآوردہ افراد کا ایک گروہ اسلام کا گرویدہ ہو گیا۔ اس موقع پر اسلام کے عظیم رہنما نے فرصت کو غنیمت جانا اور اس زمانے کے زمام داران حکومت، قبائل کے سردار اور اس وقت کے عیسائی مذہب کے رہبروں سے مذاکرہ اور مکاتبہ کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے آئین کو جو ایک عالمی آئین ہے خدا کے حکم سے دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا۔

رسولِ خدا نے جو خط، دعوت اسلام کے عنوان سے سلاطین، قبائل کے رؤسا اور اس زمانے کی سیاسی و مذہبی نمایاں شخصیتوں کو تحریر فرمائے تھے وہ آپؐ کی دعوت کی حکایت کرتے ہیں۔ اس وقت ان ۱۸۵ خطوط کے متن موجود ہیں جن کو پیغمبرؐ خدا نے تبلیغ یا دعوتِ اسلام کے لیے بعنوان میثاق و پیمان لکھا تھا۔ (الوثائق السیاسیہ)

یہ خط دعوت و تبلیغ میں روشِ اسلام کو بتاتے ہیں کہ جس کی بنیاد منطق اور برہان پر ہے نہ کہ جنگ و شمشیر پر۔ جو حقائق ان خطوط میں پوشیدہ ہیں اور دلائل و اشارات و نصیحتیں اور راہنمائی جو رسولِ خدا نے دوسری قوموں کے سامنے پیش کی ہے، وہ اسلام کے عالمی پیغام ہونے اور ان کی دعوت کے طریقے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ڈپلومیٹک نکات کی رعایت

سلاطین کے پاس اور مختلف علاقوں میں رسول خدا ﷺ کے بھیجے ہوئے افراد اور سفراء معارف اسلامی سے آگاہ اور اس پر تسلط رکھنے کے ساتھ ساتھ ادب وسخن میں نظریہ رکھتے تھے اور اس زمانے کے لوگوں کے معاشرتی اور دینی آداب و رسوم سے واقفیت رکھتے تھے۔ اس زمانے کی طاقتوں کا سامنا کرنے میں عین یقین اور لہجہ کی صفائی کے ساتھ ان کی ظاہری وضع قطع بھی ڈپلومیٹک نکات کی رعایت کی حکایت کرتی تھی۔

رسولؐ خدا نے ان خطوط کے ساتھ جس میں آپ کا عالمی پیغام منعکس تھا۔ ایران، روم، حبشہ، مصر، یمامہ، بحرین، اُردن اور حیرہ کی طرف ایک دن میں چھے چیدہ افراد کو روانہ فرمایا۔ (طبقات ابن سعد)

رسولؐ خدا ان خطوط پر مہر (محمد رسولؐ اللہ) جو کہ آپؐ کی انگوٹھی پر کھدا ہوا تھا، لگایا کرتے تھے۔ ان خطوط کو بند کر کے مخصوص موم (لاک) سے چپکا دیا کرتے تھے۔ (حوالہ سابق)

جس زمانے میں آپؐ ان خطوط کو لکھ رہے تھے اس زمانے میں ایران و روم دو بڑی طاقتیں حکمران تھیں اور دونوں اپنے اپنے ملک کا رقبہ بڑھانے کے سلسلے میں ایک دوسرے کے بہت زبردست رقیب تھے اور ان دونوں طاقتوں نے سیاست کی نبض کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

قیصر روم کے نام رسولؐ خدا کے خط کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"محمد رسولؐ خدا کی طرف سے روم کے عظیم قیصر کے نام!

سچائی اور ہدایت کا اتباع کرنے والوں پر سلام! میں تم کو دینِ اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اسلام کو قبول کرلو تاکہ صحیح و سالم رہو اور خدا بھی تم کو (خود تمھارے ایمان کا اور تمھارے زیر نگیں افراد کے ایمان کا) دوہرا اجر دے گا۔ اے اہل کتاب! میں تم کو اس بات کی طرف دعوت دیتا ہوں جو تمھارے اور ہمارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ سوائے خدائے واحد کے ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم

میں سے بعض، بعض کو رب نہ بنائے اور جب وہ لوگ رُوگردانی کریں تو کہو کہ تم گواہ رہو ہم مسلمان ہیں"۔ (آل عمران: آیت ۶۴)

(محمدؐ رسول اللہ، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۷۷)

عبداللہ بن حذافہ نے پیغمبرؐ خدا کا خط ایران کے دربار میں پہنچایا۔ جب مترجمین نے بادشاہ کے سامنے خط پڑھا تو وہ بھڑک اٹھا کہ محمدؐ کون ہے جو اپنے نام کو میرے نام سے پہلے لکھتا ہے؟ اور پورا خط پڑھنے سے پہلے ہی اس نے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

رسولؐ خدا کا قاصد مدینہ واپس آیا اور اس نے سارا ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کیا اور فرمایا: "خدایا! اس شخص نے میرا خط پھاڑ ڈالا تو اس کی حکومت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے"۔

خسرو پرویز کی دوسری گستاخی اور یمن کے لوگوں کا مسلمان ہونا

ساسانی بادشاہ نے طاقت کے نشے میں چور ہو کر اپنے ہاتھ کی کٹھ پتلی یمن کے حاکم "باذان" کو لکھا کہ مجھ کو خبر ملی ہے کہ مکہ میں کسی قریش نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تم دو دلیر آدمیوں کو وہاں بھیجو تا کہ وہ اس کو گرفتار کر کے میرے پاس لائیں۔

حاکم یمن "باذان" نے مرکز کے حکم کے مطابق اپنے دو دلیر آدمیوں کو حجاز روانہ کیا۔ جب وہ لوگ طائف پہنچے تو وہاں کے ایک شخص نے ان کی مدینہ تک راہنمائی کی۔ وہ دونوں افراد مدینہ پہنچے اور باذان کا خط پیغمبرؐ خدا کو دیا۔ آپؐ کی عظمت و ہیبت اور آپؐ کے اطمینان نے تعینات افراد کو وحشت میں ڈال دیا۔

جب پیغمبرؐ خدا نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تو لرزنے لگے۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ "کل میں اپنا نظریہ تمھارے سامنے پیش کروں گا۔ اس کے دوسرے دن جب والیانِ یمن جواب لینے کے لیے پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں پہنچے تو آپؐ نے فرمایا کہ پروردگار عالم نے مجھے خبر دی ہے کہ کل رات جب رات کے سات گھنٹے گزر چکے تھے (۱۰ جمادی الاول سنہ ۷ ہجری) "خسرو پرویز" اپنے بیٹے "شیرویہ" کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور اس کا بیٹا تخت سلطنت پر قابض ہو گیا۔ پھر رسول اللہؐ نے ان کو بیش قیمت ہدیہ دے کر یمن روانہ کیا۔ انھوں نے یمن کی راہ لی اور باذان کو

اس خبر سے مطلع کیا۔

باذان نے کہا کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو پھر یقیناً وہ آسمانی پیامبر ہے اور اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ شیرویہ کا خط حاکم یمن کے نام پہنچا۔ اس میں لکھا تھا کہ "آگاہ ہو جاؤ کہ میں نے خسرو پرویز کو قتل کر دیا اور ملت کا غم و غصہ اس بات کا باعث بنا کہ میں اس کو قتل کر دوں، اس لیے کہ اس نے فارس کے اشراف کو قتل کر ڈالا اور بزرگوں کو متفرق کر دیا۔ جب میرا خط تمہارے ہاتھ میں پہنچے تو تم لوگوں سے میری بیعت لو اور اس شخص سے جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور جس کے خلاف میرے باپ نے حکم دیا تھا، ہرگز سختی کا برتاؤ نہ کرنا، یہاں تک کہ میرا کوئی نیا حکم تم تک پہنچے۔

شیرویہ کے خط نے اس خبر کی تائید کر دی جو رسولؐ خدا نے عالم غیب سے اور وحی کے ذریعے دی تھی۔ ایرانی نژاد حاکم باذان اور ملکِ یمن کے تمام کارندے جو ایرانی تھے، مسلمان ہو گئے اور یمن کے لوگ رفتہ رفتہ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ باذان نے رسولؐ خدا کے نام ایک خط میں اپنے اور حکومت کے کارندوں کے اسلام لانے کی خبر پہنچا دی۔ (تاریخ کامل: ج ۲، ص ۲۴۶)

بادشاہ حبشہ نجاشی کے نام پیغمبرؐ خدا کا خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمدؐ رسول اللہ کی طرف سے زمام دار حبشہ نجاشی کے نام!

تم پر سلام ہو، ہم اس خدا کی تعریف کرتے ہیں جس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ خدا کہ جو بے عیب اور بے نقص ہے۔ اس کے بندے اس کے فرماں بردار اس کے غضب سے امان میں ہیں۔ خدا اپنے بندوں کے حال کو دیکھنے والا اور گواہ ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ جنابِ مریمؑ کے فرزند عیسیٰؑ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جو پاکیزہ اور زاہدہ مریمؑ کے بطن میں تھے۔ خدا نے اسی قدرت سے جس سے آدمؑ کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا ان کو بغیر باپ کے ماں کے رحم میں پیدا کیا۔

میں تم کو ایک لاشریک خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں اور تم سے یہی چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ اسی خدا کے مطیع اور فرماں بردار رہو اور میرے پاکیزہ آئین کی پیروی کرتے رہو۔ اس خدا پر ایمان لاؤ جس نے مجھ کو رسالت پر مبعوث فرمایا۔

میں پیغمبرؐ خدا ہوں، تم کو اور تمھارے لشکر والوں کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور اب اس خط اور سفیر کو بھیج کے میں اپنے اس عظیم فریضہ کو پورا کر رہا ہوں جو مَیں نے لے رکھا تھا اور تم کو پند و نصیحت کر رہا ہوں۔ سچائی اور ہدایت کے پیروؤں پر سلام!

محمدؐ رسول اللہ

نجاشی نے رسولؐ خدا کے خط کو لیا، آنکھوں سے لگایا۔ تخت سے نیچے اترا اور تواضع کے عنوان سے زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے کلمۂ شہادتین زبان پر جاری کیا اور پھر آنحضرتؐ کے خط کے جواب میں اس نے لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ خط محمدؐ رسولِ خدا کی طرف، نجاشی کی جانب سے ہے۔ اس کا درود و سلام آپؐ پر ہو جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں اور جس نے میری ہدایت کی۔ حضرت عیسیٰؑ کے بشر اور پیغمبرؑ ہونے کے مضمون کا خط آپؐ کا ملا۔ زمین و آسمان کے خدا کی قسم جو آپؐ نے بیان فرمایا وہ حقیقت ہے۔ مَیں نے آپؐ کے دین کی حقیقت سے آگاہی حاصل کی اور مہاجر مسلمانوں کی مقتضیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی ضروری خدمت عمل میں آئی۔ اب میں اس خط کے ذریعے گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے وہ فرستادہ اور سچے ہیں جس کی تصدیق آسمانی کتابیں کرتی ہیں۔ میں نے آپؐ کے چچازاد بھائی (جعفرؓ بن ابی طالبؓ) کے سامنے اسلام و ایمان و بیعت کے مراسم انجام دیئے اور اپنا پیغام و سلام پہنچانے کے لیے اپنے بیٹے "زارھا" کو آپؐ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ مَیں اپنے علاوہ کسی کا ضامن نہیں ہوں۔

آپؐ اگر حکم دیں تو میں خود آپؐ کی خدمت پرفیض میں حاضر ہو جاؤں۔ آپؐ پر درود و سلام ہو ــــ نجاشی۔

(تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۴۸)

دوسرے زمام داران حکومت کا موقف

مصر و یمامہ کے سربراہان مملکت میں سے ہر ایک نے تحفوں کے ساتھ رسولؐ خدا کے خط کا جواب دیا لیکن ان میں سے کوئی مسلمان نہیں ہوا۔

مقوقس، مصر کے حاکم نے تحفوں کے ساتھ رسولؐ خدا کے خط کا محترمانہ جواب دیا۔ یمامہ کے حاکم نے جواب میں لکھا کہ میں اس شرط پر مسلمان ہونے کو تیار ہوں کہ رسولؐ خدا کے بعد حکومت میرے ہاتھ میں ہو۔ اس پیش کش کی موافقت رسولؐ خدا نے نہیں کی اور آپؐ نے فرمایا کہ یہ الٰہی امر ہے۔ (طبقات ابن سعد: ج ۱، ص ۲۶۳)

لیکن بحرین کا حاکم مسلمان ہو گیا اور رسولؐ خدا نے اس کو اسی طرح باقی رکھا۔ اُردن کے حاکم نے رسولؐ خدا کے سامنے اپنی جنگی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ وہ مدینہ پر لشکر کشی کی فکر میں تھا۔ اسی وجہ سے اس نے مرکزی حکومت (روم) سے اپنی ذمہ داری کے بارے میں پوچھا لیکن جب اس نے قیصر روم کی بدلی ہوئی نگاہوں کو دیکھا تو اس بارے میں سب کچھ سمجھ گیا اور تمام سیاسی لوگوں کی طرح اس نے بھی اپنا موقف بدل دیا، سفیر پیغمبرؐ کی دلجوئی کی اور تحفے اس کے حوالے کیے۔

(سیرت حلبی: ج ۳، ص ۲۵۵)

خیبر کے یہودیوں سے جنگ کے اسباب

اسلام شروع ہی سے یہودیوں کی سازشوں اور کام بگاڑنے اور رخنہ اندازی کا شکار تھا۔ یہودیوں کا ایک گروہ مدینہ سے ۱۶۵ کلومیٹر دور شمال میں خیبر نامی ایک ہموار اور وسیع جگہ پر سکونت پذیر تھا کہ جہاں انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے نہایت مضبوط اور مستحکم سات قلعے بنا رکھے تھے۔ ان کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان میں جوان اور جنگجو افراد بہت زیادہ تھے۔

صلح حدیبیہ نے رسولؐ خدا کو اس بات کا موقع دیا کہ عالمی پیغام کا اعلان کرنے کے علاوہ

اس جزیرہ میں یہودیوں کے آخری خطرناک اڈہ کو بھی صاف کر دیں، اس لیے کہ پہلی بات تو یہ کہ سیاسی اور جنگی نکتۂ نظر سے خیبر ایک مشکوک اڈہ سمجھا جاتا تھا اور خیبر کے یہودیوں نے جنگ احزاب کی آگ بھڑکائی تھی اس لیے ممکن تھا کہ وہ دوبارہ مشرکین کو بھڑکا دیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایران و روم ایسی بڑی طاقتوں سے یہودیوں کے بہت قریبی تعلقات تھے اور ہر لحہ یہ اندیشہ تھا کہ ان بڑی طاقتوں کے ورغلانے یا ان کی مدد سے یہ لوگ اسلام کی جڑ کھوکھلی نہ کر سکیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کی وجہ سے یہودی یہ سوچنے لگے تھے کہ تیاری کے لحاظ اور جنگی اعتبار سے کمزور ہونے کی بنا پر انھوں نے یہ صلح نامہ قبول کیا ہے، لہٰذا وہ اس فکر میں تھے کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تحریکِ اسلام کو ناگہانی چوٹ پہنچائی جائے۔ ہر چند کہ صلح حدیبیہ کے معاہدے نے قریش و یہود کے جنگی اتحاد کے امکان کو ختم کر دیا تھا لیکن دوسرے قبائل تھے جو یہودیوں کے امکانی حملہ میں اہم ثابت ہو سکتے تھے۔ یہ وجوہات تھیں جو اس بات کا سبب بنے کہ رسولِ خدا یہودیوں کی سرکوبی کے لیے پیش قدمی کریں اور آتش فتنہ کو خاموش کر دیں۔

لشکرِ توحید کی روانگی

(یکم ربیع الاول سنہ ۷ ہجری قمری) رسول اکرم ﷺ سولہ سو جاں بازوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے اور ہمیشہ کی طرح دشمن کو غافل رکھنے کے علاوہ مقام رجیع پہنچے۔ یہ ایک چشمہ ہے جو کہ خیبر و غطفان کی سرزمین کے درمیان واقع ہے اور غطفان کی ملکیت ہے۔ چنانچہ اس طرح آپؐ نے دشمن کو بھی غافل بنا دیا اور دو جنگی ہم پیمان یعنی خیبر کے یہودیوں اور غطفان کے اعراب کے درمیان جدائی ڈال دی۔

اطلاعات کی فراہمی

رسولِ خدا نے روانگی سے قبل لشکرِ اسلام کے آگے عباد بن بشیر کو چند سواروں کے ساتھ دشمن کے لشکر کی خبر لانے کے لیے بھیجا۔ ان لوگوں کو یہ کامیابی ملی کہ انھوں نے ایک یہودی جاسوس کو گرفتار کر لیا اور اس کو دھمکا کر اس سے یہودیانِ خیبر کے جنگی اہم رازوں اور یہودیوں کی خوف

زدگی کی اطلاع حاصل کرلی۔ (مغازی واقدی: ج ۲،ص ۶۴۰)

خیبر کا مضبوط قلعہ راتوں رات مسلمانوں کے محاصرہ میں آ گیا۔ صبح سویرے خیبر کے یہودی مسلمانوں کے حملہ اور محاصرہ سے غافل قلعہ سے باہر نکلے اور اپنا بیلچہ وغیرہ لے کر اپنے کھیتوں اور نخلستانوں کی طرف چل پڑے کہ اچانک مسلمانوں پر نظر پڑی جو خیبر کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ڈر کے مارے قلعۂ خیبر کی طرف بھاگے اور آواز دی: ''محمدؐ ہم سے لڑنے آئے ہیں''۔ (مغازی: ج ۲،ص ۶۴۲)

جنگی اعتبار سے مناسب جگہ پر لشکرگاہ کی تعیین

ابتدا میں لشکرِ اسلام نے خیموں کو نصب کرنے کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا لیکن یہ جگہ بہت زیادہ مرطوب ہونے کے علاوہ صحت وصفائی کے اعتبار سے بھی نامناسب اور یہودیوں کے تیروں کی زد پر واقع تھی۔ جب یہ جگہ جنگی اعتبار سے مناسب معلوم نہ ہوئی تو رسولؐ خدا نے اپنے اصحاب سے مشورہ کر کے نخلستان کی پشت پر مناسب ترین رجیع نامی جگہ کو لشکرگاہ کے لیے معین فرمایا اور کچھ سپاہیوں کو اس جگہ کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے مقرر کر دیا۔ انھوں نے بھی باری باری لشکرگاہ کی نگہبانی کی ذمہ داری قبول کرلی۔ (حوالۂ سابق)

لشکر کے لیے طبی امداد رسانی کا انتظام

زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے والی نسیبہ نامی عورت چند ایسی عورتوں کے ساتھ جو اس فن سے آشنا تھیں، مدینہ سے لشکر اسلام کے ہمراہ آئی تھی اور لشکرگاہ کی پشت پر جنگی مجروحین کی مرہم پٹی کے لیے ایک خیمہ نصب کیا گیا تھا اور وہ عورتیں، جانبازوں کی مدد کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ (مغازی: ج ۲،ص ۶۸۵)

جدید اطلاعات

مقامِ رجیع میں ایک سپاہی نے جو بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا، اپنے کو لشکرِ اسلام کے حوالے کر دیا اور کہنے لگے کہ وہ اگر کچھ خبریں لشکرِ اسلام کو دے تو کیا اس کو امان ملے گی؟ جب اس کو امان دی گئی تو اس نے بہت سے جنگی راز فاش کر دیے۔ اس نے بتایا کہ یہودیوں کے درمیان

اختلاف ہوگیا ہے۔ پھر ان لوگوں کی رہنمائی اس نے قلعوں اور حصاروں تک کی۔

خیبر میں سات قلعے تھے جن کے نام یہ ہیں: ناعم، قموص، کتیبہ، نطاۃ، شق، وطیح، سلالم۔ ان قلعوں کے درمیان فاصلہ تھا۔ رجیع کو لشکرگاہ کے عنوان سے منتخب کر لینے اور وہاں سات دن ٹھہرنے کے بعد لشکرِ اسلام دن میں قلعوں پر حملہ کرتا اور راتوں کو اپنی قیام گاہ پر واپس آجاتا تھا۔ جنگ کے پہلے دن جانبازانِ اسلام کے پچاس آدمی تیروں سے مجروح ہوئے۔ علاج کے لیے ان کو اس خیمہ میں پہنچایا گیا جو اسی لیے نصب کیا گیا تھا۔

بالآخر سات دنوں کے بعد ناعم نامی پہلا قلعہ فتح ہوا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ سارے قلعے لشکرِ اسلام کے قبضہ میں آگئے۔ ان قلعوں میں سے ایک قلعہ کی فتح میں وہ یہودی عورت اسیر ہوئی جس نے لشکرِ اسلام کے لیے اطلاعات فراہم کرنے میں مدد دی تھی۔ رسول اکرمؐ نے اس کو اس کے شوہر کے حوالے کر دیا۔

سردار کے حکم سے رُوگردانی

جب رسولِ خدا حصار ناعم کے قریب پہنچے تو آپؐ نے لشکر کو صف آرا کیا اور فرمایا کہ جب تک میرا کوئی حکم نہ پہنچے اس وقت تک اپنی مرضی سے جنگ نہ کرنا۔ اس موقع پر ایک سپاہی نے خودسرانہ طور پر ایک یہودی پر حملہ کر دیا لیکن یہودیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ جاں بازوں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ یہ شہید محسوب ہوگا؟

آپؐ نے فرمایا کہ "منادی بہ آواز بلند اعلان کر دے کہ جو اپنے کمانڈر کے حکم سے سرتابی کرے بہشت اس کے لیے نہیں ہے"۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۶۴۹)

دوسری جنگی ٹیکنیک

سارے لشکرِ اسلام کی کمان رسولِ خدا کے ہاتھوں میں تھی اور آنحضرتؐ کے فرمان کے مطابق ایک عمدہ جنگی ٹیکنیک کے ساتھ لشکرِ اسلام ایک ایک قلعہ کا محاصرہ کرتا جا رہا تھا اور اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ جس قلعہ کا محاصرہ ہو چکا ہے اس کا رابطہ دوسرے قلعہ سے منقطع ہو جائے اور اس قلعہ کو فتح کر لینے کے بعد دوسرے قلعہ کا محاصرہ کرتا تھا۔

وہ قلعے جن کا ایک دوسرے سے رابطہ تھا، یا وہ قلعے جن کے اندر کے جنگجو زیادہ مقاومت کا ثبوت دیتے تھے وہ قلعے ذرا دیر میں فتح ہوتے تھے لیکن وہ قلعے جن کا آپس میں رابطہ بالکل منقطع ہو جاتا تھا وہ کمانڈروں کے رُعب وخوف سے کم مقاومت کر پاتے تھے اور ان کو فتح کرنے میں قتل وخونریزی بھی کم ہوتی تھی۔ (تاریخ التمدن الاسلامی: ج ۱، ص ٦١)

علی علیہ السلام فاتحِ خیبر

قلعے یکے بعد دیگرے فتح ہو گئے صرف دو قلعے باقی رہ گئے اور یہودی ان قلعوں کے اُوپر سے مسلمانوں پر بڑی تیزی سے تیر برسا رہے تھے۔ رسولؐ خدا نے اپنے اصحاب میں سے ایک صحابی (ابوبکرؓ) کو لشکر کی سرداری دے کر قلعہ فتح کرنے کے لیے روانہ کیا اور ان کے ہاتھوں میں پرچم دیا لیکن وہ بغیر پیش قدمی کے شکست کھا کر پلٹ آئے۔

دوسرے دن پیغمبرؐ خدا نے پرچم لشکر دوسرے صحابی (عمرؓ) کے حوالے کیا لیکن وہ بھی پیش قدمی نہ کر سکے اور شکست کھا کر واپس آ گئے۔

تیسرے دن رسولؐ خدا نے پرچم کو سعد بن عبادۃ کے حوالے کیا لیکن وہ بھی شکست سے دوچار ہوئے۔ خود وہ اور ان کا لشکر بھی زخمی ہو گیا اور وہ بھی بیٹھ رہے۔

رسولؐ خدا نے کہا: ''کل میں علَم اس کے حوالے کروں گا جس کو خدا اور اس کا رسولؐ دوست رکھتا ہوگا اور وہ بھی خدا اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے۔ وہ شکست کھانے والا اور بھاگنے والا نہیں ہے، خدا اس کے دونوں ہاتھوں سے فتح عطا کرے گا''۔

رات ختم ہوئی، صبح نمودار ہوئی۔ رسولؐ خدا نے علیؑ کو بلانے کے لیے بھیجا۔ آپ آنحضرتؐ کی خدمت میں تشریف لائے جب کہ آپؑ کی آنکھوں میں درد تھا۔ چنانچہ فرمایا: حضورؐ! نہ میں دشت کو دیکھ پا رہا ہوں اور نہ کوہ کو"۔ پھر آپؑ پیغمبرؐ کے قریب پہنچے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: اپنی آنکھیں کھولو۔ رسولؐ خدا نے اپنا لعابِ دہن حضرت علی علیہ السلام کی آنکھوں میں لگایا تو آنکھیں شفایاب ہو گئیں۔ پھر آپؐ نے پرچم حضرت علی علیہ السلام کو دیا اور ان کی کامیابی کے لیے دُعا کی۔ امیر المومنین علی علیہ السلام قلعہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت علی علیہ السلام کی سرکردگی میں جب لشکر قلعہ کے نزدیک پہنچا تو مرحب کے بھائی حارث نے

اپنے مشاق اور تیز رفتار شہ سواروں کے ساتھ لشکرِ اسلام پر حملہ کیا، مسلمان بھاگ گئے۔ حضرت علی علیہ السلام تنہا اپنی جگہ جمے رہے۔ حضرت علی علیہ السلام کی تلوار کی ضرب نے اپنا کام کیا اور حارث ان کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ یہودیوں پر خوف و وحشت طاری ہو گیا اور وہ قلعہ کے اندر بھاگ گئے۔ قلعہ کے دروازے کو مضبوطی سے بند کر لیا۔ مسلمانوں نے جب یہ منظر دیکھا تو پھر میدان میں پلٹ آئے۔ ایسے موقع پر خیبر کا مشہور پہلوان، حارث کا بھائی اپنے بھائی کی موت سے بے تاب ہو گیا، اسلحہ میں غرق، غصہ میں بھرا رجز پڑھتا ہوا قلعہ سے باہر کود پڑا۔

وہ کہہ رہا تھا: ''خیبر مجھے جانتا ہے میں مرحب ہوں، اسلحہ میں غرق، آزمودہ کار پہلوان ہوں، کبھی میں نیزے سے وار کرتا ہوں، کبھی شمشیر سے جب شیر غصہ کے عالم میں ہوتے ہیں (اس وقت بھی) کوئی میری ممنوعہ جگہ سے قریب نہیں ہوتا''۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۵۳-۵۴)

حضرت علی علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا: ''میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر (شیر) رکھا ہے۔ میں بہادر ہوں اور بہادروں کا شیر ہوں''۔ (ارشاد مفید: ص ۶۷)

اس کے بعد زبردست جنگ شروع ہوئی۔ شمشیرِ علیؑ مرحب کے سر میں در آئی۔ اس کی سپر پتھر کے خود اور اس کے سر کو دانتوں تک دو ٹکڑے میں تقسیم کر دیا۔ یہ ضربت ایسی خطرناک تھی کہ اس کو دیکھ کر یہودیوں کا ایک گروہ بھاگ کھڑا ہوا اور قلعہ کے اندر جا چھپا اور بقیہ افراد حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ دست بدست جنگ میں مارے گئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے شیر کی طرح یہودیوں کا پیچھا قلعہ کے دروازے تک کیا۔ پھر قلعہ کے دروازے کی طرف متوجہ ہوئے اور اُسے اُکھاڑ لیا اور اس کو جنگ کے اختتام تک سپر کی طرح استعمال کرتے رہے۔ پھر اس کو اس خندق کے اُوپر رکھ دیا جو قلعہ کے چاروں طرف کھدی ہوئی تھی۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۶۵۵)

یہ دروازہ اتنا بھاری تھا کہ لشکرِ اسلام کے آٹھ سپاہی اس کو نہ اُٹھا سکے۔ حضرت علی علیہ السلام اس اعجازی قوت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ''میں نے ہرگز بشری قوت سے اس کو نہیں اُکھاڑا ہے بلکہ خداداد قوت کے زیرِ اثر اور روزِ جزا پر ایمان کی بنا پر یہ کام کیا ہے۔ (بحار الانوار: ج ۲۱، ص ۲۶)

حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت، بہادری اور ان کے ہاتھوں کی طاقت سے خیبر کی فتح اور دوسروں کی ناطاقتی کے بارے میں بہت سی حدیثیں اہلِ سنت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ان

ماخذوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

طرفین کے خسارے کا تخمینہ

آخری قلعہ کی فتح کے بعد یہودی ہار گئے، لشکرِ اسلام کی جیت ہوئی۔ اس جنگ میں یہودیوں کے ۹۳ سے زائد بڑے بڑے جنگجو افراد ہلاک ہوئے جبکہ شہدائے اسلام کی تعداد ۲۰ افراد سے آگے نہ بڑھی۔ اسی طرح قلعوں میں حملے کے نتیجے میں کچھ یہودی لشکر اسلام کی اسیری میں آئے۔

اسیروں کے ساتھ اچھا برتاؤ

قلعوں میں سے جب ایک قلعہ فتح ہوا تو حی ابن اخطب کی بیٹی صفیہ اور ایک دوسری عورت اسیر ہوئی تو بلال اُن دونوں کو ادھر سے رسولؐ خدا کی خدمت میں لائے، جہاں یہودیوں کے مقتولین کی لاشیں پڑی تھیں۔ پیغمبرؐ اُٹھے اور انھوں نے صفیہ کے سر پر عبا ڈال دی اور ان دونوں عورتوں کے آرام کے لیے لشکرگاہ میں ایک جگہ معین فرما دی۔ پھر بلال سے سخت لہجے میں کہا: کیا تمھارے دل سے بالکل مہر و محبت ختم ہوگئی ہے کہ ”تم نے ان دونوں عورتوں کو ان کے عزیزوں سے گزارا؟“

صفیہ کے دل پر پیغمبرؐ خدا کی محبت نے بڑا اثر کیا۔ بعد میں صفیہ پیغمبرؐ خدا کی باوفا بیویوں کے زمرے میں شامل ہوئیں۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۶۷۳)

کامیابی کے بعد درگزر

تاریخ کے فاتحین نے جب بھی دشمن پر کامیابی حاصل کی تو انھوں نے شمشیر انتقام سے اپنے کینہ کی آگ کو بجھایا اور دشمن کی تباہی میں بڑی بے رحمی کا ثبوت دیا ہے لیکن خدا رسیدہ افراد نے کامیابی کے موقع پر دشمنوں کے ساتھ نہایت لطف و محبت کا سلوک کیا ہے۔ فتح خیبر کے بعد، خیبر کے جن افراد نے زیادہ مال صرف کر کے اَحزاب کی عظیم شورش برپا کی تھی اور اسلام کو خاتمہ کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ان کے سروں پر پیغمبرِ رحمت کے لطف و عطوفت کا سایہ رہا۔ آپؐ نے ان کو یہ اجازت دی کہ وہ لوگ سرزمین خیبر کی آمدنی کا آدھا حصّہ مسلمانوں کو دیں۔

آنحضرت ﷺ نے فتح کے موقع پر نیزے کے زور سے ہرگز ان پر اسلام مسلط نہیں کیا یہاں تک کہ آپؐ نے ان کے مذہبی شعائر و رسوم کی ادائیگی پر بھی کوئی پابندی عائد نہ کی۔ (حوالۂ سابق)

خیبر کی غنیمتیں

قلعہ خیبر فتح کر لینے اور یہودیوں کو خلع سلاح کرنے کے بعد کافی مقدار میں ہتھیار اور جنگی سازوسامان، یہودیوں کے جمع کیے ہوئے خزانے کہ جن میں بہت زیادہ زیورات، کھانے کے برتن، کپڑے، بہت سے چوپائے اور کھانے پینے کے دوسرے بہت زیادہ سامان ہاتھ لگے جو کہ لشکرِ اسلام کو غنیمت کے طور پر ملے۔

رسولِ خدا نے حکم دیا کہ سپاہیوں میں سے ایک شخص جانبازانِ اسلام کے درمیان اعلان کرے کہ "ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ مالِ غنیمت کو بیت المال میں لا کر جمع کردے، چاہے وہ ایک سوئی اور دھاگہ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ خیانت ننگ و عار ہے اور قیامت میں اس کی سزا آگ ہے۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۶۸۰)

پھر عادلانہ تقسیم کے لیے تمام مالِ غنیمت ایک جگہ جمع ہوا اور آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ اس میں سے کچھ نقد کی صورت میں لوگ تبدیل کرالیں۔

"فروہ" جو مالِ غنیمت بیچنے کے کام پر مامور کیے تھے، انھوں نے مالِ غنیمت میں سے ایک دستار دھوپ سے بچنے کے لیے اپنے سر پر باندھ رکھی تھی وہ فراغت کے بعد بے خبری کے عالم میں اپنے خیمے میں چلے گئے وہاں ان کو ایک دم دستار کا خیال آیا تو فوراً ہی خیمے سے باہر نکلے اور اس دستار کو مالِ غنیمت کے ڈھیر میں رکھ دیا۔ جب رسولِ خدا کو یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: یہ آگ کی ایک دستار تھی جو تم نے اپنے سر پر باندھ رکھی تھی۔ (حوالۂ سابق)

مالِ غنیمت میں خیانت کی سزا

سپاہیوں میں سے "کرکرہ" نامی ایک شخص رسولِ خدا کے مرکب کی نگہبانی پر مامور تھا۔ لوٹتے وقت اس کو ایک تیر لگا اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ رسولِ خدا سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا "کرکرہ"

شہید ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ بھی مالِ غنیمت میں سے عبا چرانے کے جرم میں اب آگ میں جل رہا ہے۔

اس موقع پر ایک شخص نے پیغمبرؐ خدا سے کہا کہ "میں نے بغیر اجازت کے ایک جوڑا جوتا مالِ غنیمت سے لے لیا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: واپس کردو، ورنہ قیامت میں آگ کی صورت میں یہ تمھارے پیروں میں ہوگا۔ (حوالۂ سابق)

مالِ غنیمت کی تقسیم

خمس نکالنے کے بعد، جانبازانِ اسلام کے درمیان مالِ غنیمت تقسیم ہوا۔ ان عورتوں کو جنھوں نے لشکرِ اسلام کی کمک اور ان کی تیمارداری کی تھی۔ رسولِ خدا نے بیش قیمت گلوبند وغیرہ عطا فرمائے۔ (حوالۂ سابق)

ایک شخص کو ایک خرابہ سے دو سو درہم ملے۔ پیغمبرؐ خدا نے اس کا خمس نکال لیا اور بقیہ اس کو دے دیا۔ لشکرِ اسلام خیبر سے کوچ کرنے والا ہی تھا کہ جعفرؓ ابن ابی طالبؑ حبشہ سے واپس آگئے۔ جب آپ نے رسولِ خدا کو مدینہ میں نہیں دیکھا تو خیبر کی طرف چل پڑے۔ آنحضرتؐ جعفرؓ کی واپسی پر بہت خوش ہوئے۔ سات قدم ان کے استقبال کے لیے بڑھے اور فرمایا: سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس بات کے لیے زیادہ خوشی مناؤں فتح خیبر کے لیے یا جعفرؓ کی واپسی کے لیے۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۶۸۳، زاد المعاد: جلد ۳، ص ۳۳۳، سنن ابی داؤد: ۲۷۴۵، صحیح بخاری: ج ۴، ص ۱۷۱)

خیبر کے حملے کے نتائج

خیبر کا حملہ اسلام سے ٹکرانے کے لیے یہودیوں کی اقتصادی اور جنگی اہم طاقتوں کے گھٹ جانے کا باعث بنا۔ اس حملے کے دوسرے نتائج میں یہ ہے کہ یہودیوں کے ایک دوسرے گروہ کے ہتھیار ڈال دینے کی بدولت مشرکین کی فوج میں خوف و ہراس پھیل گیا اور تحریکِ اسلام کی مزید پائیداری ہوئی۔

خیبر میں لشکرِ اسلام کی کامیابی کے اسباب

۱) حملہ کے نقشہ اور موثر جنگی ٹیکنیک کا استعمال۔

۲ پیغمبرؐ اسلام کی دقیق اور حکیمانہ سپہ سالاری اور لشکرِ اسلام کا سپہ سالار کے حکم پر مکمل عمل۔

۳ جنگی حکمت والی مناسب جگہ پر ڈٹے رہنا۔

۴ خیبر کے کامل محاصرہ تک لشکر اسلام کی مکمل پوشیدگی۔

۵ دشمن کے حالات کی اطلاع اور ہر قلعہ میں لشکر کی تعداد و کیفیت کے بارے میں مکمل معلومات۔

۶ علیؑ کی بے امان جنگ، ایسی جنگ کہ دشمن کے نقصانات میں سے آدھا نقصان دست زبردست حیدرِ کرّار کی توانائی کا نتیجہ تھا۔

فدک

خیبر سے ایک منزل اور مدینہ سے ۱۴۰ کلومیٹر دور کچھ یہودی فدک نامی ایک قصبہ میں رہتے تھے۔ یہ لوگ خیبر کے یہودیوں کے انجام سے ڈر گئے اور خدا نے ان کے دل میں خوف و دہشت بڑھا دی۔ اس وجہ سے انھوں نے پیغمبرؐ خدا کے نمائندے کے جواب میں ایک شخص کو قراردادِ صلح طے کرنے کے لیے رسولؐ خدا کے پاس بھیجا اور آنحضرتؐ سے یہ معاہدہ کیا کہ آدھا فدک وہ ان کے حوالے کر دیں گے اور اس میں کھیتی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی آمدنی ان کے حوالے کریں گے۔ (مغازی: ج۲،ص ۷۰۶)

رسولؐ خدا نے فدک فاطمہ سلام اللہ علیہا کو عطا کر دیا۔ فدک کی سالانہ آمدنی ۲۴ ہزار درہم تھی۔ جنابِ فاطمہ اس آمدنی کا بیشتر حصہ بے سہارا لوگوں کی امداد اور اجتماعی مصالح ایسے اُمورِ خیر میں صرف کرتی تھیں۔ (پژوہشی عمیق از زندگانی علیؑ: ص ۲۶۱-۲۶۶)

غزوۂ وادی القریٰ (سنہ ۷ ہجری قمری)

خیبر کی جنگ ختم ہونے کے بعد رسولؐ خدا مدینہ سے ۳۵۰ کلومیٹر دور وادی القریٰ کی طرف روانہ ہوئے جو کہ یہودیوں کا ایک اہم مرکز شمار کیا جاتا تھا۔ آپؐ نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ ان کا قلعہ چند دنوں تک لشکرِ اسلام کے محاصرہ میں رہا۔ انجام کار فتح و کامرانی کے بعد آنحضرتؐ نے

ان کی زمینوں کو انہی کے قبضہ میں رہنے دیا اور وہی معاہدہ جو خیبر کے یہودیوں سے ہوا تھا ان سے بھی طے پایا۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۱۶ و ۱۷)

تیماء (سنہ ۷ ہجری قمری)

مسعودی کی تحریر کے مطابق "تیماء" کے لوگ یہودی اور رسولؐ خدا کے دشمن تھے۔ جب ان لوگوں نے وادی القریٰ کے فتح کی خبر سنی تو رسولؐ خدا سے صلح کر لی اور جزیہ دینے پر تیار ہو گئے۔ اس طرح سے جزیرۃ العرب سے یہودیوں کی طرف سے جنگی خطرہ بالکل ہی ختم ہو گیا۔

خیبر کے سرایا

خیبر کی فتح کے بعد رسولؐ خدا اپنے دیرینہ دشمن کی طرف سے مطمئن ہو گئے اور مدینہ میں وہ اطمینان و سکون ہوا جو پہلے نہ تھا۔ ماہ صفر سے لے کر ذی القعدہ تک چند مہینوں کی مدت میں آپؐ نے صرف چھ گروہ اطلاعات حاصل کرنے کے لیے یا ان بکھرے دستوں اور جماعتوں کی تنبیہ و سزا کے لیے جنھوں نے داخلی امن و امان میں رخنہ ڈال رکھا تھا، روانہ فرمائے۔ ان سرایہ کے علاوہ اور کوئی دوسرا جنگی حملہ وقوع پذیر نہیں ہوا۔

مکہ کی طرف (عمرۃ القضاء)

یکم ذی القعدہ سنہ ۷ ہجری قمری کو صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد صلح نامہ کی شرط کے مطابق مسلمان عمرہ کے ارکان بجالانے کے لیے تین روز تک مکہ میں ٹھہرنے کے مجاز ہوئے۔ رسولؐ خدا لشکرِ اسلام کے دو ہزار افراد کے ساتھ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ان میں وہ افراد بھی تھے جو صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ جو خیبر میں شہید ہو گئے یا وفات پا گئے اور کچھ دوسرے لوگ بھی تھے جو اس سفر میں شریک ہونے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے۔

قرارداد کے مطابق چونکہ ایک مسلمان سوائے ایک تلوار کے (جو مسافر کا اسلحہ سمجھا جاتا تھا) اپنے ساتھ زیادہ ہتھیار نہیں رکھ سکتا، اس لیے رسولؐ خدا نے ممکنہ خطرے سے بچنے کے لیے لشکرِ اسلام کے ایک سردار کو دو سو جاں بازوں کے ساتھ کافی اسلحہ کے ساتھ آگے بھیج دیا تاکہ وہ لوگ "مرالظہران" پر مکہ سے ۲۲ کلومیٹر شمال میں ٹھہریں اور درہ میں آمادہ رہیں۔

مسلمان، مکہ کے قریب پہنچے۔ رسولِ خدا ناقہ قصوئی پر سوار تھے اور عبداللہ ابن رواحہ اس کی مہار تھامے ہوئے تھے اور فخر کے ساتھ رجز پڑھتے جاتے تھے۔ دو ہزار مسلمان خاص شان و شوکت کے ساتھ، جبکہ ان کی آواز فرطِ شوق سے لرز رہی تھی۔ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کی آواز بلند کرتے جا رہے تھے۔ اب برسوں بعد، کعبہ کی زیارت کی توفیق ان لوگوں کو نصیب ہوئی تھی۔

قریش نے شہر مکہ خالی کر دیا تھا۔ وہ پہاڑ کی بلندیوں سے مسلمانوں کی جمعیت کو دیکھنے میں مشغول تھے۔ مسلمانوں کی صدائے لبیک کی پرشکوہ گونج نے ان کے دلوں پر وحشت طاری کر دی تھی۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد احتیاطی فوج کے دستہ نے اپنی جگہ دوسرے گروہ کو دے دی۔ انھوں نے عمرہ کے فرائض انجام دیئے۔

مکہ میں سہ روزہ اقامت کی مہلت تمام ہوئی۔ قریش نے ایک شخص کو رسولِ خدا کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ جتنی جلدی ہو سکے مکہ سے نکل جائیں۔

اس سفر میں رسولِ خدا نے مکہ کے شمال میں ۱۲ کلومیٹر کے فاصلے پر مقام "سرف" میں جنابِ میمونہ سے عقد فرمایا اور اس طرح آپؐ نے قریش کے درمیان اپنی حیثیت اور زیادہ مضبوط کر لی۔ عمرۃ القضاء کے بعد سنہ ۷ ہجری میں اور چار دوسرے سرایا پیش آئے۔

جنگِ موتہ (عالمی استکبار سے پہلا مقابلہ)

(یکم جمادی الاول سنہ ۸ ہجری قمری) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بادشاہ بصریٰ کے پاس ایک سفیر بھیجا۔ فرستادۂ رسولؐ جب سرحد شام میں سرزمینِ موتہ پر پہنچا تو اس دیار کے حاکم نے سفیر کو قتل کر دیا اور ماہ ربیع الاول میں جو ۱۶ مبلغین پیغمبرؐ کی طرف سے مقام "ذات اطلاح" کے سفر پر مامور کیے گئے تھے وہ اس سرزمین کے لوگوں کے ہاتھوں قتل کر دیے گئے۔ ان میں سے ایک آدمی زخمی ہوا اور لاشوں کے بیچ گر پڑا۔ پھر وہ کسی طرح مدینہ پہنچا۔ (طبقاتِ کبریٰ: ج ۲، ص ۱۲۸)

یہ دونوں واقعات اس بات کا سبب بنے کہ رسولِ خدا موتہ کی طرف ایک لشکر روانہ فرمائیں۔ جہاد کا فرمان صادر ہوتے ہی تین ہزار مسلمان جمع ہو گئے۔ رسولِ خدا نے لشکر کے سپہ سالاروں کو درج ذیل ترتیب دی:

جب تک زیدؓ بن حارث زندہ ہیں وہ تمھارے سپہ سالار رہیں گے۔ اگر زید شہید ہو گئے تو

پھر جعفرؓ ابن ابی طالب اور اگر وہ بھی شہید ہو گئے تو عبداللہؓ بن رواحہ اور اگر وہ بھی شہید ہو گئے تو مسلمان اپنے درمیان سے خود ہی ایک سپہ سالار کا انتخاب کر لیں۔

کیوں روتے ہو؟

لشکر کی روانگی کے وقت اہل مدینہ رسولؐ خدا کے ساتھ جانبازانِ اسلام کو رخصت کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ عبداللہ ابن رواحہ گھوڑے پر سوار تھے اور آگے اپنے بیٹے کو سوار کیے ہوئے تھے اور اسی حالت میں شدت کے ساتھ گریہ فرما رہے تھے۔ لوگوں نے سوچا کہ وہ زن و فرزند کی محبت اور ان سے جدائی کے غم میں یا موت کے خوف سے رو رہے ہیں۔ عبداللہ ابن رواحہ جب لوگوں کے گمان کی طرف متوجہ ہوئے تو انھوں نے سر اٹھایا: "اے لوگو! میرا گریہ زندگی اور زن و فرزند و خاندان کی محبت میں نہیں ہے۔ میں شہادت سے نہیں ڈرتا ہوں اور نہ اس وجہ سے رو رہا ہوں بلکہ میرے گریہ کا سبب قرآن کی مندرجہ ذیل آیت ہے:

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ○ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا (سورۂ مریم: آیت ۷۱-۷۲)

"تم میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہے گا بجز اس کے کہ دوزخ میں جائے اور یہ تمھارے پروردگار کا حتمی حکم ہے۔ دوزخ میں داخل ہونے کے بعد ہم ان افراد کو جو خدا ترس اور باتقویٰ تھے، نجات دیں گے اور ستم گاروں کو اس میں چھوڑ دیں گے تاکہ وہ گھٹنوں کے بل آگ میں گر پڑیں"۔

مجھے اطمینان ہے کہ مجھے جہنم میں لے جایا جائے گا لیکن مجھے یہ کیسے پتا چلے کہ نجات دی جائے گی۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۱۵)

پیغمبرؐ اسلام نے مسلمانوں کے ساتھ شہر کے دروازہ تک مجاہدین کو رخصت کیا اور فرمایا:

دَفَعَ اللهُ عَنكُم وَرَدَّكُم سَالِمِينَ غَانِمِينَ

"یعنی خدا تمھارا دفاع کرے اور تم کو سلامتی اور غنیمت کے ساتھ واپس پلٹائے"۔

لیکن عبداللہ ابن رواحہ نے جواب میں شعر پڑھا جس کا مطلب تھا، میں خداوند رحمن سے

مغفرت طلب کرتا ہوں اور اس سے شمشیر کی ایسی ضربت کا خواہاں ہوں جو میری حیات کو ختم کر دے"۔ (حوالہ سابق)

خدا حافظ کہتے وقت عبداللہ بن رواحہ نے پیغمبرؐ خدا سے نصیحت کرنے کی خواہش کی۔ حضرتؐ نے فرمایا: "جب تم ایسی سرزمین پر پہنچو جہاں اللہ کی عبادت کم ہوتی ہے تو اس جگہ زیادہ سجدہ کرو"۔

عبداللہ نے کہا: کچھ اور نصیحت فرمائیں۔

رسولؐ خدا نے فرمایا: "خدا کو یاد کرو، خدا کی یاد مقصد تک پہنچنے میں تمھاری مددگار ہے"۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۷۱۸)

رسولؐ خدا نے لشکر کے امیروں کو حکم دیا کہ "خدا کے نام سے اس کی راہ میں جنگ کرو اور جو خدا کا انکار کرے اس سے لڑو، دھوکہ بازی نہ کرو، بچوں کو قتل نہ کرو۔ جب مشرکین سے سامنے ہو تو تین چیزوں میں سے ان کو ایک کی دعوت دو اور وہ ان میں سے جب کسی ایک کو قبول کر لیں تو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔ پہلے اسلام کی دعوت دو اگر وہ قبول کر لیں تو ان سے جنگ نہ کرو۔ دوسرے ان سے یہ مطالبہ کرو کہ وہ اپنی زمین سے چلے جائیں اور ہجرت کریں۔ اگر وہ قبول کرتے ہیں تو ان کے لیے وہی حقوق ہیں جو دوسروں کے لیے ہیں۔ تیسرے اگر ان دونوں باتوں کے قبول کرنے سے انکار کریں تو جزیہ ادا کرنے کی دعوت دو۔ اگر ان تمام باتوں سے سرتابی کریں تو خدا سے مدد مانگو اور ان سے جنگ کرو۔ (حوالہ سابق: ج ۱، ص ۷۵۷)

دو طاقتوں کی جنگ

لشکرِ اسلام موتہ کی جانب روانہ ہوا۔ جنوب عمان میں ۲۱۲ کلومیٹر دور مقام "معان" پر پہنچتے ہی خبر ملی کہ بادشاہ روم "ہرقل" ایک لاکھ سپاہیوں کو "بلقاء" کے علاقہ میں سرزمین "مآب" تک بڑھا لایا ہے اور اس علاقہ کے ایک لاکھ عرب جنگجو رومیوں کی مدد کے لیے لشکر روم سے آملے ہیں۔

یہ خبر امیرانِ لشکر کے آپس میں مشورہ کا سبب بنی۔ شروع میں تو ان کا یہ ارادہ تھا کہ اس واقعہ کی خبر پیغمبرؐ خدا کو دی جائے اور ان سے معلوم کیا جائے کہ کیا کرنا چاہیے لیکن عبداللہ ابن رواحہ

نے اپنی شجاعانہ اور مدلل تقریر سے ان کو اس فکر سے باز رکھا۔ آپ نے لشکر کو خطاب کرتے ہوئے کہا: "اے لوگو، خدا کی قسم! جو چیز تمھیں اس وقت ناپسند ہے اسی کو طلب کرنے کے لیے تم نکلے ہو، یہ وہی شہادت ہے جس کے شوق میں تم نے سفر کی زحمت برداشت کی ہے۔ ہم نے کیا بڑے گروہ، کثیر جماعت اور دشمن کے لشکرِ فروان سے جنگ نہیں کی؟ ہم ایمان کی طاقت سے لڑتے ہیں جس کی بدولت خدا نے ہم کو بزرگی دی ہے۔ اٹھو اور اپنے راستہ پر چل پڑو، ہمارے سامنے دو اچھے (احد الحسنیین) راستے ہیں: یا فتح یا شہادت۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۱۷)

عبداللہ ابن رواحہ کی شعلہ بار تقریر کے بعد لشکرِ اسلام ٹڈی دَل لشکر کی طرف چل پڑا اور بلقاء کی سرحد پر روم کا دو لاکھ کا لشکر تین ہزار مجاہدین سے رُوبرو ہوا۔

لشکرِ اسلام کی بے امان جنگ شروع ہوئی اور اللہ والے جو شہادت کو بقاء کا راز سمجھتے تھے شہادت کے استقبال کے لیے دوڑ پڑے۔

لشکرِ اسلام کے دلبر سردار جعفر ابن ابی طالبؑ کی شہادت

جنگ کے شور و غل میں جعفر ابن ابی طالب نے پرچم اپنے ہاتھ میں لیا اور مردانہ وار قلب لشکرِ کفر پر حملہ کر دیا اور ان کے نرغے میں گھر گئے۔ آپ نے اپنے گھوڑے کو پے کر دیا تاکہ وہ ان کے ہاتھ نہ آسکے اور پیادہ لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ آپؑ کا داہنا ہاتھ کٹ گیا۔ پرچم کو آپؑ نے بائیں ہاتھ میں سنبھالا۔ تھوڑی دیر بعد آپؑ کا بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا۔ اس کے بعد آپؑ نے پرچم کو سینے سے لگا لیا یہاں تک کہ شہادت کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ خدا نے ان کے کٹے ہوئے دونوں ہاتھوں کے بدلے ان کو دو پَر عنایت کیے تاکہ وہ فرشتوں کے ساتھ جنت میں پرواز کریں اس لیے آپ جعفر طیار کے لقب سے ملقب ہوئے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۲۰)

عبداللہ بن رواحہ اور زید ابن حارثہ کی شہادت

جعفر کی شہادت کے بعد زید ابن حارثہ نے پرچم اُٹھایا اور لشکرِ کفر پر حملہ کر دیا اور دلیرانہ جنگ کے بعد درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ تیسرے سردارِ لشکر عبداللہ ابن رواحہ نے پرچم اُٹھایا۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے کہ جنگ جاری رکھی جائے یا نہیں۔ آخرکار رجز پڑھتے ہوئے سپاہِ دشمن

پر حملہ آور ہوئے۔

"اے نفس! اگر تو ابھی قتل نہیں ہوگا تو بالآخر مر ہی جائے گا۔ جو تیری آرزو تھی اس کا وقت بھی آ گیا ہے۔ اگر ان دونوں کے راستے پر چلو گے تو نجات ملے گی"۔

یہ رجز پڑھ کر عبداللہ دلیرانہ انداز میں قلب لشکر پر حملہ آور ہوئے۔ ان کی تلوار کافروں کے سروں پر موت کے شعلے برسانے لگی۔ آخر کار عبداللہ بھی اپنے رب سے جا ملے اور انھیں اسی انداز میں شہادت نصیب ہوئی جس میں انھوں نے خداوند عالم سے طلب کی تھی کہ ان کے جسم کو ٹکڑوں بنا دیا جائے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۲۱)

جنگ سے بیٹھ رہنا

عبداللہ ابن رواحہ کی شہادت کے بعد سپاہیوں کی رائے اور پیش کش سے خالد ابن ولید سردارِ لشکر بنے۔ خالد نے جنگ کو بے نتیجہ دیکھا۔ رات آنے تک کم و بیش پراگندہ طور پر جنگ ہوتی رہی۔ رات کو جب دونوں لشکر جنگ سے رُک گئے تو خالد نے لشکرگاہ کے پیچھے بہت سے سپاہیوں کو بھیجا تاکہ وہ صبح کو خوب شور و غل مچاتے ہوئے یہاں مقیم لشکر سے آملیں۔ صبح کو رومیوں نے یقین کر لیا کہ مدینہ سے ایک عظیم امدادی لشکر آن پہنچا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کی تلوار کی طاقت اور ان کے جذبۂ شہادت کو وہ دیکھ چکے تھے اس لیے جنگ میں انھوں نے پس و پیش کیا اور حملہ سے باز رہے بلکہ وہ مسلمانوں کے حملے کے منتظر رہے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ خالد کا حملے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ عملی طور پر جنگ بندی ہو گئی۔ خالد نے ایک بار جنگ سے بیٹھ رہنے کے ذریعے مسلمانوں کو دشمن کے دو لاکھ جنگجوؤں کے چنگل سے بچا لیا۔

جنگ میں رومیوں کی جنگی ٹیکنیک سے مسلمانوں کی آگاہی اور روم کی مغرور سپاہ کے دل میں شہادت کے شیدا لشکرِ اسلام کا رُعب و دبدبہ بیٹھ جانا، یہ تھے اس جنگ کے نتائج۔

اس حادثہ میں قبیلہ خزاعہ کے کچھ لوگ مظلومانہ طریقے سے قتل کر دیے گئے اور اس طرح صلح حدیبیہ کا عہد و پیمان ٹوٹ گیا۔ کیونکہ قریش رسولؐ خدا کے ہم پیمان قبیلہ کے خلاف جنگ میں کود پڑے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۳۲)

تجدید معاہدہ کی کوشش

ابوسفیان اس بات کو بھانپ گیا کہ یہ گستاخی بغیر سزا یوں ہی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ درحقیقت قریش نے لشکرِ اسلام کے لیے خود ہی حملے کا موقع فراہم کر دیا تھا اس لیے وہ لوگ فوراً ہی مدینہ پہنچے کہ شاید معاہدے کی تجدید کر لیں۔

ابوسفیان مدینہ میں اپنی بیٹی رسولؐ خدا کی زوجہ "اُم حبیبہؓ" کے گھر پہنچا۔ چونکہ باپ اور بیٹی نے کئی سال سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا، اس لیے باپ کا خیال تھا کہ بیٹی بڑے اچھے انداز سے استقبال اور پذیرائی کرے گی اور اس طرح وہ اپنے مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جائے گا لیکن جب رسولؐ خدا کے گھر میں وارد ہوا اور چاہا کہ بستر پر بیٹھ جائے تو بیٹی نے بے اعتنائی کے ساتھ بستر کو لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے تعجب سے پوچھا کہ تم نے اس کو لپیٹ کیوں دیا؟ بیٹی نے جواب دیا کہ آپ مشرک ہیں اور نجس ہیں اور میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ آپ رسولؐ خدا کی جگہ بیٹھیں۔

ابوسفیان نے صلح نامہ کی مدت بڑھانے کے لیے رسولؐ خدا سے رجوع کیا۔ آپؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے جواب میں صرف خاموش رہے۔ ابوسفیان نے بزرگوں میں سے ہر ایک سے وساطت کے لیے رابطہ قائم کیا مگر نفی میں جواب ملا۔ حضرت علی علیہ السلام کی راہنمائی میں ابوسفیان مسجد کی طرف آیا اور یک طرفہ صلح نامہ کی مدت میں اضافے کا اعلان کیا۔ پھر غصہ اور مایوسی کے عالم میں بغیر کسی نتیجے کے مکہ واپس پلٹ گیا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۳۸ و ۳۹)

ستم رسیدہ قبیلہ خزاعہ کے افراد نے اپنی صدائے مظلومیت پیغمبرؐ خدا کے کانوں تک پہنچانے کے لیے عمرو ابن خزاعہ کو رسولؐ خدا کی خدمت میں بھیجا۔ وہ مدینہ میں وارد ہوا اور سیدھے مسجد کی طرف پہنچا اور لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اس نے مخصوص انداز سے ایسے دردناک اشعار پڑھے جو قبیلہ خزاعہ کے استغاثہ اور مظلومیت کی حکایت کر رہے تھے۔ آپ کا جو معاہدہ خزاعہ سے تھا اس کے واسطے سے پیغمبرؐ خدا کو اس نے قسم دلائی اور ان سے فریادرسی کا طلب گار ہوا۔ کچھ اشعار پڑھے جن کا مطلب یہ تھا:

رسولؐ خدا آدھی رات کو ہم جب "وتیرہ" کے کنارے تھے اور ہم میں سے کچھ لوگ رکوع و

سجود میں تھے تو مشرکین نے ہم پر حملہ کر دیا۔ درآں حالاں کہ ہم مسلمان تھے، انھوں نے ہمارا قتل عام کیا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۳۹)

عمرو کے جاں گداز اشعار سے رسولِ خدا کا دل درد سے تڑپ اُٹھا، لہٰذا آپؐ نے فرمایا: اے عمرو ہم تمھاری مدد کریں گے۔

لشکرِ اسلام کی آمادگی

رسولِ خدا نے روانگی کا مقصد بتائے بغیر لشکرِ اسلام کو آمادہ رہنے کا حکم دیا اور قریبی قبائل اور مدینہ والوں کو اس میں شریک کیا۔ کیا آپ نے مجموعی طور پر دس ہزار جانبازوں کو روانگی کے لیے آمادہ کر لیا۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ واقعی اس آمادگی کا مقصد کیا ہے؟ اور لشکر کا آخری ہدف کہاں جا کر تمام ہوگا؟ اس لیے کہ کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ حدیبیہ کا معاہدہ ابھی تک باقی ہے۔

راستوں کو کنٹرول کرنے کے لیے چیک پوسٹ

رسولِ خدا دشمن کو غافل رکھنے کے لیے نہایت خفیہ طریقے سے قدم اُٹھا رہے تھے اور بہت باریک بینی سے کام لے رہے تھے۔ اس کام کے لیے آپ کے حکم سے مدینہ کے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے تھے اور مشکوک افراد کی رفت و آمد پر کڑی نگاہ رکھی جا رہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قریش کے جاسوس لشکرِ اسلام کی روانگی سے آگاہ ہو جائیں۔

حضورؐ نے دعا کی: خدایا! آنکھوں کو اور خبروں کو قریش سے پوشیدہ کر دے تا کہ ہم ان کے سروں پر اچانک ٹوٹ پڑیں۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۳۹)

ایک جاسوس جال میں

سخت حفاظتی تدابیر کے باوجود، حاطب ابن ابی بلتعہ نامی ایک مسلمان نے اس لالچ میں آ کر کہ اگر اس نے قریش کی کچھ خدمت کر دی تو اس کے وابستگانِ مکہ میں گزند سے محفوظ رہیں گے اور یہ سمجھ کر کہ رسولِ خدا شاید مکہ کا ہی قصد رکھتے ہوں، ایک خط قریش کو لکھا تا کہ ان کو خبر کر دے اور یہ خط اس نے سارہ نامی ایک عورت کے حوالے کیا جو پہلے ایک گانے والی تھی اور کچھ پیسے بھی دیئے تا کہ وہ دوسرے راستوں سے مدینہ سے مکہ جائے اور یہ خط قریش کے سرکردہ افراد تک پہنچا

دے۔

جبرئیل امینؑ نے آ کر پیغمبرؐ خدا کو یہ خبر پہنچا دی اور رسولؐ خدا نے بلا تاخیر علیؑ ابن ابی طالبؑ کو زبیر کے ساتھ اس عورت کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا۔ وہ لوگ نہایت تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف چلے اور راستے میں مقام خلیقہ میں اس عورت کو گرفتار کر کے اس کے سامان کی تلاشی لی لیکن کوئی خط نہیں ملا۔ سارہ نے بھی کسی خط یا کسی خبر کے اپنے ساتھ رکھنے کا شدت سے انکار کیا لیکن حضرت علی علیہ السلام نے بہ آواز بلند کہا کہ خدا کی قسم! پیغمبرؐ کبھی بھی غلط بات نہیں کہیں گے، لہٰذا جتنی جلدی ہو سکے، خط نکال دے ورنہ میں تجھ سے خط نکلوا لوں گا۔

عورت نے جب دھمکی کو یقینی سمجھا تو کہنے لگی: آپ لوگ ذرا دُور ہٹ جائیں۔ میں خط دے رہی ہوں اس وقت اس نے اپنے جوڑے میں سے ایک خط نکالا اور حضرت علی علیہ السلام کے حوالے کر دیا۔

رسولؐ خدا نے خط لکھنے والے کو طلب کیا اور اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔ اس نے خدا کی قسم کھائی اور کہا کہ اس کے ایمان میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے لیکن چونکہ میری بیوی بچے مشرکین قریش کے ہاتھوں میں اسیر ہیں اس لیے میں نے چاہا کہ اس خبر کے ذریعے میرے گھر والوں کی تکلیف میں کچھ کمی ہو جائے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۴۰ و ۴۱)

ایسا واقعہ پھر نہ دُہرایا جائے اس غرض سے چند آیتیں نازل ہوئیں۔ ایک آیت میں اشارہ ہوتا ہے: ''اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ اور ان کے ساتھ محبت اور دوستی نہ جتاؤ''۔ (سورۂ ممتحنہ: آیت ۱)

پیغمبرؐ خدا نے اس کی جاہلانہ خطا کو معاف کر دیا اور اس کی توبہ قبول کر لی۔

مکہ کی جانب

کہاں جانا ہے اور کس مقصد سے جانا ہے، یہ تو معلوم نہ تھا اس کے علاوہ حکم صادر ہونے کے وقت تک یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کس وقت جانا ہے، رمضان کی دسویں تاریخ سنہ ۸ ہجری کو روانگی کا حکم صادر ہوا۔

رسولؐ خدا نے مدینہ کے باہر لشکرِ اسلام کا معائنہ کیا۔ پھر آپؐ نے روانگی کا حکم دیا اور مدینہ

سے تھوڑے سے فاصلے (حد حرخص) پر پانی مانگ کر اپنا روزہ افطار کیا اور سب کو حکم دیا کہ اپنا روزہ افطار کر لیں۔ بہت سے لوگوں نے افطار کر لیا لیکن ایک گروہ نے یہ سوچا کہ اگر روزہ کی حالت میں جہاد کریں تو اس کا زیادہ اجر ملے گا۔ رسول اللہؐ اس گروہ کی حکم عدولی سے ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہ لوگ گنہگار اور سرکش ہیں۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۸۰۲)

لشکرِ اسلام بغیر کسی توقف کے تیزی سے بڑھتا رہا۔ دس ہزار جانبازوں نے مدینہ سے مکہ کا راستہ ایک ہفتے میں طے کیا اور رات کے وقت مکہ سے ۲۲ کلومیٹر شمال کی جانب "مرالظہران" پہنچ کر وہیں خیمہ زن ہو گیا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۴۲)

فتح مکہ

قریش کی عہد شکنی

(روانگی کی تاریخ ۱۰ رمضان سنہ ۸ ہجری قمری، فتح کی تاریخ ۱۹ رمضان سنہ ۸ ہجری قمری)

رسولِ خدا اس فکر میں تھے کہ مکہ، یہ خانۂ توحید جو مشرکین کے گھیرے میں ہے اس کو آزاد کر دیں لیکن اس سے صلح حدیبیہ مانع تھی۔ مسلمان نہیں چاہتے تھے کہ اس معاہدے کو کچل کر مکہ فتح کریں جس کی رعایت کے لیے انھوں نے اپنے کو پابند بنایا تھا لیکن جب کسی اُمت کا وقت قریب آتا ہے اور مہلت کی مدت ختم ہو جاتی ہے تو الٰہی قانون کے مطابق ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ایک قوم یا گروہ کا خاتمہ ہو جائے اور ان کے مدمقابل کے لیے کامیابی کا راستہ کھل جائے۔

موتہ کی جنگ اس بات کا سبب بنی کہ قریش مسلمانوں کو کمزور سمجھنے لگے اور صلح حدیبیہ کا معاہدہ توڑنے کی سوچنے لگے۔ اس لیے کہ جب رومیوں کے مقابلے سے مسلمانوں کے بیٹھ رہنے کی خبر مکہ میں پہنچی تو قریش نے اس کو لشکرِ اسلام کی کمزوری پر محمول کیا اور مسلمانوں کے ہم پیمان اور ہمدرد قبیلوں پر ان کی جرأت بڑھ گئی۔

صلح حدیبیہ کے معاہدے کے مطابق کوئی بھی قبیلہ دونوں گروہوں، قریش یا مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کر سکتا تھا۔ خزاعہ نے محمد ﷺ سے اور بنی بکر نے قریش سے معاہدہ کیا۔ سنہ ۸ ہجری میں خزاعہ اور بنی بکر کے درمیان جھگڑا ہوا۔ قریش نے اس حملہ میں خزاعہ کے خلاف بنی بکر کی خفیہ طریقے سے مدد کی۔ چہرہ پر نقاب ڈال کر ان کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔

لشکر مدینہ واپس آیا، لوگ نہایت برانگیختہ اور غیظ و غضب کے عالم میں تھے اور سپاہی ملول و خاموش، لوگ آگے بڑھے اور خاک اٹھا کر سپاہیوں کے چہروں پر ڈالنے اور شور کرنے لگے کہ اے فراریو! تم لوگ خدا کے راستے سے فرار کرتے ہو؟ سپاہی اپنے گھروں میں چلے گئے اور ملامت کے خوف سے ایک مدت تک گھروں سے باہر نہ نکلے۔ یہاں تک کہ نماز جماعت میں بھی نہیں آتے تھے۔ پیغمبرِ خدا نے فرمایا: یہ لوگ فراری نہیں ہیں اور ان شاء اللہ حملہ کرنے والے

ہو جائیں گے۔ (مغازی: ج ۲، ص ۷۶۵)

رسولؐ خدا جعفرؓ ابن ابی طالبؑ کے سوگ میں

مسلمان خصوصاً جعفرؓ کی موت سے رسولؐ خدا بے حد غمگین تھے۔ جعفرؓ کے شہید ہونے کی وجہ سے آپ شدت کے ساتھ گریہ کر رہے تھے۔ جعفر کے گھر والوں کی تسلی کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے اور وہاں آپؐ نے فرمایا کہ میرے بچے عون ومحمد وعبداللہ کہاں ہیں؟

جنابِ جعفرؓ کی بیوی اسماء جعفر کے بیٹوں کو رسولؐ خدا کی خدمت میں لائیں۔ آنحضرتؐ نے شہید کے بچوں کو پیار کیا، گلے لگایا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ڈاڑھی پر بہنے لگے۔ جعفرؓ کی بیوی نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، آپؐ میرے بچوں پر اس طرح نوازشیں کر رہے ہیں جیسے کسی یتیم پر ہوتی ہیں۔ گویا ان کے باپ اس دنیا میں نہیں رہے؟

رسولؐ خدا نے فرمایا: ہاں وہ قتل کر دیے گئے۔ پھر فرمایا: اے اسماء! ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زبان سے کوئی ناروا بات نکالو اور سینہ کوبی کرو۔ میں تم کو مژدہ سناتا ہوں۔ خدا نے جعفرؓ کو دو پَر عنایت کیے ہیں جن سے وہ بہشت میں پرواز کرتے ہیں۔ (بحارالانوار: ج ۲۱، ص ۵۶ و ۵۷)

جنگ ذات السلاسل

جمادی الثانی سنہ ۸ ہجری قمری میں رسولؐ خدا کو یہ اطلاع ملی کہ قبائل ''بلی'' اور ''قضاعہ'' کے کچھ لوگ جمع ہو گئے ہیں اور مدینہ پر حملہ کرنے کی فکر میں ہیں۔

پیغمبرؐ خدا کے حکم سے لشکر تیار ہوا اور اس کی سپہ سالاری عمرو بن عاص کے سپرد ہوئی، کیوں کہ ان کی بڑی ماں قبیلہ بلی سے تھیں۔ رسولؐ خدا نے چاہا کہ عمرو عاص کو سپہ سالاری دے کر اس گروہ کے قلب کو اسلام کی طرف مائل کیا جائے۔ عمرو بن عاص دن میں کمین گاہ میں چھپے رہتے اور راتوں کو سفر کرتے۔ جس وقت دشمن کے قریب پہنچے تو پتا چلا کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے۔ رسولؐ خدا نے ابوعبیدہ جراح کو دو سو افراد کے لشکر کے ایک دستہ کے ساتھ ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ عمرو بن عاص کے لشکر نے ابوعبیدہ کے امدادی لشکر کے ساتھ قبائل بلی، عذرہ اور بلقین کے تمام رہائشی علاقہ

کا دورہ کیا لیکن دشمن پہلے ہی آگاہ ہو کر اس علاقہ سے بھاگ چکے تھے۔ صرف آخری مقام پر لشکرِ اسلام اور لشکرِ کفر کے درمیان ایک گھنٹہ تک ٹکراؤ ہوا جس میں ایک مسلمان زخمی ہوا اور دشمن شکست کھا کر فرار کر گیا۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۷۷۲-۷۷۹، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۳۲-۳۳، ملخص) ①

دشمن کو ڈرانے کے لیے جنگی مشق

پیغمبرؐ خدا نے "مرالظہران" میں حکم دیا کہ دس ہزار کا لشکر پورے میدان میں بکھر جائے اور ہر آدمی آگ جلائے تاکہ لشکرِ اسلام کی عظمت نمایاں ہو اور مشرکین قریش کے دل میں زیادہ سے زیادہ خوف پیدا ہو جائے اور وہ سمجھ لیں کہ اب اس عظیم لشکر سے مقابلہ کی طاقت ان میں نہیں ہے اور ہر طرح کے مقابلے سے ناامید ہو جائیں تاکہ مکہ بغیر کسی خونریزی کے فتح ہو جائے اور حرمت خانہ خدا محفوظ رہ جائے۔

رات کے اندھیرے میں آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ صحرا آگ کا ایک وسیع و عریض جنگل نظر آ رہا تھا۔ لشکرِ اسلام کے ہمہمہ کی آواز دشت میں گونج رہی تھی۔ ابوسفیان، حکیم ابن حزام

---

① شیعہ مدارک میں یہ واقعہ یوں درج ہے: رسولؐ خدا نے صحابہ میں سے تین افراد ابوبکرؓ، عمرؓ اور عمروؓ بن عاص کو اس سریہ کا امیر مقرر فرمایا لیکن وہ لوگ جنگی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اس لیے آنحضرتؐ نے چوتھی بار حضرت علی علیہ السلام کو امیر بنا کر لشکر کے ساتھ روانہ فرمایا اور آں حضرتؐ نے حضرت علی علیہ السلام اور سپاہیوں کو مسجد احزاب تک رخصت کیا۔

حضرت علی علیہ السلام صبح سویرے دشمن پر حملہ آور ہوئے، دشمن ایک گروہ کثیر کے ساتھ حملہ روکنے کے لیے آگے لیکن حضرت علی علیہ السلام کی بے امان جنگ و پیکار نے دشمن کے دفاعی حملے کو ناکام بنا دیا اور دشمن کو شکست دینے کے لیے حضرت علی علیہ السلام کامیاب و سرفراز ہو کر مال غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے ساتھ رسولؐ خدا کی خدمت میں پلٹے۔ پروردگارِ قہار سورۂ والعادیات میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے:

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ○ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ○ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ○ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ○ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ○ "قسم ہے ان گھوڑوں کی جو نتھنوں پر پتھر پر ٹاپ مار کر چنگاریاں نکالتے ہیں۔ پھر صبح دم حملے کرتے ہیں۔ (کفار کے دیار میں وہ) گرد و غبار بلند کرتے ہیں اور دشمن کے دل میں گھس جاتے ہیں۔

(ارشاد شیخ مفید: ص ۸۹-۹۰، مجمع البیان: ج ۱۰، ص ۵۲۸، بحار الانوار: جلد ۲۱، ص ۶۷-۷۷، مناقب ابن شہر آشوب: ج ۳، ص ۱۴۰-۱۴۲)

اور بدیل ابن ورقا دیکھنے اور پتا لگانے کے لیے مکہ سے باہر نکلے۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۸۱۴)

دوسری جانب عباسؓ ابن عبدالمطلب جو مقام "جحفہ" سے پیغمبرؐ خدا کے ہم رکاب تھے انھوں نے اپنے دل میں سوچا کہ کیا ہی بہتر ہو اگر طرفین کے فائدہ کے لیے کام کیا جائے تاکہ خونریزی نہ ہو۔

لہٰذا سفید گھوڑے پر سوار ہو کر مکہ کی طرف چلے کہ شاید کسی کے ذریعے لشکرِ اسلام کے حملہ اور محاصرہ کی خبر قریش کے سربرآوردہ افراد کے کانوں تک پہنچا سکیں اور ان کو دلاورانِ اسلام کی عظیم طاقت اور بے پناہ جرأت و ہمت سے آگاہ کر کے ہر طرح کے مقابلے کی بات سوچنے سے باز رکھیں۔

عباس نے رات کی تاریکی میں ابوسفیان کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا: "میں نے ابھی تک اتنی آگ اور اتنے سپاہی نہیں دیکھے ہیں"۔

ابوسفیان کا ساتھی کہہ رہا تھا: یہ سب قبیلہ خزاعہ والے ہیں جو جنگ کے لیے جمع ہو گئے ہیں۔
ابوسفیان نے کہا کہ ایسی آگ روشن کرنا اور اس طرح لشکرِ تشکیل دینا خزاعہ کے بس کی بات نہیں ہے۔

عباسؓ نے ان کی بات کاٹی اور کہا کہ ابوسفیان۔

ابوسفیان نے عباسؓ کی آواز پہچان لی اور فوراً کہا: عباسؓ تم ہو۔ کیا کہہ رہے ہو؟
عباسؓ نے جواب دیا: خدا کی قسم، یہ آتش رسولؐ خدا کے لشکر نے روشن کی ہے۔ وہ ایک طاقتور اور نہ ہارنے والا لشکر لے کر قریش کی طرف آئے ہیں اور قریش میں ان سے مقابلہ کرنے کی ہرگز طاقت نہیں ہے۔

عباسؓ کی باتوں سے ابوسفیان کے دل میں اور زیادہ خوف پیدا ہوا۔ خوف کی شدت سے کانپتے ہوئے اس نے کہا: عباسؓ، میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں، مجھ کو بتاؤ میں کیا کروں؟
عباسؓ نے جب دیکھا کہ ان کی بات مؤثر ثابت ہوئی تو فرمایا: اب صرف چارہ یہ ہے کہ تم میرے ساتھ رسولؐ خدا کی ملاقات کے لیے آؤ اور ان سے امان طلب کرو ورنہ سارے قریش کی جان خطرے میں ہے۔

اس کے بعد آپ نے اس کو اپنی سواری پر سوار کیا اور لشکرگاہ اسلام کی طرف لے چلے۔

مشرکین کا پیشوا، مومنین کے چنگل میں

حضرت عباسؓ نے ابوسفیان کو سپاہ اسلام کی عظیم لشکرگاہ سے گزارا۔ سپاہیوں نے حضرت عباسؓ اور پیغمبرؐ خدا کی مخصوص سواری کو، جس پر عباسؓ سوار تھے، پہچانا اور ان کے گزرنے سے مانع نہیں ہوئے بلکہ ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ آدھے راستے میں حضرت عمرؓ کی نظر ابوسفیان پر پڑی اور انھوں نے چاہا کہ اسی جگہ اس کو قتل کر دیں لیکن چونکہ حضرت عباسؓ نے ان کو امان دی تھی اس لیے وہ اپنے ارادہ سے باز رہے یہاں تک کہ حضرت عباسؓ اور ابوسفیان رسولؐ خدا کے خیمے کے پاس پہنچ کر گھوڑے سے اترے۔ حضرت عباسؓ خیمہ میں داخلے کی اجازت لینے کے بعد پیغمبرؐ کے خیمے میں آئے۔ پیغمبرؐ خدا کے سامنے حضرت عباسؓ اور حضرت عمرؓ میں کچھ لفظی جھڑپ ہوئی۔ حضرت عمرؓ یہ اصرار کر رہے تھے کہ ابوسفیان دشمن خدا ہے اور اس کو اس وقت قتل ہو جانا چاہیے لیکن حضرت عباس کہہ رہے تھے کہ میں نے اسے امان دی ہے۔

پیغمبرؐ خدا نے حکم دیا کہ ابوسفیان کو ایک خیمہ میں رکھا جائے اور صبح کو پیغمبرؐ خدا کے پاس لایا جائے۔ صبح سویرے حضرت عباسؓ ابوسفیان کو پیغمبرؐ خدا کے حضور میں لائے۔ جب آنحضرتؐ کی نظر ابوسفیان پر پڑی تو آپؐ نے فرمایا: کیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ تو یہ سمجھے کہ خدائے یکتا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے؟ ابوسفیان نے جواب دیا: میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، آپؐ کتنے بردبار، کریم اور وابستگان کے اور میرے مہربان ہیں۔ میں نے اب سمجھ لیا کہ اگر خدائے واحد کے علاوہ کوئی اور خدا ہوتا تو ہماری مدد کرتا۔

جب اس نے خدا کے یگانہ ہونے کا اعتراف کر لیا تو حضرتؐ نے فرمایا کہ کیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ تم جانو کہ میں خدا کا پیامبر ہوں۔

ابوسفیان نے کہا: مجھے آپؐ کی رسالت میں تردد ہے۔

حضرت عباسؓ تردد سے ناراض ہوئے اور اس سے کہا: اگر تم اسلام قبول نہیں کرو گے تو تمھاری جان خطرے میں ہے۔

ابوسفیان نے خدا کی یگانگت اور پیغمبرؐ خدا کی رسالت کی گواہی دی اور بظاہر مسلمانوں کی

صف میں داخل ہوگیا، اگرچہ واقعاً کبھی بھی مومن نہیں ہوا۔

رسولؐ خدا جانتے تھے کہ ابوسفیان کو ابھی رہا کرنے کا موقع نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مکہ جاکر کوئی سازش کرے اس لیے اسے چاہیے کہ اسلام کی طاقت کا بخوبی مشاہدہ کرلے اور فتح مکہ کے سلسلے میں سپاہِ اسلام کے ارادے کو مکمل طور پر محسوس کرے اور اس خبر کو تمام مشرکین قریش تک پہنچائے تاکہ تمام سرکردہ افراد مقابلہ کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔ اس وجہ سے ابوسفیان کو ایک تنگ جگہ پر رکھا۔ سپاہِ اسلام اسلحہ میں غرق منظم دستہ کی صورت میں اس کے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ جنگی مشق کے وقت مجاہدینِ اسلام کی تکبیر کی آواز کوہ و دشت مکہ میں گونج اٹھتی تھی اور مجاہدین کے دل وفورِ شوق سے لبریز ہوجاتے تھے۔

لشکرِ اسلام کے مسلح دستوں کی عظمت نے ابوسفیان کو اتنا ہراساں کردیا کہ اس نے بے اختیار عباسؓ کی طرف مخاطب ہوکر کہا: ''کوئی بھی طاقت ان لشکروں کا مقابلہ نہیں کرسکتی واقعاً تمہارے بھتیجے نے بڑی زبردست سلطنت حاصل کرلی ہے''۔

حضرت عباسؓ نے غصہ میں کہا: یہ سلطنت نہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے نبوت و رسالت ہے۔

حضرت عباسؓ نے پیغمبرؐ خدا سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ابوسفیان ایسا شخص ہے جو ریاست کو دوست رکھتا ہے اس کو اسی وقت کوئی مقام عطا فرمائیں۔

رسولؐ خدا نے فرمایا کہ ابوسفیان لوگوں کو اطمینان دلاسکتا ہے کہ جو کوئی اس کی پناہ میں آجائے گا امان پائے گا۔ جو شخص اپنا ہتھیار زمین پر رکھ کر اس کے گھر میں چلا جائے اور دروازہ بند کرلے یا مسجد الحرام میں پناہ لے لے وہ سپاہِ اسلام سے محفوظ رہے گا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۴۶)

مکہ میں نفسیاتی جنگ

ابوسفیان مکمل طور پر حواس باختہ اور لشکرِ اسلام کی جنگی طاقت سے ہراساں تھا، رسولؐ خدا نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ اس کو رہا کردیں، تاکہ وہ اپنی قوم میں جاکر ان کے حوصلوں کو متزلزل کرے یہ وہی مقصد تھا جو پیغمبرؐ خدا چاہتے تھے۔

ابوسفیان نے اس کام کو بخوبی انجام دیا۔ اس نے مکہ میں نفسیاتی جنگ چھیڑ کر قریشیوں کو ہراساں کرنے اور بغیر خونریزی کے ہتھیار ڈال دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

شہر کے محاصرہ کی ٹیکنیک

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سپاہیوں کو چار دستوں میں تقسیم فرمایا اور ہر ایک دستہ کو ایک سمت سے شہر کے اندر روانہ کیا اور فوج کے کمانڈروں کو حکم دیا کہ جو تم سے لڑے اس کے علاوہ اور کسی سے جنگ نہ کرنا۔ چنانچہ آپ نے صرف چند مفسدین کو جن کی خیانت کی سزا موت سے کم نہ تھی مستثنیٰ رکھا۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۸۲۵)

رسولؐ خدا نے چاروں طرف سے شہر کے محاصرہ کی ترکیب اپنا کر مشرکین کے امکان فرار کو ان سے سلب کرلیا اور ان کے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی چھوڑا اور وہ یہ کہ ہتھیار ڈال دیں۔

ایک فوجی دستہ کے ساتھ مشرکین کی جھڑپ

لشکرِ اسلام کے شہر میں داخل ہوتے وقت مشرکین معترض نہیں ہوئے۔ فقط قریش کے ان افراد کا ایک گروہ جو افراط سے کام لے رہے تھے صفوان ابن اُمیہ ابن خلف اور عکرمۃ ابن ابی جہل کی رہبری میں خالد ابن ولید کی سرداری میں رہنے والے ایک دستہ سے ٹکرا گیا۔ اس جھڑپ میں دشمن کے ۱۲۸ افراد نہایت ذلت سے مارے گئے اور وہ لوگ مکہ سے بھاگ گئے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۴۹)

شہر مکہ میں داخلہ

رسولؐ خدا لشکرِ اسلام کے ساتھ فاتحانہ شہر مکہ میں داخل ہوئے۔ آپؐ کے چہرۂ اقدس پر ایسا رُعب و داب اور شکوہ وجلال تجلی ریز تھا جو تعریف کی حد سے باہر ہے۔ اسلام کو بہت بڑی فتح نصیب ہوئی تھی۔ آپؐ اہلِ مکہ کے گھروں میں نہیں گئے بلکہ آپؐ نے جاں نثار کرنے والے اور اپنے مہربان چچا ابوطالبؑ کے مزار کے پاس مقامِ حجون میں خیمہ لگایا۔

رسولؐ خدا کچھ دیر تک خیمہ میں آرام فرماتے رہے۔ پھر غسل کے بعد جنگی لباس پہنا، اپنے مرکب پر سوار ہوئے، مجاہدین بھی تیار ہو کر مسجد الحرام کی طرف روانہ ہوئے۔ جب آپ کی نگاہ کعبہ

پر پڑی تو آپؐ آگے بڑھے اور آپؐ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ درآں حالانکہ آپؐ مرکب پر سوار تھے۔ اسی حالت میں تکبیر کہتے جاتے تھے اور لشکرِ اسلام آپؐ کے جواب میں صدائے تکبیر بلند کرتا جاتا تھا۔

''حق آیا اور باطل ختم ہو گیا اور باطل تو ختم ہونے والا ہی تھا''۔ (اسراء:۸۱)

اتحاد کی آواز

حضرتؐ نے کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ سے لی اور دروازہ کھول دیا۔ تمام مسلمانوں نے مل کر دُعائے وحدت پڑھی:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ

آپؐ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے اور جنابِ ابراہیم اور دوسرے افراد کی جو تصویریں مشرکین نے بنا رکھی تھیں ان کو دیوارِ کعبہ سے نکال دیا اور اسی حالت میں آپؐ نے فرمایا: ''خدا ان لوگوں کو قتل کرے جو ان چیزوں کی تصویریں بناتے ہیں جن کو انھوں نے پیدا نہیں کیا ہے''۔

رسولِ خدا نے حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ جو بتوں کو توڑنے کے لیے آپؐ کے کاندھے پر سوار ہوئے تھے، تمام بتوں کو توڑ ڈالا اور آپؐ نے خانۂ توحید کو تمام کفر و شرک کی علامتوں سے پاک کر دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے لوگوں کے سامنے جن کی آنکھیں فرمانِ پیغمبرؐ کی منتظر تھیں، مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

''اس خدا کی تعریف جس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اپنے بندہ کی مدد کی، جس نے انھیں احزاب (گروہوں) کو شکست دی، تم کیا کہتے ہو اور کیا تصور کرتے ہو؟ مکہ والوں نے کہا کہ ''خیر و نیکی اور نیکی کے سوا ہم کو اور کوئی گمان نہیں ہے کہ آپ بزرگوار اور صاحبِ اکرام کے بھتیجے ہیں''۔ رسولِ خدا نے فرمایا کہ میں وہی بات کہتا ہوں جو ہمارے بھائی یوسفؑ نے کہی تھی: آج تمہارے اُوپر کوئی ملامت نہیں ہے، خدا تم کو بخش دے وہ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ مہربان ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ ہر وہ ربا (سود) جو جاہلیت میں معمول بن گیا

تھا اور ہر وہ خون اور مال جو تمھاری گردن پر تھا اور تمام فضول افتخار، پامال اور ختم کر دیے گئے لیکن کعبہ کی نگہبانی، کلید برداری اور حاجیوں کو سیراب کرنے کا افتخار باقی ہے۔ جو لوگ تازیانہ سے غلطی وخطا سے قتل کر دیے جائیں، ان کے لیے سو اسی اُونٹنیاں دیت کے طور پر دی جائیں جن میں چالیس اُونٹنیاں حاملہ ہوں۔ خدا نے جاہلیت کے تکبر وغرور اور آباؤ اجداد پر افتخار کو ختم کر دیا۔ تم آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں اور تم میں سب سے زیادہ خدا کے نزدیک مکرم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک خدا نے مکہ کو زمین وآسمان کی پیدائش کے وقت حرمِ امن قرار دیا ہے اور اللہ کی عطا کی ہوئی حرمت کی بنا پر یہ ہمیشہ حرمِ الٰہی رہے گا۔

ہم سے پہلے اور ہمارے بعد کسی کے لیے بھی اس کی حرمت کا پامال کرنا جائز نہ تھا اور نہ جائز ہے اور میرے لیے بھی اس کی حرمت کو برباد کر دینا ایک دن تھوڑی دیر کے علاوہ جائز نہ تھا (اور آپ نے اپنے ہاتھ سے تھوڑی مدت کی طرف اشارہ فرمایا) مکہ کے جانوروں کا شکار نہ کرنا چاہیے اور نہ ان کو ہنکانا چاہیے۔ اس کے درختوں کو کاٹنا نہیں چاہیے اور اس میں پڑی ہوئی گم شدہ چیز کو اُٹھانا جائز نہیں ہے۔ مگر اس کے لیے جو اس کے اعلان کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور اس کے سبزے اُکھاڑنا بھی جائز نہیں ہے"۔ عباسؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ سوائے اذخر کے پودوں کے کہ جن کو اُکھاڑ پھینکنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ قبروں کے لیے اور گھروں کو صاف کرنے کے لیے بھی۔

رسولِ خدا تھوڑی دیر تک چپ رہے، پھر فرمایا:

"سوائے اذخر کے کہ اس کا اُکھاڑنا حلال ہے۔ وارث کے بارے میں وصیت نہیں ہے...... اور کسی عورت کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کی دولت سے اجازت کے بغیر بخشش وعطا کرے۔ مسلمان، مسلمان کے بھائی ہیں اور تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ دشمن کے مقابل سب متحد اور ہم آہنگ رہیں

ان کا خون محفوظ رہے، ان میں دُور ونزدیک سب برابر ہیں۔ جنگ میں ان میں سے ناتواں اور توانا دونوں برابر مال غنیمت سے بہرہ مند ہوں۔ لشکر کے میمنہ اور میسرہ میں شریک کوئی معیار نہیں ہے۔ مسلمان کافر کے خون کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور کوئی صاحب پیمان، معاہدہ میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ دو مختلف دین رکھنے والے ایک دوسرے کی میراث نہیں پائیں گے۔ مسلمان اپنے علاقہ والوں کو ہی صدقات و زکوۃ دیں گے، دوسری جگہ والوں کو نہیں۔ عورت اپنی پھوپھی اور خالہ کی سوتن نہ بنے۔ مدعی کو دلیل اور شاہد پیش کرنا چاہیے اور منکر کے ذمہ قسم ہے۔

کوئی عورت بغیر محرم کے ایسے سفر پر نہ جائے جس کی مدت تین روز سے زیادہ ہو۔ عیدالفطر اور عید قربان کے روزوں سے میں تم کو منع کرتا ہوں اور ایسے لباس پہننے سے منع کرتا ہوں جس سے تمہاری شرم گاہ کھلی رہے یا ایسا لباس پہننے سے تم کو منع کرتا ہوں کہ جب تمہارے لباس کا کنارہ ہٹ جائے تو تمہاری شرم گاہ نظر آنے لگے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے یہ سارے مطالب سمجھ لیے ہوں گے۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۸۳۶)

بلالؓ کی آواز

ظہر کا وقت آپہنچا، رسولِ خدا نے بلالؓ کو حکم دیا کہ کعبہ کی چھت پر جا کر اذان دیں جس وقت بلالؓ بلند آواز میں اشھد ان محمداً رسول اللہ تک پہنچے تو مشرکین کے سرکردہ افراد کہ جو گھروں میں چھپ گئے تھے ان میں سے ہر ایک نے ایک الگ بات کہی اور اہانت کی۔

ابوسفیان نے کہا: لیکن میں کچھ نہیں کہتا اس لیے کہ اگر میں کوئی بات کہوں گا تو یہی ریگزار محمدؐ کو خبر پہنچا دے گی اور ہر ایک کی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ جائے گی۔

بت پرست، بت شکن

رسولِ خدا نے ان بت پرستوں سے بیعت لی جو مسلمان ہو گئے تھے اور عورتوں کے لیے

بھی پانی کا ایک برتن لایا گیا اور اس میں تھوڑا سا عطر ملا لیا گیا۔ عورتوں نے اپنے ہاتھ کو بیعت کی غرض سے پانی کے اندر ڈالا۔ حضرتؐ نے ان سے یہ عہد و پیمان لیا کہ وہ شرک اختیار نہ کریں۔ زنا اور چوری نہ کریں۔

پھر رسولِ خدا نے سب کو یہ حکم دیا کہ جو بت ان کے پاس ہیں ان کو توڑ ڈالیں یہاں تک کہ آپؐ نے بڑے بڑے مشرکین کو بتوں کے توڑنے کے لیے اطراف میں بھیجا۔ یہ لوگ بتوں پر اعتقاد رکھتے تھے اور اپنے نفع کے لیے بتوں کی حمایت کرتے تھے۔ اب خود ہی بت شکنی میں مصروف ہو گئے۔

آزاد شدہ شہر مکہ کے لیے والی اور معلمِ دین کا تقرر

مشرک قبیلے "ہوازن اور ثقیف" کی سازشوں کی خفیہ خبریں پیغمبرؐ خدا تک پہنچ چکی تھیں۔ اب ان کے علاقوں میں پہنچ کر ان کی سازشوں کو کچل دینا پیغمبرؐ خدا کے لیے ضروری تھا۔ آپؐ نے عتاب ابن اسید جو کہ چوبیس سال کے ایک لائق اور مدبر جوان تھے، کو شہر مکہ کا والی بنایا۔ (سیرت ابن ھشام)

رسولِ خدا نے معاذ ابن جبل کو جو معارفِ اسلام سے واقف فقیہ تھے تبلیغ اسلام اور مکہ والوں کو احکامِ دین سے آشنا کرنے کے لیے اس شہر کے معلم کے عنوان سے معین فرمایا۔ فتح مکہ کے سلسلہ میں سورۂ نصر نازل ہوئی۔ (مغازی واقدی: ج ۲، ص ۸۸۹)

اسلام کے نام پر خونریزی اور جرائم

فتح مکہ کے بعد رسولِ خدا نے خالد ابن ولید کو بت شکنی اور تبلیغ اسلام کے لیے ۳۵۰ مہاجرین و انصار کے ساتھ قبیلہ بنی جذیمہ کی طرف بھیجا۔ خالد نے وہاں پہنچنے کے بعد ان لوگوں کو اپنی طرف سے عدم تعرض کے بارے میں مطمئن کر کے بنی جذیمہ سے ہتھیار رکھوا لیے اور جاہلیت کے زمانہ میں خالد کے چچا کو بنی جذیمہ نے قتل کر دیا۔ لہٰذا اس نے فرمانِ رسولِ خدا کے خلاف ان کو اسیر کیا اور پھر قتل کا حکم دے دیا۔ جانبازانِ مہاجرین و انصار نے حکم پر عمل کیے بغیر اپنے اسیروں کو آزاد کر دیا۔ بنی سلیم خالد کے گروپ نے اپنے اسیروں کو قتل کر ڈالا اور اس طرح سے کچھ بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

جب یہ خبر رسولِ خدا تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: خدایا! خالد نے جو کیا ہے اس کے لیے میں تیری بارگاہ میں بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔ پھر آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو معین فرمایا کہ وہ مقتولین کا خوں بہا اور ستم رسیدہ افراد کا ہرجانہ ادا کریں۔

جو مال رسولِ خدا نے دیا تھا حضرت علی علیہ السلام اسے اپنے ساتھ لے کر بنی جذیمہ کے پاس پہنچے اور آپؐ نے مقتولین کا خوں بہا اور نقصانات کا ہرجانہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ لکڑی کے اس برتن کا بھی حساب ہوا جس میں کتا پانی پیتا تھا۔ جب آپؐ اس بات سے مطمئن ہو گئے کہ اب خوں بہا اور ہرجانہ باقی نہیں رہا جو مال باقی بچا تھا اس کو بھی آپ نے ان کے درمیان تقسیم کر دیا تا کہ وہ مصیبت زدہ افراد رسولِ خدا سے راضی ہو جائیں۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۷۰ و ۷۱)

حضرت علی علیہ السلام جب واپس پلٹے تو آپؐ نے اپنے کام کی رپورٹ آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کی۔ آپؐ نے فرمایا: میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں، تم نے بڑا عمدہ کام کیا، تم نے جو کیا وہ میری نظر میں سرخ بالوں والے اُونٹ رکھنے سے بہتر ہے۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۶۱)

جنگ حنین

(۵ شوال سنہ ۸ ہجری) مشرکین کے اہم مرکز مکہ کی فتح نے اطرافِ مکہ کے مشرک قبیلوں کے دلوں میں شدید رُعب و وحشت پیدا کر دی۔ ان قبیلوں نے تحریکِ اسلامی کی موج کو روکنے کے لیے یہ ارادہ کیا کہ تمام قبائل کے اتحاد اور ملاپ سے ایک وسیع نقشہ کے تحت غفلت کے عالم میں مسلمانوں کے حملہ سے پہلے ہی ان پر حملہ کر دیا جائے۔

ہوازن، ثقیف، نصر، سعد اور چند دوسرے قبیلوں نے مل کر اسلام کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنایا اور مالک ابن عوف جو ایک جنگجو اور دلیر جوان تھا اسی کو لشکر کا سپہ سالار چنا گیا۔

دشمن کی سازش سے پیغمبرؐ خدا کی آگاہی

جنگی محاذ کی تشکیل اور دشمن کی سازشوں کی خبر رسولِ خدا کے کانوں تک پہنچی۔ حضرت نے سراغ رساں فورس کے ایک آدمی کو دشمن کے جنگی راز کی اطلاعات فراہم کرنے کے لیے متحد قبائل کے درمیان بھیجا۔ پیغمبرؐ خدا کا فرستادہ دشمن کے لشکر میں گھس کر ان کے نقشوں اور ان کے خفیہ جنگی

ارادوں سے باخبر ہو گیا اور ان کے لشکر کا تجزیہ کرنے کے بعد مکہ واپس آیا اور جو کچھ دیکھا اور سنا تھا وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں بیان کر دیا۔

حنین کی طرف روانگی

دشمن کے حالات سے مکمل آگاہی کے بعد رسولؐ خدا ۱۲ ہزار سپاہیوں، دس ہزار فتح مکہ میں شرکت کرنے والے مہاجرین و انصار اور دو ہزار دلیرانِ مکہ کے ساتھ جو اسلامی تحریک سے آملے تھے۔ مکہ سے دشمن کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ لشکر جزیرہ کی تاریخ میں بے نظیر تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک شخص نے سفر کی ابتدا میں جب جاں بازوں کی کثرت اور لشکرِ اسلام کے جنگی ساز و سامان کو دیکھا تو کہا کہ اب مسلمان سپاہ کی کمی کی بنا پر مغلوب نہیں ہوں گے۔ وہ اس بات سے غافل تھا کہ صرف افراد اور ساز و سامان ہی کامیابی کا سبب نہیں ہوتے۔

دشمن کی اطلاعات اور ان کی تیاری

دشمن کے لشکر کے سپہ سالار مالک ابن عوف نے اپنے تین آدمیوں کو جاسوسی اور لشکرِ اسلام کا تجزیہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ لوگ لشکرِ اسلام کو دیکھنے اور ان کی تمام عظمت و شکوہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد وحشت زدہ ہو کر واپس گئے اور لشکرِ اسلام کی عظیم طاقت کی خبر اپنے سپہ سالار کو پہنچائی۔ اس خبر سے مالک کو یہ احساس ہو گیا کہ آمنے سامنے کی جنگ میں اس کا لشکر، لشکرِ اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ حنین کی بلندیوں پر جنگی اعتبار سے مناسب جگہوں، پتھروں کے پیچھے اور پہاڑوں کی بلندیوں پر مورچہ سنبھال لیں اور اس تنگ جگہ پر لشکرِ اسلام کے آتے ہی یکبارگی حملہ کر دیں۔ جنگجو افراد جنگ میں زیادہ مقاومت کا مظاہرہ کریں۔ اس غرض سے اس نے حکم دیا کہ عورتوں، بچوں، چوپایوں اور اپنے مال کو بھی اپنے ساتھ لے لیں تاکہ ان سب کے دفاع میں زیادہ کوشش کریں۔

درۂ حنین میں

مکہ سے ۲۸ کلومیٹر مشرق میں واقع درہ حنین کے نزدیک لشکرِ اسلام شب سہ شنبہ ۱۰ شوال سنہ ۸ ہجری کو پہنچ گیا۔ رسولؐ اسلام کے حکم کے مطابق لشکرِ اسلام رات کو سو گیا اور صبح سویرے

خالد ابن ولید کی کمان میں لشکر کا ہراول دستہ تیار کر کے آگے بھیج دیا۔

خالد شمال و مشرق مکہ سے ۱۲ کلومیٹر دور مقام جعرانہ تک بڑھتے چلے گئے۔ ۱۰ شوال صبح کو دونوں لشکر آپس میں ملے اور درہ حنین میں داخل ہو گیا۔ (مغازی واقدی: ج ۳، ص ۸۹۹)

فرار

دشمن جو لشکرِ اسلام کی آمد کے لیے آمادہ اور منتظر تھے یکبارگی مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ صبح کی تاریکی ان کی مددگار تھی۔ سنگلاخ ان کی پناہ گاہ تھے۔ ان پناہ گاہوں سے لشکرِ اسلام پر تیر بارانی ہو رہی تھی اور گھوڑے بھاگ رہے تھے۔

فوج بھاگنے لگی۔ بنی سلیم کے سواروں نے جو خالد کی کمان میں تھے ابتداہی میں فرار کو قرار پر ترجیح دی۔ اس کے بعد دو ہزار کی بھاگنے والے افراد کے ساتھ ہو گئے۔ پھر تو بقیہ افراد بھی بھاگنے لگے۔ رسولؐ خدا کے پاس صرف دس آدمی رہ گئے۔ آپ دشمن کے نرغے میں گھرے نہایت دلیری سے ان کا مقابلہ کر رہے تھے اور ان کے اردگرد جو لوگ تھے وہ مردانہ وار جنگ میں مصروف تھے۔ اس مقابلہ میں ایمن نامی لشکرِ اسلام کا ایک سپاہی اپنے رہبر اور مقصد کا دفاع کرتے ہوئے خاک و خون میں غلطاں ہو کر شہادت پر فائز ہو گیا۔ (سیرت ابن ہشام)

واپسی، مقابلہ، کامیابی

پیغمبرؐ خدا نے اس حساس موقع پر مخصوص انداز سے متفرق اور بھاگے ہوئے لشکر کو جمع کیا۔ جب آپ نے لشکر کو فرار کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: لوگو، کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ اس کے بعد پیغمبرؐ خدا نے اپنے چچا عباسؓ سے جن کی آواز بلند تھی، کہا کہ آپ ان کو آواز دیں کہ "اے گروہ انصار! اے اصحابِ بیعت رضوان! پیغمبرؐ کی طرف پلٹ آؤ"۔

پیغمبرؐ خدا کی استقامت و پائیداری اور حضرت عباسؓ کی آواز سے مسلمان ہوش میں آگئے اور ایک کے بعد ایک پلٹ آئے، مقابلہ کرنے والے لشکر کی تعداد سو تک پہنچ گئی اور بہادروں کی زبردست جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ کی تپش میں پیغمبرؐ خدا نے فرمایا کہ اب جنگ کا تنور دہک اٹھا ہے۔

میدانِ رزم و پیکار کے شجاع ترین بہادر حضرت علی علیہ السلام شروع ہی شمع نبوت کے اردگرد پروانہ وار چکر لگاتے اور جان کی بازی لگا کر پیغمبرؐ خدا کا دفاع کر رہے تھے۔ اس عرصہ میں آپ نے بنی ہوازن کے چالیس جیالوں کو جہنم رسید کیا۔

رسولِؐ خدا نے اپنی باریک بین اور حکیمانہ کمان میں دشمن کے لشکر کو غفلت میں ڈال دینے والے حملے کے برخلاف ایک نئی لہر کا آغاز کیا۔ آپ بہ نفس نفیس رجز پڑھتے جاتے تھے اور ایسی شجاعت کے ساتھ دشمن سے مقابلہ کرتے جاتے تھے جو تعریف و بیان حدود سے باہر ہے۔ دشمن ہاتھ آئی ہوئی فتح کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن لحظہ بہ لحظہ کمزور ہی ہوتے جارہے تھے اور سامنے لشکرِ اسلام کی ہر لحظہ تعداد بڑھتی جارہی تھی۔

آخرکار دشمن کی دفاعی لائن ٹوٹ گئی، مال وزن و فرزند کی حمایت دشمن کی پائیداری کے لیے مضبوط سہارا نہ بن سکی۔ لشکرِ اسلام کے واپس پلٹ آنے اور ان کی شجاعانہ جنگ کی بدولت مطلع صاف ہونے کے ساتھ ساتھ دشمن کی شکست کے آثار نمایاں ہوئے اور اسلام کو کامیابی ملی۔ چھے ہزار دشمن اسیر ہوئے۔ پھر اور بہت زیادہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا جو کہ چوبیس ہزار اُونٹ چالیس ہزار گوسفند اور تقریباً آٹھ سو پچاس کلوگرام چاندی پر مشتمل تھا۔ یہ مال چھوڑ کر میدانِ جنگ سے بھاگ گئے۔ (تاریخ پیامبر: مصنف مرحوم ایتی، ص ۵۵۲)

عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرو

جب جنگ کی آگ بھڑک رہی تھی تو اس وقت رسولِؐ خدا ایک عورت کی لاش کے پاس سے گزرے۔ لوگوں نے آپ کو بتایا کہ یہ وہ عورت ہے جس کو خالد بن ولید نے قتل کیا ہے۔ پیغمبرؐ خدا نے مجاہدین میں سے ایک شخص کے ذریعے حکم بھیجا کہ خالد کے پاس پہنچ کر کہو کہ رسولِؐ خدا نے تمھیں عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ (مغازی: ج ۳، ص ۹۱۳)

چند قدم آگے بڑھ کر آپ نے ایک دوسری عورت کی لاش دیکھ کر فرمایا: اس کو کس نے قتل کیا ہے؟ ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے اسے قتل کیا ہے۔ میں نے اس کو اپنی سواری کی پشت پر بٹھایا، اس نے مجھے مار ڈالنا چاہا تو میں نے اس کو قتل کر دیا۔ پیغمبرؐ خدا نے کہا: اس کو سپردِ خاک کر دو۔ (حوالۂ سابق)

دشمن کے فرار کے بعد آپ نے حکم دیا کہ تمام مالِ غنیمت بدیل ابن ورقاء کی نگرانی میں مقام جعرانہ میں جمع کیا جائے اور لشکر کا ایک دستہ ان مشرکین کے تعاقب میں جائے جو مقام نخلہ اور اوطاس تک بھاگ گئے تھے۔ تعاقب کرنے والا دستہ دشمن کو مکمل شکست دے کر اپنے مرکز پر پلٹ آیا۔

آغاز جنگ میں مسلمانوں کی شکست کا تجزیہ

① غرور، اپنی کثرت اور جنگی سازوسامان پر اعتماد اور نتیجہ میں خودفریبی اور غیبی امداد سے غفلت، آغاز جنگ میں مسلمانوں کی شکست وفرار کے اہم اسباب تھے۔

جیسا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: ''خدا نے بہت سی جگہوں پر تمھاری مدد کی منجملہ ان کے جنگ حنین میں اس نے تمھاری مدد کی، اس وقت جب تم کو تمھاری کثرت نے تعجب میں ڈال دیا لیکن اس نے تمھیں ذرا سا بھی فائدہ نہیں پہنچایا اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی۔ پھر تم رُوگرداں ہوکر بھاگ گئے۔ پھر خدا نے پیغمبرؐ خدا اور مومنین پر سکینہ (اطمینان) نازل کیا اور ایسا لشکر نازل کیا جس کو تم دیکھتے نہ تھے اور کافروں کو ذلت وعذاب میں ڈال دیا۔ (التوبہ:۲۵)

② دوسرا سبب لشکرِ اسلام میں منافقین جیسے ابوسفیان وغیرہ کا وجود تھا جو دشمن کے پہلے ہی حملے سے بھاگ کھڑے ہوئے اور نتیجے میں دوسرے سپاہیوں کے حوصلوں کی کمزوری کا سبب بنے اور وہ لوگ بھی بھاگ گئے۔

③ شب کی تاریکی اور جغرافیائی حالات بھی دشمن کے لیے معاون ثابت ہوئے۔

طائف کی جنگ

(شوال سنہ ۸ ہجری قمری) لشکرِ اسلام کی کامیابی کے ساتھ حنین کی جنگ ختم ہوگئی۔ دشمن کے لشکر کا سردار مالک ابن عوف اپنے ساتھیوں کے ساتھ بھاگ کر مکہ سے ۷۵ کلومیٹر دور طائف میں پناہ گزین ہوا۔

رسولِ خدا کچھ مجاہدینِ اسلام کو ساتھ لے کر طائف کی طرف روانہ ہوئے تا کہ طائف میں مشرکین کی آخری پناہ گاہ کو بھی توڑ دیا جائے۔

لشکرِ اسلام طائف پہنچا، مشرکین بلند دیواروں والے مضبوط قلعہ میں بے پناہ کھانے پینے کے سامان اور قلعہ کے اندر ہی پانی کے انتظام کے ساتھ نہایت اطمینان کے ساتھ مقابلہ کرنے لگے اور قلعہ کی دیواروں کے اُوپر سے لشکرِ اسلام پر تیر بارانی شروع کردی۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴،ص ۱۲۱ و ۱۲۵)

اسلحوں کی ٹیکنالوجی

اس مستحکم قلعہ کو فتح کرنے کے لیے سلمانؓ نے ایک اسکیم بنائی اور اسے رسولؐ خدا کی خدمت میں عرض کیا۔ اسکیم یہ تھی کہ منجنیق اور پتھر و گولہ باری کرنے والی گاڑیوں کو کام میں لاکر قلعوں کو فتح کیا جاسکتا ہے۔ رسولؐ خدا نے سلمانؓ کو حکم دیا کہ اس قسم کا اسلحہ مہیا کرو۔ وہ بھی اپنے کام میں مشغول ہوگئے اور انھوں نے قلعہ کی دیواروں کے پار بڑے بڑے پتھر پھینکنے کے لیے منجنیق (جیسے آج کل کا ٹینک) اور قلعہ کی دیواروں سے نزدیک ہوکر ان کو تباہ کرنے کے لیے گولہ بار بنا کر میدانِ جنگ میں پہنچایا۔

گولہ اور پتھر بارانی کرنے والی گاڑی کی چھت موٹے اور سخت چمڑے کی بنی ہوئی تھی۔ جس پر دشمنوں کے پھینکے گئے تیر اثر انداز نہیں ہوسکتے تھے۔ (مغازی واقدی: ج ۳،ص ۹۲۷)

اس طرح پیغمبرؐ خدا کے حکم سے بہت زیادہ مقدار میں خاردار شاخیں خارخسک قلعہ کے اطراف میں بکھیر دی گئیں۔ یہ کانٹے دشمنوں کے سپاہیوں اور ان کے گھوڑوں اور اُونٹوں کے پیروں میں چبھ جاتے تھے۔

اس گاڑی کے ذریعے مجاہدینِ اسلام قلعہ کی دیوار تک پہنچ گئے اور آسانی سے دیوار کے کچھ حصّہ کو گرانے اور قلعہ کو فتح کرنے میں دیر نہ تھی کہ دشمن نے آگ اور دہکتے ہوئے پتھروں سے حملہ کرکے گاڑی کے چمڑے کی چھت کو جلا کر تہس نہس کر ڈالا۔ کچھ مجاہدینِ اسلام شہید یا زخمی ہوئے۔ نتیجہ یہ رہا کہ قلعہ کو فتح کرنے کی کوشش بارآور نہ ہوسکی۔

واپسی

طائف کے گرد ۲۰ دن سے زیادہ لشکرِ اسلام کا محاصرہ رہا۔ قبیلہ ثقیف کے افراد بڑی

پامردی سے مقابلہ کر رہے تھے۔ اندرونِ قلعہ غذا اور رفاہی سامان کے ذخیروں کی موجودگی کی بنا پر یہ محاصرہ بے نتیجہ رہا اور قلعہ تک پہنچنے کے لیے طویل محاصرہ کی ضرورت تھی۔

ایک طرف مدینہ سے دُوری غذا اور جانوروں کے چارہ کی کمی کا خطرہ لشکرِ اسلام کو تھا ہی اس کے علاوہ حرمت کا مہینہ اور حج کا زمانہ نزدیک تھا۔

رسولِ خدا نے اعلان کیا کہ غلاموں میں سے جو کوئی بھی حصار کے نیچے آجائے گا وہ آزاد ہے۔ چند لوگوں نے اپنے آپ کو لشکرِ اسلام کے حوالے کر دیا اور رسولِ خدا کے پاس آکر دشمن کے حالات کی اطلاع دے دی۔ رسول اللہ نے ان لوگوں کو آزاد کر دیا اور اس کے بعد اعلان کیا کہ طائف کا محاصرہ ختم کیا جائے اور سب واپس لوٹ جائیں۔ (طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۱۵۸)

ہوازن کے اسیروں کی رہائی

رسولِ خدا درۂ جعرانہ یا جعرانہ (یہی زیادہ مشہور ہے) لوٹ آئے تاکہ اسیروں اور مالِ غنیمت کے بارے میں بتائیں کہ کیا کیا جائے۔ یہاں اسراء سائبان کے نیچے زندگی بسر کرتے تھے۔ قبیلہ ہوازن کے بعض وہ افراد جو جنگ میں شریک نہیں تھے اور اسیر نہیں ہوئے تھے۔ وہ رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسیران ہوازن کی رہائی کی درخواست کی۔ پیغمبرِ رحمت نے ان کی خواہش کو قبول فرمایا اور چھے ہزار اسیران ہوازن کو آزاد کر دیا۔ اس طرح جزیرۃ العرب کا بہت بڑا اور خطرناک قبیلۂ اسلام کی طرف مائل ہوا۔

جنگ کی آگ بھڑکانے والوں کے رہبر مالک ابن عوف کو رسولِ خدا نے پیغام کہلوایا کہ اگر وہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دے تو اس کا مال اس کی بیوی سب اسے واپس مل جائے گا (الگ سے) سو اُونٹ بھی ملیں گے۔ قبیلہ ہوازن کے سلسلہ میں پیغمبرِ خدا کی رحمت اور جواں مردی کے سلوک نے مالک ابن عوف جیسے سرکش کو رام کر لیا۔ وہ راتوں رات طائف سے بھاگ کر رسولِ خدا کی خدمت میں پہنچا اور مسلمان ہو گیا۔ اس طرح فتنہ کے بڑے عامل قبیلہ ہوازن کا خطرہ ٹل گیا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۱۳۳)

مالِ غنیمت کی تقسیم اسیروں کی آزادی کے بعد کچھ سپاہی رسولِ خدا کے گرد جمع ہوئے اور نہایت اصرار کے ساتھ مال کی تقسیم کے خواستگار ہوئے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر "یہامہ" کے درختوں کے برابر بھی گوسفند اور اُونٹ تمھارے لیے ہوں تو میں ان سب کو تمھارے درمیان تقسیم کروں گا۔ تم میرے اندر خوف، بخل اور جھوٹ نہیں پاؤ گے۔ اس مالِ غنیمت میں میرا حق پانچویں (خمس) حصّہ سے زیادہ نہیں ہے۔ میں اسے بھی تم کو دے دوں گا، لہٰذا اگر کسی نے ایک سوئی اور دھاگہ بھی اُٹھایا ہو تو لوٹا دے، اس لیے کہ غنیمت میں خیانت کی جزاء قیامت کے دن رُسوائی، بدنامی اور آتش کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

اس وقت انصار میں سے ایک شخص ایک دھاگے کی ریل (ملکلی) لے آیا اور کہا: میں اس دھاگے کو اپنے اُونٹ کا سامان سلنے کے لیے اُٹھالے گیا تھا۔

پیغمبرؐ خدا نے فرمایا کہ اس ریل میں سے میرا حق تیرے پاس رہ جاتا۔ اس مرد انصاری نے کہا کہ اگر اتنا سخت مسئلہ ہے تو مجھے دھاگے اور ریل کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اس کو مالِ غنیمت کے ڈھیر میں لے جاکر رکھ دیا۔

وہ افراد جن کی دلجوئی کی گئی

جب مالِ غنیمت کی تقسیم شروع ہوئی اور تمام افراد کا حصّہ دے دیا گیا تو رسولِ خدا نے خمس غنائم کو سردارانِ قریش کے درمیان تقسیم کر دیا اور ابوسفیان، اس کے بیٹے معاویہ، حکم ابن حزام، حارث ابن حارث اور حارث ابن ہشام، جو کہ بہت زمانہ تک گروہ شرک وکفر کے سردار تھے، ان میں سے ہر ایک کو سو اُونٹ اور عظمت ومرتبت کے لحاظ سے معمولی افراد کو پچاس یا پچاس سے کم اُونٹ دیے گئے۔

رسولِ خدا کی بخشش کی دو دلیلیں تھیں: ایک تو یہ کہ یہ لوگ رسولِ خدا کی عطوفت ومحبت سے متاثر ہوں اور ان کا دل اسلام کی طرف مائل ہو اور ان سے کینہ ختم ہو جائے۔ اصطلاح میں اس عمل کو "تالیفِ قلوب" کہتے ہیں۔ فقہ اسلام میں زکوۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف یہ بھی ہے۔
دوسری بات یہ تھی کہ جزیرۃ العرب کے مشرک قبائل کے سربرآوردہ افراد اسلام کو قبول کرلیں تاکہ کم سے کم لڑائی ہو اور جزیرۃ العرب کے باقی افراد بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں۔

منافقین کا اعتراض

رسولِ خدا کی بڑی بخششیں بہت سے سپاہیوں کے اعتراض کا سبب بنیں۔ اسی درمیان ان

افراد نے سب سے زیادہ اعتراض کی آواز بلند کی جو بظاہر احکام دین پر توجہ دیتے تھے مگر باطن میں ان کو دین سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ امر دین میں تاویل وغیرہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ دل کے روگی "ذوالخویصرہ" نے عتاب آمیز لہجے میں رسولؐ خدا سے کہا: اے محمدؐ! آپ خدا سے ڈریں اور عدل و انصاف سے کام لیں۔

رسولؐ خدا اس شخص کی باتوں سے برہم ہوئے اور فرمایا: اگر میں انصاف سے کام نہ لوں گا تو عدالت کس کے پاس ملے گی؟ اصحاب میں سے ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضورؐ! اگر اجازت ہو تو میں جسارت کرنے والے کا سر تن سے جدا کر دوں لیکن حضرتؐ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ "جلد ہی تمھیں ایسے پیرو ملیں گے جو دین میں اتنی باریک بینی سے کام لیں گے کہ دین سے خارج ہو جائیں گے"۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۱۳۹)

دوستوں کے آنسو

رسولؐ خدا کی بخششوں نے قریش اور قبائل کے سربرآوردہ افراد یہاں تک کہ انصار کو بھی رنجیدہ کر دیا اور وہ یہ سوچنے لگے کہ یہ بخششیں خاندان اور رشتہ داریوں کی بنا پر ہیں۔

رسولؐ خدا کو انصار سے یہ اُمید نہ تھی، آپؐ رنجیدہ ہوئے اور ان سے فرمایا: "کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ دوسرے افراد گوسفندوں اور اُونٹوں کے ساتھ اپنے گھر کو جائیں اور تم رسولؐ خدا کے ہمراہ اپنے گھروں کو واپس جاؤ"۔

انصار رسولؐ خدا کی بات سن کر شدت سے روئے اور عرض کیا: "یہی ہونا چاہیے کہ رسولؐ خدا ہمارے حصّہ میں ہوں، ہم اسی پر راضی ہیں"۔

مدینہ کی طرف واپسی

مالِ غنیمت کی تقسیم تمام ہوئی۔ رسولؐ خدا نے عمرہ کے قصد سے مقام جعرانہ سے احرام باندھا اور زیارتِ خانہ خدا کے لیے مکہ کی سمت روانہ ہو گئے۔ عمرہ کی ادائیگی کے بعد آپ نے عتاب ابن اسید اور معاذ ابن جبل کی، جنھیں مکہ کا امیر اور معلم علم دین بنا کر اس شہر میں رکھا، ماموریت کی مدت بڑھا دی۔

اس کے بعد ذی الحجہ کے مہینہ میں مہاجرین اور انصار کے ساتھ مدینہ لوٹ آئے۔

غزوۂ تبوک

(ایک ہولناک خبر) سنہ ۹ ہجری رجب کا مہینہ بڑی گرمی کا مہینہ تھا۔ شدید قحط اور گرانی کے ایک زمانے کے بعد کہ جن سے لوگ حد درجہ پریشان ہو چکے تھے، پھلوں اور خرمے کے تیار ہونے اور چننے کا زمانہ آ گیا۔ لوگوں نے ذرا اطمینان کا سانس لینے کی سوچی ہی تھی کہ ہولناک قسم کی خبریں پیغمبرؐ خدا کے پاس آنے لگیں کہ عربستان کے شمال مشرق کی سرحدوں پر یعنی روم کے مطلق العنان بادشاہ کی طرف سے مسلمانوں کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

نبطی تجار جو "میدہ اور زیتون" کا تیل فروخت کرنے کے لیے مدینہ آتے تھے انھوں نے کہا کہ بادشاہ روم ہرقل نے بلقاء کے علاقے میں ایک عظیم لشکر جمع کر رکھا ہے۔ اس لشکر کا کھانے پینے کا اور ایک سال کی تنخواہ کا انتظام بھی اس نے کر دیا ہے اور سرحدی قبائل عرب لخم، جذم سے بھی اپنے سے ہم آہنگی کر لی ہے اور اسلامی سرزمین پر حملہ اور اسلامی تحریک کو مٹا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

رسولؐ خدا ایک ایسا عظیم لشکر جمع کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے جو روم کی بڑی طاقت کے لشکروں سے مقابلے کی طاقت رکھتا ہو۔

پیغمبرؐ خدا جنگوں میں اپنا آخری مقصد معین نہیں فرماتے تھے۔ اس عادت کے برخلاف اس بار لشکر جمع کرنے کے آغاز ہی کے دنوں سے اس جنگ کے مقصد کا آپ نے اعلان کر دیا تاکہ لشکر، دشت سوزاں میں دور دراز کے راستے کو طے کرنے، دشوار کام کے انجام دینے اور نہایت طاقتور دشمن سے جنگ کرنے کے لیے تمام تیاریوں کے ساتھ ضروری ساز و سامان اور غذا لے کر روانہ ہوں۔

منافقین کی حرکتیں

اس زمانے کے منافقین نے لشکر کی جمع آوری کے آغاز میں، حکومت اسلامی کی دی ہوئی آزادی سے سوئے استفادہ کرتے ہوئے، حساس ترین اوقات میں مایوس کن پروپیگنڈہ اور نفسیاتی

جنگ کے ذریعے مسلمانوں کو راہ خدا میں جہاد سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ یہ لوگ درحقیقت استکباری طاقتوں کے نفع کے لیے قدم اٹھا رہے تھے۔

اسلام کے خلاف منافقین کی خیانت آمیز تحریک تاریخ اسلام میں حادثہ مسجد ضرار کے نام سے مشہور ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

منافقین میں سے ایک سرکردہ "ابوعامر" نامی فاسق، رسولؐ خدا کی مدینہ ہجرت کے بعد اپنی خیانتوں کی بدولت بھاگ کر مکہ اور طائف پہنچا اور ان کے فتح ہونے کے بعد وہاں سے بھاگ کر روم چلا گیا۔ وہیں سے مدینہ کے منافقین سے اس کا رابطہ تھا اور فکری امداد بھی کرتا رہتا تھا۔ اس نے اپنے ہواخواہوں کو خط میں لکھا کہ "میں قیصر روم کے پاس جا رہا ہوں اور اس سے فوجی مداخلت کی درخواست کروں گا کہ اس کی مدد سے ہم مدینہ پر حملہ کریں۔ اب تم "قبا" کے دیہات میں مسلمانوں کی مسجد کے مقابلہ میں ایک مسجد بنالو اور نماز کے موقع پر وہاں جمع ہو جایا کرو اور فریضہ کی ادائیگی کے بہانے اسلام اور مسلمانوں کے موضوع اور اپنے منصوبوں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس موضوع پر گفتگو کیا کرو۔

یہ مسجد، لشکرِ اسلام کے تبوک روانہ ہونے سے پہلے بن کر تیار ہوگئی۔ منافقین اس مسجد کی آڑ میں اپنی کارکردگی کو منظم شکل دے سکتے تھے۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ان لوگوں نے رسولؐ خدا سے درخواست کی کہ آپ ان کی مسجد میں نماز ادا کریں اور اس مسجد کا افتتاح کردیں۔

رسولؐ خدا نے جواب میں فرمایا: ابھی میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں اور سفر کی تیاری میں مصروف ہوں۔ اگر خدا نے چاہا تو واپسی پر آؤں گا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۱۵۹)

بہانے

منافقین جنگ میں شرکت نہ کرنے کے لیے بڑے لچر بہانے تراشتے رہتے تھے۔ رسولؐ خدا نے "جد ابن قیس" نامی ایک منافق سے کہا: کیا تم رومیوں کے ساتھ لڑنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے؟

جد ابن قیس نے جواب دیا: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے آپؐ اس بات کی اجازت دیں کہ میں شہر ہی میں رہوں، مجھے آپؐ فتنہ میں نہ ڈالیں، اس لیے کہ میرے قبیلہ کے لوگ جانتے ہیں کہ

کوئی بھی مرد میری طرح عورت سے محبت نہیں رکھتا۔ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ اگر میں روم کی عورتوں کو دیکھوں گا تو فتنہ (وگناہ) میں پڑ جاؤں گا"۔

رسولِ خدا نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا: "تم جہاں جانا چاہتے ہو جاؤ"۔

قرآن اس منافق کی بہانہ بازی کے بارے میں اعلان کرتا ہے: ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو جہاد میں شرکت کرنے سے معاف رکھیں اور فتنہ میں نہ ڈالیں، آگاہ ہو جاؤ کہ یہ لوگ خود فتنہ میں پڑے ہوئے ہیں اور بے شک دوزخ ان کافرین کو گھیرے ہوئے ہے"۔ (التوبہ:۴۹)

منافقین کام میں رخنہ ڈالنے اور جنگ کے بارے میں لوگوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے کہتے تھے۔ اس گرمی کے موسم میں جنگ کے لیے نہ جاؤ۔ یہ موسم جنگ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ خدا نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا:

"جن لوگوں نے رسولِ خدا کے رکاب میں حکمِ جہاد سے رُوگردانی کی وہ خوش ہیں اور راہِ خدا میں جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے کو ناگوار جانتے ہیں (اور مومنین کو بھی جہاد سے منع کرتے ہیں) وہ لوگ کہتے ہیں کہ اس گرمی میں کوچ نہ کرو۔ ان سے کہہ دیجیے کہ دوزخ کی آگ زیادہ جلانے والی ہے۔ اگر لوگ سمجھ لیں"۔ (سورۂ توبہ:۸۱)

منافقین آرام طلب، ثروت مند اور کچھ ناواقف عرب نے مختلف بہانوں سے اس جنگ میں شرکت کرنے سے گریز کیا۔ خداوند عالم اعراب کے بارے میں فرماتا ہے:

"بادیہ نشینوں (اعراب) میں سے کچھ لوگ آپؐ کے پاس عذر کرتے ہوئے آئے اور جہاد سے معافی چاہ رہے تھے اور کچھ لوگ جو رسولِ خدا کی تکذیب کرتے تھے، جہاد سے بیٹھ رہے۔ کافر جلد ہی دردناک عذاب میں پہنچیں گے"۔ (سورۂ توبہ:۹۰)

منافقین کی ٹیم کے اڈہ کا انکشاف

رسولِ خدا کو خبر ہوئی کہ منافقین کا ایک گروہ "سویلم" یہودی کے گھر ایک انجمن بنا کر

سازشوں اور لوگوں کو جہاد میں شرکت کرنے سے روکنے کی پلاننگ میں مصروف ہے۔ رسولِ خدا نے سمجھ لیا کہ اگر ان کے ساتھ کوئی قطعی سلوک نہ کیا گیا جس سے عبرت حاصل کریں تو وہ اپنی مکارانہ سازشوں سے اسلام کو چوٹ پہنچائیں گے۔ انھوں نے حکم دے دیا کہ اس ٹیم کے اڈہ کو گھیر کر اس میں آگ لگا دی جائے۔ آنحضرتؐ کے حکم سے اسلام کے چند محافظین نے اس گھر کو آگ لگا دی اور منافقین کے فرار کے بعد ان کی انجمن بکھر گئی۔ فرار کے وقت پشت بام سے زمین پر گرنے کی وجہ سے ایک منافق کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۱۶۰)

جنگی اخراجات کی فراہمی

مضبوط لشکر مرتب کرنے کے اخراجات کے لیے نیکوکار اور ثروت مند مسلمانوں نے جاں بازانِ اسلام کی مالی امداد کی اور مسلمانوں نے اخراجاتِ جنگ مہیا کرنے میں بے مثال دلچسپی کے ساتھ کوشش کی۔ مسلمان عورتوں نے اپنے زیورات رسولِ خدا کے پاس بھیج دیے تاکہ وہ جنگ کے مصرف میں کام آئیں۔ ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق محاذِ جنگ کی کمک کرنے میں کوشاں تھا۔

مثال کے طور پر ایک غریب مزدور ایک صاع (تین کلو) خرما پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں لا اور عرض کرنے لگا: اے اللہ کے رسولؐ! میں نے نخلستان میں کام کیا تو دو صاع خرما مزدوری ملی۔ ایک صاع تو میں نے اپنے گھر کے لیے رکھ لیا اور ایک صاع جنگ کے اخراجات جمع کرنے کے لیے لایا ہوں۔

منافقین نے یہاں بھی اپنے غلط پروپیگنڈے کو جاری رکھا۔ اگر کوئی دولت مند مالی امداد کرتا تو کہتے تھے کہ ریاکاری کر رہا ہے اور اگر کوئی غریب خلوص کی بنا پر تھوڑی سی مدد کرتا تو کہتے کہ خدا کو اس کمک کی ضرورت نہیں۔ (مجمع البیان: ج ۵، ص ۲۵۷)

منافقین کی ان باتوں کے بارے میں قرآن مجید میں خدا فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو خود سے مدد کرنے والے مومنین اور ان لوگوں کے صدقہ میں عیب نکالتے اور مذاق اُڑاتے ہیں جن کے پاس جو ہے دے رہے ہیں۔ تنگ دستی میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ خدا ان کا تمسخر کرتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ (سورۂ توبہ: ۷۹)

اشکِ حسرت

منافقین کی سازشوں اور پروپیگنڈوں اور افواہوں کے مقابل پاکیزہ دل مومنین کا ایک گروہ جنگ میں شرکت کے شوق میں رسولِ خدا کی طرف دوڑ پڑا۔ چونکہ یہ لوگ غریب تھے ان کے پاس سواری کا انتظام نہ تھا، لہٰذا انھوں نے رسولِ خدا سے خواہش کی کہ ان کو مرکب عطا کیا جائے تاکہ حضورؐ کی رکاب میں دراز صحراؤں کا سفر کر کے اس جہادِ مقدس میں شرکت کریں۔

رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: میرے پاس کوئی ایسی سواری نہیں ہے جس پر تم کو سوار کروں۔ یہ لوگ اس وجہ سے افسوس اور گریہ کرتے ہوئے رسولِ خدا کے پاس سے نکلے کہ ان کو جہاد میں شرکت کی توفیق حاصل نہ ہو سکی۔ یہ جماعت تاریخ میں گروہ "بکاؤون" کے نام سے مشہور ہوئی۔ (یعنی بہت رونے والے)۔

خدا قرآنِ مجید میں ان کو اس طرح یاد کرتا ہے:

> "اے پیغمبرؐ! مومنین جہاد کے لیے تیار ہو کر آپؐ کے پاس آئے تاکہ آپؐ ان کو کسی مرکب پر سوار کر دیں (اور میدانِ جہاد لے جائیں) اور آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ میرے پاس مرکب نہیں ہے جس پر میں تم کو سوار کروں اور وہ لوگ اس حالت میں واپس چلے گئے کہ غم کی شدت سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ وہ اخراجاتِ سفر کیوں نہ فراہم کر سکے۔ ایسے لوگوں پر جہاد ترک کر دینے میں کوئی گناہ نہیں ہے؟" (سورۂ توبہ: ۹۲)

بے نظیر لشکر

منافقین کی رخنہ اندازی اور پروپیگنڈہ، راستے کی دُوری، شدید گرمی، خشک سالی، دشمن کا بے شمار لشکر، ان میں سے کوئی چیز مسلمانوں کو وسیع پیمانے پر جنگ میں شرکت سے نہ روک سکی۔ تقریباً تیس ہزار افراد نے اپنی آمادگی کا اعلان کیا اور ثنیۃ الوداع کی لشکرگاہ میں خیمہ زن ہو گئے۔ اس مسلح لشکر کے پاس دس ہزار گھوڑے اور بارہ ہزار اُونٹ تھے۔ رسولِ خدا نے لشکرگاہ میں ان سپاہیوں کا معائنہ کیا اور ان کے پرچم کو ان کے ہاتھ میں دے دیا اور سب روانگی کے لیے آمادہ ہو گئے۔ (مغازی: ج ۳، ص ۹۹۶)

منافقین کی واپسی

منافقین کے لیڈر عبداللہ ابن ابی نے اپنے چاہنے والوں کے ساتھ "ذباب" کے علاقے میں ثنیۃ الوداع میں جو لشکر گاہ تھی اس سے ذرا پیچھے اپنے خیمے نصب کیے اور وہیں سے مدینہ کی طرف لوٹ گیا۔ اس نے کہا: محمدؐ اس گرمی، دُوری اور سختی میں رومیوں سے لڑنے جارہے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ رومیوں کے ساتھ جنگ ایک کھیل ہے۔ خدا کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں کہ کل ان کے اصحاب اسیر اور گرفتار ہو جائیں گے۔ (حوالہ سابق)

منافقین یہ چاہتے تھے کہ لشکرِ اسلام سے عین روانگی کے موقع پر نفسیاتی جنگ چھیڑ کر ان کے حوصلوں کو کمزور کردیا جائے لیکن ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی۔ (امتاع والاستماع: ج ۱ ص ۴۵۰)

شخصیت پر حملہ

رسولِ خدا کی رکاب میں حضرت علی علیہ السلام کو ہر جنگ میں شرکت کا افتخار حاصل تھا، لیکن اس جنگ میں نہ جاسکے۔ رسولِ خدا کے حکم سے مدینہ کی دیکھ بھال کے لیے رہ گئے۔ رسول اللہؐ منافقین کی سازش سے آگاہ تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شرک پر باقی رہ جانے والے اعراب کی مدد سے منافقین، شہرمدینہ پر مجاہدین سے خالی ہوجانے کی بنا پر حملہ کردیں اور کوئی ناگوار حادثہ پیش آجائے۔ اس پریشان حال سیاسی حالات میں سازشوں کے مقابلے میں اسلام کے مرکز کی جو دیکھ بھال کرسکتا ہے وہ صرف حضرت علی علیہ السلام تھے۔

رسولِ خدا نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جگہ پر اس لیے بٹھایا تاکہ اطمینان سے جہاد کے لیے جاسکیں۔ جب منافقین نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنی تحریک میں رکاوٹ محسوس کیا تو ان کو میدان سے ہٹادینے کے لیے ماحول بنایا اور افواہیں پھیلانا (درحقیقت ان کی شخصیت پر حملہ) کرنا شروع کردیا۔ انھوں نے یہ افواہ پھیلائی کہ رسولِ خدا حضرت علی علیہ السلام سے افسردہ خاطر ہوگئے۔ آپ نے ان سے بے اعتنائی کی اور ان کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔

یہ باتیں حضرت علی علیہ السلام کے کانوں تک پہنچیں۔ آپؑ نے اپنا اسلحہ اُٹھایا اور مدینہ سے تین میل دُور مقام جرف میں رسولِ خدا سے جاملے اور فرمایا: اے اللہ کے رسولؐ! منافقین کہتے ہیں کہ آپؐ ہم سے مطمئن نہیں تھے اس لیے آپؐ نے ہمیں مدینہ میں چھوڑ دیا۔

حضرتؐ نے فرمایا: وہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے میں نے تم کو مدینہ میں چھوڑا ہے۔

اس وقت آپؐ نے بہت سارے اصحاب کے سامنے جو وہاں حاضر تھے اور سن رہے تھے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: میرے بھائی مدینہ واپس جاؤ، مدینہ کے لیے ہمارے تمھارے علاوہ کوئی مناسب نہیں ہے۔ تم ہی میرے خاندان میں اور میرے محلِ ہجرت (مدینہ) میں میرے عشیرہ کے درمیان میرے جانشین ہو، کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ تم میرے لیے ایسے ہی ہو جیسا موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ، بس میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوگا۔

حضرت علی علیہ السلام مدینہ لوٹ آئے اور رسولِ خدا اپنے مقصد کے لیے روانہ ہو گئے۔

تپتے صحرا میں

باہمت و جری مسلمانوں کے ۶۱ سالہ رہبر رسولِ خدا سخت ترین سپاہیوں، جیش العسرہ کی کمان سنبھالے ہوئے ہیں۔ دشمن تک پہنچنے کے لیے سپاہیوں کو ۷۷۸ کلومیٹر کے گرم ریگستان کو عبور کرنا پڑے گا۔ لشکر چل پڑا، آفتاب اس لشکر پر آگ برسا رہا تھا۔ شدید گرمی کا خطرہ دشمن سے کم نہ تھا لیکن لشکرِ اسلام بھی استقامت و مقاومت کا پیکر تھا۔ صرف چند منافقین تخریب کاری اور اذیت رسانی کے ارادے سے ساتھ ہو گئے تھے۔ یہ لوگ راستے میں خیانت آمیز حرکتیں اور زہریلے پروپیگنڈے کر رہے تھے۔ لشکرِ اسلام کا گزر اصحابِ حجر کے علاقے سے ہوا۔ اصحابِ حجر کے ویران شہر میں ایک پانی والا کنواں تھا۔ سپاہیوں نے اس کنویں سے پانی کھینچا اور اپنے ظروف بھر لیے۔ جس وقت یہ لوگ اس جگہ اُترے اور سپاہی آرام کرنے لگے تو رسولِ خدا نے فرمایا کہ فلاں کنویں کا پانی نہ پینا اور پانی سے آٹا نہ گوندھنا اور اگر آٹا گوندھ لیا تو اس کو نہ کھانا بلکہ چوپایوں کو دے دینا۔

اسی طرح آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ آج رات کوئی لشکرگاہ سے باہر نہ نکلے، اس رات لشکرگاہ سے کوئی باہر نہیں گیا سوائے دو افراد کے اور ان کے ساتھ ناگوار حادثات پیش آئے۔

صبح سویرے لشکرِ اسلام رسولِ خدا کے پاس طلبِ آب کے لیے پہنچا۔ حضرتؐ نے دُعا فرمائی، بارش ہوئی، سارے تالاب گڑھے بھر گئے۔ جاں بازوں نے بارش کے پانی سے مشکیں

بھر لیں۔ ایک منافق نے کہا: ایک گزرتا ہوا بادل تھا جو اتفاقاً برس گیا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴،ص ۱۶۴ و ۱۶۵)

ایک جگہ رسولؐ خدا کا اُونٹ گم ہو گیا۔ کچھ لوگ اس کو ڈھونڈنے کے لیے نکلے لیکن منافقین میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہ کیسے پیغمبرؐ ہیں جن کو یہ نہیں معلوم کہ ان کا اُونٹ کہاں ہے درحالانکہ یہ آسمانوں کی خبر دیتے ہیں؟ ان کی باتیں پیغمبرؐ تک پہنچائی گئیں تو آپؐ نے فرمایا: مجھے خدا جو بتا دیتا ہے میں غیب کی وہی باتیں جانتا ہوں۔ اس وقت جبرئیلؑ نازل ہوئے اور آنحضرتؐ کو اُونٹ کی جگہ سے باخبر کیا۔ حضرتؐ نے فرمایا: میرا اُونٹ فلاں وادی میں ہے اور اس کی مہار فلاں درخت میں اُلجھ گئی ہے جاؤ اس کو پکڑ لاؤ۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴،ص ۱۶۶)

حضرت ابوذرؓ کا واقعہ

چلتے چلتے راستے میں حضرت ابوذرؓ کا اُونٹ بیٹھ گیا۔ انھوں نے بڑی کوشش کی کہ وہ کسی طرح قافلہ تک پہنچ جائیں لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ اُونٹ سے اُتر پڑے۔ سامان کو پیٹھ پر لادا اور پیدل ہی چل پڑے۔ آفتاب ان کے سر پر شدت کی گرمی برسا رہا تھا۔ حضرت ابوذرؓ پیاس سے نڈھال ہوئے جا رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بھلا چکے تھے اور صرف لشکرِ رسولؐ خدا تک پہنچنے کے علاوہ کوئی مقصد نہ تھا۔ پیاس سے پھٹتے ہوئے جگر کے ساتھ پیدل، پستیوں اور بلندیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ دُور سے آپ کی نگاہیں لشکرِ مسلمین پر پڑیں۔ آپ نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ اس طرف ایک سپاہی کی نظر ایک سیاہی پر پڑی اس نے رسولؐ خدا سے عرض کیا کہ کوئی شخص ہماری طرف آ رہا ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا: اچھی بات ہے وہ ابوذر ہیں۔ آنے والی سیاہی اور قریب ہو گئی۔ ایک شخص نے چلا کر کہا: وہ ابوذرؓ ہیں۔ خدا کی قسم! وہی ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا: خدا ابوذرؓ پر رحمت نازل کرے وہ اکیلے راستے طے کرتے ہیں، تنہا مریں گے اور تنہا اُٹھائے جائیں گے۔

لشکرِ اسلام تبوک میں

لشکرِ اسلام نے اپنا سفر جاری رکھا یہاں تک کہ تبوک میں پہنچ گیا، لیکن رومیوں کو اپنے

سامنے نہیں پایا اس لیے کہ رومی لشکرِ اسلام کی کثرت سے واقف ہو چکے تھے اور لشکرِ اسلام کی شجاعت اور ان کے بلند حوصلوں کی اطلاع ان کو تھی۔ اس بنا پر انھوں نے محفوظ جگہ ڈھونڈ لی اور شمال کی طرف بیٹھ رہے۔ (پیامبرؐ و آئین نبرد، مولف: جنرل مصطفیٰ طلاس، ص ۴۸۳)

تبوک میں لشکرِ اسلام نے اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ رسولؐ خدا نے لشکر کے سامنے تقریر کی۔ مسلمان بیس دن تک تبوک میں رہے۔ رسولؐ اللہ نے وہاں چند گروہوں کو اپنے زیر اثر قبیلوں سے عہد و پیمان باندھنے کے لیے مختلف سرحدی علاقوں میں روانہ فرمایا۔ ان سرحدی علاقوں میں بسنے والے قبیلوں میں سے عہد و معاہدہ کے بعد جزیرۃ العرب کی سرحدیں محفوظ ہو گئیں۔

دومۃ الجندل کے بادشاہ کی گرفتاری

رسولؐ خدا نے سواروں کے ایک دستہ کا خالد بن ولید کو سردار بنا کر بھیجا۔ خالد اور اس کے سپاہیوں نے وہاں کے بادشاہ "اکیدر" اور اس کے بھائی "حسان" پر جب وہ ایک وحشی گائے کا پیچھا کر رہا تھا۔ غفلت کے عالم میں حملہ کر دیا، حسان مارا گیا اور اکیدر گرفتار ہو گیا۔ خالد نے اکیدر کو گرفتار کرنے کے بعد دومۃ الجندل کو فتح کیا اور مالِ غنیمت کے ساتھ واپس پلٹا۔ اکیدر کو پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ رسولؐ خدا نے اس سے صلح کا معاہدہ کیا اور اس کے لیے جزیہ ادا کرنا ضروری قرار دیا۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۱۶۹)

تبوک میں شہر "ایلہ" جہاں عیسائی آباد تھے، اس کے رئیس "یوحنا ابن روبہ" نے دومۃ الجندل کے واقعات سننے کے بعد پیش قدمی کی اور خود پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں آ کر اپنے آپ کو اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی حمایت کے سایہ میں پہنچا دیا۔ وہاں یہ طے پایا کہ اہل ایلہ سالانہ تین سو طلائی دینار بعنوان جزیہ کا ادا کریں۔ (مغازی واقدی: ج ۳، ص ۱۰۴۲)

پیغمبرؐ خدا پر حملہ کرنے کی سازش

مقام تبوک میں بیس دن تک قیام کے بعد، لشکرِ اسلام نے رسولؐ خدا کے حکم کے بموجب لوٹ آنے کا ارادہ کیا۔ منافقین نے دیکھا کہ لشکرِ اسلام کے قتل اور زخمی ہونے یا جنگ کی تو نوبت ہی نہیں آئی، لہٰذا انھوں نے چاہا کہ کسی طرح رسولؐ خدا کا قصہ پاک کر دیں۔ انھوں نے منصوبہ

بتایا کہ واپسی کے وقت رات کو پیغمبرؐ خدا کے راستے میں کسی موڑ پر کمین گاہ میں بیٹھ جائیں اور آنحضرتؐ کے اُونٹ کو بھڑکا دیں تاکہ آپؐ اُونٹ سے گر کر دروں میں لڑھک کر ختم ہو جائیں۔

جب حضورؐ اس موڑ پر پہنچے تو خدا نے آپ کو منافقین کے ارادوں سے آگاہ کر دیا۔ حضرتؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ وہ لوگ درہ کے نیچے سے گزریں اور آپؐ خود اس موڑ کے اُوپر روانہ ہوئے۔ عمار یاسرؓ سے فرمایا کہ اُونٹ کی مہار کھینچتے ہوئے لے چلیں اور حذیفہؓ ابن یمان سے فرمایا کہ ان کے اُونٹ کو پیچھے سے ہانکتے رہیں۔ جب آنحضرتؐ اس موڑ کے اُوپر پہنچے تو منافقین نے چاہا کہ اپنا حملہ شروع کر دیں۔ رسولؐ خدا نے غصے کے عالم میں حذیفہ کو حکم دیا کہ ان کو بھگا دو۔ جب حذیفہ نے ان پر حملہ کیا تو منافقین رُسوائی کے ڈر سے فوراً ہی بھاگے اور شب کی تاریکی میں صفوف لشکر میں گم ہو گئے۔ دوسرے دن صبح اسید ابن حضیر نے پیغمبرؐ خدا سے ان لوگوں کو قتل کر ڈالنے کی اجازت مانگی لیکن رسولؐ خدا نے اجازت نہیں دی۔ (سیرتِ حلبی: ج ۳، ص ۱۴۳)

مسجدِ ضرار کو ویران کر دو

رسولؐ خدا تبوک سے واپسی میں جب منزل ''ذی آوان'' پر پہنچے تو آپؐ وحی اور مندرجہ ذیل آیات کے نزول کے ذریعے مسجد ضرار کے بانیوں کے منصوبے سے باخبر ہو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

> ''جن لوگوں نے ضرر پہنچانے، کفر اختیار کرنے، مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنے اور ان لوگوں کے لیے اڈہ بنانے کے لیے جو اس سے پہلے خدا و رسولؐ سے جنگ کرتے تھے، مسجد بنائی ہے۔ البتہ یہ لوگ قسم کھاتے ہیں کہ سوائے نیکی کے اور ہم کچھ نہیں چاہتے اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ آپ ہرگز اس مسجد میں نماز کے لیے نہ کھڑے ہوں۔ وہ مسجد جو پہلے ہی دن سے اساسِ تقویٰ پر بنی ہے زیادہ بہتر ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس مسجد میں وہ لوگ ہیں جو اپنے کو پاک و پاکیزہ رکھنے کو دوست رکھتے ہیں اور خدا بھی ان لوگوں کو جو مطہرین ہیں دوست رکھتا ہے''۔ (سورۂ توبہ: آیت ۱۰۶ و ۱۰۷)

ان آیتوں کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ نے چند مسلمانوں کو حکم دیا کہ" جاؤ اور اس مسجد کو جس کو ستم گروں نے بنایا ہے ویران کر دو اور جلا ڈالو۔ رسولؐ خدا کے حکم پر فوراً عمل ہوا اور مسجد کی چھت کو جو کھجور کی لکڑی سے بنائی گئی تھی آگ لگا دی گئی اور منافقین بھاگ کھڑے ہوئے۔ جو اسلحہ اُٹھانے پر قادر تھا وہ میدان میں کود پڑا، اس طرح کہ مومنین میں سے کسی نے بھی اس حکم کو ماننے سے انکار نہیں کیا مگر تین آدمیوں نے بعد میں جن کی توبہ خدا نے قبول کر لی۔

۱ درحقیقت اس فوجی تحریک نے اُمت اسلامی کی جنگ میں آمادگی کو ظاہر کر دیا۔

۲ تبوک کی جنگی مشق، لشکرِ اسلام کے مضبوط ارادے اور ان کی جسمانی اور روحانی طاقت کا مظاہرہ تھی۔ اس لیے کہ نہایت نظم و نسق کے ساتھ دشوار اور طولانی راستے کا طے کرنا وہ بھی اس زمانہ کے ابتدائی وسائل کے ساتھ یہ لشکرِ اسلام کی عظیم روحانی طاقت اور ان کی وسعت فکری کو ثابت کرتا ہے۔

۳ غزوۂ تبوک: اعراب کی نظر میں مسلمانوں نے عسکری اور معنوی مسجد کی چھت جلانے کے بعد اس کی دیواروں کو مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۴، ص ۱۷۳)

اسلحے نہ فروخت کرو

تبوک کے واقعہ کے بعد بہت سے جاں بازوں نے یہ سمجھ کر کہ جہاد کا کام اب تمام ہو گیا، اپنے اسلحوں کو بیچنا شروع کر دیا۔ دولت مند ان اسلحوں کو خریدنے لگے تا کہ اپنی قوت میں اضافہ کریں۔ جب یہ خبر پیغمبرؐ خدا کو پہنچی تو آپؐ نے ان لوگوں کو اس کام سے منع فرمایا۔ ہماری اُمت سے کچھ لوگ اسی طرح اپنے دین کا دفاع کرتے رہیں یہاں تک کہ دجال ظہور کرے۔

جنگ میں دُعا کی تاثیر

تبوک کے واقعہ کے بعد رسولؐ خدا نے خداوند عالم کی بارگاہ میں شکر ادا کیا اور فرمایا: خدایا! اس سفر میں جو اجر ملا اور جو کچھ پیش آیا ہم اس پر تیری بارگاہ میں شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس اجر و پاداش میں وہ لوگ بھی ہمارے شریک ہیں جو عذر شرعی کی وجہ سے یہاں رُک گئے تھے۔

حضرت عائشہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ لوگوں کو سفر کی تکلیفیں اور سختیاں جھیلنا پڑیں۔ ایسے میں جو لوگ گھروں میں رہ گئے کیا وہ بھی آپؐ کے ساتھ شریک ہیں؟

رسولِؐ خدا نے فرمایا: ہم نے جہاں کہیں بھی سفر کیا، جہاں کہیں بھی خیمہ زن ہوئے، جو لوگ مدینہ میں ہیں وہ ہمارے ساتھ تھے لیکن چونکہ یہ لوگ بیمار تھے اس لیے عملی طور پر ہمارے ساتھ نہ آسکے۔ قسم اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، ان کی دُعا ہمارے ہتھیاروں سے زیادہ دشمن پر اثرانداز ہوئی۔ (مغازی: ج ۳، ص ۱۰۵۶)

غزوۂ تبوک سے ماخوذ نتائج

① غزوۂ تبوک موجب بنا کہ تاریخ اسلام میں پہلی بار مسلمانوں میں سے ہر ایک کی عظمت و منزلت بڑھ جائے۔ وہ اعراب جو ہنوز شرک پر باقی تھے اس حقیقت کو سمجھ گئے کہ وہ لشکر جو میلوں کی مسافت کو نہایت سختی برداشت کر کے رومیوں سے لڑنے کے لیے طے کر سکتا ہے تو بڑی آسانی سے مشرکین عرب کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تبوک کے واقعہ کے بعد جزیرۃ العرب کے مختلف قبائل کی طرف سے مدینہ میں وفود آنا شروع ہو گئے تاکہ اپنے قبیلہ کے مسلمان ہوجانے کا اعلان کریں۔ اس وجہ سے ہجرت کے نویں سال کو سنِ وفود کا نام دیا گیا ہے۔

② جزیرۃ العرب کی سرحدوں کا سرحدی قبائل سے معاہدے کے بعد محفوظ ہوجانا۔

③ منافقین کی کثیف ماہیت کا پردہ فاش ہوجانا، جو اس واقعہ میں بے حد رُسوا ہوئے۔

④ غزوۂ تبوک اس بات کا سبب بنا کہ مسلمان رسولِؐ خدا کی رحلت کے بعد بڑی آسانی سے شام اور روم کے مختلف علاقوں کو آزاد کرالیں۔

منافقین کے لیڈر کی موت

واقعۂ تبوک کے بعد مسلمانوں کی کامیابیوں میں سے ایک کامیابی منافقین کے فتنہ پرور لیڈر عبداللہ ابن ابی کی موت بھی ہے۔ وہ تھوڑے عرصہ تک بیمار رہ کر مر گیا اور اس طرح تحریکِ اسلامی کے ایک سخت ترین داخلی دشمن کا شر برطرف ہوگیا۔ (مغازی: ج ۳، ص ۱۰۵۷)

مدینہ میں قبائل کی نمائندگی کرنے والے وفود کی آمد

فتح مکہ اور تبوک پر لشکر کشی کے بعد، ہر طرف سے مختلف قبائل کی نمائندگی کرنے والے وفود مدینہ میں آئے۔ چنانچہ اسی لیے سنہ ۹ ہجری کو عام الوفود، وفود کا سال کہا جاتا ہے۔ عرب اس بات کے منتظر تھے کہ اسلام قبیلۂ قریش کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا ہے؟ اس لیے کہ قریش عرب کے پیشوا اور خانہ کعبہ کے متولی تھے۔ جب مکہ فتح ہو گیا اور قریش مغلوب ہو گئے تو دوسرے عرب قبائل یہ سمجھ گئے کہ ان میں اسلام سے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔ غزوۂ تبوک سے یہ حقیقت ان پر اور زیادہ روشن ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ ناچار گروہ، گروہ دین خدا میں داخل ہونے لگے۔

وہ دین جس میں نماز نہیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں

عرب کے سخت ترین قبیلوں میں سے ثقیف کے سرکردہ افراد میں سے چھے افراد پر مشتمل ایک وفد اسلام قبول کرنے کے بارے میں مذاکرہ کرنے کے لیے مدینہ آیا اور مغیرہ ابن شیبہ ثقفی کے گھر ٹھہرا۔ پذیرائی کے سارے سامان رسولؐ اللہ کے گھر سے مغیرہ کے گھر بھیجے گئے۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں کچھ تجویزیں رکھیں۔ من جملہ ان میں سے ایک یہ تھی کہ "لات کے بت خانہ کو ایک سال تک ویران نہ کریں دوسرے یہ کہ ان سے نماز معاف ہو جائے۔ جب رسولؐ خدا نے ان کی تجویزوں کو قبول نہیں کیا تو وہ ترک نماز پر اصرار کرنے لگے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: جس دین میں نماز نہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ آخر کار انھوں نے اسلام قبول کیا، نماز پڑھنے اور شرعی تکلیفوں پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ (سیرت النبویہ ابن کثیر: ج ۴، ص ۶۵)

ابراہیم کا سوگ

پیغمبرؐ خدا کی بیوی ماریہ قبطیہ سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ ولادت کی صبح پیغمبرؐ خدا نے اپنے اصحاب کو یہ خوش خبری سنائی کہ کل رات خدا نے مجھے بیٹا عطا کیا ہے جس کا نام میں نے اپنے جد ابراہیمؑ کے نام پر ابراہیمؑ ہی رکھا ہے۔ ولادت کے ساتویں دن آپؐ نے عقیقہ میں ایک گوسفند ذبح کیا۔ نومولود کے سر کے بال تراش کر اس کے برابر چاندی مسکینوں میں صدقہ کے طور پر تقسیم کی۔ پیغمبر کی دوسری بیویوں نے جب یہ دیکھا کہ ماریہ کے ذریعہ پیغمبرؐ ... دہ ہو گئے تو ان کو

ماریہ پر رشک ہوا۔ (طبقات ابن سعد: ج ا،ص ۱۳۵)

۱۸ مہینے کے بعد پیغمبرؐ خدا کا اکلوتا بیٹا بیمار پڑا اور انتقال کر گیا۔ پیغمبرؐ خدا اس کے انتقال سے غم و اندوہ میں مبتلا ہوئے۔

خرافات سے جنگ

جس دن ابراہیم کا انتقال ہوا اس دن آفتاب کو گہن لگا۔ لوگوں نے یہ سوچا کہ پیغمبرؐ خدا کے بیٹے کے غم میں آفتاب کو گہن لگا ہے۔ پیغمبرؐ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ خرافات کی طرف مائل ہوں اس لیے آپؐ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: آفتاب و ماہتاب قدرت کی نشانی ہیں۔ وہ سنتِ الٰہی کے مطابق خاص راستے پر گردش کرتے ہیں اور انھیں ہرگز کسی کی ولادت یا موت پر گہن لگتا نہیں۔ سورج گہن کے موقع پر تمھارا فریضہ یہ ہے کہ تم نماز پڑھو۔ (سیرتِ حلبی: ج ۳، ص ۳۱۰-۳۱۱)

مشرکین سے بے زاری

(۱۰ ذی الحجہ سنہ ۹ ہجری) حج کا زمانہ آگیا۔ ابھی تک مشرکین حج کے مراسم میں گذشتہ لوگوں کے طریقہ کے مطابق شرکت کرتے تھے۔ اس سال مشرکین سے بیزاری (سورۂ برات) والی آیتیں نازل ہوئیں۔ رسولِ خدا نے ابتدا میں ابوبکرؓ کو امیر الحاج کے عنوان سے مکہ روانہ کیا اور ان کو حکم دیا کہ ان آیات کو لوگوں کے مجمع میں پڑھیں۔ جناب ابوبکرؓ اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ حج کے لیے مکہ کی طرف جادۂ پیما ہوئے۔

حضرت علی علیہ السلام کی اہم ذمہ داری

ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ جبرئیل امینؑ نازل ہوئے اور خدا کی طرف سے پیغام لے کر آئے کہ مشرکین سے بے زاری والے پیغام کو یا آپ خود پہنچائیں یا وہ شخص پہنچائے جو آپؐ کے اہلِ بیتؑ سے ہو۔ رسولِ خدا نے اپنی اُونٹنی "ناقہ عضباء" کو حضرت علی علیہ السلام کے حوالے کیا اور فرمایا: ابوبکرؓ سے جا کر وہ آیتیں لے لو جو مشرکین سے بے زاری و برأت کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں اور زائرین خانہ خدا کے مجمع میں خود پڑھو۔ بروایت شیخ مفید ابوبکرؓ نے ان آیات کو حضرت

علی علیہ السلام کے حوالے کیا اور مدینہ لوٹ آئے اور پیغمبرؐ خدا کی بارگاہ میں پہنچ کر کہا: کیا میرے بارے میں وحی نازل ہوئی ہے؟

رسولؐ خدا نے نہایت اطمینان سے فرمایا: جبرئیل تشریف لائے اور خدا کا پیغام پہنچایا کہ اس کام کو میرے علاوہ یا میرے خاندان کے فرد کے علاوہ دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ (بحارالانوار: ج۲۱، ص ۲۷۵)

حضرت علی علیہ السلام حج کے زمانے میں مجمع کے درمیان کھڑے ہوئے اور جو کچھ رسولؐ خدا کے فرمان کے مطابق تھا، اعلان کیا کہ: "اے لوگو! کوئی کافر بہشت میں نہیں جائے گا اور اس سال کے بعد کسی مشرک کو حج نہیں کرنے دیا جائے گا اور نہ ہی کعبہ کا برہنہ طواف کرنے کی اجازت ہوگی۔ جس کی رسولؐ خدا سے کوئی قرارداد یا معاہدہ ہے تو وہ معاہدہ اپنی مدت تک باقی رہے اور دوسروں کو بھی آج سے چار مہینے کی مہلت ہے کہ ہر گروہ اپنے مامن اور اپنی سرزمین کو پلٹ جائے۔ چار مہینے کے بعد کسی بھی مشرک کے لیے کوئی عہد و پیمان نہیں رہ جائے گا مگر ان لوگوں کے لیے جنھوں نے خدا اور اس کے رسولؐ سے ایک مدت تک کے لیے عہد و پیمان کیا ہے۔ اس سال کے بعد مشرکین نہ حج بجا لائیں گے اور نہ کعبہ کے گرد برہنہ طواف کریں گے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۴، ص ۱۹۰)

مباہلہ

رسولؐ خدا نے دنیا کے سرکردہ افراد کو خط لکھنے کے بعد ایک خط "اسقف نجران" (مکہ کے جنوب مشرق میں ۹۱۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک شہر ہے) کو لکھا اور اس دیار کے عیسائیوں کو اسلام کی دعوت دی۔

اس خط میں اعلان تھا کہ اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے تو جزیہ دو تاکہ تم کو حکومت اسلامی کی حمایت ہو جائے۔ یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اسقف نے عیسٰی کے بعد ایک پیغمبرؐ خدا کے ظہور کی بشارت آسمانی کتابوں میں پڑھ رکھی تھی اس لیے اپنے نمایندوں کو مدینہ بھیجنے کا ارادہ کیا۔

عیسائیوں کا ایک عالی مرتبہ وفد مذاکرہ اور اسلام کے مسائل کے بارے میں تحقیق کے لیے مدینہ پہنچا۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو کمال آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی مراسم انھوں نے مسجد مدینہ

میں انجام دیے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ایک تفصیلی بحث شروع ہوئی۔ رسولِ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں فرمایا: وہ خدا کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں جن کو خدا نے مریمؑ کے رحم میں رکھا۔ (سورۂ نساء: ص ۱۷۱)

عیسائی نمائندے کہہ رہے تھے کہ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں اس لیے کہ مریمؑ نے بغیر کسی مرد کی قربت کے ان کو جنا ہے۔

جواب میں آیت نازل ہوئی اور رسولِ خدا نے اس کو پیش کیا کہ: "عیسیٰؑ کی خلقت آدمؑ کی تخلیق کی طرح ہے۔ خدا نے ان کو خاک سے پیدا کیا۔ یعنی اگر باپ کا نہ ہونا خدا کے بیٹے ہونے کی دلیل ہے تو آدمؑ کا نہ کوئی باپ تھا اور نہ کوئی ماں، لہٰذا خدا کے بیٹے ہونے کے زیادہ سزاوار تو وہ تھے۔

مذاکرات اور بحثیں جاری رہیں۔ عیسائی مذہبی نمائندے پیغمبرؐ خدا کی منطق کے سامنے خاموش ہو گئے لیکن ان کا بے جا تعصب حقیقت و ایمان کو ماننے سے رکاوٹ بنا رہا۔

فرشتۂ وحی نازل ہوا اور پیغمبرؐ خدا کو حکم ملا کہ ان لوگوں کو مباہلہ کے لیے بلائیں۔ یعنی دونوں گروہ صحرا میں جائیں اور ایک معین وقت پر دونوں خدا کی بارگاہ میں دُعا کریں اور ان میں سے جو جھوٹا ہو اس پر لعنت بھیجیں۔ (آل عمران: ۶۱)

مباہلہ کے بارے میں علامہ طباطبائی مرحوم فرماتے ہیں کہ "مباہلہ اسلام کے ایک ابدی معجزات میں سے ہے اور ہر باایمان شخص اسلام کے پہلے پیشوا کی پیروی میں حقائق اسلام کی کسی حقیقت کے اثبات کے راستے میں اپنے مخالف سے مباہلہ کرسکتا ہے اور خداوند عالم سے درخواست کرسکتا ہے کہ وہ طرف مخالف کو کیفرِ کردار تک پہنچائے اور اس کو شکست دے۔ (تفسیر المیزان: ج ۳، ص ۲۲۸)

مباہلہ کا وقت قریب آیا۔ رسولِ خدا نے مسلمانوں اور اپنے وابستگان کے درمیان سے صرف چار افراد کا انتخاب کیا جو اس تاریخی واقعہ میں شریک ہوئے اور وہ ہیں حضرت علی علیہ السلام پیغمبرؐ خدا کی باعظمت بیٹی حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا اور حسن و حسین علیہما السلام۔ اس لیے کہ تمام مسلمانوں کے درمیان ان چار افراد سے زیادہ پاکیزہ اور باایمان انسان موجود نہ تھے۔

رسولِ خدا نے اپنے ساتھ جانے والوں سے کہا کہ جب ہم وہاں پہنچیں تو ہماری دُعا پر

آمین کہنا۔ پھر معنوی شان و شوکت کے ساتھ آنحضرت ﷺ امام حسینؑ کو گود میں لیے، امام حسنؑ کا ہاتھ پکڑے ہوئے اور فاطمہؑ و علیؑ ان کے پیچھے اس مقام کی طرف چلے جہاں مباہلہ ہونا قرار پایا تھا۔

جب عیسائیوں کی نظر نگاہیں رسولؐ خدا اور ان کے ساتھ آنے والوں کے نورانی اور ملکوتی چہروں پر پڑی تو اس وقت ان کے اسقف اعظم نے کہا:

"میں ان چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ جو بارگاہِ الٰہی میں اگر دعا کریں تو بیابان دیکھتے دیکھتے جہنم میں بدل جائے اور عذاب کی چادر سرزمین نجران کو اپنے دامن میں لپیٹ لے۔ اس بات کا خطرہ ہے کہ تمام عیسائی ختم ہو جائیں"۔

(سیرت نبویہ برحاشیہ، سیرتِ حلبی: ج ۲، ص ۴)

آخر وہ جزیہ دینے پر تیار ہو گئے اور طے یہ پایا کہ ہر سال دو ہزار حلے اور تین آہنی زرہیں وہ مسلمانوں کو بطورِ جزیہ دیا کریں گے۔ (صحیح مسلم: ج ۲، ص ۲۱)

حضرت علی علیہ السلام کی یمن میں ماموریت

جب یمن کے فرماں روا اور کچھ لوگ اسلام کے گرویدہ ہو گئے تو رسولؐ اللہ نے ایک دانش مند صحابی معاذ ابن جبل کو قرآن کی تعلیم اور تبلیغ اسلام کے لیے اس علاقے میں بھیجا۔ وہ کچھ دنوں کے بعد لوٹ آئے۔ پھر چند دنوں کے بعد پیغمبرؐ خدا نے خالد بن ولید کو ان کی جگہ روانہ کیا۔ خالد اپنی خشونت اور اپنے سلوک کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں ایمان کی لَو نہ بڑھا سکے۔

اس وجہ سے رسولؐ خدا نے حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا کہ یمن جا کر اس علاقے کے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں، انھیں احکامِ دین سکھائیں اور واپسی پر نجران کے لوگوں سے جزیہ وصول کرتے ہوئے آئیں۔

رسولؐ خدا کے حکم سے حضرت علی علیہ السلام چند مسلمانوں کے ساتھ یمن کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں آپؑ نے حیرت انگیز فیصلوں اور پُرزور تقریروں سے شیفتگانِ حق کو اسلام کی طرف مائل کیا۔

قبیلہ ہمدان کے درمیان آپؑ کی صرف ایک تقریر اور رسولؐ خدا کے خط کے پڑھنے سے اس قبیلے کے لیے وہ مثل ثابت ہو گئی کہ "جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل میں جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ ایک

دن سے بھی کم میں یہ عظیم قبیلہ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ (بحار الانوار: ج ۲۱، ص ۳۶۰)

قبیلۂ ہمدان کے مسلمان ہو جانے سے پورے یمن میں اسلام کی اشاعت پر بہت اچھا اثر پڑا۔

حجۃ الوداع

(روانگی کی تاریخ ۲۵ ذی القعدہ، سنہ ۱۰ ہجری) رسولؐ خدا کے حکم سے یہ اعلان کیا گیا کہ اس سال رسولؐ حج بیت اللہ کو تشریف لے جائیں گے۔ اس خبر نے لوگوں کے اشتیاق کو بھڑکا دیا اور ہزاروں مسلمان ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

رسولؐ خدا نے ابودجانہ کو مدینہ میں اپنا جانشین معین فرمایا اور اپنے ساتھ ساتھ قربانی لے کر ۲۵ ذی القعدہ کو حج ادا کرنے کے لیے اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں پیغمبرؐ خدا کی بیویاں آپؐ کے ساتھ تھیں۔ جب آنحضرتؐ مدینہ سے ۹ کلومیٹر جنوب میں مقام ذوالحلیفہ پر پہنچے تو آپؐ نے لباس احرام پہنا اور لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَاشَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الحَمدَ وَالنِّعمَةَ لَكَ وَالمُلك، لَاشَرِيكَ لَكَ کی آواز بلند کی۔ روانگی کے دس دن بعد آپ مکہ پہنچ گئے۔ مسجد الحرام میں وارد ہوئے اور کعبہ کا طواف کیا۔ حجر اسود کو بوسہ دیا اور مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی، پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔

جہان عدالت، باعث عداوت ہے

حضرت علی علیہ السلام یمن کی ماموریت پر تھے۔ رسولؐ خدا کے سفرِ حج سے آگاہ ہوئے اور اپنے ماتحت افراد کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ آدھے راستے میں اپنے ہمراہ افراد کی کمان اپنے ایک افسر کے سپرد کی اور تیزی سے پیغمبرؐ خدا کے پاس مکہ پہنچے اور ان کی خدمت میں اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کردی۔ جب یمن کی طرف بھیجا ہوا لشکر مکہ سے نزدیک ہوا تو حضرت علی علیہ السلام ان کے استقبال کے لیے بڑھے لیکن اُمید کے برخلاف آپ نے دیکھا کہ انھوں نے بیت المال کے کپڑوں اور تولیوں کو جو نجرانیوں سے جزیہ کے طور پر دیئے تھے، اپنے درمیان تقسیم کر لیا اور لباسِ احرام بنا کر پہن لیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اس ناشائستہ حرکت پر اپنے ماتحت افسر پر سخت ناراض ہوئے اور اس سے کہا: تم نے کپڑوں کو کیوں تقسیم کر دیا؟

اس نے جواب میں کہا کہ جانبازوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ میں کپڑوں کو امانت کے طور پر انھیں دے دوں اور حج کے مراسم ادا کرنے کے بعد ان سے واپس لے لوں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ تم کو یہ اختیار نہیں تھا۔ پھر آپؑ نے تمام کپڑے واپس لے لیے اور رسولؐ خدا کی تحویل میں دینے کے لیے آپؑ نے اس کو باندھ دیا۔

ایک گروہ رسولؐ خدا کی خدمت میں پہنچا اور اس نے حضرت علی علیہ السلام کی سخت گیری کی شکایت کی۔ رسولؐ خدا نے ناراض ہونے والوں سے کہا کہ علیؑ پر تنقید نہ کرو وہ خدا کے حکم کے جاری کرنے میں بایقین اور سخت ہیں۔ (ترمذی)

حج آخر میں رسولؐ خدا کی پُرزور تقریر

اس سال حج کے زمانے میں پیغمبرؐ خدا نے عرفہ کے دن نماز سے پہلے خطبہ پڑھا اور اس کے دوسرے دن منیٰ میں آپؐ کی تقریر کچھ اس طرح تھی:

"خداوند عالم اس بندہ کے چہرہ کو منور اور شاداب رکھ جو میری بات کو سنے اور یاد رکھے اور ان کی حفاظت کرے۔ پھر ان کو ان لوگوں تک پہنچائے جنھوں نے نہیں سنی ہے۔ بہت سے فقہ کے حامل ایسے ہیں جو خود فقیہ نہیں ہیں اور بہت سے فقہ کے پہنچانے والے ایسے ہیں کہ جو ایسے شخص تک پہنچاتے ہیں جو ان سے زیادہ عقل مند ہیں۔ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے مرد مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا۔ عمل کو خالص خدا کے لیے انجام دینا، رہبروں کے لیے بھلائی چاہنا اور ایک رنگی اختیار کرنا اور مومنین کی جماعت سے جدا نہ ہونا اس لیے کہ ان کی دُعا ہر ایک کو گھیرے رہتی ہے۔

پھر فرمایا: اے لوگو! تم شاید اب اس کے بعد مجھے نہ دیکھو۔ آیا تم یہ جانتے ہو کہ یہ کون سا شہر، کون سا مہینہ اور کون سا دن ہے؟

لوگوں نے کہا: ہاں یہ حرمت کا شہر، حرمت کا مہینہ اور حرمت کا دن ہے۔

آپؐ نے فرمایا: خدا نے تمھارے خون تمھارے مال کی حرمت کو اس شہر، اس مہینہ اور اس دن کی حرمت کی طرح قرار دیا ہے۔ کیا میں نے (پیغام) پہنچا دیا؟ مجمع نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: خدایا تو گواہ رہنا۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم خدا سے ڈرتے رہو اور کم (تول کر) نہ پہنچانا، زمین میں تباہی نہ مچاؤ اور ہر وہ شخص جس کے پاس کوئی امانت ہو وہ اسے (اس کے مالک تک) پہنچائے۔ اسلام میں سارے لوگ برابر ہیں اس لیے کہ سب آدمؑ وحواؑ کی اولاد ہیں۔ عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر سوائے پرہیزگاری کے اور کوئی برتری حاصل نہیں۔ کیا میں نے (پیغام) پہنچا دیا؟

لوگوں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: خدایا! گواہ رہنا۔

حضرتؐ نے فرمایا: اپنے نسب کو میرے پاس نہ لانا بلکہ اپنے عمل کو میرے پاس لانا، جو میں لوگوں سے کہتا ہوں تم بھی یہی کہو، کیا میں نے (پیغام) پہنچا دیا؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: خدایا! تو گواہ رہنا۔

پھر آپؐ نے فرمایا: وہ خون جو جاہلیت میں ہوا ہے میرے پیر کے نیچے ہے اور پہلا خون جس کو میں اپنے پیر کے نیچے رکھتا ہوں وہ آدم ابن ربیعہ ابن حارث (رسولؐ خدا کے وابستگان میں ایک شیر خوار بچہ تھا اور بنی سعد ابن بکر نے اس کو مار ڈالا تھا) کا خون ہے۔ کیا میں نے (پیغام) پہنچا دیا؟

لوگوں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: خدایا گواہ رہنا۔

پھر فرمانے لگے: ہر وہ ربا (سود) جو جاہلیت کے زمانہ میں تھا میرے پیروں کے نیچے ہے۔ پہلا ربا جو میں اپنے پیروں کے نیچے رکھتا ہوں وہ عباسؓ ابن عبدالمطلب کا ربا ہے۔ کیا میں نے (پیغام) پہنچا دیا؟ مجمع نے کہا: ہاں۔ فرمایا: خدایا! تو گواہ رہنا۔ پھر فرمایا: بے شک ماہِ حرام میں تاخیر کفر میں زیادتی ہے اور کافرین اس سے گمراہ ہوں گے ایک سال کو حلال اور ایک سال کو حرام شمار کرتے ہیں تاکہ اس کو شمار کر کے جس کو خدا نے حرام کیا ہے موافق بنا لیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ زمانہ گذشتہ لوگوں کی وضع کی طرف پلٹ گیا۔ جس دن خدا نے آسمان اور زمینوں کو پیدا کیا، بے شک خداوند عالم کے نزدیک اس کی کتاب میں بارہ مہینے ہیں۔ ان میں سے چار مہینے حرمت کے ہیں۔ رجب جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان ہے اور اس کو "رجب مضر" کہتے ہیں اور پھر

پے درپے تین مہینے ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم ہیں۔ بتاؤ میں نے تمھیں خبردار کر دیا؟ لوگوں نے جواب دیا: ہاں۔ آپؐ نے کہا: خدایا! تُو گواہ رہنا۔ پھر فرمایا: میں تم کو عورتوں کے ساتھ نیکی کرنے کے لیے کہتا ہوں اس لیے کہ ان کو تمھارے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ اپنے امر میں سے کوئی چیز اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتیں۔ تم نے ان کو خدا کی امانت میں لیا ہے۔ خدا کے حکم کے مطابق تم نے ان سے قربت کی ہے، تمھارا ان پر کچھ حق ہے۔ ان کی متعارف غذا اور لباس تم پر لازم ہے اور تمھارا حق ان پر یہ ہے کہ کسی کا پیر تمھارے بستر تک نہ پہنچنے دیں۔ تمھاری اطلاع اور اجازت کے بغیر تمھارے گھروں میں کسی کو داخل نہ ہونے دیں۔ پس اگر ان میں سے کوئی چیز انجام دیں تو ان کی خواب گاہ سے دُوری اختیار کرو، نہایت اطمینان سے ان کو تنبیہ کرو۔

کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔ حضرتؐ نے فرمایا: خدایا! تُو گواہ رہنا۔ پھر آپؐ گویا ہوئے: اب میں تم سے غلاموں کے بارے میں کچھ کہتا ہوں جو کھانا تم کھاتے ہو، وہی ان کو بھی کھلاؤ، جو تم پیتا وہی ان کو بھی پلانا۔ اگر یہ کوئی خطا کریں تو ان کی سزا کو معاف کر دینا۔ آیا میں نے تبلیغ کر دی؟ سب لوگ بولے: ہاں۔ حضرتؐ نے فرمایا: خدایا! تُو گواہ رہنا۔ پھر فرمانے لگے: مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، ان کے ساتھ حیلہ اور خیانت نہ کرو۔ ان کی پیٹھ پیچھے بدگوئی نہ کرو۔ ان کا خون حلال ہے اور نہ مال۔ مگر ان کی رضایت سے، کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: خدایا! تُو گواہ رہنا۔

پھر آپؐ نے کہا: شیطان آج کے بعد اس بات سے نااُمید ہو گیا کہ اس کی پرستش ہوگی لیکن پرستش کے علاوہ جن کاموں کو تم چھوٹا سمجھتے ہو ان پر عمل ہوگا اور وہ (شیطان) اسی پر راضی اور خوش ہے۔ کیا میں نے بتا دیا؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: خدایا! تُو گواہ رہنا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: دشمن خدا میں سب سے زیادہ گستاخ وہ ہے جو اپنے قتل کرنے والے کے علاوہ کسی کو قتل کرے اور اپنے مارنے والے کے علاوہ کسی کو مارے۔ جو اپنے آقا کی نافرمانی کرے اس نے اس چیز کا انکار کر دیا، جو خدا نے محمدؐ پر نازل کی ہے اور جو کوئی اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنی نسبت دے اس پر خدا، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ کیا میں نے بتا دیا؟ مجمع بولا: ہاں۔ فرمایا: خدایا! تُو گواہ رہنا۔

پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: میں مامور ہوں کہ جہاد کروں تاکہ لوگ خدا کی یکتائی اور میری

رسالت کے معتقد ہو جائیں۔ جب اس کا اقرار کر چکیں گے تو سوائے میرے حق کے انھوں نے اپنے مال اور خون کو محفوظ کر لیا اور ان کا حساب خدا پر ہے۔ کیا میں نے بتا دیا؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: خدایا! تو گواہ رہنا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے بعد تم گمراہ کرنے والے کافر ہو جاؤ کہ تم میں سے بعض، بعض کی گردن کا مالک (مالک الرقاب) ہو جائے۔ میں تمھارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم ان سے متمسک رہے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔

کتابِ خدا اور میری عترت و خاندان! کیا میں نے تبلیغ کر دی؟ لوگوں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: خدایا! تو گواہ رہنا۔

اس کے بعد فرمایا: البتہ تم سے سوال ہوگا لہٰذا تم میں جو حاضر ہے وہ غائب تک (یہ پیغامات) پہنچائے۔ (سیرت ابن ہشام: ج ۳، ص ۶۰۳)

غدیر خم میں

(یک شنبہ ۱۸ ذی الحجہ سنہ ۱۰ ہجری) یک شنبہ ۱۸ ذی الحجہ کو جب پیغمبرؐ خدا جحفہ سے غدیر خم کے پاس پہنچے تو امین وحی خدا کی جانب سے یہ پیغام لائے کہ ''اے پیغمبرؐ! جو خدا کی طرف سے آپؐ پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو اور اگر آپؐ نے نہیں پہنچایا تو اس کی رسالت کو آپؐ نے مکمل نہیں کیا۔ خدا آپ کو لوگوں سے بچائے گا''۔ (سورۂ مائدہ: آیت ۶۸)

اس طرح خدا کی جانب سے پیغمبرؐ خدا کو حکم دیا گیا کہ آپؐ علیؑ کو لوگوں کے درمیان کھلم کھلا پہچنوائیں۔ ولایت اور ان کی اطاعت کے واجب ہونے کے سلسلے میں جو مسلمانوں کی تکلیف ہے آپ اسے پہنچا دیں۔ حجاج کا کارواں جحفہ پہنچا۔ پیغمبرؐ خدا نے حکم دیا کہ تمام وہ لوگ جو آگے بڑھ گئے ہیں وہ لوٹ آئیں اور باقی ٹھہر جائیں۔ تمام مسلمان جمع ہو گئے۔ ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ تھی۔ اس روز سخت گرمی کے عالم میں لوگ اپنے پیروں کے نیچے اپنی عبا بچھائے اور اپنے دامن کو سائبان بنا کر سروں پر رکھ رہے تھے۔ نماز ہوئی۔ پیغمبرؐ خدا نماز کے بعد اس بلند جگہ پر جلوہ افروز ہوئے جو پالان شتر سے بنائی گئی تھی (منبر) اور آپؐ نے ایک تقریر فرمائی۔

رسولِ خدا کی تقریر کا ترجمہ ملاحظہ ہو

”حمد و ثنا خدا سے مخصوص ہے ہم اس سے مدد چاہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس پر توکل کرتے ہیں اور نامناسب عمل سے اس کی پناہ چاہتے ہیں۔ وہ خدا جس کے سوا کوئی ہادی اور رہنما نہیں ہے۔ جس کی وہ ہدایت کرے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمدؐ اس کے بندے اور پیغمبرؐ ہیں۔

اے لوگو! عنقریب میں دعوتِ حق پر لبیک کہنے والا اور تمھارے درمیان سے جانے والا ہوں۔ میں بھی مسئول ہوں، تم بھی جواب دہ ہو، تم میرے بارے میں کیا کہتے ہو؟

لوگوں نے بہ آواز کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اپنی رسالت کو پہنچا دیا نصیحت اور کوشش کی، خدا آپؐ کو نیک جزا دے۔

پیغمبرؐ خدا نے فرمایا: کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اور محمدؐ اس کے بندے اور فرستادہ ہیں اور یہ کہ بہشت، دوزخ حق ہے، موت حق ہے اور قیامت کے دن میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور خدا قبروں سے تمام سونے والوں کو اُٹھائے گا۔

لوگوں نے کہا: جی ہاں! ہم شہادت دیتے ہیں۔

حضرتؐ نے فرمایا: خدایا تو گواہ رہنا۔

بے شک میں دوسرے جہاں میں جانے اور حوضِ کوثر کے کنارے تک پہنچنے میں تم پر سبقت لے جاؤں گا اور تم حوض پر میرے پاس حاضر ہوگے۔ وہاں ستاروں کی تعداد میں چاندی کے جام اور پیالے ہوں گے۔ دیکھنا ہے کہ تم میرے بعد ان دونوں سے کیا سلوک کرتے ہو جو کہ گراں بہا اور گراں قدر چھوڑے جا رہا ہوں؟

مجمع میں سے ایک شخص نے بلند آواز سے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! وہ دو گراں قدر چیزیں کیا ہیں؟ فرمایا: جو بزرگ ہے وہ کتابِ خدا ہے جو تمھارے درمیان اللہ کی مضبوط رسی ہے اور دوسرے اہلِ بیتؑ عترت ہیں۔ خدائے مہربان اور عالم نے مجھے بتایا ہے کہ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض (کوثر) پر میرے پاس پہنچیں۔ قرآن و عترت سے آگے نہ بڑھنا اور ان دونوں کی پیروی سے منہ نہ موڑنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو پکڑا اور اس کو اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغل کی سفیدی نمایاں ہوگئی اور لوگوں نے ان کو دیکھا اور پہچانا۔

پھر آپؐ نے فرمایا: اے لوگو! اہل ایمان سے بالاتر کون ہے؟

لوگوں نے کہا: خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا: بے شک خدا ہمارا مولا ہے اور میں مومنین کا مولا ہوں اور مومنین کے نفسوں سے اولیٰ اور بلند ہوں۔ لہٰذا جس کا میں مولا ہوں علیؑ اس کے مولا ہیں۔ حضرتؐ نے اس بات کو تین بار اور حنبلی حضرات کے پیشوا، احمد ابن حنبل کے قول کے مطابق چار بار تکرار فرمائی۔ اس کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کر کے فرمایا:

"بارِ الٰہا! تو اس کو دوست رکھ جو ان کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھ جو ان سے دشمنی کرے۔ ان کے دوستوں کی مدد فرما اور جو ان کو رسوا کرے، اسے ذلیل فرما اور ان کو حق کا مدار و محور قرار دے"۔

پھر آپؐ نے فرمایا: حاضرین غائبین تک یہ پیغام پہنچا دیں۔ ابھی مجمع پراگندہ (بکھرا) بھی نہیں ہوا تھا کہ جبرئیل امینؑ وحی الٰہی لے کر آ پہنچے اور آیہ کریمہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ......"آج میں نے تمھارے دین کو کامل کر دیا، تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمھارے لیے دینِ اسلام کو پسند کر لیا ہے"۔

دین کے کامل ہو جانے سے نعمت کے تمام ہو جانے اور میری رسالت اور میرے بعد حضرت علی علیہ السلام کی ولایت پر اللہ کے راضی ہو جانے پر رسولِ خدا نے تکبیر کہی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے حضرت علی علیہ السلام ابن ابی طالبؑ کو امیر المومنینؑ کے عنوان سے مبارک باد دی اور سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے اور انھوں نے کہا: مبارک ہو، مبارک ہو، اے ابوطالبؑ کے بیٹے! آپ ہمارے اور تمام مومنین مرد و عورت کے مولا ہو گئے۔

پھر شاعر انقلاب اسلام، حسان بن ثابت نے کہا: یا رسولؐ اللہ! اگر اجازت ہو تو میں اس سلسلہ میں کچھ اشعار پڑھوں۔

رسولِ خدا نے فرمایا: خدا کی برکت سے پڑھو اور حسان نے فی البدیہہ واقعۂ غدیر خم کو اشعار میں بیان کیا۔ ہم یہاں ان کے اشعار میں سے تین شعر نقل کر رہے ہیں۔

"یعنی غدیر کے دن پیغمبرؐ خدا نے لوگوں کو آواز دی: کیا آواز رسا تھی۔ حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ اُٹھو میں نے تم کو اپنے بعد لوگوں کی ہدایت اور امامت کے لیے منتخب کیا۔ میں جس کا مولا ہوں علیؑ اس کے ولی ہیں، لہٰذا از روئے صدق و راستی ان کے پیرو اور دوست دار رہو"۔

شورشیں

حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد تکان کی شدت کی بنا پر رسولؐ خدا چند دنوں تک بیمار رہے۔ اس ہنگامہ میں آپ کی خستگی اور طبیعت کی ناسازی کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ کچھ موقع کی تلاش اور فائدہ کی جستجو میں رہنے والے افراد نے پیغمبری کا دعویٰ کیا۔

مسلیمہ کذاب نے یمامہ اور نجد میں خود کو پیغمبرؐ خدا اور رحمان الیمامۃ کہا۔ اسود عنسی نے یمن میں اپنے کو پیغمبر کہا اور اس نے شورش کا آغاز کر دیا۔ سجاح نامی عورت اور طلیحہ نامی ایک شخص نے اس طرح کے دعویٰ سے لوگوں کو دھوکا دینا شروع کیا۔ اس فتنہ کی جڑیں بہت پھیلی ہوئی تھیں اور یہ دھوکہ باز قومی اور قبائلی تعصب سے فائدہ اُٹھانے کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ ایک جماعت کو اپنے گرد جمع کر لیا اور جب ان کو قدرت حاصل ہو گئی تو اپنی حکومت و قلمرو کو یہ لوگ وسعت دینے لگے۔

اُسود عنسی کا واقعہ

نمونہ کے طور پر اسود عنسی کا واقعہ پیش ہے جس کو پیغمبرؐ خدا کی ناسازی طبیعت کی خبر نے لالچ میں ڈال دیا۔ اس نے جاہلی طریقوں اور رسوم کو کتب عتیق کے قوانین میں ملا کر یمن میں ایک نئے نقطۂ خیال کی بنیاد رکھی۔ وہ ایک کاہن اور شعبدہ باز تھا۔ اپنی پریشان باتوں کو مسجع اور مقفّی بنا کر اس طرح پیش کرتا کہ جو اس کی باتیں سنتا بدل ہو جاتا۔ جنگجوؤں میں بڑا سنگدل اور تیز تھا۔ ظلم و ستم میں لوگوں کی جان و مال سے کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔

اُسود عنسی نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ چند دنوں میں نجران پر قبضہ کر لیا اور اس نے بلا فاصلہ یمن کے دارالسلطنت صنعاء پر حملہ کر دیا۔

شہر ابن باذام ایرانی جو رسولِ خدا کی طرف سے اس علاقہ میں حکومت کرتے تھے، انھوں نے لشکر تیار کیا تاکہ اسود کے راستے کو روک لیں لیکن شورش کرنے والوں کے جلد حملہ کی بنا پر شہر ابن باذام کا لشکر اسود کے لشکر کا کچھ نہ کر سکا اور شہر ابن باذام اس حملہ میں شہید ہو گئے۔

اسود عنسی کامیاب اور اس کامیابی سے مغرور ہو کر صنعاء میں داخل ہوا۔ اعرابی جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، بہت جلد انھوں نے دوبارہ اسود کے ہاتھوں اسلام سے برگشتگی کا راستہ اختیار کر لیا۔ گروہ گروہ اور قبیلہ قبیلہ نے اس کی بیعت کر لی اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ تھوڑی ہی مدت میں اسود نے تمام یمن پر طائف و بحرین اور حدود و عدن پر تسلط جما لیا۔

ان علاقوں میں باقی ماندہ مسلمانوں نے بھی خوف سے سکوت اختیار کر لیا۔ اسود نے شہر ابن باذام کی بیوی 'آزاذ' کو زبردستی اپنی بیوی بنا لیا۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۲۷)

یمن میں انقلاب کی سازش

بستر علالت ہی سے رسولِ خدا نے مدعیانِ نبوت کے ساتھ جنگ کے لیے نمائندوں کو بھیجا اور خط لکھنا شروع کیے۔

آپ نے ایک خط میں یمن کے ایرانی، سرکردہ افراد کو حکم دیا کہ دین مقدس اسلام کے دفاع کے لیے قیام کریں اور ان کے پیغام کو دین داروں اور باحمیت و غیرت افراد تک پہنچائیں اور کوشش کریں تاکہ اس فساد کی جڑ اسود عنسی کو خفیہ یا آشکارا طور پر ختم کر دیں۔

یمن کے آزاد ایرانیوں نے رسولِ خدا کے فرمان کے مطابق اسلام پر باقی رہ جانے والے قبائل کو اپنے ساتھ تعاون کے لیے بلایا اور جب ان کو معلوم ہو گیا کہ اسود اور سپہ سالارِ لشکر قیس میں اختلاف ہے تو انھوں نے قیس کے سامنے نہایت اطمینان سے اس موضوع کو پیش کیا اور اس طرح سپہ سالار لشکرِ اسود کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ (طبری: ج ۳، ص ۲۳۱)

اسود کے قصر کے اندرونی معلومات حاصل کرنے کے لیے 'آزاذ' سے رابطہ قائم کیا گیا جو شہر ابن باذام کی بیوی تھیں اور اسود کے تصرف میں تھیں۔

'آزاذ' ایک آزادی پسند شیر دل مومنہ اور باعزت خاتون تھیں۔ ان لوگوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور مفید و قیمتی راہنمائیوں کے ذریعے انھوں نے مومنین کو اسود کے قتل پر آمادہ کیا۔

قصر مکمل طور پر نگہبانوں کی نگرانی میں تھا۔ ' آزاذ ' کی راہنمائی میں ایک سرنگ کے ذریعے جو اسود عنسی کے کمرے میں پہنچتی تھی رات کو جب وہ نیم خوابیدگی کے عالم میں تھا، انقلابی مومنین نے حملہ کر دیا۔ فیروز نے اس کا سر زور سے دیوار سے ٹکرا دیا اور اس کی گردن مروڑ دی۔ اسود کی آواز وحشی گائے کی طرح بلند ہوئی۔ آزاد نے فوراً ایک کپڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پہرہ دار محل کے اندر ہونے والی چیخ پکار سے مشکوک ہو گئے اور کمرہ کی پشت سے انھوں نے پوچھا کہ خیریت تو ہے؟

آزاد نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: کوئی بات نہیں ہے۔ پیغمبر پر وحی آ رہی ہے۔ اس طرح انقلابی مومنین اپنی مہم میں کامیاب ہوئے اور پیغمبری کے جھوٹے دعویدار کو دوزخ میں پہنچا دیا۔ دوسرے دن صبح مسلمانوں نے اسلامی نعرے لگائے اور کلمہ شہادتین (اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ) زبان پر جاری کیا اور اعلان کیا کہ لوگو! اسود ایک جھوٹے شخص سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد اس کا سر لوگوں کی طرف پھینک دیا۔

شہر میں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا اور قصر کے نگہبانوں نے اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے محل کو لوٹ لیا اور جو کچھ اس میں تھا لے کر فرار ہو گئے۔ اس وقت مسلمانوں نے آواز دی کہ نماز کے لیے لوگ صف بستہ ہو جائیں اور پھر نماز کے لیے لوگ کھڑے ہو گئے۔ (طبری: ج ۳، ص ۲۲۷)

جس رات اسود مارا گیا اسی رات وحی کے ذریعے حضرتؐ کو معلوم ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا: کل رات ایک مبارک خاندان سے ایک مبارک شخص نے عنسی کو قتل کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا: وہ کون تھا۔ آپؐ نے فرمایا: فیروز تھا۔ فیروز کامیاب رہے۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۳۹)

مسلیمہ کذاب کا واقعہ

یمامہ میں مسلیمہ کذاب نے بھی پیغمبری کا دعویٰ کر کے اپنا ایک گروپ بنا لیا اور فتنہ پردازی میں مشغول ہو گیا۔ وہ اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ بے معنی سخن بافی کے ذریعے قرآن سے معارضہ کرے۔

رسولِ خدا ابھی سفرِ حج سے جلد ہی لوٹے تھے کہ دو افراد مسلیمہ کذاب کا خط آپ کے پاس لے کر پہنچے۔ اس میں لکھا تھا: مسلیمہ خدا کے رسول کی طرف سے محمدؐ اللہ کے رسول کے نام

میں پیغمبری میں آپ کا شریک ہوں، آدھی زمین قریش سے متعلق ہے اور آدھی مجھ سے۔ لیکن قریش عدالت سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ (تاریخ طبری: ج ۳،ص ۱۴۶)

رسولؐ اللہ بہت ناراض ہوئے اور مسیلمہ کے نامہ بروں سے فرمایا: اگر تم سفیر اور قاصد نہ ہوتے تو میں تمھارے قتل کا حکم دے دیتا۔ تم لوگ کس طرح اسلام سے جدا ہو کر ایک تیمی مغرور کے پیرو ہو گئے۔ پھر آپؐ نے حکم دیا کہ مسیلمہ کو بہت سخت جواب لکھا جائے۔ خدائے رحمن ورحیم کے نام سے محمد الرسول اللہ کی طرف سے دروغ گو مسیلمہ کی طرف سلام ہو، ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر، زمین خدا کی ملکیت ہے اور وہ اپنے صالح بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے زمین کا وارث قرار دیتا ہے اور نیک انجام پرہیزگاروں کا ہوگا۔ (حوالہ سابق)

جھوٹے پیغمبر کی طرف میلان کا سبب قومی تعصب

طبری کا بیان ہے کہ ایک شخص یمامہ گیا اور اس نے پوچھا: مسیلمہ کہاں ہے؟ اس سے لوگوں نے کہا کہ پیغمبر خدا کہو۔ اس شخص نے کہا: نہیں میں پہلے اس کو دیکھوں گا۔ جب اس مسیلمہ کو دیکھا تو کہا کہ تُو مسیلمہ ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ پوچھا: کیا تمھارے اُوپر فرشتہ نازل ہے؟ اُس نے کہا: ہاں، اور اس کا نام رحمٰن ہے۔ پوچھا: نُور میں آتا ہے یا ظلمت میں؟ مسیلمہ نے کہا: ظلمت میں۔ اس شخص نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تُو جھوٹا ہے اور محمدؐ سچے ہیں لیکن ربیعہ کی دروغ گوئی کو مضر (حجاز) کی راست گوئی سے زیادہ دوست رکھتا ہوں۔ (تاریخ طبری: ج ۳،ص ۲۸۶)

جھوٹوں کا انجام

سجاح جو نبوت کا دعویٰ کرتی تھی، مسیلمہ نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ رسولؐ خدا رحلت کے بعد لشکرِ اسلام نے اس کی سرکوبی کی اور اس کے قتل کے بعد اس کی جھوٹی نبوت کی بساط اُلٹ گئی۔ (تاریخ طبری: ج ۳،ص ۲۹۰)

رسولِ خدا کے زمانے میں مدعیانِ نبوت میں طلیحہ نامی ایک شخص تھا جو قبیلہ "بنی اسد" قبیلہ غطفان میں ظاہر ہوا۔ رسولِ خدا نے قبیلہ بنی اسد میں اپنے نمایندوں کو پیغام بھیجا کہ اس کے

خلاف قیام کریں۔ وہ لوگ اس پر حملہ آور ہوئے اور وہ فرار کر گیا۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۵۶)

اس طرح رسولِ خدا کی تدبیر سے آپ کی زندگی کے آخری دنوں میں یا آپ کی وفات کے بعد جھوٹے پیغمبروں کی بساط اُلٹ گئی۔

رحلتِ پیغمبرؐ کے وقت کے حالات کا تجزیہ

بیماری سے نسبتاً آفاقہ کے کچھ ہی دنوں بعد آنحضرتؐ دوبارہ علیل ہو گئے۔ ہر چند کہ تمام جزیرۃ العرب حکومت اسلامی کے زیر اثر تھا لیکن ایک طرف پیغمبری کے جھوٹے دعویداروں نے سر اُٹھا رکھا تھا اور بہت سے رؤساء قبائل کہ جن کے دلوں میں ابھی تک اسلام کی جڑیں نہیں پہنچی تھیں۔ گذشتہ لوگوں کے موہوم امتیازات سے جو دست بردار ہوئے تھے، جن کو زکوٰۃ کا ادا کرنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ وہ پیغمبری کے جھوٹے دعویداروں سے مل کر شورش پر آمادہ ہو گئے۔ دوسری طرف موقع کی تلاش میں رہنے والے منافقین کا مکمل پلاننگ کے ساتھ یہ ارادہ تھا کہ اسلام کے عظیم رہبر کی آنکھ بند ہوتے ہی حکومت اسلامی پر قبضہ کر لیں اور اس کو امامت و ولایت کے صحیح راستے سے منحرف کر دیں۔

بہر حال، رہبر اسلام کی رحلت شورش کرنے والوں اور مرتدین کے حوصلوں کی تقویت کا موجب ہوئی۔ دوسرا اہم موضوع یہ ہے کہ پیغمبرؐ خدا کی جانشینی کے سلسلہ میں رقابتی کھینچا تانی کی بنا پر اُمت اسلامی کے درمیان بہت بڑا شگاف پیدا ہو جاتا۔ جو تنہا بھی ایک بہت بڑا خطرہ ثابت ہوتا۔ روم کی بڑی طاقت بھی انتظار میں تھی تا کہ جزیرۃ العرب پر حملہ کر کے اسلام کی جڑ کو کاٹ دے۔ فتنے اُٹھ چکے تھے داخلی و خارجی تحریکیں اور سازشیں اسلام کی بنیادوں کو چیلنج کر رہی تھی۔

لشکرِ اسامہ کی روانگی

رسولِ خدا نے داخلی سازشوں کو ختم کرنے اور خارجی تحریکوں کی سرکوبی کے لیے لشکرِ اسامہ کی تشکیل اور روانگی کا حکم صادر فرمایا۔ سپاہیوں کی مزید تشویق کے لیے اپنے ہاتھوں سے پرچم کو باندھا اور اس کو ۱۷ سالہ جوان اسامہ کے سپرد کیا اور سپہ سالار معین فرمایا۔ اس بہادر نوجوان نے اس لشکر کی کمان سنبھالی جو عالمی استکبار سے جنگ کے لیے آمادہ تھا۔ آنحضرتؐ نے اسامہ کو حکم دیا

کہ تم اپنے باپ کی شہادت گاہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور جانے میں جلدی کرو۔ صبح کو نہایت تیزی سے ناگہانی طور پر دشمن پر حملہ کردو۔ پیغمبرؐ خدا نے مسلمانوں سے کہا کہ لشکرِ اسامہ میں شرکت کریں اور جتنی جلدی ہو، روانگی کے لیے تیار ہو جائیں۔

رسولؐ خدا کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سازشوں کا تانا بانا بننے والے، لشکر کے ساتھ مدینہ سے خارج ہو جائیں تا کہ شہر ان سے خالی ہو جائے اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے راستے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ آپؐ نے جوان سال اسامہ کا انتخاب فرمایا۔ ان کا انتخاب اس لیے فرمایا تھا کہ:

اوّلاً: آپؐ یہ چاہتے تھے کہ ذمہ داریاں شخصیت اور لیاقت کی بنا پر دی جائیں نہ کہ سن و سال اور موہوم شرافتوں کی بنا پر تا کہ آیندہ لوگ (حضرت) علیؑ کو یہ کہہ کر الگ نہ کرسکیں کہ وہ تو جوان ہیں۔

ثانیاً: اسامہ کے والد زیدؓ ابن حارثہ رومیوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں ان میں رومیوں کے ساتھ جنگ کرنے کا زیادہ سے زیادہ جذبہ تھا۔ سپہ سالاری کا عہدہ سونپ دینے کے بعد عملی طور پر ان کی دلجوئی بھی ہو جاتی۔

اسامہ نے مدینہ کے قریب مقام "جرف" میں پڑاؤ ڈال دیا۔ بزرگ صحابہ اور مہاجرین میں سے بڑے بڑے افراد سب کے سب اسامہ کے لشکر کے سپاہی اور ان کی ماتحتی میں تھے۔ یہ بات ان میں سے بعض کے لیے بڑی سخت تھی۔ انھوں نے علانیہ طور پر اسامہ کی سپہ سالاری پر اعتراض کیا کہ بزرگوں کی سپہ سالاری کے لیے نوجوان کیوں منسوب کیا گیا؟ لشکر کی روانگی میں عملی طور پر مخالفت ہوئی۔ چند دنوں تک لشکر پڑاؤ پر رُکا رہا۔ مخالفت کرنے والوں نے لشکر کی روانگی میں کوتاہی کی اور اپنے بے ہودہ مقاصد کو انجام دینے کے لیے انھوں نے روانگی میں تاخیر کرائی۔

رسولؐ خدا نے بسترِ علالت پر سمجھ لیا کہ لشکرگاہ سے لشکر کی روانگی کو روکنے کے لیے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ آپ بستر سے اُٹھے اور بخار تیز غیظ و غضب کے عالم میں مسجد میں تشریف لائے۔ خدا کی حمد کے بعد فرمایا:

"اے لوگو! میں لشکر کی روانگی میں دیر ہونے سے بہت ناراض ہوں۔ گویا اسامہ کی سپہ سالاری تم میں سے ایک گروہ کے اُوپر گراں گزری اور تم نے

اعتراضات شروع کر دیے تم اس سے پہلے بھی ان کے باپ کی سپہ سالاری پر اعتراض کر رہے تھے۔ خدا کی قسم! اس کے باپ بھی سپہ سالاری کے لیے مناسب تھے اور وہ خود بھی مناسب ہیں"۔

پیغمبرؐ خدا گھر میں واپس گئے اور ہر اس صحابی سے جو آپ کو دیکھنے کے لیے دوڑا چلا آتا تھا فرماتے تھے، لشکر اسامہ کو روانہ کرو۔ (طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۱۹۰)

لیکن سازشیں اس سے بالاتر تھیں یہاں تک کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جو لشکر اسامہ سے رُوگردانی کرے اس پر خدا کی لعنت۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۲۱)

اہلِ بقیع کے مزار پر

رسولؐ خدا شدید بیماری کے عالم میں حضرت علی علیہ السلام کا سہارا لیے قبرستان بقیع کی طرف چلے۔ اصحاب آپؐ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ جب بقیع کے قبرستان میں پہنچے تو فرمایا: میں اس بات پر مامور ہوں کہ خداوند عالم سے اہلِ بقیع کے لیے طلبِ مغفرت کروں۔ پھر فرمایا: اے زیرخاک آرام کرنے والو! تم پر میرا سلام ہو، تم اطمینان و مسرت سے آرام کرو کہ تمھارا دن ان لوگوں کے دن سے زیادہ آسودہ ہے۔ فتنے اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح بڑھ آئے ہیں۔

پھر فرمایا: علیؑ! ہر سال جبرائیلؑ میرے پاس قرآن کو ایک مرتبہ پیش کرتے تھے اور اس سال دو بار انھوں نے پیش کیا۔ اس لیے کہ میرا وقت قریب آگیا ہے۔ (ارشاد مفید: ص ۹۸)

بے لکھی تحریر

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام تھے جب آپؐ نے آنکھیں کھولیں تو اپنے بستر کے اردگرد چند اصحاب کو دیکھا جن کو آپؐ کے حکم کے مطابق اس وقت لشکرِ اسامہ کے ساتھ اور اس میں ہونا چاہیے تھا۔ اُمت میں اختلاف کی روک تھام کے لیے آپؐ نے ان سے خطاب فرمایا: کاغذ اور قلم و دوات لاؤ تاکہ میں تمھارے لیے ایک چیز لکھ دوں کہ اس کے بعد گمراہ نہ ہوگے۔ ان میں سے ایک صاحب نے چاہا کہ اُٹھ کر قلم دوات لے آئیں لیکن جنابِ عمرؓ نے اظہارِ خیال کیا۔ یہ (پیغمبرؐ کی جانب اشارہ) ہذیان بک رہے ہیں۔ قرآن تمھارے پاس ہے اور کتاب آسمانی ہمارے

لیے کافی ہے۔ایک گروہ نے مخالفت میں حضرت عمرؓ کا ساتھ دیا اور کچھ لوگوں نے ان کی مخالفت کی۔ شوروغل برپا ہوا۔ رسولؐ خدا نے فرمایا: اٹھو اور میرے گھر سے نکل جاؤ۔

ناتمام نماز

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت کے دوران ایک دن صبح کو حضرت بلالؓ نے اذان دی اور پیغمبرؐ خدا کے گھر کے دروازے پر آکر آواز دی: نماز...... خدا تمھارے اُوپر رحمت کرے۔ رسولؐ خدا بہت زیادہ بیمار تھے اس وجہ سے آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں کو کوئی نماز پڑھادے، اس لیے کہ میں بیمار ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ حضرت ابوبکرؓ کو تلاش کرو اور حفصہؓ نے کہا کہ حضرت عمرؓ کو بلاؤ۔ پیغمبرؐ خدا نے دونوں کی باتیں سنیں اور دونوں بیویوں سے کہا: ان باتوں سے اپنے کو روکو کہیں تم ان عورتوں کی طرح نہ ہوجاؤ جنھوں نے یوسفؑ کو گمراہ کرنا چاہا۔

آپؐ اسی شدید بیماری کے عالم میں اُٹھے۔ حضرت علیؑ اور فضلؓ بن عباس نے دونوں شانوں کو سہارا دے رکھا تھا، مسجد میں تشریف لائے، حضرت ابوبکرؓ کو محراب میں دیکھا کہ نماز کے لیے کھڑے ہوگئے ہیں۔ آپؐ نے ہاتھوں سے ان کو اشارہ کیا کہ ہٹ جائیں۔ رسولؐ خدا نے ان کی نماز کو ناتمام چھوڑا اور دوبارہ نہایت مختصر نماز کا اعادہ کیا۔ جب آپؐ گھر تشریف لے گئے تو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور دوسرے افراد کو بلوا بھیجا۔ جب یہ لوگ آپؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ لشکرِ اسامہ کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟ انھوں نے جواب دیا: ہم آپؐ سے تجدید بیعت کے لیے لوٹ آئے اور ہم نے یہ نہیں چاہا کہ آپؐ کی بیماری کی خبر دوسروں سے پوچھیں۔ (کنز العمال: ج ۳، ص ۱۳۸)

وداعِ پیغمبرؐ

پیغمبرؐ خدا کی بیماری نے شدت اختیار کرلی۔ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا آنحضرتؐ کے بستر کے پاس بیٹھی ہوئی باپ کے نُورانی اور ملکوتی چہرے کو دیکھ رہی تھیں، جس پر بخار کی شدت کی بنا پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ جنابِ فاطمہؑ نے جنابِ ابوطالبؑ کا شعر جو پیغمبرؐ خدا کے بارے میں تھا، پڑھا:

وَأَبۡيَضَ يُسۡتَسۡقَى الۡغَمَامُ بِوَجۡهِهٖ
ثِمَالُ الۡيَتَامٰى عِصۡمَةٌ لِلۡاَرَامِلِ

"یعنی روشن چہرہ اس چہرہ کی آبرومندی کے وسیلہ سے بارش طلب کی جاتی ہے جو یتیموں کی پناہ گاہ اور بیوہ عورتوں کی نگہداری کرنے والا ہے"۔

رسولؐ خدا نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا: بیٹی! شعر نہ پڑھو، قرآن پڑھو۔

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ وَ مَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـًٔا وَ سَيَجۡزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ ۝ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۴۴)

"محمدؐ نہیں ہیں مگر پیغمبرؐ خدا، ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبرؐ گزر چکے ہیں تو کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا قتل کر دیئے جائیں تو تم اپنے گذشتہ لوگوں کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ اور جو اپنے گزشتگان کے آئین کی طرف پلٹ جائے گا وہ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ خدا شکر کرنے والوں کو نیک جزا دے گا"۔

رسولؐ خدا نے آہستہ سے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے کانوں میں کوئی بات کہی۔ آپؑ نے گریہ شروع کیا۔ پیغمبرؐ خدا اپنی بیٹی کی اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکے۔ دوبارہ آپؐ نے ان کے کانوں میں ایک بات کہی تو جنابِ فاطمہؑ چپ ہو گئیں اور مسکرانے لگیں۔

بعد میں جب لوگوں نے جنابِ فاطمہؑ سے سوال کیا کہ رسولؐ خدا نے آپؑ سے کیا کہا تھا کہ پہلی بار آپؑ روئیں اور دوسری بار مسکرائی تھیں؟

آپؑ نے جواب دیا: پہلی بار آنحضرتؐ سے ان کی رحلت کی خبر سنی تو میں مغموم ہو گئی۔ دوسری بار آپؐ نے بشارت دی کہ اے فاطمہؑ! میرے اہل بیتؑ میں سے تم سب سے پہلے مجھ سے ملو گی۔ اس پر میں بشاش ہو گئی۔

پیغمبرؐ خدا نے اپنی حیات کے آخری لمحوں میں حضرت علی علیہ السلام کو بلایا اور فرمایا:

علیؑ میرا سر اپنی آغوش میں لے لو کہ امر خدا آپہنچا۔ اے علیؑ! جب میں اس دنیا میں نہ رہوں تو مجھے غسل دینا اور پہلی بار مجھ پر نماز پڑھنا"۔

آپؐ کا سر حضرت علی علیہ السلام کی گود ہی میں تھا کہ آپؐ رحمت باری سے جا ملے۔ یہ عظیم

معصیت دوشنبہ ۲۸ صفر سنہ ۱۱ ہجری قمری کو آئی لیکن مورخین اہل سنت کے اعتقاد کے مطابق پیغمبرؐ خدا کی رحلت ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ ہجری قمری کو ہوئی۔

حضرت علی علیہ السلام نے رسولؐ خدا کے پاکیزہ جسم کو غسل دیا، کفن پہنایا اور نماز پڑھی۔ اس عالم میں کہ آنسو آپؑ کی آنکھوں سے رواں تھے اور فرمایا:

ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں اے اللہ کے رسولؐ! بے شک آپؐ کے انتقال سے وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا"۔

وہ چیز جو دوسرے پیغمبروںؑ کی موت کے بعد منقطع نہیں ہوئی (یعنی نبوت و احکام الٰہی اور آسمانی خبریں) اگر آپ صبر کا حکم نہ دیتے اور نالہ وفغاں سے منع نہ فرماتے تو میں آپؐ کے فراق میں اتنا روتا کہ میرے اشکوں کا سرچشمہ خشک ہو جاتا۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۲۲۶، ص ۷۳۳)

رسولؐ خدا کی رحلت کی خبر نہایت تیزی سے مدینہ میں پھیل گئی۔ حضرت علی علیہ السلام جب غسل وکفن میں مشغول تھے اس وقت ایک گروہ سقیفہ میں پیغمبرؐ خدا کے جانشین کا مسئلہ حل کرنے میں اُلجھا ہوا تھا۔ غسل دینے کے بعد پہلے حضرت علی علیہ السلام نے نماز جنازہ پڑھی پھر مسلمان دستہ دستہ آتے گئے اور نماز پڑھتے گئے۔ پھر رسولؐ خدا کو ان کے گھر میں مسجد کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

یہ نور ہرگز نہیں بجھے گا

پیغمبرؐ خدا دارِ بقاء کی طرف روانہ ہو گئے لیکن یہ نور نہ تو گل ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ ان کے آئین مشعلِ ہدایت کی طرح بشر کے تاریک راستوں میں رہنما ہیں اور کھربوں انسان صدیوں سے ان کے آئین کے پیرو ہیں۔

اب روزانہ ایک ملیارد مسلمان ساری دنیا میں کروڑوں بار اَشْهَدُ اَن لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ کی آواز گلدستۂ اذان سے سن رہے ہیں اور بے پناہ محبت کے ساتھ اس آواز کے دلبر ترنم کو اپنی زبان پر جاری کرتے اور ان (محمدؐ) پر درود بھیجتے ہیں۔ ان کی آسمانی کتاب کو پڑھتے اور اس سے سبق حاصل کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کریم ۱۱۴ سوروں کے جاودانہ اعجاز کے عنوان سے محمدؐ کی رسالت پر زندہ گواہ کی حیثیت سے موجود ہے۔ خدا نے ان کے دین کو آخری دین اور ان کو آخری پیغمبر قرار دیا ہے۔ جو ان کے آئین کی پیروی نہ کرے

(گمراہ ہے) خدا اس سے اس کی عبادت کو قبول نہیں کرے گا اور آخرت میں وہ گھاٹے میں رہے گا۔ (آلِ عمران: آیت ۸۵)

جی ہاں! یہ نُور آج لوگوں کے دلوں اور ان کی عقل وخرد پر جگمگا رہا ہے۔ یہ نُور ہر جگہ چمکا اور تھوڑی ہی مدت میں جزیرۃ العرب سے نکل کر ہر جگہ پھیل گیا۔ روم اور ایران کی مطلق العنان حکومتوں کو اپنے ہالہ میں لے لیا اور ایک طرف قلب فرانس اور اسپین تو دوسری طرف ہند تک پہنچ گیا۔

ڈوبتی ہوئی بشریت کو نجات بخشی اور اس کو ایک عظیم تمدن سے روشناس کرایا۔

ختم نبوت کے بعد یہ نُور معصوم رہنماؤں میں درخشندہ ہوا اور ہدایت کے یہ پاک انوار اور نُوری پیکر فتنوں کی تیرگی میں انسانوں کی ہدایت کے لیے کمربستہ ہوئے اور انسانیت کو الٰہی واسلامی زندگی کی طرف بلایا اور آج بھی نجاتِ بشریت کا واحد راستہ قرآن وعترت کی پیروی ہے۔

آخر کلام میں عرض ہے کہ مسلمان ان کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے راستے کو تلاش کرے۔ ستم کے بوجھ تلے دبا ہوا تیرہ بخت اور حیران وسرگرداں انسان کی رہائی کا واحد راستہ ان کا آئین ہے۔ تحریکیں شروع ہوں گی اور کفر وارتداد ونفاق وظلم وستم مغلوب ہوں گے اور کمزور افراد زمانے کے راہبر اور زمین کے وارث ہوں گے۔ (سورۂ قصص: آیت ۵)

امام مہدی (عَجَّلَ اللّٰهُ لَهُ الفَرَج) تشریف لائیں گے۔ پھر ساری دنیا میں ایک اسلامی حکومت قائم ہوگی اور ساری دنیا میں ایک پرچم لہرائے گا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ!

یہ نُور کبھی بجھ نہیں سکتا!

تاریخ اسلام

(حصّہ دوم)

maablib.org

اپنی بات

اس سے قبل موسسۂ انصاریان نے نوجوانوں اور جوانوں کے لیے ائمہ معصومین علیہم السلام کی مختصر سوانحِ عمری شائع کی تھی۔ اس کے بعد علامہ روزبہان کی تالیف "شرح صلوات"، "چودہ معصوم" کا ترجمہ شائع کیا مگر یہ دونوں کتابیں مختلف سطح کے لوگوں سے متعلق تھیں۔ ایک بالکل سطحی، دوسری علمی ہونے کے ساتھ ساتھ تعجب آور، قدیم اسلوب کی تحریر تھی جو کہ تجزیہ و تحلیل اور اسباب و علل سے یکسر خالی تھی۔

محترم انصاریان کی خواہش تھی کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی ایک ایسی سوانح عمری اُردو دان طبقہ کے لیے طبع کی جانی چاہیے کہ جس کے تاریخی حقائق کا، حق و انصاف کے ساتھ عقلِ سلیم کی روشنی میں تجزیہ ہوا ہو، اور مربوط واقعات کے اسباب و علل کی صحیح تحقیق پیش کی گئی ہو۔ جستجو جاری تھی، جوئندہ یابندہ، موصوف کو دو کتابیں "ایک عہدِ رسالتؐ سے اور دوسری زمانۂ امامتِ علیؑ بن ابی طالبؑ سے متعلق دستیاب ہوئیں۔ ان کی تصحیح و ترجمہ اور طباعت کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا۔

مَیں نے کہا:

"اگر یہ عظیم کام آپ انجام دینا ہی چاہتے ہیں تو چودہ معصومین علیہم السلام کی سوانحِ حیات بیک وقت شائع کیجیے تاکہ قارئین کو انتظار کی زحمت برداشت نہ کرنی پڑے"۔

انھوں نے کہا:

"بات تو صحیح ہے لیکن سرِدست باقی ائمہ معصومین علیہم السلام کے بارے میں ایسی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ ہاں ایک کتاب ہے جس میں مختصر طور پر حالاتِ ائمہ معصومینؑ کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ فی الحال اسی کو حضرت علی علیہ السلام کی سوانحِ حیات کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ آئندہ خداوندِ متعال کشادگی عطا کرے گا تو

ہر ایک امام کی مفصل سوانح زندگی شائع کریں گے، ان شاء اللہ"۔

بحمد اللہ! اب یہ کتابیں تمام مراحل طے کر چکی ہیں اور طباعت کے لیے جاری ہیں۔

موسسۂ انصاریان دسیوں سال سے مختلف زبانوں میں، زمانہ کے اقتضاء کے مطابق مختلف علوم کی کتابوں کے تراجم شائع کر رہا ہے اور نشر علوم آل محمدؐ میں مشغول ہے۔ دین وملت کی مخلصانہ و بے لاگ خدمت کی وجہ سے یہ موسسہ عالمی اور بین الاقوامی شہرت کا حامل ہو گیا ہے، چنانچہ دنیا کے دور دراز ممالک میں بسنے والے کتابوں کے شائقین کتابوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور موسسہ پہلی فرصت میں انھیں کتابیں ارسال کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کے خطوط بھی بکثرت آتے ہیں کہ جن میں کتاب خریدنے کی استطاعت نہیں ہے، لیکن مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں۔ ان کی علمی تشنگی ختم کرنے کے لیے ادارہ انھیں مفت کتابیں بھیجتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس علمی عہد میں کوئی ناداری کی وجہ سے تشنۂ علم نہ رہے۔

یہ ادارہ پرائیویٹ اور نجی ہے، اس لیے اس کے امکانات بھی محدود ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کار خیر میں متمول و مخیر حضرات بھی حصہ لیں اور ادارہ سے رابطہ قائم کریں اور ناداروں تک کتابیں پہنچائیں۔ اس سے دین وملت اور علم تینوں کی خدمت ہو جائے گی۔ اُمید ہے ثواب حاصل کریں گے اور اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے اور نشر علوم وآل محمدؐ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

ہم زیر نظر کتاب کے امتیازی پہلوؤں کی نشان دہی تو نہیں کر سکتے لیکن اتنا جانتے ہیں کہ قارئین ان شاء اللہ اس کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے۔

طالبِ دُعا!

نثار احمد

maablib.org

حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے

مختلف ادوار

maablib.org

حضرت علی علیہ السلام کی تریسٹھ سالہ زندگی کے پانچ اَدوار

① ولادت سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک

② بعثت سے ہجرت تک

③ ہجرت سے رحلت تک

④ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے خلافتِ ظاہری تک

⑤ خلافتِ ظاہری سے شہادت تک

maablib.org

ولادت سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک

ولادت

حضرت علی علیہ السلام نے ۱۳ رجب بروز جمعہ واقعۂ عام الفیل (۱) کے تیسویں سال (بعثت سے دس سال قبل) خانۂ کعبہ میں ولادت پائی۔ اس نومولود بچے کے والد کا نام عمران (۲) تھا۔ وہ قبیلۂ بنی ہاشم کے سردار تھے اور مکہ کے بااثر لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی والدہ فاطمہؑ بنت اسد ابن ہاشم ابن عبدمناف تھیں۔ آپؑ کو خانۂ کعبہ کے طواف کے دوران دردِ زہ محسوس ہوا۔ چنانچہ! آپؑ معجزے کے زیرِ اثر خانۂ کعبہ کی عمارت میں داخل ہوگئیں اور وہیں حضرت علی علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔

خانۂ کعبہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ولادت کو عام شیعہ مورخین و محدثین اور علمِ انساب کے دانشوروں نے اپنی کتابوں میں تحریر کیا ہے، اب تک کسی دوسرے شخص کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ (۳)

---

(۱) عام الفیل وہ سال کہلاتا ہے جس میں ابرہہ ہاتھیوں پر سوار لشکر کے ساتھ کعبہ کو نیست و نابود کرنے کی غرض سے آیا تھا۔

(۲) حضرت عمران کے چار فرزند تھے، جن کے نام طالبؑ، عقیلؑ، جعفرؑ اور علیؑ تھے۔ آپ ابوطالبؑ کی کنیت سے مشہور تھے۔ بعض مورخین نے حضرت علی علیہ السلام کے والد کا نام عبدمناف بھی بیان کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۱۱)

(۳) حضرت علی علیہ السلام کی ولادت کو اہلِ سنت کے محدثین و مورخین نے بھی اپنی کتابوں میں خانۂ کعبہ میں تحریر کیا ہے۔ منجملہ ان کے مسعودی نے مروج الذہب: جلد ۲، ص ۳۴۹، حاکم نے مستدرک: جلد ۳، ص ۴۸۳ اور آلوسی نے شرح قصیدہ عبدالباقی آفندی (ص ۱۵)۔ مزید تفصیل کے لیے اہلِ سنت کے دانشوروں کے نظریات کو جاننے کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الغدیر: ج ۶، ص ۲۱-۲۳)

پیغمبرؐ کے زیرِ دامن آپؑ کی پرورش

حضرت محمد ﷺ پر جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہوئی تو اس وقت حضرت علی علیہ السلام کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔ حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کا وہ حساس ترین دور تھا جس میں حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ کے سایۂ عاطفت آپؑ کی شخصیت کی تشکیل ہوئی۔ آیندہ جو واقعات رُونما ہونے والے تھے، ان کا چونکہ پیغمبر اکرمؐ کو مکمل علم تھا اور بخوبی یہ جانتے تھے کہ آپؐ کے بعد حضرت علی علیہ السلام ہی اُمت مسلمہ کے اُمور کی زمام سنبھالیں گے، اس لیے آپؐ نے منظم دستور العمل کے تحت اپنے زیرِ دامن تربیت کی غرض سے اس وقت جب کہ حضرت علی علیہ السلام کی عمر چھے سال تھی، ان کے والد کے مکان سے اپنے گھر منتقل کر لیا تا کہ براہِ راست اپنی زیرِ نگرانی تربیت و پرورش کر سکیں۔ ①

حضرت محمد ﷺ کو حضرت علی علیہ السلام سے اس قدر محبت تھی کہ آپؐ کی معمولی دیر کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔ چنانچہ! جب بھی عبادت کی غرض سے آنحضرتؐ مکہ سے باہر تشریف لے جاتے تو حضرت علیؑ کو بھی ہمراہ لے جاتے تھے۔ ②

حضرت علی علیہ السلام نے اس دور کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی ہے:

"یہ تو آپ سب ہی جانتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ کو مجھ سے کس قدر اُنسیت تھی اور مجھے جو خاص قربت حاصل تھی اس کا بھی آپ کو علم ہے۔ مَیں نے آپؐ کی پُرشفقت آغوش میں پَرورش پائی ہے۔ جب میں بچہ تھا تو

---

① سیرتِ ابن ہشام: ج ۱، ص ۲۶۲، کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۵۸، کشف الغمہ: ج ۱، ص ۷۹، تاریخ طبری: ج ۲، ص ۳۱۲۔ البتہ! مورخین کی رائے میں حضرت علی علیہ السلام کے پیغمبر اکرم ﷺ گھر منتقل ہونے کا سبب وہ قحط سالی تھی، جس سے شہر دوچار ہوا تھا اور ابوطالبؑ کی زندگی چونکہ تنگ دستی میں گزر رہی تھی اس لیے حضرت محمدؐ کی تجویز پر آپؐ کے قبیلے کے لوگ ان کے ہر فرزند کو اپنے ساتھ لے گئے اور حضرت علی علیہ السلام کو آنحضرت ﷺ اپنے ساتھ لے آئے لیکن! شہید مطہری نے نقل مکانی کی اس وجہ کو مسترد کیا ہے اور اسے مورخین کے ذہن کی اختراع قرار دیا ہے جس کا سبب رسولِ اکرمؐ کے اس اقدام کی اہمیت اور قدر و قیمت کو کم کرنا مقصود ہے۔ اس سلسلے میں موصوف کا مطمعِ نظر متن کتاب میں ملاحظہ ہو۔

② تاریخ طبری: ج ۲، ص ۳۱۳، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱۳، ص ۱۹۹، کشف الغمہ: ج ۱، ص ۱۱۷، کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۵۸، سیرۃ ابنِ ہشام: ج ۱، ص ۲۶۳

آنحضرت ﷺ مجھے گود میں لے لیا کرتے تھے۔ مجھے آپؐ گلے سے لگاتے تھے اور اپنے ساتھ سُلاتے تھے۔ میں ان کے پاس سوتا تھا اور آپؐ کے بدن کی خوشبو سونگھتا تھا۔ آپؐ لقمے چباتے اور میرے منہ میں دیتے تھے۔ جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے اسی طرح میں پیغمبر اکرم ﷺ کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ آپؐ ہر روز اپنے اخلاقی فضائل کا پرچم میرے سامنے لہراتے اور فرماتے کہ میں بھی آپؐ کی پیروی کروں"۔ ①

اس دوران حضرت علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرم ﷺ کے اخلاقِ گرامی اور فضائلِ انسانی سے بہت زیادہ کسبِ فیض کیا اور آپؐ کی زیرِ ہدایت و نگرانی روحانیت کے درجۂ کمال پر پہنچ گئے۔

---

① نہج البلاغہ، خطبۂ قاصعہ (۱۹۲) ولقد کنت اتبعه اتباع الفصیل اثر أمه یرفع لی کل یوم من اخلاقه علمًا یامرنی بالاقتداء به۔

بعثت سے ہجرت تک

پہلا شخص جس نے دینِ اسلام قبول کیا

حضرت علی علیہ السلام کا اولین افتخار یہ ہے کہ آپؑ نے سب سے پہلے دینِ اسلام قبول کیا بلکہ صحیح معنوں میں یوں کہیے کہ آپؑ نے اپنے قدیم دین کو آشکار کیا۔

دینِ اسلام قبول کرنے میں پیش قدمی وہ اہم موضوع ہے جس کو قرآن نے بھی بیان کیا ہے۔ (۱) یہی نہیں بلکہ جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل دینِ اسلام قبول کیا اور راہِ خدا میں اپنی جان و مال کو نثار کیا انھیں ان لوگوں پر فوقیت حاصل ہے جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے اور جہاد کیا۔ (۲) اس پس منظر میں اس شخص کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو سب سے پہلے دینِ اسلام سے مشرف ہوا اور اس وقت ایمان لایا جب کہ ہر طرف دشمنانِ اسلام کی طاقت کا ہی دور دورہ تھا۔ دینِ اسلام قبول کرنے میں آپؑ نے جو سب پر فوقیت حاصل کی۔ اس کا شمار اتنے عظیم افتخار میں ہوتا ہے کہ دیگر تمام فضائل اس کی برابری نہیں کر سکتے۔

بہت سے مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی مرتبہ وحی پیر کے دن نازل ہوئی اور اس سے اگلے دن حضرت علی علیہ السلام ایمان لائے۔ (۳)

---

(۱) سورۂ واقعہ آیت ۱۰-۱۱: وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ، اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ "اور آگے والے تو پھر آگے والے وہی ہیں جو مقرب لوگ ہیں"۔

(۲) سورۂ حدید، آیت ۱۰: لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا "تم میں سے جو لوگ خرچ اور جہاد کریں گے وہ بھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے"۔

(۳) سیرتِ ابن ہشام: ج۱، ص ۲۴۶، کشف الغمہ: ج۱، ص ۱۱۳، کامل: جلد ۲، ص ۵۷، تاریخ طبری: ج ۲، ص ۲۱۰، سنن ابن ماجہ، ج۱، ص ۵۷۔

حضرت علی علیہ السلام نے دینِ اسلام قبول کرنے میں جو دوسروں پر سبقت کی اس کی صراحت کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کے مجمع عام میں فرمایا تھا:

"روزِ قیامت مجھ سے حوضِ کوثر پر وہ شخص پہلے ملاقات کرے گا جو دینِ اسلام قبول کرنے میں سب پر سبقت لے گیا ہے اور وہ ہے علیؑ ابن ابی طالب"۔ ①

حضرت علی علیہ السلام نے بھی مختلف مواقع پر اس حقیقت کی صراحت فرمائی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"اس روز جب کہ اسلام کسی کے گھر تک نہیں پہنچا تھا اور صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت خدیجہ علیہا السلام اس دین سے مشرف ہوئے تھے، تو میں تیسرا مسلمان تھا۔ میں نورِ رسالت کو دیکھتا تھا اور نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ ②

آپؑ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"خداوندا! میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے تیری طرف لوٹ آنے کا پیغام سنا اور (تیرے پیغمبرؐ کی دعوت کا) جواب دیا"۔

بے نظیر قربانی

اس رات کو لیلۃ المبیت کہا جاتا ہے جس رات کو حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سو گئے اور آنحضرتؐ ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے۔ آپؑ کے دیگر افتخارات میں سے ایک افتخار یہ بھی ہے اور تمام مورخین نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اہلِ قریش میں سے چالیس بہادروں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس رات رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر دیں گے۔ اس غرض

---

① اوّلکم وروداً علی الحوض اوّلکم اسلاماً (علی بن ابی طالب)، مستدرک حاکم: ج ۳، ص ۱۳۶۔ کشف الغمہ: ج ۱، ص ۱۰۵، تاریخ بغداد: ج ۲، ص ۸۱، شرح ابن ابی الحدید: ج ۳، ص ۲۵۸ وغیرہ۔ مزید اطلاع کے لیے ملاحظہ ہو، الغدیر: ج ۳، ص ۲۳۰۔

② نہج البلاغہ: خطبہ ۱۹۲۔ ولم یجمع بیت واحد یومئذٍ فی الاسلام غیر رسول اللہ وخدیجہ وأنا ثالثھما أری نور الوحی والرسالۃ واشتم ریح النبوۃ۔

سے انھوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کو نرغے میں لے لیا۔ اس رات حضرت علی علیہ السلام نے اپنی جان کی بازی سے آنحضرتؐ کی جان بچائی اور جو خطرات رسولؐ خدا پر آنے والے تھے، انھیں اپنے اوپر لے لیا۔

ہجرت سے رحلت تک

علیؑ رسولِؐ خدا کے امین

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب یہ حکم ملا کہ مکہ سے مدینہ تشریف لے جائیں تو آپؐ کو اپنے قبیلے کے افراد میں کوئی بھی ایسا شخص نظر نہ آیا جو حضرت علی علیہ السلام سے زیادہ امین و صادق ہو۔ چنانچہ! اس بنا پر رسولِؐ خدا نے حضرت علیؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور فرمایا کہ لوگوں کو ان کی امانتیں جو آپؐ کے پاس تھیں واپس کر دیں اور آپؐ پر جو قرض واجب ہیں، انھیں بھی ادا کر دیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کی دختر حضرت فاطمہ علیہا السلام اور بعض دیگر خواتین کو ساتھ لے کر مدینہ آ جائیں۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے بعد حضرت علی علیہ السلام ان اُمور کو انجام دینے کے لیے، جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا، تین دن تک مکہ میں تشریف فرما رہے۔ اس کے بعد آپؐ اپنی والدہ فاطمہؑ، دختر رسولِؐ خدا حضرت فاطمہ زہراؑ، فاطمہ بنت زبیر اور دیگر بعض عورتوں کے ہمراہ پیدل مدینہ کی جانب روانہ ہوئے اور قُبا میں پیغمبرؐ خدا سے جا ملے۔ ①

جس وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی تو دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام کے پیروں میں پیدل چلنے سے چھالے پڑ گئے ہیں اور ان سے خون بہنے لگا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کو دیکھ کر پیغمبر اکرم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور آپؐ نے فرطِ محبت سے گلے لگا لیا اور آپؐ کے حق میں دعا کی۔ اس کے بعد آپؐ نے لعابِ دہن حضرت علی علیہ السلام کے پیروں پر لگایا، جس کی وجہ سے زخم بھر گئے۔

علیؑ رسولِؐ خدا کے بھائی

ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جانے کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اہم و سودمند

---

① یہ مقام مدینہ سے دو فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے اور یہاں قبیلۂ بنی عمرو بن عوف آباد تھا۔ (معجم البلدان: ج۴، ص۳۰۱)

اقدامات کیے ان میں ایک یہ تھا کہ مہاجرین و انصار کے درمیان رشتۂ اخوت و برادری برقرار کیا۔ چنانچہ اس وقت مسجد میں جتنے بھی لوگ موجود تھے، ان کے درمیان رسولِ خدا ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ رشتۂ برادری قائم کر دیا۔ حضرت علی تنہا رہ گئے تو آپؑ نے پیغمبرِ خدا کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے میرے علاوہ ہر ایک کو رشتۂ برادری میں منسلک کر دیا۔ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے ایک تاریخی جملہ اپنی زبانِ مبارک سے ادا کیا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ کی نظر میں حضرت علیؑ کی کیا عظمت تھی، اور آپؐ کی نظروں میں ان کی کتنی وقعت و اہمیت تھی۔ آپؐ نے فرمایا:

"قسم ہے اس خدا کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا۔ میں نے تمھارے رشتۂ برادری میں تاخیر نہیں کی بلکہ تمھیں اپنے رشتۂ اخوت و برادری کے لیے منتخب کیا ہے۔ تم ہی دین و دنیا میں میرے بھائی ہو"۔ ①

علیؑ اور راہِ خدا میں جنگ

حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت اپنی قربانیوں اور راہِ حق میں جانبازیوں کے باعث صحابۂ پیغمبرؐ کے درمیان لاثانی و بے مثال ہے۔ ② غزوۂ تبوک کے علاوہ آپؑ نے تمام غزوات میں شرکت کی اور غزوۂ تبوک میں پیغمبر ﷺ کی ہدایت کے مطابق آپؑ مدینہ میں مقیم رہے۔ یہ آپؑ کی قربانی اور جانبازی کا ہی نتیجہ تھا کہ سپاہِ اسلام نے سپاہِ شرک پر غلبہ حاصل کیا۔ اگر اسلام کے اس جیالے کی جانبازیاں نہ ہوتیں تو ممکن تھا کہ وہ مشرک و کافر جو مختلف جنگوں میں اسلام کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ چراغِ رسالتؐ کو آسانی سے خاموش اور پرچمِ حق کو سرنگوں کر دیتے۔

یہاں ہم حضرت علی علیہ السلام کی ان قربانیوں کا سرسری جائزہ لیں گے، جو آپؑ نے جنگ کے میدانوں (بدر، اُحد، خندق اور خیبر) میں پیش کیں۔

---

① وَالَّذِیْ بعثنی بِالْحَقِّ.... أَنْتَ أَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ.... (مستدرک حاکم: جلد ۳، ص ۱۴)

② غزوہ اصطلاح میں اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں پیغمبر اکرم ﷺ بذاتِ خود موجود رہتے تھے۔ ایسی جنگوں کی تعداد چھبیس یا ستائیس ہے اور جن جنگوں میں رسولِ خدا موجود نہ تھے، انھیں اصطلاحاً "سریہ" کہا جاتا ہے۔ جن کی تعداد پینتیس سے چھیاسٹھ تک کے درمیان بتائی گئی ہے۔

علیؑ جنگِ بدر کے بے نظیر جانباز

جنگِ بدر میں حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت درج ذیل وجہ سے نمایاں رہی:

جنگ فرد بفرد:

جس وقت مشرکین کے لشکر سے عتبہ، شیبہ اور ولید جیسے تین نامور دلیروں نے میدانِ جنگ میں اُتر کر سپاہِ اسلام کو للکارا تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر حضرت عبیدہ بن حارث، حمزہ بن عبدالمطلب اور علیؑ ابن ابی طالبؑ ان سے جنگ کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں اُتر آئے۔ چنانچہ! حضرت عبیدہ، عتبہ سے، حضرت حمزہ، شیبہ سے اور حضرت علیؑ، ولید سے برسرِ پیکار ہوئے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے پہلے ہی وار میں دشمن کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد آپؑ حضرت حمزہ کی مدد کے لیے پہنچے اور ان کے حریف کے بھی دمِ شمشیر سے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس کے بعد یہ دونوں بزرگ حضرت عبیدہ کی جانب مدد کی غرض سے بڑھے اور ان کے حریف کو بھی ہلاک کر ڈالا۔ (الصحیح من سیرۃ النبی: ج ۳، ص ۱۹۱، بحار الانوار: ج ۱۹، ص ۲۲۵، ۲۵۴، ۲۹۰)

اس طرح آپؑ لشکرِ مشرکین کے تینوں نامور پہلوانوں کے قتل میں شریک رہے۔ چنانچہ! آپؑ نے حاکمِ شام کو جو خط لکھا، اس میں تحریر فرمایا:

> ''وہ تلوار آج بھی میرے پاس ہے، جس سے میں نے ایک ہی دن میں تیرے دادا (عتبہ)، تیرے ماموں (ولید)، تیرے بھائی (حنظلہ) اور تیرے چچا (شیبہ) کو قتل کیا تھا''۔ (حوالہ سابق)

مؤرخین نے لکھا ہے کہ جنگِ بدر میں لشکرِ مشرکین کے ستر سپاہی مارے گئے جن میں ابوجہل، اُمیہ بن خلف، نضر بن حارث اور دیگر سربرآوردہ سردارانِ کفار شامل تھے۔ ان میں سے ستائیس سے پینتیس کے درمیان حضرت علی علیہ السلام کی شمشیر کے ذریعے لقمۂ اجل ہوئے۔ اس کے علاوہ بھی دوسروں کے قتل میں آپؑ کی شمشیر نے جوہر دکھائے۔ چنانچہ اس وجہ سے قریش آپؑ کو سرخ موت کہنے لگے کیونکہ اس جنگ میں انھیں ذلت و خواری، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں نصیب ہوئی تھی۔ (الصحیح من سیرۃ النبی: ج ۳، ص ۲۰۲، ۲۰۳، مناقب: ج ۲، ص ۶۸، بحار الانوار: ج ۱۹، ص ۲۷۶، ۲۷۹، ۲۹۱)

علیؑ رسولؐ کے تنہا محافظ

جنگ اُحد میں بھی حضرت علی علیہ السلام کے کردار کا جائزہ دو مراحل، یعنی مسلمانوں کی فتح و شکست کے پس منظر میں لیا جاسکتا ہے:

① مرحلۂ فتح و کامیابی:

اس مرحلے میں لشکرِ اسلام کو کامیابی اور مشرکین کو پسپائی، آپؑ ہی کے دست و مبارک سے ہوئی۔ لشکرِ قریش کا اوّلین پرچم دار طلحہ بن ابی طلحہ جب حضرت علی علیہ السلام کے حملوں کی تاب نہ لاسکا اور زمین پر گر گیا تو اس کے بعد دوسرے نو افراد نے یکے بعد دیگرے پرچم لشکر اپنے ہاتھوں میں لیا لیکن جب وہ بھی حضرت علی علیہ السلام کی شمشیر سے مارے گئے تو لشکرِ قریش کے لیے راہِ فرار کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ (بحار الانوار: ج ۲۰، ص ۵۰-۵۱، الصحیح من سیرۃ النبی: ج ۴، ص ۲۱۳، ۲۱۸)

② مرحلۂ شکست:

جب آبنائے عینین کے بیشتر کمان داروں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے سرتابی کی اور اپنی جگہ سے ہٹ گئے تو اس وقت خالد بن ولید اپنے گھڑسوار لشکر کے ساتھ اس پہاڑ کا چکر کاٹ کر اس آبنائے کی راہ سے مسلمانوں پر ایک دم حملہ آور ہوا۔ چونکہ یہ حملہ اچانک اور انتہائی کمر شکن تھا، اسی لیے جنگ کے اس مرحلے میں ستر مسلمانوں کو شہادت نصیب ہوئی اور باقی جو چند بچ گئے تھے، ان کے لیے فرار کے علاوہ کوئی راہ نہ تھی۔

اس مرحلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا اہم ترین کردار یہ تھا کہ آپؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ مقدس کی پاسبانی و حفاظت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

ان حالات میں جب کہ چند مسلمانوں کے علاوہ سب اپنی جان بچانے کی خاطر میدانِ جنگ سے فرار کر گئے اور لشکرِ قریش نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر طرف سے اپنے حملوں کا نشانہ بنالیا تو اس وقت حضرت علی علیہ السلام ہی تھے جنھوں نے اپنے حملوں سے دشمن کو آگے بڑھنے سے روکا۔ چنانچہ! دشمنانِ اسلام کا وہ گروہ جو رسولِ خدا کے نزدیک آکر حملہ کرنا چاہتا تھا، آپؑ ہی کی تیغ سے ہلاکت کو پہنچا تھا۔

امیر المومنین علی علیہ السلام کی یہ قربانی اتنی اہم اور قابلِ قدر تھی کہ حضرت جبرئیلؑ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی مبارک باد دی۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے بھی یہ فرما کر عَلِیٌّ مِنِّی وَاَنَا مِنْ عَلِیّ ("یعنی علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں") اس قربانی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور جب غیب سے یہ ندا آئی: لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار وَلَا فَتٰی اِلَّا عَلِی تو دوسروں کو بھی حضرت علی علیہ السلام کی اس قربانی کا اندازہ ہو گیا۔[1]

خود حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اصحاب کے درمیان بعض تقاریر میں اس قربانی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

> "جس وقت لشکرِ قریش نے ہم پر حملہ کیا تو انصار و مہاجرین نے اپنے گھروں کی راہ لی۔ اگرچہ میں نے ستر سے زیادہ غم کھائے مگر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدافعت و پاسبانی کرتا رہا"۔ (بحار الانوار: ج ۲۰، ص ۷۰، خصال صدوق (مترجم): ج ۲، ص ۱۲۷)

حضرت علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاسبانی و مدافعت کی خاطر دشمن کا جم کر مقابلہ کیا کہ آپؑ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ اس وقت رسولِ خدا نے اپنی وہ شمشیر جس کا نام ذوالفقار تھا، آپ کو عطا فرمائی۔ چنانچہ! آپؑ نے اسی سے راہِ خدا میں اپنے جہاد کو جاری رکھا۔ (بحار الانوار: ج ۲۰، ص ۵۴، تفسیر علی ابن ابراہیم سے منقول)

جنگِ خندق میں حضرت علیؑ کا کردار

مختلف لشکروں (احزاب) کے دس ہزار سپاہیوں نے تقریباً ایک ماہ تک مدینہ کا محاصرہ جاری رکھا۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بالآخر اسے اس کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ وہ اپنے مضبوط و طاقتور لشکر کو جس طرح بھی ممکن ہو سکے خندق پار کرائے۔ اس فیصلے کے بعد عربوں کے نامور پہلوان عمرو بن عبدود نے اپنے ساتھ پانچ سپاہی لیے اور اس جگہ سے جہاں خندق کم چوڑی تھی پار کر آیا اور جنگ کے لیے للکارا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کی دعوتِ جنگ کو قبول کیا اور اس

[1] ملاحظہ ہو، تاریخ طبری: ج ۲، ص ۵۱۴، کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۱۵۴، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱۴، ص ۲۵۰۔ اس واقعے کا ذکر تمام مذکورہ کتب میں مختصر سے فرق کے ساتھ موجود ہے۔

کے نعروں کا جواب دینے کے لیے آگے بڑھے۔

چنانچہ! سخت مقابلے کے بعد عربوں کا وہ دلاور ترین جنگجو پہلوان جسے ایک ہزار جنگجو سپاہیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا، حضرت علی علیہ السلام کی شمشیر سے زمین پر گر پڑا۔ عمرو کے ساتھیوں نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو وہ فرار کر گئے اور ان میں سے جو شخص فرار نہ کر سکا، وہ نوفل تھا۔ بہرحال! وہ بھی حضرت علی علیہ السلام کے ایک ہی وار میں عمرو سے جا ملا۔ عمرو بن عبدود کی موت (نیز بعض دیگر عوامل) سے جنگ کا غلغلہ دب گیا اور مختلف لشکروں میں سے ہر ایک کو اپنے گھر واپس جانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔

اس جنگ میں حضرت علی علیہ السلام نے جو قربانی دی اس کی کیا قدر و منزلت تھی۔ اس کے بارے میں ہم یہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان تین اقوال پر اکتفا کریں گے جو آپؐ کی زبانِ مبارک سے اس جنگ میں تین مختلف موقعوں پر ادا ہوئے:

① جس وقت حضرت علی علیہ السلام نے میدانِ جنگ کی جانب رُخ کیا تو آپؐ نے فرمایا:
"خدایا! جنگِ بدر کے دن عبیدہ اور اُحد میں حمزہؑ کو تُو نے مجھ سے جدا کر دیا۔ اب علیؑ کو تُو ہر گزند سے محفوظ فرما۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت پڑھی:
لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

② جب عمرو کے ساتھ میدانِ جنگ میں مقابلہ ہوا تو آپؐ نے فرمایا: بَرَزَ الْاِیْمَانُ كُلُّهٗ اِلَی الشِّرْكِ كُلِّهٖ۔
یعنی "ایمان و شرک کے دو مظہر کامل ایک دوسرے کے مقابل ہیں"۔

③ اور جب آپؐ میدانِ جنگ سے فاتح و کامران واپس آئے تو پیغمبرِ خدا نے فرمایا:
وَزَنَ الْیَوْمَ عَمَلُكَ بِعَمَلِ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ لَرَجَحَ عَمَلُكَ بِعَمَلِهِمْ
"یعنی اگر آج تمہارے عمل کا اُمتِ محمدی کے تمام اعمال (پسندیدہ) سے مقابلہ کیا جائے تو (بے شک) اس عمل کو ان پر برتری ہوگی"۔ (بحار الانوار: ج ۲۰، ص ۲۰۵)

علیؑ فاتح خیبر

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کے مرکز خیبر کا محاصرہ کیا تو اس غزوہ کے ابتدائی دنوں

میں حضرت علی علیہ السلام آشوبِ چشم کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکے۔ چنانچہ! پیغمبر اکرم ﷺ نے پرچم اسلام دو مسلمانوں کو دیا لیکن وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے بعد کامیاب ہوئے بغیر واپس آ گئے۔ یہ دیکھ کر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: یہ پرچم ان کا حق نہ تھا۔ علیؑ کو بلاؤ۔

عرض کیا گیا: ان کی آنکھ میں درد ہے۔

آپؐ نے فرمایا: علیؑ کو بلاؤ وہی ایسا مرد ہے جو خدا اور اس کے رسولؐ کو عزیز ہے اور وہ بھی خدا اور اس کے پیغمبرؐ کو عزیز رکھتا ہے"۔ ①

جس وقت حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرم ﷺ کے حضور میں تشریف لائے تو آپؐ نے دعا فرماتے ہوئے اپنے دہنِ مبارک سے لعاب ان کی آنکھوں پر لگایا، جس کے باعث دردِ چشم زائل ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے پرچم اُٹھایا اور میدانِ جنگ کی جانب روانہ ہو گئے۔

یہودی دلاور اپنے قلعے سے نکل کر باہر آئے اور مرحب کا بھائی حارث نعرہ لگاتا ہوا حضرت علی علیہ السلام کی جانب بڑھا مگر چند ہی لمحے بعد اس کا مجروح بدن خاک پر تڑپنے لگا۔ مرحب اپنے بھائی کی موت سے سخت رنجیدہ خاطر ہوا۔ چنانچہ! اس کا انتقام لینے کی غرض سے وہ ہتھیاروں سے لیس حضرت علی علیہ السلام سے لڑنے کے لیے میدانِ جنگ میں اُتر آیا۔ پہلے تو دونوں کے درمیان کچھ دیر تکرار ہوئی مگر پلک جھپکتے ہی جانبازِ اسلام کی شمشیر براں مرحب کے سر پر پڑی اور آنِ واحد میں اُسے خاک پر ڈھیر کر دیا۔ دوسرے یہودی دلاوروں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو وہ بھاگ گئے اور اپنے قلعے میں چھپ گئے اور دروازہ بند کر لیا۔

حضرت علی علیہ السلام نے ان بھاگنے والوں کا تعاقب کیا اور جب دروازہ بند پایا تو قدرتِ حق سے اسی دروازے کو جسے بیس آدمی مل کر بند کیا کرتے تھے، تنِ تنہا دیوارِ قلعہ سے اُکھاڑ لیا اور یہودیوں کی خندق پر گرا دیا تاکہ سپاہیانِ اسلام اس کے اُوپر سے گزر کر فساد اور خطرے کے آخری سرچشمہ کو کچل دیں۔ (ارشاد مفید: ص ۶۵ – ۶۷۔ بحار الانوار: ج ۲۱، ص ۱۴ – ۱۶)

غزوۂ خیبر میں چونکہ مسلمانوں کو حضرت علی علیہ السلام کی قربانی و دلاوری سے فتح و کامرانی حاصل ہوئی تھی اسی وجہ سے آپ کو فاتحِ خیبر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

---

① ادعوہ تروني رجلاً یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ ورسولہ (ارشاد مفید: ص ۶۶)

امیرالمومنینؑ کی سیاسی زندگی میں جنگجوئی کے اثرات

حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت و دلاوری اور جرأتیں جو کہ مختلف غزوات، بالخصوص غزوۂ بدر میں ابھر کر سامنے آئیں ہم نے ان کا ایک پہلو یہاں بیان کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اسی پہلو کا اسلام کی آیندہ تاریخ اور آپؑ کی سیاسی زندگی کے حالات قلم بند کرنے میں اہم و نمایاں کردار رہا ہے۔ چنانچہ اس کے اثرات و نتائج کی تلاش و جستجو ہمیں تاریخ اسلام میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے کرنی چاہیے۔

راہِ خدا میں حضرت علی علیہ السلام کی جانبازیوں اور آپؑ کے ہاتھوں مشرکین کی ہلاکت (تمام غزوات، بالخصوص غزوۂ بدر میں) کی وجہ سے آپؑ کے خلاف کفارِ قریش کے دلوں میں ایک دشمنی و عداوت پیدا ہوگئی، جس کے اثرات بعد میں منظر عام پر آئے۔

حضرت عثمان اور حضرت علی علیہ السلام کے درمیان خلیفۂ وقت مقرر کیے جانے سے متعلق جو گفتگو چھے رکنی کمیٹی کے درمیان ہوئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کفارِ قریش کے دلوں میں آپؑ کے خلاف کس قدر دشمنی و عداوت تھی۔ اس گفتگو کے اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

مسئلۂ خلافت کے سلسلہ میں حضرت عثمان نے حضرت علی علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> "میں کیا کروں، قریش آپؑ کو پسند نہیں کرتے، کیونکہ آپؑ نے ان کے ایسے ستر آدمیوں کو (جنگ بدر و اُحد اور دیگر غزوات میں) تہ تیغ کیا ہے، جن کا شمار قبیلے کے سرداروں اور سربرآوردہ اشخاص میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ان کے دلوں میں بھی کینہ و عداوت ہے"۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج۹، ص ۲۳، الصحیح: ج۳، ص ۲۲۰)

اس کی دوسری مثال یزید کے وہ اشعار ہیں جو اس نے حضرت سید الشہداء علیہ السلام اور آپؑ کے بہتر عزیز و اقربا اور اصحابِ باوفا کی شہادت پر کہے تھے۔ وہ لعین جب کہ نشۂ فتح و کامرانی میں مست و سرشار تھا، اس وقت حسین بن علی علیہما السلام کا سر مبارک اس کے پاس لایا گیا تو اس ملعون نے اس موقع پر جو اشعار کہے ان کا مفہوم یہ ہے:

> "احمدؐ (پیشوائے اسلام) نے جو کام انجام دیے ہیں، ان کے مقابل اگر میں

ان کی آل سے انتقام نہ لوں تو خندف کی نسل سے نہیں ہوں۔ ہاشم نے دین کے نام پر حکومت حاصل کی تھی، ورنہ اس پر نہ غیب سے خبر آئی تھی نہ وحی نازل ہوئی تھی۔ ہم نے علیؑ سے اپنا بدلہ لے لیا اور سوار شجاع اور سورما (حسینؑ بن علیؑ) کو قتل کر دیا۔ (مقتل خوارزمی: ج ۲، ص ۵۹) ①

علیؑ اور پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی

بلاشک و تردید اسلام کے جو عظیم و اہم ترین مسائل ہیں، ان میں اُمت کی ولایت و قیادت نیز اُمورِ مسلمین کی راہبری و سرپرستی بھی شامل ہے۔ چنانچہ اس اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ کوشش تھی کہ آیندہ جس اسلامی معاشرے کی تشکیل ہوگی، اس کے مسئلہ رہبری کو اپنے زمانہ حیات میں ہی طے کر دیں۔ چنانچہ دعوتِ حق کے اوّلین روز سے ہی آپؐ نے توحید و نبوت کے ساتھ مسئلہ خلافت کو واضح کرنا شروع کر دیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کے وجودِ مقدس میں جو خصوصیات جمع تھیں ان کی بنیاد پر نیز حکمِ خداوندی کے ایما پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے دینی و دنیوی اُمور کے لیے حضرت علی علیہ السلام کو ولی و سرپرست مقرر کریں اور اپنے بعد ان کی جانشینی کا اعلان فرما دیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پیغام کا اعلان مختلف مواقع پر فرمایا۔ یہاں ہم اختصار کے پیشِ نظر ان تین احادیث کا ہی ذکر کریں گے جو آپؐ نے مختلف اوقات میں بیان فرمائی ہیں:

1. حدیث یوم الدار
2. حدیث منزلت
3. حدیث غدیر

---

① ـ

لَسْتُ مِنْ خَنْدَفٍ اِنْ لَمْ أَنْتَقِمْ مِنْ بَنِی أَحْمَدَ مَا کَانَ فَعَل

لَعِبَتْ هَاشِمُ بِالْمُلْكِ فَلَا خَبَرٌ جَاءَ وَلَا وَحْیٌ نَزَل

قَدْ اَخَذْنَا مِنْ عَلِیٍّ ثَارَنَا وَقَتَلْنَا الْفَارِسَ اللَّیْثَ الْبَطَل

حدیث یوم الدّار

بعثت کے تین سال بعد جب یہ آیت نازل ہوئی: وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (سورۂ شعراء: آیت ۲۱۴) یعنی رسولِ اکرم ﷺ اس کام پر مامور کیے گئے کہ وہ سب سے پہلے اپنے عزیز واقربا کو دعوتِ اسلام دیں۔ اس مقصد کے تحت پیغمبر اکرم ﷺ کے حکم پر حضرت علی علیہ السلام نے بنی ہاشم کے چالیس سرداروں کو جن میں ابوطالبؑ، ابولہب، عباس اور حمزہ وغیرہ شامل تھے، مدعو کیا۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا:

"اے فرزندانِ عبدالمطلب! عرب کے جوانوں میں مجھے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جو تمھارے لیے مجھ سے بہتر پیغام لایا ہو۔ میں تمھارے لیے ایسا پیغام لے کر آیا ہوں جس میں دونوں جہان کی خیر وسعادت ہے۔ خداوند تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں اس کی طرف دعوت دوں۔ تم میں سے ایسا کون ہے جو اس راہ میں میری مدد کرے تاکہ وہ میرا بھائی، وصی اور جانشین قرار پائے"۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے اس سوال کو تین مرتبہ دُہرایا اور ہر مرتبہ صرف حضرت علی علیہ السلام ہی اپنی جگہ سے اُٹھے اور انھوں نے اپنی آمادگی کا اعلان کیا۔

اس وقت رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ تو گویا علیؑ ہی میرے بھائی، وصی اور جانشین ہیں، لہٰذا تم ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو"۔ ①

حدیث منزلت

صرف وہ غزوہ جس میں حضرت علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرم ﷺ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے شرکت نہیں کی، غزوۂ تبوک تھا۔ چنانچہ! اس مرتبہ آپؑ جانشین رسولؐ کی حیثیت سے اور ان

---

① تاریخ طبری: ج ۲، ص ۳۲۰، ۳۲۱، کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۶۲، ۶۳، مجمع البیان: ج ۸، ص ۷، الغدیر، ج ۲، ص ۲۷۸۔ فَاَیُّکُمْ یُؤَازِرُنِیْ عَلٰی ھٰذَا الْاَمْرِ عَلٰی اَنْ یَّکُوْنَ اَخِیْ وَوَصِیِّیْ وَخَلِیْفَتِیْ فِیْکُمْ ..... اِنَّ ھٰذَا اَخِیْ وَوَصِیِّیْ وَخَلِیْفَتِیْ فِیْکُمْ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْہُ!

حوادث کا سدِ باب کرنے کی غرض سے جن کے رونما ہونے کا احتمال تھا، مدینہ میں ہی قیام پذیر رہے۔

جس وقت منافقوں کو رسولِ خدا ﷺ کے ارادے کی خبر ہوئی تو انھوں نے ایسی افواہیں پھیلائیں، جن سے حضرت علی علیہ السلام اور پیغمبر اکرم ﷺ کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جائے اور حضرت علیؑ کو یہ بات باور کرا دیں کہ اب آپؑ سے رسول اللہؐ کو پہلی سی محبت نہیں ہے۔ چنانچہ جب آپؑ کو منافقین کی اس شرپسندانہ سازش کا علم ہوا تو ان کی باتوں کو غلط ثابت کرنے کی غرض سے رسولِ خدا کی خدمت میں تشریف لے گئے اور صحیح واقعات کی اطلاع دی۔ رسولِ خدا نے حضرت علیؑ کو اپنی جانب بلاتے ہوئے اپنے اس تاریخی جملے سے حضرت علی علیہ السلام کے اس مقام و مرتبہ کو جو آپؑ کے نزدیک تھا، اس طرح بیان فرمایا:

> "کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ میرے اور تمھارے درمیان وہی نسبت ہے جو کہ موسیٰؑ و ہارونؑ کے درمیان تھی۔ بس میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا"۔ ①

قرآنِ مجید میں حضرت ہارونؑ کے مراتب و مناصب

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآنِ پاک کی نظر میں حضرت ہارون علیہ السلام کے وہ کون سے مناصب و مراتب تھے جو حضرت علی علیہ السلام میں بھی نبوت کے علاوہ (حضرت محمد ﷺ نے خود ہی مذکورہ حدیث میں آپؑ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے) بدرجۂ اتم موجود تھے۔

چنانچہ جب ہم قرآن کی جانب رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ کے لیے درج ذیل مناصب طلب کیے تھے:

○ منصبِ وزارت

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ○ هٰرُوْنَ اَخِي (سورہ طٰہٰ: ۲۹، ۳۰)

---

① فَلَمَّا تَرْضٰى اَنْ تَكُوْنَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هٰرُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (غایۃ المرام کے صفحہ ۱۰۷، ۱۵۳) پر ایک سو ستر محدثین کے طریق سے "حدیث منزلت" کو نقل کیا گیا ہے۔ ان میں سے ۱۸ طریق اہلِ سنت والجماعت کے ہیں۔ صاحب المراجعات نے بھی (۱۳۹، ۱۳۱) پر مذکورہ حدیث کو صحیح مسلم، بخاری، سنن ابنِ ماجہ و مستدرک حاکم اور اہلِ سنت کے دیگر مصادر سے نقل کیا ہے۔

"اور میرے کنبے سے ہارونؑ کو وزیر مقرر کردے جو کہ میرے بھائی ہیں"۔

○ تقویت وتائید

اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ○ (سورۂ طٰہٰ: ۳۱)

"اس کے ذریعہ میرے بازو مضبوط کر"۔

○ مقام نبوت

وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ○ (سورۂ طٰہٰ: ۳۲)

"اور اس کو میرے کام میں شریک کردے"۔

حضرت موسیٰؑ نے جو چیزیں خداوند تعالیٰ سے مانگیں اس نے ان کا مثبت جواب دیا اور مذکورہ تمام مقامات حضرت ہارونؑ کو عطا کر دیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰی ○ (سورۂ طٰہٰ: ۳۶)

فرمایا: "اے موسیٰؑ! جو تم نے مانگا ہم نے عطا کیا"۔

اس کے علاوہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی غیر موجودگی میں حضرت ہارونؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا:

وَقَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (سورۂ اعراف: آیت ۱۴۲)

"اور حضرت موسیٰؑ نے حضرت ہارونؑ سے کہا کہ تم میری قوم میں میرے خلیفہ اور جانشین ہو"۔

حدیث منزلت کے مطابق وہ تمام مناصب و مقامات جو ہارونؑ کے لیے بیان کیے گئے ہیں صرف ایک منصب کے علاوہ کہ جسے حدیث نے مستثنیٰ قرار دیا ہے، حضرت علی علیہ السلام کے یاور و مددگار اور خلیفہ ہیں۔

حدیث غدیر

ہجرت کے دسویں سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت حجۃ الوداع سے واپس تشریف لا رہے تھے تو ماہ ذی الحجہ کی اٹھارہ تاریخ کو آپؐ نے غدیر خم کے مقام پر فرمان خداوندی [1] کے

---

[1] (سورۂ مائدہ: آیت ۶۷، یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ)

مطابق حکم دیا کہ سارے مسلمان یہاں توقف کریں۔ اس کے بعد ایک لاکھ افراد کی موجودگی میں حمد وستائش باری تعالیٰ کے بعد جو خطبہ دیا، اسے جاری رکھتے ہوئے آپؐ نے دریافت فرمایا:

اے لوگو! تم میں ایسا کون ہے جسے تمام مومنین پر برتری حاصل ہو؟

سب نے عرض کیا: یہ تو خدا اور اس کا رسولؐ ہی جانتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: خداوند تعالیٰ نے مجھے ولایت سے سرفراز فرمایا ہے اور مجھے تمام مومنین پر ان کے نفسوں سے زیادہ تصرف کا حق حاصل ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ اُونچا کیا، چنانچہ! تمام لوگوں نے جو اس وقت وہاں جمع تھے، حضرت علی علیہ السلام کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوش بدوش دیکھا تو آپؐ نے فرمایا:

"جس کا مولا و سرپرست میں ہوں، علیؑ اس کا مولا و سرپرست ہے"۔

اور یہ جملہ آپؐ نے تین مرتبہ دہرایا۔ ①

اس کے بعد مزید فرمایا:

"اے پروردگار! تُو اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے، اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ کو دشمن رکھے۔ خداوندا! علیؑ کی مدد فرما اور اس کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کر"۔ (ملاحظہ ہو، الغدیر: ج ۱، ص ۹، ۱۱)

یہ تھیں وہ سرفرازیاں جو حضرت علی علیہ السلام نے زندگی کے اس اولین مرحلے میں حاصل کیں کہ جس کی مدت دس سال سے زیادہ نہ تھی اور بعد کی زندگی کا پورا حصّہ قربانیوں اور جانبازیوں کے کارناموں سے پُر ہے۔ اگرچہ دیگر کتب میں آپؑ کی سوانحِ حیات مفصل طور پر بیان کی گئی ہے۔ مگر یہاں اختصار سے کام لیتے ہوئے ہم اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

---

① مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ (ملاحظہ ہو، الغدیر: ج ۱، ص ۹، ۱۱)

maablib.org

رسولِ اکرم کی رحلت سے خلافت ظاہری تک

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات میں حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے تعمیری اور کردار ساز بعض حادثات و واقعات کا جائزہ ترتیب وار گذشتہ فصل میں لیا جاچکا ہے۔ اس فصل میں ہم آپؑ کے حالاتِ زندگی لکھنے کے بجائے تاریخ اسلام کا تجزیہ کریں گے۔ اس مقصد کے پیش نظر ان مراحل کا ذکر کرنا ضروری ہے (۱) جن سے حضرت علی علیہ السلام گزرے۔

اب ہم یہاں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد تاریخ اسلام کے واقعات کا جائزہ لیں گے۔

وفاتِ پیغمبرؐ کو جھٹلانا

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے پہلا واقعہ جو مسلمانوں کے سامنے آیا وہ حضرت عمر کی جانب سے رُونما ہوا۔ چنانچہ انھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے سامنے باآواز بلند سے کہا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسولؐ خدا کی رحلت ہوگئی ہے، مَیں اسی تلوار سے اس کا قلم کردوں گا۔ اگرچہ ابن عباسؓ و دیگر صحابہ رسولؐ نے وہ آیت بھی سنائی جس کا مفہوم یہ ہے کہ موت سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی مفر نہیں۔ (۲) مگر اس کا ان پر اثر نہ ہوا۔ بوقت رحلت حضرت ابوبکرؓ مدینہ سے باہر تھے۔ چند لمحے گزرنے کے بعد وہ بھی آن پہنچے اور حضرت عمرؓ کی داد و فریاد کی جانب توجہ کیے بغیر

---

(۱) حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے وہ واقعات جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات میں پیش آئے۔ وہ مختصر طور پر تاریخ عصر نبوت میں بیان کردیے گئے ہیں۔

(۲) آلِ عمران: آیت ۱۴۴۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ "محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسولؐ ہیں ان سے پہلے اور رسولؐ گزر چکے ہیں اگر وہ مرجائیں یا قتل کردیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے"۔

وہ پیغمبر اکرم ﷺ کے گھر میں داخل ہوئے اور رسولؐ خدا کے چہرۂ مبارک سے چادر ہٹا کر بوسہ دیا اور مسجد میں واپس آگئے اور یہ اعلان کیا کہ رسولؐ اللہ رحلت فرما گئے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے بھی اسی آیت کی تلاوت کی۔ اس پر حضرت عمر نے کہا: ایسا لگتا ہے کہ میں نے آج تک یہ آیت سنی ہی نہیں تھی۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۰۰، کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۳۲۳، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۱۲۸)

غیر متوقع حادثہ و واقعات

جس وقت حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرم ﷺ کو غسل دینے میں مشغول اور مسلمان تکمیل غسل و کفن کا انتظار کر رہے تھے تاکہ نماز جنازہ میں شرکت کر سکیں تو خبر آئی کہ کچھ لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اور خلیفہ منتخب کیے جانے کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اور قبیلۂ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کا نام خلافت کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے جیسے ہی یہ خبر سنی تو فوراً سقیفہ کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں ابوعبیدہ بن جراح کو بھی مطلع کیا اور تینوں افراد نے سقیفہ کی جانب رُخ کیا۔ ①

اس وقت تک معاملہ انصار کے ہاتھ میں تھا لیکن جیسے ہی یہ تینوں مہاجر وہاں پہنچے تو تنازع شروع ہوگیا اور ہر شخص اپنی اہلیت و شائستگی کی تعریف کرنے لگا۔ بالآخر حضرت ابوبکر کو پانچ رائے کے ذریعے سقیفہ میں خلیفہ چُن لیا گیا۔

برادرانِ اہلِ سنت نے اس واقعہ کو حقیقت سمجھ لیا اور خلیفہ کے انتخاب کو مشاورت اور اجماعِ مسلمین کا نام دے کر اسے تسلیم کرلیا۔ اس حقیقت کو آشکار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل عنوانات کا تجزیہ کیا جائے تاکہ اصل واقعہ کی وضاحت ہوسکے۔

---

① سقیفہ کے لغوی معنی سائبان ہیں۔ سقیفہ مدینہ میں مسجد النبیؐ سے ۶۰۰ قدم کے فاصلے پر باب السلام کے راستے میں واقع ہے۔ یہ جگہ بنی ساعدہ بن کعب خزرجی سے متعلق تھی۔ لوگ اس سائبان کے نیچے اپنے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ بعد میں یہ جگہ سقیفہ بنی ساعدہ کے نام سے مشہور ہوگئی۔ (معجم البلدان: ج ۳، ص ۲۲۸)

پیغمبرؐ کی جانشینی کا مسئلہ شیعوں کی نظر میں

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی جانشینی کا مسئلہ آنحضرت ﷺ کے زمانۂ حیات ہی میں فرمانِ خدا کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے طے اور واضح کر دیا تھا اور جو کچھ سقیفہ بنی ساعدہ میں پیش آیا وہ فرمانِ خدا اور حکمِ رسولؐ کے خلاف محض ایک تحریک تھی۔

گزشتہ فصل میں ہم نے چند ایسی دلیلیں اور حدیثیں بیان کی تھیں جو مذکورہ دعوے کو ثابت کرتی ہیں۔ اب اس مسئلے کا تاریخی واقعات کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

پیغمبر اکرم ﷺ کے دوشِ مبارک پر ایک عالمی تحریک کی قیادت تھی۔ یہ بات بھی روشن و واضح ہے کہ اس تحریک کے بارور ہونے اور سیاسی، ثقافتی، نیز اجتماعی سطح پر گہری تبدیلی لانے کے لیے رسولِ خدا کا زمانۂ رسالت (بعثت سے رحلت تک) کافی نہ تھا۔ اگرچہ اسلام کے اس عظیم رہبر و پیشوا نے اس مختصر و محدود عرصے میں ہی انسان کی تکمیل اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے بہت عظیم و اساسی اقدامات کیے لیکن اس عالمی تحریک کو آپ کے بعد بھی جاری و ساری رہنا تھا۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت اچانک واقع نہیں ہوئی بلکہ آپؐ نے اس کے وقوع پذیر ہونے سے کچھ عرصہ قبل محسوس کر لیا تھا کہ جلد ہی اس دنیا سے کوچ کر جائیں گے۔ چنانچہ آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر کھلے لفظوں میں اس کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بعد آپؐ کے پاس اسلام کے مستقبل کے متعلق سوچنے کے لیے کافی وقت تھا اور آپؐ کوئی اصولی روش و تدبیر اختیار کر کے ان عوامل کی پیش بندی کر سکتے تھے، جن سے انقلابِ خداوندی کی راہ میں آیندہ کسی خطرے کے آنے کا امکان ہو سکتا تھا۔

ان حالات و واقعات کے بارے میں غیبی عوامل کی مدد اور سرچشمۂ وحی سے ارتباط کو علیحدہ کر کے بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ ان واقعات کی روشنی میں رسولِ اکرم ﷺ کے سامنے اسلام کے مستقبل سے متعلق تین ہی ممکن راہیں ہو سکتی تھیں:

① لاتعلقی ② شوریٰ ③ اپنے وصی اور جانشین کے بارے میں وصیت

اب ہم تاریخی حقائق اور ان سیاسی و اجتماعی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اس وقت

اسلامی معاشرہ پر حکم فرما تھے، مذکورہ بالا تینوں راہوں کا اجمالی جائزہ لیں گے۔

① لاتعلقی

لاتعلقی سے مراد یہ ہے کہ ہم اس بات کے قائل ہو جائیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسلام کے مستقبل سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ آنحضرتؐ نے اسے نوشتۂ تقدیر اور آئندہ حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی شخصیت کے بارے میں ایسی بے سروپا باتوں کا فرض کر لینا کسی طرح بھی حقائق و واقعات کے موافق نہیں ہے کہ پیغمبرؐ خدا کی اسلامی رسالت کا مقصد یہ تھا کہ وہ دورِ جاہلیت کے جتنے بھی رگ و ریشے اس دور کے انسان میں ہو سکتے تھے انھیں اس کے دل و جان کے اندر ہی خشک کر دیا جائے اور اس کے بجائے ایک جدید اسلامی انسان کی تعمیر کی جائے۔ جب کوئی ہادی اور راہنما نہ ہو تو معاشرہ بے سرپرست رہ جائے، انقلاب آجائے اور انسان عظیم خطرات سے دوچار ہو جائے۔

اُمت کی پریشانی کا خطرہ

اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی آئندہ سرنوشت کے بارے میں کوئی طرح اندازی نہ کی ہوتی اور میدان خالی رہنے دیا ہوتا تو اس نوبنیاد اُمت کی کیفیت کیا ہوتی جو ابھی تشکیل پذیر ہوئی تھی اور جب وہ یہ دیکھتی کہ قائد و رہبر کا وجود نہیں ہے اور اس کے سامنے آئندہ کے لیے کوئی دستور العمل بھی نہیں ہے تو اس پر کیا گزرتی؟

اُمت مسلمہ نے اپنے عظیم قائد و رہبر کی غیر موجودگی کے باعث ماحول میں جو خلا محسوس کیا، اس کی وجہ سے وہ حیرت و استعجاب میں گھر گئی لیکن ان پُر اضطراب لمحات میں بھی اسے یہ گوارا نہ تھا کہ یہ خلا باقی رہے اسی لیے نہایت عجلت بلکہ آن کی آن میں اس نے فیصلہ کر ہی لیا اور ایسے بحرانی حالات میں اس نے آناً فاناً جو فیصلہ کیا تھا، وہ مقاصدِ رسالتؐ کے لیے کس حد تک معقول ہو سکتا تھا؟!

لوگوں کا دورِ جاہلیت کی جانب واپس چلے جانے کا خطرہ

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ روحِ رسالتؐ اور رسولؐ کی تحریک کے مقاصد کو وہی شخص پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا تھا کہ جس کو رسول اللہ ﷺ نے پہنچایا تھا اور اُمت کے کسی فرد میں اس کی صلاحیت نہ تھی کہ وہ رسولؐ اللہ کے بعد زمام داری اور رسالت کے مقصد کے درمیان کوئی متعین تناسب قائم کر سکے اور اسلامی معاشرہ سے ان جاہلی تعصبات کو دُور کر سکے جو ابھی تک معاشرہ کی رگ و پے میں موجود تھے کہ جس نے انھیں مہاجر، انصار قریش وغیر قریش اور مکی و مدنی وغیرہ میں تقسیم کر رکھا تھا۔

منافقین کا خطرہ

پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ حیات ہی میں ان کی اسلام کے ساتھ جنگ رہتی تھی اور اگر ان لوگوں میں انھیں بھی شامل کر لیا جائے جو فتح مکہ کے بعد بصورتِ لاچاری مسلمان ہوئے تھے تو اندازہ ہوگا کہ اسلام کو ان سے کتنا بڑا خطرہ لاحق ہونے کا امکان تھا۔

اس قسم کے خطرات کا احساس کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جو کسی بھی پیشوا سے مخفی و پنہاں رہتا۔ خاتم الانبیاءؐ کا تو ذکر ہی کیا اور یہ تصور کر لینا کہ آنحضرت ﷺ یہ درک کرتے ہوئے کہ اگر جانشین مقرر نہ کیا گیا تو کس قسم کے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں گویا اسلام کو ان خطرات سے محفوظ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ پیغمبر اکرم ﷺ جیسی گرامی مرتب شخصیت سے بعید ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں اگر ان سے چشم پوشی کر کے صرف اس نمایاں واقعے پر ہی اکتفا کیا جائے جو آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری لحات میں پیش آیا اور جس کے بارے میں شیعہ وسُنی حضرات متفق الرائے بھی ہیں تو وہی پہلی روش کی نفی کرنے کے لیے کافی ہے۔

جب رسولِ خدا ﷺ علیل و صاحب فراش تھے تو اس وقت چند صحابی بھی خدمتِ اقدس میں موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "کاغذ و دوات لے آؤ تا کہ میں تمھارے لیے ایسا نوشتہ

لکھ دوں کہ جس سے تم (میرے بعد) ہرگز گمراہ نہ ہو"۔ ① رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا ہی اس بات کی واضح و روشن دلیل ہے کہ آئندہ رُونما ہونے والے خطرات کے بارے میں آپؐ کو تشویش تھی اور ان کا سدِّ باب کرنے کے لیے آپؐ کوشاں تھے۔

شوریٰ

شوریٰ سے مراد یہ ہے کہ گویا رسولِ خدا ﷺ نے اپنے بعد مسلمانوں کی رہبری کو ان ہی کے دستِ اختیار میں دے دیا تھا کہ جس کو چاہیں منتخب کرلیں۔ اگرچہ اسلام نے قانون اور اصولِ شوریٰ (مشاورت) کا احترام کیا ہے اور قرآن میں اس کا شمار اَوصافِ مومنین میں ہوتا ہے۔ ② لیکن اس کا تعلق ان واقعات سے ہے جو مسلم معاشرے کے درمیان رُونما ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی نص صریح موجود نہ ہو کیونکہ اسلام کے قوانین و احکام مشوروں سے طے نہیں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ذمہ داریاں (تکالیف) جو وحی کے ذریعے معین کی گئی تھیں ان کے بارے میں پیغمبر اکرم ﷺ نے کسی سے مشورہ نہ کیا اور مسئلہ ولایت و امامت کا شمار بھی ایسے ہی مسائل میں ہوتا ہے جو اُمورِ مشاورت کی حدود سے خارج ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بارے میں رسولِ خدا بھی اپنی رائے کا اظہار نہیں فرما سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ جس وقت قبیلۂ بنی عامر کی ایک جماعت پیغمبر اکرم ﷺ سے ملاقات کرنے کے لیے آئی اور اس نے یہ پیش نہاد کی کہ ہم اس شرط پر ایمان لانے کو تیار ہیں کہ آپؐ اپنے بعد خلافت ہماری تحویل میں دے دیں۔ اگرچہ اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ انتہائی پرآشوب حالات سے دوچار تھے نیز قریش ③ کی جانب سے آپؐ پر سخت دباؤ تھا اور آپؐ کو

---

① شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید: ج ۶، ص ۵۱، المراجعات، ص ۲۵۹، ۲۶۰، منقول از صحیح بخاری و مسلم۔ تاریخ ابی الفداء، ج ۱، ص ۱۵۱، آتونی بدواۃ وصحیفۃ اکتب لکم کتاباً لا تضلوا بہ بعدی

② وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ (سورۂ شوریٰ: آیت ۳۸)

③ حضرت ابوطالبؑ و حضرت خدیجہؑ کی وفات کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ اور قبیلۂ بنی عامر کے درمیان سخت رنجش پیدا ہوگئی جس کے باعث قریش پہلے کی نسبت اب زیادہ آپؐ پر دباؤ ڈالنے لگے نیز حملات کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

خوف زدہ کرنے کی کوشش بھی کی جارہی تھی مگر اس کے باوجود آپؐ نے فرمایا:

"یہ کام خداوند تعالیٰ کا ہے (اور اس میں مجھے کوئی اختیار نہیں) وہ جسے بھی مناسب سمجھے گا، اسے ہی میرے بعد میرا جانشین مقرر کرے گا"۔ ①

اس کے علاوہ اسلام کی فلاح و بہبود کی خاطر پیغمبر اکرم ﷺ نظامِ شوریٰ کو سودمند اقدام خیال فرماتے تو آپؐ یقیناً اپنے زمانہ حیات کے دوران ایسے دستوراتِ عمل کا سلسلہ مرتب فرماتے، جس کے ذریعے اُمت مسلمہ خود کو اس اقدام کے لیے تیار کر لیتی کہ شوریٰ کے ذریعے نظامِ حکومت جاری رکھ سکے کیونکہ دورِ جاہلیت کے نظامِ حکومت میں کوئی ایسا ادارہ کارفرما نہ تھا، جو شوریٰ کے ذریعے نظامِ حکومت چلا سکے۔ اگرچہ رسولِ خدا نے کسی وقت بھی نظامِ شوریٰ اور اس کے دائرۂ عمل نیز مشخصات کو منفی قرار نہیں دیا اور نہ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہ اس سے گریز کریں۔

اس سے قطع نظر حضرت ابوبکر نے جب حضرت عمر کو اپنا جانشین مقرر کیا تو یہ امر اس کی واضح دلیل تھی کہ اس اقدام کے ذریعے نظامِ شوریٰ کی نفی کی گئی اور یہ ثابت ہوگیا کہ آنحضرت ﷺ نظامِ شوریٰ کے حامی نہ تھے اور آپؐ اسے اپنا حق سمجھتے تھے کہ آپؐ اپنے زمانہ حیات میں کسی ایسے شخص کو مقرر فرمادیں جو رحلت کے بعد آپؐ کا جانشین ہوسکے۔ یہی نہیں بلکہ حضرت عمر بھی خلیفہ مقرر کرنا اپنا حق سمجھتے تھے اور اسے انھوں نے چھے افراد کے درمیان محدود کردیا تھا تاکہ وہ اپنے درمیان میں سے کسی ایک شخص کو خلیفہ مقرر کرلیں اور ان افراد کے علاوہ انھوں نے تمام اُمت مسلمہ کو اس حق سے محروم کردیا تھا۔

وصی اور جانشین کا تقرر

وصایت (عملی جانشینی) سے ہماری مراد یہ ہے کہ تنہا ایک یہی ایسی راہ ہے جو حقائق اور فطرت اور خلافت کی واقعیت سے عین سازگار ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے اسلام کی آیندہ فلاح و بہبود کی خاطر یہ مثبت اقدام فرمایا تھا اور خداوند عالم کے حکم سے ایک شخص کو جانشینی کی حیثیت سے مقرر کردیا تھا۔ چنانچہ! صرف یہی ایک ایسا مثبت اقدام تھا جو مستقبل میں

① سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۶۶۔ الامر الی اللہ یضعہ حیث یشاء۔

اسلام کی خیر و صلاح اور رسالت کو خطرات سے محفوظ رکھنے کا ضامن ہو سکتا تھا۔

رسولِ خدا ﷺ اور حضرت علی علیہ السلام کی باہمی زندگی کے ایسے بہت سے شواہد موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ اس حیثیت سے حضرت علی علیہ السلام کی تربیت فرما رہے تھے کہ آیندہ اسلامی معاشرے کے آپؑ ہی قائد و رہبر ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے آپؑ کو حقائق رسالت کے بہت سی خصوصیات سے نوازا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام جب کبھی پیغمبر اکرمؐ سے کوئی بات دریافت فرماتے تو آپؑ کا سوال ختم ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کلام کی ابتداء فرماتے اور تہذیب و افکار کے ہدایا و تحائف کی دولت سے آپؑ کو معزز فرماتے۔ چنانچہ! روز و شب کا زیادہ وقت باہمی گفتگو اور خلوت میں گزرتا۔

اس کے علاوہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کی جانشینی کا مختلف مواقع پر اعلان بھی فرما دیا تھا۔ چنانچہ! اس ضمن میں بکثرت احادیث نبویؐ موجود ہیں۔ ان میں سے چند یوم الدّار، حدیث الثقلین، حدیث منزلت اور سب سے اہم حدیث غدیر (نیز حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک پر مسلمانوں کا بیعت کرنا) قابلِ ذکر اور اس دعوے کی شاہد و گواہ ہیں۔ ①

مزید برآں رسولِ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بہت سے حوادث رُونما ہوئے اور آپؑ نے پوری زندگی جہاد و ذمہ داری میں گزاری۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپؑ ہی رسول اللہ ﷺ کے جانشین ہیں۔ آپؑ کی لیاقت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جن مسائل کو حل کرنا خلفاء کے لیے ناممکن تھا، انھیں آپؑ ہی حل کرتے تھے لیکن اس کے برعکس ہمیں خلفاء کے زمانہ میں ایک موقعہ بھی ایسا نظر نہیں آتا کہ جس میں امام علیہ السلام نے کسی مشکل کے حل کے لیے یا اسلام کے نظریہ سے مزید آگہی کے لیے کسی سے رجوع کیا ہو۔ ②

---

① گزشتہ فصل میں حدیث ثقلین کے علاوہ دیگر احادیث کا مختصر جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں اس کے دوبارہ نقل کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔

② تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ خلفائے وقت نے جب کبھی ضرورت محسوس کی تو حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کیا اور آپؑ سے درخواست کی کہ ان کی مشکلات حل کرنے میں ان کی مدد فرمائیں۔ ان واقعات کی کیفیت آیندہ ابواب میں بیان کی جائے گی۔

سقیفہ میں رُونما ہونے والے حالات

معن بن عدی اور عویم بن ساعدہ نامی دو افراد کے دلوں میں سعد بن عبادہ خزرجی کے خلاف کدورت تھی۔ ان کے ذریعے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو خبر ملی کہ انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں حضرات نہایت عجلت کے ساتھ اضطراب و پریشانی کے عالم میں ابوعبیدہ کے ہمراہ سقیفہ میں داخل ہوئے۔ حضرت عمر گفتگو کا آغاز کر کے حضرت ابوبکر کی خلافت کے لیے میدان ہموار کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت ابوبکر نے منع کر دیا اور کہا کہ اگر مجھ سے کوئی فروگزاشت ہو جائے تو تم اس کی تلافی کرو۔ چنانچہ! اس کے بعد انھوں نے تقریر شروع کی اور خداوند عالم کی وحدانیت اور رسالت رسولؐ خدا کی شہادت کے بعد کہا:

"مہاجرین میں ہم وہ پہلے افراد تھے جنھوں نے دینِ اسلام قبول کیا اور اس لحاظ سے تمام لوگ ہمارے پیروکار ہیں۔ ہم طائفہ رسولؐ خدا اور مرکز قبائل عرب میں سے ہیں۔ نیز ان کے درمیان نقطۂ ربط و تعلق ہیں۔ آپ انصار بھی خدا و رسول ﷺ کے یار و مددگار ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ کے پشتیبان اور ہمارے سردار ہیں۔ دین اور اس کے فائدے میں آپ ہمارے شریک ہیں، خداوند تعالیٰ کی رضا میں راضی رہے اور اس پاک پروردگار نے تم سے مہاجر بھائیوں کے لیے جو کچھ چاہا اسے قبول کرنے میں لائق و شائستہ ترین افراد ثابت ہوئے لیکن تمھیں اس پر حسد نہیں کرنا چاہیے کہ اسلام کی ترقی کی خاطر تم نے مشکلات میں اپنی طاقت کے جوہر دکھائے۔ اس بنا پر تمھارے لیے یہ زیبا نہیں کہ اپنے ہی ہاتھوں سے اس دین کی بیخ کنی کرو۔ میں تمھیں ابوعبیدہ اور عمر کی بیعت کی دعوت دیتا ہوں۔ میں دونوں ہی کو قابل اور اہل سمجھتا ہوں۔ (الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۱۳-۱۴)

اس موقع پر ان دونوں نے کہا:

"تم لوگوں میں سے کسی کو بھی آپ پر برتری حاصل نہیں ہے"۔

اس خطبے کے اہم نکات

حضرت ابوبکر نے جو تقریر کی اس کے بعض نکات کا ذکر کرنا یہاں ضروری ہے۔①

حضرت ابوبکر نے پہلے مہاجرین کی تعریف کی تا کہ ان کی عظمت انصار کے ذہنوں پر نقش ہو جائے۔ اس کے بعد جس حد تک ممکن تھا انصار کی بھی تعریف و توصیف کی اور خود کو منصف کی حیثیت سے ظاہر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انصار کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، اس تردد کے برخلاف جو خلافت کے سلسلہ میں انصار کے ذہنوں میں تھا۔ حضرت ابوبکر نے یقین کے ساتھ کہا: مہاجرین کی خلافت جو مرضیٔ خدا کے مطابق ہے اور یہی خدا کا حتمی فیصلہ ہے۔ چنانچہ ہر قسم کا تذبذب ختم ہو گیا۔ حضرت ابوبکر نے خلافت کو مہاجرین کا مسلّم حق ثابت کرنے کے بعد اس سلسلہ میں انصار کی کسی بھی فعالیت کو خدا سے عہد شکنی اور دین کو برباد کرنے کے مترادف قرار دیا۔ اپنی تقریر کے آخر میں حضرت ابوبکر نے حاضرین کو عمر و ابوعبیدہ کی بیعت کی دعوت دی۔ وہ طبیعی طور پر حضرت ابوبکر کو مقدم سمجھتے تھے۔ گویا وہ پہلے ہی خلیفہ کی تعیین کے سلسلہ میں منصوبہ بنا چکے تھے۔ (طرح جائے رسالت: ج ۱، ص ۲۵۵، ۲۵۷ کا خلاصہ)

انصار کا ردِ عمل

پروگرام کے تحت حضرت ابوبکر کی تقریر سن کر انصار اپنے گذشتہ موقف سے ہٹ گئے اور انھوں نے مہاجرین کے سامنے اپنے سر خم کر دیئے۔ ان میں "حباب بن منذر" ہی ایک ایسے انصار تھے جنھوں نے کھڑے ہو کر یہ دھمکی دی کہ اگر مہاجرین انصار سے مصالحت نہیں کرتے تو ہم علیحدہ مستقل حکومت قائم کر لیں گے لیکن عمر نے فوراً ہی اس کی گفتگو کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: افسوس دو تلواریں ایک میان میں نہیں سما سکتیں۔ خدا کی قسم! عرب اس بات پر ہرگز راضی نہیں ہوں گے کہ حکومت تمھارے حوالے کر دی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

① یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت ابوبکر کی تقریر کے بعد حضرت عمر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے راستہ طے کرنے کے دوران کسی منصوبے یا لائحہ عمل کے بارے میں غور وفکر نہیں کیا ہے۔ سوائے اس کے جو حضرت ابوبکر نے بیان کیا ہے۔ مجھے اس سے کلی اتفاق ہے اور جو کچھ انھوں نے اپنی زبان سے کہا ہے اس سے بھی بہتر کی توقع و امید ہے۔ ما من شی کنت زورتہ فی الطریق الا اتانا بہ او باحسن منہ۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۱۹۔ کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۳۲۷)

تم میں سے نہیں تھے۔ (الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۱۶-۲۱، کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۲۲۸، ۳۲۹، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۱۸، ۲۲۰)

مہاجرین اور انصار کے درمیان حصولِ اقتدار کی خاطر بہت سخت کش مکش ہونے لگی۔ چنانچہ! انصار کے دو قبیلوں اوس اور خزرج کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ قبیلۂ اوس کے سردار "اسید بن حضیر" کا میلان مہاجرین کی طرف تھا۔ اس نے اظہارِ رغبت کیا۔ ان کی پیروی کرتے ہوئے "بشیر بن سعد خزرجی" نے لوگوں کو مہاجرین کی بیعت کی جانب رغبت دلانا شروع کی۔ بالآخر اس کش مکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کا فیصلہ حضرت ابوبکر کے حق میں ہو گیا اور انھیں پانچ افراد کی رائے کے ذریعے خلیفہ منتخب کر لیا گیا۔ ①

اس واقعہ کا اگر اجمالی طور پر جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ سقیفہ میں جو کچھ پیش آیا اور اس میں حضرت ابوبکر کو خلیفہ منتخب کیا گیا، وہ انتخاب کے اصول و ضوابط کے منافی تھا۔

اس معاملے میں فیصلہ اتنی عجلت سے کیا گیا کہ کسی صاحبِ فکر شخص کو اتنا موقع ہی نہیں دیا گیا کہ وہ اس مسئلے کے بارے میں غور و فکر کر سکے اور کسی مخالف کو بھی اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ اپنے دعوے کے حق میں دلیل پیش کر سکے۔ اس عجلت و تندی کے باعث روحِ انتخابات کی اچھی طرح پامالی کی گئی، حتیٰ کہ ان لوگوں سے بھی جو سقیفہ میں موجود تھے، حقِ رائے دہی سلب کر لیا گیا اور شروع سے آخر تک ذاتی میلانات و احساسات کارفرما رہے۔ اس کے علاوہ انتخاب اس طرح کیا گیا کہ بیشتر مسلمان قطعی لاعلم و بے خبر رہے اور جنھیں اطلاع بھی ہوئی تو وہ رسولِ خدا ﷺ کے مراسمِ تجہیز و تکفین میں منہمک و مشغول تھے، وہ سقیفہ والے انتخابات میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔

جانشینِ رسولِ خدا کے انتخاب کے لیے جس مجلس کی تشکیل کی گئی تھی اس میں کم از کم کوئی ایسا شخص تو اپنے افرادِ خاندان کے ہمراہ وہاں پیش پیش رہتا، جس کی قدر و منزلت پیغمبر اکرم ﷺ کی نظروں میں وہی تھی جو حضرت ہارون علیہ السلام کی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک تھی۔ اس واقعہ پر جب ہم

① ان پانچ رائے میں سے تین تو حضرات ابوبکر، حضرت عمر اور ابوعبیدہ کی تھیں اور انصار میں سے دو رائے بشیر ابن سعد و اسید بن حضیر کی تھیں۔ ان پانچ افراد کے علاوہ باقی لوگ اپنے سردارانِ قبائل کے تابع تھے۔ چنانچہ ہر قبیلے کا سردار جو رائے دیتا، اس قبیلے کے تمام افراد اس کی پیروی کرتے اور اپنی مرضی سے کوئی رائے نہ دیتے تھے۔

شروع سے آخر تک نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہ سب اس طرح پیش آیا کہ قبیلہ بنی ہاشم بالخصوص اس کے سردار یعنی امیر المومنین علی علیہ السلام کو ان واقعات سے قطعی بے خبر اور لاعلم رکھا گیا۔

حضرت علیؑ کی بیعت کے بارے میں تجویز

حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد مبارک کی تجہیز و تکفین میں منہمک و مشغول تھے کہ ابوسفیان جس میں تدبر و سیاست فہمی بہت تیز تھی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پہنچا تا کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرے اور حضرت علی علیہ السلام کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ میں آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنا چاہتا ہوں، لیکن حضرت علی علیہ السلام اس کی نیت کو جانتے تھے لہٰذا اس کی باتوں کو قطعی اہمیت نہ دی اور فرمایا: تمھارا مقصد مسلمانوں کے درمیان فتنہ پھیلانا ہے۔ (کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۳۲۶، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۰۹، ارشاد مفید: ص ۱۰۲)

جس وقت ابوسفیان نے یہ تجویز پیش کی تو عین اسی وقت حضرت عباسؓ نے بھی چاہا کہ اپنے بھتیجے کے دست مبارک پر بیعت کریں لیکن حضرت علی علیہ السلام نے ان کی تجویز کو بھی منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۳۰، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۱۹۲)

حضرت عباسؓ کی تجویز کو حضرت علی علیہ السلام نے کیوں منظور نہیں فرمایا، اس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ یہاں ابوسفیان کی تجویز کے بارے میں وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ ابوسفیان کی پیش کش حسن نیت پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد اختلاف و فتنہ برپا کرنا تھا۔ اس نے جانشینی پیغمبرؐ کے بارے میں مسلمانوں کی رسّہ کشی اور اختلاف کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے چکر میں ہیں اور اسے یہ معلوم تھا کہ سیاسی اور معنوی اعتبار سے بنی ہاشم ہی ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں لہٰذا وہ اپنے ناپاک مقصد کے حصول کی غرض سے خدمت امامؑ میں آیا اور آپؑ کو جنگ کے لیے ابھارا۔

آپؑ نے ابوسفیان کی گفتگو سے اس اختلاف کا اندازہ لگا لیا تھا۔ چنانچہ آپؑ خود فرماتے ہیں: "میں ایک طوفان دیکھ رہا ہوں کہ جس کی منہ زوریوں کو خون ہی روک سکتا ہے"۔ [1] پھر

---

[1] انی لاری عجاجة لا یطفئها الا الدم (شرح ابن ابی الحدید: ج ۱۲، ص ۴۴، کامل: ج ۲، ص ۳۲۵۔ تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۰۹)

آپؑ اپنی رائے میں صحیح تھے۔ اگر بنی ہاشم اور ان کے سردار حضرت علی علیہ السلام فداکاری اور صبر سے کام نہ لیتے تو اس طوفانی اختلاف کو کشت وخون کے علاوہ کوئی چیز خاموش نہیں کرسکتی تھی۔

سقیفہ کے واقعات کے بعد حضرت علی علیہ السلام کا ردعمل

سقیفہ میں جو اجتماع ہوا تھا وہ اس طرح اختتام پذیر ہوا کہ انصار و مہاجرین میں سے چند افراد نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اس کے بعد یہ مجمع مسجد کی جانب روانہ ہوا تاکہ وہاں عام مسلمان بیعت کرسکیں۔ حضرت عمر اس مجمع میں پیش پیش تھے اور راہ میں جو بھی ملتا، اس سے کہتے کہ وہ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلے۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۵۶)

حضرت علی علیہ السلام ابھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد مبارک کی تکفین و تدفین میں مشغول و منہمک تھے کہ لوگوں کے شوروغل کی صدائیں سنائی دیں اور صحیح واقعہ کا اس کے ذریعہ علم ہوا۔ خلافت کی اہلیت کے بارے میں جب مہاجرین کی یہ حجت و دلیل آپ کو بتائی گئی کہ انھوں نے اس بات پر احتجاج کیا کہ خلیفہ خاندانِ قریش اور شجرِ نبوت کی شاخ ہو تو اس پر آپ نے فرمایا: "انھوں نے تکیہ تو درخت پر ہی کیا لیکن اس کے پھل کو تباہ کرڈالا"۔ ①

حضرت علی علیہ السلام کا دوسرا ردعمل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسد مبارک کی تدفین کے بعد ظاہر ہوا۔ حضرت علی علیہ السلام مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اس وقت بنی ہاشم کے افراد بھی کافی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ بعض وہ لوگ جو حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرچکے تھے، آپؑ کے اور افراد بنی ہاشم کے گرد جمع ہوگئے اور کہنے لگے: طائفۂ انصار نیز دیگر افراد نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے۔ آپ بھی بیعت کرلیجیے ورنہ تلوار آپؑ کا فیصلہ کرے گی۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: "میں ان سے زیادہ بیعت کے لیے اہل و قابل ہوں۔ تم لوگ میرے ہاتھ پر بیعت کرو۔ تم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قربت کے باعث خلافت انصار سے لے لی اور انھوں نے بھی یہ حق تسلیم کرلیا۔ خلافت کے لیے میرے پاس بھی دلائل موجود ہیں۔ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات میں ہی نہیں بلکہ رحلت کے وقت ان کے سب سے زیادہ

① احتجوا بالشجرة واضاعوا الثمرة (نہج البلاغہ: خطبہ ۶۶)

قریب ونزدیک تھا۔ میں وصی، وزیر اور علم رسولؐ کا حامل ہوں۔ میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ کے بارے میں سب سے زیادہ واقف ہوں۔ اُمور کے نتائج کے بارے میں تم سے زیادہ جاننا ہوں۔ ثبات و پائیداری میں تم سب سے بہتر محکم و ثابت قدم ہوں۔ اس کے بعد اب تنازع کس بات پر ہے؟" (احتجاج طبری: ج ۲، ص ۹۰، الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۱۸)

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: آپؑ مانیں یا نہ مانیں ہم آپؑ کو بیعت کیے بغیر جانے نہیں دیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے انھیں فیصلہ کن انداز میں جواب دیتے ہوئے فرمایا:

احلب حلبًا هناك شطره وشد له اليوم يرد عليك غداً

"اچھی طرح دوہ لو اس میں تمھارا بھی حصّہ ہے۔ آج خلافت کے کمربند کو حضرت ابوبکر کے لیے مضبوط باندھ لو، کل وہ تمھیں ہی لوٹا دیں گے"۔

اس وقت وہاں عبیدہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے کہا: اے میرے چچازاد بھائی! رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپؑ کی قرابت داری، اسلام میں آپؑ کے سابق الاسلام، اس کے مددگار اور آپؑ کی علمی فضیلت سے ہمیں انکار نہیں لیکن آپؑ ابھی جوان ہیں اور ابوبکر آپؑ ہی کے قبیلے کے سن رسیدہ آدمی ہیں۔ اس بارِ خلافت کو اُٹھانے کے لیے وہ بہتر ہیں۔ اگر عمر نے وفا کی تو ان کے بعد خلافت آپؑ کو پیش کر دی جائے گی...... لہٰذا آپؑ اس وقت فتنہ وآشوب بپا نہ کیجیے۔ یہ آپؑ کو بخوبی علم ہے کہ عربوں کے دلوں میں آپؑ کی کتنی دشمنی ہے۔ (الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۱۸، شرح ابن ابی الحدید: ج ۶، ص ۱۱-۱۲، احتجاج طبری: ج ۱، ص ۹۶)

حضرت علی علیہ السلام کا تیسرا ردِعمل وہ تقریر تھی جو آپؑ نے مہاجرین و انصار کے سامنے فرمائی۔ اسی تقریر کے دوران آپؑ نے فرمایا تھا:

"اے مہاجرین و انصار! خدا پر نظر رکھو اور میرے بارے میں تم نے جو پیغمبر اکرمؐ سے عہد و پیمان کیا تھا اسے فراموش نہ کرو۔ حکومتِ محمدیہؐ کو ان کے گھر سے اپنے گھر مت لے جاؤ۔

تم یہ بات جانتے ہو کہ ہم اہلِ بیتؑ اس معاملے میں تم سے زیادہ حق دار

ہیں۔ کیا تم کسی ایسے شخص کو نہیں چاہتے جسے مفاہیم قرآن، اصول و فروع، دین اور سنت پیغمبر اکرم ﷺ پر مکمل عبور حاصل ہے تاکہ وہ اسلامی معاشرے کا حسن و خوبی نظم و نسق برقرار کر سکے...... میں خدائے واحد کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ایسا شخص ہم میں موجود ہے اور تمھارے درمیان نہیں، نفسانی خواہشات کی پیروی مت کرو اور حق سے دُور نہ ہو جاؤ۔ نیز اپنے گذشتہ اعمال کو اپنی بداعمالیوں سے فاسد و کثیف نہ ہونے دو"۔

بشیر بن سعد نے انصار کی ایک جماعت کے ساتھ کہا: اے ابوالحسن! اگر انصار نے آپؑ کی یہ تقریر ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پہلے سن لی ہوتی تو دو آدمی بھی ایسے نہ ہوتے جو آپؑ کے بارے میں اختلاف کرتے۔ (الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۱۸، شرح ابن ابی الحدید: ج ۶، ص ۱۱-۲۱، احتجاج طبرسی: ج ۱، ص ۹۶)

علیؑ نے کیوں عجلت نہیں کی؟

تاریخ کے اس حصے کا مطالعہ کرنے کے بعد ممکن ہے کہ یہ سوال سامنے آئے کہ اگر حضرت علی علیہ السلام بھی دوسروں کی طرح امر خلافت میں عجلت کرتے اور حضرت عباس و ابوسفیان کی تجویز مان لیتے تو شاید یہ منظر سامنے نہ آیا ہوتا؟ اس بات کی وضاحت کے لیے یہاں اس بات کا واضح کر دینا ضروری ہے کہ آپؑ کی خلافت کا مسئلہ دو حالتوں سے خالی نہ تھا۔ یا تو رسول اکرم ﷺ نے آپؑ کو خداوند تعالیٰ کے حکم سے اس مقام کے لیے منتخب کر لیا تھا (اس پر شیعہ عقائد کے لوگوں کا اتفاق ہے) ایسی صورت میں عوام کا بیعت کرنا یا نہ کرنا اس حقیقت کو بدل نہیں سکتا اور اگر بالفرض خلافت کے معاملے میں اُمت کو اس کے فیصلے پر آزاد چھوڑ دیا تھا تو پھر کیوں حضرت علی علیہ السلام لوگوں کے حق انتخاب کو سلب کرتے۔ وہ اُمت کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے کہ وہ جسے بھی چاہیں اپنا خلیفہ مقرر کریں۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا جسد مبارک ابھی زمین کے اُوپر ہی تھا۔ حضرت علی علیہ السلام پیغمبر خدا ﷺ کے وصی کے لیے ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن کہ وہ جسد اطہر پیغمبر اکرمؐ کو زمین پر رکھے رہنے دیں اور خود اپنے کام کے چکر میں نکل جائیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے پہلے اپنا فرض ادا کیا، پھر لوگوں کے سامنے تشریف لائے۔ دوسرے بھی یہ بات جانتے تھے کہ اگر ایسے میں حضرت علی علیہ السلام تشریف لے آتے تو وہ ہرگز اپنے مقصد و ارادے میں کامیاب نہ ہوتے۔ چنانچہ دوسروں نے امر خلافت کے سلسلے میں عجلت کی اور حضرت علی علیہ السلام کو اس وقت اطلاع دی جب کام تمام ہو چکا تھا۔ (ماخوذ از کتاب خلافت و ولایت: ص ۶۳)

حضرت علی علیہ السلام کے گھر میں پناہ گزینی

صحابہ رسولؐ میں ایسے پاک طینت لوگ بھی موجود تھے، جنھوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ موصوف کو خلیفہ بنائے جانے پر انھوں نے اعتراض کیا اور اس کے اظہار کے لیے انھوں نے پناہ گزینی کی راہ اختیار کی اور اس مقصد کے لیے بنت رسولؐ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے گھر میں جمع ہو گئے۔

ان میں سے بعض افراد کے نام مورخین نے اپنی کتابوں میں درج کیے ہیں۔ [1]

حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کا گھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں خاص احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ بنی ہاشم، بعض مہاجرین اور اہل بیتؑ کا آپؑ کے گھر میں پناہ گزین ہونے کا فطری طور پر مقصد ہی یہ تھا کہ کوئی شخص زبردستی پناہ گزینوں کو بیعت کی غرض سے مسجد میں نہیں لا سکتا تھا۔ بالآخر حضرت عمرؓ کو ایک دستے کے ساتھ مقرر کیا گیا کہ وہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر پر جائیں اور پناہ گزینوں کو نکال کر باہر لائیں تاکہ وہ خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ حضرت عمر ایک گروہ کے ساتھ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھر کی جانب روانہ ہوئے اور بڑی کش مکش کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو باہر لایا گیا اور آپؑ کو مسجد لے گئے جہاں آپؑ کو مجبور کیا گیا کہ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کریں لیکن حضرت علی علیہ السلام اپنے ارادے پر قائم رہے۔

جب دیکھا کہ حضرت علی علیہ السلام اپنے عزم و ارادے پر قائم ہیں تو لوگ بھی آپؑ سے دست

---

[1] جن حضرات کے نام دیے گئے ہیں ان میں: زبیر، عباس، عتبہ بن ابی لہب، سلمان، ابوذر، مقداد، براء، ابی بن کعب، سعد بن ابی وقاص اور طلحہ شامل ہیں۔ لیکن الفصول المہمہ میں ان افراد کے علاوہ دیگر حضرات کے نام بھی درج ہیں۔

کش ہو گئے۔ (الامامۃ والسیاسۃ: ج ا،ص ۲۰)

انصار سے مدد چاہنا

اس واقعہ کے بعد حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام راتوں کو انصار کے گھر تشریف لے جاتے اور اہل بیت علیہم السلام سے متعلق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیتوں اور احادیث کی جانب توجہ دلاتے ہوئے ان سے مدد کے خواہاں ہوتے۔ وہ لوگ جواب میں کہتے:

"اے بنت رسولؐ! ہم اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپؑ کے چچا کے بیٹے نے حضرت ابوبکر سے قبل ہم سے بیعت کرنے کے لیے کہا ہوتا تو ہم حضرت علیؑ کے مقابل کسی دوسرے شخص کو ترجیح نہ دیتے"۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام فرماتے:

"کیا عجیب بات ہے، کیا تمھیں مجھ سے یہ توقع تھی کہ جنازۂ رسولؐ کی تکفین و تدفین کیے بغیر اسے یونہی گھر میں چھوڑ دیتا اور اس حکومت کو حاصل کرنے کی غرض سے، جو اس عظیم المرتبت انسان نے چھوڑی تھی، کشمکش وتنازع میں پڑ جاتا"۔

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام فرماتیں:

"ابوالحسن نے جو کچھ کیا، وہ صحیح تھا اور لوگوں نے جو کچھ کیا ہے خدا ان سے باز پرس کرے گا"۔ (الامامۃ والسیاسۃ، ج ا،ص ۱۹)

حساس صورت حال

حضرت علی علیہ السلام جس کیفیت وحالت سے گزر رہے تھے، وہ بہت زیادہ حساس ونازک تھی کیونکہ آپ کو جو فرض سپرد کیا گیا، وہ نہایت ہی مشکل مگر بہت ہی عظیم اور اہم تھا۔ ایک طرف تو آپؑ دیکھ رہے تھے کہ خلافت واسلامی قیادت اصل راہ سے دور ہوگئی ہے جس کے باعث فطری طور پر بہت سے حقوق پامال ہو کر رہ جائیں گے اور دوسری طرف آپؑ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان چونکہ گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، اسی لیے ان میں اختلافات بھی شروع ہو گئے ہیں۔ اب دیکھنا

یہ ہے کہ اس حساس حالت و کیفیت میں حضرت علی علیہ السلام کا کیا فرض ہے۔ کیا داخلی موقع پرست جماعت کی خود غرضی پر مبنی حرکات کو برداشت کر کے سکوت اختیار کیے رہتا یا ان حالات کے خلاف سرکشی اور کسی تحریک کا آغاز کرتا؟

اگرچہ مسجد نبوی میں مہاجرین و انصار کی موجودگی میں حضرت علی علیہ السلام اور آپؑ کے طرف داروں کی پند و نصیحت، نیز روشن و واضح تقاریر نے اس حقیقت کو آشکارا کر دیا تھا اور تمام مسلمانوں پر حجت تمام کر دی تھی لیکن حضرت ابوبکر کے خلیفہ مقرر کیے جانے کے بعد آپؑ کے سامنے اب دو ہی راہیں تھیں: پہلی تو یہی کہ بغاوت کر کے اپنا حق واپس لے لیا جائے اور دوسری یہ کہ اسلام کے تحفظ کی خاطر سکوت اختیار کیا جائے۔

موجودہ قرائن و دلائل سے ثابت ہے کہ ان حالات میں حضرت علی علیہ السلام کے لیے قیام کرنا اسلام کے حق میں ہرگز سودمند نہ تھا، جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ اسلامی معاشرہ منتشر ہو کر رہ جائے اور لاتعداد گروہ و افراد دینِ اسلام سے برگشتہ ہو کر واپس عہد جاہلیت میں اور دیگر خرافات کی جانب پلٹ جائیں۔

قیام نہ کرنے کے دلائل اور وجوہات

حضرت علی علیہ السلام نے مختلف مواقع پر جو تقاریر کیں اگر ہم ان کا اور ان حالات کا جو اس وقت اسلامی معاشرہ پر مسلط و طاری تھے، جائزہ لیں تو ہمیں اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ حضرت علی علیہ السلام نے کیوں قیام نہیں کیا۔ اب ہم ان نکات کو بیان کر رہے ہیں جن سے یہ باتیں روشن ہو جائیں گی۔

① معقول فوجی طاقت کی کمی

مندرجہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے خود حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا:

"امرِ خلافت میں میری کوتاہی موت کے خوف کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق تھی کیونکہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ

اُمت نے تجھ سے خیانت کی ہے۔ انھوں نے تجھ سے جو عہد کیا تھا اسے وہ وفا نہیں کر رہے درحالیکہ تم میرے لیے ایسے ہی ہو جیسے حضرت موسیٰؑ کے لیے حضرت ہارونؑ تھے"۔

اس کے بعد آپؑ نے مزید فرمایا:

"مَیں نے سوال کیا کہ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ رسولؐ خدا نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی ایسا شخص مل جائے جو تمھاری مدد کرے تو تم ان سے جنگ وجدال کرنا اور اپنا حق حاصل کرنا، اگر ایسا نہ ہوا تو تم اس خیال سے درگزر کرنا اور اپنے خون کی حفاظت کرنا تاکہ تم میرے پاس مظلوم آؤ"۔ (الشیعہ والحاکمون: ص ۱۸)

آپؑ نے ایک جگہ اور بھی اس تلخ حقیقت کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"اگر مجھے چالیس باعزم افراد مل جاتے تو میں اس گروہ کے خلاف انقلاب اور جنگ وجدال کرتا"۔ ①

ایک جگہ آپؑ نے یہ بھی فرمایا تھا:

"مَیں نے اپنے اطراف میں نظر ڈالی اور دیکھا کہ جز میرے اہلِ بیتؑ کے، میرا کوئی یار و مددگار نہیں، مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ انھیں موت کے منہ میں دے دوں"۔ ②

② اسلام اور اسلامی وحدت کا تحفظ

وہ نومسلم عرب جن سے دورِ جاہلیت کے رسم ورواج کی عادت وخو ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی اور جذبۂ ایمان و اسلامی عقیدہ ان کے دلوں میں پورے طور پر راسخ نہیں ہوا تھا، انھیں مدِنظر رکھتے ہوئے ہر قسم کی داخلی جنگ مسلمانوں کی طاقت کے اضمحلال اور اسلام کے انہدام باعث ہوتی بالخصوص ان حالات میں جب کہ اہلِ ردہ نے جزیرۃ العرب کے اطراف میں مرکزی

---

① لو وجدت اربعین ذوی عزم منهم لناهضت القوم (شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۲۲-۲۷)

② نہج البلاغہ (صبحی صالح) خطبہ ۲۶: فنظرت فاذا لیس لی معین الا اهل بیتی فضننت بهم عن الموت۔

حکومت کے خلاف اپنا پرچم لہرایا تھا۔ ①

ان کے علاوہ ایران اور روم کی دو شہنشاہی طاقتیں اس موقع کی تلاش میں تھیں کہ قائم شدہ حکومت سے برسرِ پیکار ہوں۔ اگر حضرت علی علیہ السلام ان حزنل مسلمانوں اور بیرونی دشمنوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی تلوار کا سہارا لیتے اور اپنا حق حاصل کرنے کی خاطر حضرت ابوبکر سے جنگ و جدال کرتے تو نوعمر اسلامی طاقت اور مرکزیت کو مدینہ میں نقصان پہنچتا اور اسلام کو نیست و نابود کرنے کی غرض سے بیرونی طاقتوں کے لیے یہ بہترین موقع ہوتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سقیفہ کے واقعات سے متعلق آپؑ نے جو تقریر کی تھی، اس میں اتحاد کی اہمیت اور تفرقہ اندازی کے برے نتائج کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> "فتنے کی امواج کو نجات کی کشتیوں سے چاک کر دو، اختلاف پیدا کرنے سے گریز کرو، فخر فروشی کی علامات کو سر سے اُتار دو۔ میری خاموشی کے سبب سے گریز کرو۔ فخر فروشی کی علامات کو سر سے اُتار دو۔ میری خاموشی کا سبب میری وہ دانش و باطنی آگاہی ہے جس میں غرق ہوں۔ اگر تم بھی میری طرح باخبر ہوتے تو کنویں کی رسی کے مانند مضطرب ولرزاں ہو جاتے"۔ ②

③ جاہلیت کی طرف بازگشت

قرآن مجید میں ایک آیت اس امر کی جانب اشارہ کر رہی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ایک گروہ واپس دورِ جاہلیت کی طرف پلٹ جائے گا۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے:

---

① اس جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کی مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت شروع کر دی اور ایک مدت تک اس کے حملے جاری رہے۔

② نہج البلاغہ، خطبہ ۵۔ شُقُّوا اَمْوَاجَ الْفِتَنِ بِسُفُنِ النَّجَاةِ، وَعَرِّجُوا عَنْ طَرِيْقِ المفاخرة وَضَعُوْا بتيجان الْمُفَاخَرَةِ ،انغى لانك عجلت على مكنون علم لو بحت به لاضطربتم اضطراب الارشيه فى الطوى التعبيدة۔

اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ①

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں پیغمبر اکرم ﷺ کو اسلامی معاشرہ کی آئندہ زندگی کے بارے میں سخت تشویش تھی۔ سقیفہ میں جو واقعہ پیش آیا اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس روز کس طرح یہ راز روشن و عیاں ہو گیا اور ایک بار پھر قبائلی تعصبات اور دورِ جاہلیت سے متعلق افکار و خیالات دونوں جانب سے تقاریر کے دوران اشارہ و کنایہ میں نمایاں ہو گئے۔

اس کے علاوہ قبائل میں سے بعض گروہ جو کچھ عرصہ قبل ہی مسلمان ہوئے تھے، رسولِ اکرم ﷺ کی خبر رحلت سنتے ہی مرتد ہو گئے اور اپنے آباء و اجداد کے دین کی طرف پلٹ گئے اور مرکزی حکومت کی مخالفت شروع کر دی۔

دوسری طرف مسیلمہ، سجاح اور طلیحہ نے بھی نجد و یمامہ کے علاقوں میں اپنی نبوت کا دعویٰ کر کے دوسرا پرچم لہرا دیا اور کچھ لوگوں کو اپنے گرد جمع بھی کر لیا۔

اگرچہ حضرت علی علیہ السلام حق بجانب تھے مگر اس وضع و کیفیت کو دیکھتے ہوئے کیا یہ زیبا تھا کہ اپنا پرچم لہرا کر انقلاب و قیام کا اعلان کر دیں؟ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے اہالی مصر کو جو خط لکھا تھا، اس میں آپؑ نے اس نکتے کی جانب اشارہ فرمایا تھا:

> "میں نے دیکھا ہے کہ لوگوں میں سے ایک گروہ دینِ اسلام سے برگشتہ ہو گیا ہے اور وہ اس فکر میں ہے کہ آئینِ محمدی کو نیست و نابود کر دے۔ مجھے یہ خوف محسوس ہوا کہ اگر میں اسلام اور اہلِ اسلام کی مدد نہ کروں تو مجھے اس بات کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ اسلام کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ دنیا کی حکومت چند روزہ ہے جو سراب یا ابر کی طرح سرعت سے گزر جانے والی ہے۔ اسلام کی تباہی اس حکومت کے ترک کرنے سے زیادہ

---

① وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۴۴)
"محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسولؐ ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو اُلٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے، انھیں وہ اس کی جزا دے گا"۔

مجھ پر شاق والمناک گزرے گی"۔ ①

① کینہ توز دشمن

حضرت علی علیہ السلام کے مسلمانوں میں ہی بہت سے دشمن موجود تھے اور یہ وہ لوگ تھے جن میں سے کسی کا باپ، کسی کا بھائی یا کوئی دوسرا قرابت دار جنگ کے دوران آپؑ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور یہ دشمنی و کینہ توزی ان کے دلوں میں اسی وقت سے چلی آ رہی تھی۔

ایسے حالات میں جب بھی حضرت علی علیہ السلام مسلح ہو کر قیام اور اپنا حق طلب کرنے کی کوشش کرتے تو یہی دشمن فریب و نفاق کو ہوا دینے لگتے اور یہ کہتے پھرتے کہ حضرت علیؑ نے مسلمانوں کے درمیان رخنہ پیدا کر دیا ہے اور دین کے نام پر جنگ و پیکار پر اُتر آئے ہیں۔ اگر حضرت علیؑ نے ان سے جنگ کی ہوتی تو اس کے یہ نتائج نکل سکتے تھے اور ممکن تھا کہ جنگ کے ابتدائی چند لمحات میں ہی آپؑ کے بہت سے عزیز و ہمدرد تہ تیغ کیے جاتے اور پھر بھی حق دار کو حق نہ ملتا۔

جب آپؑ کے دوست و ہوا خواہ تہ تیغ کر دیے جاتے تو مخالفین کا قتل ہونا بھی فطری امر تھا اور اس کا مجموعی نتیجہ یہ ہوتا کہ مرکز میں مسلمانوں کی طاقت رُو بہ زوال ہونے لگتی اور جب مرکزی طاقت کمزور ہونے لگتی تو وہ قبائل جو مرکز سے دُور تھے اور جن کے دلوں میں دینِ اسلام نے پوری طرح رُسوخ نہیں کیا تھا، مرتدین کی صفوں میں جا ملتے اور شاید ان کے طاقتور ہونے اور مرکز میں رہبر کی زبونی کے باعث اسلام کے چراغ کی روشنی ماند پڑنے لگتی۔

بیعت کا انجام

اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی رحلت تک حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ ②

---

① نہج البلاغہ، خط ۶۲۔ فامسکت یدی حتی رأیت راجعة الناس قد رجعت من الاسلام یدعون الی محق دین محمد فخشیت ان لم انصر الاسلام واهله ان اری فیه ثلما وهدما تکون المصیبة به علی اعظم من فوت ولایتکم التی هی متاع ایام قلائل یزول منها ما کان کما یزول السراب او کما یتقشع السحاب۔

② تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اسد الغابہ: ج ۳، ص ۲۲۲۔ تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۲۶۔ استیعاب: ج ۲، ص ۲۴۴۔ التنبیہ والاشراف: ص ۲۵۰ اور الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۲۰۔

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی وفات کے بعد جب آپؑ نے لوگوں میں بے رُخی اور بے اعتنائی دیکھی اور مسلمانوں کو پریشان حال پایا تو آپؑ نے حضرت ابوبکر سے مصالحت کرلی مگر اس کے باوجود تلخ واقعات آپؑ کے دل سے محو نہ ہوسکے اور ہمیشہ ان دنوں کو یاد کر کے شکوہ و شکایت کرتے رہے۔

چنانچہ خطبہ شقشقیہ میں فرماتے ہیں:

فَرَأَیْتُ اَنَّ الصَّبْرَ عَلٰی هَاتَا اَحْجٰی فَصَبَرْتُ وَفِی الْعَیْنِ قَذًی وَفِی الْحَلْقِ شَجًا

"(عقل اور اس فرض کے مطابق جس کا پورا کرنا مجھ پر واجب تھا) مجھ پر یہ بات واضح و روشن تھی کہ میرے لیے صبر و شکیبائی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، لہٰذا میں نے صبر و تحمل سے کام لیا مگر اس طرح کہ گویا میری آنکھ میں خار اور گلے میں ہڈی اٹک گئی ہو"۔ ①

مسئلہ فدک ②

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کو ابھی دس دن بھی نہ گزرے تھے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو یہ خبر ملی کہ خلیفہ کے کارندوں نے آپؑ کے کام کرنے والوں کو فدک سے باہر نکال دیا ہے اور

---

① نہج البلاغہ: خطبہ ۳۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی مصالحت اور اجتماعات میں شرکت اسی حد تک تھی کہ جتنی اسلام و مسلمین کی حفاظت کا تقاضا تھا۔

② فدک خیبر کے نزدیک مدینہ سے ۱۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر سرسبز و زرخیز زمین تھی۔ فتح خیبر کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک وفد فدک کے سرداروں کے پاس بھیجا اور بحث و گفتگو کے بعد وہاں کے رہنے والوں نے یہ عہد کیا کہ ہر سال خیبر کی جتنی پیداوار ہوگی اس کا نصف حصہ وہ پیغمبر اکرم کی خدمت میں بھیج دیا کریں گے اور اس کے عوض حکومت کی جانب سے ان کی حفاظت کی جائے گی۔
اسلامی نظریے کے مطابق وہ زمین جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے وہ خالص پیغمبر اکرم اور امامؑ کا حصہ ہے۔ اس مسئلے کی رُو سے فدک پر صرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق تھا۔ چنانچہ رسولِ اکرم نے بھی (شیعہ محدثین و مفسرین نیز بعض سنی مفکرین کے قول کے مطابق:) جس وقت آیت ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ..... (سورۂ اسراء: آیت ۲۶) نازل ہوئی تو آپؐ نے اپنی دختر حضرت فاطمہ علیہا السلام کو بلایا اور فدک انھیں دے دیا۔ (کشف الغمہ: ج ۱، ص ۴۷۶)

اس کے تمام کاموں کو اپنے اختیار میں لے لیا ہے۔

بنت رسولؐ اس زمین کو حاصل کرنے کی غرض سے بنی ہاشم کی خواتین کے ہمراہ خلیفہ کے پاس گئیں۔ اس وقت حضرت ابوبکر اور حضرت فاطمہ علیہا السلام کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ ذیل میں درج ہے:

حضرت فاطمہؑ: تم نے میرے کارندوں کو "فدک" سے کیوں باہر نکالا اور مجھے میرے حق سے محروم کیا؟

خلیفہ: میں نے آپؑ کے والد سے سنا ہے کہ پیغمبرؐ کوئی چیز میراث میں نہیں چھوڑتے۔

حضرت فاطمہؑ: فدک کی زمین میرے والد نے اپنے زمانہ حیات میں مجھے بخش دی تھی اور اس وقت اس کی مالک میں ہی تھی۔

خلیفہ: آپؑ کے پاس اس دعوے کے ثبوت میں کیا شواہد و گواہ موجود ہیں؟

حضرت فاطمہؑ: ہاں میرے شاہد و گواہ علیؑ اور اُمِ ایمن ہیں۔

چنانچہ! ان حضرات نے حضرت زہرا علیہا السلام کی درخواست پر یہ شہادت دی کہ آپؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ حیات میں اس کی مالک تھیں۔ (احتجاج طبرسی: ج ۱، ص ۱۳)

بعض مورخین نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام نے بھی گواہی دی۔ (مروج الذہب: ج ۳، ص ۲۳)

فخر رازی نے یہ قول نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں میں سے ایک غلام نے بھی حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے مالک ہونے کی گواہی دی۔ بلاذری نے اس غلام کے نام کی تصریح بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کا نام "رباح" تھا۔ [1]

جب یہ گواہیاں گزر گئیں تو حضرت علی علیہ السلام نے خلیفہ (ابوبکر) کو ان کے اشتباہ کی طرف متوجہ کیا (کیونکہ خلیفہ نے گواہی اس سے طلب کی تھی، جس کے تصرف میں فدک تھا اور متصرف (قابض) سے گواہی مانگنا اسلامی میزان و عدل کے سراسر خلاف ہے) اور فرمایا: اگر میں اس

① فتوح البلدان: ص ۴۴۔ شیعہ احادیث میں مذکورہ بالا شواہد کے علاوہ اسماء بنت عمیس کا نام بھی شاہد کی حیثیت سے آیا ہے۔

مال کی دعوے دار ہوں جو دوسرے کے قبضے میں ہے تو آپ گواہ کس سے طلب کریں گے؟ مجھ سے کہ مدعی ہوں یا اس سے جس کے تصرف میں مال ہے؟

حضرت ابوبکر نے کہا: آپؑ گواہ پیش کریں گے؟

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: فدک ہمارے تحت تصرف ہے اور اب دوسروں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ اموالِ عامہ ہیں۔ ایسی صورت میں وہ گواہ پیش کریں نہ کہ ہم۔ (احتجاج طبرسی: ج۱، ص ۱۲۲)

خلیفہ نے حضرت علی علیہ السلام کی اس دلیل پر سکوت اختیار کیا اور حلبی کے قول کے مطابق انھوں نے بذریعہ تحریر اس بات کی تصدیق کی کہ فدک حضرت فاطمہ علیہا السلام کی ملکیت ہے لیکن عین اسی وقت حضرت عمر وہاں پہنچ گئے اور دریافت کیا کہ یہ کیسا مکتوب ہے؟ اس پر حضرت ابوبکر نے کہا کہ میں نے اس ورق پر حقِ مالکیتِ حضرت فاطمہؑ کی تصدیق کی ہے۔

حضرت عمر نے کہا کہ فدک سے جو آمدنی ہوگی اس کی تو آپ کو ضرورت ہے کیونکہ عرب مشرکین نے اگر کل کہیں مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر دی تو آپ جنگ کے اخراجات کہاں سے مہیا کریں گے؟ چنانچہ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے مکتوب لیا اور چاک کر دیا۔ (اعیان الشیعہ (دس جلدی): ج۱، ص ۳۱۸، منقول از سیرتِ علیؑ)

فدک پر قابض ہونے کے محرکات

خلیفہ کی جانب سے فدک پر قابض ہونے کے جو مختلف محرکات تھے ان کی کیفیت ذیل میں درج ہے:

① مخالفین کو اپنی جانب متوجہ کرنا

خلیفۂ وقت نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ وہ عوام پر اس وقت تک اپنی فرماں روائی قائم نہیں کر سکتے تاوقتیکہ وہ اپنے مخالفین کو اپنا ہم نوا نہ بنالیں اور مختلف طریقوں سے جب تک ان کے افکار و قلوب کو اپنی جانب متوجہ نہ کریں گے ان دستوں پر حکمرانی کرتے رہنا ان کے لیے مشکل ہوگا۔

بااثر افراد و اشخاص میں سے ایک ابوسفیان تھا کہ جس کے اعتقاد کو بدلا جاسکتا تھا۔ جب سقیفہ کا واقعہ پیش آیا تو اس نے حضرت علی علیہ السلام کے سامنے بیعت لینے کی تجویز پیش کی تھی۔ نیز مسلح ہوکر قیام کرنے کی دعوت دی تھی اور (بنی ہاشم سے خطاب کرتے ہوئے) کہا تھا کہ آپ لوگ اٹھیں اور زمام اُمور اپنے ہاتھ میں لیں تو میں مدینہ کو سوار و پیادہ فوج سے بھر دوں گا۔ (کامل ابن اثیر: ج ۱، ص ۳۲۶، شرح ابن ابی الحدید، ج ۲، ص ۴۵)

لیکن یہ شور وغل ابتدائی چند روز تک برقرار رہا، اس کے بعد ختم ہوگیا۔

خلیفہ وقت نے ابوسفیان کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے وہ دولت جو بیت المال و زکوٰۃ کے نام پر جمع کر کے لایا تھا، اسے بخش دی۔ اس کے علاوہ اس کے بیٹے یزید کا بھی انھوں نے سپاہِ اسلام کے فرمان دار کی حیثیت سے شام کے علاقے فتح کرنے کے لیے انتخاب کیا اور بالآخر اسے عالمِ اسلام کے شاداب ترین علاقے یعنی شام کا فرماں روا مقرر کر دیا۔ جس وقت یہ خبر ابوسفیان کو پہنچی تو اس نے کہا کہ ابوبکر نے صلۂ رحم کیا ہے۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۲۰۲)

اس کے علاوہ خزرجی قبیلے کے لوگوں نے چونکہ پہلے دن بیعت نہیں کی تھی ان کی دلجوئی بھی خلیفہ کے لیے ضروری تھی۔ یہی نہیں بلکہ انصار کی خواتین بھی خلیفہ کے عطیات سے بے بہرہ نہ رہیں۔ ①

② جمع و خرچ کی مد میں کمی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو کچھ اثاثہ و سرمایہ تھا، اسے آپؐ نے رحلت سے قبل تقسیم کر دیا اور رحلت کے بعد آپؐ کے جو بھی نمائندگان مدینہ پہنچے، وہ بھی اس شہر میں مختصر پونجی لے کر داخل ہوئے مگر یہ قلیل آمدنی نئی قائم شدہ حکومت کی نظر میں کافی نہ تھی، بالخصوص ان حالات میں جب کہ اطراف کے قبائل نے مخالفت کا پرچم لہرا دیا تھا اور مرکزی حکومت کو زکوٰۃ دینے میں پس و پیش کر رہے تھے۔

---

① زید بن ثابت کچھ رقم لے کر بنی عدی کی ایک خاتون کے پاس پہنچے اور کہا کہ یہ وہ رقم ہے جو خلیفہ نے عورتوں کے درمیان تقسیم کی ہے اور یہ تمہارا حصہ ہے۔ اس نیک خاتون نے اپنی ذہانت کے باعث اس رقم کو قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا: میرا دین خریدنے کے لیے مجھے یہ رشوت دی جارہی ہے۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۵۳، طبقات ابن سعد: ج ۳، ص ۱۸۲)

③ علیؑ کی اقتصادی قوت کے باعث خطرے کا احتمال

قیادت و رہبری کی جو شرائط ہو سکتی ہیں، وہ سب حضرت علی علیہ السلام میں موجود تھیں اور مالی اعتبار سے بھی اگر آپؑ کی حالت قوی ہوتی تو فطری طور پر ضرورت مند افراد آپؑ کے گرد جمع ہونے لگتے۔ چنانچہ ممکن تھا کہ افراد کا یہ اجتماع خلافت کی مشنری کے لیے کوئی مسئلہ پیدا کر دیتا۔

مخالفین کی سرکوبی

اپنی خلافت کے ابتدائی دنوں میں حضرت ابوبکر کے سامنے جو مشکلات آئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ بعض مسلمان مرتد ہو گئے تھے، ان کا مقابلہ کرنے کی غرض سے خلیفہ نے جنگ کا حکم دیا اور ان سے جنگ کرنے کے لیے سپاہی روانہ کیے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو حضرت ابوبکر کے دورِ خلافت میں "اہلِ ردہ" کے نام سے مشہور ہوئے تھے، کیا واقعاً وہ اسلام سے برگشتہ ہو گئے تھے یا محض اس لیے کہ انھوں نے حکومتِ وقت کے سامنے سرِ خم نہیں کیا تھا، اس لیے انھیں مرتد کہہ کر بدنام کر دیا گیا درحالیکہ وہ اصلی وحقیقی اسلام پر کاربند تھے؟

اس سوال کی وضاحت کے لیے یہ جتانا ضروری ہے کہ لفظ ارتداد کا مادہ "رَدَدَ" ہے اور اس کے معنی ہیں: "واپس ہو جانا"۔ عرفِ عام اور مسلم فقہا کی اصطلاح میں اس کے معنی "پھر جانا ہیں" اور یہ ضروری نہیں کہ اس پر دین کا بھی اطلاق ہوتا ہو لیکن اب تردد اور ارتداد کے معنی دین سے پھر جانا ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جاں سوز خبرِ رحلت جب پھیلی تو بعض وہ لوگ جو کچھ عرصہ قبل ہی مسلمان ہوئے تھے اور دُور دراز مقامات پر آباد تھے، تردّد میں مبتلا ہو کر دین سے برگشتہ ہو گئے اور بالخصوص اس وقت جب کہ مشرکین میں ہمت و حوصلہ پیدا ہونے لگا تھا اور وہ اسلام کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کے لیے زیادہ سنجیدگی سے سوچنے لگے تھے۔

لیکن اطراف و جوانب کے باقی مسلمانوں کی نگاہیں مرکز پر لگی ہوئی تھیں اور وہ اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں جانشینی کا مسئلہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انھیں اس واقعہ کی اطلاع ملی کہ بعض افراد نے سقیفہ بنی ساعدہ میں، حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی،

مگر بعض قبائل کے لوگوں نے جن میں بنی ہاشم اور ان کے سربراہ حضرت علی علیہ السلام، چند صحابہ رسولؐ اور قبیلہ خزرج کے سردار (سعد بن عبادہ) نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

مدینہ میں مسئلہ خلافت پر جو کشمکش ہوئی اس کے باعث وہ عرب قبائل، جنھوں نے سقیفہ میں حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اب ان کی مخالفت پر اُتر آئے اور انھیں حکومت وقت کو زکوٰۃ ادا کرنے میں تامل ہوا (کیونکہ زکوٰۃ اس شخص کو دی جاسکتی تھی، جسے متفقہ طور پر خلیفہ وقت تسلیم کر لیا گیا ہو) جس کا سبب قانونِ زکوٰۃ سے منکر ہونا نہ تھا کیوں کہ اس کی ادائیگی کو وہ جزدین سمجھتے تھے بلکہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ حکومت جیسے شاندار منصب کے لیے اس شخص کو جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین کہلائے جانے کا بھی مستحق نہیں تھا، اسے متفقہ طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

حضرت ابوبکر نے خالد بن ولید کی سرکردگی میں چند سپاہی زکوٰۃ وصول کرنے کی غرض سے روانہ کیے اور یہ ہدایت دی کہ اگر لوگ زکوٰۃ نہ دیں تو ان سے جنگ کی جائے۔ ابن ماجہ کے علاوہ اہلِ سنت کے دیگر تمام محدثین نے ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے اس مسئلہ پر حضرت ابوبکر سے اختلاف کیا اور کہا کہ آپ کیوں بے سبب لوگوں کا خون بہانے پر تلے ہوئے ہیں درحالیکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یہ فرمایا ہے:

> "میں اس کام کے لیے مامور کیا گیا ہوں کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرتا رہوں جب تک وہ شہادتین نہ کہہ لیں مگر اس کے بعد ان کا خون نیز ان کا مال قابلِ احترام ہے"۔

اس پر حضرت ابوبکر نے کہا: قسم ہے خدا کی، اگر لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زکوٰۃ میں خواہ اُونٹ کی رسّی ہی دیتے تھے مگر مجھے نہ دیں گے اور نماز و زکوٰۃ کے درمیان تفرقہ ڈالیں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا۔

یہ سن کر حضرت عمر نے کہا: میں نے دیکھ لیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ابوبکر کا سینہ قتال (جنگ و پیکار) کے لیے فراخ کر دیا ہے اور میں نے جان لیا ہے کہ وہ حق بجانب ہیں۔[1]

---

① البدایہ والنہایہ: ج ۲، ص ۳۱۱۔ قال عمر فما هو الا ان رأيت الله قد شرح صدر ابی بکر للقتال فعرفت انه الحق، لیکن صحیح بخاری: ج ۷، ص ۱۷۱ میں حضرت عمر کا جملہ اس طرح نقل کیا ہے: فو الله ما هو الا ان شرح الله صدر ابی بکر فعرفت انه الحق۔

جامع الازہر کے استاد دانش کدہ ادبیات کے عالم ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن فرماتے ہیں:

"حضرت ابوبکر جن لوگوں سے اس بنا پر جنگ کر رہے تھے کہ وہ مرتد ہو گئے تھے، درحقیقت ان میں سے کوئی بھی مرتد نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ دینِ اسلام سے نہیں پھرے تھے بلکہ حکومت سے ان کے اختلاف کا سبب کچھ اور تھا"۔ (تاریخ اسلام: ج ۱، ص ۳۵۱)

اس کے بعد حضرت ابوبکر کی ان لوگوں سے جنگ کے محرک کے متعلق لکھتے ہیں:

"خلیفہ نے مرتدین کے لیے سزا معین کی اور انھیں قتل کر دیا، یہ ایک سیاسی حکم تھا اس کا جاری کرنا حکومت کے لیے ان کے اسلام لانے سے بہتر تھا"۔

شورشوں کا دبانا

پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اسامہ کے ہمراہ لشکر روانہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اس خدمت کو حضرت ابوبکر نے انجام نہ دیا۔ اس لشکر کے روانہ کیے جانے کے بعد خلیفۂ وقت اور ان کے ہمنوا افراد نے کوشش کی کہ جتنی بھی شورشیں اس وقت ابھری تھیں یکے بعد دیگرے دبا دی جائیں۔

طلیحہ، سجاح، مسیلمہ اور ایاس بن عبداللہ ان لوگوں میں سے تھے، جنھوں نے کسی گوشے میں پیغمبری کا دعویٰ کیا یا سرکشی کی یا جنوب اور مشرق میں آباد قبائل، اور وہاں کے شہروں میں آباد لوگ دوبارہ مدینہ کے مطیع و فرمانبردار ہو گئے کیونکہ انھوں نے اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ خانہ جنگی سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ مصلحت اس میں ہے کہ مرکزی حکومت کی اطاعت قبول کرلیں۔

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی شہادت

جس سال رسول اکرم ﷺ کا انتقال ہوا اسی سال آپؐ کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ علیہا السلام نے بھی وفات پائی۔ باپ کی موت اور مختصر مدت کے بعد جو سانحات پیش آئے انھوں نے حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کے جسم و روح کو غمگین بنا دیا۔

حضرت زہرا علیہا السلام کے دل و دماغ پر ان واقعات کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ آپ کے فرمانے کے بموجب کہ "اگر یہ مصائب و آلام دنوں پر پڑتے تو رات کی تاریکی میں تبدیل ہو جاتے ①
ان صدمات کی تاب نہ لا کر صاحب فراش ہو گئیں۔ وہ لوگ جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر جان بکف رہا کرتے تھے اور ان کے پاس جو کچھ تھا، وہ آپ کے والد محترم کے وجود کی برکت سے ہی تھا۔ اب ایسے پھرے کہ ان میں سے چند ہی آپ کی عیادت کو آئے۔

عالم بزرگوار حضرت علامہ شیخ صدوق مرحوم اس ضمن میں فرماتے ہیں:

"مہاجر و انصار کی کچھ خواتین آپ کی عیادت کے لیے گئیں۔ آپ نے اس وقت کو غنیمت جانا اور اس موقعہ پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اس کے بعض اہم اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

"افسوس تمھارے مردوں نے خلافت کو، رسالت کی پائیگاہ، نبوت کی اقامت گاہ اور منزل وحی سے الگ کر دیا اور دنیا و دین کے ماہروں سے زمام خلافت چھین لی۔ یقیناً اس میں ان کا سراسر نقصان ہے۔ انھیں ابو الحسنؑ سے کیا پرخاش تھی"۔

(جی ہاں! انھیں علیؑ کی راہ خدا میں برہنہ شمشیر، دلیری اور شجاعت کا خوف تھا)۔

"قسم خدا کی! اگر خلافت کو (حضرت) علیؑ کے ہاتھ سے نہ لیا ہوتا تو ان کے اُمور و مسائل کو حل کرنے میں وہ خود حصہ لیتے اور انتہائی رضا و رغبت سے شادمانی و کامرانی کی جانب انھیں ہدایت کرتے، تشنگان عدل و انصاف آپ کے چشمۂ داد و عدالت سے سیراب ہوتے۔ محروم و لاچار لوگ ان کی پناہ صولت میں دلیر و شیر دل ہو جاتے"۔ ②

---

① صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّهَا صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

② احتجاج طبرسی: ج ۱، ص ۱۳۹، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱۶، ص ۲۳۳، بلاغات النساء: ص ۱۹ اور دلائل الامامہ طبری: ص ۳۹۔

بنتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تک علالت کے باعث صاحبِ فراش رہیں (۱) کسی شخص نے آپؑ کے چہرے پر شادابی اور مسکراہٹ نہ دیکھی۔ آپؑ ہفتے میں دو مرتبہ (پیر اور جمعرات کو) شہدا کے مزارات پر جاتیں اور ان کے لیے دعائے خیر فرماتیں۔ اور بالآخر ہجرت کے گیارھویں سال ۳ جمادی الآخر کو اٹھارہ سال کی عمر میں آپؑ نے اس جہانِ فانی سے کنارہ کرلیا اور اپنے والد بزرگوارؐ کے پاس پہنچ گئیں۔ (۲)

حضرت علی علیہ السلام نے دخترِ رسولؐ کو غسل دیا۔ نیز آپؑ کی وصیت کے مطابق خواص کے علاوہ دیگر افراد کی غیر موجودگی میں نمازِ جنازہ ادا کی اور راتوں رات آپؑ کے جسدِ مطہر کو سپردِ خاک کرکے قبر کے نشان کو محو کردیا۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے مزارِ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب رُخ کیا اور فرمایا:

> "یا رسولؐ اللہ! میری اور اپنی دختر کی جانب سے جو اب آپؐ کے جوار میں پہنچ گئی ہیں اور بہت جلد آپؐ سے جاملی ہیں، سلام قبول فرمایئے اور یا رسولؐ اللہ! آپؐ کی برگزیدہ و پاک دختر کی جدائی کے باعث میرا پیمانۂ صبر لبریز ہوچکا ہے اور اب مجھ میں غم برداشت کرنے کی تاب نہیں۔ آپؐ کی پیاری بیٹی جلد ہی آپؐ کو مطلع کردیں گی کہ آپؐ کی اُمت نے ان پر ستم روا رکھنے کی غرض سے کیا کیا باہمی سازشیں نہ کیں۔ ان پر جو کچھ گزری انھی کی زبانی سنیے اور یہ وقت کس طرح گزرا، اس کی کیفیت انھی سے دریافت فرمایئے۔ اگرچہ

---

(۱) حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کتنے عرصے تک علیل رہیں، اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن شہر آشوب نے مناقب میں بیان کیا ہے کہ آپؑ چالیس دن تک مریض رہیں اور اسی مرض کے باعث آپؑ کی وفات واقع ہوئی۔ حضرت امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ پندرہ روز تک علیل رہیں اور اس کے بعد آپؑ کی رحلت ہوئی۔ (اعیان الشیعہ: ج۱، ص۳۱۹)

(۲) حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی تاریخِ وفات اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد آپؑ کی مدتِ عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ کتاب کے متن میں جو بات درج کی گئی ہے وہ اقوالِ مشہور کے مطابق ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام رحلتِ رسولؐ کے بعد کم از کم چالیس دن اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ماہ اس جہانِ فانی میں تشریف فرما رہیں۔ مذکورہ بالا دونوں اقوال کے علاوہ مختلف روایات میں دو ماہ سے بہتر دن، تین ماہ اور چھے ماہ کا عرصہ بھی نقل کیا گیا ہے۔

آپؐ کی رحلت و زمانہ حیات کے درمیان کافی عرصہ نہیں گزرا ہے اور آپؐ کی یاد دلوں سے بھی محو نہیں ہوئی ہے"۔ (نہج البلاغہ (صبحی صالحی): خطبہ ۲۰۲)

سرزمینِ شام و عراق کی فتح

داخلی جنگوں کی آگ جب خاموش ہوگئی تو خلیفۂ وقت نے دو اہم لشکر تیار کیے۔ ان میں سے ایک لشکر خالد کے زیر فرمان عراق کی جانب روانہ کیا، جس پر اس وقت ساسانی حکومت کا اثر و غلبہ تھا اور دوسرا لشکر ابو عبیدہ کی سرکردگی میں شام کی سمت، مشرقی روم کی جانب روانہ کیا۔

خالد سب سے پہلے "حیرہ" کی طرف متوجہ ہوا لیکن وہاں کے حاکم نے صلح و امن کا طریقہ اختیار کیا اور نوے ہزار درہم ادا کر کے اپنے ملک کے تابع سرزمین کو مسلمین کی دراز دستی سے بچا لیا۔ حیرہ کے بعد "آبلہ"، "عین التمر" اور "انبار" جیسے شہر جنگ کا معاہدہ صلح کے ذریعے تابع و مطیع کیے گئے۔

عراق کی جانب جب لشکر روانہ کیا گیا تھا تو وہ کامیابی سے ہمکنار ہوا مگر جو لشکر رومی شہنشاہیت کے متصرفات کو فتح کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا، اس کے بارے میں احتمال تھا کہ کہیں شکست سے دوچار نہ ہو۔ اس خدشے کے پیش نظر حضرت ابو بکر نے خالد کو عراق سے واپس بلا لیا اور مسلمانوں کی مدد کے لیے انھیں شام کی جانب جانے پر مقرر کیا۔ خالد کے چلے جانے کے بعد قبیلۂ بکر کے سردار مثنی نے لشکرِ عراق کے فرمان دار کی ذمہ داری قبول کی اور حیرہ سے بابل (یہ شہر موجودہ حلہ کے نزدیک واقع تھا) کی جانب روانہ ہوئے۔

جب خالد اپنا مختصر لشکرِ اسلام لے کر "یرموک" پہنچا تو لشکرِ اسلام کو اس سے بہت فرحت حاصل ہوئی اور بے مثال بہادری و دلیری سے جنگ کر کے انھوں نے سپاہِ روم کو شکست دی۔ چنانچہ اس نے پسپا ہو کر دمشق میں پناہ لی۔

خلیفۂ وقت کی قرآن و سنت سے واقفیت

حضرت ابو بکر اگرچہ مسند خلافت پر متمکن ہو گئے لیکن مہاجر و انصار کی نظروں میں ان کا شمار افضل و اعلیٰ و دانشور صحابۂ رسولؐ میں نہیں تھا۔ مثلاً! تفسیر قرآن مجید کے وہ قابلِ اعتناء توجہ

مطالب بیان نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ! جلال الدین سیوطی جیسا متتبع مفسر اس سے زیادہ تفسیر و مطالب تفسیر ان سے نقل نہیں کر سکا ہے جبکہ وہی مفسر حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں لکھتا ہے کہ علم تفسیر میں آپؑ کی بہت سی روایات بیان کی گئی ہیں۔ (اتقان: ج ۲، ص ۳۲۸)

حنبلی مسلک کے پیشوا امام احمد بن حنبل کو دس لاکھ احادیث یاد تھیں (تذکرۃ الحفاظ ذہبی: ج ۲، ص ۴۳۱)۔ "مسند" میں انھوں نے پچاس ہزار سات سو احادیث نقل کی ہیں اور جو احادیث انھوں نے حضرت ابوبکر کے واسطے سے نقل کی ہیں ان کی تعداد اسی سے کم ہی ہے۔ (مسند حنبل: ج ۱، ص ۱۴-۲۰)

ابن کثیر نے بہت زیادہ تلاش و جستجو کے بعد حضرت ابوبکر سے منقول بہتّر احادیث جمع کی ہیں اور انھیں مجموعہ مسند صدیق کا نام دیا جاتا ہے۔ جلال الدین سیوطی کی علم تفسیر و احادیث پر کافی دسترس تھی۔ اس نے مجموعہ ابن کثیر کا سند کے اعتبار سے جائزہ لیا ہے اور ان کی تعداد کو اس نے ایک سو چار تک پہنچا دیا ہے۔ (تاریخ الخلفاء: ص ۸۶-۹۴)

حضرت علی علیہ السلام اور حضرت ابوبکرؓ کی علمی و سیاسی مشکلات

اُوپر جو بیان کیا گیا ہے، اس کے پیش نظر حضرت ابوبکر کے لیے علمی ہی نہیں بلکہ سیاسی مشکلات میں بھی اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ضرورت کے وقت حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کریں اور آپؑ سے مدد چاہیں اور یہ بات اس امر کی واضح دلیل ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کتابِ خدا، حدیثِ رسولؐ اور اسلام کے سیاسی مصالح کے بارے میں سب سے زیادہ باخبر اور ذی ہوش شخص تھے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں دو واقعے بیان کر رہے ہیں:

① اہلِ روم سے جنگ کرنے کے بارے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خود فرمان تھا، اسے نافذ کرنے میں حضرت ابوبکر کو تردد تھا اور اس سلسلے میں انھوں نے بعض صحابہ رسولؐ سے مشورہ بھی کیا۔ چنانچہ! ہر شخص نے اس سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا۔ بالآخر انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے مشورہ کیا اور رائے جاننا چاہی۔ آپؑ نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کو نافذ کیے جانے کی ترغیب دلائی اور مزید فرمایا:

اِن فَعَلتَ ظَفِرتَ "یعنی اگر آپ یہ اقدام کریں گے تو کامیاب ہوں گے"۔

خلیفہ نے بھی آپؑ کے کہنے پر عمل کیا۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۳۲)

۲ ایک شخص نے شراب پی رکھی تھی اور نشے کی حالت میں اسے خلیفہ کے رُوبرو لایا گیا۔ اس شخص نے کہا کہ مجھے علم نہ تھا کہ شراب پینا حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ اب تک میں نے اس ماحول میں پرورش پائی ہے جہاں شراب کو حلال سمجھا جاتا ہے۔ خلیفہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ چنانچہ انھوں نے ایک شخص کو حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں روانہ کیا اور کہا کہ اس مشکل کو حل فرمائیں۔ ①

جانشینی کا تعین

حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو خلیفہ بنانے کے لیے بہت زیادہ سعی و کوشش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ خلیفۂ اوّل کے بعد خلافت ان کو ملے اور حضرت ابوبکر نے بھی ان کی مرضی کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا۔ جس وقت بستر علالت پر وہ صاحب فراش تھے تو انھوں نے حضرت عثمان کو بلایا اور کہا، لکھو:

"یہ عہد نامہ ابوبکر جانشین رسولؐ کا مسلمانوں کے لیے ہے......"

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ حضرت ابوبکر پر غشی طاری ہوگئی۔ حضرت عثمان کو یہ گمان گزرا کہ شاید خلیفہ گزر گئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس عہد نامہ کی اس طرح تکمیل کی:

"حضرت ابوبکر نے اپنے بعد عمر بن خطاب کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے"۔

اسی اثناء میں حضرت ابوبکر کو ہوش آگیا اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ عثمان نے کیا لکھا ہے تو انھوں نے کہا:

"تم نے ٹھیک لکھا ہے اس معاملے میں میری اور تمھاری ایک ہی رائے

---

① کافی: ج ۲، حدیث ۱۶، ارشاد مفید: ص ۱۰۷۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس مسئلے کو اس طرح حل کیا کہ وہ شخص اسے عام لوگوں کے درمیان لے جائیں اور ان سے پوچھیں کہ کیا تم نے اس شخص کے سامنے اس آیت کی تلاوت کی ہے جس کی رُو سے شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے؟ اگر ان کا جواب مثبت ہو تو اس شخص پر حد جاری کی جائے ورنہ اس سے کہا جائے کہ وہ اپنے اس فعل سے توبہ کرے۔ خلیفہ نے ایسا ہی کیا اور اس شخص نے نجات پائی۔

ہے"۔(کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۴۲۵، تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۲۹، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۱۶۳)

حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں حضرت ابوبکر کے اس اقدام پر سخت تنقید کی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"عجیب بات ہے کہ وہ شخص جو زندگی میں لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ وہ میرا عذر قبول کریں اور (علیؑ کے ہوتے ہوئے) اس کو خلافت سے معذور رکھیں، خود مرتے وقت خلافت (کی دلہن) کا پلا دوسرے سے باندھ گیا"۔(اعیان الشیعہ: ج ۱، ص ۴۳۹، نہج البلاغہ: خطبہ ۱۳۶، بحار: ج ۹، ص ۵۰۱، مطبوعہ کمپانی)

قلمرو اسلام کی وسعت

حضرت عمر کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کو بہت سی فتوحات نصیب ہوئیں اور ایران و روم جیسی دو عظیم شہنشاہی حکومتوں کے دروازے ان پر کھل گئے۔ عراق میں مسلمانوں نے جس تیز سے پیش رفت کی، اس کے باعث انھیں یہ اُمید نظر آنے لگی کہ ساسانی حکومت کی اصل سرزمین بھی وہ حملہ کرسکیں گے۔ چنانچہ حضرت عمر نے ابوعبیدہ کو ایران کی فتح کے لیے فرمان دار مقرر کیا اور مثنی چونکہ عراق میں مقیم تھے انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ ابوعبیدہ کی اطاعت و پیروی کریں۔

ایران کے بادشاہ یزدجرد سوم نے اپنے سرداروں کو کثیر طاقت جمع کرنے کے بعد حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کی پیش رفت کو روکیں۔ اگرچہ اس کے سردار ہر چند لائق و جنگ جو تھے مگر وہ سب ایک دوسرے کے بعد یا تو قتل ہوئے یا انھوں نے لشکرِ اسلام سے صلح کرلی۔ ایرانی سرداروں میں بہمن جادویہ ہی ایسا سردار تھا جو مطیع و فرمانبردار نہ ہوا۔ چونکہ اس کی فوج ہاتھیوں کے لشکر سے آراستہ تھی جنھیں دیکھ کر عربوں کے گھوڑے بھڑک گئے۔ چنانچہ "جنگ جسر" میں ابوعبیدہ شہید ہوئے اور باقی لشکر نے پسپا ہو کر فرات کے پار جا کر پناہ لی۔

لیکن ایک سال بعد (۱۴ ہجری) میں سپاہِ اسلام نے مثنی کے زیر فرمان "بویب"[1] میں

---

[1] عراق میں کوفہ کے نزدیک ایک نہر ہے جو فرات سے نکلی ہے۔

سپاہِ ایران پر فتح پائی اور اس سے جنگِ جسر کی شکست کی تلافی ہوگئی۔

اس کے بعد جنگِ قادسیہ وقوع پذیر ہوئی۔ اس سے قبل کہ جنگ شروع ہو، ایرانی اور اسلامی افواج کے سپہ سالاروں (سعد وقاص اور رستم فرخ زاد) کے درمیان ایلچیوں کے ذریعے گفت وشنید ہوتی رہی۔ ایلچیوں کی اس ملاقات میں سپاہِ اسلام کے سپہ سالار نے بھی مطالبہ کیا کہ دو چیزوں میں سے ایک چیز قبول کی جائے۔ اسلام یا جزیے کی ادائیگی، لیکن رستم فرخ زاد جو بڑا خودسر سردار تھا، یہی کہتا رہا کہ جس وقت تک ہم تمھیں قتل نہ کردیں گے، دم نہ لیں گے۔

بالآخر چار دن کی جنگ کے بعد مسلمان فتح وکامرانی سے ہمکنار ہوئے اور اس طرح محرم ۱۴ ہجری میں ایران کے دروازے لشکرِ اسلام پر کھل گئے اور نورِ ایمان وتوحید نے اس سرزمین کو اپنی آمد سے منور کیا۔

دوسری طرف شہنشاہِ روم کی فوج نے یرموک میں اپنی شکست کے بعد دمشق میں پناہ لی اور اپنی اس شکست کی تلافی کرنے کی غرض سے اس نے عظیم فوجی طاقت جمع کی لیکن یہ لشکر بھی شکست سے دوچار ہوا اور مسلمانوں نے دمشق اور اُردن جیسے شہروں پر فتح پائی۔ ۱۷ ہجری میں مسلمانوں نے فلسطین کو بھی جو فوجی اور تاریخی لحاظ سے اہم شہر تھا، تسخیر کرلیا۔ ۱۹ ہجری میں عمرو عاص نے بحرِ احمر کو عبور کرکے مصر کی جانب رُخ کیا اور بابلیوں میں بازنطینی سپاہ سے مقابلہ ہوا۔ اس میں بھی لشکرِ اسلام کو کامیابی نصیب ہوئی۔ وہاں سے وہ عین الشمس اور روم کی جانب روانہ ہوا تاکہ شہنشاہِ روم کی رضایت حاصل کرکے اسکندریہ پہنچ جائے۔ چنانچہ چند ماہ کے محاصرے کے بعد اسکندریہ کو بھی فتح کرلیا اور اس طرح شمالی افریقہ کے لیے راستہ ہموار ہوگیا۔

فتوحات کی خوشخبریوں کے اثرات

مغایرت ومخالفت سے قطع نظر جو محرکات خلفاء کے زمانے میں ان فتوحات کے ذریعے مسلمانوں کو ہوئے اگر ان کا موازنہ ان جنگوں اور فتوحات سے کیا جائے جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ظہور پذیر ہوئیں تو اس نکتے کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ ان فتوحات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے باعث دربارِ خلافت کی شان وشوکت میں اضافہ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک طاقتور وفاتح فوج کو اعلیٰ مقاصد، حوصلہ مندانہ آمادگی، فنِ حرب وضرب سے واقفیت اور

فوجی تربیت جیسے عوامل و اُوصاف کا مجموعہ ہونا چاہیے مگر اس کا چنداں ربط و تعلق موجودہ سپہ سالاروں سے نہیں تھا۔

مسلمانوں کی فتح وکامرانی میں جو عوامل کارفرما تھے اور انھیں دو عظیم شہنشاہی حکومتوں سے قوت آزما ہونے کے لیے ترغیب دلاتے تھے۔ وہ پیغمبر اکرم ﷺ کی یہ خوش خبری تھی کہ مسلمان ایران اور روم جیسی سرزمینوں کو فتح کریں گے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر ایسے عوامل تھے جن سے مسلمانوں کی میدانِ جنگ میں حوصلہ افزائی ہوتی تھی، مگر ان کا تعلق کسی طرح بھی حکومت وقت سے نہ تھا بلکہ ان میں وہ شہرت و نیک نامی کے عناصر کارفرما تھے جو رسولِ اکرم ﷺ اور شیرِ خدا علی علیہ السلام جیسے پیشوایانِ اسلام نے اپنے کردار کے ذریعے قائم کیے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ خلیفۂ ثانی کے سیاسی و علمی مشورے

حضرت علی علیہ السلام خلیفۂ اوّل کی طرح خلیفۂ دوم کے بھی اہم مشکل کشا تھے اور ان کی بھی سیاسی و علمی مشکلات کو حل فرماتے تھے۔ یہاں ہم بطورِ مثال دو واقعات پیش کر رہے ہیں:

جنگِ قادسیہ میں سپاہِ ایران کی شکست کے بعد ایران کے بادشاہ یزدجرد نے فیروزان کی کمانڈری میں عظیم لشکر مرتب کیا تاکہ وہ آئندہ عربوں کے حملات کا سدِ باب کر سکے۔ کوفہ کے حاکم نے خط کے ذریعے تمام واقعات کی اطلاع خلیفہ کو دی۔

حضرت عمر مسجد میں آئے اور اصحاب سے مشورہ کیا کہ وہ مدینہ میں ہی رہیں یا اس علاقے میں پہنچ کر جو بصرہ وکوفہ کے درمیان واقع ہے، سپاہِ اسلام کی کمان سنبھالیں۔ حضرت عثمان اور طلحہ نے دوسرے نظریے کی تائید کی اور اس ضمن میں مزید کہا کہ آپ سردارانِ سپاہِ شام و یمن کو لکھیں کہ وہ آپ سے ملحق ہوں لیکن حضرت علی علیہ السلام نے ان دونوں کے نظریات کی مخالفت کی اور فرمایا:

> "وہ شہر جو حال ہی میں مسلمانوں کے تصرف میں آئے ہیں انھیں فوج سے خالی نہیں رہنا چاہیے کیونکہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ حبشہ کی فوج یمن پر اور روم کا لشکر شام پر قبضہ کر لے"۔

حضرت عمر کی پہلی تجویز کے بارے میں بھی آپؑ نے مشورہ دیا اور فرمایا:

> "اگر آپ مدینہ سے باہر چلے جائیں گے تو ممکن ہے کہ اطراف کے اعراب

اس موقع کا فائدہ اُٹھائیں اور یہاں کوئی فتنہ بپا کریں۔ اس کے علاوہ اگر آپ محاذِ جنگ پر پہنچیں گے تو دشمن جری ہو جائے گا کیونکہ جب عجمی سپاہی آپ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ عربوں کی جڑ و بنیاد یہی شخص ہے۔ اگر اس کو کاٹ ڈالیں تو سارا جھگڑا ہی پاک ہو جائے"۔

حضرت علی علیہ السلام کی بات سننے کے بعد حضرت عمر نے روانگی کے خیال کو ترک کر دیا اور کہا کہ قابلِ عمل رائے حضرت علی علیہ السلام کی ہے، مجھے انہی کی پیروی کرنی چاہیے۔

ایک شخص خلیفہ کے پاس آیا اور شکایت کی کہ میری بیوی کے یہاں شادی کے چھے ماہ بعد ولادت ہوئی ہے۔ عورت نے بھی اس بات کو قبول کیا۔ اس پر خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے سنگسار کیا جائے لیکن حضرت علی علیہ السلام نے حد جاری کرنے سے منع کیا اور فرمایا: "قرآن کی رُو سے عورت چھے ماہ پورے ہو جانے پر وضع حمل کر سکتی ہے کیوں کہ مدتِ حمل اور شیر خواری تیس ماہ معین ہے [1] اور دوسری آیت میں دودھ پلانے کی مدت دو سال بتائی گئی ہے [2] اور اگر تیس ماہ میں سے دو سال کم کر دیے جائیں تو مدتِ حمل چھے ماہ رہ جاتی ہے"۔

حضرت علی علیہ السلام کی منصفانہ گفتگو سننے کے بعد حضرت عمر نے کہا:

لَولَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ

"یعنی اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا"۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۰۲، کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۳۰۳، ۳۲۱)

بنی ہاشم کی گوشہ نشینی

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں بنی ہاشم اور حضرت علی علیہ السلام کے

---

① وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ (احقاف: آیت ۱۵) "اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ بڑھائی کے تیس مہینے ہوئے"۔

② وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ (سورۂ بقرہ: آیت ۲۳۳) "اور تم نہیں جانتے کہ جو شخص اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلوانا چاہے تو اس کی خاطر سے مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں"۔

ہواخواہوں کو عملی طور پر حکومت کے اہم عہدوں سے دور رکھا گیا اور یہ کوشش کی گئی کہ اس زمانے کے دل و دماغ سے اہل بیت علیہم السلام کے اعلیٰ اقتدار کو محو کر دیا جائے۔

اس کے مقابل اُموی گروہ بتدریج معاشرے کی رہبری مشنری میں اثر و رسوخ پیدا کرتا رہا۔

اس نظریے کے بہت سے تاریخی شواہد موجود ہیں جن میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت ابوبکر نے اس زمانے کے وسیع و عریض مملکت میں سے چھوٹا سا حصّہ بھی بنی ہاشم میں سے کسی کو نہیں دیا جبکہ شام کو سیاسی اہمیت حاصل ہونے کے باوجود ابوسفیان کے بیٹے معاویہ کے اختیار میں دے دیا تھا۔ (حوالہ سابق)

۲۔ محض چند لوگوں کی اس شکایت پر کہ عمار یاسرؓ ایک ضعیف انسان ہیں، خلیفہ دوم نے کوفہ کی گورنری سے انھیں معزول کر دیا اور مغیرہ کو گورنر مقرر کیا۔ چند روز بعد مغیرہ کی بھی شکایت پہنچی لیکن اس کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۵۵، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۱، ۳۳)

حضرت عمر اگرچہ ابوسفیان سے بہت زیادہ خوش نہ تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے اُموی خاندان کے افراد کو حد سے زیادہ سیاسی اُمور میں داخل نہیں ہونے دیا مگر اس کا میدان انھوں نے حضرت عثمان کے زمانہ خلافت میں ہموار کر دیا تھا۔ مثلاً حضرت عمر جانتے تھے کہ شوریٰ جس کی انھوں نے تشکیل کی ہے، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ حضرت عثمان کو خلیفہ منتخب کرلیا جائے گا۔ چنانچہ! اس نے خود بھی یہ بات کہہ دی تھی کہ اگر حضرت عثمان حاکم ہوئے تو وہ بنی اُمیہ کو لوگوں پر مسلط کردیں گے۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۵۸، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۱۸۶، ان ولی ابن ابی معیط و بنی أمیة علی رقاب الناس......)

احادیثِ نبویؐ کے لکھنے پر پابندی

جیسا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ حیات میں بیان کیا جاچکا ہے کہ آپؐ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں چاہا تھا کہ اُمت کے لیے ایک نوشتہ لکھ دیں تاکہ آپؐ کے بعد وہ گمراہ نہ ہو مگر حضرت عمر نے منع کیا اور کہا کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔

اس خیال کی پیروی کرتے ہوئے انھوں نے اپنے زمانہ خلافت میں حکم دیا کہ احادیث

پیغمبر ﷺ کو قلم بند نہ کیا جائے اور اگر انھیں حدیث لکھی ہوئی مل جاتی تو اسے ضبط کر کے جلا دیتے تھے۔ انھوں نے تمام شہروں میں یہ منادی کرا دی کہ اگر کسی کے پاس کوئی حدیث ہے تو وہ اسے نیست و نابود کر دے۔ (شیعہ در اسلام: ص ۱۱، منقول از کنز العمال، مقدمہ مراۃ العقول: ج ۱، ص ۳۰)

چنانچہ! قاسم بن محمد بن ابی بکر سے منقول ہے کہ حضرت عمر کے زمانے میں احادیث بہت زیادہ جمع ہو گئیں۔ جب ان کے پاس لائی گئیں تو حکم دیا کہ انھیں جلا دیا جائے۔ (طبقات ابن سعد: ج ۵، ص ۱۸۸، مقدمہ مراۃ العقول، ج ۱، ص ۲۹)

حضرت ابوبکر نے بھی اپنے زمانہ خلافت میں پانچ سو احادیث جمع کیں۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں: مجھ سے کہا کہ احادیث میرے پاس لاؤ۔ جب انھیں لایا گیا تو ان سب کو آگ لگا دی گئی۔ (شیعہ در اسلام: ص ۱۱)

چنانچہ! یہ روش عمر بن عبد العزیز کے دورِ خلافت تک جاری رہی۔ اس رویے کو اختیار کرنے کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ اگر عوام کی توجہ احادیث کی جانب رہے تو وہ قرآن سے دُور ہو جائیں گے درحالیکہ قرآن کا یہ ارشاد ہے:

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

"پیغمبر جو کچھ تمھارے لیے لائے ہیں اسے قبول کرلو اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز رہو"۔ (سورۂ حشر)

رسولِ اکرم ﷺ کی اطاعت کا امکان پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ احادیث جن میں بالخصوص اوامر و نواہی کے بارے میں آپؐ نے فرمایا ہے، وہ محفوظ رہنی چاہییں ورنہ کس طرح رسولؐ خدا کی اطاعت ہو سکے گی؟

بیت المال کی تقسیم میں خلیفہ کا رویہ

رسولِ خدا ﷺ کے عہد میں سپاہیوں اور حکومت کے کارکنوں کی تنخواہ مقرر نہ تھی بلکہ اخراجاتِ زندگی مالِ غنیمت کے ذریعے مہیا کیے جاتے تھے۔ اس کی تقسیم میں لوگوں کی سابقہ زندگی، عربوں کی نسلی فضیلت اور پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ قرابت داری کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔

خلیفہ اوّل کے زمانے میں بھی یہی طریقہ رائج رہا لیکن خلیفہ دوم کے زمانے میں اس طریقہ کار کو بدل دیا گیا۔ انھوں نے سپاہیوں اور حکومت کے کارکنوں کی تنخواہ کے لیے علیحدہ ادارہ قائم کیا اور اس کی تقسیم کے لیے نسل و نسبت کو معیار قرار دیا۔ ان کے درمیان میں عرب کو عجم پر، قحطان کے عرب کو عدنان کے عرب پر، مصر کو ربیعہ پر، قریش کو غیر قریش پر اور بنی ہاشم کو بنی اُمیہ پر برتری و فضیلت تھی اور انھیں بیش تر مراعات حاصل تھیں۔ ①

کچھ عرصہ گزرا تھا کہ ذخیرہ اندوزوں اور دنیا پرستوں نے اس طریقہ کار کی بدولت جس طرح بھی ممکن ہوسکتا تھا، مال جمع کرنا شروع کر دیا۔ وہ غلاموں اور کنیزوں کو خرید لیتے اور انھیں مختلف کاموں پر زبردستی لگا دیتے تا کہ ان کے لیے زندگی کی سہولتیں فراہم کرنے کے علاوہ ہر روز نقد رقم بھی اپنے آقاؤں کو لا کر دیں۔

خلیفۂ دوم کا قتل

فیروز ایرانی عرف ابولؤلؤ مغیرہ کا غلام تھا۔ وہ اپنی زندگی کے اخراجات پورے کرنے کے علاوہ مجبور بھی تھا کہ ہر روز دو درہم مغیرہ کو ادا کرے۔ اس نے ایک روز خلیفہ کو بازار میں دیکھا تو فریاد کی کہ اس کے آقا نے اس سے ہر روز دو درہم وصول کرنے کا جو بار اس پر ڈالا ہے، وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن خلیفہ نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا:

"تجھ جیسے ہنرمند اور ماہرِ فن شخص کے لیے اتنی مقرر کردہ رقم کوئی زیادہ نہیں۔ میں نے تو یہ سنا ہے کہ تُو ایسی چکی بنا سکتا ہے جو ہوا کے رُخ پر گردش کرتی ہے۔ کیا ایسی چکی تُو میرے لیے بھی بنا سکتا ہے؟"

فیروز کو چونکہ خلیفہ کی بے اعتنائی سے بہت تکلیف پہنچی تھی، اس نے کہا کہ میں ایسی چکی بنا

---

① مورخین نے سپاہیوں اور کارکنانِ حکومت کی تنخواہوں کے جو اعداد و شمار درج کیے ہیں، ان کی رقوم میں نمایاں فرق ہے، مثلاً: عباس بن عبدالمطلب کی سالانہ تنخواہ بارہ ہزار درہم تھی، جب کہ ایک مصری سپاہی کو سالانہ تنخواہ صرف تین سو درہم دی جاتی تھی۔ معاویہ اور ان کے باپ کی سالانہ تنخواہ پانچ ہزار درہم مقرر تھی جب کہ مکہ کے ایک عام باشندے کی تنخواہ جس نے مہاجرت نہیں کی تھی صرف چھ سو درہم تھی۔ ازواجِ پیغمبرؐ کو سالانہ تنخواہ، چار سو درہم ملتے تھے۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۵۳، کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۵۰۲)

سکتا ہوں جس کی مشرق و مغرب میں کہیں مثال نہ ملے گی۔ بالآخر ماہِ ذی الحجہ ۲۳ ہجری میں اس نے خلیفہ کو قتل کر دیا۔

کون سی شوریٰ؟

حضرت عمر نے جب موت کے آثار دیکھے تو انھوں نے چھے ایسے افراد کو جن سے ان کے بقول پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بہت خوش تھے، بلوا لیا۔ یہ چھے افراد تھے: حضرت علی علیہ السلام، عثمان، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن وقاص۔

حضرت عمر نے ہر ایک کی معنوی خصوصیت بیان کرنے کے بعد کہا:

"اگر میرے بعد خلیفہ مقرر کرنے کے سلسلے میں تم نے اتفاق رائے سے کام لیا تو تمھیں نیز تمھارے فرزندان کو درختِ خلافت کے میوے سے فیض پہنچے گا، ورنہ خلافت کی گیند کو معاویہ اُچک لے گا"۔

اس کے بعد انھوں نے ابا طلحہ کو کچھ ضروری نصیحتیں کیں اور مزید کہا:

"اگر پانچ افراد نے اتفاق رائے کیا اور ایک نے مخالفت کی، یا چار افراد ایک طرف ہو گئے اور دو شخص دوسری جانب، تو ایسی صورت میں جو اقلیت میں ہوں ان کی گردن اُڑا دینا۔ اگر دونوں فریق برابر ہوئے تو حق اس طرف جائے جس طرف عبدالرحمٰن ہوں گے...... اگر تین دن گزر جائیں اور کسی بھی مرحلے پر اتفاق رائے نہ ہو تو سب کو قتل کر دینا اور مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا کہ اس کے بعد وہ جسے بھی چاہیں خلیفہ مقرر کریں"۔ (خلاصہ شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۱۸۶)

حضرت عمر کے انتقال کے بعد طلحہ، زبیر اور سعد وقاص بالترتیب عثمان کی طرف جھک گئے اور حضرت علی علیہ السلام اور عبدالرحمٰن ایک طرف ہو گئے۔ عبدالرحمٰن نے بھی کنارہ کش ہو کر حضرت علی علیہ السلام کی جانب رُخ کیا اور کہا کہ میں اس شرط پر آپؑ کی بیعت کرتا ہوں کہ آپؑ کتابِ خدا، سنتِ رسولؐ اور شیخین کی روش پر عمل کریں گے۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

”میں کتابِ خدا اور سنتِ پیغمبر اکرم ﷺ اور اپنے اجتہاد کی بنیاد پر عمل کروں گا“۔

عبدالرحمٰن نے یہی بات حضرت عثمان کی جانب رُخ کر کے کہی تو حضرت عثمان نے ان کی اس شرط کو فوراً قبول کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے حضرت عثمان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور انھیں امیرالمومنین ہونے کی حیثیت سے سلام کیا۔ ①

مذکورہ شوریٰ کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا رویہ

جس وقت شوریٰ کے اراکین کا تعین ہوا تو حضرت علی علیہ السلام نے ابتدا ہی میں اس کے فیصلے سے باخبر کر دیا تھا اور عباس سے کہا تھا: عدلت عنا، یعنی ”ہمارے خاندان سے خلافت کا رُخ موڑ دیا گیا ہے“۔ انھوں نے دریافت کیا کہ آپؑ نے کیسے جانا تو آپؑ نے فرمایا: کیونکہ عثمان کو میرے مقابل لایا گیا ہے۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۶۷، شرح ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۱۹۱، تاریخ طبری: ج ۴، ص ۳۲۹)

جب شوریٰ کے نتیجے کا اعلان کیا گیا تو اس وقت بھی آپؑ نے فرمایا تھا:

حَتّٰی اِذَا مَضٰی لِسَبِيْلِهٖ جَعَلَهَا فِیْ جَمَاعَةٍ زَعَمَ اَنِّیْ اَحَدُهُمْ فَيَالِلّٰهِ وَلِلشُّوْرٰی مَتٰی اعْتَرَضَ الرَّيْبُ فِیَّ مَعَ الْاَوَّلِ مِنْهُمْ حَتّٰی صِرْتُ اُقْرَنُ اِلٰی هٰذِهِ النَّظَائِرِ لٰكِنِّیْ اَسْفَفْتُ اِذْ اَسَفُّوْا وَطِرْتُ اِذْ طَارُوْا فَصَغٰی رَجُلٌ مِنْهُمْ لِضِغْنِهٖ وَمَالَ الْاٰخَرُ لِصِهْرِهٖ مَعَ هَنٍ وَهَنٍ

”عمر نے اپنی موت کے بعد خلافت کو ایک جماعت میں محدود کر دیا اور مجھے بھی اس جماعت کا ایک رکن قرار دیا ہے۔ بھلا مجھے اس شوریٰ سے کیا تعلق ہے ان میں سے سب سے پہلے ہی کے مقابلہ میں میرے استحقاق میں کب شک تھا کہ جو اب اس قسم کے لوگوں میں شامل کر لیا گیا ہوں؟ وہ پرندہ کی طرح کبھی زمین پر چلتے تھے اور کبھی اڑنے لگتے تھے۔ مجبوراً میں نے بھی

① طبری کے قول کے مطابق (ج ۴، ص ۲۲۷) جس وقت مجلسِ مشاورت (شوریٰ) کی تشکیل ہوئی تو طلحہ مدینہ میں نہ تھے اور اس مجلس کی تشکیل باقی پانچ افراد نے کی۔

نشیب و فراز میں ان سے ہم آہنگی کی۔ ان میں ایک (عبدالرحمن ابن عوف)
تو کینہ توزی کی وجہ سے عثمان کی طرف چلا گیا، اور دوسرا (سعد وقاص) دامادی
اور بعض ناگفتہ باتوں کی وجہ سے اُدھر جھک گیا"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۳)

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اس بیان کے ذریعے اس مجلس مشاورت کے حقیقی چہرے کو بے نقاب کر دیا اور یہ بات واضح کر دی کہ آپ کا شمار کسی طرح بھی اس شوریٰ کے اراکین میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عثمان کے حق میں رائے دی، ان کی رائے غیر جانبدارانہ تھی بلکہ اس میں کینہ توزی اور قرابت داری جیسی ذاتی اغراض شامل تھیں اور جس وقت خلافت کے لیے فیصلہ کیا جا رہا تھا تو اس وقت یہ عوامل کارفرما تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کی شرکت اور اس کی وجہ

جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمر نے جس شوریٰ کی تشکیل کی تھی، اس کی ہیئت شروع سے ہی یہ بتا رہی تھی کہ اس کے ذریعے حضرت علی علیہ السلام کو امیر المومنین منتخب نہیں کیا جائے گا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام نے پہلے ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا تو آپؑ نے اس شوریٰ میں شرکت ہی کیوں فرمائی؟

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ان نکات کی جانب توجہ دلائی جائے جن میں بعض آپ ہی کے اقوال ہیں:

1. ابن عباس نے آپؑ سے کہا تھا کہ اس شوریٰ میں شرکت نہ کیجیے تو اس پر آپؑ نے یہ فرمایا کہ مجھے اختلاف پسند نہیں۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۶۶، انی اکرہ الخلاف.....)
2. قطب راوندی کے قول کے مطابق ابن عباس کے سوال کے جواب میں ہی آپؑ نے یہ فرمایا تھا:

"میں جانتا تھا کہ اس شوریٰ کی تشکیل کس نہج پر ہوئی ہے، اس کے باعث خلافت ہمارے خاندان سے چلی جائے گی، لیکن میں نے ان کی اس شوریٰ میں شرکت کی جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر نے مجھے خلافت کا اہل و شائستہ جانا لیکن اس سے قبل انھوں

نے ہی کہا تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نبوت اور امامت ایک جگہ جمع نہ ہوں۔ اب مَیں اس شوریٰ میں شامل کر لیا گیا ہوں تو چاہتا ہوں کہ ان (حضرت عمر) کے قول کی ان کی بیان کردہ روایت کی مخالفت کو واضح کر دوں"۔(شرح ابن ابی الحدید: ج۱،ص۱۸۹)

مذکورہ شوریٰ میں حضرت علی علیہ السلام کی عدم شرکت کے باعث فیصلہ کرنے کا اختیار عبدالرحمٰن کو ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر حضرت علیؑ مخالفت کرتے تو اس ہدایت کے مطابق جو حضرت عمر نے کی تھی، آپؑ کو قتل کروا دیا جاتا۔ اس اعتبار سے صحیح اور منطقی راہ وہی تھی جسے آپؑ نے پیشِ نظر رکھا۔

حضرت عثمان کی خلافت

خلیفۂ دوم کی وفات کے بعد حضرت عثمان نے زمامِ اُمور اپنے ہاتھوں میں سنبھالی۔ انھوں نے روزِ اوّل سے وہی راہ اختیار کی جس کا عمر کو خدشہ تھا۔ چنانچہ بتدریج اپنے قرابت داروں (بنی اُمیہ) کو اہم مناصب پر مقرر کرنا شروع کر دیا۔

اُنھوں نے اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ ابن عامر کو جس کی عمر ابھی پچیس سال ہی کی تھی بصرہ کا والی مقرر کر دیا اور اپنے ماموں ولید ابن عقبہ جیسے بدکار شخص کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شخص بحالتِ مستی مسجد میں داخل ہوا اور فجر کی نماز چہار رکعت پڑھا دی۔ نماز پڑھانے کے بعد اس نے اپنے مقتدیوں سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو مَیں مزید چند رکعت پڑھا سکتا ہوں۔

معاویہ کو حضرت عمر نے دمشق اور اُردن کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن حضرت عثمان نے ان میں حمص، فلسطین اور جزیرے کے علاقوں کا بھی اضافہ کر دیا اور اس کے لیے ایسے مواقع فراہم کر دیے، جس سے اس کے تسلط و اقتدار میں اضافہ ہو سکے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد کو مصر کا گورنر مقرر کیا۔ مروان بن حکم کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہر بدر کر دیا تھا مگر عثمان نے اسے اپنے حواریوں میں شامل کر کے اسے اپنا مشیر مقرر کر دیا۔

مختصر یہ کہ ان کی خلافت کے دوران قلیل عرصے میں ہی بصرہ، کوفہ، شام اور مصر جیسے چار عظیم صوبے جنھیں فوجی، اجتماعی اور اقتصادی اعتبار سے خاص اہمیت حاصل تھی، بنی اُمیہ کے زیرِ تسلط آ گئے اور وہ عرب خاندان جو صحابۂ رسولؐ کی نسلوں سے تھے، نیز دیگر افراد و قبائل حکومت

کے عہدوں سے محروم کر دیے گئے۔ اُموی دستے نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا اور شروع سے ہی اپنی وضع و حالت کو استحکام دینے سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

ابوسفیان نے حضرت عثمان کے دورِ خلافت کی ابتدا میں ہی اپنے قبیلے کے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا تھا:

"اے بنی اُمیہ! حکومت کو گیند کے مانند ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی جانب اُچھالتے رہو...... میری ہمیشہ یہی آرزو رہی ہے کہ حکومت تمھارے ہی ہاتھوں میں رہے اور تمھارے بچوں کو ورثے میں ملے"۔ ①

ابوسفیان کی نصیحت کے مطابق بنی اُمیہ اس پر کاربند ہو گئے کہ اُمورِ حکومت میں داخل ہو کر اپنے ان رسوخ کو وسیع کریں اور خلافت کو سلطنت میں تبدیل کر دیں تاکہ اسے اُموی خاندان کی میراث بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔ ②

مسلمانوں کا بیت المال

وہ کثیر دولت جو تازہ مفتوحہ علاقوں سے بطورِ خراج اور مالِ غنیمت خلافتِ اسلامیہ کے مرکز کی جانب کشاں کشاں چلی آ رہی تھی، ایسا طرۂ امتیاز بن گئی، جس نے خلیفۂ سوم کی حیثیت کو دیگر خلفاء سے علیحدہ کر دیا تھا۔ چنانچہ! خلیفہ نے خود ہی یہ امتیاز حاصل کر لیا تھا کہ اگر چاہیں تو وہ اس مال و دولت میں تصرف کر سکتے ہیں۔

قرابت دار، ہم قوم افراد، قریش کے امراء اور بعض اراکینِ مجلسِ مشاورت اس مال و دولت سے بخشش و بخشائش کے ذریعے فیض یاب ہو رہے تھے۔ اسلامی خلافت وسیع و عریض سرزمین پر صوبہ دار اور حکام بھی اسی راہ و روش پر عمل کر رہے تھے۔ (مروج الذہب)

چنانچہ! مسعودی لکھتا ہے:

---

① تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۶۵، شرح ابن ابی الحدید: ج ۳، ص ۱۹، مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۳۵، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۱۰۷۔

② مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۴۳، الاغانی: ج ۴، ص ۳۵۶۔ الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ یہ عبارت نقل کی ہے: یابنی أمیۃ القفوھا تلقف الکرۃ فوالذی یحلف بہ ابوسفیان مازلت ارجوھا لکم ولیصیرن الی صبیانکم وراثۃ۔

"جس وقت حضرت عثمان کا قتل ہوا تو اس وقت ان کے پاس ایک لاکھ پچاس ہزار سونے کے دینار تھے اور دس لاکھ درہم تھے۔ وادی القریٰ، حنین اور دیگر مقامات پر جو باغات تھے، ان کی قیمت کا تخمینہ ایک لاکھ سونے کے دینار لگایا گیا تھا۔ اُونٹوں کے گلّے اور گھوڑوں کے غول ان کے علاوہ تھے"۔ (مروج الذہب)

حاکمِ بصرہ بیت المال سے جو سونے اور چاندی کے سکّے نکال کر حضرت عثمان کے پاس لایا تھا، انھوں نے انھیں پیمانے سے ناپ ناپ کر خاندان بنی اُمیہ کی خواتین اور ان کے بچوں کے درمیان تقسیم کیے تھے۔ (شرح ابن ابی الحدید: ص ۲۲، الغدیر: ج ۱، ص ۱)

عبداللہ بن شرح کو پیغمبر اکرم ﷺ نے شہر بدر کر دیا تھا۔ فتح افریقہ کے بعد جب وہ واپس آیا اور وہاں سے مالِ غنیمت اپنے ساتھ لایا تو اس کی قیمت پچیس لاکھ بیس ہزار دینار تھی۔ حضرت عثمان نے یہ سارا مال اسے ہی بخش دیا۔ (شرح ابن ابی الحدید: ص ۲۲)

ایک روز اس نے حکم دیا کہ بیت المال سے دو لاکھ درہم ابوسفیان کو اور ایک لاکھ درہم مروان کو عطا کر دیے جائیں۔ ① اس کے علاوہ دیگر ایسے بہت سے مواقع پر جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ موصوف نے دل کھول کر داد و دہش سے کام لیا۔

حضرت علی علیہ السلام کے پند و نصائح

جس وقت لوگ اور بزرگ صحابی حضرت عثمان کی راہ و روش اور ان کے کارندوں کی زیادتیوں سے تنگ آگئے تو وہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس پہنچے اور شکایات کے ضمن میں یہ درخواست کی کہ وہ ان کے نمائندے کی حیثیت سے حضرت عثمان کے پاس جائیں اور کہیں کہ وہ لوگوں کو اپنے کارندوں کے شر سے نجات دلائیں۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام حضرت عثمان کے پاس تشریف لے گئے اور آپؑ نے نصیحت فرمائی۔ دورانِ گفتگو ان سے کہا:

"عثمان! خدا سے ڈرو اور اپنے اُوپر رحم کرو...... خدا کے بہترین بندوں میں وہ عادل پیشوا ہے جو خود ہدایت یافتہ ہو اور دوسروں کی بھی ہدایت

① نہج البلاغہ: خطبہ ۱۶۴۔ فلا تکون لمروان سیقۃ یسوقک حیث شاء بعد جلال السن وتقضی العمر

کرے..... مروان سے اتنے نہ دبو کہ وہ تمھیں اس پختہ عمر اور پیرانہ سالی میں جہاں چاہے لیے پھرے"۔

بعض صحابہ رسولؐ نے جب حضرت عثمان کی کارکردگی اور ان کے کارندوں کی زیادتیوں پر اعتراض کیا تو حضرت عثمان کا عتاب نازل ہوا۔ پیغمبر اکرم ﷺ کے جن بزرگ صحابہ سے انھوں نے ناروا سلوک کیا ان میں سے یہاں تین قابلِ ذکر ہیں:

حضرت ابوذرؓ نیک صالح بزرگ تھے۔ ان کا شمار پیغمبر اکرم ﷺ کے عظیم الشان صحابہ میں سے ہوتا تھا۔ حضرت عثمان نے انھیں شہر بدر کرکے ربذہ ① چلے جانے کا حکم دیا۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۲۲، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۱۱۳، تاریخ طبری: ج ۴، ص ۲۸۳)

یہی نہیں بلکہ یہ حکم جاری کردیا کہ رخصت کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ کوئی شخص نہ جائے۔ چنانچہ! جس وقت وہ روانہ ہوئے تو انھیں رخصت کرنے کے لیے حضرت علی علیہ السلام، آپؑ کے دو فرزند، حضرت عقیلؓ اور حضرت عمار یاسرؓ کے علاوہ اور کوئی شخص نہ تھا۔ (الغدیر: ج ۹، ص ۳، ۶، ۱۱۰، شرح ابن ابی الحدید: ج ۳، ص ۴۰)

حضرت عمار یاسرؓ اور عبداللہ بن مسعود اور بزرگ صحابہ رسولؐ پر بھی وہی حالت گزر گئی جس سے حضرت ابوذر دوچار ہوئے تھے۔ عبداللہ کے بارے میں ان کے غلاموں کو حکم دیا گیا کہ وہ انھیں خوب زدوکوب کریں۔ چنانچہ! انھوں نے موصوف کو اس بری طرح زمین پر پٹخا اور اتنا مارا کہ ان کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ بیت المال سے جو انھیں وظیفہ دیا جاتا تھا، وہ بھی منقطع کردیا گیا اور لوگوں کو منع کردیا گیا کہ کوئی ان کی عیادت کو نہ جائے۔ (الغدیر: ج ۹، ص ۱۱۳، شرح ابن ابی الحدید: ج ۳، ص ۴۷، الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۳۵، ۳۶)

حضرت عمار یاسرؓ نے جب یہ اعتراض کیا کہ بیت المال کو پانی کی طرح بہایا جارہا ہے اور حکومت کے عہدے نالائق افراد کو دیے جارہے ہیں تو ان پر بھی خلیفہ اور ان کے خدمت گاروں کا عتاب نازل ہوا جن کے باعث وہ مرضِ فتق میں مبتلا ہوگئے۔ (ان خطوط کے متون کتاب

---

① ربذہ کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ یہ جگہ بہت خشک اور سخت مقامات پر واقع تھی اور حضرت ابوذرؓ نے اپنے فقر کا بیشتر زمانہ اسی جگہ گزارا تھا، اسی لیے انھیں اس سے سخت نفرت تھی۔

الغدیر کی جلد ۹ میں مشاہدہ کریں)۔

خلیفۂ سوم کا قتل

بنی اُمیہ کو کارگاہِ خلافت و ولایت کے صدر اور اہم مقامات پر بروئے کار اور برسرِ اقتدار لانا، ان کا موقع سے ناجائز فائدہ اُٹھانا اور ان بزرگ ہستیوں کی جانب سے نکتہ چینی کیا جانا، جن کا شمار بزرگ صحابۂ رسولؐ میں ہوتا تھا، ایسے عوامل تھے جن کے باعث لوگ حضرت عثمان کے خلاف طیش و غضب میں آگئے اور انفرادی اعتراضات عوامی غم و غصے کا سبب بن گئے۔

عوامی غم و غصے کا مقابلہ کرنے کی غرض سے حضرت عثمان نے حاکمِ شام اور بصرہ کے گورنر عبداللہ بن سعد کو خط لکھا اور مخالفین کی سرکوبی کے لیے ان سے مدد چاہی۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۱۰۱، ۱۵۲، لا انزع قمیصا البسنیه الله)

مسلمین کو جب اس بات کی اطلاع ہوئی کہ خلیفہ نے اپنی راہ و روش پر تجدیدِ نظر کے بجائے ان کی سرکوبی کے اقدامات کرنا شروع کر دیے ہیں تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس قضیے کا فیصلہ ہی کر دیں۔ چنانچہ! اس غرض سے کثیر تعداد میں لوگ مصر سے اور کچھ لوگ کوفہ سے مدینہ پہنچے۔ مزید مہاجرین و انصار بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور سب نے مل کر حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔

اگرچہ! عوام کے نمایندگان اور خلیفہ کے درمیان بہت زیادہ کشمکش نیز کئی مرتبہ طولانی گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام نے خلیفہ کو چند نصائح بھی کیے اور حضرت عثمان نے ان پر کاربند رہنے کا وعدہ بھی کیا مگر انھوں نے نہ صرف یہ کہ انھیں عملی جامہ نہ پہنایا بلکہ جنگ و مقابلے پر اتر آئے اور اس بات پر اصرار کر کے کہ وہ پیراہن جو خداوندِ عالم نے مجھے پہنایا ہے میں اسے ہرگز نہ اُتاروں گا [1] اور خلافت سے برطرف ہونے کے احتمال کو مسترد کر دیا۔

حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ چالیس دن تک جاری رہا۔ اس دوران گھر کے اندر سے تیر چلتے رہے، جس میں رسولِؐ خدا کے ایک ضعیف العمر صحابی بھی شہید ہو گئے۔ عوام نے مطالبہ کیا کہ قاتل کو

---

[1] حضرت عثمان کے سانحۂ قتل کے بارے میں یہ کتابیں ملاحظہ ہوں: الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، الغدیر: ج ۹، شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، اور کامل ابن اثیر: ج ۳

ان کے حوالے کیا جائے مگر انھوں نے یہ بات نہ مانی۔ چنانچہ لوگوں نے ان کے گھر پر ہجوم بپا کر دیا جس کے باعث حضرت عثمان قتل ہو گئے (یہاں اس سانحہ کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے)۔

حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں حضرت عثمان کا قتل ①

نہج البلاغہ میں مجموعی طور پر سولہ مقامات پر حضرت عثمان کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبات میں ایک طرف تو خود کو اس حادثۂ قتل سے بری الذمہ قرار دیا ہے اور دوسری طرف انھوں نے خود کو حضرت عثمان کے مددگاروں میں بھی شامل نہیں کیا ہے بلکہ جن لوگوں نے ان کے خلاف شورش کی تھی، انھیں حضرت عثمان کے مددگاروں پر ترجیح دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ سانحۂ قتل آپ کی نظر میں مجموعی طور پر اسلامی مصالح ومنافع کے موافق وسازگار نہ تھا۔

بظاہر یہ اقوال اور موضوعات مختلف ومتضاد نظر آتے ہیں مگر ان میں اس طرح ہم آہنگی و مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے کہ:

> "حضرت علی علیہ السلام چاہتے تھے کہ حضرت عثمان اپنے طریقۂ کار سے دست بردار ہو جائیں اور اسلامی عدل کی صحیح راہ اختیار کریں اور اگر وہ اس پر کاربند رہنے سے انکار کریں تو عوام شورش کر کے انھیں برطرف کر دیں اور ضرورت پیش آجائے تو انھیں گرفتار بھی کرلیں تاکہ ان کی جگہ اہل خلیفہ برسرِ اقتدار آئے اور وہ ان کے دورِ خلافت کی بدعنوانیوں کی تفتیش کرے اور اس سے متعلق جو حکمِ خداوندی ہو اسے جاری کرے"۔

اس طرح حضرت علی علیہ السلام نے نہ تو حضرت عثمان کے قتل سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے اور نہ ہی ان کے خلاف شورش کرنے والوں کے رویے کی تائید کی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کی یہی کوشش تھی کہ خون نہ بہایا جائے اور شورش کرنے والوں کے جو جائز مطالبات ہیں انھیں تسلیم کیا جائے اور اس طرح حضرت عثمان اپنی راہ و روش پر تجدید نظر کریں یا خلافت سے برطرف ہو جائیں تاکہ یہ کام کسی ایسے شخص کے سپرد کیا جاسکے جو اس کا اہل و مستحق ہو۔

حضرت عثمان اور انقلابیوں کے درمیان جو تنازع ہوا اس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا

---

① اِسْتَأْثَرَ فَأَسَاءَ الْأَثَرَةَ وَجَزِعْتُمْ فَأَسَأْتُمُ الْجَزَعَ (نہج البلاغہ: خطبہ ۳۰)

فیصلہ یہ تھا کہ:

"حضرت عثمان نے ہر چیز کو اپنے اور اپنے عزیز و اقارب کے لیے مخصوص کر دیا تھا اور جو شیوہ انھوں نے اختیار کیا تھا، وہ پسندیدہ نہ تھا اور تم شورش کرنے والوں نے بھی عجلت و بے تابی سے کام لیا جو بری چیز ہے"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۱۶۴)[1]

جس وقت حضرت علی علیہ السلام فرد ثالث کی حیثیت سے انقلابیوں کے مطالبات حضرت عثمان کو بتا رہے تھے تو آپؑ نے اس تشویش کا اظہار فرمایا تھا کہ:

"ہو سکتا ہے کہ انھیں مسند خلافت پر قتل کر دیا جائے اور اگر ایسا ہوا تو مسلمانوں پر عظیم مصیبتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ چنانچہ اس ضمن میں آپؑ نے حضرت عثمان سے کہا کہ میں تمھیں قسم دلا کر کہتا ہوں کہ ایسا کوئی کام نہ کرنا جس کے باعث تمھارا شمار اُمت کے مقتول پیشواؤں میں ہو، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس اُمت کے ایک پیشوا کا قتل ہوگا اور اس کے بعد کشت و کشتار کے دروازے کھل جائیں گے"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۱۷۴: واللہ ما استعجل متجر بالطلب بدم عثمان الاخوفاً)

حضرت عثمان کے قتل کو بہانہ بنا کر طلحہ و زبیر نے لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام کے خلاف مشتعل کرنا چاہا تھا اسی لیے ایک موقعہ پر آپؑ نے انھیں حضرت عثمان کے قتل میں ملوث قرار دیا تھا اور فرمایا تھا:

"حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کی اس لیے جلدی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انھیں اس خون کا ذمہ دار قرار دیا جائے کیوں کہ ان پر الزام آ رہا تھا کہ انھیں سب سے زیادہ حضرت عثمان کے قتل کیے جانے پر اصرار تھا"۔

---

[1] انی انشدك الله الا تکون امام هذه الامة المقتول فانه کان یقال لیقتل فی هذه الامة امام یفتح علیها القتل والقتال الی یوم القیامة

حضرت علی علیہ السلام نے دو موقعوں پر حاکم شام کو سخت قصوروار قرار دیا کیونکہ حضرت عثمان کے قتل کو اس نے سازش نیز حضرت علی علیہ السلام کی اسلامی حکومت میں رخنہ اندازی کی غرض سے بطور آلۂ کار استعمال کرنا چاہا تھا، اس لیے اس قتل پر وہ بہت زیادہ رنج و افسوس ظاہر کر رہا تھا اور اپنے مفاد کی خاطر وہ مظلوم خلیفہ کے خون کا قصاص لینے کے لیے لوگوں میں اشتعال پیدا کر رہا تھا۔ ①

دو مواقع پر حضرت عثمان کے قتل کو حضرت علی علیہ السلام نے خود حضرت عثمان کے سہو اور غلط اندازی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ②

پچیس سالہ حکومتِ خلفاء کے دوران علیؑ کے کارنامے

حضرت عثمان کا قتل ۳۵ ہجری کے اواخر میں ہوا اور یہیں پر حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے چوتھے مرحلے کی تکمیل ہوئی۔ وہ خلافت کو چونکہ اپنا حق سمجھتے تھے، اسی لیے اس پچیس سالہ دور میں انھیں خلفائے ثلاثہ کی حکومت سے اختلاف بھی رہا۔ اس کے باوجود انھوں نے خلفائے وقت کی مدد، ہدایت اور تعلیم و اَحکام سے کوئی دریغ نہ کیا اور اسی طرح آپ نے عالمِ اسلام کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

اگرچہ گذشتہ اسباق میں ہم حضرت علی علیہ السلام کی بعض کارگزاریوں کے بارے میں واقفیت حاصل کر چکے ہیں لیکن یہاں ہم محض بطور یاددہانی ترتیب وار آپؑ کے اہم ترین کارناموں کا ذکر کریں گے:

① قرآن کی تفسیر، اس کی جمع آوری اور علمِ تفسیر میں بعض شاگردوں کی تربیت۔

② دانشورانِ عالم بالخصوص یہود و نصاریٰ کے سوالات کے جوابات اور ان کے شبہات کا ازالہ۔

③ ایسے واقعات جو اس وقت تک اسلام میں رُونما ہو چکے تھے ان کے اور بالخصوص قرآن

---

① اس سلسلہ میں نہج البلاغہ کا تیسرا حصّہ ملاحظہ ہو (سیری در نہج البلاغہ نامی کتاب، تالیف شہید استاد مطہریؒ کے صفحات ۱۶۵، ۱۷۵ سے بطور خلاصہ ماخوذ)

② یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی ولادت سے خلافت ظاہری تک کی زندگی کے حالات محقق گرانقدر استاد جعفر سبحانی کی کتاب "پژوهشی عمیق از زندگی علیؑ" اور دیگر معتبر کتب سے اخذ کیے گئے ہیں۔

وسنت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں احکامات بیان کرنا۔

۴ خلفاء کے سیاسی وعلمی مسائل حل کرنا اور ان کی جانب سے مشورہ کیے جانے پر ایسے نظریات پیش کرنا جوان کی مشکلات کو دُور کرسکیں۔

۵ اپنے پاک ضمیر اور روشن ذہن شاگردوں کی تربیت و پرورش کرنا جو سیر وسلوک کے لیے آمادہ رہیں۔

۶ بعض لاچار و مجبور انسانوں کی زندگی کے مخارج پورا کرنے کی سعی وکوشش کرنا۔

۷ ان لوگوں کی دل جوئی و پاسبانی جن پر حکامِ وقت کی جانب سے ستم روا رکھے جاچکے تھے۔

خلافت ظاہری سے شہادت تک

حضرت علی علیہ السلام کی بیعت

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد اپنے آیندہ کے ہادی و رہنما کا انتخاب کرنے کی غرض سے مہاجرین و انصار حضرت علی علیہ السلام کے گرد جمع ہو گئے۔ جو لوگ اس مقصد کے تحت حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے ان میں عمار یاسر، ابوالہیثم، ابوایوب انصاری، طلحہ اور زبیر جیسے صحابۂ رسولؐ پیش پیش تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کی خاطر آپؑ کے گھر کی طرف ایک جمِ غفیر روانہ ہوا۔ ان میں سب کا یہی اصرار تھا کہ اُمورِ خلافت کی لگام آپؑ سنبھالیں۔ انھوں نے یک زبان ہو کر کہا:

"اے ابوالحسن! حضرت عثمان قتل کر دیے گئے اور ہمیں اپنے ہادی و رہنما کی ضرورت ہے اور ہم آج آپ سے زیادہ کسی کو شائستہ و قابل نہیں سمجھتے۔ جن لوگوں نے دینِ اسلام قبول کیا آپ ان میں سب پر سبقت لے گئے اور دوسروں کے مقابل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپؑ ہی سب سے زیادہ نزدیک تھے"۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لا حاجة لي في امركم فمن اخترتم رضيت به

"مجھے تمھاری حکومت کی ضرورت نہیں۔ تم جسے بھی اپنا رہنما اختیار کرو گے میں بھی اس سے اتفاق کروں گا"۔

سب نے یک زبان ہو کر کہا: آپؑ کے علاوہ ہم کسی کو بھی نہیں چاہتے۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۱۹۰، تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۲۷، تاریخ ابی الفداء، ج ۱، ص ۱۷۱)

لوگوں کا اصرار جاری رہا مگر حضرت علی علیہ السلام کی جانب سے انھیں جواب نفی کی صورت میں ہی ملتا رہا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے بغیر حضرت کے گھر سے باہر نکل آئے۔

اگرچہ لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا مگر حضرت علی علیہ السلام کسی طرح بھی خلافت قبول کرنے کے لیے راضی ہی نہیں ہوتے تھے اور ہر بار یہی جواب دیتے کہ اس امر کے لیے تم لوگ مجھے مجبور مت کرو۔ "امیر بننے سے میرے لیے بہتر یہی ہے کہ وزیر رہوں"۔ ① لیکن انھوں نے بھی کہا کہ ہم اپنے اس فیصلے سے ہرگز رُوگرداں نہ ہوں گے اور آپؑ کے دستِ مبارک پر بیعت کریں گے اور ہر طرف سے بیعت کی خاطر آپ کے گرد ہجوم ہونے لگا۔

آپؑ کے گرد لوگ کس طرح جمع ہوئے اس کی کیفیت خود ہی بیان فرماتے ہیں:

"اچانک میرے گرد لوگوں کا ہجوم اس طرح ہو گیا کہ لگتا تھا گویا یہ انسان نہ ہوں بلکہ چرغ بجو کی گردن پر گھنے بال ہوں۔ اس ازدحام میں میرے بچے حسنؑ و حسینؑ بھی روندے گئے اور لوگوں کے اس ہجوم کے باعث میرا لباس بھی دو جانب سے چاک ہو گیا۔ لوگوں کی یہ حالت تھی گویا وہ انسان نہیں بلکہ ایسے مویشی ہیں جن کے سر پر گلے بان نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک میری طرف ہی چلا آرہا تھا۔ ②

لیکن اس کے بعد بھی حضرت علی علیہ السلام نے بلا قید و شرط حکومت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

"میں تمھیں کل صبح تک کی مہلت دیتا ہوں، اپنے اپنے گھر جاؤ اور اپنے فیصلے پر غور کر لو۔ اگر اس کے بعد بھی تم لوگ اپنے فیصلے پر قائم رہے تو تمھیں میری حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا اور تم مجھ سے یہ نہ چاہو گے کہ میں سابق خلفاء کی روش کا پیروکار رہوں۔ اگر یہ شرط منظور ہے تو کل صبح مسجد میں جمع ہو جانا، ورنہ تمھیں اختیار ہے کہ جسے چاہو اپنا خلیفہ مقرر کر لو"۔

---

① لا تفعلوا فانی اَکُون وزیرًا خیر من ان اَکُون امیرًا۔

② نہج البلاغہ: خطبہ ۳ شقشقیہ۔ فَمَا رَاعَنِي إِلَّا وَالنَّاسُ كَعُرْفِ الضَّبُعِ إِلَيَّ يَنْثَالُونَ عَلَيَّ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ حَتَّى لَقَدْ وُطِئَ الْحَسَنَانِ وَشُقَّ عِطْفَايَ مُجْتَمِعِينَ حَوْلِي كَرَبِيضَةِ الْغَنَمِ۔

اگلے روز لوگ مسجد میں جمع ہوئے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

"لوگو! کل جب ہم آپس میں جدا ہوئے تو اس وقت میری یہ کیفیت تھی کہ مجھے تمھاری حکومت سے بیزاری تھی جب کہ تمھارا یہ اصرار تھا کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا شخص تمھارے اُمور کی زمام نہ سنبھالے۔ یہ جان لو اگرچہ تمھارے مال (بیت المال مسلمین) میرے دستِ اختیار میں ہے مگر مجھے یہ حق نہیں کہ تمھارے بغیر اس میں سے ایک درہم بھی نکالوں۔ میں اسی صورت میں تم پر حکومت کر سکتا ہوں ورنہ تم میں سے کسی کی ذمہ داری قبول کرنے کو میں تیار نہیں"۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۲۸، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۱۹۳)

جس وقت حضرت علی علیہ السلام کی تقریر ختم ہوئی تو لوگوں نے بلند آواز سے کہا:

"ہم نے جو عہد کیا تھا، آج بھی اسی پر قائم ہیں اور خدا کو گواہ کر کے کہتے ہیں کہ ہم آپؑ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے لیے تیار ہیں"۔

اس کے بعد موجوں کے مانند لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا اور بیعت کے لیے اژدحام ہو گیا۔

سب سے پہلے طلحہ اور زبیر نے آپؑ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اس کے بعد ان لوگوں نے بیعت کی جو مصر، بصرہ اور کوفہ سے آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد عام لوگ اس سعادت سے سرفراز ہوئے۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۲۸، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۱۹۳)

بیعت کے بعد لوگوں میں سرور و شادمانی

حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے بعد لوگ انتہائی خوش و خرم تھے کیوں کہ انھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

بیعت کے بعد لوگوں میں جو باطنی خوشی و مسرت تھی اسے حضرت علی علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَبَلَغَ مِنْ سُرُوْرِ النَّاسِ بِبَيْعَتِهِمْ إِيَّايَ أَنِ ابْتَهَجَ بِهَا الصَّغِيْرُ وَهَدَجَ إِلَيْهِ الْكَبِيْرُ وَتَحَامَلَ نَحْوَهَا الْعَلِيْلُ وَحَسَرَتْ إِلَيْهَا الْكِعَابُ

"میرے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد لوگوں کی مسرت وشادمانی کا یہ حال تھا کہ بچے تک وجد وسرور میں آ گئے تھے۔ ضعیف العمر لرزتے ہوئے پیروں سے چل کر، بیمار دوسروں کے کاندھوں پر سوار ہو کر میرے پاس آئے اور جو لوگ معذور تھے، ان کے دلوں میں مجھ تک پہنچنے کی حسرت ہی رہ گئی"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۲۲۹)

عام لوگوں کی خوشی ومسرت کے علاوہ بعض بزرگ صحابہ رسولؐ ایک دوسرے کے بعد عوام میں تشریف لائے اور انھوں نے بھی تقاریر کے ذریعے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ اس ضمن میں انھوں نے عوام کو دعوت دی کہ وہ عہد وپیمان پر مضبوطی سے قائم رہیں اور نئی حکومت کو تقویت بخشیں۔ جن لوگوں نے اس موقع پر تقاریر کیں ان میں سے بعض کے نام درج ذیل ہیں:

① انصار کے نمائندہ ثابت بن قیس نے کہا: امیر المومنینؑ! خدا کی قسم، اگرچہ دوسرے لوگوں کو خلافت کے لحاظ سے آپؑ پر سبقت حاصل ہے لیکن دین میں وہ آپؑ پر برتری حاصل نہ کر سکے...... انھیں آپؑ کی ضرورت تھی لیکن آپؑ ان سب سے بے نیاز رہے۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۷۹)

② خزیمہ بن ثابت نے اس موقع پر کہا: امیر المومنینؑ! ہماری نظر میں آپؑ کے علاوہ کوئی ایسا نہیں جس کے ہاتھوں میں اپنے معاملات کی لگام دے سکیں۔ ایمان میں آپؑ کو سب پر برتری حاصل ہے۔ خدا شناسی میں آپؑ عارف کامل ہیں اور رسولؐ خدا کے مقامات ومراتب کے سب سے زیادہ حق دار آپؑ ہی ہیں۔ دوسروں میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں، وہ آپؑ میں بھی موجود ہیں لیکن جو فضائل وکمالات آپؑ کی ذات میں ہیں، ان سے وہ محروم ہیں۔ (حوالہ سابق)

③ صعصعہ بن صوحان نے فرمایا: امیر المومنینؑ! مقام خلافت نے آپؑ کی ذات کے ذریعے زینت ورونق پائی۔ خلافت کو آپؑ کی ضرورت ہے اور آپؑ کو اس کی ضرورت قطعی نہیں۔ (حوالہ سابق)

قریش کی وحشت و پریشانی

قریش اور حق سے رُوگرداں وہ تمام لوگ جنھوں نے حضرت عثمان کے عہدِ حکومت میں خاص مراعات حاصل کرلی تھیں، حضرت علی علیہ السلام کے دورِ خلافت میں بہت مضطرب و پریشان ہوئے۔ چنانچہ! ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ سرِ تسلیم خم کردیں۔ کیوں کہ اب رائے عامہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ تھی اور وہ لوگ کسی ایسی راہ پر گامزن نہیں رہ سکتے تھے جو اسلامی معاشرے کے منافی ہو۔ اسی لیے انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کرلی لیکن ان کے دلوں میں کدورت ابھی تک باقی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام کی تلوار نے بہت سے مشرکین قریش اور کفار کے سرتن سے جدا کیے تھے۔

اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت علی علیہ السلام کی حکمت عملی اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتی کہ بیت المال کو غارت کیا جائے۔

قریش کے دلوں میں حضرت علی علیہ السلام کے خلاف جو کینہ و دشمنی کے جذبات تھے، ان کے بارے میں ابن ابی الحدید لکھتا ہے:

> ''اگرچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے اس وقت تک کافی عرصہ گزر چکا تھا مگر قریش کے دلوں میں ان کے خلاف اس قدر بغض و کینہ تھا کہ کسی طرح کم نہیں ہوتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کینہ و عداوت کو انھوں نے اپنے بچوں کے ذہنوں پر نقش کردیا''۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۱۱، ص ۱۱۴)

گوشہ نشین لوگ

بعض لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے سے کنارہ کشی بھی کی۔ مسعودی نے انھیں قعاد (زمین گیر)[۱] اور ابوالفداء نے انھیں معتزلہ (گوشہ نشین)[۲] کے عنوان سے یاد کیا ہے۔ جب حضرت علی علیہ السلام سے ان کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

۱۔ شرح ابن ابی الحدید: ج ۱۱، ص ۱۱۴۔

۲۔ مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۳۔

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ حق کا ساتھ دیا اور نہ ہی باطل کی مدد کے لیے کھڑے ہوئے۔ [1] ان لوگوں میں سعد بن وقاص، عبداللہ بن عمر، حسان بن ثابت، کعب بن مالک، قدامہ بن مظعون، مغیرہ بن شعبہ اور دیگر چند افراد شامل تھے۔ [2] یہ لوگ اپنے اس فعل کی توجیہ کے لیے بے جا عذر و بہانے تراشتے تھے، مثلاً جب سعد بن وقاص سے بیعت کے لیے کہا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ جب تک سب لوگ بیعت نہ کرلیں گے میں بیعت نہیں کروں گا۔ [3]

یہ لوگ تو اچھی طرح جانتے تھے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام حق پر ہیں اور حق بھی ان کے ساتھ ہے۔ آپ کو ہر اعتبار سے دوسروں پر فضیلت و برتری حاصل تھی لیکن ان کی نخوت اور جسمانی ہوا و ہوس نے انھیں حق سے دُور کر دیا تھا۔ چنانچہ! امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور بیعت کے لیے مجبور نہ کیا۔ البتہ! ان میں سے چند لوگ بالخصوص سعد بن وقاص اور عبداللہ بن عمر بعد میں بہت پشیمان ہوئے۔

حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے امتیازات

حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت روزِ جمعہ بتاریخ پچیس ذی الحجہ ۳۵ ہجری انجام پذیر ہوئی۔ اس کے بعض امتیازات ہم یہاں بیان کر رہے ہیں:

۱. حضرت علی علیہ السلام نے مستقبل کی حکومت کے استحکام کی خاطر لوگوں کو یہ موقع دیا کہ آزادانہ طور پر اپنا رہبر منتخب کریں اور انھیں اتنی مہلت دیں کہ وہ اس کے بارے میں مکمل طور پر غور و فکر کرلیں تاکہ پورے شعور کے ساتھ وہ آیندہ کے لیے اپنے رہبر کا انتخاب کریں۔
۲. امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی بیعت عمومی تھی اور ایک عوامی تجویز کے طور پر پیش کی گئی

---

[1] تاریخ ابی الفداء: ج ۱، ص ۱۷۱۔

[2] استیعاب: ج ۳، ص ۵۵۔

[3] مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۳۔

تھی۔ اس کے برعکس گذشتہ خلفاء کے ہاتھ پر بیعت کا معاملہ عوامی تحریک پر مبنی نہ تھا بلکہ بقول حضرت عمرؓ:

"حضرت ابوبکر کی بیعت اتفاقی واقعہ تھا جو اچانک کسی پیش بندی کے بغیر حادثاتی طور پر رُونما ہوا اور صرف دو افراد (عمر اور ابوعبیدہ) کی تجویز پر اس مسئلے کو پیش کیا گیا"۔

حضرت عمر کو بھی عوام کی تجویز پر خلیفہ مقرر نہیں کیا گیا تھا بلکہ انھیں حضرت ابوبکر نے اس منصب پر مامور کیا تھا۔ حضرت عثمان کو بھی عوام کی تجویز پر خلیفہ منتخب نہیں کیا گیا تھا بلکہ چھے افراد پر مشتمل شوریٰ میں سے صرف دو افراد کی موافقت سے جسے خلیفہ ثانی نے منتخب کیا تھا، یہ کام انجام پذیر ہوا۔[1]

③ حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کو لوگوں نے خود قبول کیا اور یہ کام اس وقت عمل پذیر ہوا جب لوگوں نے پہلے سے اس مسئلے پر غور کر لیا تھا جبکہ سابقہ خلفاء نے عوام کو غور و فکر کرنے کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ ان کی سعی و کوشش یہ تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے یہ کام ختم ہو تاکہ تاخیر کے باعث اس میں موانع پیدا نہ ہوں۔

④ بیعت کے لیے جس جگہ کو مرکز بنایا، وہ مسجد تھی تاکہ تمام مسلمین اس میں شرکت کر سکیں اور اگر کسی کو کوئی اعتراض ہو تو اسے پیش کر دے۔ درحالیکہ گذشتہ خلفاء کی بیعت میں اس خصوصیت کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔

⑤ حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا گیا۔ چنانچہ جس وقت عبداللہ بن عمر کی بیعت کا مسئلہ سامنے آیا اور انھوں نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا تو مالک اشترؒ نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے کہا تھا کہ اگر آپؑ اجازت دیں تو ان کی گردن تن سے جدا کر دی جائے؟ حضرت علی علیہ السلام نے ان کی اس تجویز کو نہ صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے یہ ضمانت بھی دی کہ عبداللہ بن عمر کو کوئی شخص تکلیف و آزار نہ پہنچائے۔ (انساب الاشراف بلاذری: ج ۲، ص ۲۰۷، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۲۸)

---

[1] حضرت عثمان خود بھی مذکورہ شوریٰ کے رکن تھے اور انھوں نے خود بھی اپنی خلافت کے حق میں رائے دی تھی۔

سوالات کے جوابات

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جاچکا ہے اور نہج البلاغہ میں مندرج امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے خطبات سے بھی اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے اگرچہ لوگ آپؑ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کے لیے مصر تھے مگر آپؑ نے اس کام کے آغاز سے ہی خود کو کسی بھی پیش قدمی سے باز رکھا۔ (ملاحظہ ہو، خطبات ۷، ۱۳، ۲۲۹)

ممکن ہے یہ سوال پیش آئے کہ حضرت علی علیہ السلام اس کے باوجود کہ خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے اور برسر اقتدار آنے کے لیے شائستہ ترین انسان بھی تھے، نیز عوام آپؑ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کے لیے ہر طرف سے جمع ہو گئے تھے تو پھر عوام کے اصرار کے باوجود حضرت علی علیہ السلام نے شروع سے ہی منصب خلافت کو قبول کرنے سے کیوں منع فرمایا؟

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے لیے منصب خلافت قبول کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ حکومت کی ذمہ داریوں، نیز ان سے پیدا ہونے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو عاجز ناتواں سمجھتے تھے بلکہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ آپؑ اسلامی معاشرہ کی اجتماعی و معنوی کیفیت پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس کی بہت سی مشکلات آپؑ کے پیش نظر تھیں اس لیے آپؑ چاہتے تھے کہ لوگوں کا امتحان لیں تا کہ یہ اعلان ہو جائے کہ عوام آپؑ کی انقلابی روش کو برداشت کرنے کے لیے کس حد تک تیار ہیں اور ان کا جب مشکلات سے سامنا ہو تو وہ یہ نہ کہیں کہ امیر المومنینؑ نے انھیں صحیح حالات سے بے خبر رکھا اور ان کے انقلابی جذبات نیز جوش و خروش سے فائدہ اُٹھایا۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آپؑ نے عوام سے کہا تھا کہ:

دَعُوْنِیْ وَالْتَمِسُوْا غَیْرِیْ فَاِنَّا مُسْتَقْبِلُوْنَ اَمْرًا لَهٗ وُجُوْهٌ وَلَوْ اَنْ لَا تَقُوْمُ لَهُ الْقُلُوْبُ وَلَا تَثْبُتُ عَلَیْهِ الْعُقُوْلِ وَاِنَّ الْاٰفَاقَ قَدْ اَغَامَتْ وَالْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَکَّرَتْ

”آپ لوگ مجھے معاف رکھیں، یہ ذمہ داری کسی دوسرے شخص کے سپرد کر دیں کیونکہ جو مقصد میرے پیش نظر ہے اس میں اتنی زیادہ مشکلات ہیں کہ لوگوں میں انھیں برداشت کرنے کی طاقت اور انسانی عقول میں انھیں

قبول کرنے کی تاب ہی نہیں، بلکہ عالمِ اسلام کے اُفق پر ظلم و بدعت کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں اور اسلامی راہ و روش میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۹۲)

حضرت علی علیہ السلام نے کن مقاصد کے تحت حکومت قبول فرمائی

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شخص جسے حضرت علی علیہ السلام کے کردار و اخلاق اور طرزِ زندگی کے بارے میں ادنیٰ سی واقفیت ہے، اتنا تو جانتا ہی ہے کہ آپؑ جیسے بزرگوار شخص کی قطعی یہ آرزو و تمنا نہ تھی کہ لوگوں پر حکومت کریں اور منصبِ خلافت قبول کرنے میں ہرگز یہ مقصد کارفرما نہ تھا کہ مال و دولت، جاہ و ثروت اور حکومت و اقتدار حاصل ہو۔

آپؑ نے بھی گفتگو کے دوران کئی مرتبہ یہ بات لوگوں کے گوش گزار کر دی تھی۔ چنانچہ! حضرت علی علیہ السلام اور ابن عباس کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

"ابن عباس کہتے ہیں: بصرہ کے راستے میں واقع "ذی قار" نامی منزل پر حضرت علی علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی۔ آپؑ اپنی نعلین سی رہے تھے، اسے سیتے ہوئے آپؑ نے فرمایا کہ ان جوتیوں کی کیا قیمت ہوگی؟ میں نے عرض کیا: اب ان کی کیا قیمت رہ گئی؟۔ اس پر آپؑ نے فرمایا:

واللہ ھی احب الی من امر بکم الا ان اقیم حقًا او ارفع باطلًا۔

"یعنی خدا کی قسم! مجھے یہ نعلین تم پر حکومت کرنے سے کہیں زیادہ عزیز ہے، مگر یہ کہ حق کو قائم کروں اور باطل کا قلع قمع کر دوں"۔

اور ایک جملے میں تو آپؑ نے زمام داری کو گندے پانی اور ایسے لقمے سے تشبیہ دی ہے جو گلے میں پھنسا ہوا ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ھذا ماء آجن ولقمۃ یغص بھا آکلھا

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے خطبہ شقشقیہ کے آخر میں اس مقصد کی وضاحت فرمائی ہے کہ آپؑ نے زمام داری کو کیوں قبول فرمایا؟

اَمَا وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّۃَ وَبَرَأَ النَّسَمَۃَ لَوْلَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ وَقِیَامُ

الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ وَمَا اَخَذَ اللّٰهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ ان يُقَارُّوْا عَلٰى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَلَا سَغَبِ مَظْلُوْمٍ لَاَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلٰى غَارِبِهَا وَلَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَاْسِ اَوَّلِهَا (نہج البلاغہ: خطبہ ۳)

"قسم ہے اس خدائے پاک کی جس نے دانے کو چاک کیا اور انسان کی تخلیق کی! اگر لوگ کثیر تعداد میں میرے گرد جمع نہ ہو گئے ہوتے، ہم کاروں کی مدد سے حجت قائم نہ ہو گئی ہوتی اور اگر خداوند تعالیٰ نے علماء سے یہ عہد و پیمان نہ کیا ہوتا کہ ظالموں کی شکم پری اور مظلومین کی فاقہ کشی پر وہ خاموش نہ رہیں، تو میں خلافت کے شتر کی مہار کو اس کی کمر پر پھینک دیتا اور پہلے ہی جام میں اسے آخری جام کی طرح سیراب کر دیتا"۔

حضرت علی علیہ السلام کے ان اقوال سے واضح ہے کہ آپؑ نے دو اہم بنیادوں پر زمامِ حکومت سنبھالی۔ پہلی تو یہی کہ لوگ خود چل کر آپؑ کے پاس آئے اور یہ اعلان کیا کہ حکومت کی پشتیبانی کریں گے اور دوسری بنیاد یہ تھی کہ آپؑ عدل و انصاف برقرار کر کے ظلم و ستم کا سدِّ باب کرنا چاہتے تھے۔

ابتدائی اقدامات

جب آپؑ کو بیعت سے فرصت ملی تو آپؑ نے اعلان فرمایا کہ جن مقاصد کے تحت آپ نے حکومت کو قبول فرمایا ہے انھیں حقیقت کی شکل دیں گے۔ حضرت علی علیہ السلام نے جو سیاسی مسلک اور طریق کار اختیار کیا وہ کوئی ایسا اتفاقی امر نہ تھا جس کی تخلیق اسی روز کی گئی ہو بلکہ یہ ایسے دستور العمل کا مجموعہ تھا جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ و روش سے حاصل کیا گیا تھا اور اس کا سرچشمہ وحی و قرآن تھے۔

وہ کام جنھیں حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں اوّلیت حاصل تھی اور جنھیں فوراً ہی انجام دینا چاہتے تھے وہ ان تین حصوں پر مشتمل تھے: (۱) برتری و امتیازی سلوک کی برطرفی اور سب کے لیے مساوی حقوق کی ضمانت، (۲) تاخت و تاراج کیے ہوئے مال کو واپس کرنا (۳) بیت المال کی عادلانہ تقسیم۔

نیک اور صالح کارکنوں کا تقرر

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں حضرت عثمان کے حکام اور کارندوں کو برطرف کر دیا کیوں کہ ظلم و ستم اور اسلامی اصول نیز عوام کے تحفظ کی خاطر حضرت عثمان کے خلاف عمل کرنا بہترین حربہ تھا۔

مغیرہ بن شعبہ نے حضرت علی علیہ السلام سے گفتگو کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ پہلے حکام کو ان کے مناصب پر بحال و برقرار رکھا جائے لیکن حضرت علی علیہ السلام نے ان کی اس تجویز کو منظور نہ کیا اور فرمایا:

"خدا کی قسم! میں اپنے دینی فرائض کی انجام دہی میں سستی نہ کروں گا"۔

جن محرکات کے تحت حضرت علی علیہ السلام نے یہ اقدامات کیے ان کے بارے میں آپؑ دوسری جگہ فرماتے ہیں:

> "میں اس بات سے غمگین و اندوہناک ہوں کہ اس اُمت کی حکومت کے سرپرست بے خبر اور ناکارہ لوگ ہوں۔ وہ بیت المال کو تباہ کریں، بندگانِ خدا کو آزادی سے محروم کر کے انھیں اپنا غلام بنالیں۔ نیک و صالح لوگوں سے جنگ کریں اور فاسق و فاجر لوگوں کو اپنا یار و مددگار بنائیں۔ اس جماعت میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو شراب پیتے ہیں اور ان پر حد جاری کی جا چکی ہے۔ انھی میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اسلام اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک ان کے لیے کوئی عطیہ مقرر نہیں کیا گیا"۔ (نہج البلاغہ: مکتوب ۶۲)

حضرت علی علیہ السلام نے عثمان کے مقرر کردہ حکام کو برطرف کر کے ان کی جگہ نیک و صالح اور دور اندیش لوگوں کو مختلف صوبوں کی حکومتوں پر مقرر کیا۔ اس زمانے میں بصرہ، مصر اور شام کا شمار اسلامی قلمرو کے عظیم صوبوں میں ہوتا تھا، چنانچہ! آپؑ نے حضرت عثمان بن حنیف کو بصرہ کا، سہل بن حنیف کو شام کا، اور قیس بن سعد کو مصر کا صوبہ دار مقرر فرما کر ان مناصب سے سرفراز فرمایا۔ والیٔ کوفہ ابوموسیٰ اشعری کو مالک اشترؓ کے اصرار پر ان کے عہدے پر بحال رکھا۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۷۹)

معاویہ کی برطرفی

جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت عثمان کے حکام وعمال کو برطرف کرنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علی علیہ السلام چاہتے تھے کہ تباہی و فسادکاری کے خلاف محاذ قائم کر کے اجتماعی عدل و انصاف کی بنیادوں کو محکم و استوار کریں اور آپؑ چونکہ معاویہ کے نظر وفکر و کارکردگی سے بخوبی واقف تھے اسی لیے انھوں نے اس بات کی مخالفت کی کہ وہ حکومت کے کسی منصب پر برقرار رہے۔ اگرچہ ان کے چچازاد بھائی ابنِ عباس نے معاویہ کی سفارش بھی کی کہ اسے مختصر عرصے کے لیے ہی سہی اس کے عہدے پر بحال رکھا جائے لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اس سفارش کو بھی قبول نہیں فرمایا۔

جب مغیرہ کی یہ تجویز کارگر نہ ہوئی کہ سابقہ حکام کو ان کے عہدوں پر بحال رکھا جائے تو انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا کہ معاویہ کو شام کی صوبہ داری سے معزول نہ کیجیے کیوں کہ وہ گستاخ ہے اور شام کے لوگ اسی کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ حضرت عمر نے چونکہ اسے شام کا گورنر مقرر کیا تھا، لہٰذا آپؑ کے پاس بہانہ ہے۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: خدا کی قسم! میں اسے دو روز بھی کسی عہدے پر بحال نہ رکھوں گا۔ ①

جس وقت عباس کو مغیرہ کی تجویز کے بارے میں اطلاع ہوئی تو انھوں نے بھی امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں یہی عرض کیا کہ مجھے اس بات سے اتفاق نہیں کہ فی الحال آپؑ معاویہ کو اس کے منصب سے معزول کریں۔ جس وقت وہ آپؑ کے دستِ مبارک پر بیعت کرے گا اور آپؑ کا کام استحکام پذیر ہو جائے، اس کے بعد آپؑ اسے برطرف کیجیے۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: خدا کی قسم! تلوار کے علاوہ میں اسے کوئی اور چیز نہ دوں گا۔ ②

---

① لا واللہ لا استعمل معاویہ یومین ابداً (کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۱۹۷، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۳۳۱)

② لا واللہ لا اعطیہ الا السیف کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۱۹۳، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۴۳، مروج الذھب: ج ۲، ص ۳۵۶

حضرت علی علیہ السلام نے جو یہ روش اختیار کی اس کے بارے میں ان چند نکات کا بیان کر دینا ضروری ہے۔

۱ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام بخوبی واقف تھے کہ معاویہ کسی بھی صورت میں ان کے دست و مبارک پر ہرگز بیعت نہ کرے گا اور آپ کا حکم نہ مانے گا کیوں کہ جذبہ اقتدار پسندی و زراندوزی کے علاوہ قبائلی تعصب اور وہ دیرینہ دشمنی جو اس کے دل میں حضرت علی علیہ السلام کے خلاف تھی، اس راہ میں مانع و حائل تھی کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے نمایندے کی حیثیت سے کوئی خدمت انجام دے اور امر واقعی یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کے جذبہ کارکردگی و مقاصد کے درمیان متضاد تطبیق کا فاصلہ تھا اور اسی کے باعث دونوں کے مابین باہمی تعاون کا امکان نہ تھا۔

۲ اگر حضرت علی علیہ السلام نے کوئی ایسا فرمان جاری کر دیا ہوتا جس سے اس بات کی تائید ہوتی کہ وہ شام کی صوبہ داری پر بحال رہے تو اس بات کا امکان تھا کہ معاویہ اس فرمان سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی فرمانروائی کا پروانہ تصور کرتا اور اس طرح اسے شام میں پہلے سے کہیں زیادہ قدم جمانے کا موقع مل جاتا۔

۳ معاویہ جیسے استبداد پسند عمال اور دیگر مفسد کارندوں کی عملۂ خلافت میں موجودگی، ایسے عوامل تھے جن کے باعث مسلمین کے درمیان رنجش پیدا ہوئی اور انھوں نے حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کردی۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت چوں کہ حقوق سے محروم وستم دیدہ طبقات کی پناہ گاہ تھی، اسی لیے اگر اس میں معاویہ جیسے لوگ بر سر اقتدار رہتے تو اس بات کا امکان تھا کہ عوام میں دوبارہ غم و غصہ پیدا ہو جائے اور وہ اکثریت جو حضرت علی علیہ السلام کی طرف دار تھی، اسے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ذات اور اس حکومت سے جس کی آیندہ تشکیل کرتے، مایوسی ہوتی۔ چنانچہ! ان کے اور اس اقلیت کے درمیان جو حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کو بہر حال حجت تسلیم کرتے تھے، اختلاف پیدا ہو جاتا۔

مذکورہ بالا دلائل نیز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول یہ روایت کہ فرزندانِ اُمیہ پر حکومت حرام ہے، ایسے عوامل تھے جن کے باعث حضرت علیؑ نے معاویہ کو خط لکھ کر مطلع کیا کہ اسے اس

کے عہدے سے برطرف کر کے اس کی جگہ سہل بن حنیف کو شام کا صوبہ دار مقرر کیا جاتا ہے۔ ①

مساوی حقوق کی ضمانت

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام نے دورِ جاہلیت کے امتیازی سلوک کو قطعی طور پر باطل قرار دیا ہے مگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد عہد جاہلیت کی اس رسم کا بتدریج رواج ہونے لگا اور حضرت عثمان کے زمانہ خلافت میں اسے مزید فروغ ملا۔

حضرت علی علیہ السلام نے زمامِ حکومت اپنے اختیار میں لینے کے بعد عہد جاہلیت کے تمام امتیازی سلوک کو بالکل ختم کر دیا اور اس بات کی ضمانت دی کہ تمام مسلمانوں کے حقوق مساوی و یکساں ہیں۔ چنانچہ! اس بارے میں خود فرماتے ہیں:

> ”ذلیل (مظلوم وستم دیدہ) اس وقت تک میرے نزدیک عزیز وارجمند ہے جب تک اس کے حق کو ظالم سے نہ لے لوں، اور زورمند (ظالم وستم گر) اس وقت تک میرے نزدیک بُرا اور ناتواں ہے جب تک میں مظلوم کا حق اس سے حاصل نہ کرلوں“۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۳۷) ②

لوٹے ہوئے مال کی واپسی

حضرت علی علیہ السلام نے مالی اُمور میں بھی واضح و روشن راستہ اختیار کیا۔ اس سلسلے میں آپؑ کے سامنے دو اہم مسئلے تھے: پہلا تو یہی کہ حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں ایک مخصوص گروہ نے بہت دولت جمع کی تھی۔ دوسرا مسئلہ بیت المال کی تقسیم تھا۔

حضرت علی علیہ السلام نے آغاز خلافت میں جو خطبات دیے ان میں اپنی آیندہ کی راہ وروش کو واضح و روشن کر دیا ہے چنانچہ ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

> ”وہ اَراضی جو حضرت عثمان نے مخصوص افراد کو دے دی ہے اور وہ ثروت جو

---

① مذکورہ خط کا متن ان کتابوں میں ملاحظہ ہو: شرح ابن ابی الحدید: ج۱، ص ۲۳۰، ناسخ التواریخ: ج۱، ص ۳۸، انساب الاشراف بلاذری: ج ۲، ص ۲۱۱، سیرۂ ائمہ اثنا عشر: ج۱، ص ۳۴۲۔

② اَلذَّلِیْلُ عِنْدِیْ عَزِیْزٌ حَتّٰی آخُذَ الْحَقَّ لَهٗ، وَالْقَوِیُّ عِنْدِیْ ضَعِیْفٌ حَتّٰی آخُذَ الْحَقَّ مِنْهُ رَضِیْنَا

اس (حضرت عثمان) نے اپنے قرابت داروں میں تقسیم کردی ہے، اسے بیت المال میں واپس لا کر جمع کریں گے"۔

اس کے ساتھ ہی آپؑ نے عوام کو یہ یقین دلایا کہ بیت المال کی تقسیم میں مساوات سے کام لیں گے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبے کے ایک حصے میں یہ بھی فرمایا تھا:

"میں بھی تم میں سے ایک فرد ہوں اور سود و زیاں میں تمھارے ساتھ شریک ہوں۔ میں تمھاری رہبری سیرتِ محمدیؐ کے مطابق کرنا چاہتا ہوں اور آپؐ کے احکامات کو تم لوگوں کے درمیان نافذ و جاری کروں گا۔

یاد رکھو! ہر وہ جاگیر جو عثمان نے کسی کو دی اور جو بھی مال عوامی ملکیت میں سے کسی کو بخش دیا تھا، وہ واپس بیت المال میں لایا جائے گا۔ اس میں خواہ وہ رقم شامل ہو جس سے خواتین کو مہر ادا کیا گیا ہو اور خواہ اس سے کنیزیں خریدی گئی ہوں، کیوں کہ عدالت کا دروازہ وسیع ہے اور جس پر عدل و انصاف تنگ ہو گیا ہو، اس پر جور و ستم کا میدان اس سے کہیں زیادہ تنگ کر دیا جائے گا"۔ ①

اپنے دوسرے خطبے میں آپؑ نے فرمایا تھا:

"لوگو! یاد رکھو! تم میں سے جس کو دنیا نے نگل لیا ہے اور جنھوں نے املاک و کاشت کی زمین جمع کر لی ہے جن میں انھوں نے نہریں جاری کر دی ہیں، سواری کے لیے تیز رفتار گھوڑے حاصل کر لیے ہیں اور اپنے لیے خوبصورت کنیزیں خرید لی ہیں، انھوں نے اپنے اس رنگ و ڈھنگ سے رُسوائی و بدنامی مول لی ہے۔ انھیں میں اس لہو و لعب سے جس میں وہ غوطہ زن ہیں اگر نجات دلانا چاہوں اور تسلیم شدہ حق کے کنارے پر انھیں لانا چاہوں تو وہ میرے اس عمل پر غضب ناک نہ ہوں اور یہ نہ کہیں کہ ابی طالبؑ کے فرزند نے ہمیں ہمارے حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ تم سب ہی بندگانِ خدا ہو اور

① نورالحسین للمہدی شمس الدین: ص ۵۷، شرح ابن ابی الحدید: ص ۲۶۹، نہج البلاغہ: خطبہ ۱۵ (یہ قول مختصر ترمیم کے ساتھ نقل کیا گیا ہے)۔

بیت المال بھی خدا کا ہی مال ہے، یہ تم میں مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا"۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا کہ:

"میرے پاس بیت المال کا کچھ حصّہ موجود ہے۔ تم سب میرے پاس آکر اپنا حصّہ لے لو، چاہے عرب ہو یا عجم، وظیفہ دار ہو یا غیر وظیفہ دار"۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۷، ص ۳۷)

اس طرح حضرت علی علیہ السلام نے نہایت تیزی کے ساتھ قطعی طور پر ناروا عصبیت اور امتیازات کا خاتمہ کر دیا۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ایک اقدام سے اس جماعت کے اثر ورسوخ کا قلع قمع کر دیا جو حضرت عثمان کی خلافت کے دوران ابھری تھی۔ حضرت عثمان نے انھیں کثیر مال و دولت اور جاگیر سے نوازا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس مال و جاگیر کو بیت المال میں جمع کر دیا۔ ①

بدعنوانیوں میں ملوث دولت مندوں کی رخنہ اندازی

بیت المال کی مساویانہ تقسیم کے باعث محرومین اور مستضعفین کو جس قدر خوشی و مسرت ہوئی اتنا ہی صدمہ ان چند مغرور افراد کو پہنچا جنھیں جاہ طلبی کی ہوا و ہوس تھی۔ انھیں چند سال میں چوں کہ جور و ستم کر کے کئی گنا زیادہ تنخواہیں نیز وظائف لینے کی عادت ہوگئی تھی، اسی لیے حضرت علی علیہ السلام کی مساویانہ روش تقسیمِ مال سے جب وہ دوچار ہوئے تو انھیں سخت پریشانی ہوئی۔

ایک روز ولید بن عقبہ اس جماعت کے نمایندے کی حیثیت سے حضرت علی علیہ السلام کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے ابوالحسنؑ! اگرچہ ہم (بنی عبد مناف) بھی آپؑ کے بھائیوں میں سے اور آپؑ جیسے ہی ہیں لیکن آپؑ نے تو ہم پر ظلم وستم ہی بپا کر دیا۔ ہم اس شرط پر آپ کی بیعت کرنے کو تیار ہیں کہ وہ مال ومتاع جو ہم نے عثمان کے عہد خلافت میں جمع کیا ہے، وہ آپ ہم سے واپس نہ لیں

---

① اس واقعے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۳، شرح نہج البلاغہ خوئی: ج ۳، ص ۲۱۵، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۲۷۰، فی ظلال، نہج البلاغہ: ج ۱، ص ۱۳۰، شرح نہج البلاغہ بحرانی، ج ۱، ص ۳۲۶، اور سیرۃ الائمہ، مصنفہ علامہ سید محسن امین، ج ۱، جز دوم، ص ۱۱۔

اور ان کے قاتلوں کو ہلاک کردیں لیکن اگر ہمارے مفادات کو کوئی خطرہ ہوا اور آپؑ کے رویے سے ہم خوف زدہ ہوئے تو ہم آپؑ سے علیحدہ ہو کر شام کی جانب کوچ کر جائیں گے۔

یہ سن کر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں نے ظلم وستم کیا ہے (اور میرے اس اقدام کو ظلم وستم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے) تو یہ ظلم حق وانصاف کی جانب سے ہوا ہے اور یہ کہ وہ مال جو تمھارے پاس ہے اسے میں نظر انداز کردوں تو میں ایسا نہیں کرسکتا کیوں کہ حق خدا کو پامال ہوتے ہوئے دیکھ کر میں چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ اب یہ مال خواہ تمھارے چنگل میں ہو یا کسی اور شخص کے۔" ①

جب اس جماعت کے سردار کو یقین ہوگیا کہ وہ گفتگو یا دھمکی کے ذریعے اپنا مدعا حاصل نہیں کرسکتے تو انھوں نے اپنی پوری قوت سے حضرت علی علیہ السلام کی قائم کردہ نوبنیاد حکومت کی بیخ کنی شروع کردی اور اس کے خلاف برسرِ پیکار ہوگئے۔

اس بارے میں عمرو بن عاص نے معاویہ کو لکھا تھا کہ:

"جو بھی فیصلہ کیا ہے اس پر جلد ہی عمل کیجیے کیوں کہ جس طرح لکڑی کے اُوپر سے چھال اُتار لی جاتی ہے، ابی طالب کا فرزند اسی طرح اس مال و دولت کو جو تمھارے پاس ہے تمھارے تن سے اُتروائے گا"۔ ②

حکومت علیؑ کی مخالفت

حضرت علی علیہ السلام نے ایک خطبے میں حکومت کے مخالفین کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے: ③

---

① ما کنت صانعًا فاصنع اذ قشرك ابن ابی طالب من کل مال تملکه کما تقشر عن العصا لحاها، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۲۷۰، الغدیر: ج ۷، ص ۲۸۸۔

② نہج البلاغہ: خطبہ سوم، ملاحظہ ہو جس میں آپ فرماتے ہیں: فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْأَمْرِ نَكَثَتْ طَائِفَةٌ وَمَرَقَتْ أُخْرىٰ وَقَسَطَ آخَرُونَ۔ حضرت علی علیہ السلام سے قبل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی دشمنانِ اسلام کے بارے میں پیشین گوئی کردی تھی چنانچہ حضرت علیؑ سے آپؐ نے خطاب کرتے ہوئے ان کے نام بیان کیے تھے۔
یَا عَلِیُّ! سَتُقَاتِلُ بَعْدِی النَّاكِثِينَ وَالْقَاسِطِينَ وَالْمَارِقِينَ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۲۰۱)

اصحابِ جمل، جنھیں آپؑ نے ناکثین کے نام سے یاد کیا ہے۔
اصحابِ صفین، انھیں آپؑ نے قاسطین کہا ہے، اور
اصحابِ نہروان (خوارج) جو مارقین کہلائے ہیں۔

"ناکثین" کی ذہنی کیفیت یہ تھی کہ وہ انتہائی لالچی، زر پرست اور امتیازی سلوک روا رکھنے کے طرف دار تھے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے جہاں کہیں عدل و مساوات کا ذکر کیا ہے۔ وہاں آپؑ کی توجہ بیشتر اسی جانب رہی ہے۔

"قاسطین" کا تعلق طلقاء ① کے فرقے سے تھا۔ اس گروہ کی تشکیل میں بعض فراری، بعض حکومت سے ناراض اور حضرت عثمان کے کارندے شامل تھے۔ یہ لوگ ذہنی طور پر حیلہ گر اور نفاق پسند تھے۔ وہ لوگ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کا زوال چاہتے تھے تاکہ حکومت ان کے دست اختیار میں آجائے۔

تیسرے گروہ کی اخلاقی حالت یہ تھی کہ وہ ناروا عصبیت کے قائل تھے۔ ذہنی خشکی کو تقدس تصور کرتے تھے اور ان کی جہالت خطرناک حد تک پہنچ گئی تھی۔

یہاں ہم اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان گروہوں کا تعارف کراتے ہوئے ان کی حیثیت کا جائزہ لیں گے اور یہ بتائیں گے کہ ان میں سے ہر گروہ نے حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے خلاف کیا کارگزاریاں کیں۔

"ناکثین" طلحہ و زبیر کی عرصہ دراز سے یہ آرزو تھی کہ وہ اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے عالمِ اسلام پر حکمرانی کر سکیں۔ حضرت عثمان کے قتل کے بعد رائے عامہ حضرت علی علیہ السلام کی جانب اس بنا پر متوجہ ہوگئی کہ انھوں نے آپؑ کو ہی عہدۂ خلافت کے لیے شائستہ ترین انسان سمجھا۔ چنانچہ جب وہ لوگ اقتدار سے ناامید ہوگئے تو حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے لیے پیش پیش رہے اور بظاہر سب پر سبقت لے گئے۔

حضرت علی علیہ السلام کی بیعت میں سبقت لے جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ اپنے

---

① طلقاء وہ لوگ تھے جو فتح مکہ کے دوران مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے لیکن رسولِ خدا نے سب کو آزاد کر دیا تھا اور فرمایا تھا: اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔

اس اقدام سے خلیفۂ وقت کو اپنی جانب متوجہ کریں تا کہ اس طریقے سے وہ اپنے مقاصد تک پہنچ سکیں لیکن ان کی توقع کے خلاف امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ان کے ساتھ دیگر تمام مسلمین کی طرح یکساں سلوک روا رکھا اور اس طرح ان کی تمام حسرتوں پر پانی پھر گیا۔

یعقوبی نے لکھا ہے:

طلحہ اور زبیر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا: پیغمبرؐ خدا کے بعد ہم سے بہت زیادہ ناانصافی کی گئی ہے۔ اب آپؑ ہمیں خلافت کی مشنری میں شریک کر لیجیے۔

اس پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَنْتُمَا شَرِیکَانِ فِي الْقُوَّةِ وَالْاِسْتِقَامَةِ وَعَلَی الْعِجزِ....

"قوت و پائیداری میں تو تم میرے ساتھ شریک ہو ہی، شدائد اور سختیوں میں بھی تم میرے ساتھ رہو۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۷۹، ۱۸۰)

حضرت علی علیہ السلام کے اس اقدام سے یہ دونوں حضرات ایسے برگشتہ ہوئے کہ انھوں نے دستگاہِ خلافت سے عہد شکنی کا فیصلہ کر لیا اور آخر کار اس کا انجام جنگِ جمل کی صورت میں رُونما ہوا۔

برگشتگی کا دوسرا عامل یہ تھا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے بیت المال کو تمام مسلمانوں کے درمیان مساوی تقسیم کیا۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا یہ رویہ طلحہ اور زبیر کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے زبانِ اعتراض دراز کی اور بیت المال سے اپنا حصّہ بھی نہیں لیا۔

حضرت علی علیہ السلام نے انھیں اپنے پاس بلایا اور فرمایا:

کیا تم میرے پاس اس مقصد کے لیے نہیں آئے تھے کہ زمامِ خلافت کو میں اپنے دستِ اختیار میں لے لوں درحالیکہ مجھے اس کا قبول کرنا ناپسند تھا؟ کیا تم نے اپنی مرضی سے میرے ہاتھ پر بیعت نہیں کی؟

اس پر انھوں نے جواب دیا: ہاں! اس میں ہماری مرضی شامل تھی۔

یہ سن کر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: تو پھر تم نے مجھ میں کون سی بات دیکھی ہے جو اعتراض شروع کر دیا اور میری مخالفت پر اُتر آئے؟

انھوں نے جواب دیا: ہم نے اس اُمید پر بیعت کی تھی کہ خلافت کے اہم اُمور میں آپؑ کے مشیر رہیں گے۔ اب دیکھتے ہیں کہ آپؑ نے ہمارے مشورے کے بغیر بیت المال کو مساوی تقسیم

کر دیا۔ جو چیز ہماری رنجیدگی کا سبب ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آپؑ حضرت عمر کی روش کے خلاف جا رہے ہیں۔ وہ بیت المال کی تقسیم میں لوگوں کے سابقہ کارناموں کو ملحوظِ خاطر رکھتے تھے لیکن آپؑ نے اس امتیاز سے چشم پوشی کی جو ہمیں حاصل ہے۔ آپؑ نے ہمیں دیگر مسلمانوں کے برابر سمجھا ہے جب کہ یہ مال ہماری جانبازی کے ذریعے شمشیر کے بل پر حاصل ہوا ہے۔

یہ سن کر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اُمورِ خلافت میں مسئلہ مشورت کی بات یہ ہے کہ مجھے خلافت کی کب چاہ تھی۔ اس کی جانب آنے کی تم نے ہی مجھے دعوت دی تھی۔ مجھے چوں کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور ان کے منتشر ہو جانے کا خوف تھا، اسی لیے اس ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ جب بھی کوئی مسئلہ میرے سامنے آیا تو میں نے حکمِ خدا اور سنتِ پیغمبرؐ کی جانب رجوع کیا اور اس کا حل تلاش کر لیا۔ اسی لیے اس معاملے میں مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ البتہ اگر کسی روز ایسا معاملہ پیش آیا جس کا حل قرآن اور سنتِ پیغمبرؐ کے ذریعے نہ نکل سکے تو مجھے تمھارے مشورے کی ضرورت محسوس ہوگی تو تم سے ضرور مشورہ کروں گا۔

رہا، بیت المال کا مسئلہ تو یہ بھی میری اپنی خصوصی روش نہیں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں میں نے دیکھا ہے کہ آپؐ بیت المال کو مساوی تقسیم کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس مسئلے کے بارے میں بھی قرآن نے حکم دیا ہے کہ یہ کتاب اللہ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں کوئی غلط بات درج نہیں ہے۔ یہ کتاب ہمیں مساوات و برابری کی دعوت دیتی ہے اور اس نے ہر قسم کے امتیازی سلوک کو باطل قرار دیا ہے۔

یہ کہنا کہ بیت المال آپ کی شمشیر کے زور پر ہاتھ آیا ہے تو اس سے پہلے بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے جان و مال سے اسلام کی مدد کی ہے لیکن رسولِ خدا نے بیت المال کی تقسیم میں کسی کے ساتھ امتیازی سلوک روا نہ رکھا۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۷، ص ۴۰-۴۲)

طبری لکھتا ہے: جب طلحہ ہر قسم کے امتیازی سلوک سے مایوس و نا اُمید ہو گیا تو اس نے یہ مثل کہی کہ ہمیں اس عمل سے اتنا ہی ملا ہے جتنا کتے کو سونگھنے سے ملتا ہے۔[1]

---

[1] مَا لَنَا مِن هٰذَا الاَمرِ اِلَّا كَحَسَّةِ أَنفِ الكَلبِ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۲۹)

ایک طرف تو طلحہ اور زبیر اس بات سے مایوس و نا اُمید ہو گئے کہ انھیں کوئی مقام و مرتبہ ملے گا اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جائے گا اور دوسری طرف انھیں یہ اطلاع ملی کہ حضرت عائشہ نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف مکہ میں پرچم لہرا دیا ہے۔ چنانچہ! انھوں نے فیصلہ کیا کہ مکہ کی جانب روانہ ہوں۔ اسی لیے حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ ہم عمرہ کے لیے آپؑ کی اجازت کے خواہاں ہیں۔

ان کے جانے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دوستوں سے فرمایا:

"خدا کی قسم! ان کا ارادہ ہرگز عمرہ کا نہیں بلکہ ان کا مقصد عہد شکنی اور خیانت ہے"۔ ①

موقف میں تبدیلی

حضرت عائشہ کو پہلے دو خلفاء کے دور میں جو مراعات حاصل تھیں، ان سے وہ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں محروم کر دی گئیں۔ چونکہ وہ ان کی حکومت سے عاجز و پریشان تھیں، اسی لیے انھوں نے حضرت عثمان کے خلاف پرچم شورش لہرا دیا۔ نیز زورِ بیان اور اپنی رفتار کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں کو خلیفہ وقت کے خلاف شورش و سرکشی کی دعوت دی۔ ②

شعلۂ شورش کو ہوا دینے کے باعث وہ خود کو اپنے مقصد میں کامیاب محسوس کر رہی تھیں۔ اسی لیے وہ مکہ کی جانب روانہ ہو گئیں اور ہر لمحہ حضرت عثمان کے قتل نیز مسلمین کا طلحہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا انتظار کرنے لگیں۔

جس وقت حضرت عثمان کے قتل کی خبر انھیں ملی تو انھوں نے کہا:

"خدا اس کو غارت کرے اپنے ان کرتوتوں سے ہی تو مارا گیا، خداوند تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتا"۔ ③

حضرت عثمان کے قتل کے بعد انھوں نے مسلمانوں سے کہا:

---

① واللہ ما اراد العمرۃ ولکنہما ارادا الغدرۃ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۸۰)

② حضرت عثمان کے خلاف حضرت عائشہ کے اقوال واقدامات کے لیے ملاحظہ ہو: الغدیر: ج ۹، ص ۷۷-۸۶

③ بعدہ اللہ بما قدمت یداہ وما اللہ بظلام للعبید (الغدیر: ج ۹، ص ۸۳)

"وہ عثمان کے مارے جانے کے باعث پریشان خاطر نہ ہوں، اگر وہ مارے گئے تو کیا ہوا، مقامِ خلافت کے لیے بہترین اور لائق ترین شخص طلحہ تو تمھارے درمیان موجود ہیں، ان کے ہاتھ پر بیعت کرو اور تفرقہ سے دُور رہو"۔

اپنے اس بیان کے بعد وہ بڑی تیزی سے مدینہ کی جانب روانہ ہوئیں۔ انھیں اطمینان تھا کہ حضرت عثمان کے بعد منصبِ خلافت طلحہ کے ہاتھ آجائے گا۔ اسی لیے راستے میں خود ہی گنگنا رہی تھیں:

"میں گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں کہ لوگ طلحہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں، میری سواری کو تیز ہانکو، تاکہ میں ان تک پہنچ جاؤں"۔ (الغدیر: ج ۹، ص ۸۲۔ ابومخنف، لوط بن یحییٰ الازدی سے منقول)

عبید بن اُمِ کلاب مدینہ سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں ان سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے مدینہ کی حالت ان سے دریافت کی تو عبید نے ان سے کہا: "عوام نے حضرت عثمان کو قتل کردیا۔ آٹھ روز تک وہ یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ کیا کریں"۔

حضرت عائشہ نے دریافت کیا: اس کے بعد کیا ہوا؟

انھوں نے کہا: الحمدللہ! کام بحسن وخوبی تمام ہوا اور مسلمانوں نے ایک دل اور ایک زبان ہوکر علی ابن ابی طالبؑ کو منتخب کرلیا۔

حضرت عائشہؓ نے یہ خبر سننے کے بعد کہا: "خدا کی قسم! اگر خلافت کا فیصلہ حضرت علی علیہ السلام کے حق میں ہوا ہے تو اب آسمان زیر وزبر ہوجائیں گے۔ مجھے یہاں سے واپس لے چلو۔ فوراً مجھے یہاں سے لے چلو"۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۰۶، تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۴۸، الغدیر: ج ۹، ص ۸۰-۸۲، انساب الاشراف: ج ۲، ص ۲۱۷)

چنانچہ وہ وہیں سے مکہ کی جانب روانہ ہوگئیں لیکن اب انھوں نے اپنا نظریہ بدل دیا تھا اور یہ کہہ رہی تھیں کہ: "عثمان بے گناہ مارا گیا، میں اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے سرکشی کروں گی"۔

عبید نے ان سے کہا: ان کے خون کا مطالبہ آپ کیسے کر سکتی ہیں، کیوں کہ وہ آپ ہی تو ہیں جنھوں نے سب سے پہلے حضرت عثمان کے قتل کیے جانے کی تجویز پیش کی اور آپ ہی تو کہا کرتی تھیں کہ "نعثل کو قتل کر دو کیونکہ وہ کافر ہو گیا ہے" اور آج آپ ہی انھیں مظلوم و بے گناہ کہہ رہی ہیں؟

حضرت عائشہ نے کہا: "ہاں! عثمان ایسا ہی تھا لیکن اس نے توبہ کر لی تھی اور لوگوں نے ان کی توبہ کی طرف سے بے اعتنائی کی اور انھیں قتل کر دیا۔ اس کے علاوہ میں نے کل جو کچھ کہا تھا تمھیں اس سے کیا سروکار؟ میں آج جو کہہ رہی ہوں تم اسے مانو کیوں کہ میری آج کی رات کل سے بہتر ہے"۔ ①

مکہ پہنچنے کے بعد حضرت عائشہ مسجد الحرام کے سامنے محمل سے اُتریں اور پوری ستر پوشی کے ساتھ وہ حجر الاسود کی جانب روانہ ہوئیں۔ لوگ ان کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔

حضرت عائشہ نے ان کے سامنے تقریر کی اور کہا: عثمان کا خون ناحق ہوا ہے۔ انھوں نے اہل مدینہ اور دوسرے لوگوں کے جذبات کو ان کے خلاف جنھوں نے حضرت عثمان کے قتل میں حصہ لیا تھا برافروختہ کیا اور حاضرین سے کہا کہ وہ عثمان کے خون کا بدلہ لیں اور قاتلوں کے خلاف شورش کرنے کی دعوت دی۔ (تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۴۸، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۰۷، انساب الاشراف بلاذری: ج ۲، ص ۲۱۸)

مکہ میں مخالفین کا جمع ہونا

مکہ میں حضرت عائشہ نے جیسے ہی حضرت علی علیہ السلام کے خلاف پرچم لہرا دیا تو آپؑ کے

---

① عبید نے حضرت عائشہ کے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

فمنك البدء ومنك الغير ... ومنك الرياح ومنك المطر
وانت امرت بقتل الامام ... وقلت لنا انه قد كفر
فهبنا اطعناك فی قتله ... وقاتله دوننا من امر

"یعنی ان اختلاف کا سرچشمہ اور تغیرات کا باعث تم ہی تو ہو۔ تمھاری وجہ سے سخت طوفان اور فتنے بپا ہوئے۔ تم نے ہی عثمان کے قتل کا حکم دیا اور کہا کہ وہ کافر ہو گیا ہے۔ اب بالفرض ہم نے تمھاری اطاعت کی خاطر اس قتل میں حصہ لیا تو اصل قاتل وہ ہے جس نے اس قتل کا حکم دیا"۔ (الامامة والسیاسة: ج ۱، ص ۵۱، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۵۸، ۴۵۹)

مخالفین ہر طرف سے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ طلحہ و زبیر بھی حضرت علی علیہ السلام سے عہد شکنی کر کے ان کے ہمنوا ہو گئے۔ دوسری طرف بنی اُمیہ حضرت علی علیہ السلام کے ایک زمانے سے دشمن چلے آ رہے تھے اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے اور حضرت عثمان کے قتل کے بعد وہ مدینہ سے فرار کر کے چونکہ مکہ پہنچ گئے تھے، اس لیے وہ بھی حضرت عائشہ کے زیر پرچم آ گئے۔ اس طرح حضرت عثمان کے زمانے کے وہ تمام والی و صوبہ دار جنھیں حضرت علی علیہ السلام نے معزول کر دیا تھا وہ سب حضرت عائشہ کے ساتھ ہو گئے۔ مختصر یہ کہ وہ تمام مخالف گروہ جنھیں حضرت علی علیہ السلام سے پرخاش تھی، مکہ میں جمع ہو گئے اور اس طرح ناکثین کی تحریک کا اصل بیج یہاں بویا گیا۔ مخالف گروہوں کے سردار حضرت عائشہ کے گھر میں جلسات کی تشکیل کر کے شورش و سرکشی کی طرح اندازی پر بحث و گفتگو کرتے۔

حضرت عائشہ نے کہا: اے لوگو! یہ عظیم حادثہ ہے جو رُونما ہوا ہے اور جو واقعہ رُونما ہوا ہے وہ قطعی ناپسندیدہ ہے۔ اٹھو اور اپنے مصری بھائیوں سے مدد طلب کرو۔ شام کے لوگ بھی تمھارا ساتھ دیں گے، شاید اس طرح خداوند تعالیٰ حضرت عثمان اور دیگر مسلمانوں کا بدلہ دشمنوں سے لے۔

طلحہ و زبیر نے بھی اپنی تقاریر کے دوران حضرت عائشہ کی حضرت علی علیہ السلام کے خلاف جنگ کرنے میں حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ وہ مدینہ سے رخصت ہو کر ان کے ساتھ چلیں۔

جب انھوں نے حضرت عائشہ کے جنگ میں شریک ہونے کی رضامندی حاصل کر لی اور حضرت عائشہ نے بھی اس تحریک کی قیادت سنبھال لی تو یہ گروہ حضرت عمر کی اور پیغمبر اکرم کی زوجہ، حفصہ کی جانب گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے عائشہ سے اتفاق رائے ہے اور میں ان کے تابع ہوں اگرچہ انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ حضرت عائشہ کے ہمراہ چلیں مگر ان کے بھائی عبداللہ اس روانگی میں مانع ہوئے۔ (تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۵۱، کامل ابن اثیر: ج ۳، ۲۰۸، تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۸۱، انساب الاشراف: ج ۲، ص ۲۲۱)

سپاہ کے اخراجات

حضرت عثمان نے جو رقم اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دی تھی اور وہ کثیر دولت جو ان کے پروردوں کے ہاتھ آئی تھی، وہ سب اسی مقصد کے لیے استعمال کی گئی۔ چنانچہ! بصرہ کے معزول

گورنر عبداللہ بن عامر اور حضرت عثمان کے ماموں زاد بھائی نے سب سے پہلے حضرت عائشہ کی دعوت کو قبول کیا اور اپنا بہت سا مال انھیں دے دیا۔ حضرت عثمان کا معزول کردہ یمن کا گورنر یعلی بن اُمیہ نے بھی اپنی کثیر دولت جس میں چھے ہزار درہم اور چھے سو اُونٹ شامل تھے، اس فتنہ پرور لشکر کے حوالے کر دیے۔ ① اور اس لشکر ناکثین کے اخراجات فراہم کیے۔

عراق کی جانب روانگی

"ناکثین" کی سعی و کوشش سے مسلح لشکر فراہم ہوگیا۔ سرداران سپاہ نے اس بات پر غور کرنے کے لیے کہ جنگی کارروائی کہاں سے شروع کی جائے، آپس میں مشورہ کیا اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ عراق کی جانب روانہ ہوں اور کوفہ و بصرہ جیسے دو عظیم شہروں کے باشندوں سے مدد لیں کیوں کہ طلحہ اور زبیر کے بہت سے خیر خواہ وہاں موجود تھے اور اس کے بعد وہاں سے اسلامی حکومت کے مرکز پر حملہ کریں۔

اس فیصلے کے بعد حضرت عائشہ کے منادی نے مکہ میں جگہ جگہ اعلان کیا: اُم المومنین اور طلحہ و زبیر کا ارادہ بصرہ جانے کا ہے۔ جس کسی کو اسلامی حمیت کا پاس ہے اور حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہے تو وہ ان کے ساتھ شریک ہو جائے۔

جب ہزار آدمی ضروری سامانِ جنگ کے ساتھ جمع ہو گئے تو انھوں نے مکہ سے عراق کی جانب کوچ کیا۔ راستے میں ان کے ساتھ بہت سے لوگ شامل ہونے لگے، یہاں تک کہ ان کی تعداد تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ (تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۵۱-۴۵۲)

حضرت عائشہ اپنے مخصوص عسکر نامی شتر پر سوار لشکرِ سپاہ کے پیش پیش تھیں اور بنی اُمیہ ان کے اطراف میں چل رہے تھے اور سب کا ارادہ بصرہ پہنچنا تھا۔ راہ میں جو حادثات رُونما ہوئے ان میں سے ہم یہاں ایک کے بیان پر ہی اکتفا کرتے ہیں:

> "راستے میں انھیں جہاں پہلی جگہ پانی نظر آیا وہاں ان پر کتوں نے بھونکنا اور بھکنا شروع کر دیا۔ حضرت عائشہ نے دریافت کیا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟

---

① کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۰۸، تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۸۱ لیکن طبری کی تاریخ: ج ۴، ص ۴۵۰-۴۵۱ پر یعلی بن اُمیہ کے اُونٹوں کی تعداد چھے ہزار چھے سو لکھی ہے۔

انھیں بتایا گیا کہ یہ "حواب" ہے۔

یہ سن کر حضرت عائشہ کو پیغمبر اکرم ﷺ کی وہ حدیث یاد آ گئی جس میں آنحضرت ﷺ نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ "حواب" کے کتے ازواج مطہرات میں سے ایک پر غرائیں گے اور انھیں اس سفر سے باز رہنے کے لیے فرمایا تھا۔ ①

حضرت عائشہ اس حادثے سے پریشان ہو گئیں اور فرمایا: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ، میں وہی زوجہ ہوں جنھیں پیغمبرؐ خدا نے ان کے مستقبل کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا اور فوراً ہی واپس چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن طلحہ و زبیر نے جب یہ دیکھا کہ حضرت عائشہ جنگ کے خیال کو ترک کرنا چاہتی ہیں تو انھیں اپنی آرزوئیں خاک میں ملتی ہوئی نظر آئیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ عائشہ اپنے فیصلے سے باز رہیں۔ بالآخر جب پچاس آدمیوں نے یہ جعلی گواہی دی کہ یہ جگہ "حواب" نہیں تو وہ مطمئن ہو گئیں"۔ ②

سپاہ کی جانب عثمان بن حنیف کے نمائندوں کی روانگی

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی جانب سے بصرہ میں مقرر صوبہ دار عثمان بن حنیف کو جب یہ اطلاع ہوئی کہ حضرت عائشہ کا لشکر شہر "ابوالاسود دوئلی" کے گرد و نواح میں پہنچ گیا ہے تو انھوں نے عمران بن حصین کو سردارِ لشکر کے پاس بھیجا تاکہ وہ یہ جان سکے کہ بصرہ کی جانب آنے کا کیا سبب و محرک ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے حضرت عائشہ سے ملاقات کی اور ان سے دریافت

---

① اس حدیث کے متن کو مختلف مورخین نے بیان کیا ہے۔ یعقوبی نے ج ۲، ص ۱۸۱ پر نقل کیا ہے۔ لاتکونی التی تنبحک کلاب الحواب، "اے عائشہ! تم ان میں سے نہ ہونا جن پر حواب کے کتے بھونکیں"۔ لیکن ابن اثیر (تاریخ: ج ۲، ص ۲۱۰) کامل اور بلاذری نے انساب الاشراف: ج ۲، ص ۲۲۴ میں اس طرح درج کیا ہے: لیت شعری ایتکن تنبحها کلاب الحواب، اور ابن ابی الحدید نے ج ۱۰، ص ۳۱۰ پر بھی حدیث دوسرے الفاظ کے ساتھ پیش کی ہے۔

② مروج الذہب: ج ۳، ص ۳۵۷، انساب الاشراف: ج ۲، ص ۲۲۴، الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۶۰۔ لیکن یعقوبی نے جلد ۲، ص ۱۸۱ پر شہادت دینے والوں کی تعداد ۴۰ لکھی ہے۔

کیا: بصرہ کی جانب آپ کے آنے کا کیا مقصد ہے؟

انھوں نے کہا: عثمان کے خون کا بدلہ اور ان کے قاتلوں سے انتقام لینا۔

طلحہ اور زبیر سے بھی انھوں نے یہی سوال کیا۔ انھوں نے بھی حضرت عائشہ کی بات دُہرا دی۔ حضرت عثمان بن حنیف نے طلحہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: کیا تم نے حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت نہیں کی؟

انھوں نے کہا: ہاں! مگر میری بیعت دباؤ کی وجہ سے تھی۔ (تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۱۶، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۱۰)

حضرت عثمان بن حنیف کے نمایندگان نے تمام واقعات کی انھیں اطلاع دی۔ حضرت عائشہ بھی اپنے لشکر کے ہمراہ "حفیر ابوموسیٰ" نامی جگہ سے روانہ ہوکر بصرہ میں داخل ہوگئیں اور "مرید" ① کو جو بھی بہت وسیع و کشادہ میدان تھا، لشکر گاہ قرار دیا۔

حضرت عثمان بن حنیف نے اپنے نمایندگان سے گفتگو کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ جب تک امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی جانب سے کوئی حکم نامہ نہیں ملتا، وہ سپاہ کو قلب شہر میں آنے سے روکیں چنانچہ! انھوں نے حکم دیا کہ لوگ مسلح ہو جائیں اور جامع مسجد میں جمع ہوں۔

جب لوگ مسجد میں جمع ہوگئے تو قیس نامی شخص نے صوبہ دار بصرہ کی جانب سے ان کے سامنے تقریر کی اور کہا کہ وہ عائشہ کے لشکر کا استقامت و پایداری سے مقابلہ کریں۔ ②

ابن قتیبہ کے قول کے مطابق خود عثمان بن حنیف اور ان کے ساتھیوں نے بھی اس موقع پر تقریریں کیں اور اسی دوران کہا:

> "ان دو اشخاص (طلحہ و زبیر) نے بھی حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت کی تھی مگر یہ بیعت رضائے خداوندی کی خاطر نہ تھی۔ اسی لیے انھوں نے عجلت کی اور چاہا کہ اس سے پہلے کہ بچہ اپنی ماں کا دودھ چھوڑے۔ وہ بڑا اور جوان ہو جائے...... ان کا خیال ہے کہ انھوں نے دباؤ کی وجہ سے

---

① مرید، شہر کے کنارہ پر ایک میدان تھا جہاں پیٹھ لگتی تھی۔

② شرح ابن ابی الحدید: ج ۹، ص ۳۱۳، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۳۶۱ - ۳۶۲، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۱۱، الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۶۱ گفتگو اگرچہ بہت مفصل ہے مگر یہاں اس کا خلاصہ دیا گیا ہے۔

بیعت کی ہے درحالیکہ ان کا شمار قریش کے زورمند لوگوں میں ہوتا ہے۔ اگر چاہتے تو بیعت کرتے...... صحیح طریق وہی ہے جو عام لوگوں نے طے کیا ہے اور حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اب آپ لوگ بتائیں کیا رائے ہے؟"

یہ سن کر حکیم بن جبلہ عبیدی اپنی جگہ سے اُٹھے اور کہا:

"ہماری رائے یہ ہے کہ اگر انھوں نے ہم پر حملہ کیا تو ہم بھی جنگ کریں گے، اگر وہ حملہ کرنے سے باز رہے تو ہم اس کا استقبال کریں گے۔ اگرچہ مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے مگر راہِ حق میں جان دینے کا مجھے ذرا خوف نہیں۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس رائے کو پسند کیا"۔(تاریخ طبری: ج ۴، ص ۳۶۲)

پہلا تصادم

جب حضرت عائشہ کا لشکر "مرید" میں داخل ہو گیا تو بصرہ کے بعض وہ لوگ جو ان کے طرف دار تھے، ان کی سپاہ میں شامل ہو گئے۔ ان کے علاوہ بصرہ کے باشندے اور حضرت عثمان کے حامی بھی کثیر تعداد میں ان کے گرد جمع ہو گئے۔

سرداران لشکر کی تقاریر اور حضرت عثمان کے "بدلۂ خون" تحریک کے باعث حضرت عثمان کے حامی و طرف دار دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ نے حضرت عائشہ، طلحہ اور زبیر کے بیانات کی تائید کی اور انھوں نے کہا کہ آپ یہاں عمدہ مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں۔

لیکن دوسرے گروہ نے ان پر دروغ گوئی کا الزام لگایا اور کہا: خدا کی قسم! تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ سراسر فریب ہے اور جو کچھ تم اپنی زبان سے بیان کر رہے ہو وہ ہمارے فہم سے باہر ہے۔ اس باہمی اختلاف کا یہ نتیجہ ہوا کہ انھوں نے ایک دوسرے پر خاک اُچھالنی شروع کر دی اور حالات کشیدہ ہو گئے۔(الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۶۰-۶۱)

سرداران لشکر مروان، عبداللہ بن زبیر اور چند دیگر افراد کے ساتھ صوبہ دار بصرہ کی جانب روانہ ہوئے اور انھوں نے عثمان بن حنیف سے درخواست کی کہ وہ اس جگہ سے چلے جائیں لیکن

انھوں نے ان کی اس درخواست کی پروا نہ کی۔

عثمان بن حنیف کے لشکر اور جارحین کے درمیان شدید تصادم ہوا جو غروب آفتاب تک جاری رہا۔ مدافعین کے قتل اور جانبین میں سے بہت سے لوگوں کے زخمی ہوجانے کے بعد بعض لوگوں کی مداخلت کے باعث یہ جنگ بند ہوئی اور طرفین کے درمیان عارضی صلح کا عہدنامہ لکھا گیا۔ اس عہدنامۂ صلح کی شرائط یہ تھیں:

① بصرہ کی صوبہ داری و مسجد اور بیت المال حسب سابق عثمان بن حنیف کے اختیار میں رہے گا۔

② طلحہ اور زبیر، نیز ان کے آدمیوں کو یہ آزادی ہے کہ وہ بصرہ میں جہاں بھی چاہیں آجا سکتے ہیں۔

③ طرفین میں سے کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کے لیے کوئی پریشانی پیدا کرے۔

④ یہ عہدنامہ اس وقت تک معتبر ہے جب تک حضرت علی علیہ السلام یہاں تشریف لے آئیں۔ اس کے بعد لوگوں کو صلح یا جنگ کا اختیار ہوگا۔

جب عہدنامے پر دستخط ہوگئے اور طرفین کے درمیان صلح ہوئی تو عثمان بن حنیف نے اپنے طرف داروں کو حکم دیا کہ وہ اپنا اسلحہ ایک طرف رکھ دیں اور اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ (تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۶۳-۴۶۴، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۱۲، ۲۱۳)

عہد شکنی

لشکر کے سرداروں نے بصرہ میں قدم جمانے کے بعد یہاں کے قبائل کے سربرآوردہ اشخاص سے ملاقاتیں کرنا شروع کیں اور سبز باغ دکھا کر انھیں بہت سی چیزوں کا لالچ دیا جس کے باعث بہت سے دنیادار اور جاہ طلب لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول کرلیا۔

طلحہ و زبیر نے جب اپنا کام محکم کرلیا تو وہ اپنے عہد کی پاسداری سے رُوگرداں ہوگئے۔ چنانچہ صوبہ دار کے گھر پر شب خون مار کر عثمان بن حنیف کو گرفتار کرلیا اور انھیں سخت ایذا پہنچائی۔ پہلے تو انھیں سخت زدوکوب کیا اور پھر سر، داڑھی اور دونوں ابروں کے بال نوچے۔ اس کے بعد

بیت المال پر حملہ کیا۔ وہاں کے چالیس پاسبانوں کو قتل کر کے باقی کو منتشر کر دیا اور خزانے میں جو کچھ مال و متاع موجود تھا، اسے برباد کر دیا۔

اس طرح شہر پر جارحین کا قبضہ ہو گیا اور جو اہم و حساس مراکز تھے، وہ ان کے تحت تصرف میں آ گئے۔ جارحین نے مزید رُعب جمانے کے لیے ان لوگوں میں پچاس افراد کو جنھیں انھوں نے گرفتار کیا تھا، عوام کے سامنے انتہائی بے رحمی کے ساتھ وحشیانہ طور پر قتل کر دیا۔①

حضرت عائشہ نے حکم دیا کہ عثمان بن حنیف کا بھی خاتمہ کر دیا جائے مگر ایک نیک دل خاتون مانع ہوئیں اور انھوں نے کہا کہ عثمان بن حنیف اصحابِ پیغمبرؐ میں سے ہیں۔ اس لیے رسولؐ خدا کے احترام کا پاس کیجیے۔ اس پر حضرت عائشہ نے حکم دیا کہ انھیں قید کر لیا جائے۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۸، شرح ابن ابی الحدید: ج ۹، ص ۳۲۱)

جملِ اصغر

حکیم بن جبلہ کا شمار بصرہ کے سربرآوردہ اشخاص میں ہوتا تھا۔ انھیں جس وقت عثمان بن حنیف کی گرفتاری کے واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے طائفہ "عبدالقیس" کے جنگجو جوانوں کو مسجد میں بلایا اور پُر ہیجان تقریر کے بعد تین سو اور بعض روایات کے مطابق سات سو افراد کو لے کر حملے کا اعلان کر دیا اور جارح سپاہ کے مقابل آ گئے۔

اس جنگ میں جسے جنگ جملِ اصغر سے تعبیر کیا گیا ہے حکیم بن جبلہ اور ان کے ساتھیوں نے سخت پامردی سے دشمن کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ جس وقت بازار کارزار پورے طور پر گرم تھا تو جارح لشکر کے ایک سپاہی نے حکیم بن جبلہ پر حملہ کر کے ان کا ایک پیر قطع کر دیا۔ انھوں نے اسی حالت میں اس سپاہی پر وار کیا اور اسے مار گرایا۔ وہ اسی طرح ایک پیر سے دشمن سے نبرد آزما ہوتے رہے، حملہ کرتے وقت یہ رزمیہ اشعار ان کی زبان پر جاری تھے:

یا ساق لن تراعی ان معی ذراعی احمی بھا کراعی

"اے پیر تو غم مت کر کیوں کہ ابھی میرے ہاتھ میرے ساتھ ہیں اور ان

① الجمل للمفید: ص ۱۵۰-۱۵۱، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۳۶، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۱۴۔ مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۸، شرح ابن ابی الحدید: ج ۹، ص ۳۲۰، الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۶۵۔

سے ہی میں اپنا دفاع کروں گا"۔

وہ اسی حالت میں مسلسل جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ نقاہت و کمزوری ان پر غالب آگئی اور شہید ہوگئے۔ ان کے فرزند، بھائی اور دوسرے ساتھی بھی اس جنگ میں قتل ہوگئے۔ (تاریخ طبری: ج ۴، ص ۲۶۸، کامل ابن اثیر: ۲۱۵-۲۱۶)

حکیم بن جبلہ پر غلبہ پانے کے بعد جارح لشکر کے سرداروں نے دوبارہ فیصلہ کیا کہ عثمان بن حنیف کو قتل کردیا جائے مگر انھوں نے کہا کہ تمھیں معلوم ہے کہ میرا بھائی "سہل" مدینہ کا صوبہ دار ہے۔ اگر تم مجھے قتل کروگے تو وہ تمھارے عزیز و اقارب کو مدینہ میں نیست و نابود کردے گا۔ چنانچہ اس بنا پر وہ ان کے قتل سے باز رہے اور انھیں آزاد کردیا۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۱۶، ۲۱۷، تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۷۰-۴۷۱، الجمل للمفید: ص ۲۵۱-۲۵۲)

سرداری پر اختلاف

"ناکثین" کے سرداران لشکر کو جب ابتدائی جنگوں میں فتح و کامرانی حاصل ہوئی اور انھوں نے شہر پر بھی قبضہ کرلیا تو ان میں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ سربراہ کسے مقرر کیا جائے۔ ان میں سے ہر شخص کی یہی کوشش تھی کہ فتح کے بعد اوّلین نماز جو مسجد میں ادا کی جائے اس میں وہی امام جماعت کے فرائض انجام دے۔ یہ باہمی کش مکش اس قدر طولانی ہوئی کہ نزدیک تھا کہ آفتاب طلوع ہوجائے۔ چنانچہ لوگوں نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا:

"اے صحابہ پیغمبرؐ! الصّلوٰۃ، الصّلوٰۃ"۔

لیکن طلحہ و زبیر نے اس کی جانب توجہ نہ کی۔ حضرت عائشہ نے مداخلت کی اور حکم دیا کہ ایک روز طلحہ کے فرزند محمد اور دوسرے روز زبیر کے بیٹے عبداللہ امامت کریں گے۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۸، الجمل للمفید: ص ۱۵۲، تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۸۱)

خبر رسانی

طلحہ اور زبیر نے جب بصرہ پر قبضہ کرلیا تو وہ کارنامے جو انھوں نے یہاں انجام دیے تھے ان کی خبر شام کے لوگوں کو بھیجی گئی۔ حضرت عائشہ نے بھی ان خبروں کی تفاصیل اہل کوفہ کو لکھیں اور

ان سے کہا کہ حضرت علی علیہ السلام کی بیعت سے دست کش ہو جائیں اور حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ یمامہ اور مدینہ کے لوگوں کو بھی خط لکھے گئے اور انھیں فتح بصرہ کی اطلاع کے ساتھ یورش وشورش کا مشورہ دیا گیا۔ ①

حضرت علی علیہ السلام کی بصرہ کی جانب روانگی

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے مخالفوں کا وجود میں آنا، ان کے درمیان اتحاد و اُلفت اور ان کے لشکر کا بصرہ کی جانب روانہ ہونا اور پھر اس پر قابض ہو جانے کو ہم بیان کر چکے ہیں۔ اب مدینہ چلتے ہیں تاکہ وہاں سے امیر المومنینؑ کے ساتھ بصرہ کی طرف روانہ ہو جائیں۔

معاویہ نے چونکہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے خلاف سرکاری سطح پر سرکشی کی تھی اور حضرت علی علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ اسی لیے حضرت علی علیہ السلام بھی اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے ابتدائی تیاری میں مشغول تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے حضرت عثمان بن حنیف، قیس بن سعد اور ابو موسیٰ جیسے اپنے کار پردازوں کو خطوط کے ذریعے مطلع کیا کہ معاویہ کے خلاف جنگ کرنے کی غرض سے لوگوں کو آمادہ کریں۔

اس اثناء میں حضرت علی علیہ السلام کو حضرت عائشہ، طلحہ اور زبیر کی سرکشی نیز ان کے لشکر کی عراق کی جانب روانگی کی اطلاع ملی۔ حضرت علی علیہ السلام جانتے تھے کہ موجودہ حالات میں ان تینوں حضرات کی یورش معاویہ کی سرکشی سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ کیوں کہ معاویہ اسلامی حکومت کے دُور دراز علاقے میں سرگرم عمل تھا، لیکن یہ لوگ مرکز خلافت میں بھی یکجا جمع اور اس کے گرد و نواح میں شورش کیے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بصرہ اور کوفہ سیاسی اور عسکری اعتبار سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

چنانچہ! اس بنا پر اس سے پہلے کہ یورش و بغاوت کے شعلے دیگر مقامات تک پہنچیں، آپؑ نے مصلحت اس امر میں سمجھی کہ ان کی آتشِ فتنہ کو خاموش کرنے کے لیے خود ہی پیش قدمی کریں۔ اگرچہ! کچھ لوگوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ آپ طلحہ اور زبیر کے تعاقب کو نظر انداز کر دیں مگر

---

① کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۱۹–۲۲۰، تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۷۲۔ حضرت عائشہ نے جو خط مدینہ اور یمامہ کے لوگوں کو لکھا تھا اس کا متن علامہ مفیدؒ نے اپنی تالیف "الجمل" کے ص ۱۶۰ پر درج کیا ہے۔

آپؑ نے اس پیش نہاد کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور فرمایا:

والله لا كون كالضبع تنام على طول حتى يصل اليها طالبها ويختلها راصدها ولكنني اضرب بالمقبل الى الحق وبالسامع المطيع العاصى المريب ابداً حتى ياتى على يومى

"خدا کی قسم! میں بجو نہیں ہوں جس کو پکڑنے کے لیے اس کے بھٹ پر دھیمے سُروں میں گاتے بجاتے ہیں اور اچانک اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ میں اپنے مخالفین سے پوری طرح باخبر ہوں۔ میں حق پسندوں کی شمشیر بُراں سے ان لوگوں کا کام تمام کر دوں گا جنھوں نے حق کے نام پر سرکشوں کو جو راہِ حق میں رخنہ اندازی پر تلے ہوئے ہیں ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا دوں گا اور اپنے اس عمل کو تا دمِ واپسیں جاری رکھوں گا"۔

حضرت علی علیہ السلام نے مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپؑ نے عام لوگوں پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ مخالفین کے اغراض و مقاصد کیا ہیں اس موضوع سے متعلق درج ذیل تقریر فرمائی:

"لوگو! حضرت عائشہ بصرہ کی جانب چلی گئیں ہیں۔ طلحہ و زبیر ان کے ہمراہ ہیں۔ ان دونوں کا خیال ہے کہ خلافت پر صرف انھی کا حق ہے کسی اور کا نہیں۔ طلحہ حضرت عائشہ کے چچازاد بھائی ہیں اور زبیر ان کے داماد ہیں (اور حضرت عائشہ کی سعی و کوشش انھی کے لیے ہے) خدا کی قسم! اگر یہ دونوں اپنے مقصد میں بالفرض کامیاب ہو بھی گئے تو پھر ان دونوں میں وہ سخت تنازعہ ہوگا کہ ان میں ایک دوسرے کی گردن مار دے گا۔ خدا شاہد ہے کہ جو شخص سرخ اُونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہوتا ہے، وہ زیادہ دُور تک راستہ طے نہیں کرتا اور اس سے کوئی عقدہ وا بھی نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ گناہ کے راستے پر چلے اور خدا کا غضب اس پر نازل ہوتا کہ وہ اور اس کے ساتھی ہلاکت کو پہنچیں۔

خدا کی قسم! انجامِ کار یہ ہوگا کہ ان میں سے ایک تہائی افراد مارے جائیں

گے، ایک تہائی فرار کر جائیں گے اور ایک تہائی توبہ کر لیں گے۔ حضرت عائشہ وہی خاتون ہیں جس پر "حواب" کے کتے غرا رہے ہیں۔ طلحہ اور زبیر بھی جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک راستے پر نہیں چل رہے ہیں۔ افسوس اس عالم کے حال پر جو اپنے جہل کے باعث مارا گیا اور وہ اپنے علم سے بہرہ مند نہ ہو سکا۔

مجھے قریش سے کیا سروکار، خدا گواہ ہے جب وہ حالت کفر میں تھے تو میں نے انھیں قتل کیا، اس وقت بھی وہ ہوا و ہوس اور شیطانی وساوس کے دام فریب میں ہیں (اسی لیے شورش برپا کیے ہوئے ہیں)۔ یہ سب میرے ہاتھوں مارے جائیں گے"۔ (شرح ابن ابی الحدید۔ ارشاد مفید: ص ۱۳۱)

حضرت علی علیہ السلام نے افکار عامہ کو بیدار کرنے کی غرض سے دوسرے اور تیسرے روز پرہیجان تقاریر کیں اور بالآخر آپؑ نے اعلان جنگ کر دیا۔ سہل بن حنیف کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا① اور خود مسلح و مجہز لشکر کے ساتھ جو سات سو سے زیادہ افراد پر مشتمل تھا، مدینہ سے عراق کی جانب روانہ ہوئے۔

"ناکثین" پر قابو پانے کے لیے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا لشکر پہلے مکہ کی جانب روانہ ہوا لیکن جب آپ "ربذہ"② نامی مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخالفین وہاں سے کوچ کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہاں سے آپؑ نے عراق کی جانب رُخ کیا۔

ربذہ میں قیام

حضرت علی علیہ السلام نے ربذہ میں چند روز قیام فرمایا۔ اس عرصے میں مدینہ سے کچھ انصار جن میں خزیمہ بن ثابت اور تقریباً چھے سو طائفہ طی کے منظم سوار امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے لشکر

① الجمل للمفید: ص ۲، الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۵۳ میں سہل کے بجائے قثم بن عباس کا ذکر ملتا ہے۔
② یہ جگہ ذات عرق کے قریب حجاز و مدینہ کے درمیان تین روزہ راہ کی دوری پر واقع ہے۔ (معجم البلدان: ج ۳، ص ۲۴، مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۸-۳۵۹)

سے متصل ہو گئے۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۸-۳۵۹)

عثمان بن حنیف بھی دشمنوں کے چنگل سے نجات پانے کے بعد ربذہ میں حضرت علی علیہ السلام سے آن ملے۔ انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے ملاقات کرنے کے بعد عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! جس روز آپؑ نے مجھے روانہ کیا تھا اس وقت میری داڑھی بہت گھنی تھی لیکن آج میں آپؑ کی خدمت میں ایک بے ریش نوجوان کی صورت میں حاضر ہوا ہوں......

حضرت علی علیہ السلام نے انھیں صبر کی تلقین کی اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ ①

اسی طرح امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ہاشم مرتال کو خط دے کر حاکمِ کوفہ کی جانب روانہ کیا تاکہ اس سے پہلے کہ طلحہ اور زبیر وہاں پہنچیں، وہاں کے گورنر کی عسکری مدد حاصل کر لی جائے لیکن ابوموسیٰ اشعری حاکمِ کوفہ نے نہ صرف یہ کہ حضرت علی علیہ السلام کے نمایندے سے سیدھے منہ بات نہ کی بلکہ حضرت علی علیہ السلام کے خط کو بھی انھوں نے غائب کر دیا اور ہاشم مرتال کو یہ دھمکی دی کہ وہ انھیں قیدی بنالیں گے۔ انھوں نے کوفہ کے لوگوں کو بھی سختی سے منع کر دیا اور کہا کہ حضرت علی علیہ السلام کی مدد نہ کریں اور گورنر کی حیثیت سے اعلان کیا کہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو پہلے وہ حضرت عثمان کے قاتلوں کے خلاف جنگ کریں گے اور اس کے بعد وہ دوسروں کی طرف متوجہ ہوں گے۔ ②

حضرت علی علیہ السلام کے نمایندے نے ان تمام واقعات کی امیر المومنینؑ کو خبر کی۔ یہ خط حضرت علی علیہ السلام کو "ذی قار" نامی مقام پر موصول ہوا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے فرزندِ عزیز حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت عمار یاسرؓ کو اپنے پاس بلایا اور ان دونوں حضرات کو اس کام پر مقرر کیا کہ اہلِ کوفہ کے لیے وہ خط لے کر روانہ ہوں اور وہاں پہنچ کر وہاں کے لوگوں کو مدد کے لیے آمادہ کریں۔

---

① کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۲۶، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۸۰، تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۸۲، شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۳۲۱

② تاریخ طبری: ج ۴، ص ۴۷۷-۴۷۸، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۷۷، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱۴، ص ۹

حضرت علی علیہ السلام نے ابوموسیٰ اشعری کو بھی خط لکھا اور انھیں ان کے منصب سے معزول کر دیا۔ امیر المومنینؑ نے اس خط میں لکھا تھا کہ انھوں نے اپنے موقف کا صحیح استعمال نہیں کیا اور اسی بنا پر انھیں سخت تنبیہ بھی کی۔ اس کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشترؓ کو ان کے پیچھے روانہ کیا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت عمارؓ نے کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کا خط وہاں کے لوگوں کو سنایا اور اس سلسلہ میں تقاریر بھی کیں۔ حضرت علی علیہ السلام کی تحریر اور امام حسن علیہ السلام اور حضرت عمارؓ کی تقریر کا اثر یہ ہوا کہ اہلِ کوفہ ان کے گرویدہ ہو گئے اور انھوں نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ خلوصِ نیت اور محبت کا اظہار کیا اور ان کے فرمان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے ابوموسیٰ اشعری کی معزولی کا بھی اعلان کیا اور ان کی جگہ قرظہ بن کعب کو گورنر مقرر کیا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے نمایندے کی سعی و کوشش اور بصیرت افروز تقاریر کے باعث کچھ لوگوں نے اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ! چند روز بعد تقریباً سات ہزار افراد "ذی قار" میں حضرت علی علیہ السلام سے جا ملے۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کی کامیابی پر حضرت علی علیہ السلام بہت مسرور ہوئے اور انھوں نے اپنے فرزند دل بند سے اظہارِ تشکر کیا۔ ①

لشکر کا جاہ و جلال

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا وہ مسلح و عظیم لشکر جو مدینہ اور کوفہ میں جمع ہوا تھا اور بصرہ کے نواح میں قیام پذیر تھا، اس لشکر کے بارے میں منذر بن جارود نے لکھا ہے:

"میں شہر بصرہ سے باہر نکل کر آیا تا کہ حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کا نظارہ کر سکوں

① ملاحظہ ہو: مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۹، والجمل: ۱۳۰، ۱۳۸، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۳۱، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۴۸۵، ج ۴۸۲، شرح ابن ابی الحدید: ج ۳، ص ۱۰، ۱۴، طبری: ج ۳، ص ۵۰۰، اور ابن ابی الحدید نے ج ۱۴، ۲۱ پر ابی الطفیل سے نقل کیا ہے کہ اس سے قبل کہ سپاہ کوفہ پہنچے حضرت علی علیہ السلام نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ کوفہ سے ایک ہزار ایک سپاہی آئیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ راوی کا کہنا ہے کہ میں نے انھیں گنا تو ان میں سے نہ ایک کم تھا، نہ ایک زیادہ۔

تو اس وقت وہاں ہزار مسلح سوار موجود تھے اور ابوایوب انصاری تومند گھوڑے پر سوار ان کے پیش پیش چل رہے تھے۔ ان کے علاوہ بھی وہاں دوسرے عسکری دستے موجود تھے، جن میں ہر دستہ ہزار مسلح افراد پر مشتمل تھا اور دستوں کی کمانڈری خزیمہ بن ثابت، ابوقتادہ، عمار یاسر، قیس بن سعد اور عبداللہ بن عباس جیسے جلیل القدر صحابہ رسولؐ کرتے تھے اور یہ تمام دستے ابوایوب کی فوج کے پیچھے ہوئے چل رہے تھے۔ انھی جنگجو دستوں میں ایک دستہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی زیر قیادت تمام دستوں سے آگے چل رہا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام کے دائیں بائیں حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام چل رہے تھے اور ان کے جلو میں حضرت علی علیہ السلام کے دیگر فرزند محمد بن حنفیہ پرچم ہاتھ میں لیے ہوئے چل رہے تھے۔ عبداللہ بن جعفر حضرت علی علیہ السلام کے پیچھے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت عقیلؓ کے فرزند اور بنی ہاشم کے نوجوانوں نے حضرت علی علیہ السلام کو انگشتری کے نگینہ کی طرح اپنے درمیان لے رکھا تھا۔ کچھ معمر بدری بزرگ (مہاجر و انصار) بھی ان ہی دستوں میں نظر آرہے تھے۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۹ و ۳۶۱ کا خلاصہ)

بصرہ پہنچنے سے قبل حضرت علی علیہ السلام نے "زاویہ" نامی جگہ پر قیام فرمایا اور یہاں چار رکعت نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؑ نے دوبارہ سجدہ کیا اور اس قدر گریہ وزاری کی کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور عرض کیا:

اللھم انّ ھؤلاء القوم قد خلعوا طاعتی ومضوا علیّ ونکثوا بیعتی اللھم احقن دما المسلمین (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۶۱)

"خداوندا! اس جماعت نے میرے حکم کی نافرمانی کر کے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ یہ لوگ بیعت سے منحرف ہوگئے ہیں۔ خدایا! اب تو ہی مسلمانوں کی حفاظت فرما"۔

صلح کی کوشش

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا مقصد جنگ کرنا نہ تھا بلکہ آپؑ چاہتے تھے کہ "ناکثین" نے جو فتنہ کی آگ بھڑکائی ہے، اسے خاموش کر دیں۔ اس مقصد کی برآوری کے لیے اور کشت و خون کو روکنے کی خاطر حضرت علی علیہ السلام نے ہر ممکن کوشش کی اور جو بھی ممکن طریقہ ہو سکتا تھا آپؑ اسے بروئے کار لائے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے جو صلح طلبانہ اقدامات کیے ان کے چند نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

① بصرہ پہنچنے سے قبل آپؑ نے صعصعہ بن صوحان اور عبداللہ بن عباس کو جداگانہ طور پر خط دے کر حضرت عائشہ، طلحہ اور زبیر کے پاس بھیجا کہ شاید ان کو مذاکرہ اور پند و نصیحت کے ذریعے جنگ کرنے سے باز رکھا جا سکے لیکن ان لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کے نمایندگان اور آپؑ کے پند و نصائح کے آگے سر تسلیم خم نہ کیا۔ انھوں نے جنگ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔ (الجمل للمفید: ص ۱۶۷)

② حضرت علی علیہ السلام نے جنگ کے دن فیصلہ کیا کہ کلام اللہ کو درمیان لا کر اسے حکم قرار دیں۔ چنانچہ! آپؑ نے حضرت مسلم نامی شخص کو قرآن پاک دیا اور فرمایا کہ ان لوگوں سے کہو کہ ہمارے اور تمھارے درمیان قرآن ہی حاکم و منصف ہے۔ خدا سے ڈرو اور مسلمانوں کا خون بہانے سے گریز کرو۔ اس جوان نے حضرت علی علیہ السلام کے حکم پر عمل کیا لیکن انھوں نے مسلم کا وہ ہاتھ قلم کر دیا جس میں قرآن مجید تھا، انھوں نے قرآن دوسرے ہاتھ میں لے لیا اور حسب سابق انھیں قرآنی حکومت کی دعوت دی مگر ان سنگدلوں نے ان کا دوسرا ہاتھ بھی قطع کر دیا اور انھیں شہید کر دیا۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۶۱، الجمل للمفید: ص ۱۸۱، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۵۰۹–511)

③ حکومتِ قرآن کی دعوت دینے والے جوان، مسلم کے قتل نے کشت و خون کا سدِ باب کرنے والے اقدامات نے حضرت علی علیہ السلام کو مایوس کر دیا۔ آپؑ نے آخری مرتبہ عمار یاسرؓ کو بھیجا۔ یہ وہ بزرگ صحابی تھے، جن کے بارے میں رسولؐ خدا نے فرمایا تھا کہ جو لوگ انھیں قتل کریں گے، ان کا شمار ظالموں میں ہوگا اور ان کے مقام و مرتبے نیز ایمان

کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا: "حق ہمیشہ عمارؓ کے ساتھ ہے اور عمارؓ حق سے پیوستہ"۔

عمارؓ نے بھی پند ونصیحت کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے دشمنوں کی سپاہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: اے لوگو! تم نے پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار نہ کیا، تم نے اپنی عورتوں کو تو اپنے گھروں میں محفوظ کر دیا اور زوجہ مطہر رسولؐ خدا کو گھر سے نکال کر نیزوں اور تلواروں کے رُوبرو لے آئے۔

اس کے بعد وہ مزید آگے بڑھے اور حضرت عائشہ کے ہودج کے مقابل آ کر ان سے گفتگو کی۔ ان کی یہی کوشش تھی کہ وہ ان فتنہ انگیزوں کے ساتھ شریک نہ ہوں۔ وہ ابھی گفتگو کر ہی رہے تھے کہ دشمن کے تیر ہر جانب سے ان کی طرف آنے لگے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے سر کو اِس طرف یا اُس طرف خمیدہ کر کے خود کو تیروں کی زد سے بچا لیا اور قطع گفتگو کر کے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۶۲)

۴ "ناکثین" کی جانب سے شدت کے ساتھ مسلسل تیراندازی شروع ہوگئی۔ ادھر سپاہ اسلام کا نعرہ بلند ہوا کہ یا امیر المومنینؑ! دشمن ہم پر تیروں کی بارش کر رہا ہے، دفاع کا حکم صادر کیجیے۔ اس وقت ایک مرد کا جنازہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے رُوبرو لایا گیا، جسے دشمن نے اپنے تیروں کا نشانہ بنایا تھا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے یہ حالت دیکھ کر رُخِ مبارک آسمان کی جانب کیا اور زبانِ حال سے فرمایا: خداوندا! تو عادل و دادگر ہے۔ شاہد و گواہ رہنا، اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم صبر کرو تاکہ دشمن پر حجت تمام ہو جائے۔ اس کے بعد ایک جنازہ اور لایا گیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس مرتبہ بھی وہی بات دُہرائی۔ یہاں تک کہ بزرگ صحابی عبداللہ بن بدیل اپنے فرزند کا جنازہ لے کر آئے اور اسے حضرت علی علیہ السلام کے رُوبرو رکھ دیا اور عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! ہم کب تک صبر کریں۔ دشمن ہمارے جوانوں

کو یکے بعد دیگرے قتل کیے جا رہا ہے۔ ①

حضرت علی علیہ السلام مسلسل تین دن تک پوری کوشش کرتے رہے کہ جنگ وخون ریزی نہ ہو مگر افسوس انھیں اپنے اس ارادے میں کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ! آپؑ نے خود کو اس اقدام کے رُوبرو پایا جو پہلے کئی مرتبہ انجام پذیر ہوا تھا۔ اس کے بعد امیر المومنینؑ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زرہ پہنی، عمامہ سرِ مبارک پر رکھا، ذوالفقار کمر میں حمائل کی اور دُلدل پر سوار ہو کر پرچم محمد بن حنفیہ کو دیا۔ مجہز و مسلح ہو کر آپؑ نے لشکر کا معائنہ کیا جو کہ بیس ہزار پر مشتمل تھا۔ طلحہ اور زبیر نے بھی اپنے لشکر کا معائنہ کیا جس میں تیس ہزار سے زیادہ نفوس شامل تھے۔ اب دونوں لشکر پوری طرح جنگ کے لیے آمادہ و تیار تھے۔ (شرح ابنِ ابی الحدید: ج۹، ص ۱۱۱)

لشکر کے لیے دستور العمل

دشمن پر حملہ کرنے سے قبل حضرت علی علیہ السلام نے اپنی سپاہ کے لیے چند احکامات صادر کیے اور فرمایا: جب دشمن کو شکست ہو جائے تو مجروحین سے جنگ نہ کریں، قیدیوں کو قتل نہ کیا جائے، عورتوں کو برہنہ نہ کیا جائے، مقتولین کے ناک کان قطع نہ کیے جائیں، کسی کی پردہ دری نہ ہو اور فاتح سپاہی مفتوحین کے مال کے پاس سے بھی نہ گزریں، البتہ میدانِ جنگ میں اگر ہتھیار، گھوڑے، غلام یا کنیزیں ہاتھ آجائیں تو انھیں غنیمت میں لے لیں"۔ (مروج الذہب: ج۲، ص ۳۶۳، الجمل للمفید: ص ۱۸۲)

دشمن کو متفرق کرنے کی آخری کوشش

دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئے۔ اس سے قبل کہ جنگ شروع ہو، حضرت علی علیہ السلام کو یہ موقع مل گیا کہ زبیر ان کے سامنے آگئے۔ اگرچہ! حضرت علی علیہ السلام نے ان سے چند ہی جملے کہے جن کا ان کے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ دشمن کے سرداروں اور فوج کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

---

① الجمل للمفید: ص ۱۸۲۔ شرح ابن ابی الحدید: ج۹، ص ۱۱۱۔ مروج الذہب: ج۲، ص ۳۶۲۔ لیکن تاریخ یعقوبی اور شرح ابن ابی الحدید میں مقتول کو عبداللہ کا بھائی تحریر کیا ہے۔

جس وقت حضرت علیؑ نے گفتگو کے دوران زبیر کو رسولؐ خدا کی حدیث سنائی اور فرمایا:

اے زبیر! کیا وہ دن یاد ہے جب کہ تُو نے میری گردن میں اپنا ہاتھ حائل کر رکھا تھا اور پیغمبرؐ خدا نے یہ دیکھ کر تجھ سے پوچھا تھا، کیا تجھے علیؑ سے بہت پیار ہے؟ اور تُو نے جواب دیا تھا کہ آخر کیوں نہ پیار کروں یہ میرا ماموں زاد بھائی ہی تو ہے۔ اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

اما انك ستحاربه وانت ظالم له

"تُو مستقبل قریب میں اس سے جنگ کرے گا درحالیکہ تُو ستم گر ہوگا"۔

زبیر نے جب یہ حدیث سنی تو کہا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ، مجھے پورا واقعہ یاد آ گیا۔ میں آپؑ سے ہرگز جنگ نہ کروں گا۔

اس کے بعد انھوں نے دیگر سرداروں کی پُر ہیجان اور وسوسہ انگیز باتوں کی جانب توجہ کیے بغیر میدانِ جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور وادی اسباع نامی مقام پر عمرو بن جرموز کے ہاتھوں قتل ہوئے۔①

حضرت علی علیہ السلام نے اس خیال سے کہ شاید طلحہ بھی جنگ سے باز رہیں اور خون ریزی کی نوبت نہ آئے تو ان سے بھی ملاقات کی اور فرمایا: وہ کون سا عامل تھا جس کے باعث تُو نے شورش و سرکشی کی؟

طلحہ نے جواب دیا: عثمان کے خون کا بدلہ۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: خدا اس شخص کو پہلے قتل کرے جو اس گناہ میں ملوث ہو۔

---

① مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۶۳۔ زبیر کے سلسلے میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ وہ بھی دوسروں کی طرح حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ آخری لمحہ تک جنگ کرتے رہے لیکن جب اصحابِ جمل کو شکست و ہزیمت ہوئی تو انھوں نے بھی راہِ فرار اختیار کی۔ جس وقت وہ فرار کر رہے تھے تو اچانک جرموز نے انھیں غافل پا کر قتل کر دیا (سیرۃ الائمہ اثنا عشر: ج ۱، ص ۴۵۵)۔ ان اقوال کے علاوہ یہ قول بھی ہے کہ جب زبیر نے کنارہ کشی کا فیصلہ کر لیا تو ان کے فرزند عبداللہ نے ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ جنگ سے خوف زدہ ہو گئے ہیں اور انھوں نے انھیں قسم یاد دلائی اور کفارہ دینے کو کہا: تو زبیر نے اپنے غلام کو آزاد کر کے کفارہ ادا کیا اور بیٹے نے جو الزام لگایا تھا، اسے دُور کرنے کے لیے انھوں نے تلوار اُٹھائی اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے لشکر پر حملہ آور ہو گئے۔ (ملاحظہ ہو: تاریخ ابوالفداء: ج ۱، ص ۱۷۳-۱۷۴)

پھر فرمایا: اچھا یہ بتا کہ عثمان کا قاتل کون ہے؟ میں یا تُو؟ کیا تُو نے نہیں سنا کہ رسولِ خدا نے میرے بارے میں فرمایا تھا کہ خدایا! تُو اسے دوست رکھ جو علیؑ کا دوست ہو اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے۔ کیا تُو ان لوگوں میں شامل نہ تھا جنھوں نے سب سے پہلے بیعت کی؟

طلحہ نے کہا: میں توبہ و استغفار کرتا ہوں۔

اس کے بعد وہ بھی کسی کی پند و نصیحت سنے بغیر میدانِ جنگ سے چلے گئے۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۶۴)

لیکن ان کا بھی وہی انجام ہوا جس سے زبیر دوچار ہوئے تھے۔ مروان کیونکہ حضرت عائشہ کے لشکر میں تھا اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام طلحہ کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں تو اسے یہ خوف لاحق ہوا کہ کہیں وہ بھی حضرت علی علیہ السلام کی بصیرت افروز تقریر سے متاثر نہ ہو جائیں۔ دوسری طرف مروان کا یہ گمان تھا کہ حضرت عثمان کے قتل کی سازش میں وہ بھی ملوث ہے۔ چنانچہ! اس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس وقت جب کہ ہنگامہ کارزار گرم تھا۔ مروان نے طلحہ کی پشت پر تیر مارا اور انھیں زمین پر گرا دیا۔ [1]

فیصلہ کن جنگ

سردارانِ سپاہ کی اشتعال انگیز تقاریر، تیس ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل مسلح لشکر کی تیاری، بعض سردارانِ قبائل کے نام تحریری و زبانی پیغام رسانی، مختلف شہروں کے لوگوں کی شورش و سرکشی میں شرکت کی دعوت، لشکر کشی کے ذریعے بصرہ پر قبضہ، وہاں کے بعض مسلمانوں کا قتل اور شکنجہ کشی ایسے قرائن و شواہد ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مخالف سرداروں، گورنروں کے کشت و خون کا مقصد، امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کو سرنگوں کرنے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ان حالات میں حضرت علی علیہ السلام کے ہمدردانہ پند و نصائح اور صلح پسندانہ اقدامات کا ان کے دلوں پر اثر نہ ہونا فطری تھا۔ اسی لیے انھوں نے پہلے تو حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کی جانب تیر اندازی کی۔ اس کے بعد چند سپاہیوں کو قتل کر کے دائیں اور بائیں جانب سے حملہ شروع کر دیا۔

---

[1] مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۶۴، تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۸۲، انساب الاشراف: ج ۲، ص ۲۴۸، الجمل للمفید: ص ۲۰۴، شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۳۶۴۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے پرچم دار لشکر محمد حنفیہ کو حکم دیا کہ دشمن کی فوج کے قلب پر حملہ آور ہوں لیکن مسلسل تیراندازی کے باعث ان کی نظروں کے سامنے چونکہ اندھیر سا چھا گیا تھا اسی لیے حملہ کرنے میں انھیں تردد ہوا۔ اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: پیش قدمی کیوں نہیں کرتے؟

محمد حنفیہ نے اس کی وجہ بتائی۔ اس پر حضرت علی علیہ السلام نے پرچم ان کے ہاتھ سے لے لیا اور خود ہی غرائے ہوئے شیر کے مانند دشمن پر حملہ کر دیا۔ حملہ کرنا تھا کہ دشمن کا لشکر اس طرح منتشر ہوگیا گویا تند و تیز ہوا کے جھونکے نے گرد و خاک کو اِدھر اُدھر بکھیر دیا ہو۔ ①

اس موقع پر "ازد بن ناجیہ" اور بنی ضبہ جیسے عرب قبائل اُونٹ کے گرد جمع ہو گئے جس پر لشکر کا کمانڈر سوار تھا اور بھڑکی ہوئی جنگ میں غیر معمولی فداکاری کا مظاہرہ کیا۔

خلافِ معمول حضرت عائشہ کے لشکر کے ساتھ پرچم نہ تھا البتہ پرچم کی جگہ لشکر سے آگے آگے اُونٹ (جمل) چل رہا تھا اور یہی گویا ان کا پرچم تھا اور اسی سے ان کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی اور جب تک یہ اُونٹ اپنی جگہ قائم رہا دشمن نے خود میں کسی قسم کی کمزوری یا شکست محسوس نہ کی۔ (تاریخ ابن اعثم: ص ۱۷۶، شرح ابن ابی الحدید)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کو حکم دیا کہ وہ دشمن کے بائیں بازو پر حملہ آور ہوں۔ انھوں نے جیسے ہی میسرہ پر حملہ کیا تو لشکرِ دشمن کی صفیں یک لخت منتشر ہوگئیں اور انھوں نے اپنی عافیت راہِ فرار میں سمجھی۔

اب جو لشکر باقی رہ گیا تھا وہ حسب سابق اُونٹ اور اس کے سوار کا دفاع و تحفظ کر رہا تھا۔ فطری طور پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی سپاہ نے بھی اپنی پوری طاقت اسی حصّہ پر لگا دی تھی۔ چنانچہ اس اُونٹ کے گرد شدید خونی جنگ شروع ہوگئی۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۲۵۸)

سر گردنوں سے جدا ہو کر، ہاتھ جسموں سے کٹ کٹ کر فضا میں بکھر رہے تھے اور نوکِ شمشیر مسلسل دشمنوں کے شکموں کو چاک کیے جا رہی تھی مگر اس کے باوجود حضرت عائشہ کے

① مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۶۶، الجمل للمفید: ص ۱۸۳، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۵۱۴، سیرۃ الائمہ اثنا عشر: ج ۱، ص ۴۵۷، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۲۵۷۔

اُونٹ "جمل" کی حفاظت آہنی فصیل کے مانند کر رہے تھے۔ انھوں نے اس اُونٹ کو اپنے حلقہ میں لے رکھا تھا اور اس کا سختی سے دفاع کر رہے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ جب تک یہ اُونٹ اپنے پیروں پر کھڑا رہے گا جنگ کا خاتمہ نہ ہوگا، اس پر آپؑ نے اپنے لشکر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

اعقروا الجمل فانه ان عقر تفرقوا

"اس اُونٹ کی ٹانگیں کاٹ دو، کیوں کہ جیسے ہی یہ اُونٹ زمین پر گرے گا تو دشمن کا لشکر منتشر ہو جائے گا"۔ (تاریخ طبری: ص ۵۱۹)

حضرت علی علیہ السلام کے فرمان کے مطابق تلواریں بلند ہوئیں اور ہر طرف سے تیروں کی بارش جمل کی جانب ہوگئی یہاں تک کہ تیروں کے پھل اس اُونٹ کے پورے بدن میں اُتر گئے۔

جن لوگوں نے اُونٹ کی مہار اپنے ہاتھوں میں سنبھال رکھی تھی وہ یکے بعد دیگرے زمین پر گرنے لگے۔ ان میں سب سے پہلے گرنے والا بصرہ کا مشہور ومعروف قاضی کعب بن سور تھا۔ اس نے قرآن مجید اپنی گردن میں حمائل کر رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں عصا تھا اور دوسرے میں اُونٹ کی مہار۔ اس کے بعد قریش نے پیش دستی کی اور انھوں نے بھی مہار کو اپنے ہاتھ میں تھاما یہاں تک کہ ستر افراد نے یکے بعد دیگر دفاع کی خاطر جان دے دی۔ قریش کے بعد بنی ناجیہ، بنی ضبہ اور ازد قبائل کے لوگوں نے بالترتیب اس کی مہار کو سنبھالا لیکن وہ بھی قتل ہوئے۔ مختصر یہ کہ بقول زبیر: "جس نے بھی اُونٹ کی مہار کو تھاما وہ فوراً ہی مارا گیا"۔ (تاریخ طبری: ج ۴، ص ۵۱۹، اسد الغابہ: ج ۳، ص ۳۰۸، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۲۶۵)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ان گروہوں کے ہمراہ جو نخعی اور ھمدانی قبائل کے حامی طرف دار تھے، مرکزی نقطے کی جانب شدت سے حملہ کر کے دشمن کو منتشر ومتفرق کر دیا اور بجیر نخعی سے فرمایا: "اس وقت یہ اُونٹ تمھارے دست اختیار میں ہے، اس کی ٹانگوں کی رگیں کاٹ دو"۔

بجیر نے شمشیر سے اس پر حملہ کیا، اُونٹ زور سے چیخا اور زمین پر گر گیا تو باقی لشکر بھی فرار ہوگیا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے سپاہیوں نے آپؑ کے حکم سے حضرت عائشہ کے کجاوہ کو ایک طرف منتقل کیا۔ پہلے تو اس اُونٹ کو مار کر جلایا اور پھر اس کی راکھ کو فضا میں منتشر کر دیا۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے اس حکم کے ثبوت نیز اس کی تائید میں کتابِ خدا سے استشہاد پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"اے لوگو! یہ اُونٹ بنی اسرائیل کے بچھڑے کی طرح منحوس و فتنہ انگیز حیوان تھا"۔

اس کے بعد آپؑ نے اس آیت کی تلاوت کی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے خطاب کرتے ہوئے پڑھی تھی:

"اپنے اس خدا کو دیکھو جس کی تم پرستش کرتے ہو کہ ہم اسے کس طرح جلاتے ہیں اور پھر اس کی راکھ کو دریا میں بہا دیں گے"۔ (ملاحظہ ہو: شرح ابن ابی الحدید: ج۱، ص ۲۶۶)

اور اس طرح جنگِ جمل تمام ہوئی۔ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کو ابھی چھ ماہ کا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ جنگ آپؑ پر مسلط کر دی گئی اور ماہ جمادی الآخر ۳۶ ہجری میں "ناکثین" کی مکمل شکست پر اس کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا اور طرفین کا کثیر جانی و مالی نقصان ہوا۔

عام معافی

دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے حکم دیا کہ جنگ سے قبل جو حکم دیا گیا تھا اسے سپاہیوں کے سامنے دوبارہ پڑھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا:

"کسی ایسی عورت سے جس کا شوہر جنگ میں مارا گیا ہے فوراً نکاح نہ کیا جائے بلکہ اسے موقع دیا جائے کہ عرصۂ عدت کو پورا کرے"۔ ①

حضرت عائشہ کے سلسلہ میں بالخصوص محمد بن ابی بکر کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی بہن کے پاس جائیں اور ان کی دلجوئی کریں اگر ان کو تیر لگا ہو یا جسم پر زخم آیا ہو تو اس کا علاج کر دیا جائے۔

محمد بن ابی بکر کے جانے کے بعد حضرت علی علیہ السلام بذاتِ خود حضرت عائشہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور عصا سے حضرت عائشہ کے کجاوہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اے حمیرا! کیا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمھیں یہی کرنے کا حکم دیا تھا؟ کیا

---

① اس حکم کے جاری کرنے سے حضرت علی علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کے افراد کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے، ان کے ساتھ کفار کا سا برتاؤ نہ کیا جائے۔

آنحضرتؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم اپنے گھر میں بیٹھنا، خدا کی قسم جو تمہیں
گھر سے نکال کر باہر لائے ہیں انھوں نے تمھارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔
انھوں نے اپنی خواتین کو پس پردہ بٹھا دیا اور تمہیں وہ میدانِ جنگ میں لے
آئے"۔

اس کے بعد آپؑ نے ان کے بھائی کو حکم دیا کہ وہ عائشہ کو حرث بن ابی طلحہ کی بیٹی صفہ کے پاس لے جائیں، جہاں چند روز آرام کریں۔

جب حالات معمول پر آگئے تو حضرت علی علیہ السلام نے عبداللہ بن عباس کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ عائشہ کے پاس جائیں اور انھیں مدینہ واپس چلنے کے لیے آمادہ کریں۔

حضرت عائشہ نے اگرچہ شروع میں تو چلنے سے انکار کیا مگر جب ابنِ عباس نے ان سے بار بار کہا اور انھیں یہ بتایا کہ حضرت علی علیہ السلام نے فیصلہ کرلیا ہے کہ آپ کو مدینہ لے جایا جائے تو مجبوراً وہ تیار ہو گئیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ کے سفر کی تیاری شروع کی اور انھیں ان کے بھائی عبدالرحمٰن، تیس سپاہیوں اور قبیلۂ عبدالقیس و ہمدان کی بیس عورتوں کی نگرانی میں مدینہ کی جانب روانہ کیا۔ ان سب نے حضرت عائشہؓ کی انتہائی خدمت کی اور ان کے ساتھ پورے اعزاز واحترام کا سلوک کیا۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۵۸، خطبہ ۲۵۵، طبری: ج ۴، ص ۵۴۴)

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عائشہ کی پوری حفاظت اس بنا پر کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انھیں کہیں راستے میں کوئی گزند پہنچے۔ حضرت علی علیہ السلام کی جانب سے حضرت عائشہ کے تحفظ کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زوجہ مطہرہ رسولؐ کے مرتبہ کا پاس کرکے مقامِ رسالت کا احترام کیا جائے۔ اس کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام کو یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر حضرت عائشہ کا قتل ہو گیا تو کہیں ایسا فتنہ بپا نہ ہو جائے جو حضرت عثمان کے قتل کی وجہ سے رُونما ہوا تھا۔ چنانچہ! عمرو بن عاص نے جنگ کے بعد حضرت عائشہ سے کہا تھا:

"اے کاش! تم جنگ میں قتل کر دی گئی ہوتیں"۔

حضرت عائشہ نے اس کا مطلب دریافت کیا تو اس نے کہا:

"اگر تم ماری جاتیں تو جنت میں جاتیں اور ہم اس مسئلے کو حضرت علی علیہ السلام کے خلاف حملہ

کرنے کا اہم ترین بہانہ بنا لیتے"۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج۶ص ۳۲۲)

حضرت علی علیہ السلام کی بصرہ میں آمد

جنگ جمل ختم ہونے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے تین روز تک معرکہ گاہ پر قیام فرمایا۔ مقتولین کی نماز جنازہ پڑھائی اور حکم دیا کہ دشمن کے مقتولین کو جمع کر کے انھیں دفن کیا جائے۔ شہداء کو حضرت علی علیہ السلام کے فرمان کے مطابق ان کے لباس میں ہی دفن کیا گیا۔ جسموں سے جو اعضاء الگ ہو گئے تھے، انھیں یک جا ایک بڑی قبر میں دفن کیا گیا۔ (الجمل: ص ۲۱۱)

مالِ غنیمت کو (سوائے اس اسلحہ کے جس پر مہر خلافت ثبت تھی) سپاہ میں مساوی تقسیم کیا۔ خود بھی ایک حصہ اس میں سے لیا، باقی مال جو جنگ میں ہاتھ آیا تھا اور اس کا شمار مالِ غنیمت میں نہیں ہوتا تھا، مسجد میں لے جایا گیا تاکہ ان کے مالک یا وارثین کی تحویل میں دے دیا جائے۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۵۵، تاریخ طبری: ج ۴، ص ۵۳۸)

بصرہ پہنچنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام سیدھے مسجد میں تشریف لے گئے جہاں آپؑ نے مفصل تقریر کی۔ اہل بصرہ سے خطاب کرتے ہوئے آپؑ نے ان کی سرزنش کی اور فرمایا:

"اے کاہل لوگو! اے وعدہ خلاف انسانو! تم نے تین مرتبہ اپنوں ہی سے خیانت کی اور چوتھی مرتبہ تم نے خدا پر اتہام لگایا، تم نے پیروی بھی کی تو ایک عورت اور بے زبان جانور کی، تم نے اس کی ایک آواز پر غوغا و فتنہ بپا کر دیا اور جب اس حیوان کے پیروں کی رگیں کاٹ دی گئیں تو تم بھاگ نکلے، اخلاقی اعتبار سے تم پست ہو، تمھارے اعمال منافقانہ ہیں اور تمھارا دین و آئین باطل اور تفرقہ اندازی ہے"۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۶۸)

اس کے بعد تمام افراد حتیٰ کہ مجروحین نے بھی آپؑ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ حضرت علی علیہ السلام نے ابن عباس کو بصرہ کی صوبہ داری اور زیاد کو اُمور مالی وخراج کی وصول یابی کے عہدوں پر مقرر و مامور فرمایا۔

اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام خزانہ بیت المال تشریف لے گئے۔ جس وقت آپؑ کی نظر مبارک سونے اور چاندی پر گئی تو آپؑ نے فرمایا:

یا صفراء یا بیضاء غرّی غیری

"اے زرد سونے اور سفید چاندی کے سکو! تم اپنی یہ دل رُبائی کسی اور کو دکھانا، کسی اور کو تم اپنے دامِ فریب میں لانا"۔

اس کے بعد آپؑ نے حکم دیا کہ جو مال موجود ہے، اس کو پانچ سو اعداد میں تقسیم کریں۔ جس وقت سکوں کا شمار کیا گیا تو ان کی تعداد کم و بیش ساٹھ لاکھ درہم تھی۔ چنانچہ! آپؑ کے ساتھیوں میں سے ہر شخص کے حصّے میں پانچ سو سکّے آئے۔ اسی وقت وہاں ایک شخص آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! مجھے بھی کچھ عطا فرمایئے اگرچہ میں کسی وجہ سے جنگ میں شرکت نہ کرسکا لیکن میری نیک خواہشات آپؑ کے ساتھ تھیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنا حصّہ اسے دے دیا۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۷۱، شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۲۴۹)

جنگِ جمل کے ناخوشگوار نتائج

جنگِ جمل کے جو اثرات و نتائج رونما ہوئے وہ نہایت ہی ناخوشگوار تھے۔ ان میں سے بعض کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

① اس جنگ میں دس ہزار سے زیادہ مسلمان قتل ہوئے۔[①] درحقیقت یہ افراد "ناکثین" کے حسد اور جذبۂ جاہ طلبی پر قربان ہوئے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ دو لشکروں کے اتنے سپاہی زمین پر گرے کہ اگر ان کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے جاتے تو گھوڑوں کے سم ان کی لاشوں کے علاوہ کسی اور چیز پر نہ پڑتے۔ لاشوں کا یہ انبار اس عظیم جنگ کا

---

① جنگِ جمل میں جو جانی نقصان ہوا، اس کے بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ ابن اثیر: ج ۲، ص ۲۵۵ اور طبری نے ج ۳، ص ۵۳۹ پر مقتولین کی تعداد دس ہزار افراد لکھی ہے، یعنی ہر طرف سے تقریباً پانچ ہزار افراد قتل ہوئے۔ مسعودی نے ج ۲، ص ۳۵۱ پر مروج الذہب میں مقتولین کی تعداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصحابِ جمل کے تیرہ ہزار افراد مارے گئے اور حضرت علیؑ کی سپاہ میں سے پانچ ہزار افراد شہید ہوئے۔ بلاذری نے انساب الاشراف: ج ۲، ص ۲۵۶ پر درج کیا ہے کہ صرف اہلِ بصرہ میں سے بیس ہزار افراد قتل ہوئے مگر یعقوبی نے اپنی تاریخ کے ج ۲، ص ۱۸۳ پر طرفین کے مقتولین کی تعداد تیس ہزار افراد سے زیادہ بیان کی ہے۔

حاصل وثمرہ تھا جو جمل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس سے قبل بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ بیش تر افراد "ناکثین" کے ہاتھوں ہی مارے گئے۔ مقتولین کی اس کثیر تعداد نے بہت سی اقتصادی مشکلات نیز جسمانی ونفسیاتی دشواریاں مسلمانوں کے لیے پیدا کر دیں۔

۲ اس جنگ کے بعد مسلمانوں میں سے جذبۂ اخوت وبرادری قطعی مفقود ہوگیا اور اُمت مسلمہ پر فتنہ وفساد کے دروازے کھل گئے اور جنگ صفین بھڑک اُٹھی۔ درحقیقت یہ دو جنگیں اس مضبوط رتی سے بندھی ہوئی تھیں، جس کا پہلا سرا بصرہ میں تھا اور دوسرا صفین میں۔ اگرچہ حضرت عائشہ کی حضرت عثمان سے قرابت داری نہ تھی لیکن جنگ جمل نے معاویہ کے لیے اس بنا پر شورش وسرکشی کا راستہ ہموار کر دیا کہ وہ خاندانِ اُمیہ کے فرد اور حضرت عثمان کے رشتہ دار تھے۔ چنانچہ! اس جنگ کے باعث معاویہ کے لیے یہ بہانہ پیدا ہوگیا کہ اس نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے خلاف جنگ وجدل کرنے کے علاوہ خلافت کو اپنے خاندان میں منتقل کر دیا۔ درحالیکہ یہ مقتول خلیفہ کا ہی خاندان تھا اور یہیں سے خلافت نے موروثی شکل اختیار کر لی۔

۳ جنگ جمل کے ضرر رساں نتائج جنگ صفین کے بعد بھی باقی رہے اور جنگ نہروان درحقیقت دو پہلی جنگوں (جنگ جمل وجنگ صفین) کا نتیجہ تھی کیوں کہ ان دو جنگوں کے باعث بعض تنگ نظر اور کوتاہ فکر لوگوں کے دلوں میں بدگمانی کے جذبات اُبھرنے لگے۔ چنانچہ! عملی طور پر وہ تشویش و اضطراب اور حالت تردّد کا شکار ہوکر رہ گئے۔ نیز معاشرے کی طرف سے وہ ایسے بدبین و بدظن ہوئے کہ ہر شخص دوسرے کو عداوت و دشمنی کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔

بعض وہ لوگ جو "خوارج" کہلائے اس رائے کے حامی وطرف دار تھے کہ "ناکثین کے سرداروں نے اپنے پیشوا یعنی حضرت علی علیہ السلام کے خلاف شورش وسرکشی کی ہے اس لیے ان کا شمار کفار میں ہے۔ اس کے بعد ان کے دلوں میں یہ گمان پیدا ہوگیا کہ حضرت علی علیہ السلام نے چوں کہ اپنی حکومت کے استحکام کی خاطر یہ جنگ کی اس لیے وہ بھی آئین ودینِ اسلام سے خارج ہوگئے"۔

بعض لوگوں کی یہ رائے تھی کہ جنگِ جمل میں اگرچہ حضرت علی علیہ السلام حق بجانب تھے، لیکن آپؑ نے چونکہ اہلِ بصرہ کی تمام دولت کو بطور مالِ غنیمت جمع نہیں کیا اور ان کی عورتوں کو قید نہیں کیا اسی لیے یہ آپؑ سے غلطی سرزد ہوئی۔ چنانچہ! اسی بنا پر وہ آپؑ کو ناشائستہ الفاظ سے یاد کرنے لگے۔ انھی میں سے تیسرا گروہ ایسا بھی تھا جو ان دونوں گروہوں کو کافر سمجھتا تھا اور اس کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ (الملل والنحل شہرستانی: ج۱، ص ۱۲۱، والتبصیر: ص ۴۲)

کوفہ دارالحکومت

جنگِ جمل کے مسائل اور بصرہ کی حکومت کے معاملات حل و نظم کرنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے مدینہ اور بصرہ کے لوگوں کو خطوط لکھے، جن میں آپؑ نے جنگِ جمل کے واقعات مختصر طور پر بیان کیے۔ وہ خط جو اہلِ کوفہ کو لکھا تھا، اس میں آپؑ نے مزید یہ بھی مرقوم فرمایا تھا کہ میں جلد ہی کوفہ کی جانب آؤں گا۔ [1]

اس ارادہ کے تحت آپؑ جنگِ جمل کے ایک یا دو ماہ بعد بصرہ سے کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔ بصرہ کے بعض سربرآوردہ لوگ بھی حضرت علی علیہ السلام کے ہمرکاب تھے۔ کوفہ کے لوگ بالخصوص قاریانِ قرآن حضرت علی علیہ السلام کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل آئے اور آپؑ کے حق میں انھوں نے دعائے خیر کی۔

حضرت علی علیہ السلام بتاریخ ۱۲ رجب ۳۶ھ میں اس مقام پر فروکش ہوئے جو "رحبہ" [2] کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں سے آپ سیدھے جامع مسجد تشریف لے گئے اور وہاں آپؑ نے دو رکعت نماز ادا کی۔ (تاریخ طبری: ج ۴، ص ۵۴۳-۵۴۴)

کوفہ کے واقعات بیان کرنے سے قبل یہاں لازم ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا جائزہ لیں جن کے باعث کوفہ کو اسلامی حکومت کا مرکز قرار دیا۔

کوفہ کی اسلامی حکومت کا مرکز قرار دیے جانے کے سلسلے میں مؤرخین نے بہت سے اسباب و علل بیان کیے ہیں۔ ان میں ایک وجہ یہ تھی کہ مالک اشترؒ اور کوفہ کے دیگر سربرآوردہ

---

① علامہ مفیدؒ نے حضرت علی علیہ السلام کے خطوط اپنی تالیف الجمل میں صفحات ۲۱۵، ۲۱۱ پر درج کیے ہیں۔

② ملاحظہ ہو، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۶۰۔

لوگوں کا یہ اصرار تھا کہ اس شہر کو اسلامی حکومت کا مرکز بنایا جائے۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ جمل کے بعد بعض لوگ فرار کر کے کوفہ کی جانب چلے آئے تھے اور اس بنا پر حضرت علی علیہ السلام نے مجبوراً فیصلہ کیا کہ ان کے فتنے کی سرکوبی کے لیے کوفہ کی جانب روانہ ہوں۔

لیکن جب ہم ان حوادث اور مسائل کا جائزہ لیتے ہیں جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے سامنے اس وقت موجود تھے جب آپؑ نے زمامِ حکومت سنبھالی تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ دیگر مسائل تھے جو حضرت علی علیہ السلام کے لیے مرکزِ حکومت منتقل کرنے کے محرک ہوئے۔

اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ فتنہ ناکثین سے قبل حضرت علی علیہ السلام کا خیال تھا کہ ایسی عسکری طاقت منظم ہو جائے جس کے ذریعے معاویہ کا مقابلہ کیا جا سکے مگر ناکثین کی شورش نے اس معاملے میں تاخیر پیدا کر دی۔ چنانچہ! فطری طور پر معاویہ نے اس معاملے کو غنیمت جانا اور اس نے حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے خلاف جنگ کرنے کی غرض سے کافی فوجی طاقت اور دیگر وسائل فراہم کر لیے۔ معاویہ نے شام کے لوگوں کو مطیع و فرماں بردار کرنے کے علاوہ حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے لوگوں کے جذبات مشتعل کیے۔ چنانچہ! عراق کی جانب جو خطوط بھیجے اور جن صاحبِ اثر و رسوخ افراد کو روانہ کیا، ان کا اصلی سبب یہ تھا کہ سردارانِ قبائل اور فرماندارانِ لشکر کو وہ اپنی جانب متوجہ کر لے۔

معاویہ جانتا تھا کہ فتوحات اور اسلامی قلمرو کے وسعت پذیر ہونے کے باعث شام، کوفہ اور بصرہ تین اہم مرکز بن گئے ہیں اور حجاز قومی طاقت کے اعتبار سے خاصا دُور ہو گیا ہے۔ یمن میں بھی قابلِ توجہ و اعتنا عسکری طاقت موجود نہ تھی۔ چنانچہ! جس وقت بُسر بن ارطاۃ نے اس منطقے میں شورش و سرکشی کی تو حضرت علی علیہ السلام کا کارپرداز اس کے مقابل اپنا دفاع نہ کر سکا اور یا یہ کہ جنگِ جمل میں تقریباً سات سو افراد ہی حضرت علی علیہ السلام کی مدد کے لیے ربذہ پہنچے اور اسی لیے حضرت علی علیہ السلام نے "ذی قار" میں توقف فرمایا تا کہ لشکرِ کوفہ وہاں آ جائے۔

یہی وہ مسائل تھے جو حضرت علی علیہ السلام کی تیزبین و دُور اندیش نظروں سے پنہاں نہ رہ سکے۔ آپ کو علم تھا کہ معاویہ نے شام میں اس موقع سے فائدہ اُٹھایا ہے چنانچہ! عسکری طاقت کے علاوہ اس نے دیگر وسائلِ جنگ بھی فراہم کر لیے ہیں۔ اس بنا پر حضرت علی علیہ السلام کے لیے ضروری تھا کہ وہ بھی عظیم مسلح لشکر تیار کریں تا کہ معاویہ سے نبرد آزمائی کی جا سکے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری

تھا کہ دشمن کی نگرانی نزدیک سے کی جائے کیوں کہ اس سے کسی وقت بھی زور آزمائی ہوسکتی ہے۔

ان دو مقاصد کے پیشِ نظر بصرہ اور کوفہ میں سے کسی ایک شہر کو منتخب کیا جاسکتا تھا۔ اب بصرہ بھی ایسی جگہ نہیں تھی، جہاں زیادہ دن تک قیام کیا جاسکے کیوں کہ فتنہ جمل کی آگ سرد کرنے کے لیے وہاں بہت زیادہ خون بہایا گیا تھا اور جنگ کے بعد جو لوگ زندہ رہ گئے تھے ان کے دلوں میں حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے لیے جوش و خروش نہیں تھا بلکہ وہ ایک اعتبار سے پست ہمت و کم حوصلہ ہوچکے تھے۔ اسی بنا پر وہ حضرت علی علیہ السلام کے لیے بھی قابلِ اعتماد نہ تھے۔ چنانچہ! ان وجوہات کی بنا پر بہترین اور مناسب ترین شہر کوفہ ہوسکتا تھا۔

چنانچہ! معاویہ کی طرف سے جب تک خطرے کا امکان ہوسکتا تھا، اس وقت تک حکومت کی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کوفہ میں ہی تشریف فرما رہیں۔

کوفہ پہنچنے پر حضرت علی علیہ السلام کے اقدامات

کوفہ پہنچنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام شہر کی مسجد میں تشریف لے گئے جہاں آپؑ نے لوگوں سے خطاب کیا۔ اس موقع پر آپؑ نے اہلِ کوفہ کی قدر کرتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی کہ انھوں نے آپؑ کی دعوت کو قبول کیا۔ اپنے خطبے میں آپؑ نے ہوا و ہوس، نیز لمبی لمبی آرزوؤں سے گریز کرنے کی ہدایت فرمائی اور ان لوگوں کو تنبیہ کی جو آپؑ کی مدد کرنے سے رُوگردان ہوگئے تھے۔

اس کے بعد آپؑ نے "جعدہ بن ہبیرہ" مخزومی کے مکان پر قیام فرمایا۔[1] بتاریخ ۱۶ رجب آپؑ مسجد میں تشریف لے گئے جہاں پہلی مرتبہ آپؑ نے نمازِ جمعہ کی امامت فرمائی۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۷۲، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۷۶)

اس کے بعد آپؑ نے اُمورِ حکومت کی جانب توجہ فرمائی۔ اپنے ابتدائی اقدامات میں حاکمِ آذر بائیجان، اشعث ابن قیس اور ہمدان کے عامل و کارپرداز جریر ابن عبداللہ کو ان کے مناصب سے برطرف کیا جو کہ حضرت عثمان کے مقرر کردہ والیانِ حکومت تھے، ان دونوں کو اپنے پاس بلایا (وقعہ صفین)۔ اپنے دیگر کارپردازوں کو مختلف مناطق کی جانب روانہ کیا۔ چنانچہ! یزید ابن قیس کو

---

[1] وقعہ صفین: ص ۳ و ۱۰۔

حکومتِ مدائن مخنف بن سلیم کو حکومت اصفہان وہمدان اور مالک اشترؒ کو موصل کی منصب داری عطا کی۔ ①

قاسطین

ناکثین کا فتنہ دب جانے کے بعد ایسے ناہنجار حالات پیدا ہونے لگے جن میں خالص نسلی اور قبائلی محرکات کارفرما تھے۔ اب اسلامی فکر کو پیش کرنے کی کوشش کی جانے لگی جس میں سے روح تو مفقود ہو چکی تھی بس ظاہری خول باقی رہ گیا تھا۔ اب اسلام کی قدرت کو بچانے کے لیے خلیفہ مسلمین کی روز افزوں طاقت مسئلہ تھی اس لیے حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے راستے میں جو دوسرا خطرہ تھا، وہ قاسطین کا وجود تھا۔ قاسطین کا مجمع درحقیقت ان عاملین اور جماعتوں کی منظم شکل تھی جنھیں حضرت علی علیہ السلام کی حکومت سے کسی نہ کسی طرح گزند پہنچی تھی اور انھیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر حضرت علی علیہ السلام کی حکومت برسر اقتدار رہی تو وہ اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔

ان تمام گروہوں اور جماعتوں کا سربراہ معاویہ تھا۔ اس نے اپنے سیاسی واجتماعی موقف کی بنا پر اپنے گرد بہت سے پیروکار جمع کر لیے تھے۔ معاویہ ابن ابی سفیان نے فتح مکہ کے بعد دینِ اسلام قبول کیا تھا اور وہ ان افراد میں شامل تھا جو جنگ کے دوران مسلمانوں کی حراست میں آگئے تھے اور جنھیں پیغمبر اکرم ﷺ نے یہ فرما کر آزاد کر دیا تھا کہ تم سب آزاد ہو۔ ②

۱۲ ہجری میں جس وقت حضرت ابوبکر نے یزید ابن ابی سفیان کی قیادت وفرمانداری میں رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے لشکر روانہ کیا تھا تو معاویہ پرچم دار کی حیثیت سے لشکرِ شام کے ہمراہ تھا۔ جب اس کے بھائی کا انتقال ہو گیا تو خلیفہ وقت نے اسے سپاہ کا فرماندار مقرر کر دیا۔

---

① بعض مورخین نے لکھا ہے کہ جریر کو انھی کی درخواست پر روانہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ مالک اشترؒ نے انھیں روانہ کیے جانے کی مخالفت کی تھی اور یہ کہا تھا کہ جریر کا دل سے جھکاؤ معاویہ کی جانب ہے لیکن اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ان کا امتحان کیے لیتے ہیں۔ پھر دیکھیں گے کہ وہ ہماری طرف کیسے آتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: مروج الذہب: ج ۲، ص ۷۲-۳، وقعۂ صفین: ص ۲۷)

② اذھبوا انتم الطلقاء، اسی وجہ سے معاویہ کا شمار طلقاء میں ہوتا ہے۔

حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں بہت سے نئے علاقے اسلامی حکومت کی قلمرو میں شامل ہوئے۔ چنانچہ! یہی وجہ تھی کہ معاویہ انیس سال تک خاطر جمعی کے ساتھ شام پر حکومت کرتا رہا۔

جس وقت حضرت علی علیہ السلام نے زمامِ حکومت سنبھالی تو معاویہ نے آپ کا فرمان قبول کرنے سے رُوگردانی کی اور حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کو بہانہ بنا کر حضرت علی علیہ السلام سے برسرِ پیکار ہو گیا اور جنگِ صفین کے لیے راہ ہموار کی۔ آخری لمحات میں جب کہ حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کی فتح و پیروزی یقینی تھی تو اس نے عمرو عاص کی نیرنگی سے قرآن مجید کو نیزوں کی نوک پر اُٹھایا اور حضرت علی علیہ السلام کو حکمیت قرآن کی جانب آنے کی دعوت دی اور اس طرح اس نے کوفہ کے سادہ لوح سپاہیوں کو تقدس نمائی سے اپنا گرویدہ بنا لیا یہاں تک کہ انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کو مجبور کیا کہ وہ جنگ کرنے سے باز رہیں۔

قرآن مجید کی ''حکمیت'' کا فائدہ بھی معاویہ کو ہی ہوا۔ (اس کی تفصیل بعد میں بیان کی جائے گی)۔ چنانچہ! پہلی مرتبہ اس کا نام لوگوں کی زبانوں پر خلیفہ کی حیثیت سے آنے لگا اور ۴۰ ہجری میں جب حضرت علی علیہ السلام کو شہید کر دیا گیا تو وہ خلیفہ بن کر مسندِ خلافت پر متمکن ہوا اور اس نے انیس سال سے زیادہ مسلمانوں پر حکومت کی اور بالآخر ماہِ رجب میں اس کا انتقال ہوا۔

معاویہ کی تخریب کاری

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے خلاف معاویہ نے جس قدر مخالفت و تخریب کاری کی، اس کی طرح اندازی عمرو عاص کرتا تھا۔ جیسے ہی یہ اطلاع ملی کہ لوگ حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کر رہے ہیں تو اس نے درج ذیل مضمون پر مشتمل خط زبیر کو لکھا:

''معاویہ کی جانب سے بندۂ خدا زبیر کی خدمت میں عرض ہے کہ اے امیر المومنین! مَیں نے شام کے لوگوں سے کہا کہ وہ آپ کے لیے میرے ہاتھ پر بیعت کریں۔ انھوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ وہ سب متفقہ طور پر آپ کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ انھوں نے ہی مجھ پر دباؤ ڈالا کہ آپ کے حق میں ان سے بیعت لوں۔ آپ کوفہ و بصرہ کی حفاظت کیجیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دو شہر علیؑ ابن ابی طالبؑ کے ہاتھ لگ جائیں کیونکہ ان دو شہروں

پر قبضہ دیگر سرزمینوں کو حاصل کرنے کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے۔
آپ کے بعد میں نے طلحہ کے حق میں بھی لوگوں سے بیعت لے لی ہے۔
اب آپ یہ کہہ کر شورش و سرکشی کریں کہ عثمان کے خون کا بدلہ لینا ہے اور لوگوں کو بھی اسی عنوان سے دعوت دیجیے۔ اس مقصد کی برآوری کے لیے پوری متانت و سنجیدگی اور سرعت سے کام لیجیے"۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج۱،ص ۲۳۱، تاریخ التواریخ: ج۱،ص ۳۸)

معاویہ نے اپنی جدوجہد کا آغاز اسی روش سے کیا اگرچہ کسی بھی تاریخ کی کتاب میں یہ واقعہ نہیں ملتا کہ انھوں نے شام میں زبیر کے حق میں بیعت لی ہو۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے معاویہ کے ساتھ جنگ کرنے سے قبل اتمام حجت کی غرض سے جریر ابن عبداللہ کو خط دے کر روانہ کیا۔ [1] اور اس سے بیعت کا مطالبہ کرتے ہوئے طلحہ و زبیر کی عہد شکنی کا بھی ذکر کیا۔ خط کے آخر میں آپؑ نے مزید تحریر فرمایا:

"اگر خود کو بلاؤوں میں گرفتار کرنا مقصد ہے تو تم سے جنگ کروں گا۔ تم ان آزاد شدہ لوگوں میں سے ہو جن میں خلافت کی اہلیت و شائستگی ہے اور نہ ہی اُمورِ خلافت میں ان کو مشیر بنایا جاسکتا ہے"۔ (مروج الذہب: ج۲، ص ۳۷۷، وقعۂ صفین: ص ۳۱، ۳۴)

جریر نے جب خط معاویہ کو دیا تو وہ اس خط کو پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا اور جریر سے کہا کہ میرے جواب کا انتظار کرو۔ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی غرض سے عمرو عاص کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ "اگر اس مشکل کا حل نکال لو تو مصر کی حکومت میں تمھارے حوالے کردوں گا"۔

معاویہ نے عمرو بن عاص کی تجویز پر شام کے سربرآوردہ لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور ان کے سامنے مفصل تقریر کی۔ اس نے اہل شام کی تحسین و قدردانی کرتے ہوئے ان کے جذبات کو حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کے لیے مشتعل کیا اور حاضرین جلسہ کی اس بارے میں رائے

---

[1] وقعۂ صفین: ص ۲۹، شرح ابن ابی الحدید: ج ۳، ص ۷۵، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۷۶، اور مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۷۲۔

جاننا چاہی۔ اس بات پر حاضرین اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اپنی آمادگی و رضامندی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اس غرض کے تحت انھوں نے معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور یہ وعدہ کیا کہ جب تک دم میں دم ہے، وہ اس عہد پر قائم رہیں گے اور اپنا مال تک اس راہ میں قربان کردیں گے۔

جریر نے جب یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے پاس واپس آگئے اور تمام واقعات آپؑ کے سامنے بیان کیے اور کہا کہ شام کے لوگوں نے معاویہ کے ساتھ گریہ وزاری بھی کی اور آپ سے جنگ کرنے کے لیے سب متفق الرائے ہیں کیوں کہ ان کا گمان ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب علیہما السلام نے حضرت عثمان کو قتل کرایا ہے اور ان کے قاتلوں کو پناہ دی ہے۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج۵،ص ۱۲۹)

سرکشی کے اسباب

معاویہ نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے خلاف کیوں سرکشی کی نیز اس کے پسِ پشت کیا اسباب و علل اور محرکات کارفرما تھے ان کا مختصر طور پر ہی سہی مگر ذکر کردینا بہت ضروری ہے:

① دشمنی اور کینہ

خاندانِ بنی اُمیہ کو جس کا سردار معاویہ تھا، ہاشمی خاندان بالخصوص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام سے سخت عداوت و دشمنی تھی۔ اس دشمنی و کینہ توزی کا آغاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہدِ رسالت سے اور اس کے بعد پیش آنے والے غزوات کے باعث ہوا۔

عداوت و دشمنی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جہاں کہیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کا ذکر ہوتا تو معاویہ اپنے دل میں ملول ہوتا۔ ذیل کی حکایت اس کی شاہد و گواہ ہے:

> ''مطرف ابن مغیرہ'' سے منقول ہے کہ میرے والد کی معاویہ کے پاس آمدورفت تھی۔ وہ جب بھی اس کے پاس سے واپس گھر آتے تو اس کی ذہانت و ذکاوت کی بہت تعریف کرتے۔ ایک رات معاویہ کے پاس سے

آئے تو میں نے انھیں اتنا مضطرب و پراگندہ خاطر پایا کہ انھوں نے کھانا تک نہیں کھایا۔ میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ وہ اس قدر کیوں مضطرب و پریشان خاطر ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ آج میں انتہائی کافرو خبیث ترین شخص کے پاس سے آرہا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ آخر ہوا کیا؟ تو انھوں نے کہا کہ میں معاویہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب خلوت ہوئی تو میں نے کہا: اے امیرالمومنین! آپ کافی عمر رسیدہ ہو چکے ہیں اور عہدپیری کی منزل تک پہنچ گئے، کیا اچھا ہوگا کہ آپ اب عدل و انصاف سے کام لیں اور اپنے بھائی بنی ہاشم سے صلہ رحمی کے ساتھ پیش آئیں کہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس کے باعث آپ کو ان سے خطرہ ہو۔ اس کے علاوہ اگر آپ حُسنِ سلوک کریں گے تو وہ لوگ آپ کو یاد رکھیں گے اور اس کا آپ کو اجر بھی ملے گا۔

اس پر معاویہ نے کہا: ہرگز نہیں! اپنے کام کی بقا کی خاطر کس اُمید پر نیک کام کروں، تیم کے بھائی ابوبکر کو خلافت ملی، عدل و انصاف کو اپنا شیوہ بنایا اور جو کچھ کرنا تھا انھوں نے کیا لیکن جب ان کی وفات ہوگئی تو لوگ انھیں بھول گئے۔ بس لوگوں کو اتنا ہی یاد رہ گیا کہ ابوبکر کے بعد عدی کے بھائی عمر نے حکومت کی۔ دس سال تک وہ خدمتِ خلق کرتے رہے مگر مرنے کے بعد ان کا نام بھی صفحۂ ہستی سے محو ہو گیا۔ صرف چند ہی لوگوں کو یہ نام (عمر) یاد رہ گیا ہے لیکن اس کے برعکس "ابی کبشہ" کے فرزند محمد ابن عبداللہ کا نام ہر روز پانچ مرتبہ باآواز بلند لیا جاتا ہے اور اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد میری کون سی کارکردگی اور یاد باقی رہ جائے گی۔ خدا کی قسم! جیسے ہی میں خاک کے نیچے جاؤں گا تو میرا نام بھی اسی کے ساتھ دفن ہو جائے گا"۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۱۹، ۱۲۰، شرح ابن ابی الحدید: ج ۳، ص ۱۸۹)

② حکومت کی آرزو

معاویہ جانتا تھا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اسے اس کے منصب پر قائم نہیں رہنے دیں گے کیوں کہ اسے اس بات کا علم تھا کہ حضرت علی علیہ السلام نے ظلم و استبداد کی ہمیشہ مخالفت کی ہے اور حکومت اسی لیے قبول کی کہ اسے عدل و انصاف سے چلائیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام کے کردار سے وہ چوں کہ بخوبی واقف تھا، اسے اس لیے یہ بھی علم تھا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نہ صرف یہ کہ حکومتِ شام کی جانب سے چشم پوشی نہ کریں گے بلکہ وہاں جو انھوں نے حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں جمع کیا تھا، اس سے لے کر بیت المال میں داخل کردیں گے۔ اس کے بعد وہ ایک معمولی فرد کی طرح اپنی باقی عمر کسی گوشۂ تنہائی میں گزارے گا۔ یہ بات اس کے لیے کسی طرح بھی قابلِ برداشت نہ تھی۔

چنانچہ! یہی وجہ تھی کہ وہ جب تک شام پر حکم فرما رہا، اس نے کبھی مرکزی حکومت کے کارپرداز نمایندے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا بلکہ وہاں اپنے لیے ایک مستقل سلطنت کی بنیاد قائم کردی تھی تاکہ اپنی مرضی کے مطابق وہ لوگوں پر حکمرانی کرسکے اور ایسی حکومت کی بنیاد رکھ دی جو اس کے خاندان میں آنے والی نسلوں کی میراث بن گئی۔

③ ناکثین کی شورش

ناکثین کی شورش نے حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کی تحریک کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو معاویہ کے لیے مشکل تھا کہ اس اتحاد کو جو مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوگیا تھا اور جس کی سرزمین اسلام کے بیشتر علاقوں پر حکم و فرمانروائی تھی، اس کو درہم برہم کرسکے اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف مقابلے کی ہمت و جرأت پیدا ہوسکے لیکن جنگِ جمل کے جو ناخوش گوار نتائج رُونما ہوئے انھوں نے اس سدِّ عظیم کو گرادیا اور معاویہ کے واسطے شورش و سرکشی کا میدان ہموار کردیا۔

④ گذشتہ خلفاء کی دلیل و مثال

اس کے علاوہ معاویہ اپنے اس رویّے کی یہ توجیہ پیش کرتا اور کہتا کہ گذشتہ خلفاء نے حضرت

علی علیہ السلام پر سبقت حاصل کرلی اور مسلمانوں نے بھی ان کی حکومت کو تسلیم کرلیا۔ اسی لیے میں بھی انھی کے رویے کی پیروی کر رہا ہوں۔

چنانچہ! جب اس نے "محمد ابن ابی بکر" کو خط لکھا تو اس میں اس نے اسی امر کی جانب اشارہ کیا کہ:

"تمھارے والد اور (حضرت) عمر اُن اوّلین افراد میں سے تھے، جنھوں نے خلافت میں (حضرت) علیؑ کی مخالفت کی اور ان کا حق خود لے لیا۔ وہ خود تو مسند خلافت پر متمکن رہے مگر (حضرت) علیؑ کو انھوں نے امر خلافت میں شریک تک نہ کیا...... اگر وہ راہِ راست پر چل رہے ہیں تو تمھارے والد وہ پہلے شخص تھے، جنھوں نے یہ راہ اختیار کی۔ اگر ہم ظلم وستم کے راستے پر گامزن ہیں تو اس راستے کو بھی تمھارے والد نے سب سے پہلے ہموار کیا تھا۔ اس مقصد میں ہم ان کے شریک کار ہیں اور انھی کی پیروی کر رہے ہیں۔ اگر تمھارے والد اس راہ میں ہم پر سبقت نہ لے جاتے تو ہم (حضرت) علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ہرگز مخالفت نہ کرتے لیکن ہم نے دیکھا کہ تمھارے والد نے یہ کام انجام دیا ہے چنانچہ! ہم ان کی راہ و روش پر گامزن ہیں"۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۵۴، وقعۂ صفین: ص ۳۸، ۴۰)

⑤ پروپیگنڈا

حضرت عثمان کے قتل کے بعد طلحہ و زبیر نے جو شورش و سرکشی کی راہ اختیار کی اس کے باعث معاویہ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کر سکے اور اس میں بھی جو چیز کارفرما تھی، وہ حضرت عثمان کے خون کا بدلہ تھا۔

معاویہ نے اہلِ شام کے جذبات برافروختہ کرنے کے لیے حضرت عثمان کے خون آلود کرتے اور ان کی اہلیہ کی قطع شدہ انگلی کو جنھیں نعمان بن بشیر اپنے ساتھ مدینہ سے لے آیا تھا مسجد کی دیوار پر نصب کر دیا اور انھوں نے چند عمر رسیدہ لوگوں سے کہا کہ وہ ان چیزوں کے نزدیک بیٹھ کر گریہ وزاری کریں۔ اس پروپیگنڈے نے لوگوں کے دلوں پر ایسا گہرا اثر کیا کہ جیسے ہی معاویہ

کی ولولہ انگیز تقریر ختم ہوئی، لوگ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سب نے ایک آواز ہو کر کہا کہ ہم حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے اور معاویہ کے ہاتھ پر یہ کہہ کر بیعت کی کہ جب تک ہمارے دم میں دم ہے، تمھارا ساتھ دیں گے۔

مشہور و معروف اشخاص کو اپنانا

معاویہ کا مقصد چونکہ زمامِ حکومت کو اپنے اختیار میں لینا تھا، اسی لیے اس کی مسلسل یہ سعی و کوشش تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے ان لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مائل کریں جو اس کام کے لیے مناسب ہو سکتے ہیں اور ان کے ساتھ یہ عہد و پیمان کریں کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے خلاف سرگرمِ عمل رہیں گے۔ اس کام میں جو لوگ اس کے ہم خیال رہے، ان کے نام درج ذیل ہیں:

① عمرو بن عاص: معاویہ نے اس سے کہا: تم میرے ہاتھ پر بیعت کرو اور میری مدد کرو۔
اس پر عمرو عاص نے کہا کہ خدا کی قسم! دین کی خاطر تو میں یہ کام نہیں کر سکتا، البتہ دنیوی مفاد کی خاطر میں تیار ہوں۔
معاویہ نے دریافت کیا: کیا مانگنا چاہتے ہو؟
اس نے کہا: مصر کی حکومت۔
معاویہ نے اس کے مطالبے کو منظور کیا اور دستاویز بھی لکھ کر دے دی۔ (وقعہ صفین: ص ۴۴)

② طلحہ و زبیر: جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ معاویہ نے زبیر کو جو خط لکھا تھا اس میں زبیر کو امیر المومنین کے لقب سے یاد کیا تھا اور ان کی نیز طلحہ کی توجہ کو اپنی جانب مائل کرنے کی غرض سے ایسا ظاہر کیا کہ میں نے تمھارے حق میں شام کے لوگوں سے بیعت لے لی ہے اور طلحہ کو ولی عہد مقرر کر دیا ہے۔

③ شرجیل: اس کا شمار شام کے با اثر و رسوخ افراد میں ہوتا تھا، معاویہ نے خاص حکمت عملی کے ذریعے اسے اپنی جانب مائل کیا اور وہ بھی اس کا ایسا گرویدہ ہوا کہ معاویہ کا دم بھرنے کے علاوہ حضرت عثمان کے خون کا مطالبہ شروع کر دیا۔ معاویہ نے ضمناً عمرو عاص کا ذکر کرتے ہوئے اسے خط میں لکھا:

"(حضرت) علیؓ کا جریر نامی نمائندہ میرے پاس آیا ہے اور اس نے بہت اہم تجویز میرے سامنے رکھی ہے۔ یہ خط ملتے ہی آپ فوراً میرے پاس چلے آئیں"۔

معاویہ نے شرجیل کے آنے سے قبل بعض ایسے لوگوں کو جو اس کے نزدیک قابلِ اعتماد تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ شرجیل کے قرابت دار بھی، یہ ہدایت کی کہ جب شرجیل مجھ سے ملاقات کر چکے تو وہ اس سے ملاقات کریں اور اسے اطلاع دیں کہ (حضرت) عثمان کا قتل (حضرت) علیؓ کے ایماء پر ہی ہوا ہے (ان کی قرابت داری میں یزید بن اسد، بسر بن ارطاۃ اور عمرو بن سفیان بھی شامل تھے)۔

شرجیل کو جیسے ہی معاویہ کا خط ملا تو عبدالرحمن ابن غنم اور عیاض جیسے خیر خواہ دوستوں کی مرضی و منشاء کے خلاف اس نے معاویہ کی دعوت کو قبول کر لیا۔ اگرچہ انھوں نے بہت منع کیا مگر اس کے باوجود حمص سے دمشق کی جانب روانہ ہو گیا۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۵)

شرجیل جیسے ہی شہر میں داخل ہوا تو معاویہ کے ہوا خواہ اس کے ساتھ بہت عزت و احترام سے پیش آئے۔ اس کے بعد معاویہ نے جریر کے خط کا ذکر کیا اور مزید کہا: "اگر (حضرت) علیؓ نے (حضرت) عثمان کو قتل نہ کرایا ہوتا تو وہ بہترین انسان شمار کیے جاتے"۔

جب معاویہ کی گفتگو ختم ہو گئی تو شرجیل نے کہا: "مجھے اس مسئلے پر سوچنے کا موقع دیجیے تاکہ اس کے بارے میں غور و فکر کر سکوں"۔

معاویہ سے رخصت ہو کر جب وہ واپس ہوا تو اس کی کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ تو پہلے سے ہی اس سے ملنے کے متمنی و مشتاق تھے۔ شرجیل نے حضرت عثمان کے قتل کے بارے میں ان سے دریافت کیا تو سب نے یہی کہا کہ (حضرت) علیؓ ہی (حضرت) عثمان کے قاتل ہیں۔

یہ سننے کے بعد شرجیل غضبناک حالت میں معاویہ کے پاس واپس آیا اور کہا کہ لوگوں کا یہ خیال واضح ہے کہ حضرت عثمان کو حضرت علیؓ نے قتل کیا ہے۔ خدا کی قسم! اگر تم نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تو ہم لوگ تمہیں شام سے باہر نکال دیں گے یا تمہیں قتل کر ڈالیں گے۔

معاویہ نے محسوس کر لیا کہ اس کا منصوبہ کارگر ثابت ہوا ہے، اور کہا کہ میں بھی شام کے افراد میں سے ایک ہوں۔ میں نے آج تک تمھاری مخالفت نہیں کی ہے اور آئندہ بھی ایسا نہ کروں گا

مگر تم کو یہ جاننا چاہیے کہ یہ کام شام کے عوام کی مرضی کے بغیر صورت پذیر نہیں ہو سکتا۔ تم کو اس منطقے میں شہرت و ناموری حاصل ہے۔ اب تم شام کے مختلف شہروں کا دورہ کرو اور لوگوں کو بتاؤ کہ (حضرت) عثمان کو (حضرت) علیؑ نے قتل کیا ہے اور اب مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کے خون کا بدلہ لینے کی خاطر شورش و سرکشی کریں تو شرجیل نے ایسا ہی کیا۔ چنانچہ! چند زاہد و پارسا و گوشہ نشین افراد کے علاوہ شام کے عام لوگوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ (وقعہ صفین: ص ۴۵-۵۰، شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۷۱)

قاسطین (جنگِ صفین والے)

معاویہ سے مراسلات کا محرک

حضرت علی علیہ السلام جب تک کوفہ میں قیام پذیر رہے اور صفین کی جانب روانہ ہونے سے پہلے تک آپؑ نے معاویہ کی جانب خطوط بھیجنے اور اپنے نمایندگان کو روانہ کرنے میں ہمیشہ پیش قدمی کی تاکہ اسے اس راہ وروش سے روکا جاسکے جو اس نے اختیار کر رکھی تھی جس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام دل سے یہ نہیں چاہتے تھے کہ شام کے لوگوں سے جنگ کی جائے کیوں کہ وہ بھی مسلمان تھے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام چاہتے تھے کہ معاویہ، شام کے عوام اور ان لوگوں کے لیے جو آیندہ آپؑ کے ہم رکاب رہ کر معاویہ سے جنگ کریں گے، اُن پر اتمام حجت ہوجائے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ اگر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام معاویہ کے خطوط کا جواب نہ دیتے اور اس کے عدم تعاون کے خلاف صریح وقطعی موقف اختیار نہ کرتے تو ممکن تھا کہ عوام اس رائے کے حامی ہوجاتے کہ معاویہ حق بجانب ہے۔

ابن ابی الحدید نے ان بعض خطوط کو نقل کرتے ہوئے جن کا مبادلہ حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان ہوا تھا لکھا ہے کہ:

> "اگرچہ! زمانہ میں نیرنگیاں تو بہت ہیں مگر اس سے زیادہ عجیب کیا بات ہوسکتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے لیے نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ ان کا اور معاویہ کا شمار ایک ہی صف میں کیا جانے لگا اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مراسلت کریں"۔ ①

---

① ملاحظہ ہو، شرح نہج البلاغہ: خطبہ ۱۶، ص ۱۳۶۔ اس کے علاوہ خود امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام بھی اقوال میں فرماتے ہیں: "اس سے زیادہ میرے لیے اور کیا باعث تردد ہوگا کہ میرا موازنہ ان لوگوں سے ⇦

اس کے بعد ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ اس مراسلت و مکاتبت کے پس پشت کون سا محرک کارفرما تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاید حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں اس کی وہ مصلحت آشکار و روشن تھی جو ہم پر پوشیدہ و پنہاں ہے۔ اُوپر جو وجوہ بیان کیے گئے ہیں، ان کے علاوہ خطوط لکھنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ:

① "زور آور و تومند سیاسی افراد نے مختلف احادیث جعل کر کے معاویہ کو اس بلند مقام پر پہنچا دیا اور اس کے لیے یہ فضائل اختراع کیے کہ معاویہ امام علیہ السلام کے مقابلے میں آ گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ معاویہ خود کو افضل تصور کرتا تھا اور اس پر فخر کرتا تھا۔ یہ تحریک حضرت عمر کے عہد خلافت میں شروع ہوئی[1] اور بالآخر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے زمانِ خلافت میں شدت اختیار کر گئی۔

② معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں اس نے حضرت علی علیہ السلام سے بہت سی ناروا باتیں منسوب کی ہیں اور اپنی طرف سے ایسے افتخارات کی نسبت دی ہے جن کی کوئی اساس نہیں ہے۔ اگر حضرت علی علیہ السلام نے ان حقائق کو آشکار نہ کیا ہوتا اور اس ضمن میں ضروری باتیں نہ بتائی ہوتیں تو بہت سے حقیقی واقعات نظروں سے اوجھل ہو کر رہ جاتے اور اگر ان افترا پردازیوں کا جواب نہ دیا گیا ہوتا جو کہ آپؑ کے ساتھ روا رکھی گئی تھیں تو سادہ لوح انسان ان کو حقیقت سمجھ کر قبول کر لیتے۔

حضرت علی علیہ السلام سے جو اتہامات منسوب کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ کو اپنے سے پہلے کے خلفاء سے حسد و بغض تھا اور ان کے خلاف شورش کرنا چاہتے تھے۔ اگر اس کا جواب نہ دیا گیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ سپاہِ عراق میں تفرقہ پیدا ہو جاتا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس سازش کو روکنے کی غرض سے اپنے منطقی و مستدل بیان سے معاویہ کو

⇐ کیا جا رہا ہے درحالیکہ میں (حضرت) عثمان، طلحہ، زبیر، سعد اور عبدالرحمٰن کے ہم پلہ نہیں۔ زمانے نے مجھے اس قدر گرا دیا ہے کہ میرا اور معاویہ کا نام ایک ساتھ لیا جاتا ہے"۔

① حضرت عمر ابن خطاب نے معاویہ کو "کسرائے عرب" کا لقب دیا تھا اور شورائے خلافت کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ خبردار! اگر تم ایک دوسرے کے ساتھ اختلاف کرو گے تو معاویہ شام سے اُٹھے گا اور تمہیں مغلوب کر لے گا۔

جواب دیا۔ ①

حجاز کی جانب دراز دستی

حضرت علی علیہ السلام کی یہی کوشش تھی کہ معاویہ سے جو اختلافات ہیں وہ مسالمت آمیز طریقے سے حل ہو جائیں اور وہ قتل و خون ریزی کے بغیر حق و انصاف کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے لیکن اس کے برعکس معاویہ پوری سنجیدگی سے حالات کی برہمی و آشفتگی اور مسلمانوں میں باہمی اختلاف و گروہ بندی کی کوشش کرتا رہا۔ چنانچہ اس نے اپنے سیاسی اقتدار کو تقویت دینے کے لیے سربرآوردہ افراد اور سردارانِ قبائل کو خط لکھنے شروع کیے تاکہ اس طریقے سے حجاز اس کی دسترس میں آجائے۔

اس سلسلے میں اس نے عمرو بن عاص سے مشورہ کیا اور کہا کہ اس اقدام کے ذریعے ہمیں دو نتائج میں سے ایک حاصل ہوگا۔ یا تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے اور انھیں اپنا ہم خیال بنا لیں گے یا کم از کم ان کے درمیان شک و تردد پیدا کر دیں گے تاکہ وہ (حضرت) علیؑ کو مدد دینے سے باز رہیں۔

لیکن عمرو بن عاص کی رائے میں یہ اقدام موثر نہ تھا کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ جن افراد کو خط لکھا جا رہا ہے وہ حضرت علی علیہ السلام کے طرف دار ہیں، اس صورت میں انھیں خط لکھنے سے ان کی نظر و بصیرت میں اضافہ ہوگا اور وہ بیش تر (حضرت) علی علیہ السلام کے حامی و طرف دار ہو جائیں گے یا پھر وہ لوگ ہیں جو حضرت عثمان کے جانب دار ہیں۔ انھیں خط لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ وہ جو کچھ بھی ہیں خط سے ان پر مزید کوئی اثر ہونے والا نہیں۔ رہے وہ لوگ جو ہر طرف سے لاتعلق ہیں تو انھیں بھی تم سے زیادہ علیؑ پر اعتماد ہے۔

---

① بطورِ مثال حضرت علی علیہ السلام پر حسد کا اتہام لگایا گیا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے لکھا تھا...... بالفرض اس الزام میں اگر کوئی صداقت ہے تو ایسا کوئی جرم نہیں جو تم پر بھی عائد ہوا اور میں اس کے لیے عذر خواہی کروں۔ بقول شاعر اگرچہ تنگ ہے مگر اس کی گرد تمھارے دامن کو نہ پکڑے گی (نہج البلاغہ: خطبہ ۲۸)۔ معاویہ کے خطوط اور حضرت علی علیہ السلام کے جوابات کے لیے بیش تر اطلاع کے لیے ملاحظہ ہو، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۸۳)

لیکن معاویہ اپنے فیصلے پر پوری سنجیدگی سے قائم رہا بالآخر دونوں نے مشترکہ طور پر اہل مدینہ کو لکھا اور اس میں انھوں نے یہ اتہام لگایا کہ عثمان کے قاتل علیؑ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت علی علیہ السلام اور اہل مدینہ سے درخواست کی کہ حضرت عثمان کے قاتل ان کے حوالے کیے جائیں اور اس سلسلے میں اہل مدینہ سے مدد چاہی۔(وقعۂ صفین: ص ۶۲-۶۳، شرح ابن ابی الحدید: ج ۳، ص ۱۰۹)

مذکورہ بالا خط کے علاوہ انھوں نے سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمر اور محمد بن مسلمہ ایسے سربرآوردہ لوگوں کو بھی خطوط لکھے کہ جنھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

اس اقدام سے معاویہ کا مقصد و مدعا یہ تھا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کو داخلی مشکلات و کش مکش سے دوچار کر دے کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو اسے دو جانبہ فتح و کامرانی حاصل ہوگی۔ اوّل تو یہ کہ سربرآوردہ اشخاص کی حمایت حاصل کرے گا اور دوسری طرف اس کے اس اقدام سے مرکزی حکومت کو کاری ضرب لگے گی۔

لیکن معاویہ کو جیسا کہ عمرو بن عاص نے پیشین گوئی کی تھی، کامیابی حاصل نہ ہوئی کیونکہ جن اشخاص کو خطوط لکھے گئے تھے، انھوں نے منطقی و مدلل جواب کے ساتھ اس کی درخواست کو رد کر دیا۔(ان خطوط کے جوابات کا مطالعہ کرنے کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب وقعۂ صفین، صفحات ۶۳، ۷۱، ۷۲، ۷۵ اور ۷۶)

نمایندے کی روانگی

اس سے پہلے کہ جنگ و جدال کی نوبت آئے حضرت علی علیہ السلام اس طریقے کو بروئے کار لائے جس کے ذریعے اہل شام بیدار ہو سکیں اور معاویہ کو شورش و سرکشی سے باز رکھا جا سکے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے خفاف بن عبداللہ کو معاویہ کے پاس بھیجا کیوں کہ خفاف نے شاعرانہ مزاج پایا تھا اور فطرتاً بولنے والے واقع ہوئے تھے۔ شام پہنچنے کے بعد انھوں نے اپنے چچازاد بھائی حابس بن سعد کو جو قبیلہ کے سردار تھے، اپنے ساتھ لیا اور دونوں مل کر معاویہ کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت عثمان کے واقعۂ قتل کی پوری تفصیل اس کے سامنے بیان کی۔ اس کے بعد انھوں نے یہ بھی بتایا کہ لوگ حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے کے لیے کس طرح متمنی و

خواہش مند تھے۔ ساتھ ہی انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کی بصرہ و کوفہ کی جانب روانگی کی مفصل کیفیت بیان کی اور مزید کہا کہ اس وقت بھی بصرہ ان کے ہاتھ میں ہے اور کوفہ میں تمام طبقات کے لوگ جن میں بچے، سن رسیدہ خواتین، نئی دلہنیں وغیرہ شامل ہیں، پورے جوش و خروش سے آپ کا استقبال کرنے کے لیے شاداں و خنداں آئے اور میں جس وقت ان کے پاس سے روانہ ہوا تھا تو اس وقت ان کے سامنے شام کی جانب آنے کے علاوہ کوئی مقصد نہ تھا۔

معاویہ نے جب یہ کیفیت سنی تو اس پر خوف طاری ہو گیا اور ان لوگوں کی موجودگی میں جو ان کے گرد جمع تھے اسے اپنی شکست کا احساس ہوا۔ ناچار اس نے حابس سے کہا کہ لگتا ہے کہ یہ شخص (حضرت) علیؑ کا جاسوس ہے، اسے اپنے پاس سے آگے چلتا کر، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شام کے لوگوں کو گمراہ کر دے۔ (وقعۂ صفین: ص ۶۸)

مہاجرین و انصار سے مشورہ

جب حضرت علی علیہ السلام کو یہ یقین ہو گیا کہ اب یہ طوفان دبنے والا نہیں اور معاویہ اپنے ارادے سے باز نہ آئے گا تو ناچار آپؑ نے فیصلہ کیا کہ مقابلے کے لیے اقدام کریں۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریق کار پر عمل کرتے ہوئے آپؑ نے جنگ سے قبل اپنے مہاجرین اور انصار و اصحاب سے مشورہ کیا۔ حضرت علی علیہ السلام کے پیروکاروں نے مختلف افکار و خیالات کا اظہار کیا جن میں بیشتر افراد کی رائے یہی تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے اقدام کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ جتنی جلد ہو سکے اس بارے میں فیصلہ کر لیا جائے۔ مگر ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو یہ چاہتے تھے کہ پہلے مسالمت آمیز طریقہ اختیار کیا جائے اور اگر حریف اپنی عناد پسندی اور سرکشی پر قائم رہا تو جنگ شروع کی جانی چاہیے۔ (وقعۂ صفین: ص ۹۲)

سب سے آخر میں سہیل بن حنیف اپنی جگہ سے اُٹھے اور اُنھوں نے حاضرین کی نمائندگی کرتے ہوئے عرض کیا: امیر المومنینؑ! آپ جس کے ساتھ صلح و آشتی چاہیں گے، ہم اس کے ساتھ صلح و آشتی کریں گے۔ ہماری رائے اور مرضی وہی ہے جو آپؑ کی ہے۔ ہم سب دست راست کے مانند آپؑ کے مطیع و فرمانبردار ہیں"۔ (وقعۂ صفین: ص ۹۳)

اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے عام لوگوں کو آمادہ کرنے کی خاطر خطبہ دیا اور لوگوں کو جہاد

کرنے اور صفین کی جانب روانہ ہونے کے لیے جوش دلایا، آپؑ نے فرمایا:

سیروا الی اعداء اللہ سیروا الی اعداء السنن والقرآن سیروا الی بقیۃ الاحزاب قتلۃ المہاجرین والانصار (وقعۂ صفین: ص ۹۴)

"چلو دشمنانِ خدا کی طرف، چلو سنت و قرآن کے دشمنوں کی جانب، ان لوگوں کی طرف جو باطل کے گروہ میں سے بچ گئے ہیں جو مہاجرین وانصار کے قاتل ہیں"۔

اسی اثناء میں بنی فزارہ قبیلے کا "اربد" نامی شخص اٹھا جو بظاہر معاویہ کا ہمنوا اور اس کا جاسوس تھا، اس نے کہا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے لے جائیں؟ بالکل اسی طرح جیسے آپ برادرانِ بصرہ کے خلاف ہمیں لے گئے تھے۔ خدا کی قسم! ہم ہرگز ایسا کوئی اقدام نہیں کریں گے۔

حضرت مالک اشترؒ نے جب یہ دیکھا کہ یہ شخص مسلمانوں کی صفوں کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے بلند آواز میں کہا: "ہے کوئی جو ہمیں اس کے شر سے نجات دلائے؟"

اربد فرازی نے جیسے ہی مالک اشترؒ کی آواز سنی تو خوف کے مارے بھاگ نکلا۔ لوگوں نے اس کا تعاقب کیا اور بالآخر بیچ بازار میں اسے پکڑ لیا اور گھونسوں، لاتوں اور شمشیر کی نیام سے اسے اتنا مارا کہ اس کی جان ہی تن سے نکل گئی۔ ①

عمومی فوج

جب حضرت علی علیہ السلام نے سرکشوں اور شورش پسندوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے رائے عامہ کو ہموار کر لیا تو آپؑ نے مختلف مناطق میں اپنے کارپردازوں کو فوجی فرمان داروں اور عاملین محصول کو خطوط لکھے، جن میں انھیں ہدایت کی گئی کہ اپنے اپنے علاقوں میں وہ لوگوں کو اس جہادِ مقدس میں شرکت کی دعوت دیں اور جو لوگ متمنی ہیں، انھیں مرکز کی جانب روانہ کیا جائے۔ ②

① وقعۂ صفین: ص ۹۴۔ چونکہ اس کے قاتلین کی تشخیص نہ کی جا سکی اسی لیے حضرت علی علیہ السلام نے اس کا خون بہا بیت المال سے ادا کیا۔

② ان خطوط کے متون کا مطالعہ کرنے کے لیے کتاب "وقعۂ صفین" کے صفحات ۱۰۲-۱۰۸ ملاحظہ ہوں۔

لوگوں کے دلوں میں جذبۂ خلوص و قربانی کو تقویت دینے کی خاطر مسجد کے منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ دیا۔ خطبہ کے دوران بعض مقامات پر آپؑ نے یہ بھی فرمایا:

"معاویہ اور اس کے سپاہی باغی و سرکش ہو گئے ہیں کیوں کہ شیطان نے ان کی زمام اپنے دستِ اختیار میں لے لی ہے اور پُر فریب وعدوں سے انھیں گمراہ کر دیا ہے۔ تم خداوند تعالیٰ کی دانا ترین مخلوق ہو اور اس نے جن چیزوں کو حلال و حرام قرار دیا ہے، ان کے درمیان تم خوب تمیز کر سکتے ہو۔ چنانچہ! جو تم جانتے ہو، اس پر اکتفا کرو اور خدا نے جن چیزوں سے گریز کرنے کے لیے فرمایا ہے تم ان سے اجتناب کرو"۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۱۳)

حضرت علی علیہ السلام کے خطبے کے بعد آپؑ کے دونوں فرزند دل بند حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی اس مسئلے کی اہمیت کو واضح و روشن کرنے کی غرض سے بصیرت افروز تقاریر کیں۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کے بعض ارشاداتِ عالیہ میں آیا ہے:

"معاویہ اور اس کے سپاہی تیار ہو چکے ہیں۔ خیال رہے تم ہرگز کنارہ کشی نہ کرنا کیوں کہ کنارہ کشی اور احساسِ کمتری دلوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں۔ نوکِ نیزہ کے سامنے سینہ سپر ہونا، عزت، شجاعت اور پاک دامنی کی علامات ہیں"۔ (حوالہ سابق)

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے عام خطبہ دینے کے علاوہ ان لوگوں سے بھی شخصاً ملاقات کی جن کا ارادہ جنگ سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا تھا۔ چنانچہ انھیں سمجھا کر صفِ مجاہدین میں لے آئے۔ (وقعۂ صفین: ص ۳-۷)

حضرت امام حسین علیہ السلام نے تقریر کرنے کے علاوہ لوگوں کو راہِ خدا میں جہاد کرنے کی ترغیب دلائی اور انھیں بعض آدابِ فنِ حرب و جنگ بھی سکھائے اور سب کو اتحاد و یگانگی کی دعوت دی۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۱۶)

جب حضرت علی علیہ السلام اور ان کے دونوں فرزند ارجمند کی تقاریر اختتام پذیر ہوئیں تو اکثر و بیشتر لوگ نبرد آزمائی کے لیے آمادہ ہو چکے تھے لیکن عبداللہ بن مسعود اور ان کے ساتھی علیحدہ رہے۔ چنانچہ وہ لوگ حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم جنگ میں آپؑ سے لاتعلق

رہیں گے لیکن جب ہمیں جداگانہ طور پر جگہ مل جائے گی تو قریب آکر شام کے لشکر کو دیکھیں گے اور دونوں میں سے جو بھی غیر مشروع مقصد کی جانب جائے گا یا جس کا ظلم و ستم ہمیں نظر آئے گا ہم اس کے خلاف جنگ کریں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے ان کے افکار و خیالات کی ستائش کی اور فرمایا: دین میں اسی کا نام فہم و فراست ہے اور یہی سنت سے آگاہی و واقفیت ہے۔

عبداللہ کے دوسرے ساتھیوں نے، جو کہ چار سو افراد تھے، حضرت علی علیہ السلام سے عرض کیا:

ہم آپؑ کی فضیلت و برتری سے بخوبی واقف ہیں اور یہ بھی آپؑ جانتے ہیں کہ ہم سب کو دشمن سے نبرد آزما ہونے کی آرزو ہے مگر اس کے ساتھ ہی ہمیں اس جنگ کے بارے میں شک و تردد ہے۔ ہماری مرضی تو یہ ہے کہ آپؑ ہمیں اسلامی مملکت کی سرحدوں پر بھیج دیں تاکہ وہاں پہنچ کر ہم اسلام کا دفاع کر سکیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے انھیں ربیع بن خیثم کی فرمان داری میں علاقہ رے کی سرحد پر بھیج دیا۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۱۵)

قبیلۂ "باہلہ" میں بھی ایسا گروہ موجود تھا، جس کا حضرت علی علیہ السلام کے مکتب فکر کی جانب کوئی خاص میلان نہ تھا۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کے فرمان کے بموجب وہ جنگ سے کنارہ کش ہو گیا تھا کیونکہ ایسے لوگوں کی جہاد میں شرکت جن کا کوئی مقصد و ارادہ نہ ہو، اور ان کا عقیدہ بھی صحیح نہ ہو تو وہ نہ صرف یہ کہ محاذِ حق کو تقویت نہیں پہنچاتے بلکہ بسا اوقات دوسرے سپاہیوں کا حوصلہ پست کرنے کا سبب ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں کہ وہ قید کر لیے جائیں تو بہت سے فوجی راز دشمن تک پہنچا دیتے ہیں یا خود دشمن ہی انھیں یہ موقع فراہم کر دیتا ہے کہ وہ اس کے لیے اپنے وطن میں خدمات انجام دیں۔

شاید ان دلائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام نے انھیں اپنے پاس بلایا اور ان کی جو مزدوری یا تنخواہ ہو سکتی تھی، وہ ادا کرنے کے بعد انھیں حکم دیا کہ "دیلم" کی جانب مہاجرت کر جائیں۔ (وقعۂ صفین، ص ۱۱۶)

کمانڈروں کا تقرر

حضرت علی علیہ السلام نے تمام بنیادی کام انجام دینے کے بعد لشکر کی روانگی کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ!

آپؑ کی فرمائش کے مطابق حارث بن اعور نے کوفہ میں اعلان کیا کہ تمام لشکر "نخیلہ" کی جانب روانہ ہوجائے اور شہر سے باہر خیمے بپا کرے۔ کوفہ کے حاکمِ شہر مالک بن حبیب کو اس کام پر مقرر کیا گیا کہ وہ سپاہ وعسکر کے درمیان ہم آہنگی پیدا کریں اور انھیں لشکرگاہ کی جانب روانہ کرنے میں مدد کریں۔ عقبہ بن عمرو انصاری، حضرت علی علیہ السلام کے جانشین کی حیثیت سے کوفہ میں ہی مقیم رہیں۔

ان اقدامات کی تکمیل کے بعد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنے لشکر کے ہمراہ لشکرگاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ جب سپاہی جمع ہوگئے تو حضرت علی علیہ السلام نے انھیں سات دستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستہ کا کمانڈر و سردار مقرر کیا جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

١. قیس وعبدالقیس کے دستہ کا کمانڈر سعد بن مسعود کو۔
٢. تمیم، ضبہ، رباب، قریش اور کنانہ کے دستہ پر معقل بن یربوعی کو۔
٣. ازد بجیلہ، خثعم، انصار اور خزاعہ کے دستہ پر حنف ابن سلیم کو۔
٤. کندا، حضرموت، قضاعہ اور مہرہ کے دستہ پر حجر بن عدی کو۔
٥. مذحج واشعری قبائل کے دستوں پر زیاد بن نضر کو۔
٦. ہمدان اور حمیر کے قبائل کے دستے پر سعد بن قیس ہمدانی کو۔
٧. طے کے قبائل دستہ پر عدی ابن حاتم کو۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۲۱)

ابن عباس اور ابوالاسود کو بصرہ میں اپنا جانشین مقرر کیا، چنانچہ! اس شہر سے پانچ لشکروں پر مشتمل افواج اپنے اپنے فرمان داروں کی نگرانی میں روانہ ہوئیں اور نخیلہ میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئیں۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۱۷)

حضرت علی علیہ السلام نے فرمان داروں کو مقرر اور دستوں کو منظم کرنے کے بعد زیاد بن نضر (دستہ مذحج اور اشعریوں کے فرمان دار) اور شریح بن ہانی کو اپنے پاس بلایا اور ضروری تذکرات و ہدایات کے بعد انھیں بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اگلی منزل کی جانب روانہ کیا اور حکم دیا کہ تمام واقعات کی اطلاعات اور خبریں آپؑ کو پہنچائی جائیں۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۲۱-۱۲۲)

صفین کی جانب روانگی

روانگی کے بعد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام بھی بدھ کے دن بتاریخ ۵ شوال ۳۶ ہجری کو

اپنے لشکرِ عظیم کے ہمراہ جس کی تعداد (قراول لشکر کے علاوہ) نوے ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی، ① نخیلہ سے صفین کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں مختلف حادثات بھی پیش آئے جن میں سے یہاں صرف دو واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے:

① امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام جس وقت شہر "رقہ" میں داخل ہوئے تو آپؑ نے وہاں کے لوگوں سے فرمایا کہ دریا پر پُل باندھیں تا کہ سپاہ آرام سے دریا پار کر سکے لیکن وہ لوگ چوں کہ آپؑ کی حکومت کے مخالف تھے، اس لیے انھوں نے اس کام کو انجام دینے سے انکار کیا۔ یہی نہیں بلکہ جو جہاز وہاں اس وقت لنگر انداز تھے، وہ انھیں بھی اپنے ساتھ لے گئے تا کہ لشکرِ اسلام کے ہاتھ نہ لگ جائیں اور وہ انھیں اپنے استعمال میں لائیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ وہ پُل منبج سے گزریں (جو لشکرگاہ سے بہت دُور تھا) اس اقدام کے بعد آپؑ نے مالک اشترؒ کو وہیں قیام کرنے کا حکم دیا اور خود وہاں سے روانہ ہو گئے۔

حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ اہلِ رقہ نے جو سلوک کیا، اس سے مالک اشترؒ خوش نہ تھے۔ چنانچہ! انھوں نے وہاں کے لوگوں سے کہا: خدا کی قسم! اگر تم نے پُل نہ باندھا اور حضرت علی علیہ السلام کو واپس نہ آنے دیا تو میں تم سب کو تہِ تیغ کر دوں گا، تمھارے مال کو ضبط کر لوں گا اور زمین ویران کر ڈالوں گا۔

یہ سن کر وہ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور آپس میں کہنے لگے کہ اشتر جو کہتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے انھیں یہاں اسی مقصد کے لیے رہنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ! وہ فوراً ہی پُل باندھنے کے لیے تیار ہو گئے اور تھوڑے عرصے میں ہی انھوں نے دریا پر پُل باندھ دیا اور لشکرِ اسلام اس پر سے گزر گیا۔ (وقعہ صفین: ص ۱۵۱، ۱۵۲، یعقوبی: ج ۲، ص ۱۸۷، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۸۱)

② جب لشکرِ اسلام فرات کے ساحل پر اُتر گیا تو بعض افراد نے یہ تجویز پیش کی کہ اتمامِ حجت کے طور پر معاویہ کو خط لکھا جائے اور اس کو یہ دعوت دی جائے کہ تم سے جو لغزشیں سرزد ہوئی

---

① مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۷۵۔ سپاہ کی تعداد ایک لاکھ اور ایک لاکھ پچاس ہزار بھی بتائی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، وقعہ صفین: ص ۱۵۶، اور اعیان الشیعہ: ج ۱، ص ۴۷۹

ہیں ان سے اب باز رہو۔

حضرت علی علیہ السلام نے ان کی اس تجویز کو قبول کر لیا اور کتنی ہی مرتبہ نصیحت آمیز خط لکھنے کے بعد اس مرتبہ بھی مراسلہ مرقوم فرمایا۔

حضرت علی علیہ السلام نے مذکورہ خط میں اس امر کی جانب بھی اشارہ فرمایا کہ (اے معاویہ) مقامِ خلافت کے لیے وہ شخص سب سے زیادہ سزاوار ہے جو دوسروں کی بہ نسبت سب سے زیادہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نزدیک ہو، وہ کتابِ خدا اور احکامِ اسلام کو دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر سمجھتا ہو، دینِ اسلام قبول کرنے میں سب پر سبقت لے گیا ہو، اور جس نے سب سے زیادہ اور بہتر طریقے پر جہاد کیا ہو، میں تمھیں کتابِ خدا و سنتِ رسولؐ کی جانب آنے اور اُمتِ مسلمہ کی خوں ریزی سے اجتناب کی دعوت دیتا ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام کے خط کے جواب میں معاویہ نے صرف ایک ہی شعر لکھا اور اس میں اس نے تہدید آمیز رویہ اختیار کیا۔ شعر کا مضمون یہ ہے:

> ''میرے اور تمھارے درمیان جنگ اور شمشیر کے علاوہ کوئی اور چیز فیصلہ نہیں کر سکتی''۔ ①

شام میں غیر معمولی حالات کا اعلان

معاویہ کو جب یہ اطلاع ملی کہ لشکرِ عراق کی روانگی شام کی جانب ہے تو وہ سمجھ گیا کہ اب کام، نامہ و پیام سے گزر کر سنجیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ چنانچہ! اس نے حکم دیا کہ لوگ شہر کی مسجد میں جمع ہوں تو تقریباً ستر ہزار لوگ جمع ہوئے۔ حضرت عثمان کے پیراہن کو ہاتھ میں لے کر معاویہ مسجد کے منبر پر گیا اور کہا:

> ''اے شام والو! تم نے اس سے پہلے (حضرت) علیؑ کے معاملے میں مجھ پر اعتبار نہیں کیا لیکن اب سب پر یہ بات روشن ہو گئی ہے کہ (حضرت) عثمان کا قتل (حضرت) علیؑ کے علاوہ کسی نے نہیں کیا۔ انھوں نے ہی (حضرت) عثمان کے قتل کا حکم صادر کیا اور ان کے قاتلوں کو پناہ دی اور آج انھی افراد پر

① وقعۃ صفین: ص ۱۴۹، ۱۵۱، لیس بینی وبین قیس عتاب غیر طعن الکلی وضرب الرقاب۔

مشتمل، انھوں نے فوج تشکیل دی ہے اور تمھیں نیست و نابود کرنے کے لیے اب ان کا رُخ شام کی جانب ہے"۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۲۷)

معاویہ کی جب ولولہ انگیز تقریر ختم ہوئی تو لوگ اس کے گرد ہر طرف سے جمع ہو گئے اور اس کے قول و بیان کی تائید کی۔ اس نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے لوگوں کے گروہ بنائے اور انھیں صفین کی جانب روانہ کیا اور ساتھ ہی اس نے شام میں غیر معمولی حالات کا اعلان کر دیا اور وہاں کے عوام کو حکم دیا کہ محاذِ جنگ پر روانہ ہوں۔

معاویہ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ جب وہ شہر سے ایک منزل کے فاصلہ پر پہنچ جائے تو وہیں ٹھہر جائے اور اسے سلامی دے۔ یہاں اس نے میمنہ، میسرہ اور مقدم لشکر کے فرمان دار مقرر کیے۔ اس کے بعد لشکر وہاں سے روانہ ہوا اور اس سے قبل کہ حضرت علی علیہ السلام کے دستے صفین پہنچیں [1] وہ وہاں پہنچ گیا اور ایسے وسیع میدان میں جہاں سے دریائے فرات کا پانی آسانی سے دستیاب ہو سکتا تھا، اس نے اپنے خیمے لگائے (یہاں ساحل کے نزدیک دیگر مقامات بلندی پر واقع ہیں اسی لیے پانی تک رسائی آسانی سے نہیں ہو سکتی تھی)۔ لشکرِ شام کی سپاہ کی تعداد تقریباً پچاسی ہزار تھی۔ معاویہ نے قراول لشکر کے فرمان دار ابوالاعور سلمی کو چالیس ہزار سواروں کے ساتھ گھاٹ پر مقرر کر دیا۔ [2]

پہلا مقابلہ

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے قراول لشکر کو جب یہ معلوم ہوا کہ معاویہ عظیم فوج کے ساتھ صفین کی جانب روانہ ہو گیا ہے تو انھوں نے اس خوف سے کہ کہیں دشمن کے نرغے میں نہ گھر جائیں، ہیت نامی دریا کو پیچھے چھوڑا اور حضرت علی علیہ السلام سے جا ملے۔ حضرت علی علیہ السلام کو جب قراول لشکر کے واپس آنے کی اطلاع ملی اور اس کی وجہ معلوم کی تو آپؑ نے فرمان دارِ لشکر کی رائے و تدبیر کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا۔ (کامل ابن اثیر: ج ۲، ص ۲۸۲، وقعۂ صفین: ص ۱۲۵)

اس کے بعد آپؑ نے اسی لشکر کو دوبارہ پیش پیش چلنے کے لیے روانہ کیا۔ چنانچہ جب ان کا

---

[1] صفین رومی عہدِ حکومت کے زمانے کا ایک ویران قریہ تھا۔ اس کے اور فرات کے درمیان ایک تیر ⇦

[2] مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۷۵۔ سپاہ کی تعداد ایک لاکھ اور ایک لاکھ پچاس ہزار بھی بتائی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، وقعۂ صفین: ص ۱۵۶، اور اعیان الشیعہ: ج ۱، ص ۴۷۹

معاویہ کے قراول دستے سے سامنا ہوا تو انھوں نے اس کی اطلاع حضرت علی علیہ السلام کو دی اور دریافت کیا کہ اب انھیں کیا اقدام کرنا چاہیے؟ حضرت علی علیہ السلام نے حضرت مالک اشترؒ کو ایک دستے کے ہمراہ ان کی مدد کے لیے روانہ کیا اور یہ حکم دیا کہ جب غنیم کا لشکر سامنے آئے تو تم میری جانب سے سردارِ لشکر کے فرائض انجام دینا مگر یہ یاد رہے کہ حملے کا آغاز تمھاری جانب سے نہ ہو۔ جب دشمن بالکل ہی مقابل آجائے تو اتمامِ حجت کے طور پر اس سے گفتگو کرنا اور اس کی بات غور سے سننا تاکہ آغازِ جنگ کا موجب کینہ، عداوت نہ ہو، اپنی سپاہ کے ساتھ زیاد کو میمنہ پر اور شریح کو میسرہ پر مقرر کرنا اور دشمن کے اس قدر نزدیک بھی نہ ہونا کہ وہ خیال کرے کہ تم جنگ کے شعلوں کو برافروختہ کرنا چاہتے ہو اور اس سے اس قدر دُور بھی نہ رہنا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ تم پر اس کا خوف طاری ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے زیاد اور شریح کو بھی خطوط لکھے جن میں آپؑ نے یہ حکم صادر فرمایا تھا کہ وہ مالک اشتر کی اطاعت کریں۔ مالک انتہائی تندی و تیزی کے ساتھ روانہ ہو کر قراول دستے تک پہنچ گئے۔ جب رات کی تاریکی سب طرف پھیل گئی تو معاویہ کے فرمان دار لشکر ابوالاعور نے مالک اشتر پر شب خون مارا مگر سپاہِ اسلام نے اس کا پوری پامردی سے مقابلہ کیا اور ناچار اسے پسپا ہونا پڑا۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۸۲، وقعۂ صفین: ص ۱۵۱)

اگلے روز ہاشم بن عتبہ کا ابوالاعور سے مقابلہ ہو گیا۔ پہلے تو دونوں فرمان داروں کے درمیان پیغامات کا سلسلہ جاری ہوا۔ دونوں کے درمیان رنجش و تکرار بھی ہوئی مگر جیسے ہی دن ختم ہوا تو یہ پیام رسانی اور باہمی آویزش بھی ختم ہو گئی۔ اگلے روز حضرت علی علیہ السلام بھی تشریف لے آئے اور معاویہ کے نزدیک ہی آپؑ نے قیام فرمایا۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۵۵ و ۱۶۳)

پانی پر بندش

حضرت علی علیہ السلام نے ہر ممکن کوشش کی کہ کوئی ایسی مناسب جگہ مل جائے جہاں سے ان کی دریائے فرات تک رسائی ممکن ہو سکے مگر آپؑ کو اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ وہاں تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا، جس کو ابوالاعور نے چالیس ہزار سپاہی تعینات کر کے بند کر دیا تھا اور وہ سپاہِ اسلام کو اس جانب بڑھنے ہی نہیں دیتا تھا۔

سپاہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کو برداشت کیا مگر جب پیاس کی شدت کا ان پر غلبہ ہوا تو انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے دریافت کیا کہ انھیں کیا کرنا چاہیے۔ حضرت علی علیہ السلام نے صعصعہ بن صوحان کو معاویہ کے پاس اپنے پیغام کے ساتھ روانہ کیا، جس میں آپؑ نے فرمایا:

"اب جس راہ پر میں نے قدم رکھا ہے مجھے ہرگز یہ پسند نہیں کہ باہمی مذاکرہ کریں اور اتمام حجت کے بغیر جنگ کروں مگر تمھارے قراول لشکر نے میرے قراول دستے پر حملہ کر کے جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ اس نے دریا کے راستے کو بند کر کے جنگ و جدال میں پیش قدمی کی ہے۔ اب تم اپنی سپاہ کو حکم دو کہ وہ دریائے فرات کے راستے سے ایک طرف ہو جائے تاکہ ہم جس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں اس پر گفتگو کی جاسکے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اگر تم اس بات کے حامی ہو کہ اصل مقصد کو برطرف کر کے پانی پر جنگ کروں تاکہ اس تک رسائی ہو جائے تو مجھے اس پر بھی عذر نہیں ہے"۔

معاویہ کو جب یہ پیغام ملا تو اس نے اس کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ جس طرح انھوں نے حضرت عثمان پر پانی بند کر دیا تھا تم بھی بند کرو تاکہ وہ لوگ بھی پیاس سے ہلاک ہو جائیں۔

لیکن عمرو بن عاص نے اس اقدام کو لاحاصل سمجھا اور کہا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم تو سیر ہو کر پانی پیو اور (حضرت) علیؑ پیاسے رہ جائیں...... تم جانتے ہو کہ (حضرت) علیؑ کتنے دلاور اور بہادر انسان ہیں۔ عراق و حجاز کے لوگ بھی انھی کے ساتھ ہیں۔ جس روز ہم (حضرت فاطمہ زہراؑ) کے گھر کی تلاشی لے رہے تھے تو ہم دونوں نے (حضرت) علیؑ کی زبان سے یہ سنا تھا کہ اگر میرے ساتھ چالیس آدمی ہی ہوتے تو میں انقلاب برپا کر دیتا"۔

مگر اس کے ساتھ ہی معاویہ نے واضح طور پر حضرت علی علیہ السلام کے نمائندے کو جواب نہیں دیا۔ بس اتنا کہا کہ میرا فیصلہ جلد ہی آپ تک پہنچ جائے گا۔

اس کے بعد صعصعہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس واپس آگئے اور پورے واقعہ کی آپؑ کو اطلاع دی۔ جب صعصعہ واپس چلے گئے تو معاویہ نے اپنی سپاہ کا مزید ایک دستہ ابوالاعور کی مدد کے لیے روانہ کیا اور یہ تاکید کی کہ (حضرت) علیؑ پر حسب سابق پانی بند رکھا جائے۔ جب اس

واقعہ کی اطلاع حضرت علی علیہ السلام کو ہوئی تو آپؑ نے جنگ کرنے کے لیے حکم دیا۔

اشعث بن قیس نے یہ تجویز پیش کی کہ اس مقصد کی برآری کا موقع اسے دیا جائے۔ جب حضرت علی علیہ السلام نے اس کی اس تجویز سے اتفاق کیا تو ایک فوجی دستہ فرات کی جانب روانہ کیا گیا اور دونوں لشکروں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ دونوں جانب سے فرمان دار لشکر نے تازہ دم سپاہی روانہ کیے اور آتشِ جنگ ہر لحظہ تیز تر ہوتی چلی گئی۔ حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کو فتح ہوئی اور اس نے فرات کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔

اس پر بعض فاتح سپاہیوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم بھی دشمن کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو اس نے ہمارے ساتھ روا رکھا تھا مگر جب حضرت علی علیہ السلام تک یہ بات پہنچی تو آپؑ نے حکم دیا کہ جس قدر تمھیں ضرورت ہے وہاں سے پانی بھر لاؤ اور معاویہ کے سپاہیوں کو بھی پانی بھرنے دو کیوں کہ خداوند تعالیٰ نے تمھیں فتح و کامرانی عطا کی ہے اور ان کے ظلم و تجاوز کو تم سے دُور کر دیا ہے۔ (۱)

نمایندگان کی روانگی

جب اس راستے پر قبضہ ہو گیا جو لبِ دریا تک جاتا تھا تو حضرت علی علیہ السلام نے دو روز تک توقف فرمایا۔ اس کے بعد آپؑ نے اپنی سپاہ کے سرداروں میں سے بشیر بن عمرو، سعید بن قیس اور شیث بن ربعی کو معاویہ کے پاس بھیجا اور فرمایا: تم ان کے پاس جاؤ اور انھیں اطاعتِ خدا، میرے ہاتھ پر بیعت، نیز جماعت کی طرف آنے کی دعوت دو۔ (۲)

حضرت علی علیہ السلام کے نمایندے ماہ ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کو معاویہ کے پاس پہنچے اور اس کے ساتھ مذاکرات شروع کیے۔ سب سے پہلے بشیر نے کہا: اے معاویہ! دنیا ختم ہوا چاہتی ہے اور آخرت تم پر آشکارا ہونے لگی ہے۔ خداوند تعالیٰ تجھے تمھارے اعمال کی سزا دے، اب تو اُمت کے درمیان تفرقہ اندازی اور خون ریزی سے باز آجا۔

---

(۱) کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۸۲، ۲۸۵، وقعۂ صفین: ص ۱۶۰، ۱۶۷، مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۷۵، تاریخ یعقوبی: ج ۳، ص ۸۱،۷۔

(۲) ائتوا هذا الرجل وادعوه الى الله والى الطاعة والجماعة

معاویہ نے ان کی گفتگو کو درمیان میں ہی قطع کر دیا اور کہا: یہی مشورہ تم نے اپنے آقا کو کیوں نہیں دیا؟

بشیر نے جواب دیا: وہ تمھارے جیسے نہیں ہیں۔ وہ دین، فضیلت، اسلام میں سابقہ زندگی اور رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ قرابت داری کے اعتبار سے اور اس امر و قصد کے لیے بہترین اور اہل ترین فرد ہیں۔

اس کے بعد شبث بن ربعی نے گفتگو شروع کی۔ معاویہ نے جب اس کی مدلل گفتگو سنی تو وہ حیران رہ گیا اور جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو طیش میں اس کی زبان سے کچھ ناشائستہ الفاظ نکل گئے۔ اس نے حضرت علی علیہ السلام کے نمایندوں سے کہا کہ یہاں سے اٹھو اور چلے جاؤ، میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ اب تلوار ہی کرے گی۔

اس پر شبث بن ربعی نے کہا کہ تم ہمیں تلوار سے ڈرا رہے ہو۔ خدا کی قسم! ہم جلدی ہی تمھیں گردابِ بلا میں گرفتار دیکھیں گے۔

یہ کہہ کر یہ نمایندے وہاں سے اٹھ گئے اور حضرت علی علیہ السلام کے پاس چلے آئے۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۸۷، ۱۸۸، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۸۵)

اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ وہ چند دستوں میں تقسیم ہو جائے اور باری باری اپنے ان حریفوں اور ہم پلہ قبائل کے ساتھ جو معاویہ کی سپاہ میں ہیں، نبرد آزما ہوں اور اس طرح طرفین نے ماہ ذی الحجہ کو جنگ و نبرد میں گزار دیا۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۸۶، وقعۂ صفین: ص ۱۹۵)

دوبارہ وفود کی روانگی

ماہِ محرم کی آمد جنگ و جدال کو روکنے کا ایک عمدہ بہانہ تھا اور فریقین میں اس امر پر معاہدہ ہو گیا کہ ماہِ محرم کے آخر تک جنگ نہ کی جائے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس وقت کو صلح پسندانہ اقدامات کے لیے بہترین موقع جانا۔ چنانچہ! آپؑ نے اس مقصد کے تحت ایک وفد، جو عدی بن حاتم، یزید بن قیس، شبث بن ربعی اور زیاد بن حفصہ پر مشتمل تھا، معاویہ کے پاس بھیجا۔

ہر نمایندے نے جو لازم سمجھا وہ کہا لیکن معاویہ کی منطق ہمیشہ کی طرح اب بھی وہی تھی اس

نے پہلے کی طرح اب بھی یہی کہا کہ میں جنگ سے دست بردار نہیں ہو سکتا، میرے اور (حضرت) علیؑ کے درمیان صرف تلوار ہی فیصلہ کر سکتی ہے۔

اس ضمن میں اس نے مزید کہا کہ تم ہمیں کیوں اس جماعت کی اطاعت و فرمانبرداری کی دعوت دے رہے ہو، خلافت کے اصل حق دار ہم ہیں نہ کہ تمھارا پیشوا کیونکہ تمھارے پیشوا نے ہمارے خلیفہ کو قتل کیا ہے اور ہماری منظم جماعت کو منتشر کر دیا ہے۔

اس گفتگو کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے نمایندے کوئی نتیجہ حاصل کیے بغیر واپس آ گئے۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۹۷-۱۹۸)

معاویہ کے نمایندے

معاویہ نے بھی ایک وفد جو حبیب بن مسلمہ، شرجیل اور معن بن یزید پر مشتمل تھا، حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں روانہ کیا۔ انھوں نے گفتگو کا آغاز حضرت عثمان کے قتل سے کیا اور کہا کہ اگر آپؑ صادق ہیں اور آپؑ نے (حضرت) عثمان کو قتل نہیں کیا تو ان کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کریں۔ اس کے بعد خلافت سے دست بردار ہو جائیں اور مسئلۂ خلافت کو رائے عامہ پر چھوڑ دیں تا کہ لوگ باہمی مشورے اور اتفاقِ رائے سے جسے چاہیں اپنا خلیفہ منتخب کریں۔

حضرت علی علیہ السلام نے ان سے سخت برتاؤ کے ضمن میں شائستگی سے مذکورہ مسائل کی تردید کی اور قتل عثمان، اپنی بیعت اور بنی اُمیہ خصوصاً معاویہ کی پہلی زندگی اور حق سے ان کی عداوت کو بیان فرمایا۔ معاویہ کے نمایندوں کے پاس چونکہ امام علیہ السلام کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا، اس لیے وہ اٹھ کر چلے گئے۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۹۲-۲۹۳، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۷، وقعۂ صفین: ص ۲۰۱-۲۰۲)

دغابازی کا کمزور حربہ

معاویہ کے لشکر کا سپاہ اسلام کے ساتھ پہلا معرکہ پانی پر ہوا اور اس کے لشکر کو شکست ہوئی۔ اس شکست اور طرزِ گفتگو سے جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے براہِ راست آپؑ کے نمایندگان کے ذریعے ہوئی، اس نے سپاہ اسلام کی قوت، ان کے جذبۂ ایثار اور فوج کے بعض

سرداروں اور کمانڈروں کی مددگاری کا اندازہ لگایا اور جان لیا کہ جو لوگ ایمان و عقیدت سے سرشار ہو کر جنگ کرنے کے لیے آئے ہیں اگر بالفرض ان کے ساتھ جنگ ہوئی بھی تو پنجہ کشی کر کے سنگین خسارے کے باوجود نصرت و فتح حاصل نہیں کی جاسکتی، بالخصوص ان حالات میں جب کہ ان کے چاروں طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کی سپاہ کے بعض سرداروں سے ملاقات کی جائے اور انھیں لالچ کے ذریعے شوق و ترغیب دلا کر نیز سپاہ کے درمیان شک و شبہ پیدا کر کے ان میں تفرقہ پیدا کیا جائے تا کہ اس کے باعث عساکرِ اسلام میں کمزوری و ناتوانی پیدا ہو جائے اور بالآخر وہ شکست و پسپائی سے دوچار ہوں۔

لشکروں کے سرداروں سے ملاقات

حضرت علی علیہ السلام کا وفد جب معاویہ سے رخصت ہو کر چلا گیا تو اس نے اس وفد کے ایک رکن زیاد بن حفصہ سے دوبارہ ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اس نے زیاد سے کہا کہ وہ اپنے قبیلے کے ہمراہ اس کام میں میری مدد کرے اور ان سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو شہر بصرہ یا کوفہ کی حکومت اس کو دے دی جائے گی۔

لیکن معاویہ کو اس سے مدد و تعاون میں مایوسی ہوئی تو اس نے عمرو بن عاص سے کہا کہ ہم علی علیہ السلام کے لشکر کے سرداروں میں سے جس کے ساتھ بھی گفتگو کرتے ہیں وہ ہمیں اطمینان بخش لگتا ہے اور وہ سب دل سے باہمی طور پر متحد ہیں۔ (1)

قاریوں اور زاہدوں کی جماعت سے ملاقات

معاویہ جب حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کے سرداروں اور فرمان داروں کو فریفتہ کرنے میں نا اُمید ہو گیا تو اس نے ان قاریوں اور زہد فروشوں کی جانب توجہ کی جن کی ظاہری زندگی ہی اسلام سے متاثر ہوئی تھی۔

---

(1) کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۹۰، وقعۂ صفین: ص ۱۹۹۔۲۰۰۔ معاویہ کی اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے حضرت علی علیہ السلام کے دیگر سرداران سے بھی اس قسم کی بات کی تھی۔

شام اور عراق کی سپاہ میں دونوں لشکروں کے درمیان تیس ہزار سے زیادہ قارئین قرآن موجود تھے۔ یہ قاری دونوں لشکروں کی صفوں سے نکل کر باہر آ گئے اور انھوں نے علیحدہ جگہ پر اپنے خیمے نصب کیے اور یہ فیصلہ کیا کہ فریقین کے درمیان ثالث کے فرائض انجام دیں۔

اس مقصد کے پیش نظر ان کے نمائندے دونوں سپاہ کے فرمان داروں سے ملاقات کرنے کی غرض سے گئے اور ہر ایک نے اپنے نظریات دوسرے کے سامنے بیان کر دیے۔ ان کی طرز گفتگو سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان پر معاویہ کی جادو بیانی کا اثر ہو گیا ہے۔

جب یہ جماعت حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؑ نے انھیں آگاہ کیا کہ وہ کسی کی پُرفریب گفتگو سے متاثر نہ ہوں، اور فرمایا:

"اس بات کا خیال رہے کہ معاویہ کہیں دین کے معاملے میں تمھاری جانوں کو مفتون و فریفتہ نہ کر لے"۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۸۸-۱۹۰، اس واقعہ کی تفصیل بعد میں آئے گی)

لیکن ابھی کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ انھی لوگوں کی کثیر تعداد اشعث اور چند دیگر افراد کی سرکردگی میں معاویہ کی جادو بیانی پر فریفتہ ہو گئی اور جنگ کے معاملے میں انھوں نے عہد شکنی کی اور حضرت علی علیہ السلام کے خلاف صف بستہ ہو گئے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے مجبوراً معاویہ کی جانب سے مسلط کردہ شرط جنگ بندی کو قبول کر لیا۔

سپاہ کے درمیان خلل اندازی

معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کی سپاہ کے دلوں میں تذبذب و تزلزل پیدا کرنے اور ذہنوں پر خوف و ہراس طاری کرنے کی غرض سے اس دوران جب کہ فریقین کے درمیان جنگ جاری تھی حکم دیا کہ خط لکھا جائے جسے تیر پر باندھ کر حضرت علی علیہ السلام کے لشکر میں پھینک دیا جائے۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

"خدا کے ایک خیر اندیش بندے کی طرف سے لشکرِ عراق کو پیغام!
آگاہ کیا جاتا ہے کہ معاویہ نے تم پر دریائے فرات کا بند کاٹ دیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تمام لشکرِ عراق کو اس میں غرق کر دے، جتنی جلد ممکن ہو سکے فرار کر جاؤ"۔

اہلِ کوفہ میں سے ایک شخص نے یہ خط اُٹھالیا اور پڑھ کر دوسرے کو دے دیا اور اس طرح یہ خط دست بدست ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گیا۔ چنانچہ! جس شخص نے بھی یہ خط پڑھا اس نے لکھنے والے کو خیراندیش ہی سمجھا۔

معاویہ نے اس اقدام کے بعد دو سو آدمیوں کو بیلچے اور کدالیں دے کر اس پشتے کی جانب روانہ کر دیا جو دریائے فرات پر بنا ہوا تھا اور ان سے کہا کہ تم اپنے کام پر لگ جاؤ۔

حضرت علی علیہ السلام کو جب اس خط کے بارے میں علم ہوا تو آپؑ نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ معاویہ کا یہ اقدام عملی نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنی سازش سے تمھیں پسپائی کے لیے مجبور کرے اور تمھارے درمیان میں آشفتگی و سراسیمگی پیدا کر دے۔

اس پر سپاہیوں نے جواب دیا کہ ہم کیسے اس بات پر یقین نہ کریں؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کے مزدور نہر کا بند کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم یہاں سے کوچ کرتے ہیں۔ آپؑ کی مرضی ہے کہ آپ بھی چلیں یا یہیں قیام کریں۔

چنانچہ! اس فیصلے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے سپاہی پیچھے ہٹنے لگے اور لشکر سے دُور جا کر انھوں نے پڑاؤ ڈال دیا۔ جس جگہ سے حضرت علی علیہ السلام کی سپاہ نے کوچ کیا تھا اس پر معاویہ کی سپاہ نے قدم جما دیے۔ (وقعۂ صفین: ص ۱۶۰)

فیصلہ کُن جنگ

ماہِ محرم کے ختم ہوتے ہی مذاکرات کا بھی خاتمہ ہو گیا اور فریقین جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: ”مَیں نے تمھیں مہلت دی کہ شاید تم حق کی طرف واپس آجاؤ، کلام اللہ کے ذریعے تمھارے لیے حجت و دلیل پیش کی لیکن تم شورش و سرکشی سے باز نہ آئے۔ تم نے دعوتِ حق سے رُوگردانی کی، اس لیے اب تم جنگ و جدال کے لیے تیار ہو جاؤ کیوں کہ خداوند تعالیٰ خیانت کاروں کو پسند نہیں کرتا“۔

اس کے بعد آپؑ نے اپنے لشکروں کی صفوں کو منظم کیا اور معاویہ نے بھی اپنی سپاہ کو آراستہ کیا۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۰۳ - ۲۰۴)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنی سپاہ کو مرتب کرتے ہوئے فرمایا: ”جب تک دشمن

پیش قدمی نہ کرے تم جنگ شروع نہ کرنا کیوں کہ تمھارے پاس حجت و دلیل موجود ہے اور ان کا جنگ شروع کرنا تمھارے لیے دوسری حجت و دلیل ہے۔ جب انھیں شکست دے چکو تو فرار کرنے والوں کو قتل نہ کرنا، زخمیوں پر حملہ آور نہ ہونا، برہنہ نہ کرنا، اور مُردہ لوگوں کے ناک، کان نہ کاٹنا، جس وقت تم ان پر غالب آجاؤ تو تم ان کے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہونا جب تک میں اجازت نہ دوں۔ اس مال کے علاوہ جو میدانِ جنگ میں رہ گیا ہے تم ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا اگرچہ عورتیں تمھیں، تمھارے سرداروں اور تمھارے نیک بزرگوں کو ناشائستہ الفاظ سے یاد کر رہی ہوں مگر تم انھیں تکلیف نہ پہنچانا کیونکہ وہ جسمانی طور پر کمزور اور عقل کے اعتبار سے ناقص ہیں"۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۰۳-۲۰۴)

سپاہ کو مرتب کرنے کے بعد آپؑ نے مالک اشترؓ کو کوفہ کے سواروں کا اور سہیل بن حنیفؓ کو بصرہ کے دستہ کا فرمان دار مقرر کیا، کوفہ کی پیادہ فوج کی فرمان داری، عمار یاسرؓ کو تفویض کی گئی اور بصرہ کی پیادہ فوج کا فرمان دار قیس بن سعدؓ کو مقرر کیا۔ کوفہ و بصرہ کے قاریوں کو آپؑ نے مسعر بن فدکی تحویل میں دیا اور پرچم ہاشم مرقال کے سپرد کیا۔ ①

یکم صفر ۳۷ ہجری دونوں فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ کوفہ کی فوج نے مالک اشترؓ اور شام کی فوج نے حبیب بن مسلمہ کی سپہ سالاری میں شدید جنگ کا آغاز کیا اور یہ معرکہ ظہر تک جاری رہا۔

اگلے دن ہاشم مرقال میدان میں اُترے اور شام کے اس لشکر کے ساتھ جو ابوالاعور کی زیرِ فرمان داری میدانِ جنگ میں آیا تھا، نبرد آزمائی کی اور شامیوں کے ساتھ سخت جنگ کے بعد وہ واپس اپنی لشکرگاہ میں آئے۔

تیسرے روز عمار یاسرؓ مہاجر و انصار بدریوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں اُترے اور عمرو بن عاص سے مقابلہ کیا۔ عمار نے اپنی سپاہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"کیا تم ان دشمنوں کو دیکھنا چاہتے ہو جنھوں نے خدا اور اس کے رسولؐ کے

---

① کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۹۳، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۱۱۔ لیکن وقعۂ صفین میں ص ۲۰۵ پر منقول ہے کہ سوار دستے کی کمانڈری عمار کو اور پیادہ فوج کی عبداللہ بدیل کو دی گئی۔

خلاف جنگ کی اور دشمنوں کو مدد پہنچائی، خداوند تعالیٰ کو چونکہ اپنا دین عزیز تھا اسی لیے اس نے اسے کامیابی عطا کی اور بالآخر اس دشمن نے خوف کی وجہ سے اپنا سر اسلام کے سامنے خم کر دیا۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد اس دشمن کی مسلمانوں کے خلاف دشمنی و عداوت آشکار ہوگئی۔

مسلمانو! تم دشمن کے لشکر سے جنگ کرو کیوں کہ ان کے سرداران لوگوں میں سے ہیں جو نُورِ الٰہی کو خاموش کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں"۔

اس کے بعد انھوں نے پیادہ فوج کے فرمان دار زیاد بن نضر کو حکم دیا کہ حملہ کریں اور خود بھی حملہ آور ہوئے اور عمرو بن عاص کو پسپا کر دیا۔

چوتھے دن حضرت علی علیہ السلام کے فرزند محمد حنفیہ میدانِ جنگ میں گئے اور عبیداللہ بن عمر سے جنگ کی۔ دونوں جانب سے مقابلہ سخت رہا۔ بالآخر عبیداللہ نے محمد حنفیہ کو جنگی کشتی کی دعوت دی تو محمد حنفیہ نے پیش قدمی کی مگر حضرت علی علیہ السلام نے منع کر دیا اور خود ان کی جگہ کشتی گیری کے لیے تشریف لے گئے، مگر عبیداللہ بن عمر اس کے لیے تیار نہ ہوا۔

پانچویں دن عبداللہ بن عباس کا ولید بن عقبہ سے مقابلہ ہوا۔ سخت نبرد آزمائی کے بعد انھوں نے ولید بن عقبہ کو جنگی کشتی کی دعوت دی مگر اس کے دل پر خوف طاری ہوگیا اور بالآخر لشکر اسلام فتح و کامرانی کے ساتھ واپس آیا۔ [1]

چھٹے دن قیس بن سعد اور ذی الکلاع کے درمیان سخت معرکہ ہوا۔ ساتویں دن مالک اشترؓ کا اپنے سابقہ رقیب سے مقابلہ ہوا اور ظہر کے وقت لشکر گاہ واپس آئے۔

عام جنگ

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے دیکھا کہ جنگ کو ایک ہفتہ ہوگیا ہے اگرچہ دونوں طرف سے بہت سے سپاہی قتل ہو چکے ہیں مگر اس کے باوجود لشکرِ اسلام کو فتح نصیب نہیں ہو رہی ہے۔ اسی لیے آپؑ نے عام حملے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہم کیوں اپنی پوری فوجی طاقت کو حریف کے خلاف

---

[1] کامل: ج ۳، ص ۲۹۳، لیکن وقعۂ صفین میں درج ہے کہ فریقین کے لشکر فتح و کامرانی کے بغیر واپس آئے، ملاحظہ ہو: وقعۂ صفین: ص ۲۲۲۔

جنگ میں بروئے کار نہ لائیں؟

اسی لیے آپؑ نے ۸ صفر شب چہارشنبہ (بدھ کی رات) اپنی سپاہ کے سامنے تقریر کی اور فرمایا:

"جان لو کہ کل تمھیں دشمن کے رُوبرو ہونا ہے۔ اس سے تمام رات عبادت میں گزارو اور قرآنِ مجید کی کثرت سے تلاوت کرو۔ خداوند تعالیٰ سے دعا کرو کہ ہمیں صبر و نصرت عطا فرمائے، دشمن کے مقابل میں مکمل پائیداری، ثابت قدمی اور پوری جدوجہد و اُستواری سے اس کا مقابلہ کرنا اور ہمیشہ راست گو رہنا"۔

حضرت علی علیہ السلام کی تقریر ختم ہوتے ہی آپؑ کی سپاہ نے اپنا اسلحہ اور تلواریں، نیزہ و زوبین وغیرہ کو سنبھالا اور انھیں جلا دینی شروع کی۔ حضرت علی علیہ السلام صبح کے وقت تک اپنے لشکر کو آراستہ کرتے رہے اور آپؑ کے حکم کے مطابق منادی کے ذریعے دشمن کو اعلانِ جنگ سنایا اور کہا: "اے شامیو! کل صبح تم سے میدانِ کارزار میں ملاقات ہوگی"۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۲۶)

منادی کی آواز جب دشمن کے کانوں میں پہنچی تو اس کی صفوں میں کہرام مچ گیا۔ سب نے بیم و ترس کی حالت میں معاویہ کی جانب رُخ کیا۔ اس نے تمام سرداروں اور فرمان داروں کو بلایا اور حکم دیا کہ اپنی فوجوں کو تیار کریں۔

حضرت علی علیہ السلام نے جب اپنے لشکر کو آراستہ کرلیا تو آپؑ اپنی جگہ سے اُٹھے اور سپاہ میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لیے ان کے سامنے تقریر کی اور فرمایا:

"اے لوگو! خداوند تعالیٰ نے تمھیں اس تجارت کی جانب آنے کی دعوت دی ہے جس میں عذاب سے نجات اور خیر و فلاح کی جانب بلایا ہے، یہ تجارت خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پر ایمان اور راہِ خدا میں جہاد ہے، اس کا معاوضہ تمھیں یہ ملے گا کہ تمھارے گناہ بخش دیے جائیں گے اور خلد بریں میں تمھیں رہنے کے لیے پاکیزہ مکان ملیں گے اور اس کا انتہائی اجر یہ ہے کہ تمھیں خدا کی رضا نصیب ہوگی جو ہر اجر سے کہیں عظیم ہے۔ قرآن کا خدا کے محبوب بندوں سے ارشاد ہے: خداوند تعالیٰ ان مجاہدینِ حق کو

دوست عزیز رکھتا ہے جو محکم دیوار کی طرح دشمن کے مقابل آجاتے ہیں اور اس سے جنگ و جدال کرتے ہیں"۔ ① اپنی صفوں کو سیسہ پلائی ہوئی بنیادوں کی طرح محکم کرلو اور ایک دوسرے کے دوش بدوش رہو، زرہ پوش سپاہ پیشاپیش رہیں اور جن کے پاس زرہ نہیں، انھیں زرہ پوش سپاہ کے عقب میں رکھا جائے۔ اپنے دانت بھینچے رکھو کیوں کہ اس کے باعث شمشیر کی ضرب سے کاسۂ سر محفوظ رہتا ہے۔ اس سے قلب کو تقویت اور دل کو آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اپنی آوازوں کو خاموش رکھو اس لیے کہ اس کی وجہ سے سستی و شکست سے نجات ملتی ہے اور چہرہ پر متانت و وقار کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اپنے پرچموں کو یکجا رکھو اور انھیں باحمیت دلاوروں کے سپرد کرو جو لوگ مصائب و مشکلات میں صبر کرتے ہیں اور پرچم پر مسلط رہتے ہیں، وہ اس کی ہر طرف سے حفاظت میں کوشاں رہتے ہیں"۔ (نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۲۴ کا اقتباس، وقعۂ صفین: ص ۲۳۵)

حضرت علی علیہ السلام کا خطبہ ختم ہونے کے بعد آپؑ کے اصحاب میں سے بھی ہر شخص نے اپنے قبیلے کے لشکر میں جوش و خروش پیدا کرنے کی خاطر تقریر کی۔ انھی مقررین میں سعید بن قیس بھی شامل تھے، چنانچہ! وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان سے اُٹھے۔ پہلے تو انھوں نے حضرت علی علیہ السلام اور آپؑ کے اصحاب کی قدر و منزلت کا ذکر کیا۔ اس کے بعد انھوں نے معاویہ کا تعارف کرایا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے دوستوں کو جنگ کرنے کے لیے ترغیب دلائی۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۳۶)

فریقین کے لشکر چوں کہ جنگ کے لیے آمادہ تھے اس لیے بدھ کے دن سخت معرکہ ہوا اور رات کے وقت دونوں لشکر بغیر فتح و نصرت واپس اپنے اپنے خیموں میں آگئے۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۹۶) ②

---

① سورۂ صف: آیت ۴، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○

② اس سے قبل حضرت علی علیہ السلام کی سواری میں جانور خچر تھا۔ اس روز آپؑ نے تنومند و دراز دم گھوڑا لانے کے لیے حکم دیا۔ یہ گھوڑا اس قدر تنومند و طاقتور تھا کہ اسے قابو میں رکھنے کے لیے دو لگام استعمال کرنی پڑتی تھیں اور وہ اپنی اگلی ٹانگوں سے زمین کھودتا رہتا تھا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے جمعرات کی صبح نماز فجر جلدی سے پڑھ لی اور سپاہ سے خطاب کرنے اور جنگ کی ترغیب دلانے کے بعد آپؑ نے گھوڑا طلب فرمایا۔ اس پر سوار ہونے کے بعد آپؑ قبلہ رُخ کھڑے ہوگئے، دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور خداوند تعالیٰ کی بارگاہ عالیہ میں یوں رازونیاز کرنے لگے:

"خداوندا! یہ قدم تیری راہ میں بڑھ رہے ہیں، بدن خستہ وناتواں ہیں، دلوں پر لرزہ ووحشت طاری ہے، اور یہ ہاتھ تیری بارگاہ میں اُٹھے ہوئے ہیں اور آنکھیں تیری طرف لگی ہوئی ہیں"۔

اس کے بعد آپؑ نے یہ آیت پڑھی:

.....یَحْکُمَ اللّٰہُ بَیْنَنَا ۚ وَھُوَ خَیْرُ الْحٰکِمِیْنَ○

"اے رب! ہماری قوم کے درمیان ٹھیک فیصلہ کردے اور تُو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔ (سورۂ اعراف: آیت ۸۷)

آخر میں آپؑ نے سپاہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

سیروا علی برکۃ اللہ

"آگے بڑھو خدا تمھارا پشت پناہ ہے"۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۳۰، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۱۷۶)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے نبرد آزما ہونے سے قبل شام کے ہر قبیلے کا نام دریافت فرمایا۔ اس کے بعد آپؑ نے اپنی سپاہ کے قبائل کو حکم دیا کہ تم میں سے ہر سپاہی اپنے ہم نام اور ہم پلہ قبیلے کے ہر اس شخص سے جنگ کرے جو دشمن کی صفوں میں شامل ہے۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۲۹، کامل ابن اثیر: ج، ص ۲۹۸، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۱۳، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۱۸۶)

سپاہ اسلام کی علامت وہ سفید رنگ کا کپڑا تھا جو انھوں نے اپنے سروں اور بازوؤں پر باندھ رکھا تھا اور ان کا نعرہ تھا:

یا اللہ، یا احد، یا صمد، یا ربِّ محمد، یا رحمٰن، یا رحیم

اس کے برعکس معاویہ کی سپاہ کا نشان زرد پٹی تھی، جسے انھوں نے اپنے سروں اور بازوؤں پر باندھ رکھا تھا اور ان کا نعرہ تھا:

نحن عباد الله حقا حقا یالثارات عثمان (وقعۂ صفین: ص ۳۳۲)

قرآن کی طرف دعوت

اس سے قبل کہ حضرت علی علیہ السلام کے سامنے عمرو بن عاص کا مکروفریب ظاہر ہو، آپؑ نے اپنی جمعیت کو بیدار کرنے اور دشمن پر اتمامِ حجت کی خاطر اس وقت بھی جب کہ آپؑ نے اپنی فوج میں ذرہ برابر زبونی وناتوانی محسوس نہیں کی، یہ تجویز پیش کی اور فرمایا:

> ”کوئی شخص قرآن شریف اپنے ہاتھ میں اُٹھالے اور دشمن کے نزدیک پہنچ کر اسے قرآن کی طرف آنے کی دعوت دے۔ ایک شخص جس کا نام ”سعید“ تھا، اُٹھا اور اس نے سپاہِ دشمن کی جانب جانے کا اظہار کیا“۔

حضرت علی علیہ السلام نے دوبارہ اپنی اس تجویز کو زبانِ مبارک سے ادا کیا۔ اسی نوجوان نے آپؑ کی اس تجویز پر لبیک کہا۔ کیوں کہ اکثر وبیشتر افراد کا خیال تھا کہ جو شخص بھی اس راہ میں پیش قدمی کرے گا، اس کا مارا جانا یقینی ہے۔

حضرت سعید نے قرآنِ مجید ہاتھ میں لیا اور دشمن کی سپاہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ”اے لوگو! شورش وسرکشی سے باز آؤ۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام قرآنی حکومت اور عدلِ الٰہی کی دعوت دے رہے ہیں۔ سیدھا راستہ اختیار کرو۔ سیدھا راستہ وہی ہے جو مہاجرین وانصار نے اختیار کیا ہے لیکن اہلِ شام نے اس کو اپنے نیزوں اور تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا“۔ [1]

معاویہ کہاں ہے؟

فریقین کے لشکر کے درمیان جنگ جیسے جیسے شدید تر ہوتی جارہی تھی، مالک اشترؓ، عمار یاسرؓ

---

[1] وقعۂ صفین: ص ۲۴۳، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۱۹۶۔ اس پورے قصے میں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے خیرخواہی کا جو یہ اقدام کیا تھا اس کے پیش نظر معاویہ کے کسی سپاہی نے اپنے فیصلۂ جنگ پر تردید نہیں کی۔ وہ اس نوجوان کو دیکھتے رہے لیکن جب معاویہ کی صفوں میں شکست کے آثار نمودار ہوئے تو اس کے سپاہیوں نے اس شکست کی تلافی کے لیے قرآن کو نیزے پر چڑھالیا اور وہ بھی سپاہِ عراق کو قرآن کی دعوت دینے لگے۔ حضرت علی علیہ السلام کی سپاہ میں سے کچھ لوگوں پر اس کا اثر ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا کہ حکم صادر کیجیے کہ مالک اشترؓ واپس آجائیں، ورنہ ہم آپؑ کو قتل کردیں گے۔

اور عبداللہ بدیلؓ جیسے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے یار و مددگار شیر کی طرح غراتے ہوئے دشمن پر حملہ آور ہوتے۔ حضرت علی علیہ السلام بھی میدانِ کارزار میں داخل ہوئے۔ دشمن کی سپاہ نے جیسے ہی آپ کو دیکھا تو اس پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ بعض قبائل کو تو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور یہ فکر ستانے لگی کہ کس طرح نجات پائیں گے۔ چنانچہ قبیلہ خشعم کے سردار عبداللہ خنس نے پیغام کے ذریعے یہ درخواست کی کہ صلۂ رحم کی خاطر اور ایک دوسرے کے حقوق کا پاس کرتے ہوئے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کرلے لیکن مخالفت سے دوچار ہوا۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۵۷)

اسی اثناء میں سپاہِ اسلام کے فرمان دارِ میمنہ عبداللہ بدیل جو بہت ہی شجاع و دلیر شخص تھا جو دو زرہ پہن کر جنگ کرتے تھے، دونوں ہاتھوں میں تلواریں لیے دشمن کی سپاہ کے میسرہ کی جانب بڑھے اور اسے چیرتے ہوئے ان لوگوں تک پہنچ گئے جو معاویہ کے فدائی کہلاتے تھے۔ یہ لوگ معاویہ کے ایسے جاں نثار و باوفا دوست تھے، جنھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ جب تک ہمارے دم میں دم ہے، اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ معاویہ نے ان فدائیوں کو حکم دیا کہ عبداللہ کے بالمقابل آجائیں اور خفیہ طور پر اپنے میسرہ کے فرمان دار حبیب بن مسلمہ سے کہا کہ وہ ابن بدیل کو آگے بڑھنے سے روکے لیکن وہ آگے بڑھتے ہی گئے۔ معاویہ نے ناچار مصلحت اس میں سمجھی کہ اپنی جگہ بدل دے اور وہ پیچھے کی طرف بھاگا لیکن عبداللہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے: یالثارات عثمان (عثمان کے خون کا بدلہ لینے والو)[1] معاویہ کی سپاہ نے جب یہ نعرہ سنا تو انھوں نے انھیں اپنا ہی سپاہی سمجھ کر انھیں راستہ دے دیا۔

معاویہ کو چونکہ دوسری مرتبہ اپنی جگہ سے ہٹ کر پیچھے آنا پڑا تھا، اس لیے اس نے دوبارہ حبیب بن مسلمہ سے کہا کہ میری مدد کرو۔ چنانچہ! اس نے بڑا سخت حملہ کیا اور دائیں جانب کے لشکر (جناحِ راست) کو چیرتا ہوا عبداللہ بن بدیل تک پہنچ گیا۔ عبداللہ سو قاریوں میں سے اکیلے رہ گئے تھے (باقی سب پسپا ہو چکے تھے) چنانچہ! وہ پوری دلیری سے جنگ کرتے رہے اور زبان سے بھی کہتے رہے کہ معاویہ کہاں ہے؟ معاویہ نے جب عبداللہ کو اپنے نزدیک دیکھا تو اس نے پکار کر کہا

---

[1] حضرت عبداللہ بن بدیل کے بھائی کا نام بھی عثمان تھا اور وہ بھی دشمن کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے، یہاں عثمان سے مراد ان کے بھائی ہیں۔

کہ اگر تلوار سے ان پر حملہ نہیں کر سکتے ہو تو انھیں آگے بھی نہ آنے دو اور ان پر سنگ باری شروع کر دو۔ چنانچہ! ہر طرف سے اس جانباز اسلام پر اس قدر پتھر برسائے گئے کہ وہ بھی شہید ہو گئے۔

معاویہ نے حکم دیا کہ ان کے ناک کان کاٹ دیے جائیں لیکن ان کی عبداللہ بن عامر سے چونکہ سابقہ دوستی تھی، اس لیے وہ مانع ہوئے اور معاویہ نے بھی اس خیال کو ترک کر دیا۔ ①

حضرت علی علیہ السلام میدانِ کارزار میں

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کمانڈر انچیف کے فرائض انجام دینے کے علاوہ بہت سے مواقع پر بالخصوص حساس ترین لمحات میں خود بھی میدانِ کارزار میں پہنچ جاتے اور دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرتے۔ اگرچہ! آپؑ کے اصحاب و فرزند آپؑ کے دشمن کے درمیان حائل ہو جاتے اور آپؑ کی پوری حفاظت کرتے اور ان کی یہ خبر گیری آپؑ کے لیے جنگ کرنے میں مانع ہوتی۔

بطور مثال ایک موقع پر میدانِ کارزار میں بنی اُمیہ کا احمر نامی غلام جو بڑا جری و دلاور شخص تھا آگے بڑھا۔ جس وقت حضرت علی علیہ السلام کی نگاہ اس پر پڑی تو آپؑ بھی اس کی طرف بڑھے۔ اسی اثناء میں حضرت علی علیہ السلام کا غلام جس کا نام "کیسان" تھا، آگے بڑھا اور دونوں کے درمیان کچھ دیر تک نبرد آزمائی ہوتی رہی۔ بالآخر وہ احمر کے ہاتھوں مارا گیا۔ اب احمر حضرت علی علیہ السلام کی جانب بڑھا تاکہ آپؑ کو شہید کر دے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس سے قبل کہ دشمن پر وار کریں ہاتھ بڑھا کر اس کا گریبان پکڑا اور اسے گھوڑے پر سے کھینچ لیا اور اپنے سر سے اُوپر اُٹھا کر زمین پر دے مارا کہ اس کے شانہ و بازو ٹوٹ کر الگ ہو گئے اور حضرت علیؑ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں فرزندانِ علیؑ (امام حسین علیہ السلام اور حضرت محمد حنفیہؒ) وہاں پہنچ گئے اور تلوار کے وار سے اسے ہلاک کر دیا۔

راوی مزید بیان کرتا ہے کہ احمر کے قتل کے بعد شامیوں نے جب حضرت علی علیہ السلام کو اکیلا دیکھا تو وہ آپؑ کی طرف بڑھے اور جان لینے کا ارادہ کیا اگرچہ! وہ حضرت علی علیہ السلام کی جانب

① وقعۂ صفین: ص ۲۳۸، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۱۹۶۔ اگرچہ تاریخ کی کتابوں میں ایسے کئی دلیر جانبازوں کا ذکر ملتا ہے مگر اس کتاب کے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی کیفیات بیان کرنے سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۲۱۲، وقعۂ صفین: ص ۸۵۔

بڑھتے رہے مگر آپ کی رفتار میں ذرا بھی فرق نہ آیا اور پہلے کی طرح آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے رہے، حالانکہ اپنے لشکر کی طرف پلٹنے کا ارادہ نہیں تھا۔

یہ کیفیت دیکھ کر حضرت امام حسن علیہ السلام نے اپنے والد محترم سے عرض کیا: بابا جان! کیا حرج ہے کہ آپؑ اپنی رفتار تیز کر دیں اور اپنے ان دوستوں سے آن ملیں جو دشمن کے رُوبرو کھڑے ہیں۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے جواب دیا: اے میرے فرزند! تیرے والد کا اس جہان سے کوچ کرنے کے لیے خاص وقت معین ہے۔ اس میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہو سکتی، تیرے والد کو اس بات کا ذرا بھی غم نہیں کہ موت کو اپنی آغوش میں لے لے یا موت خود ہی آکر گلے لگ جائے۔[1]

ایک موقع پر سعید بن قیس میدانِ کارزار میں موجود تھے تو انھوں نے بھی ایک مرتبہ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: یا امیر المومنین! آپؑ دشمن کی صف کے نزدیک حد سے زیادہ آگے جاتے ہیں۔ کیا آپ کو اس بات کا ذرا بھی خوف نہیں کہ دشمن آپؑ پر وار کر سکتا ہے؟

اس پر آپؑ نے فرمایا: خداوند تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی کسی کا نگہبان نہیں۔ اگر کوئی کنویں میں گر جائے یا اس پر دیوار گر رہی ہو یا کوئی اور بلا نازل ہو رہی ہو تو خدا کے علاوہ اس کی کوئی حفاظت کرنے والا نہیں اور جب موت آجاتی ہے تو تمام تدابیر بیکار ہو جاتی ہیں۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۵۰، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۱۹۹)

دوست واصحاب کی مدد

حضرت علی علیہ السلام میدانِ جنگ میں عین اس وقت جب کہ میدانِ کارزار میں پیش قدمی فرما رہے ہوتے تھے، اگر ضرورت پیش آجاتی تو اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر وہ اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے تیزی سے پہنچتے۔

غرار بن ادہم شامی لشکر کا مشہور سوار تھا ایک روز اس نے عباس بن ربیعہ کو جنگی کشتی کے

[1] وقعۂ صفین: ص ۲۴۹—۲۵۰، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۱۹۸۔ تاریخ طبری: ج ۵، ص ۱۹، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۲۹۹۔

لیے للکارا۔ عباس گھوڑے سے اُتر کر نیچے آ گئے اور غرار سے کشتی میں نبرد آزما ہو گئے۔ سخت زور آزمائی کے بعد عباس نے شامی کی زِرہ کو چاک کر دیا۔ اس کے بعد آپؑ نے تلوار نکال کر اس کے سینے پر وار کیا یہاں تک کہ وہ زخمی ہو کر مارا گیا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

ابوالاعز سے یہ واقعہ منقول ہے کہ میں نے اچانک سنا کہ میرے پیچھے کوئی شخص یہ آیت تلاوت کر رہا ہے:

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ۝ (سورۂ توبہ: آیت ۱۴)

"انھیں قتل کر ڈالو، خدا تمھارے ذریعے انھیں عذاب میں مبتلا کرتا ہے اور ذلیل کرتا ہے اور تمھاری مدد کرتا ہے۔ مومنوں کے لیے دلوں کو شفا بخشتا ہے اور ان سے کدورت دُور کرتا ہے"۔ (عباس بن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب)

جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کو پایا۔ اس کے بعد آپؑ نے مجھ سے فرمایا: ہم میں سے کس شخص نے دشمن سے جنگ کی؟

میں نے عرض کیا: آپؑ کے بھتیجے نے۔

اس پر آپؑ نے فرمایا: کیا میں نے تمھیں اور ابن عباس کو جنگ کرنے سے منع نہیں کیا تھا؟

انھوں نے جواب دیا: جی ہاں! آپؑ نے منع فرمایا تھا مگر دشمن نے خود ہی مجھے للکارا۔

اس پر آپؑ نے فرمایا: اگر تم نے اپنے پیشوا کی اطاعت کی ہوتی تو وہ اس سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ تم دشمن کی للکار کا جواب دیتے۔ اس کے بعد آپؑ نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی کہ وہ عباس کی لغزش کو معاف کرے اور جہاد کی انھیں جزا دے۔

غرار کے قتل ہو جانے کی وجہ سے معاویہ بہت زیادہ مضطرب و آشفتہ خاطر ہوا۔ چنانچہ اس کے حکم کے مطابق اور انعام کے وعدے پر قبیلہ "لخم" کے دو افراد نے عباس بن ربیعہ کو پیکار کی غرض سے للکارا، لیکن حضرت علی علیہ السلام نے انھیں نبرد آزمائی کی اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ معاویہ تو یہ چاہتا ہے کہ بنی ہاشم میں سے ایک شخص بھی زندہ نہ رہے۔

اس کے بعد آپؑ نے عباس کے لباس اور اسلحہ سے خود کو آراستہ کیا اور انھی کے گھوڑے پر

سوار ہو کر ان دونوں افراد کی طرف روانہ ہوئے اور انھیں وہیں ہلاک کر دیا۔ میدانِ کارزار سے واپس آکر آپؑ نے ابن عباس کا اسلحہ انھیں واپس کیا اور فرمایا کہ جو کوئی تمھیں نبرد آزمائی کے لیے للکارے تو پہلے تم میرے پاس آؤ۔

اس واقعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی بنی ہاشم بالخصوص خاندانِ رسالت کی جانب خاص توجہ و عنایت تھی اور ان کی جان کی حفاظت کے لیے آپؑ ہر ممکن کوشش فرماتے۔ چنانچہ! بحرانِ جنگ میں جب کہ آپؑ کی جانب تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور آپؑ کے فرزندوں کو دشمن اپنے تیروں کا نشانہ بنائے ہوئے تھا، اس وقت بھی آپؑ کو اپنی جان کی پروانہ تھی۔ چنانچہ! خود آگے بڑھ جاتے اور اپنے ہاتھ سے تیروں کے رُخ کو کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری جانب منتشر کر دیتے۔ (شرح نہج البلاغہ: ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۲۱۹)

استقامت و پائیداری کے لیے نصیحت

لشکرِ اسلام کا مرکزی حصہ پہلے کی طرح اب بھی سپاہِ دشمن کے قلب میں جنگ آزما تھا اور حبیب بن مسلمہ کے سخت حملے کے باعث بائیں بازو کا پرہ (جناح چپ) پسپا ہو کر فرار کرنے لگا تھا۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے جب یہ کیفیت دیکھی تو انھوں نے مالک اشترؓ کو حکم دیا کہ ان فرار کرنے والوں کی طرف جاؤ اور ان سے کہو کہ موت سے بچ کر کہاں جا رہے ہو؟ کیا اس زندگی کی جانب جو قطعی ناپائیدار ہے؟

مالک اشترؓ فرار کرنے والوں کی جانب لپکے اور کئی مرتبہ پکار کر کہا کہ لوگو! میں مالک ہوں۔ لیکن کسی نے ان کی جانب توجہ نہ کی جس کی وجہ یہ تھی کہ بیشتر لوگ انھیں اشتر کے نام سے جانتے تھے لہٰذا جس وقت انھوں نے کہا کہ میں مالک اشتر ہوں تو فرار کرنے والے واپس آنے لگے اور ان کے گرد جمع ہو گئے۔

مالک اشترؓ نے اپنے زورِ بیان سے ان لوگوں کو دوبارہ جنگ و نبرد کے لیے آمادہ کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے قبیلۂ مذحج کے افراد کو جو اپنی دلیری و جنگجوئی میں مشہور تھے، خاص طور پر نبرد آزمائی کی دعوت دی اور کہا کہ میدانِ کارزار میں اپنی مردانگی کے جوہر دکھائیں اور دشمن کو پسپائی پر مجبور کر دیں۔ ان سب نے یک زبان ہو کر اپنی آمادگی کا اعلان کیا اور کہنے لگے کہ ہم آپؑ

کے فرمانبردار ہیں۔ طائفہ ہمدان کے سو افراد اور ان کے علاوہ دیگر چند دانشور، جرأت مند اور باوفا لوگ مالک اشترؓ کی جانب واپس آگئے اور اس طرح دوبارہ دائیں جانب کا پرہ مضبوط ہو گیا۔ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ جس لشکر پر بھی حملہ آور ہو جاتے، اسے نیست و نابود کر دیتے۔ چنانچہ ان کے سخت و شدید حملات کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ دشمن کو مجبوراً پسپا ہونا پڑا۔

فرار کرنے والوں کی سرزنش

فرار کرنے والے جب واپس آگئے تو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اس پیش بندی کے خیال سے کہ یہ اقدام دوبارہ نہ ہو، ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> "میں نے تمھاری چابک دستی و دلاوری بھی ملاحظہ کی اور دیگر سپاہ کی صفوں سے تمھیں سرتابی کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اہل شام تو جفاکار، پست فطرت اور صحرانشین بدو ہیں، مگر افسوس انھوں نے تمھیں راہِ فرار دکھا دی جب کہ تم شائستہ و لائق، برگزیدہ اور سربرآوردہ عرب ہو، جو رات کی تاریکیوں میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے اور لوگ گمراہی میں بھٹک رہے تھے۔ تم حق کی جانب آنے کی دعوت دے رہے تھے، اگر تم فرار کرنے کے بعد واپس نہ آگئے ہوتے تو وہ سخت سزا تمھارے گریبان گیر ہوتی جو خداوند تعالیٰ نے مفرورین کے لیے مقرر کی ہے۔ ①
>
> ...... یہ جان لو کہ جو شخص راہِ فرار اختیار کرتا ہے وہ خدا کے غضب کو برانگیختہ کرتا ہے اور خود ہلاکت کی جانب بڑھتا ہے اور وہ اس پستی و ذلت کی طرف

---

① شاید آپؑ کا اس آیت کی جانب اشارہ ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ ...... "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلے میں پیٹھ نہ پھیرو جس نے ایسے موقعے پر پیٹھ پھیری یا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا کسی دوسرے فوجی دستے سے جاملنے کے لیے تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ (سورۂ انفال: آیت ۱۵-۱۶)

چلا جاتا ہے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ اس کے ذریعے اپنے ابدی ننگ و رسوائی اور بدبختی کے سامان مہیا کرتا ہے۔ جو شخص فرار کرتا ہے نہ اس کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی اسے خدا تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ اس بنا پر ان مذموم صفات کو حاصل کرنے سے موت کہیں زیادہ گوارا ہے"۔ ①

جنگ میں مالک اشترؓ کا کردار

مالک اشترؓ دراز قامت، مضبوط جسم اور لاغر بدن انسان تھے مگر بہت زیادہ طاقتور و تنومند۔ ایک مرتبہ قیس کے دو فرزند "مسقد اور حمیران" کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ مسقد نے کہا کہ گر مالک اشترؓ کی نیت ان کے عمل کی طرح ہے تو عربوں میں ان کا ثانی نہیں تو اس پر حمیر نے جواب دیا کہ ان کا عمل ان کے خلوصِ نیت کا آئینہ دار ہے۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۵۴-۲۵۵)

مالک اشترؓ سرتاپا ایسے مسلح تھے کہ انھیں پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔ شمشیر یمانی ان کے ہاتھ میں تھی، جس وقت یہ تلوار ان کے ہاتھ میں گھوم جاتی تھی تو لگتا تھا کہ یہ تلوار نہیں آبِ رواں ہے اور جس وقت فضا کو چیرتی ہوئی گزرتی تھی تو اس کی چمک سے دیکھنے والوں کی آنکھیں چکاچوند ہوجاتی تھیں۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۵۴-۲۵۵)

مالک اشترؓ نے ہمدانیوں کے ساتھ ان پانچ صفوں کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تھا کہ جنھوں نے معاویہ سے یہ عہد کیا تھا کہ مرتے دم تک تم پر آنچ نہیں آنے دیں گے لیکن مالک اشترؓ نے ان چار صفوں کو پسپا کردیا۔ (حوالہ سابق)

مالک اشترؓ جیسے لائق و اہلِ فرمان دار کی موجودگی جہاد میں سپاہیوں کی حوصلہ مندی اور دل گرمی کا سبب ہوتی۔ وہ جس لشکر پر بھی حملہ آور ہوتے، وہ لشکر فرار کر جاتا اور جب بھی منتشر و پراگندہ سپاہ کے درمیان پہنچ جاتے تو انھیں لشکر کی شکل میں مرتب و منظم کر دیتے۔ جس وقت انھوں نے یہ دیکھا کہ سپاہِ اسلام کے لشکر کے فرمان داروں اور پرچم داروں میں سے دو شخص سخت جنگ و

---

① وقعۂ صفین: ص ۲۵۶، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۰۳، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۲۵، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۲۰۳۔

نبرد کے بعد شہید ہو گئے ہیں تو انھوں نے کہا:

> ”خدا کی قسم! یہی صبر جمیل اور کریمانہ عمل ہے اور مرد وہ ہے جو میدانِ کارزار میں کسی کو قتل کر دے یا خود شہید ہو جائے اور جو اس کے بغیر میدانِ جنگ سے واپس آتا ہے تو کیا اس کے لیے باعث ننگ و رسوائی نہیں ہے“۔
>
> (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۰۲، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۲۴)

دو حجر کی جنگ

صفر کی سات تاریخ کو جب کہ فریقین کے لشکر ایک دوسرے کے مدِّ مقابل آ گئے تو پہلا شخص جو معاویہ کے لشکر سے نکل کر میدانِ کارزار میں آیا اور حریف کو نبرد آزمائی کے لیے للکارا، وہ حجر شر کے نام سے مشہور اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے باوفا صحابی حضرت حجر بن عدی کا چچازاد بھائی تھا۔ حجرِ شر کا مقابلہ کرنے کے لیے حجر بن عدی میدانِ جنگ میں پہنچے اور دو حجر کے درمیان سخت نبرد آزمائی ہوئی۔ اسی اثناء میں خزیمہ بن ثابت حجرِ شر کی مدد کے لیے میدانِ جنگ میں آ گیا اور حجر بن عدی کو اس نے زخمی کر دیا۔ سپاہِ اسلام نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ بھی میدانِ کارزار کی جانب بڑھے اور خزیمہ بن ثابت کو قتل کر ڈالا۔ حجر شر بھی مجاہدینِ اسلام میں سے ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد اپنے چچازاد بھائی (حجر بن عدی) کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ اس کی ہلاکت حضرت علی علیہ السلام کے لیے باعثِ مسرت ہوئی اور آپؑ باری تعالیٰ کا شکر بجا لائے۔ [1]

حریث کا قتل

حریث، معاویہ کا غلام تھا اور تنومند ہونے کی وجہ سے اپنے آقا کا بہت محبوب و پسندیدہ تھا۔ اسے میدانِ جنگ میں اسی وقت بھیجا جاتا تھا جب کہ میدانِ کارزار سخت گرم ہو اور جنگ دشوار و حساس لمحات سے گزر رہی ہو۔ اس میں اور معاویہ میں شباہت بھی بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ! کبھی کبھی وہ اپنا مخصوص لباس بھی اس غلام کو پہنا دیتا تھا، جس کے باعث لوگ یہ سمجھنے لگتے کہ معاویہ بذاتِ خود میدانِ جنگ میں آ گیا ہے۔

---

[1] وقعۂ صفین: ص ۲۵۳-۲۵۴، الا تستحی الرجل ان ینصرف لم یقتل ولم یقتل؟

معاویہ نے اس سے یہ فرمائش کی کہ امیرالمومنین کے علاوہ وہ جس سے بھی چاہے نبرد آزما ہوجائے لیکن عمرو بن عاص نے اسے اپنی باتوں سے یہ ترغیب دلائی کہ موقعہ ملے تو (حضرت) علیؑ سے بھی مقابلہ کرنا۔ چنانچہ! وہ حضرت علی علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے گیا اور کہنے لگا کہ اگر مجھ سے زور آزمائی کرنا چاہتے ہو تو آجاؤ۔

حضرت علی علیہ السلام نے ایک ہی وار میں اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اس کے قتل سے معاویہ کو سخت صدمہ ہوا اور اس نے عمرو بن عاص کو سخت ملامت کی۔

آخری تجویز

سرزمین صفین پر دونوں لشکروں کا قیام کافی طویل ہوگیا۔ اس عرصے میں فریقین کا جانی و مالی نقصان بھی بہت زیادہ ہوا۔ ایک روز اس وقت جب کہ میدانِ کارزار گرم تھا اور حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں دشمن کے بہت سے جانباز دلاور مارے جا چکے تھے، آپؑ نے لشکرِ حریف کو للکارا اور کہا:

"ہے کوئی جو مجھ سے نبرد آزما ہو"۔

مگر دشمن کی صفوں میں سے کوئی بھی میدانِ جنگ میں نہ آیا۔ اس وقت حضرت علی علیہ السلام گھوڑے پر سوار تھے۔ چنانچہ! آپؑ لشکرِ شام کے سامنے آئے اور معاویہ کو طلب کیا۔

معاویہ نے کہا: ان سے پوچھو کہ کیا کام ہے؟

آپؑ نے فرمایا: کیا اچھا ہوتا کہ معاویہ میرے سامنے ہوتا اور میں اس سے بات کرتا۔

یہ سن کر معاویہ، عمرو بن عاص کی موافقت کے بعد اپنی صف سے نکل کر سامنے آیا۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: افسوس تیرے حال پر! آخر تُو نے کیوں لوگوں کو قتل کرنے پر کمر باندھ رکھی ہے؟ کب تک دونوں لشکر اپنی تلواریں کھینچے رہیں گے۔ کیوں نہ ہو کہ ہم باہم نبرد آزما ہوجائیں تاکہ جو بھی غالب آجائے، حکومت اسی کو مل جائے۔

اس پر معاویہ نے عمرو بن عاص سے پوچھا: تمھاری کیا رائے ہے، کیا میں علیؑ سے نبرد آزمائی کروں؟

عمرو بن عاص نے کہا: تجویز تو معقول و منصفانہ ہے۔ اگر اس وقت اس تجویز سے رُوگردانی کی تو تیرا خاندان ابد تک ذلت و خواری میں گرفتار رہے گا۔

معاویہ نے کہا: بھلا میں اور تمھاری باتوں میں آجاؤں!

واللہ ما بارز ابن ابی طالب رجلا قط الاسقی الارض من دمہ

"میں علیؑ ابن ابی طالب کو خوب جانتا ہوں، خدا کی قسم! اس نے جس سے بھی دست و پنجہ نرم کیا، اسی کے خون سے زمین کو سیراب کر دیا"۔

یہ کہہ کر واپس اپنے لشکر کی جانب چلا گیا اور آخری صف میں پہنچ کر پناہ لی۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام کو ہنسی آگئی۔ چنانچہ! آپ بھی اپنی جگہ واپس آگئے۔ ①

بدترین حربے کا سہارا

حارث بن نضر کا شمار حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب میں ہوتا تھا۔ عمرو بن عاص کو ان سے خاص دشمنی تھی اور شاید ہی کوئی ایسی مجلس ہو جس میں حارث کی برائی نہ کرتا ہو۔ حارث نے بھی عمرو بن عاص کے متعلق کچھ شعر کہے اور اس کے پاس بھیج دیے۔ ان اشعار میں اسے یہ اشتعال دلایا گیا تھا: "اگر نیک نامی اور کار خیر کی تمنا ہے تو علیؑ ابن ابی طالبؑ کے مدِ مقابل آجاؤ"۔

ان اشعار کو پڑھ کر عمرو بن عاص نے قسم کھائی کہ "علیؑ سے ضرور زور آزمائی کروں گا چاہے ہزار مرتبہ موت کا سامنا کرنا پڑے"۔

یہ کہہ کر وہ میدان کارزار میں آیا حضرت علی علیہ السلام بھی اس کی جانب بڑھے۔ حضرت علی علیہ السلام کو دیکھ کر عمرو بن عاص پر ایسا خوف طاری ہوا کہ اس نے خود کو گھوڑے سے زمین پر گرا دیا اور شرم گاہ کھول دی۔ حضرت علی علیہ السلام نے منہ پھیر لیا تو عمرو بن عاص نے راہ فرار اختیار کی۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۶، ص ۲۱۳-۲۱۴)

---

① وقعۂ صفین: ص ۲۷۴، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۲۱۷-۲۱۸۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تاریخ کے اس حصے میں حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کا اپنی سپاہ کے ساتھ جو رویہ رہا اسے مورخین نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کتنی ہی مرتبہ محاذ جنگ پر تشریف لے گئے اور آپؑ نے اپنے ساتھیوں کی مدد بھی کی مگر اس کے برعکس معاویہ کی یہ پوری توجہ اپنی جان کی حفاظت کی جانب رہی۔ اس واقعے کے ضمن میں جو گزر چکا ہے کہ معاویہ نے عمرو بن عاص سے کہا تھا: کیسی نادانی کی باتیں کرتے ہو، قبائل مکہ اشعریان اور جذام کے ہوتے ہوئے میں علیؑ سے نبرد آزمائی کروں۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۷۵)

سردارانِ دشمن کا اعتراف

عمرو بن عاص، عقبہ، ولید، عبداللہ اور طلحہ کے بیٹے جیسے لشکرِ شام کے نامور سردار ایک رات معاویہ کے گرد جمع تھے اور گفتگو حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ہو رہی تھی کہ عقبہ نے کہا:

(حضرت) علیؑ کا ہمارے ساتھ رویہ بڑا ہی عجیب و حیرت ناک ہے کیوں کہ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں بچا جو ان کے ستم کا نشانہ نہ بن چکا ہو۔ میرے عقبہ اور بھائی حنظلہ کو تو انھوں نے ہی قتل کیا تھا اور میرے چچا شیبہ کے قتل میں بھی وہ شریک تھے۔ اے ولید! تیرے باپ کو بھی علیؑ نے ہی قتل کیا ہے اور اے مروان! تجھے علیؑ سے دو لحاظ سے صدمہ پہنچا ہے۔

اس پر معاویہ نے کہا: یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو تو وہ (حضرت) علیؑ کی شجاعت کا اعتراف ہے۔ پھر تم نے ان کا کیا بگاڑ لیا؟

مروان نے کہا: آپ کیا چاہتے ہیں، مَیں ان کے ساتھ کیا کروں؟

اس نے کہا: اپنے نیزے سے ان کی تکہ بوٹی کر دو۔

مروان نے کہا: لگتا ہے کہ آپ کو مذاق سوجھا ہے اور ہمارے ذریعہ آسودہ خاطر ہونا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر ولید نے بھی چند اشعار کہے جن کا مفہوم و مضمون یہ تھا:

"معاویہ کہتا ہے کہ ہے کوئی جو ابوالحسنؑ پر حملہ آور ہو، اور اپنے مقتول بزرگوں کا ان سے انتقام لے۔ گویا فرزندِ ہند کو دل لگی سوجھی ہے یا وہ کوئی اجنبی ہے جو (حضرت) علیؑ کو نہ پہچانتا ہو، کیا تم ہمیں اس سانپ سے ڈسوانا چاہتے ہو جو صحرا کے بیچ رہتا ہے۔ اگر کاٹ لے تو اس کے زہر کا منتر نہ ملے۔ ہم تو علیؑ کے مقابل اس بجو کی طرح ہیں جو کسی وسیع دشت میں ہیبت ناک شیرِ غراں کے سامنے آ گیا ہو۔ عمرو بن عاص نے حیلے سے اپنی جان تو بچا لی مگر ڈر کے مارے اس کا دل سینے میں دھڑک رہا ہے"۔

ولید کے اشعار سن کر عمرو بن عاص کو غصہ آ گیا، اس نے جواب دیا:

"ولید نے (حضرت) علیؑ کے رُعب دار وحشت ناک نعروں کی یاد تازہ کر دی۔ میدانِ جنگ میں شجاعت و دلاوری کے جوہر ان کی ذات سے

نمایاں ہوتے ہیں جب قریش ان کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے دلوں کے پرندے سینوں کے قفس سے پرواز کرنے لگتے ہیں۔ تم مجھے تو تنبیہ و توبیخ کر رہے ہو درحالانکہ معاویہ اور ولید تک (حضرت) علیؑ سے دہشت کھاتے ہیں اور ولید اگرچہ تو سچ کہہ رہا ہے اور اگر سو رہا ہے تو علیؑ کا سامنا کر، خدا کی قسم! اگر علیؑ کی آواز بھی سن لی تو دل ہوا ہو جائے گا اور رگیں پھول کر کپّہ ہو جائیں گی اور عورتیں تیرا سوگ مناتی رہیں گی"۔ (وقعہ صفین: ص ۲۱۷-۲۱۸)

دھوکا

دلیری و جانبازی، راہِ خدا میں جہاد مقدس اور شرک کے منصب داروں کی بیخ کنی حضرت علی علیہ السلام کے ایسے نمایاں کارنامے ہیں جن کا شمار آپؑ کے اہم ترین امتیازات و افتخارات میں ہوتا ہے لیکن معاویہ رائے عامہ کو بدلنے کی خاطر انھی فضائل کو ایسے نقص سے تعبیر کرتا تھا جو اس کے خیال کی رُو سے اُمورِ زمام داری اور اُمت کی قیادت میں مانع ثابت ہوتے ہیں۔

ایک روز معاویہ نے عبیداللہ بن عمر کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ حضرت امام حسن علیہ السلام کے پاس جائے اور ان سے ملاقات کرے اور ان تک معاویہ کا پیغام پہنچائے۔ جب وہ حضرت امام حسن علیہ السلام کے پاس پہنچا تو اس نے امام علیہ السلام سے کہا: آپؑ کے والد نے اوّل سے آخر تک قریش کا خون بہایا ہے اور اپنے اس عمل سے ان کے دلوں میں جذبۂ کینہ و دشمنی کو برافروختہ کیا ہے۔ کیا آپؑ ان کا ساتھ ترک نہیں کر سکتے تا کہ زمامِ خلافت آپؑ کے اختیار میں دے دی جائے۔

اس پر حضرت امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: ہرگز ممکن نہیں! خدا کی قسم! یہ کام کسی بھی صورت میں عمل پذیر نہیں ہو سکتا۔ لگتا ہے کہ تمھارا وقت پورا ہو چکا ہے اور تُو آج یا کل قتل ہونے والا ہے۔ شیطان نے تجھے فریفتہ کیا ہے، اسی لیے اس نے تمھارے کاروبار کو رونق بخشی ہے۔ خداوند تعالیٰ تجھے نیست و نابود کرے"۔

عبیداللہ، معاویہ کے پاس واپس آ گیا اور تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ چار ہزار سپاہیوں کا لشکر میدان میں حملہ آور ہوا اور وہ طائفہ ہمدان کے ایک شخص کے ہاتھوں قتل ہوا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے جو پیش گوئی فرمائی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے اس کا خون آلود لاشہ جب زمین پر گرا ہوا دیکھا تو آپؑ کو مسرت ہوئی اور خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۹۷)

جنگ کی شدت

جنگ کے نویں روز جب کہ پرچم، ہاشم مرقال کے ہاتھ میں تھا، سپاہِ اسلام میں خاندانِ مذحج اور سپاہِ شام سے عک، لخم اور اشعریوں کے درمیان شدید جنگ جاری تھی، حضرت علی علیہ السلام کی تلوار سے پانچ سو سے زیادہ عرب کے سربرآوردہ اور دلاور قتل ہوئے۔ یہاں تک کہ آپؑ کی تلوار خمیدہ ہوگئی۔

راوی کا بیان ہے کہ ہم حضرت علی علیہ السلام کی خمیدہ تلوار لیتے اور اسے سیدھا کر دیتے اور واپس دے دیتے، جسے لے کر آپؑ دشمن کی صفوں میں اتر جاتے۔ خدا کی قسم! ہم نے کوئی ایسا شجاع نہیں دیکھا جو دشمن کے لیے علیؑ سے زیادہ سخت ہو۔ (وقعۂ صفین: ص ۲۹۷)

اس روز فریقین کے لشکر ایک دوسرے کی جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔ پہلے تو تیروں اور پتھروں سے مقابلہ ہوتا رہا، اس کے بعد نیزوں سے جنگ شروع ہوئی۔ جب نیزے بھی ٹوٹ گئے تو تلواروں اور لوہے کے گرزوں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ اس دن میدانِ کارزار ایسا گرم تھا کہ اسلحہ کی چکاچک کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی، نعروں کی گونج، بجلی کی گرج، پہاڑوں کی چٹانیں ٹکرانے سے کہیں زیادہ ہولناک تھی۔ فضا اس وقت ایسی گرد آلود تھی کہ لگتا تھا کہ سورج غروب ہو رہا ہے۔ اس گرد و خاک اور تاریکی کے درمیان پرچم و بیرق کہیں نظر نہ آتے تھے۔ مالک اشترؓ کبھی سپاہ میمنہ کی طرف جاتے اور کبھی لشکرِ میسرہ کی جانب لپکتے۔ چنانچہ وہ جس لشکر یا قبیلے کے پاس پہنچتے، جنگ جاری رکھنے کے سلسلہ میں اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ جنگ نصف شب تک جاری رہی اور اس وقت نماز پڑھنے کا بھی موقع نہ تھا۔

مالک اشترؓ مسلسل میدانِ جنگ کی جانب بڑھتے چلے جا رہے تھے یہاں تک کہ کارزار ان کے پیچھے رہ گیا اور وہ آگے نکل گئے۔

اس اثناء میں حضرت امام مجتبیٰ علیہ السلام دشمن پر حملہ آور ہونے کے ارادے سے آگے بڑھے لیکن انھیں دیکھ کر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

ان کو میدانِ جنگ میں نہ جانے دو کیوں کہ ان دو فرزندوں (حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام) کی جانب میری خاص توجہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ نسل پیغمبرؐ روئے زمین سے مفقود و ناپید ہو جائے"۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۸، (فیض)۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام قلب لشکر میں پیش پیش تھے۔ مالک دائیں پرے میں اور ابن عباس سپاہ کے بائیں پرے میں تھے۔ انجام کار! یہ جنگ نویں روز اس دسویں شب جو "لیلۃ الہریر" ① کے نام سے مشہور ہے، اختتام پذیر ہوئی جس میں فریقین کا بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا اور دونوں لشکروں ② کے سپاہی بھی تھک چکے تھے مگر تھکن کے آثار سپاہ شام میں نمایاں طور پر نظر آتے تھے اور فتح و ظفر کی علامات سپاہِ عراق سے ہویدا تھیں۔

دو لائق فرمان داروں کی شہادت

نویں روز جو دردناک حوادث رُونما ہوئے ان میں حضرت علی علیہ السلام کے دو فرمان داروں یعنی عمار یاسرؓ اور ہاشم مرقالؓ کی شہادت تھی، اگرچہ! عمار کی عمر نوے سال سے تجاوز کر گئی تھی مگر ان میں اس قدر چستی و دلیری تھی اور ایسا جوش و خروش پایا جاتا تھا کہ جس سے جوانوں کو تقویت حاصل ہوتی تھی۔

حضرت عمارؓ جس وقت میدانِ کارزار کی جانب روانہ ہوئے تھے اس وقت وہ دست بہ دُعا تھے اور خداوند تعالیٰ سے فریاد کر رہے تھے:

"اے پروردگار! اے خدا! تُو ناظر و شاہد ہے اگر میں یہ جان لوں کہ تیری رضا اسی میں ہے کہ میں خود کو سمندروں میں گرا دوں تو میں ایسا ہی کروں گا۔

---

① لغت میں ہریر کے معنی اس آواز کے ہیں جو سردی پڑنے کی وجہ سے نکلتی ہے چوں کہ اس شب میں شدید جنگ جاری تھی اور فریقین کے گھڑسوار ایک دوسرے کے سر پر پہنچے تھے اس لیے اس رات کو لیلۃ الہریر کہتے ہیں۔ (معجم البلدان: ج ۵، ص ۴۰۳، مجمع البحرین: ج ۳، ص ۵۱۸، مادہ ہرر)

② نصر بن مزاحم نے وقعۂ صفین: ص ۴۷۵ پر اس دن اور رات کے دوران قتل ہونے والوں کی تعداد ستر ہزار افراد بیان کی ہے۔

اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ تیری خوشنودی اس میں ہے کہ میں اپنے سینہ و دل کو نوکِ شمشیر پر اس طرح رکھ دوں کہ وہ میری کمر سے نکل آئے تو یقیناً میں ایسا ہی کروں گا لیکن اس علم کے مطابق جو تُو نے مجھے دیا ہے، میں یہ جانتا ہوں کہ تجھے آج کوئی عمل اس سے زیادہ راضی و خوشنود نہیں کر سکتا کہ میں ظالموں کے خلاف جہاد کروں"۔ (وقعۂ صفین: ص ۳۲۰، شرح ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۲۵۳)

حضرت عمارؓ وہ مخلص دلاور اور ایسے جنگجو سپاہی تھے، جو میدانِ کارزار میں تھکنا نہیں جانتے تھے۔ وہ ایک عاشق جانباز کے مانند جنگ کرتے، حق کے دشمنوں کے لیے ان کی تلوار موت کا پیغام تھی اور جس کے سر پر پڑ جاتی، اسے واصلِ جہنم کرتی، مگر حامیانِ حق کے دلوں کو اس سے تقویت ملتی۔ درحقیقت وہ میزانِ حق تھے، نبی اکرم ﷺ نے ان ہی کی شان میں تو فرمایا تھا:

"عمارؓ حق کے ساتھ زندہ ہے اور حق عمارؓ کے ساتھ ہے"۔ ①

جو شخص بھی ان کے ساتھ محاذ پر جنگ کرتا، اسے یہ یقین ہوتا تھا کہ وہ حق کی مدافعت کریں گے اور اسی راہ میں اگر انھیں قتل بھی کر دیا گیا تو انھیں بہشت بریں میں جگہ ملے گی۔

مسلمانوں کے درمیان یہ بات مشہور تھی کہ عمارؓ میزانِ حق ہیں۔ چنانچہ! جب بھی حق و باطل کے درمیان تشخیص کرنا مقصود ہوتا تو عمارؓ کے عمل اور موجودگی کو بطورِ سند پیش کیا جاتا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے:

"ان کا چچازاد بھائی "ذی الکلاع حمیری" شامی سپاہ عراق میں شامل تھا۔ عمارؓ نے اسے بلایا اور کہا: میں نے اس لیے بلایا ہے کہ تمھیں وہ حدیث سناؤں جو عمرو بن عاص نے رسولِ خدا ﷺ سے نقل کی ہے:

شام اور عراق کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوں گے۔ ان میں سے ایک حق و ہدایت کا پیشوا ہوگا اور عمار اسی کے ساتھ ہوں گے۔ ②

---

① حضرت عمارؓ سے متعلق احادیث نبوی کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: معجم رجال الحدیث: ج ۱۲، ص ۲۷۷، طبقات ابن سعد: ج ۳، ص ۱۸۷، استیعاب: ج ۲، ص ۴۳۶، وقعۂ صفین: ص ۲۲۲-۲۳۳

② یلتقی اهل الشام و اهل العراق وفی احد الکتیبتین الحق و امام الهدی و معه عمار بن یاسر

اس پر ابونوح نے کہا: خدا کی قسم! عمارؓ ہمارے ساتھ ہیں اور ہم سب سے زیادہ انھیں تم سے جنگ کرنے پر اصرار ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ تم سب ایک تن ہوتے اور میں اسے ذبح کرتا اور سب سے پہلے تجھ چچازاد بھائی کو ہی قتل کرتا...... کیوں کہ ہم حق پر ہیں اور تم باطل پر ہو"

اس کے بعد ذی الکلاع کی درخواست پر وہ عمرو بن عاص کے پاس گئے تا کہ اس تک بھی یہ اطلاع پہنچائی جا سکے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے لشکر میں عمارؓ بھی موجود ہیں اور شامیوں سے جہاد کرنے کے لیے واقعی وہ سنجیدہ ہیں تا کہ ان کے ضمیر کو بیدار کیا جا سکے۔

عمرو بن عاص نے بھی گفتگو کے درمیان اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اس نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن رکھا ہے کہ عمارؓ کو جفا کار اور باغی قتل کریں گے۔ اس کے بعد عمرو بن عاص کی تجویز پر اس کے اور عمارؓ کے درمیان ملاقات کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ گفتگو عمرو بن عاص کی جانب سے شروع ہوئی۔ اس نے عمارؓ کو پند و نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ جنگ و خونریزی سے باز رہیں۔

اس ضمن میں یہ بھی کہا کہ ہمارے اور تمھارے درمیان خدا کا فیصلہ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشترک ہیں۔

عمار نے کہا: خدا کا شکر کہ جس نے تجھے یہ توفیق دی کہ تم نے وہ سب باتیں اپنی زبان سے خود ہی کہیں دیں جو مجھے اور میرے دوستوں کو کہنی چاہیے تھیں نہ کہ تمھیں، اب میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میں تم سے کیوں جنگ کر رہا ہوں۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں "ناکثین" سے جنگ کروں گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ رسولِ خدا نے ہی یہ حکم دیا تھا کہ میں "قاسطین" سے جنگ کروں گا اور تم وہی ہو اسی لیے میں تم سے برسرِ پیکار ہوں"۔ (وقعۂ صفین: ص ۳۴۰، ۳۴۳)

بالآخر گفتگو کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچی اور اب عمار دشمن کی اس فوج کے مقابلے میں گئے جس کی فرمان داری عمرو بن عاص کے ہاتھ میں تھی۔ جس وقت ان کی نگاہ عمرو بن عاص کے پرچم پر پڑی تو انھوں نے کہا: خدا کی قسم! اس پرچم کے خلاف تو میں تین مرتبہ جنگ کر چکا ہوں۔ اس راہ پر چل کر آدمی کہیں نہیں پہنچے گا اور دوسرے راستوں سے یہ کسی طرح بھی بہتر نہیں ہے"۔ [1]

---

[1] واللہ ان ھذہ الرأیۃ قاتلھا ثلاث عرکات وما ھذہ بارشدھن (وقعۂ صفین: ص ۳۴۰)

عمار نے اپنے ساتھیوں کے درمیان بآواز بلند کہا:

این من یبتغی رضوان ربہ ولا یوب الی مال ولا ولد

"کہاں ہیں وہ لوگ جو رضائے خدا کے متمنی ہیں اور جنھیں مال واولاد سے علاقہ نہیں"۔

اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے جنھوں نے راہ خدا میں پیش قدمی کی تھی، کہا: ہمارے ہمراہ ان لوگوں سے جنگ وجدل کے لیے جلد جلد آگے آؤ جو اپنی دانست میں حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔(وقعۂ صفین: ص ۳۲۶)

حضرت عمار جس لشکر میں شامل تھے اس کے پرچم دار ہاشم مرقال تھے۔ وہ اپنے پرچم دار کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے کہ دشمن پر حملہ آور ہوں۔ ہاشم مرقال بھی اپنی بے مثال دلاوری کے باعث جنگجو سپاہیوں کے لیے راستہ ہموار کرتے رہتے۔ جب کبھی ان کا نیزہ ٹوٹ جاتا تو حضرت عمار انھیں دوسرا نیزہ دے دیتے۔ ان دو جانبازوں کی بے پناہ و دلیرانہ نبرد آزمائی نے عمرو بن عاص کو ایسا مرعوب کیا اور اس کے دل پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ اس نے بآواز بلند کہا: جس شخص نے یہ سیاہ پرچم اپنے ہاتھ میں سنبھال رکھا ہے اگر اسی طرح آگے بڑھتا رہا تو آج یہ تمام عربوں کو ہلاک کر ڈالے گا۔(وقعۂ صفین: ص ۳۲۸)

جب یہ پیشوائے حریت یعنی حضرت عمار بہت سے شامیوں کو ہلاک کر چکے تو ان پر معاویہ کی فوج کے دو دلاور حملہ آور ہوئے اور ان میں سے ایک نے اپنے نیزے سے ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ زمین پر آرہے اور دوسرے نے ان کے سر مبارک کو تن سے جدا کر دیا اور اس طرح اس جری و دلیر سپاہی نے اپنے اس سر کو جس سے وہ اپنے معبود حقیقی کے سامنے جبین سائی کرتا تھا، میدان جہاد میں اسی کی خاطر قربان کر دیا۔(وقعۂ صفین: ص ۳۴۰-۳۴۱)

... اس جنگ کے دوسرے دلیر و جانباز ہاشم بن عتبہ تھے جو دو زرہ پہنے ہوئے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے جس وقت پرچم ان کے سپرد کیا تو بطور مزاح ان سے فرمایا: اس کالے بزدل کا تو ڈر کہیں تمھارے دل میں نہیں؟

اس پر انھوں نے عرض کیا: یہ تو امیر المومنین کو جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔ قسم خدا کی میں ان کے

سروں کو اس طرح اُڑاؤں گا کہ جس طرح کوئی اس دنیا سے دوسری دنیا میں جانے کا قصد رکھتا ہو۔

اس کے بعد انھوں نے نیزہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس زور سے اسے جھٹکا دیا کہ وہ ٹوٹ گیا۔ دوسرا نیزہ لایا گیا وہ چونکہ سوکھ چکا تھا، اس لیے انھوں نے اسے دُور پھینک دیا۔ بالآخر انھیں ایک نرم نیزہ دیا گیا، جس پر انھوں نے پرچم کا پھریرا باندھا اور اپنے حملے کو اس خیمے پر مرکوز کر دیا جس میں عمرو بن عاص، معاویہ اور ان کے دوست واحباب جمع تھے۔ اس روز کشت وکشتار کا ایسا بازار گرم ہوا کہ کسی نے اس سے پہلے ایسی قتل وغارت گری نہ دیکھی تھی اور نہ ہی کسی کو موت کی ایسی گرم بازاری یاد تھی۔ (وقعۂ صفین: ص ۳۲۸)

آخری مرتبہ جب سپاہ پرچم امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے ہاشم کو دیا تو چاہا کہ اب یہ جنگ ایک طرف ہو۔ چنانچہ! آپؑ نے فرمایا: ہاشم! معلوم نہیں کہ اب تمھارا آب ودانہ کب تک کا باقی ہے؟

اس پر انھوں نے عرض کیا: اس مرتبہ راہِ جہاد میں ایسے نکلوں گا کہ پھر کبھی واپس نہ آؤں گا۔

آپؑ نے فرمایا: تمھارے مقابل ذی الکلاع ہے اور اس کے گرد موت منڈلا رہی ہے، سرخ موت۔

ہاشم میدان کارزار کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ معاویہ کے نزدیک پہنچے تو اس نے پوچھا: یہ کون شخص ہے جو آگے بڑھا چلا آرہا ہے؟

اس سے بتایا گیا کہ یہ ہاشم مرقال ہیں۔ ①

یہ سن کر اس نے کہا: یہ وہی بنی زہرہ کا کانڑا ہے، خدا اسے غارت کرے۔ ②

حضرت ہاشم نے اپنے ان ساتھیوں کے ہمراہ جو قاریٔ قرآن اور خدا کے عاشق تھے، کتنی مرتبہ دشمن کی صف کو درہم برہم کیا۔ چنانچہ! جس وقت وہ طائفہ "تنوخ" کے پرچم تک پہنچے، تو تقریباً دشمن کے دس دلاوروں کو ہلاک کر چکے تھے۔ انھوں نے معاویہ کے پرچم دار کو جو طائفہ عذرہ کا فرد

---

① انھیں مرقال اس بنا پر کہا جاتا تھا کہ وہ بہت چست و چالاک اور تیز رفتار تھے۔ چونکہ جنگ کے دوران ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی اسی لیے انھیں اعور بھی کہا جاتا تھا۔

② یہاں معاویہ کا اشارہ حضرت مرقال کی جانب تھا کیوں کہ جنگ کے دوران ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی۔

تھا، قتل کر دیا۔ اس کے بعد ذی الکلاع ان سے جنگ کرنے کے لیے میدان میں آیا۔ ان کے درمیان ایسی زبردست جنگ ہوئی اور ایسی کاری ضربیں ایک دوسرے پر لگائیں کہ دونوں ہی قتل ہو گئے۔ (وقعۂ صفین: ص ۳۴۸) اس کے بعد ان کے فرزند عبداللہ نے فوراً ہی اپنے والد کا پرچم اُٹھا لیا اور جہاد کے لیے آمادہ ہو گئے۔ (وقعۂ صفین: ص ۳۴۸)

حضرت عمارؓ کی شہادت کا ردِعمل

حضرت عمار یاسرؓ اور ہاشم مرقال کی شہادت نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور آپؑ کے اصحاب کو بہت زیادہ غمگین و رنجیدہ خاطر کیا۔ چنانچہ! ان کی جدائی کا ایسا قلق و صدمہ ہوا کہ آپؑ نے ان کے سوگ میں گریہ وزاری کرتے ہوئے چند اشعار بھی کہے جن کا مفہوم یہ ہے:

"اے موت! مجھے تجھ سے رہائی تو نصیب نہ ہوگی اور مجھے بھی اس زندگی سے نجات دے کیوں کہ تُو نے تمام دوستوں کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تُو کسی راہنما کی مدد سے ان کی تلاش میں نکلتی ہے"۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس شہادت نے باطل کے چہرے کو بے نقاب کر دیا اور لشکرِ اسلام کے بہت سے سپاہیوں کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ چنانچہ! ان میں سے بعض افراد کو جن میں عبداللہ بن سوید بھی شامل تھے، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ حدیث یاد آ گئی جو آپؐ نے حضرت عمارؓ کی شان میں فرمائی تھی اور ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ معاویہ ناحق اور باطل پر ہے اور اس کی یہ جنگ دراصل بغاوت پر مبنی ہے۔ چنانچہ! انھوں نے معاویہ کا ساتھ چھوڑ کر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ہمراہی اختیار کر لی۔

حضرت عمار کی شہادت نے سپاہ دشمن کو بھی اتنا متاثر کیا کہ ان کا حوصلہ بھی متزلزل ہو گیا۔ چنانچہ! عمرو بن عاص نے اس کے اثر کو زائل کرنے کے خیال سے ایک بہانہ نکال ہی لیا اور یہ اعلان کر دیا کہ عمار کے قاتل ہم نہیں بلکہ (حضرت) علیؑ ہیں کیوں کہ انھوں نے انھیں محاذِ جنگ پر بھیجا تھا۔ (تاریخ طبری: ج ۵، ص ۴۱)

معاویہ نے بھی اس جرم کی پاداش میں کہ عمرو بن عاص نے وہ حدیث نقل کی تھی جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمار کی شان میں بیان کی تھی اسے بہت زیادہ سرزنش کی اور کہا:

"تم نے شام کے لوگوں کو میرے خلاف شورش پر آمادہ کیا ہے، کیا ضروری تھا کہ تم نے جو رسولِ خدا ﷺ سے سنا تھا، اسے یہاں بیان کرتے"۔

اس نے جواب دیا: مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ وقت بھی آئے گا جب جنگ صفین بپا ہوگی۔ جس روز میں نے یہ حدیث بیان کی تھی اس وقت عمار ہمارے اور تمہارے ہم خیال تھے۔ اس کے علاوہ جو کچھ میں نے رسولِ خدا ﷺ سے سن کر بیان کیا تھا تم نے بھی اسے نقل کیا ہے اور اگر اس بات سے تمھیں انکار ہے تو خود ہی شام کے لوگوں سے دریافت کرلو۔

یہ سن کر معاویہ پہلے سے بھی زیادہ طیش میں آیا اور اس نے عمرو بن عاص کو بہت زیادہ سخت وسست کہا۔ (وقعۂ صفین: ص ۳۴۵)

نجات کے لیے کوشش

فوج اسلام کی جانب سے معاویہ اور عمرو بن عاص کو جب پے در پے شکست ... اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے لشکر کے مقابلے کی تاب نہیں ... شکست فاش میں زیادہ دیر نہیں ہے، اسی لیے انھوں نے جنگ سے نجات پانے ... منصب کو بچانے کی خاطر کوشش شروع کردی۔ سب سے پہلے انھوں نے عراق کے سرداروں کو پیغامات بھیجے اور ان سے جنگ ترک کرنے کی درخواست کی۔ معاویہ نے ... عتبہ کو جو نہایت ہی فصیح بیان اور چرب زبان آدمی تھا، حکم دیا کہ وہ علی علیہ السلام کے لشکر کے سردار اشعث بن قیس سے ملاقات کرے اور اسے جنگ وجدل ختم کرنے کے لیے آمادہ کرے۔

عتبہ نے اشعث سے ملاقات کی اور خوب مدح سرائی کرنے کے بعد کہا: آپ عراق اور یمن کے لوگوں کے سردار ہیں۔ آپ کی (حضرت) عثمان سے نہ صرف یہ کہ قرابت داری تھی بلکہ آپ ان کی فوج کے فرمان دار بھی تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کے دیگر اصحاب کے برخلاف آپ طائفہ شام کے لوگوں کی حمیت وغیرت اور ان کے جذبۂ ناموس کی خاطر جنگ وجدل میں حصہ لے رہے ہیں۔

آخر میں اس نے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا اور کہا: جنگ انتہائی خطرناک صورت اختیار کرچکی ہے۔ ہم آپ سے یہ تو نہ کہیں گے کہ آپ حضرت علی علیہ السلام سے کنارہ کشی اختیار کرلیجیے۔ البتہ اس بات کے متمنی ہیں کہ اس جنگ کا اب کسی طرح خاتمہ ہوجائے تاکہ سپاہ مزید ہلاک نہ ہو۔

اشعث نے عتبہ کی تعریف وستائش کا جواب دیتے ہوئے اس کے اس بیان کی تائید کی اور کہا:

''میری جنگ شام کے لوگوں سے ایمان وعقیدے کی بنیاد پر نہیں بلکہ میں اہل عراق کی حمایت اس بنا پر کر رہا ہوں کہ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر کی خود حفاظت کرے''۔

اس نے جنگ ختم کرنے کے سلسلے میں اسے منفی جواب نہ دیا، نیز یہ کہا کہ میرے نظریے کا اعلان جلد ہی کر دیا جائے گا۔

اس ملاقات کے ذریعے عتبہ کو اتنی کامیابی تو ہوگئی کہ اس نے اشعث کے ذہن میں صلح کا میلان پیدا کر دیا اور جو تجاویز و پیش نہادات بعد میں وقوع پذیر ہوں گی، ان کے اجراء نیز سپاہِ عراق میں اس کی تشہیر و ترویج کے لیے ایک مؤثر عامل کے طور پر اسے آمادہ کرلیا۔

معاویہ نے یہ بھی حکم دیا کہ عتبہ اور اشعث کے درمیان جو ملاقات ہوئی ہے، نہ صرف یہ کہ اسے بلکہ جو گفتگو ان دونوں نے کی ہے، اُسے حرف بحرف سپاہِ عراق کے درمیان منتشر کر دیا جائے اور عمرو بن عاص سے کہا کہ وہ ابن عباس کو بھی خط لکھے تو عمرو بن عاص نے خط اس طرح لکھا:

''(حضرت) علیؑ کے بعد چونکہ آپ ہی اس جماعت کے سرور و سردار ہیں، اس لیے جو گزر گیا، اسے فراموش کریں اور آیندہ کے بارے میں غور و فکر کیجیے۔ خدا کی قسم! اس جنگ نے ہم پر اور تم پر زندگی حرام اور صبر و تحمل کی تاب تمام کردی ہے۔ یہ جان لیجیے کہ عراق اور شام کو اسی وقت قابو میں لایا جاسکتا ہے جب کہ ان میں سے ایک نیست و نابود ہو جائے۔ طرفین کے اس امر میں ہرگز صلاح نہیں کہ حریف مقابل ہلاک ہو جائے۔ ہمارے اور تمھارے درمیان ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھیں جنگ و جدل پسند نہیں۔ آپ مشیر و امین ہیں لیکن اشتر سنگ دل انسان ہیں اور یہ مناسب نہیں ہے کہ انھیں مشورے میں شریک کیا جائے''۔

ابن عباس نے یہ خط حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دیا جسے دیکھ کر آپؑ کو ہنسی آگئی اور فرمایا:

"اس (عمرو بن عاص) کو خدا غارت کرے، معلوم نہیں کہ اسے کس چیز نے اس بات کے لیے مجبور کیا ہے کہ وہ تم سے اس قسم کی توقع رکھے؟"

اور اس کا جواب دینے کے لیے حکم دیا۔ ابن عباس نے عمرو بن عاص کو واضح و مدلل جواب دیا اور اس کی اُمیدوں پر قطعی پانی پھیر دیا۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۰۹، ۴۱۲)

آخری حربہ

معاویہ کو اتنی کامیابی تو ہو ہی گئی تھی کہ وہ ایک ایسا میدان ہموار کرلے جس کے ذریعے وہ سپاہِ عراق کے درمیان اپنے آخری جنگی حربے کو بروئے کار لاسکے۔ اس نے چونکہ سن لیا تھا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے تمام اہلِ لشکر کے درمیان یہ فرمایا ہے کہ: کل جنگ کو یک طرفہ کر دیا جائے گا۔ اسی لیے اس نے عمرو بن عاص سے کہا کہ بس یہی ایک رات ہے، جس میں ہم کچھ کر سکتے ہیں کیوں کہ کل جنگ یک طرفہ ہو جائے گی، اس بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

اس نے جواب دیا:

"آپ کے جوانوں میں نہ تو ان جوانوں کا مقابلہ کرنے کی تاب و طاقت ہے اور نہ ہی آپ (حضرت) علیؑ کے مثل و مانند ہیں۔ وہ دین کی خاطر جنگ کر رہے ہیں اور آپ دنیا کے لیے۔ آپ زندگی و بقا کے متمنی ہیں اور وہ شہادت کے خواہش مند۔ عراق کے لوگوں کو آپ کے غالب آنے کا خوف و ہراس ہے مگر شام کے عوام حضرت علی علیہ السلام کی فتح و کامرانی سے خوش و خرم ہیں لیکن مَیں ایک مشورہ دیتا ہوں اور وہ یہ کہ ان کے سامنے ایسی تجویز پیش کر دی جائے کہ جس کو وہ یا تو قبول کرلیں گے یا اسے رد کر دیں گے تو ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ انھیں یہ دعوت دیجیے کہ قرآن ہمارے درمیان ثالث و حَکَم ہے اور یہی ایسی راہ ہے، جس کے ذریعے آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مَیں نے اس حربے کو ہمیشہ اس خیال کے پیشِ نظر التوا میں رکھا تاکہ اسے بوقتِ ضرورت بروئے کار لایا جا سکے"۔

معاویہ نے اس کے اس نظریے کو پسند کیا۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۷۶-۴۷۷)

اشعث بن قیس نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس بیان کی پیروی کرتے ہوئے کہ دشمن آخری چند سانسیں لے رہا ہے، کہا:

"......میں کل ان پر حملہ کروں گا تا کہ بارگاہ خداوندی میں ان کا محاکمہ کیا جائے"۔ ①

اس نے اپنے طائفہ "کندا" کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اے مسلمانو! تم دیکھ رہے ہو کہ تم پر کیا گزر گئی ہے؟ کتنے عرب ہلاک ہو چکے ہیں۔ خدا کی قسم! میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا منحوس دن نہیں دیکھا جو حاضر ہیں، وہ غائب لوگوں تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ اگر کل کا دن بھی اسی طرح گزرا تو عربوں کی نسل نیست و نابود ہو جائے گی۔ عورتوں اور بچوں کے سر پر کوئی وارث نہ رہے گا"۔

معاویہ کے جاسوسوں نے اشعث کے اس بیان کو اس تک پہنچا دیا۔ معاویہ نے اس کے اس بیان کو اپنی جنگی سازش کی بنیاد اور نیرنگی فکر کا محور بنا لیا۔ اس نے اشعث کے بیان کی تائید کرتے ہوئے حکم دیا کہ آدھی رات کے وقت عراقیوں کے درمیان بلند آواز سے کہیں:

"اے عراقیو! اگر ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو قتل کرے گا تو ہماری عورتوں اور اولاد کا کون والی و وارث ہوگا۔ اب جو کچھ باقی رہ گیا ہے کم از کم اس کی حفاظت کی جائے"۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۸۰-۴۸۱)

بروز جمعہ (یوم الہریر) مالک اشترؓ کے حملے دشمن پر مسلسل جاری تھے، یہاں تک کہ ان کے سپاہی تھک گئے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی سپاہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میں تمھارے لیے خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس لیے کہ (اگر زندہ بچ گئے) تو باقی دنوں میں اپنے گلے کا دودھ دوہا کرو گے"۔ ②

---

① (وقعۂ صفین: ص ۴۷۶۔ فلم یبق منهم الا آخر نفس.... انا غار علیهم بالغداة احاکمهم الی اللہ عزوجل۔

② اعیذ کم باللہ ان ترضعوا الغنم سایر الیوم۔ یہ اس بات پر کنایہ ہے کہ اگر تمھیں فتح نصیب نہ ہوتو تمھاری حالت ان عورتوں جیسی ہو جائے گی کرتی

اس کے بعد انھوں نے اپنا گھوڑا طلب کیا اور پرچم کو "حیان بن ہوزہ" سے لے کر زمین میں گاڑ دیا اور بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سپاہ کے درمیان پہنچ گئے کہ:

"تم میں سے کون حاضر ہے کہ اپنی جان کا خدا سے معاملہ کرے اور اشتر کے شانہ بشانہ جنگ کرے تا کہ اسے فتح و نصرت نصیب ہو یا شہادت"۔

اس تقریر کے بعد بہت سے سپاہی ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے ہمراہ دشمن پر حملہ آور ہوئے یہاں تک کہ انھوں نے سپاہ کو دھکیل کر ان کی لشکرگاہ تک پہنچا دیا لیکن یہاں پہنچ کر انھیں دشمن کا سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ! اس مقابلے میں مالک اشترؒ کے پرچم دار بھی شہید ہو گئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ فتح و کامیابی مالک کے قدم چومنا چاہتی ہے تو آپؑ نے ان کی مدد کے لیے سپاہ کی ایک جماعت روانہ کی۔ مالک اشترؒ کی سرشکن ضربات اور دشمن کے ٹھکانہ پر مسلسل یورش سے یہ خوشخبری مل رہی تھی کہ فتح و نصرت جلد ہی نصیب ہونے والی ہے۔ شام کے ضعیف و عمر رسیدہ لوگوں کے لبوں پر یہ صدا بلند تھی:

اللہ اللہ فی الحرمات من النساء والبنات

"خدا کے لیے اپنی عورتوں اور بیٹیوں کا کچھ تو خیال و پاس کرو"۔

معاویہ نے اپنے لشکر کی جب یہ زبوں حالی دیکھی اور اپنی شکست کا یقین ہو گیا تو اس نے عمرو بن عاص سے کہا: ھلم مخبیاتك یا بن عاص فقد ھلكنا "ہم تو اب فنا ہوا چاہتے ہیں۔ کہاں ہے وہ تمھارا آخری حربہ"۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۹۰)

یہ سن کر عمرو بن عاص نے بآواز بلند کہا: اے لوگو! تم میں سے جس کے پاس بھی قرآن مجید ہے، اسے نیزے کی نوک پر بلند کر دے۔

پس! عمرو بن عاص کا یہ کہنا تھا کہ تقریباً پانچ سو قرآن نیزوں پر آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی چیخ و پکار بھی شروع ہو گئی کہ ہمارے اور تمھارے درمیان قرآن حاکم و ثالث ہے۔ اگر ہمیں قتل کر دو گے تو شام کی سرحدوں کی کون نگرانی و حفاظت کرے گا۔ ①

---

① مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۹۰۔ ایک قول کے مطابق لیلۃ الہریر میں ہی معاویہ کے جاسوسوں نے اشعث کی بات اس تک پہنچا دی تھی چنانچہ اس کے بعد ہی معاویہ نے اس بات کا فیصلہ کیا تھا کہ قرآن کو نیزوں پر چڑھا دیا جائے۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۸۱)

فوج عراق کا ردِّ عمل

عراق کے بعض سپاہیوں پر دشمن کے حیلہ و نیرنگ اور اس کے پُرفریب ہیجان انگیز نعروں کا جادو چل گیا (بالخصوص اشعث جیسے سرداروں پر چونکہ ان کے دل معاویہ کی طرف مائل تھے، اسی لیے ان کا شمار امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے منافقین میں ہوتا تھا)۔ چنانچہ! انھوں نے لوگوں کو مشتعل کرنا شروع کر دیا تاکہ وہ دشمن کے دامِ فریب میں آجائیں اور اسی لیے انھوں نے بآواز بلند یہ کہنا شروع کر دیا کہ تمھاری دعوت کتاب خدا ہم نے قبول کر لی ہے، آؤ ہم اسی طرف چلیں۔ ①

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اپنی سپاہ کے افکار روشن کرنے اور دشمن کے حیلہ و نیرنگ سے باخبر کرنے کی خاطر فرمایا:

> "اے خدا کے بندو! اسی طرف چلتے رہو اور دشمن سے جہاد کرتے ہوئے حقیقت و حقانیت کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دو۔ معاویہ، عمرو بن عاص اور ابن ابی معیط کو دین و قرآن سے کوئی سروکار نہیں ہے، مَیں ان لوگوں کو تم سے زیادہ جانتا ہوں ان کے بچپن سے سن رسیدہ ہونے تک میرا ان سے سابقہ رہا ہے۔ یہ اپنے وقت کے بدترین بچے اور بدترین مرد رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ قرآن کی عظمت سے واقف ہوتے اور اس کے احکام پر عمل کرتے تو ان کو نیزوں پر نہ چڑھاتے، وہ جو کچھ کر رہے ہیں سب نیرنگ و نفاق ہے"۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۱۶، مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۹۰)

اس سے قبل کہ یہ واقعہ رُونما ہوا، حضرت علی علیہ السلام نے اس خط میں جو معاویہ کو لکھا تھا، یہ پیشین گوئی کر دی تھی:

> "گویا مَیں دیکھ رہا ہوں کہ حوصلہ شکن ضربات، بے حد و اندازہ کشت و خون اور یقینی شکست و ریخت کے بعد تم اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کتاب اللہ کی جانب آنے کی دعوت دو گے۔ چنانچہ! جو لوگ اس دعوت کی دہائی دیں گے، وہ کافر ہوں گے یا منافق یا حق سے رُوگرداں"۔ (تاریخ طبری: ج ۵، ص ۴۸، مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۹۱، کامل: ج ۳، ص ۳۱۶)

---

① نجیب الی کتاب اللہ عزوجل نتنیب الیہ۔ (تاریخ طبری: ج ۵، ص ۴۸)

دشمن کی اس سازش کو ناکام کرنے اور سپاہ فریقین کے افکار بیدار کرنے کی خاطر حضرت علی علیہ السلام نے حضرت سعید کو قرآن دے کر شامیوں کی جانب روانہ کیا اور انھیں حاکمیت قرآن کی دعوت دی۔

فوج عراق کے درمیان اختلاف

حضرت علی علیہ السلام کی تقاریر و تنبیہات کا اثر چند ہی لوگوں پر ہوا۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے ضد اختیار کر لی تھی اور ان کا اس بات پر اصرار تھا کہ جنگ بند کر دی جائے۔ چنانچہ انھوں نے پکار پکار کر کہنا شروع کیا:

"اس جنگ نے ہمیں نگل لیا، اس میں ہمارے تمام مرد مارے گئے، ان کی دعوت کو قبول کر لو ورنہ سب مارے جاؤ گے"۔

جو لوگ اس حق میں تھے کہ جنگ جاری رہے، ان میں مالک اشترؒ پیش پیش تھے، ان لوگوں کی دلیل یہ تھی:

"معاویہ کے پاس اب اپنی فوجی طاقت کا دم خم نہیں جب کہ ہماری فوجی طاقت بہت زیادہ ہے اور پھر ہم میں حوصلہ مندی بھی ہے۔ اگر اس کے پاس تمہاری جیسی فوجی طاقت ہوتی تو وہ ہرگز جنگ سے رُوگرداں نہ ہوتا"۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۱۶، ص ۱۳۴)

جنگ کو جاری رکھنے کے حامیوں میں دوسرے شخص عدی بن حاتم تھے، انھوں نے کہا:

"ہر چند ہماری سپاہ کا کشت و خون ہوا ہے اور ان میں سے بہت سے مجروح ہوئے ہیں لیکن وہ حق کی پاسداری کر رہے ہیں اس لیے ہم اہل شام سے زیادہ ثابت قدم و پائیدار ہیں۔ اب وہ لوگ ناتواں ہو چکے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے اور ہم ان سے جنگ کریں"۔

انھی افراد میں "عمرو بن حمق" اپنی جگہ سے اُٹھے اور کہنے لگے:

"اے امیر المومنینؑ! ہم نے آپ کا ساتھ باطل کی خاطر نہیں دیا ہے بلکہ ہم راہِ خدا میں اور حق قائم کرنے کی غرض سے آپؑ کے دوش بدوش رہے ہیں۔

اب کام اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے اور ہم بھی آپؑ کے مطیع وفرمانبردار ہیں"۔(وقعۂ صفین: ص ۴۸۲-۴۸۳)

اس جماعت کے مقابل اشعث کھڑا تھا وہ کہنے لگا:

"اے امیرالمومنینؑ! ہم آپ کے آج بھی وہی جانثار دوست ہیں جو کل تھے لیکن کام کا انجام آغاز سے مختلف ہے۔ مجھ سے بڑھ کر کوئی اہلِ عراق کا دوست اور مجھ سے بدتر کوئی شامیوں کا دشمن نہیں لیکن انھوں نے جب کلام اللہ کی دعوت دی ہے تو قبول کر لیجیے کیوں کہ اس کے آپ ان سے کہیں زیادہ اہل ہیں۔لوگ اپنی زندگی و بقا کے متمنی ہیں، ہلاکت وتباہی انھیں پسند نہیں ہے"۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے اس خیال کے پیش نظر کہ لشکر کے درمیان ہم آہنگی برقرار رہے اور ان کے درمیان کوئی اختلاف واشتعال پیدا نہ ہو۔ پہلے تو خود سے ہی کہا کہ اس مسئلے کے بارے میں غور کیا جانا چاہیے۔(حوالہ سابق)

لیکن جیسے ہی ہر گوشہ وکنارے سے صلح کے بارے میں دبی دبی آوازیں آنے لگیں تو آپؑ نے فرمایا:

"خدا کے بندو! اس میں کوئی شک نہیں کہ کلام اللہ کی دعوت قبول کرنے کے لیے میں آپ سے زیادہ لائق و اہل ہوں مگر دین وقرآن کے معاملے میں معاویہ اور عمرو بن عاص کی بات الگ ہے...... ان کا قول اگرچہ کلمۂ حق ہے مگر اس کے پسِ پردہ جو ارادہ کارفرما ہے، وہ باطل ہے۔قرآن کو نیزے پر چڑھانا معرفت اور ایفائے عہد کی بنیاد پر نہیں بلکہ یہ ایک حیلہ ونیرنگ اور بہانہ ہے۔تم صرف ایک گھنٹے کے لیے اپنے دست و بازو اور سر میرے حوالے کر دو تو جلد ہی یہ دیکھو گے کہ حق اپنے آشکارا نتیجے پر پہنچ چکا ہے اور ستم گروں کی بیخ کنی ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں ہے"۔

لیکن اشعث نے جب یہ دیکھا کہ اس کی بات کو نظرانداز کیا جارہا ہے یا اس پر عمل ہونا مشکل ومحال نظر آتا ہے تو یہ بات اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔اس لیے وہ فوج کی جانب

روانہ ہوا تاکہ اپنے اس نظریے کا ان کے درمیان پرچار کر سکے۔ چنانچہ اس نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا کہ جنگ بندی کر دی جائے اور یہ بات اس نے ان حساس لمحات میں کہی جب کہ جنگ کی چکی مالک اشتر کے ہاتھ میں گھوم رہی تھی اور دشمن گیہوں کے دانوں کے مانند ان کی سرشکن ضربات کے باعث پس رہے تھے۔ وہ میدانِ کارزار میں حق کو روشن اور فتح و نصرت کو آشکارا کرنا چاہتے تھے، دشمن کے محاذ کو زیر و زبر کرنے میں اب چند قدم کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔

شامیوں کی زندگی اب معاویہ اور عمرو بن عاص کے باریک تارِ اُمید سے وابستہ تھی۔ وہ سراسیمہ و پریشان معاویہ کے سر پر کھڑے چلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

> "اہلِ عراق ہماری دعوت قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اپنی اس تجویز کو ان کے سامنے دوبارہ رکھیے، تم نے یہ دعوت دے کر دشمن کو جرأت مند و گستاخ کر دیا ہے اور لالچ و حرص نے تم کو گھیر لیا ہے"۔ (حوالہ سابق)

دوسری طرف اشعث کی کوشش سے تقریباً دو ہزار آہن پوش افراد سلاح بدست اور شمشیر بدوش ان قاریانِ قرآن کی جماعت کے ہمراہ جن کو بعد میں جزو خوارج کہا گیا، مسعر بن فدکی اور زید بن حصین کی قیادت میں حضرت علی علیہ السلام پر حملہ آور ہوئے۔ انھوں نے پہلی بار حضرت علی علیہ السلام کو امیر المومنین خطاب کرنے کے بجائے یہ کہا:

> "اے علیؑ! انھوں نے کلام اللہ کی دعوت دی ہے تم اسے قبول کر لو ورنہ ہم تمھیں بھی عثمان کی طرح قتل کر دیں گے اور ہم خدا کو شاہد کر کے کہتے ہیں کہ ہم یہ کام کر گزریں گے"۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

> "افسوس تمھاری حالت پر! میں وہ پہلا شخص ہوں، جس نے قرآن کی دعوت دی اور مَیں ہی وہ پہلا فرد ہوں، جس نے اس کی دعوت کو قبول کیا۔ میرے لیے یہ کسی طرح بھی شائستہ و سزاوار نہیں کہ حکمیتِ قرآن کی دعوت دی جائے اور مَیں اسے قبول نہ کروں۔ مَیں ان سے اس لیے جنگ کر رہا ہوں کہ وہ حکمِ قرآن کے آگے اپنی گردنیں خم کر دیں کیوں کہ انھوں نے حکمِ خداوندی سے رُوگردانی کی ہے اور اس کے احکام سے عہد شکنی کر کے اس کی کتاب سے

منحرف ہو گئے ہیں۔ میں بار بار تمھارے سامنے یہ اعلان کر چکا ہوں کہ ان کا ہرگز یہ ارادہ نہیں ہے کہ احکامِ الٰہی پر عمل پیرا ہوں بلکہ اپنے اس اقدام سے وہ تمھیں فریب دے رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا اور وہ بات جو تم کہہ رہے ہو، اس پر غور کرو اگر میری اطاعت مقصود ہے تو جنگ کرو اور اگر میرے حکم کی خلاف ورزی منظور ہے تو تمھیں اختیار ہے جو چاہو کرو"۔ [1]

انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کے بیان کی پروا کیے بغیر کہا: اشتر کو حکم دیجیے کہ وہ جنگ سے دست بردار ہو کر واپس آ جائیں۔ (ملاحظہ ہو، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۱۶-۳۱۷، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۴۹، وقعۂ صفین: ص ۴۸۹-۴۹۰)

مالک اشترؓ کا واپس آنا

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ناگزیر یزید بن ہانی کے ذریعے مالک اشترؓ کو پیغام بھجوایا کہ واپس آ جائیں۔ مالک اشترؓ اس وقت دشمن کی استقامت و پائیداری کو کاری ضرب لگا چکے تھے اور فتح و نصرت ان کے قدم چوم لینا چاہتی تھی۔

انھوں نے جواب دیا: یہ وقت مجھے اپنے موقف سے ہٹانے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ مجھے خداوند تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ فتح و کامیابی حاصل ہوگی۔ میرے بارے میں آپ جلدی نہ کیجیے۔

انھوں نے مالک اشترؓ کا پیغام حضرت علی علیہ السلام کو پہنچا دیا۔ اسی اثناء میں میدانِ کارزار میں گرد و غبار بلند ہوا اور نبرد آزما سپاہ کی پُر جوش و خروش صدائیں سنائی دیں۔ اب مالک اشتر کی فتح و نصرت اور شامیوں کی شکست فاش نمایاں ہو چکی تھی۔ لیکن فتح و نصرت کی ان علامتوں سے کوئی بھی علامت ان سرکشوں کو جنھوں نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا، ضد سے نہ روک سکی۔ وہ غضب ناک ہو کر چیخے اور کہنے لگے کہ یقیناً آپؑ نے مالک اشترؓ کو یہ حکم دیا ہے کہ آتشِ جنگ کو مزید برافروختہ کریں۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: افسوس ہے تمھارے اُوپر! کیا میں نے تمھارے سامنے

---

[1] فان تطیعونی فقاتلوا وان تعصونی فاصنعوا ما بدالکم

قاصد مالک کے پاس روانہ نہیں کیا؟ جو بات میں نے روشن و آشکارا کہی تھی، کیا وہ تمھارے کانوں تک نہیں پہنچی؟

انھوں نے کہا: دوبارہ یہ پیغام بھجوایئے کہ وہ واپس آجائیں اور اگر آپؑ نے ایسا نہ کیا تو ہم آپؑ سے قطع تعلق کرلیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے دوبارہ یہ پیغام بھیجا کہ یہاں فتنہ بپا ہے تم واپس آجاؤ۔ مالک اشترؓ نے قاصد سے پوچھا: کیا یہ شور وغوغا قرآن کو نیزوں پر بلند کرنے کے باعث بپا ہوا ہے۔ قاصد نے جواب دیا: جی ہاں! اس کی وجہ یہی ہے۔ اس پر مالک اشترؓ نے کہا: خدا کی قسم! جس وقت قرآن کو نیزوں پر لایا گیا تھا، مجھے اس وقت یہ گمان ہوا تھا کہ اختلاف وتفرقہ پیدا ہوگا۔ یہ طرح ریزی ونقشہ کشی اس غیر معمولی ذہین آدمی کی پیداوار ہے، جس کا نام عمرو بن عاص ہے۔ اس کے بعد انھوں نے یزید بن ہانی سے کہا: کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں فتح وکامیابی عطا فرمائی ہے۔ کیا اس وقت یہ مناسب ہے کہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے دوں اور واپس چلا جاؤں؟"

یزید بن ہانی نے کہا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس محاذِ جنگ پر تو آپ کامیاب ہوجائیں اور اُدھر آپ امیر المومنینؑ کو دشمن کے حوالے کردیں؟

انھوں نے جواب دیا: سبحان اللہ! آپ نے یہ کیا بات کہی۔ خدا کی قسم! میں ایسا ہرگز نہ چاہوں گا۔ یہ کہہ کر وہ میدانِ کارزار سے واپس آگئے۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۹۰-۴۹۱، کامل: ج ۳، ص ۳۱۷، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۴۹)

سرکشوں کی سرزنش

مالک اشترؓ جب میدانِ کارزار سے واپس آگئے تو وہ ان لوگوں پر غضب ناک ہوئے جنھوں نے حضرت علی علیہ السلام کو گھیر رکھا تھا اور کہا:

"اے ذلت قبول کرنے والو! تمھیں غالب وفاتح دیکھ کر دشمن نے حکمیتِ قرآن کی دعوت دی ہے، کیا دعوت دینے کے لیے یہی وقت رہ گیا تھا۔ خدا کی قسم! انھوں نے احکامِ الٰہی وقرآن اور سنت کو پامال کیا ہے، اس لیے

تم ان کی دعوت قبول نہ کرو۔ مجھے اتنی مہلت دے دو کہ میں یہاں سے جاؤں
اور واپس چلا آؤں۔ میں فتح و کامیابی کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں"۔

انھوں نے کہا: ایسا نہیں ہو سکتا۔

مالک اشترؓ نے کہا: کم از کم مجھے اتنا ہی وقت دے دیا جائے، جتنی دیر گھوڑے کو دوڑانے میں لگتی ہے۔ انھوں نے جواب دیا: ایسے وقت میں ہم تمھارے ساتھ گناہ میں شریک ہوں گے۔

اس پر مالک نے کہا: تم وہ لوگ ہو جنھوں نے اپنے برگزیدہ لوگوں کو قتل کرا دیا اور جو پست فطرت تھے، وہ زندہ ہیں۔ ایسی حالت میں تم خود کو کس طرح حق پر سمجھ سکتے ہو؟ کیا اس وقت جب تم شامیوں کو قتل کر رہے تھے یا اس وقت جب کہ تم کشت و کشتار سے دستبردار ہو گئے ہو؟ دوسری صورت میں تمھیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ تمھارے وہ عزیز جو قتل ہوئے تم سے بہتر و افضل تھے، اور تم ان کی فضیلت سے انکار نہیں کر سکتے۔

وہ لوگ جو مالک کی منطق و دلیل کا جواب نہ دے سکے۔ انھوں نے کہا: اب آپ ہم سے حجت و بحث نہ کیجیے کیوں کہ ہم نے راہِ خدا میں ہی جنگ کی تھی اور راہِ خدا ہی میں اس جنگ سے دست کش ہو رہے ہیں، آپ کی اطاعت ہرگز نہیں کریں گے۔ بہتر ہے کہ آپ اپنی راہ لیں......۔

مالک اشترؓ نے چاہا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اس جنگ کو جو شامیوں سے ہو رہی تھی سرکشوں پر مسلط کر دیں لیکن انھوں نے چلانا شروع کر دیا تو امیر المومنینؑ نے حکمیت کو تسلیم کر لیا ہے کہ قرآن کے حکم پر وہ راضی ہیں اور اس کے علاوہ ان کے لیے کوئی چارہ نہیں۔

اس پر مالک اشترؓ نے کہا کہ اگر امیر المومنین علی علیہ السلام نے حکمیت کو قبول کر لیا ہے تو میں بھی اس پر راضی ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ سرکش لوگ آپؑ کی موجودگی ہی میں دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں تو آپؑ نے کوئی بات کہے بغیر نظریں زمین پر جھکا لیں۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۹۱ - ۴۹۲، کامل: ج ۳، ص ۳۱۷ - ۳۱۸، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۵۰)

لیکن جب سب خاموش ہو گئے تو آپؑ اپنی جگہ سے اُٹھے اور فرمایا:

"تم جب تک مجھ سے متفق و ہم خیال تھے، جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ جنگ نے تمھیں ناتواں کر دیا۔ خدا کی قسم! جنگ کی ناتوانی نے تمھیں پکڑ لیا ہے اور تمھیں تمھارے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ تمھیں یہ جان لینا چاہیے کہ کل

تک مَیں امیرالمومنین تھا مگر آج مَیں حکم بنانے کے لیے مامور ہوں، کل تک مجھے اختیار تھا اور تمھیں حکم دے سکتا تھا مگر آج مَیں اس حکم سے محروم ہوں۔ آج میرے حکم کو ٹھکرایا جا رہا ہے، اس لیے مَیں تمھیں تمھاری مرضی کے خلاف مجبور نہیں کر سکتا"۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۸۴)

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام ان سے خطاب کرنے کے بعد تشریف فرما ہوئے۔ قبائل کے سرداروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سے بعض جنگ کے حامی وطرف دار اور بعض صلح کے متمنی وخواہش مند تھے۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۸۴-۴۸۵)

نفاق وحماقت کے خلاف جنگ وجدال

اگرچہ سپاہِ شام کی طرف سے یہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ "ہم نے قرآن کے سامنے اپنے سرخم کر دیے ہیں اور تم بھی قرآن کی حکمیت کو تسلیم کر لو"۔

مگر عملی طور پر وہ لوگ درحقیقت قرآن کے حکم سے رُوگرداں تھے۔ کیا اب تک امیرالمومنین علی علیہ السلام نے قرآن کے احکام کو تسلیم نہیں کیا تھا، اور کیا آپؑ کا عمل قرآن کے حکم کی بنیاد پر نہ تھا؟ یا جیسے ہی سپاہِ شام کے سرداروں نے قرآن کو نیزوں پر چڑھایا اور ظاہرداری سے کام لیا تو قرآن کا حکم بھی بدل گیا اور یہیں سے علی علیہ السلام کا راستہ قرآن سے علیحدہ ہو گیا؟ شامیوں نے درحقیقت اپنے اس عمل سے حق وعدالت کو نفاق کے پیروں تلے روند ڈالا۔

انھی لوگوں میں کچھ تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جنھوں نے اپنے ہادی وپیشوا کو نہ پہچانا۔ انھوں نے اپنی حماقت ونادانی سے اپنی خواہشات ہی نہیں بلکہ دشمن کی خواہشات کو امیرالمومنینؑ پر مسلط کر کے ظلم ونفاق کی بنیادوں کو مضبوط کر دیا۔ جب کچھ کوتاہ فکر اور کج اندیش لوگ ان سے آ کر مل گئے تو نفاق کی گرم بازاری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ ان حالات میں نفاق سے ٹکر لینا گویا اس وقت ایسا اقدام کرنا حماقت ونادانی سے پنجہ زنی کرنا تھا۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام ایسی حساس صورتِ حال کے رُوبرو تھے جس میں ایک طرف منافق ومفاد پرست لوگ قرآن کو نیزوں پر بلند کیے ہوئے تھے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بظاہر محاذِ حق پر جنگ وجدال کر رہے تھے مگر اس کے ساتھ ہی امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام پر تلوار کھینچ

کھڑے تھے کہ حکمِ قرآن کو تسلیم کیجیے اور وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ اس بارے میں قرآن کا صریح ارشاد ہے کہ:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ

(سورۂ حجرات: آیت ۹)

"اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے"۔

باغی و سرکش جانتے تھے کہ مسلمانوں کے قانونی و شرعی زمام دار امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہیں اور معاویہ آپؑ سے برگشتہ ہے۔ اسے چاہیے کہ سرکشی سے دستبردار ہو جائے، حق کے سامنے سر خم کر دے، اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو حکمِ قرآن کے مطابق جنگ و جدال کریں۔

سرکشوں نے حیلہ و نیرنگ پر کاربند رہ کر قرآن کو تو نیزوں پر چڑھا دیا مگر ان سے یہ نہیں کیا گیا کہ ہم امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ بلکہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ انھیں کوئی ایسا موقع مل جائے جس کے ذریعے وہ اپنی یورش و سرکشی کو جاری رکھ سکیں مگر سپاہِ عراق میں سے کچھ ظاہر بیں اور کج اندیش افراد ان کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ گئے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ رنج و افسوس کے علاوہ انھیں کچھ نہ ملا۔

حکمیت کی دعوت

معاویہ نے فوجِ عراق کے درمیان اختلاف پیدا کرنے اور مسئلہ حکمیت کی پیش کش کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں خط لکھا:

"ہمارا اختلاف کافی طویل ہو گیا ہے اور دونوں طرف سے بہت زیادہ خون بہایا جا چکا ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں حالت پہلے سے زیادہ بدتر نہ ہو جائے اور اس کی ذمہ داری ہم دونوں پر ہوگی۔ کیا آپؑ اس بات سے متفق ہیں کہ لوگوں

کی کشت و کشتار کو روکا جائے اور دینی اخوت و محبت برقرار ہو جائے؟ اس کی راہ یہی ہے کہ آپ اور میرے ہواخواہوں سے دو معتبر حکم (ثالث) انتخاب کیے جائیں اور وہ کلام اللہ کی اساس و بنیاد پر فیصلہ کریں، کیوں کہ ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ خوفِ خدا کو دل میں رکھیں اور اگر اہلِ قرآن ہیں تو اس حکم کا پاس کریں"۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۹۳)

معاویہ ایسا نافہم تو نہیں تھا کہ اسے یہ معلوم نہ ہوتا کہ حضرت علی علیہ السلام اس ظاہر سازی کا فریب نہ کھائیں گے۔ اس نے اتنا تو یقیناً سوچ ہی رکھا تھا کہ اس خط کا مضمون سپاہِ عراق کے بعض کج اندیش اور منافق افراد کے کانوں تک ضرور پہنچے گا اور وہ اس سے متاثر بھی ہوں گے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے مدلل بیان سے صریح الفاظ میں واضح و قطعی جواب دیتے ہوئے اسے لکھا:

"معاویہ تم مجھے حکمیتِ قرآن کی دعوت دے رہے ہو جب کہ تم اس سے کہیں دور ہو اور تم اس کتابِ مقدس کو اپنا حکم بنانا نہیں چاہتے ہو۔ ہم نے دعوتِ قرآن کو حکمیت کی بنیاد پر قبول کیا ہے نہ کہ تمھاری تجویز پر۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۹۳، نہج البلاغہ، مکتوب ۴۸)

معاویہ کی جانب

اشعث جو مخالفین اور صلح پسندوں کا سردار بنا ہوا تھا معاویہ کے خط کی تشہیر کرنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

"میں دیکھ رہا ہوں کہ لوگ شامیوں کی دعوتِ حکمیت سے خوش و خرم ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں معاویہ کے پاس جاؤں اور اس سے پوچھوں کہ کیا چاہتے ہو؟" (وقعۂ صفین: ص ۴۹۸-۴۹۹)

کیا اشعث واقعی یہ نہیں جانتا تھا کہ معاویہ کیا چاہتا ہے؟ آخر وہ کون سا مقصد تھا جس کی خاطر وہ معاویہ کے پاس جانے کی کوشش کر رہا تھا؟ اسے تمام باتوں کا علم تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اب فیصلہ کرنے کا اختیار کس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ حضرت علی علیہ السلام کے ان الفاظ کو نہیں بھولا تھا

جو آپؑ نے چند لمحہ قبل فرمائے تھے کہ "میں کبھی امیر تھا مگر اب تابع و مامور ہوں"۔

لیکن اس کے باوجود اس نے حضرت علی علیہ السلام سے اجازت مانگی تا کہ وفد کے اراکین کے درمیان اس کی حیثیت مامور کی رہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے بے اعتنائی سے جواب دیا کہ اگر چاہو تو معاویہ کے پاس جا سکتے ہو۔(وقعۂ صفین: ص ۴۹۹)

اشعث تو اس موقع کی تلاش میں تھا ہی اور خود کو اس نے وفد کا رہبر فرض کر لیا تھا۔ وہ ظاہراً حضرت علی علیہ السلام کے نمایندے کی حیثیت سے معاویہ کے پاس گیا اور اس کے سامنے چند سوال پیش کیے۔ معاویہ نے اس کے وہی جوابات دیے جو وہ خط میں حضرت علی علیہ السلام کو لکھ چکا تھا۔

اس پر اشعث نے کہا: یہ سب مبنی برحق ہے۔ اس کے بعد وہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس واپس آ گیا۔

جب یہ خبر پھیل گئی کہ اشعث کو وفد کا سربراہ بنایا گیا ہے تو لوگوں نے بآواز بلند کہنا شروع کیا کہ "ہم اس حکم پر راضی ہیں اور ہمیں یہ منظور ہے"۔

اس کے بعد شام و عراق کے لشکروں کے قاری یک جا جمع ہوئے اور انھوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ حکمِ قرآن کو بحال کیا جائے۔(وقعۂ صفین: ص ۴۹۹)

حکمین (ثالثوں) کا انتخاب

یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ معاویہ کا حکم عمرو بن عاص ہوگا اور شام کے لوگوں کو بھی اس کے انتخاب کیے جانے پر اتفاق ہوگا۔ چنانچہ معاویہ نے بغیر کسی مشورے کے حکم مقرر کر دیا اور اپنی سپاہ کو اپنے اس انتخاب کے ذریعے مطمئن کر دیا۔

عراق کے لوگ اپنے ہادی و پیشوا کی حکم عدولی کے باعث اگرچہ تباہی اور ہلاکت کے دہانے تک پہنچ چکے تھے مگر اس کے باوجود انھوں نے حکم کے انتخاب کے حق سے بھی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو محروم کر دیا۔ اشعث نے ان قاریانِ قرآن کے ہمراہ (جو بعد میں خوارج شمار کیے گئے) بلند آواز سے کہنا شروع کیا کہ "ہم ابوموسیٰ اشعری کو منتخب کرتے ہیں"۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اس پر اتفاق نہیں کیوں کہ میں اسے اس کا اہل

نہیں سمجھتا۔ اشعث، زید بن حصین اور مسعر بن فدکی نے قاریانِ قرآن کے ساتھ یک زبان ہو کر کہا کہ ہمارا انھی پر اتفاق ہے کیوں کہ انھوں نے ہی ہمیں اس جنگ کی مصیبت سے محفوظ رکھا۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے یہ انتخاب منظور نہیں کیوں کہ انھوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ لوگوں کو میری مدد کرنے سے منع کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہ فرار کر گئے۔ چنانچہ اکئی ماہ گزر جانے کے بعد میں نے انھیں امان و پناہ دی۔ اس کام کے لیے میں عباس کو اہل و شائستہ سمجھتا ہوں۔ لیکن وہ لوگ حسب سابق اپنی ضد پر اڑے رہے اور کہنے لگے کہ ہمارے لیے آپؑ کے ہونے یا عباسؓ کے ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ حکم ایسے شخص کو بنایا جائے جو آپ کی اور معاویہ کی طرف سے بے لاگ ہو اور اس کی نظر میں دونوں افراد یکساں ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں پھر مالک اشترؓ کو مقرر کرتا ہوں۔

اس پر اشعث نے بلند آواز سے کہا: کیا اشترؓ کے علاوہ کوئی اور شخص تھا جس نے ساری زمین میں آگ لگائی؟ اگر ہم ان کا نام منظور کر لیتے ہیں تو ہمیں ان کا پابند رہنا ہوگا۔

حضرت علی علیہ السلام کو ان کی ضد اور خودسری پر طیش آ گیا اور فرمایا کہ ابوموسیٰ کے علاوہ کسی اور کو اپنا حکم تسلیم نہیں کرو گے؟

انھوں نے کہا: نہیں۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جو چاہو وہ کرو۔ (وقعۂ صفین: ص ۴۹۹-۵۰۰، کامل ابن اثیر: ص ۳۱۸-۳۱۹)

خوارج کی نامزدگی

ان سرکشوں اور باغیوں کی حماقتیں اور کوتاہیاں (جو بعد میں خوارج کے نام سے مشہور ہوئے) ایک دو نہیں تھیں۔ ان سے جو لغزشیں اور خطائیں سرزد ہوئیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انھوں نے حاکم کا انتخاب صحیح نہیں کیا، اگرچہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ انھوں نے غیر جانب دار شخص کو منتخب کرنے کی کوشش کی ہے، مگر جس شخص کو انھوں نے اس کام کے لیے نامزد کیا اس کی عداوت و دشمنی حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ دوسروں سے کہیں زیادہ تھی، لیکن اس کے برعکس معاویہ کو اس شخص

کے انتخاب کا حق دیا گیا جو اس سے کہیں زیادہ مال وجاہ کا حریص اور اس کا فرماں بردار تھا۔

ابوموسیٰ وہ شخص تھا جس نے اس وقت جب کہ کوفہ کی فرمانروائی اس کے ہاتھ میں تھی اپنے پیشوا کے حکم سے سرتابی کی تھی اور جنگ جمل کے موقع پر لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام کی مدد سے منع کیا تھا۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ حضرت علی علیہ السلام نے انھیں ایک خط میں لکھا تھا کہ تمھاری طرف سے جو بات مجھ تک پہنچی ہے اس میں تمھارا نفع بھی ہے اور نقصان بھی۔ جیسے ہی میرا پیغام رساں تمھارے پاس پہنچے تم اپنی کمر کس لینا اور اس پر مضبوطی سے پٹکا باندھ لینا، اور اپنی کمین گاہ سے نکل کر باہر آ جانا، جو افراد تمھارے ساتھ ہیں انھیں بھی باخبر کر دینا۔ اگر میرے حکم پر عمل کرنا مقصود ہو تو قدم آگے بڑھانا، اگر خوف غالب ہو اور سستی تمھارے وجود سے عیاں ہو تو کہیں اور نکل جانا۔ خدا کی قسم! تمھاری گیلی اور سوکھی ہر لکڑی کو جلا کر خاک کر دوں گا اور اتنا موقع نہیں دوں گا کہ تم بیٹھ کر دم لے سکو، تمھیں پیٹھ پیچھے جس چیز کا ڈر ہے اسے بھی تم اپنے سامنے پاؤ گے"۔ (نہج البلاغہ: مکتوب ۶۳)

لیکن اس سرکش کارندے نے نہ صرف کمر ہی نہ کسی اور حضرت علی علیہ السلام کی دعوت کا مثبت جواب نہ دیا بلکہ حضرت علی علیہ السلام کا وہ وفد جو حضرت امام حسن علیہ السلام کی سرکردگی میں گیا تھا اس کی بھی مخالفت کی، اور جو لوگ اپنا فرض ادا کرنے کی غرض سے ابوموسیٰ کے پاس آئے تھے تاکہ اپنا فریضہ معلوم کریں تو اس نے کہا تھا کہ "اگر آخرت کی فکر ہے تو اپنے گھروں میں جا کر بیٹھو۔ عثمان کی بیعت ابھی ہماری گردنوں پر ہے۔ اگر جنگ کرنا ہی مقصود ہے تو پہلے عثمان کے قاتلوں سے جنگ کرو"۔ (الامامہ والسیاسہ: ج۱، ص ۶۱)

اسی طرح جنگ جمل میں حضرت علی علیہ السلام کے اقدام کو ایک قسم کا فتنہ بتایا تھا اور رسولؐ خدا سے یہ حدیث نقل کی تھی کہ "جس وقت فتنہ بپا ہو تو بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ لیٹ جاؤ، اگر کھڑے ہو تو بہتر ہے کہ بیٹھ جاؤ اور اگر چل رہے ہو تو اس سے اچھا ہے کہ اپنی جگہ کھڑے رہو"۔

یہ کہہ کر وہ لوگوں کو اس بات کی جانب ترغیب دلا رہا تھا کہ اپنی تلواروں کو میان میں رکھ دو اور نیزوں کو توڑ ڈالو تاکہ اس فتنے کے شرارے ان کے دامن کو نہ پکڑ لیں"۔ (الامامہ والسیاسہ: ج۱، ص ۶۱)

کیا ایسا شخص جو اس طرز فکر کا حامل ہو اور جس کا حضرت علی علیہ السلام کے خلاف اس طرح کا موقف رہا ہو، کیا وہ اس لائق ہو سکتا تھا کہ اسے حضرت علیؑ کے نمایندے کی حیثیت منتخب کیا جائے؟

اسی لیے حضرت علی علیہ السلام ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ وہ لوگ جو توہمات میں غرق ہیں ان پر صحیح افکار کو روشن اور حقیقت کو واضح کر دیا جائے۔ اسی لیے آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ ابوموسیٰ کا تعلق خوارج کے گروہ سے ہے، حکمیت کے واسطے ان کے منتخب کیے جانے کے مسئلے کو مزید وسیع پیمانے پر پیش کریں، اور سب کے سامنے وہ دلائل پیش کر دیں جن کی بنا پر وہ حکمیت کے لیے ان کا نام منظور کرنا نہیں چاہتے ہیں، چنانچہ انھوں نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور فرمایا:

"جان لو کہ شامیوں نے اس شخص کا انتخاب کیا ہے جو قضیے میں ان سب سے زیادہ نزدیک ہے، لیکن تم نے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو اس قضیے میں تمھاری نفرت کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔ کیا تم بھول گئے ہو کہ یہ ابوموسیٰ ہی تھا جو یہ کہا کرتا تھا کہ جنگ جمل محض ایک فتنہ ہے۔ اس مقصد کے لیے تم اپنی کمانوں کے چلّے میں تیر نہ چڑھاؤ اور اپنی تلواروں کو میان میں رکھ لو۔ اگر اس کی یہ بات صحیح تھی تو وہ کیوں بحالت مجبوری جنگ صفین میں شریک ہوا۔ اگر یہ صورتِ حال نہیں ہے تو اس پر دروغ گوئی کا الزام عائد کیا جانا چاہیے۔ عمرو بن عاص کے اندرونی ارادے کو عبداللہؓ بن عباس کے ذریعے خاک میں ملا دو۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اسلام کے اطراف میں جو سرحدیں ہیں ان کی حفاظت کرو، کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمھارے شہروں پر حملے کیے جا رہے ہیں اور تمھیں تیروں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے"۔ (نہج البلاغہ: مکتوب ۲۳۶ سے ماخوذ)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام چاہتے تھے کہ عباس کو حکم مقرر کر کے جنگ بندی کے ان تلخ و ناگوار اثرات کو کم کر دیں جنھوں نے ان لوگوں کے دل و دماغ پر غفلت کا پردہ ڈال دیا تھا، کیوں کہ عباس دوسروں کی بہ نسبت عمرو بن عاص کی نیرنگیوں اور دیگر کمزوریوں سے زیادہ واقف و باخبر تھے۔ اس کے علاوہ مذاکرہ میں بھی وہ اس سے زیادہ محکم و قوی تھے۔ (1)

---

(1) حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبے میں بھی اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ عباس کو منتخب کرنے میں کیا مصلحت تھی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: وقعۂ صفین: ص ۵۰۰۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کی بات کسی کے کان تک نہیں پہنچی اور کسی کے دل و دماغ پر اس کا اثر نہ ہوا۔ اشعث تو حضرت علی علیہ السلام کی بات سن کر ہی برافروختہ ہو گیا بالخصوص اس وقت جب کہ اس نے یہ دیکھا کہ جس شخص کو مذاکرے کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے وہ قریش میں سے ہے، اور اشعث یہ سمجھتا تھا کہ ان کا حکم مقرر نہ کیا جانا قبیلہ یمن کی مذمت کیے جانے کی صحیح و روشن دلیل ہے، اور اسی بنا پر وہ کہہ رہا تھا کہ عبداللہؓ بن عباس میں حکم ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔

چنانچہ! انھوں نے ناراض ہو کر باآواز بلند کہا: خدا کی قسم! قیامت تک قبیلۂ معنر کے افراد بیک وقت حکم نہیں بنائے جا سکتے۔ [1] معاویہ نے چونکہ حکم کے لیے قبیلۂ معنر کے شخص کا انتخاب کیا ہے اس لیے آپ ایسے شخص کا انتخاب کریں جو قبیلہ یمن کے لوگوں میں سے ہو۔

اس پر آپؑ نے فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمھارا یمنی دھوکا نہ کھا جائے۔

اشعث نے کہا: اگر وہ دھوکا کھا گیا اور وہ بات جو ہمارے لیے پسندیدہ نہیں اس نے اسی کو فیصلے میں تسلیم کر لیا تو اس سے بہتر ہے کہ دونوں ہی افراد قبیلۂ معنر سے ہوں تاکہ ہماری مرضی کے مطابق حکم کے فرائض انجام دے سکیں۔

اس طرح اشعث نے اپنے باطنی نفاق کو آشکار کر دیا۔ وہ اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے چاہتا تھا کہ حکم کسی ایسے شخص کو بنایا جائے جو انھی کے قبیلے کا ہو، لیکن اس نظریے کے پس پشت ان یمنیوں کا قبائلی تعصب کارفرما تھا جو سپاہ عراق و شام میں بہ کثرت شامل تھے۔ ایسی صورت میں اگر دو حکم میں سے ایک اسی قبیلے کا ہو تو وہ کیوں نہ خلافت پر نظر رکھیں۔ ابوموسیٰ کے موقف سے اشعث بخوبی واقف تھا اور یہ جانتا تھا کہ وہ معاویہ کی طرف داری نہیں کرے گا، جس کی وجہ یہ تھی کہ ابوموسیٰ اسے بھی فتنہ سمجھتا تھا۔ اس کے برعکس دوسری طرف ان کے ماضی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا تھا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کا بھی جانب دار نہ ہوگا۔ چنانچہ! اسی وجہ سے اسے بہترین طاقت سمجھا گیا تھا۔

---

[1] ربیعہ اور معنر کا شمار عرب کے دو بڑے قبیلوں میں ہوتا تھا۔ یہ دونوں قبیلے نزار ابن معد بن عدنان کے فرزندان، ربیعہ اور معنر کی نسلوں سے تھے۔ قبیلہ ربیعہ کے بیشتر لوگ یمن میں اور معنر کے اکثر افراد حجاز میں آباد تھے۔ یہ دونوں قبیلے اپنے قبائلی مسائل کی بنا پر ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے۔

اشعث کتنا اقتدار پسند اور جاہ طلب تھا۔ اس کی شاہد ذیل کی داستان ہے:

"طائفہ بنی ولیعہ ان طائفوں میں سے تھا جو پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد مرتد ہوگئے تھے۔ جس وقت زیاد ابن لبید انصاری نے ان سے جنگ کی اور انھیں اپنی تلوار کا مزہ چکھایا تو وہ اشعث کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے طائفہ کندہ کے سردار کے پاس گئے۔ اس نے اس موقع کو سلطنت حاصل کرنے کا بہانہ سمجھا اور ان سے کہا کہ اگر تم مجھے اپنا بادشاہ تسلیم کرلو تو میں تمھاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے اس کی اس شرط کو مان لیا۔ چنانچہ وہ بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہوگیا اور قحطان خاندان کے بادشاہوں کی طرح رسم تاج پوشی ادا کی گئی"۔ [①] اس کے بعد ان کی قیادت کرتے ہوئے وہ مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار ہوا، لیکن ابن زیاد کے لشکر نے جیسے ہی دباؤ ڈالا اور اس قلعے کا جس میں اس نے پناہ لی تھی محاصرہ کیا تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی زندگی کو خیانت کے ذریعے خرید لیں اور اپنے ساتھیوں سے دُور ہوکر اس نے اپنے نیز اپنے دس قرابت داروں کے لیے پناہ مانگی۔ اس کے بعد اس نے قلعے کا دروازہ کھول دیا اور باقی لشکر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا"۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۲۹۳، ۲۹۵)

ان خیانت کاریوں کی وجہ سے اسے مسلمانوں اور کفار کے درمیان ہمیشہ لعن طعن اور نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، بالخصوص کندہ طائفے کی عورتیں اس بزدلی اور خیانت کاری کی وجہ سے جو اس سے سرزد ہوئی تھی اور جس کے باعث اس طائفہ کے ایک گروہ کو سخت نقصان پہنچا تھا، سخت لعنت و ملامت کیا کرتی تھیں، اور عام طور پر "عرف النار" (آگ لگانے والا جاسوس) کہا کرتی تھیں اور اس اصطلاح کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا تھا جس کی سرشت میں مکر، فریب اور دغا بازی شامل ہو۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۱، ص ۲۹۶، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۳۳۸)

ابو موسیٰ بھی جس کا نام اشعث نے حکمیت کے لیے پیش کیا تھا، کسی طرح بھی اشعث سے کم

---

① لا انصر کم حتی تملکونی فملکوہ وتوجوہ کما یتوج الملک من قحطان۔

نہ تھا۔ جس وقت جنگ جاری تھی اس نے جانبین کی طرف سے کنارہ کشی اختیار کر کے شام میں اس مقام پر جو "عرض" کے نام سے مشہور تھا گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، لیکن جیسے ہی اس کے غلام نے یہ اطلاع دی کہ لوگ جنگ سے دست کش ہو گئے ہیں اور تمھارا نام حکم کی حیثیت سے لیا جا رہا ہے تو صفین کی جانب روانہ ہوا اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے لشکر تک پہنچ گیا۔

مالک اشترؓ اور احنفؓ ابن قیس جیسے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابوموسیٰ کے اوصاف و افکار بیان کرنے کے بعد عرض کیا کہ انھیں حکم منتخب نہ کیا جائے۔

اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس کا اعلان کرنے کے لیے وہ خود تیار ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ان کا نظریہ لوگوں کے سامنے بیان کیا، لیکن اس پر خوارج نے کہا کہ ہم ابوموسیٰ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو منتخب نہ کریں گے۔ (وقعۂ صفین: ص ۵۰۰-۵۰۲، تاریخ طبری: ج ۳، ص ۳۳۸)

اس سلسلے میں انھوں نے مزید کہا کہ ابوموسیٰ وہ شخص ہیں جن پر شام و عراق کے لوگوں کو اعتماد ہے، وہ رسولؐ خدا کے پاس یمن کے لوگوں کا نمایندہ بن کر آ چکے ہیں"۔ (الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۱۳، کامل ابن اثیر: ص ۳۱۹)

آخر کار ابوموسیٰ اشعری سپاہِ عراق کی جانب سے حکمیت کے لیے مقرر کر دیا گیا۔

حکمین کا معاہدہ

جب حکمین مقرر کر لیے گئے تو معاہدۂ صلح اس طرح لکھا گیا:

هٰذا ما تقاضى عليه على بن ابى طالب اميرالمومنين عليه السلام ومعاوية بن ابى سفيان.........

لیکن اس پر معاویہ نے اعتراض کیا اور کہا: اگر میں نے انھیں امیر المومنین تسلیم کر لیا ہوتا تو ان سے جنگ نہ کرتا۔ عمرو بن عاص نے بھی یہی کہا کہ ہرچند حضرت علی تمھارے امیر ہیں لیکن وہ ہمارے امیر نہیں، لہٰذا صرف ان کا اور ان کے والد کا نام لکھا جائے۔ (تاریخ طبری: ج ۵، ص ۱۱۳، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۱۹، وقعۂ صفین: ص ۵۰۸، الامامہ والسیاسہ، ج ۱، ص ۱۱۴)

لیکن احنفؓ بن قیس نے کہا کہ اس لقب کو حذف نہ کیا جائے۔ اس کے لیے خواہ کتنا ہی

خون ہو جائے۔ کیوں کہ مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ لقب ایک دفعہ حذف کر دیا گیا تو پھر واپس نہ دیا جائے گا۔[1]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کافی دیر تک اس فکر میں محو رہے کہ یہاں تک کہ اشعث آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی اور لہجہ خیانت سے سرشار۔ اس نے فخریہ انداز میں کہا کہ اس لقب کو حذف کر دیجیے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو ماضی کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا: هذا ما تصالح محمد رسول الله۔

سہیل ابن عمرو کو یہ ضد تھی کہ لقب رسولؐ اللہ حذف کیا جائے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتہائی صبر سے اس کی اس ضد کو برداشت کرتے رہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے لیے لقب رسولؐ اللہ حذف کرنا گوارا نہ تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے حذف کر دیا جائے اور فرمایا کہ اس لقب کے حذف کیے جانے سے مجھے رسالت سے تو محروم نہیں کر دیا جائے گا۔

اس کے بعد آپ نے حضرت علی علیہ السلام کی جانب رُخ کر کے فرمایا کہ ایک دن تمھارے سامنے بھی یہی مسئلہ آئے گا۔ اگرچہ تمھیں بہت زیادہ کوفت ہوگی مگر تمھیں بھی یہی کرنا ہوگا۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۲۳۲، وقعۂ صفین: ص ۵۰۸، الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۱۴)

اب وہ زمان موعود آن پہنچا تھا، چنانچہ! حضرت علیؑ نے پوری رضا و رغبت اور مکمل اطمینان کے ساتھ اس کلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو رسولِ گرامی کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا تھا، آپؑ نے فرمایا:

> ”لا اله الا الله والله اکبر، تاریخ خود کو دہرا رہی ہے.....[2] آج میں ان کی آل و اولاد کے لیے اس طرح لکھ رہا ہوں جیسا رسولؐ خدا، ان کے آباء و اجداد کے لیے تحریر فرما چکے ہیں“۔[3]

---

[1] لا تمسح اسم امرة المومنين منك وان قتل الناس بعضهم بعضا فاني اتخوف الا ترجع اليك ابدا۔

[2] یہ جملہ حضرت علی علیہ السلام کی فرمائش کے مطابق ”سنہ بسنہ“ نقل کیا گیا ہے۔

[3] فاليوم اكتبها الى ابنائهم كما كتبها رسول الله الى آبائهم سنة ومثلا۔ وقعۂ صفین: ص ۵۰۸، شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۲۳۲، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۵۲۔

معاہدے کا متن لقب "امیر المومنین" حذف کر کے طرفین کی اتفاق رائے سے جس طرح تحریری شکل میں آیا اس کا اجمالاً ذکر ہم ذیل میں اس کے اہم نکات کے ساتھ کریں گے:

① "طرفین قرآن وسنت پیغمبرؐ کے مطابق حکمِ خداوندی کو قبول کریں گے، حکمِ قرآن اور سنت رسولؐ کے جو خلاف ہے اسے وہ دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔

② حکمین ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص ہیں، جب تک حق سے تجاوز نہ کریں ان کے جان و مال اور ناموس کو حفظ و امان میں رکھا جائے گا۔

③ حکمین اور تمام مسلمین پر فرض ہے کہ وہ حکم کو قرآن وسنت کے مطابق قبول کریں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔

④ جب تک حکمین کا حکم جنگ بندی برقرار ہے اس وقت تک طرفین میں سے کسی کو بھی دوسرے پر تجاوز کرنے کا حق نہیں ہے۔

⑤ منصفین کو اختیار ہے کہ وہ شام و عراق کے درمیان کوئی متوسط نقطہ متعین کر سکتے ہیں۔ ان افراد کے علاوہ جن کے بارے میں اتفاق رائے ہوگا کسی بھی شخص کو مجلس منصفین میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ منصفی کی مدت ماہِ رمضان کے آخر تک ہے۔

⑥ اگر منصفین نے مقررہ مدت تک قرآن وسنت کے مطابق حکم صادر نہیں کیا تو طرفین کو حق حاصل ہوگا کہ اپنی پہلی حالت پر واپس آجائیں اور ایک دوسرے سے جنگ کریں۔

مذکورہ معاہدے پر حضرت علی علیہ السلام کے طرفداروں میں سے عبداللہؓ بن عباس، مالک اشترؒ، حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام، سعید بن قیس نیز اشعث نے اور معاویہ کی طرف سے حبیب بن مسلمہ، ابوالاعور وغیرہ نے دستخط کیے۔ (وقعۂ صفین: ص ۵۰۵، ۵۰۴، الامامۃ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۱۱۵، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۲۰)

اور اس طرح ایک سو دس روزہ جنگ ستر مرتبہ سے زیادہ مقابلوں کے بعد ۷ صفر ۳۷ ہجری کو اختتام پذیر ہوئی۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۹۳-۳۹۴)

مؤرخین نے اس جنگ کے جانی نقصانات کے مختلف اعداد و شمار درج کیے ہیں۔ بعض نے مقتول کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار بتائی ہے جن میں نوے ہزار شام کے سپاہی اور بیس ہزار عراقی

فوج کے لوگ شامل تھے۔ (حوالۂ سابق)

جنگِ صفین کے عبرت آموز سبق

جنگِ صفین کا نتیجہ اسلام کی فتح و نصرت کے ساتھ یہ ہونا چاہیے تھا کہ فتنہ و فساد نیز شجرۂ نفاق کی بیخ کنی ہو اور اس کے ساتھ ہی فرمانروائے شام کی بیداوگری کا قلع قمع ہو جائے۔ لیکن عراقی فوج کے بعض کمانڈروں کی خودسری اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے حکم سے رُوگردانی کے باعث جو نتائج برآمد ہوئے وہ انتہائی تلخ و ناگوار ہونے کے ساتھ عبرت آموز بھی ثابت ہوئے۔ اس سے قبل کہ جنگِ صفین کے نتائج کا اجمالی جائزہ لیا جائے ہم یہاں اس کے بعض سبق آموز نکات کی جانب اشارہ کریں گے:

① جنگِ صفین نے ثابت کر دیا کہ معاویہ کے بارے میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے جو بھی پیشین گوئی کی اور ابتدائے امر سے ہی جتنے بھی موقف اختیار کیے وہ تمام حق پر مبنی تھے اور اس بات کے آئینہ دار تھے کہ حضرت علی علیہ السلام کو ایسے عناصر کی کتنی گہری شناخت تھی۔ معاویہ کی سیاسی سرگرمی کے باعث ناسازگار ماحول پیدا ہو گیا تھا اور وہ افراد جنھوں نے اپنے کرّ و فر کی خاطر انھیں ان کے مرتبے پر برقرار رکھا تھا اگر اس ہنگامہ آرائی میں سرگرمِ عمل نہ ہوتے تو وہ تمام ہلاکتیں اور تباہیاں نہ ہوتیں جو اس جنگ کی وجہ سے ہوئیں۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اس کی معزولی کا فرمان جاری کر کے اور جنگ و نبرد آزمائی کے ذریعے اس کی سرکشی و بالادستی کا جس طرح قلع قمع کیا اس سے آپؑ نے یہ ثابت کر دیا کہ اس جیسے کسی بھی غیر پسندیدہ عنصر کو ہرگز برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

② جنگ کے دوران لشکرِ شام پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ لشکرِ اسلام کو قوتِ ایمانی اور دلیرانہ حوصلہ مندی کے باعث اس پر نمایاں فضیلت و برتری حاصل ہے۔ چنانچہ! یہی وجہ تھی کہ معاویہ نے اپنی شکست و نابودی سے نجات پانے کے لیے فریب کاری و نیرنگی کا سہارا لیا۔ بلاشک و تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس فضیلت و برتری کا بنیادی عامل خود حضرت علی علیہ السلام نیز ان کے فرزندوں اور اصحاب کا جذبۂ ایثار و قربانی تھا۔

۳ اسلامی افواج جب تک حضرت علی علیہ السلام کے زیر فرمان رہیں انھیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی لیکن جیسے ہی افواج کے سرداروں نے خودسری اختیار کر کے آپ کے احکام سے رُوگردانی کی تو نہ صرف مسلمانوں بلکہ دینِ اسلام کو سخت ناگوار حوادث سے دوچار ہونا پڑا۔

۴ جنگِ صفین نے یہ سبق سکھایا کہ اگر پیروانِ حق اپنے موقف پر ثابت قدم رہیں تو حق ہی غالب رہتا ہے، اور اس کا ہی بول بالا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے جزئی جانی مالی نقصان کی وجہ سے اپنے موقف سے پھر جائیں اور سازش وریشہ دوانی کا رویہ اختیار کرلیں تو ظاہر ہے کہ باطل کو ہی ان پر برتری و بالادستی حاصل ہوگی۔

جنگ کے نتائج

صفین کی تباہ کن جنگ کے باعث دونوں ہی لشکروں کا سخت مالی و جانی نقصان ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس جنگ کے جو مفید و ضرر رساں نتائج برآمد ہوئے ان کی کیفیت درج ذیل ہے:

۱ جب لشکرِ عراق میدانِ جنگ سے واپس آیا تو اس کی فوج میں سخت باہمی اختلاف پیدا ہوگیا، چنانچہ! ان میں سے بعض کو تو میدانِ کارزار ترک کرنے کا اتنا سخت افسوس و ملال ہوا کہ ان کے دلوں میں ان لوگوں کے خلاف دشمنی و عداوت پیدا ہوگئی جو میدانِ جنگ ترک کرانے کے اصلی محرک تھے۔ چنانچہ! یہ دشمنی و عداوت اس حد تک پہنچی کہ بھائی بھائی سے اور بیٹا باپ سے نفرت کرنے لگا، اور کہیں کہیں تو نوبت یہاں تک آئی کہ انھوں نے ایک دوسرے کو خوب زدوکوب کیا۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۱۷)

۲ اگرچہ معاویہ کا نقصان بہت زیادہ ہوا لیکن اس کے باوجود وہ عمرو بن عاص کی نیرنگی کے باعث اپنی سیاسی حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ جنگ سے قبل وہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کا معزول و باغی کارگزار تھا لیکن اس معاہدے کی رُو سے جو اس جنگ کے بعد کیا گیا اس کا مرتبہ حضرت علی علیہ السلام کے ہم پایہ و ہم پلہ تھا اور اسے سرکاری سطح پر راہبرِ شام تسلیم کرلیا گیا تھا۔

۳ اگرچہ لشکرِ عراق میں ایسے سپاہیوں کی تعداد کم ہی تھی کہ جنھوں نے اس جنگ سے درپ

عبرت لیا اور راہِ حق پر کاربند رہے لیکن اس میں ایسے ظاہر بین فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو منافق اور اقتدار پرست افراد کے دامِ فریب میں آگئے اور انھوں نے اپنی نیز دینِ اسلام کی تقدیر کو حیلہ گر، نیرنگ ساز، کج اندیش حکمین کے حوالے کر دیا اور اپنے لیے مصائب و آلام کو دعوت دے دی۔

۲ اس جنگ کا دوسرا اہم نتیجہ فتنہ و آشوب کا بیج بویا جانا تھا اور یہ درحقیقت عراقی فوج کے بعض نادان افراد کی خودسری و ضد کا ثمرہ تھا۔

چنانچہ! اشعث اس معاہدے کو لے کر دونوں لشکروں کے سپاہیوں کی جانب روانہ ہوا اور اس کی شرائط پڑھ کر انھیں سنائیں۔ شامیوں نے سن کر خوشی کا اظہار کیا اور انھیں قبول بھی کر لیا لیکن فوجِ عراق میں سے بعض نے تو اس پر رضایت ظاہر کی۔ بعض نے مجبوراً انھیں پسند کیا مگر چند ایسے بھی تھے جنھوں نے سخت مخالفت کی اور معترض ہوئے۔

مخالفت کی پہلی صدا طائفہ "عزہ" کی جانب سے بلند ہوئی جو چار ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل تھا، اور ان میں سے دو افراد نے بلند آواز سے کہا:

لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ

"یعنی خدا کے علاوہ کسی کو حاکمیت کا حق نہیں"۔

اس کے بعد وہ معاویہ کے لشکر پر حملہ آور ہو گئے مگر شہید ہوئے۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۹۴)

دوسرے مرحلہ پر "بنی تمیم" کا نعرہ سنا گیا بلکہ اس قبیلے کے ایک فرد نے تو اشعث پر حملہ کر دیا اور کہا کہ "کیا امرِ خدا میں افراد کو حاکم قرار دیا جا سکتا ہے؟ ایسی صورت میں ہمارے جوانوں کے خون کا کیا انجام ہوگا؟" (وقعۂ صفین: ص ۵۱۲-۵۱۳)

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ کا غلغلہ بیشتر سپاہیوں کے گلے سے جوش مارنے لگا۔ انھوں نے اپنے گذشتہ عمل کی اس طرح اصلاح کی کہ "حکمیت" کے لیے راضی ہو جانا دراصل ہماری اپنی ہی لغزش تھی لیکن اپنے کیے پر ہم پشیمان اور توبہ کے طلب گار ہیں۔ چنانچہ! انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا: "جس طرح ہم واپس آگئے ہیں آپ بھی آجایئے ورنہ ہم آپ سے بیزار ہو جائیں گے"۔ (حوالہ سابق)

وہ اس قدر جلد پشیمان ہوئے کہ انھوں نے پوری سنجیدگی سے یہ مطالبہ کیا کہ معاہدۂ جنگ بندی پر کاربند نہ رہا جائے، لیکن حضرت علی علیہ السلام نے آیاتِ مبارکہ

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا

"اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم نے ان سے کوئی عہد باندھا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو"۔ (سورۂ نحل: آیت ۹۱)

اور — اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ "لوگو! بندشوں کی پوری پابندی کرو"۔

سنا کر انھیں عہد و پیمان شکنی سے باز رکھا۔ (وقعۂ صفین: ص ۵۱۵-۵۱۶)

مگر ان کی کمزور رائے اور متزلزل ارادے پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ جنگ کی کوفت کے آثار ابھی ان کے چہرے سے زائل نہ ہوئے تھے کہ دوسرے فتنے کا بیج بو دیا گیا۔

سرکشوں کی تشکیل و گروہ بندی

جب جنگ صفین ختم ہوگئی تو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کوفہ واپس تشریف لے آئے لیکن جو لوگ سرکش و باغی تھے وہ راہ میں آپؑ سے علیحدہ ہوگئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اس وقت جب کہ جنگ اَوج پر تھی تو حضرت علی علیہ السلام کو یہ دھمکی دی تھی کہ جنگ بندی کا اعلان کیجیے ورنہ ہم آپؑ کو قتل کر ڈالیں گے اور حکمیت کا تعین ہو جانے کے بعد انھی افراد نے لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ کا نعرہ بلند کیا تھا اور حرورا[1] نامی مقام پر تقریباً بارہ ہزار افراد نے قیام کیا اور یہاں خود ایک مستقل گروہ کی شکل اختیار کرلی جہاں انھوں نے شبث بن ربعی کو اپنا فرمان دار اور عبداللہ بن کوا کو اپنا امامِ جماعت مقرر کیا۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۲۶، مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۹۵)

حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب نے جب اس واقعے کے بارے میں سنا تو اس خیال کے پیش نظر کہ وہ اپنی وفاداری کا حضرت علی علیہ السلام پر دوبارہ اظہار کریں، انھوں نے آپؑ کے ساتھ از سرِ نو عہد کیا اور وہ یہ تھا کہ: دوستانِ علیؑ کے ساتھ دوست، اور آپؑ کے دشمنوں کے ساتھ دشمنی کا سلوک روا رکھیں۔

---

[1] یہ جگہ کوفہ سے تقریباً نصف فرسخ کے مقابلے پر واقع تھی اور چوں کہ انھوں نے یہاں قیام کیا تھا اسی لیے وہ "حروریہ" کہلائے جانے لگے۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۹۱)

لیکن خوارج نے اس وعدہ کو کفر و گناہ سے تعبیر کیا اور شیعیان علیؑ سے کہا کہ تمھاری اور شامیوں کی مثال ان دو گھوڑوں کی سی ہے جنھیں، دوڑ کے مقابلہ میں لگایا گیا ہو۔ چنانچہ اس راہ میں تم کفر کی جانب بڑھ گئے ہو۔

حضرت علی علیہ السلام خوارج کے درمیان

جب خوارج حضرت علی علیہ السلام سے علیحدہ ہو گئے تو آپ نے یہ سوچ کر کہ ان کے ساتھ زیادہ نزدیک سے ملاقات کی جائے اور ان کے ذہنوں میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان کا حل تلاش کیا جائے۔ سب سے پہلے عباس کو ان کے پاس بھیجا۔ حضرت علی علیہ السلام چونکہ ان کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ حالات و واقعات کا تجزیہ تو نہیں کر سکتے البتہ حریف کو قائل کرنے کی ان میں غیر معمولی مہارت و صلاحیت ہے اسی لیے آپؑ نے حضرت عباسؓ سے تاکیداً یہ بات کہی کہ ان کے ساتھ گفتگو کرنے میں عجلت نہ کریں بلکہ اس قدر توقف کریں کہ میں ان تک پہنچ جاؤں۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۱۷)

لیکن حضرت عباسؓ وہاں پہنچے ہی تھے کہ انھوں نے بحث و گفتگو شروع کر دی۔ بالآخر انھوں نے بھی مجبوراً اپنی زبان کھولی اور اس آیہ مبارکہ کی تلاوت کی:

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا (سورۂ نساء: آیت ۳۵)[۱]

"اور اگر تم کو کہیں شوہر اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو"۔

نیز حکم عقل کے ذریعے ثابت کر دیا کہ "حکمیت" کا تقرر شرعاً جائز ہے مگر انھوں نے جواب میں اس مرتبہ بھی وہی بات کہی جو اس سے پہلے کہتے چلے آ رہے تھے۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۱۷)

حضرت عباسؓ کے چلے جانے کے بعد حضرت علی علیہ السلام بھی اس طرف روانہ ہوئے اور

---

[۱] ان کی دلیل یہ تھی کہ جب خداوند تعالیٰ نے ایک خاندان کی اصلاح کے لیے ایک منصف ثالث کو لازم قرار دیا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا اطلاق اس عظیم اُمت پر نہ ہو۔

چونکہ یزید بن قیس سے واقفیت تھی اس لیے آپؑ اسی کے خیمے میں پہنچے۔ یہاں دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد آپؑ نے مجمع کی جانب رُخ کیا اور دریافت فرمایا کہ تمھارا رہبر کون ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ ابن الکوا۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا کہ وہ کون سی چیز تھی جس نے تمھیں ہم سے برگشتہ کیا؟

انھوں نے کہا کہ آپ کی جانب سے حکمیت کا تعین و تقرر۔

اس پر حضرت علی علیہ السلام نے جواب دیا کہ حکمیت کی پیش کش تمھاری جانب سے کی گئی تھی، میں تو اس کا سخت مخالف تھا۔

انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کے مدلل جوابات کی تائید کرتے ہوئے اپنی اس نئی راہ و روش کی یہ توجیہ کی کہ ہمارے سابقہ اعمال کفر پر مبنی تھے۔ چنانچہ! ہم نے ان سے توبہ کرلی ہے، آپ بھی تائب ہوجایئے تاکہ ہم آپؑ کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کرلیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: اِنِّی اَستَغفِرُ اللّٰہَ مِن کُلِّ ذَنبٍ۔

اس پر خوارج نے سمجھا کہ آپ نے "حکمیت" کے منظور کرنے پر توبہ کی ہے، چنانچہ! وہ سب آپؑ کے ساتھ کوفہ چلے آئے اور بظاہر اس فتنہ و فساد کا خاتمہ ہوگیا۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۹۱، کامل ابن اثیرؒ: ج ۳، ص ۳۲۸، سیرۃ الائمہ الاثنی عشر: ج ۱، ص ۴۸۹، عقد الفرید: ج ۲، ص ۳۸۸)

منافقین کی تحریکات

وہ منافق و موقع پرست لوگ جو حکومت کے اقتدار اور مملکت میں امن و امان کی فضا برداشت نہیں کرسکتے تھے جب خوارج کے گروہ سے نکل کر واپس آگئے تو مختلف قسم کی افواہیں پھیلانے لگے اور یہ کہنا شروع کردیا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام حکمیت کے معاملے میں پشیمان ہیں۔ وہ اسے گمراہی تصور کرتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ جنگ کے امکانات پیدا ہوجائیں تاکہ دوبارہ معاویہ کی جانب روانہ ہوسکیں۔ (سیرۃ الائمہ الاثنی عشر: ج ۱، ص ۴۸۹)

یہ افواہیں معاویہ کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ اس نے ایک شخص کو کوفہ کی جانب روانہ کیا تاکہ اس سلسلے میں بیشتر اطلاعات فراہم کرسکے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو اچھی طرح

جانتا تھا، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت علی علیہ السلام قرآن اور اسلام کے راستے سے منحرف نہ ہوں گے اور جو عہد و پیمان انھوں نے کیا ہے اس کی وہ کبھی خلاف ورزی نہ کریں گے، لیکن شاید یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے حرکات و سکنات کی نگرانی کر رہا تھا اس لیے اس نے یہ اقدام کیا۔

اس بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ معاویہ کو متحرک کرنے کا اصل عامل اشعث تھا، اور وہ عہد جنگ بندی کی افواہوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، کیوں کہ اشعث وہ شخص تھا جو ابن ابی الحدید کے قول کے مطابق معتزلی تھا اور جس کا مقصد حضرت علی علیہ السلام کی حکومت میں ہر قسم کی تباہی و بربادی کو فروغ دینا تھا اور مسلمانوں کے لیے ہر طرح کی اضطرابی و پریشانی کا عامل بننا مقصود تھا۔ (۱) چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے بھی اسے کافر کے بچے سے یاد کیا ہے۔ (۲)

اس احتمال کو جو چیز تقویت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جس وقت شام سے حضرت علی علیہ السلام کے پاس پیغام پہنچا اور آپؑ سے معاہدے کی خلاف ورزی سے اجتناب کرنے کو کہا گیا تو وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان بہت سے لوگوں کی موجودگی میں جو حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے، کہا کہ یہ سننے میں آیا ہے کہ آپؑ حکمیت کو گمراہی قرار دیتے ہیں اور اس پر ثابت قدم رہنا آپ کے نزدیک کفر ہے۔ (سیرۃ الائمہ الاثنی عشر: ج ۱، ص ۳۹۸، شرح نہج البلاغہ، علامہ خوئی: ج ۴، ص ۱۲۶)

افواہوں کو بے بنیاد ثابت کرنے اور ان کی حقیقت کو عوام پر واضح و روشن کرنے کے لیے حضرت علی علیہ السلام نے ضروری سمجھا کہ مسجد میں تشریف لے جائیں اور وہاں حاضرین سے خطاب کریں۔ چنانچہ آپؑ نے فرمایا:

> ”جس شخص کو یہ گمان ہے کہ میں معاہدۂ حکمیت پر قائم نہیں ہوں تو اس نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے اور جو مسلمان بھی حکمیت کو گمراہی کا سبب سمجھتا ہے وہ دوسروں کی بہ نسبت خود زیادہ گمراہ ہے“۔

حضرت علی علیہ السلام کا خطبہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ مسجد کے ایک کونے سے یہ آواز سنائی دی:

---

(۱) کل فساد کان فی خلافۃ علی علیہ السلام وکل اضطراب حدث فاصلہ الاشعث (شرح نہج البلاغہ: ج ۲، ص ۲۷۹)

(۲) علیک لعنۃ اللہ ولعنۃ اللاعنین حائک بن حائک منافق ابن کافر (نہج البلاغہ: خطبہ ۱۹)

اے علیؑ! تم نے ان افراد کو خدا کے دین میں شامل کرلیا۔ لَاحُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ۔

اس آواز کے بلند ہونے کے ساتھ ہی مسجد کی پوری فضا لَاحُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ کے نعروں سے گونجنے لگی۔ (شرح نہج البلاغہ، علامہ خوئی: ج ۴، ص ۱۲۷)

منافقین کی تحریکات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ خوارج نہ صرف اپنی اصلی حالت پر واپس نہیں آئے بلکہ کینہ وعداوت ان کے دلوں میں پہلے کے مقابل زیادہ گھر کرنے لگا۔ چنانچہ! جب جلسہ ختم ہوا تو وہ لوگ گذشتہ کی نسبت اب زیادہ غم وغصہ اور نفرت کے جذبات سے لبریز شہر کے باہر روانہ ہوئے اور اپنی خیمہ گاہوں میں واپس آگئے۔

منصفین کا اجتماع

معاویہ نے جب یہ دیکھا کہ حکمیت کے معاملے میں عراقی فوج کی کثیر تعداد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے برگشتہ ہوگئی ہے تو اس نے یہ کوشش شروع کردی کہ جس قدر جلد ہوسکے حکمیت کا نتیجہ اس کی مرضی کے مطابق برآمد ہوجائے۔ اس مقصد کے تحت اس نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف سرکشی وشورش کا محاذ قائم کردیا تاکہ وہ اپنے سیاسی موقف کو قائم کرسکے۔ چنانچہ! اس ارادے کے تحت اس نے جو نمایندے حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں بھیجے انھیں ہدایت کردی کہ جس قدر جلد ہوسکے منصفین اپنا کام شروع کردیں۔

بالآخر ۳۸ ہجری میں چار سو افراد کے ہمراہ دو نمایندہ وفد دومۃ الجندل [1] نامی مقام پر جمع ہوئے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی جانب سے جو وفد بھیجا گیا تھا اس کی سرپرستی کے فرائض ابن عباسؓ انجام دے رہے تھے۔ (وقعۂ صفین: ص ۵۳۳، مروج الذہب: ج ۲، ص ۳۹۰)

جس وقت یہ وفد روانہ ہونے لگا تو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بعض اصحاب نے ابوموسیٰ کو کچھ ضروری ہدایات بھی کیں۔ (وقعۂ صفین: ص ۵۳۶) جن کا ان پر ذرا بھی اثر نہ ہوا، جس وقت اسے مشورے دیے جارہے تھے تو وہ مسلسل اپنے داماد عبداللہ ابن عمر کی جانب دیکھ رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ: خدا کی قسم! اگر میرا بس چل سکا تو عمر کی راہ ورسم کو ازسرنو زندہ کردوں گا۔ (وقعۂ صفین: ص ۵۳۴-۵۴۱)

---

[1] اس کا شمار مدینہ کے قریات میں ہوتا ہے۔

عمرو بن عاص کی جیسے ہی ابوموسیٰ سے ملاقات ہوئی تو وہ اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا اور اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ اسے اپنا ہم خیال بنا لے۔ ابتدائی مراحل انجام دینے کے بعد وہ دونوں مشاورت کے لیے بیٹھ گئے اور باقی افراد دو جانب کھڑے اس گفتگو کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگے۔

شام کا وفد خاص نظم و ضبط کے ساتھ آیا تھا۔ ملاقاتوں اور گفتگو میں احتیاط کا عنصر غالب تھا۔ اسی اثنا میں معاویہ نے عمرو بن عاص کو خط لکھا جس کے مضمون کی اطلاع اس کے علاوہ کسی کو نہ ہوئی۔ اس کے برعکس عراقی وفد کے اراکین احتیاط سے دُور شور و غوغا بپا کیے ہوئے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے بھی ابن عباس کو خط لکھا۔ ابھی قاصد اُونٹ سے اُترا بھی نہیں تھا کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ خط میں کیا لکھا گیا ہے۔ یہی کام انھوں نے ابن عباسؓ کے پاس پہنچ کر کیا لیکن جب انھوں نے خط کے مضمون کو ان سے پوشیدہ رکھنا چاہا تو لوگوں ان کے بارے میں چہ چہ ہونے لگے یہاں تک کہ ابن عباسؓ کو ان کی حماقت و ضد پر غصہ آ گیا۔ انھوں نے سرزنش کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا کہ افسوس! تمھاری حالت پر تمھیں کب عقل آئے گی۔ دیکھتے نہیں ہو کہ معاویہ کا قاصد آتا ہے اور کسی کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ کیا پیغام لے کر آیا ہے۔ وہ اپنی بات کو ہوا تک لگنے نہیں دیتے اور ایک تم ہو کہ میرے بارے میں ہر وقت بدگمانی کرتے رہتے ہو۔ (وقعۂ صفین: ص ۵۳۴)

حکمیت کا نتیجہ اور اس کا ردعمل

منصفین کے درمیان بحث و گفتگو تقریباً دو ماہ تک جاری رہی۔ مذاکرات کے دوران ابوموسیٰ کی یہ کوشش رہی کہ عمرو بن عاص اُمورِ خلافت کو عبداللہ ابن عمر کی تحویل میں دے دے۔ دوسری طرف عمرو بن عاص معاویہ کی تعریف کے پل باندھے چلا جا رہا تھا اور اسے عثمان کا ولی و جانشین کہتے اس کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ وہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ابوموسیٰ کو قائل کر لے اور یہ کہنے پر مجبور کر دے کہ خلافت اسی کا حصہ ہے۔

بالآخر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فریقین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ، دونوں ہی خلافت سے دست بردار ہو جائیں اور اُمورِ خلافت کو مشاورت کی صوابدید پر چھوڑ دیں۔

اس موافقت کے بعد اعلان کیا گیا کہ لوگ حکمیت کا نتیجہ سننے کے لیے جمع ہو جائیں۔

جب لوگ جمع ہو گئے تو ابوموسیٰ نے عمرو بن عاص کی جانب رُخ کیا اور کہا کہ منبر پر جا کر اپنی رائے کا اعلان کر دو۔ عمرو بن عاص تو اوّل دن سے ہی اس بات کا متمنی تھا اور اسی لیے وہ ابوموسیٰ کی تعریف و خوشامد کرتا رہتا تھا مگر اس نے استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا:

> ''سبحان اللہ! حاشا وکلا کہ یہ جسارت کروں اور آپ کی موجودگی میں منبر پر قدم رکھوں، خداوند تعالیٰ نے ایمان و ہجرت میں آپ کو مجھ پر فوقیت عطا کی ہے۔ آپ اہلِ یمن کی طرف سے نمایندہ بن کر رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو چکے ہیں اور پھر رسولِ مقبول ﷺ کی جانب سے آپ ہی نمایندہ بنا کر یمن کے لوگوں کے پاس بھیجے گئے تھے...... اس کے علاوہ سن و سال میں آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ اس بنا پر آپ ہی گفتگو شروع کریں''۔ (الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۱۸، وقعۂ صفین: ص ۵۴۴)

ابوموسیٰ گفتگو شروع ہی کرنا چاہتا تھا کہ ابن عباسؓ نے کہا کہ عمرو بن عاص تمھیں دامِ فریب میں لانے کی فکر میں ہے۔ گفتگو کا آغاز اسے ہی کرنے دو، کیوں کہ وہ بہت عیار اور نیرنگ ساز آدمی ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ جس چیز پر اس نے اپنی رضایت ظاہر کی ہے وہ اس پر عمل بھی کرے۔

لیکن ابوموسیٰ نے ابن عباسؓ کی نصیحت پر عمل نہیں کیا اور اس نیک مشورے کے باوجود وہ منبر پر چڑھ گیا اور اعلان کیا:

> ''ہم نے اس اُمت کے اُمور پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ وحدتِ نظر سے بڑھ کر ایسی کوئی شے نہیں جو اس درہم برہم حالت کی اصلاح کر سکے۔ چنانچہ! مَیں نے اور میرے حریف ساتھی ''عمرو'' نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت علیؑ اور معاویہ دونوں ہی خلافت سے دست بردار ہو جائیں اور اس معاملے کو مسلمانوں کی مجلس مشاورت کی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ جس شخص کو یہ مجلس مشاورت پسند کرے اسے ہی منصبِ خلافت پر فائز کیا جائے''۔

اس کے بعد اس نے پُروقار لہجے میں کہا کہ مَیں نے حضرت علیؑ اور معاویہ کو خلافت سے

برطرف کیا۔ اس کے بعد عمرو بن عاص منبر پر گیا اور اس نے باآواز بلند کہا:

''لوگو! تم نے اس شخص کی باتیں سن لیں، میں بھی حضرت علیؑ کو ان کے مقام سے برطرف کرتا ہوں لیکن اپنے دوست معاویہ کو اس منصب پر مقرر کرتا ہوں کیونکہ انھوں نے عثمان کے خون کا بدلہ لیا ہے اور اس منصب کے لیے وہ مناسب ترین شخص ہے''۔

یہ کہہ کر وہ منبر سے نیچے اُتر آیا۔

مجلس میں ایک دم شور و ہیجان بپا ہوگیا۔ لوگ طیش میں آ کر ابوموسیٰ پر ٹوٹ پڑے۔ بعض نے عمرو بن عاص پر تازیانہ تک اُٹھا لیا۔ ابوموسیٰ نے شکست کھائے ہوئے انسان کی طرح اپنے خیانت کار حریف کی اس حرکت پر اعتراض کیا:

''تجھے کیا سوجھی؟ خدا تجھے نیک توفیق نہ دے، تُو نے خیانت کی ہے اور گناہ کا مرتکب ہوا ہے، تیری حالت کتے جیسی ہی ہے، اسے چاہے مارا جائے یا چھوڑ دیا جائے وہ ہر حالت میں بھونکتا ہی رہتا ہے''۔

اس پر عمرو نے جواب میں کہا:

''تیری حالت اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں''۔

حکمیت کا معاملہ اس تلخ انجام کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ ابوموسیٰ جان کے خوف سے فرار کر کے مکہ چلا گیا۔ عمرو بن عاص فاتح کی حیثیت سے شام کی جانب روانہ ہوا اور اس نے معاویہ کو خلیفہ کی حیثیت سے سلام کیا۔

حکمیت سے جو نتیجہ برآمد ہوا اس نے عراق کے لوگوں کی ذہنی کیفیت کو بُری طرح متاثر و مجروح کیا کیوں کہ ایک طرف تو خوارج کا غم و غصہ پہلے کی بہ نسبت اب کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا کہ جس کا سبب یہ تھا کہ ابھی اُمید تھی کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام معاہدے کے منسوخ کرنے پر راضی ہو جائیں گے اور معاویہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے گا۔ دوسری طرف جب یہ افسوس ناک خبر کوفہ و بصرہ کے لوگوں تک پہنچی کہ حضرت علی علیہ السلام خلافت سے محروم کر دیے گئے ہیں تو مسلمانوں کے درمیان اختلافات بہت زیادہ ہو گئے اور ان کی خلیج کافی وسیع ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ! نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دوسرے کو برملا سخت و سست کہنے لگے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کے درمیان رفع اختلاف، حزن و ملال کے آثار میں کمی اور مسئلۂ حکمیت کے بارے میں رائے عامہ روشن کرنے کی خاطر اپنے فرزند حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ عوام کے سامنے جا کر تقریر کریں۔ حضرت امام حسن علیہ السلام منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

''لوگو! حکمین کے بارے میں تم بہت زیادہ گفتگو کر چکے ہو، ان کا انتخاب اس لیے عمل میں آیا تھا کہ وہ قرآن کی بنیاد پر حکم کریں گے، مگر ہوائے نفسانی کی پیروی کرنے کی وجہ سے انھوں نے فیصلہ قرآن کے برخلاف کیا ہے، اس بنا پر انھیں حکم نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ محکوم کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

ابوموسیٰ جو عبداللہ بن عمر کا نام تجویز کر چکا تھا، تین اعتبار سے لغزش و خطا کا مرتکب ہوا۔ اس کی پہلی لغزش تو یہی تھی کہ اس نے اس کے خلاف عمل کیا جو عمر نے کہا تھا۔ عمر چونکہ اسے خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے اسی لیے انھوں نے اس کو مجلسِ مشاورت کا رکن بھی قرار نہیں دیا تھا۔

دوسری لغزش یہ تھی کہ اس نے یہ فیصلہ عبداللہ سے مشورہ کیے بغیر کیا اور اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس پر رضامند ہوں گے یا نہیں۔

تیسری لغزش یہ تھی کہ عبداللہ اس حیثیت کا انسان نہیں تھا جس کے بارے میں مہاجرین و انصار کا اتفاق رائے ہوتا۔

اب رہی مسئلۂ حکمیت کی اصل (تو کوئی نئی بات نہیں، کیوں کہ پیغمبرؐ اسلام غزوات کے دوران اس پر عمل کر چکے ہیں)۔ رسولؐ خدا نے طائفہ بنی قریظہ کے بارے میں سعدؓ بن معاذ کو حکم قرار دیا تھا اور چونکہ حکمیت رضائے خدا وندی کے خلاف تھی اس لیے پیغمبر اکرمؐ اس پر راضی نہ ہوئے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام کے بعد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے فرمانے پر عبداللہؓ بن جعفر اپنی جگہ سے اُٹھے اور عوام کو مطلع کرنے کی غرض سے انھوں نے تقریر کی۔ (الامامہ والسیاسہ: ج۱، ص۱۱۹)

مارقین (جنگِ نہروان)

خوارج کے مقابل حضرت علی علیہ السلام کا موقف ①

حکمیت کے معاملے میں شکست سے دوچار ہوکر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے معاویہ سے جنگ کرنے کے لیے خود کو آمادہ کرنا شروع کیا تاکہ مہلت کی مدت ختم ہوجانے کے بعد صفین کی جانب واپس چلے جائیں لیکن خوارج نے حضرت علی علیہ السلام کی اطاعت کرنے کے بجائے شورش و سرکشی سے کام لیا اور پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی نعرۂ لَاحُکمَ اِلَّا لِلّٰہِ کی بنیاد پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کو وہ کافر کہنے لگے۔

انھیں جب بھی موقع ملتا وہ شہر کوفہ میں داخل ہوجاتے اور جس وقت حضرت علی علیہ السلام مسجد میں تشریف فرما ہوتے تو وہ اپنا وہی پرانا نعرہ لگانے لگتے۔ اس کے سات ہی انھوں نے اس شہر میں اپنے افکار و نظریات کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے خاموش و پرسکون رہ کر اور کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر اپنی تحریک کو جاری رکھا۔ وہ ان کے ساتھ انتہائی نرمی اور تواضع کے ساتھ پیش آئے۔ اگرچہ حضرت علی علیہ السلام چاہتے تو ان لوگوں سے کسی بھی قسم کا سلوک روا رکھ سکتے تھے مگر آپؑ نے ان کی تمام افترا پردازیوں اور سیاسی سرگرمیوں کے باوجود اپنے محبت آمیز رویے میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ آنے دی۔ آپؑ ان سے اکثر فرماتے: تمھارے تین مسلّم حقوق ہمارے پاس محفوظ ہیں:

① شہر کی جامع مسجد میں نماز پڑھنے اور اجتماعات میں شرکت کرنے سے تمھیں ہرگز منع نہیں کیا جائے گا۔

② جب تک تم لوگ ہمارے ساتھ ہو، بیت المال سے تمھیں تنخواہیں ملتی رہیں گی۔

---

① خوارج جمع ہے خارجہ کی۔ اصطلاحاً اس کا اطلاق اس فرقے پر ہوتا ہے جنھوں نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف شورش و سرکشی کی اور نہروان نامی مقام پر آپ سے برسرِ پیکار ہوئے۔ ابنِ ملجم کا شمار بھی خوارج ہی میں ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ اسی شخص کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ (کتاب ملل ونحل: تالیف شہرستانی، ج ۱، ص ۱۱۴)

۴ جب تک تم لوگ ہم پر تلوار نہیں اٹھاؤ گے ہم تمھارے ساتھ ہرگز جنگ کے لیے اقدام نہ کریں گے۔ ①

خوارج اگرچہ نماز میں حضرت علی علیہ السلام کی پیروی نہیں کرتے تھے مگر اجتماعِ نماز کے وقت ضرور پہنچ جاتے۔ وہ لوگ اس جگہ نعرے لگا کر اور دوسرے طریقوں سے آپؑ کو پریشان کر کے آزار پہنچانے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ ایک دن جس وقت حضرت علی علیہ السلام نماز میں قیام کی حالت میں تھے خوارج میں سے ایک شخص نے جس کا نام "کوا" تھا باآواز بلند یہ آیت پڑھی:

وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ○ (سورۂ زمر: آیت ۶۵)

اس آیت میں خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا گیا ہے:

"اے نبیؐ! ان سے کہو، پھر کیا اے جاہلو، تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو (یہ بات ہمیں صاف کہہ دینی چاہیے کیوں کہ) تمھاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاءؑ کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے۔ اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے"۔

ابن کوا یہ آیت پڑھ کر چاہتا تھا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو اشارہ و کنایہ میں یہ جتادے:

"آپ نے عہد گذشتہ میں جو اسلام کے لیے خدمات انجام دی ہیں، ان سے ہر چند انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن آپؑ نے کفر کے باعث اپنے تمام گذشتہ اعمال کو تلف و ضائع کر دیا ہے"۔

حضرت علی علیہ السلام خاموش رہے اور جب یہ آیت پوری پڑھی جا چکی تو آپؑ نے نماز شروع کی۔ ابن کوا نے دوسری مرتبہ یہ آیت پڑھی۔ حضرت علی علیہ السلام اس مرتبہ بھی خاموش رہے۔ چنانچہ!

---

① ان لکم عندنا ثلاثا لا نمنعکم صلوٰۃ فی ھذا المسجد ولا نمنعکم نصیبکم من ھذا المسجد ولا نمنعکم نصیبکم من ھذا الفیء ما کانت ایدیکم مع ایدینا ولا نقتلکم تقاتلونا (تاریخ طبری: ج ۵، ص ۷۳)

جب وہ یہ آیت کئی بار پڑھ چکا اور چاہتا تھا کہ نماز میں خلل انداز ہو تو امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ۝

"پس اے نبیؐ! صبر کرو یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں کرتے"۔ (سورۂ روم: آیت ۶۰)

آپؑ نے اس کی جانب توجہ و اعتنا کیے بغیر نماز جاری رکھی۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کا طرزِ عمل یہ تھا کہ آپؑ لوگوں کی نعرے بازی اور نکتہ چینی کا جواب منطقی نیز واضح و روشن دلائل سے دیتے تا کہ وہ اپنی ذہنی لغزش کی جانب متوجہ ہو سکیں اور آپؑ کو پریشان کرنے سے باز رہیں۔ اسی لیے آپؑ فرماتے:

"اگر خوارج خاموش رہتے ہیں تو ہم انھیں اپنی جماعت کا جزو رکن سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اعتراض کے لیے لب کشائی کرتے ہیں تو ہم ان کا مقابلہ منطق و دلیل سے کرتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ ضد پر اتر آئیں تو ہم ان سے نبرد آزمائی کرتے ہیں"۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۳۱۱، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۷۳)

منشور

خوارج نے ایک خاص اندازِ فکر کی بنیاد پر امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے خلاف شورش و سرکشی کی۔ ان کے اس دائرۂ عمل میں مندرجہ ذیل نکات شامل تھے:

① امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں معاویہ اور عثمان، اصحابِ جمل، حکمیت سے متفق و ہم خیال اشخاص دوسروں کو کافر تصور کرنے والے لوگ اور مذکورہ بالا افراد سے وابستہ گروہ، سب کے سب کافر ہیں۔

② امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بنیاد پر ظالم و ستم گر خلیفۂ وقت (امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام) کو بلاقید و شرط برخاست کرنا ضروری ہے، کیوں کہ ان کی رائے میں اس کا اطلاق کسی شرط و پابندی کے بغیر ہر جگہ ضروری و لازمی امر تھا۔

④ مسئلہ خلافت کا حل مجلس مشاورت کے ذریعے کیا جانا چاہیے اور اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے اس کی دانست میں واحد شرط یہ تھی کہ آدمی صاحب تقویٰ و ایمان ہو اور اگر خلیفہ انتخاب کے بعد اسلامی معاشرے کی مصلحتوں کے برخلاف کوئی اقدام کرے تو اسے اس عہدے سے معزول کر دیا جائے اور اگر وہ اپنے منصب سے دست بردار نہ ہو تو اس سے جنگ و نبرد کرنی چاہیے۔ ①

اس منشور کی بنیاد پر وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے کیوں کہ ان کی رائے میں یہ حضرات صحیح انتخاب کے ذریعے عہدۂ خلافت پر فائز ہوئے تھے اور وہ مسلمانوں کی خیر و صلاح کی راہ سے منحرف نہ ہوئے تھے۔ حضرت عثمان اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے انتخاب کو اگرچہ وہ درست ہی سمجھتے تھے مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے:

> "حضرت عثمان نے اپنی خلافت کے چھٹے سال سے اپنے رویے کو بدلنا شروع کر دیا تھا۔ اسی لیے وہ خلافت سے اگرچہ معزول کر دیے گئے تھے مگر وہ چونکہ اپنے اس منصب پر باقی رہے اس لیے وہ کافر اور واجب القتل تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے بھی چونکہ حکمیت کو تسلیم کر لیا تھا اور اس اقدام پر پشیمان ہو کر انھوں نے توبہ نہیں کی تھی اس لیے وہ کافر اور واجب القتل ہیں" (معاذ اللہ)۔ ②

مجموعی نعرہ

خوارج کا انتہائی اہم اور پرجوش ترین نعرہ لَاحُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ تھا، اگرچہ یہ نعرہ انھوں نے

---

① ان سکتوا عممناهم ان تکلموا حججناهم وان خرجوا علینا قاتلناهم (تاریخ طبری: ج ۵، ص ۷۲، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۳۴)

② خوارج کے نعرہ لَاحُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ سے جو مطلب اخذ کیا گیا تھا اسی مفہوم میں اس کا ذکر حضرت علی علیہ السلام کے خطبہ ۴۰ میں بھی ملتا ہے۔ ابتدا میں ان کی رائے یہ تھی کہ امامِ وقت اور حکومت کے لیے اجتماع کی ضرورت نہیں اور لوگوں کو چاہیے کہ خود براہ راست کلام اللہ پر عمل کریں مگر اس رائے کو ظاہر کرنے کے بعد انھوں نے حضرت عبداللہ بن وہب راسبی سے رجوع کیا اور اسی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۳۶)

قرآن مجید سے ہی اخذ کیا تھا۔ ① مگر عدم واقفیت اور فکری جمود کے باعث اس کی وہ صحیح تفسیر نہ کر سکے۔

مذکورہ آیۂ مبارکہ میں "حکم" سے مراد قانون ہے مگر خوارج نے اپنی کج فہمی کی بنا پر اس کے معنی "رہبری" سمجھ لیے جس میں حکمیت بھی شامل ہے۔ وہ اس بات سے بے خبر رہے کہ خود قرآن نے شوہر اور بیوی کے اختلاف اور حالت احرام میں ② شکار کرنے تک کے مسائل کے بارے میں انسانوں کو حکمیت کا حق قرار دیا ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ مسلمانوں کے دو گروہ کے درمیان ایسے حساس معاملات اور عظیم اختلافات کے بارے میں انسانوں کو حقِ حکمیت نہ دیا جاتا جس سے بعض انسانی زندگیوں کی نجات بھی وابستہ ہو۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ان لوگوں کی اطلاع کے لیے جو خوارج کے پروپیگنڈہ بالخصوص اس دلکش نعرے سے متاثر ہو گئے تھے، موثر تقریر کی۔ اس میں آپؑ نے فرمایا:

> "اگرچہ یہ بات مبنی برحقیقت ہے مگر اس سے جو مقصد و ارادہ اخذ کیا گیا ہے وہ محض باطل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حکم خدا کے لیے ہی مخصوص ہے لیکن ان لوگوں نے حکم کی جو تفسیر کی ہے اس سے مراد فرمانروا کا وجود نہیں درحالیکہ انسانوں کے لیے خواہ اچھے کام انجام دیتے ہوں یا برے، فرماں روا کا وجود ناگزیر ہے"۔ ③

---

① اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ ھُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ "فیصلہ کا سارا اختیار اللہ کو ہے، وہی امرِ حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔ (سورۂ انعام: آیت ۵۷)

② شوہر اور بیوی کے اختلاف کا ذکر سورۂ نساء کی آیت ۳۵ میں آچکا ہے اور ہم اس کا پہلے ذکر کر چکے ہیں لیکن احرام کی حالت میں اگر کوئی محرم دیدہ و دانستہ شکار کرے تو اسے چاہیے کہ کفارہ ادا کرے اور بطور کفارہ وہ جو جانور ذبح کرے اس کی حکمیت دو عادل انسان کریں۔ چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے: وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ (سورۂ مائدہ: آیت ۹۵) "احرام کی حالت میں شکار نہ مارو اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہے اسی کے ہم پلہ ایک اور جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے"۔

③ کلمة حق یراد بها باطل نعم انه لاحکم الا لله ولکن هولاء یقولون لا امرة الا لله انه لابد للناس من امیر من بر او فاجر.... (نہج البلاغہ: خطبہ ۸۰)

شورش وسرکشی

خوارج ابتداء میں بہت امن پسند تھے اور صرف لوگوں پر تنقید و اعتراض ہی کیا کرتے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ ان کا رویہ وہی تھا جو اُوپر بیان کیا جا چکا ہے، مگر آہستہ آہستہ انھوں نے اپنی راہ وروش بدلی۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ شورش وسرکشی پر اُتر آئے۔

ایک روز عبداللہ بن وہب راسبی نے انھیں اپنے گھر میں جمع ہونے کی دعوت دی اور ان کے سامنے نہایت ہی پُرجوش وولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے ذریعے انھیں شورش وسرکشی پر آمادہ کیا۔ اس ضمن میں اس نے کہا:

> ''بھائیو! اس جور وستم کی نگری سے نکل کر اچھا تو یہی ہے کہ پہاڑوں میں جا کر آباد ہو رہیں تاکہ وہاں سے ہم ان گمراہ کن بدعتوں کا مقابلہ کر کے ان کا قلع قمع کر سکیں''۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۳۵)

اس کے بعد حرقوص بن زہیر نے تقریر کی۔ ان دونوں کی تقاریر نے خوارج کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر کیا اور ان میں پہلے کی نسبت اب زیادہ جوش وخروش پیدا ہونے لگا۔ اگلا جلسہ زید بن حصین طائی کے گھر پر ہوا۔ اس نے مفصل تقریر کے بعد کہا:

> ''میں اپنے نظریئے میں دوسروں کی نسبت زیادہ محکم و پائیدار ہوں۔ اگر ایک شخص اس سلسلے میں میرا ساتھ نہ دے تو میں اکیلا ہی شورش کروں گا۔ بھائیو! تم اپنے چہروں اور پیشانیوں پر شمشیر کی ضربیں لگاؤ تاکہ خدائے رحمٰن کی اطاعت ہو سکے''۔ ①

اس کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی کہ بصرہ کے خوارج کو خط لکھا جائے تاکہ جتنی جلد ممکن ہو سکے وہ نہروان میں ان سے آن ملیں۔

اہلِ بصرہ نے مثبت جواب دیا اور کوفہ کے گروہ کے ساتھ آکر مل گئے۔ (الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۳۳، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۱۷۵، کامل: ج ۳، ص ۳۳۶)

---

① یا اخواننا اضربوا جباههم ووجوههم بالسیف حتی یطاع الرحمٰن عزوجل۔

بغاوت

خوارج نے اپنی تحریک کوفہ کے باہر راہزنی اور ناکہ بندی کے ذریعے شروع کی۔ قتل و غارت گری کو انھوں نے اپنا شعار بنایا اور جو لوگ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے حامی و طرف دار تھے ان کے ساتھ وہ دہشت پسندانہ سلوک کرنے لگے۔

اس اثناء میں انھیں دو شخص نظر آئے۔ ان میں سے ایک مسلمان تھا اور دوسرا عیسائی۔ عیسائی کو تو انھوں نے چھوڑ دیا مگر مسلمان کو اس جرم میں قتل کر دیا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کا طرف دار ہے۔ (الامامہ والسیاسۃ: ج ۱، ص ۱۳۳)

عبداللہ بن خباب سربرآوردہ شخص اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے کارپرداز تھے۔ وہ اپنی زوجہ کے ساتھ جا رہے تھے کہ خوارج سامنے سے آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی انھوں نے کہنا شروع کیا کہ اسی قرآن نے جو تیری گردن میں حائل ہے تیرے قتل کا حکم صادر کیا ہے۔

قتل ہونے سے پہلے عبداللہؓ نے کہا: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ میرے بعد کچھ عرصہ نہ گزرے گا کہ فتنہ و فساد کی لہریں ہر طرف پھیل جائیں گی۔ اس وقت بعض لوگوں کے دل حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور وہ اسی طرح مردہ ہو جائیں گے جیسے انسانی جسم۔ ایسے وقت میں بعض افراد رات کے وقت مومن ہوں گے لیکن دن کے وقت کافر۔ اس وقت تم خدا کے نزدیک مقتول بن کر رہ لینا (حق کی پاسبانی کرنا اس کام میں اگر تمھاری جان پر بن جائے) مگر قتل و خونریزی سے گریز کرنا۔ ①

عبداللہؓ نے حدیث بیان کر کے اس وقت مسلمانوں میں جو معاشرہ کارفرما تھا اس کی تصویر کشی کر دی تا کہ خوارج اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکیں، لیکن انھوں نے ان کے ہاتھ پاؤں اس بری طرح جکڑے کہ دیکھنے والے کے دل پر رقت طاری ہوتی تھی اور بہت زیادہ شکنجہ کشی اور آزار رسانی کے بعد انھیں نہر کے کنارے لے گئے جہاں انھوں نے انھیں بھیڑ کے مانند ذبح کیا۔ ان کی حاملہ زوجہ کو قتل کرنے کے بعد ان کا شکم چاک کیا اور نارسیدہ بچے کو بھی ذبح

---

① ستکون بعدی فتنۃ یموت فیھا قلب الرجل کما یموت بدنہ یمسی مومنا ویصبح کافرا فکن المقتول ولا تکن القاتل عند اللہ۔ (شرح نہج البلاغہ: خوئی، ج ۳، ص ۱۲۸، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۸۱)

کرڈالا۔ (شرح نہج البلاغہ: خوئی، ج ۴، ص ۱۲۷)

عبداللہؓ کا قتل جس بے رحمی سے کیا گیا اس پر ایک عیسائی شخص معترض ہوا۔ وہ باغبان تھا۔ اس وضع و کیفیت کو دیکھ کر وہ کچھ کھجوریں لے گیا اور قاتلوں کو پیش کیں جنھیں بغیر قیمت ادا کیے انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس پر اس عیسائی نے کہا کہ عجیب بات ہے کہ تم عبداللہؓ جیسے بے گناہ شخص کو قتل کر سکتے ہو اور بغیر قیمت ادا کیے کھجوریں کھانے میں تمھیں عذر ہے۔ [1]

معاویہ سے جنگ

حکمیت کی مدت اس وقت ختم ہوئی جب کوفہ و بصرہ میں خوارج جمع ہو رہے تھے۔ مذکورہ مدت کے ختم ہو جانے کے بعد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے خروراء میں معاویہ سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ! شہر میں آباد رہنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد آپؑ نے لوگوں کو جہاد کی جانب رغبت دلانے کی خاطر تقریر کی۔ آپؑ نے فرمایا:

> "اب تم جہاد کرنے دشمن کی جانب روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پیر کے دن نخیلہ نامی مقام پر عسکرگاہ میں تمھیں جمع ہونا ہے۔ ہم نے منصفین کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ وہ قرآن کی بنیاد پر فیصلہ کریں گے مگر تم نے دیکھ لیا کہ انھوں نے کلام اللہ اور سنت رسولؐ کے خلاف اقدام کیا۔ خدا کی قسم! میں ان سے جنگ کروں گا۔ اگر کسی نے بھی ساتھ نہ دیا تو میں تنہا ہی ان سے نبرد آزمائی کروں گا"۔ (شرح نہج البلاغہ: علامہ خوئی، ج ۴، ص ۱۲۸، اعیان الشیعہ: ج ۱، ص ۵۲۳)

اس کے بعد آپ نخیلہ کی جانب روانہ ہوئے اور بصرہ کے صوبہ دار کو خط لکھ کر اس سے مدد چاہی۔ جب خوارج کو یہ علم ہوا کہ سپاہِ اسلام "نخیلہ" میں جمع ہو رہی ہے تو انھوں نے حروراء میں قیام کرنا تحفظ کے اعتبار سے خلافِ مصلحت سمجھا اور اس جگہ کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ: خوئی، ج ۴، ص ۱۲۸، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۸۱، اعیان الشیعہ: ج ۱، ص ۵۲۲ (دس جلدیں مطبوعہ بیروت)، و کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۱۴۔

اس سے قبل کہ وہ اپنی قیام گاہ کو خالی کر کے چلے جائیں۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اتمامِ حجت کے طور پر انھیں خط لکھا اور انھیں یہ دعوت دی کہ وہ دیگر سپاہ کے ساتھ آن ملیں تا کہ معاویہ کی جانب روانہ ہو کر اس کے ساتھ جنگ کی جاسکے، مگر انھوں نے اس خط کا جواب نفی میں دیا۔ (الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۲۳)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام جب خوارج کو راہِ حق پر لانے میں مایوس ہو گئے تو آپؑ نے یہی فیصلہ کیا کہ انھیں ان کے حال پر ہی چھوڑ کر اصل مقاصد کی جانب روانہ ہوا جائے۔ چنانچہ! آپؑ نے نخیلہ میں بھی تقریر کا اہتمام کیا اور افواج کی معاویہ سے جنگ کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کی۔

اس ضمن میں آپؑ نے فرمایا: میں نے اہلِ بصرہ کو بھی خط لکھا ہے اور ہم ان کے پہنچتے ہی دشمن کی جانب روانہ ہوں گے۔ (حوالہ سابق)

بصرہ کی فوج جو تین ہزار دو سو سے زیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھی آن پہنچی۔ سپاہ کی مجموعی تعداد تقریباً اڑسٹھ ہزار ہوگئی۔ (تاریخ طبری: ج ۵، ص ۷۸، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۳۹)

اس سے پہلے کہ لشکر روانہ ہو بعض سپاہ نے دبی آواز میں کہنا شروع کیا:

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ پہلے خوارج سے جنگ کر لی جاتی اور جب ان کا کام تمام ہو جا . تو ہم صفین کی جانب رُخ کرتے"۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے انھیں اس امر کی جانب متوجہ کیا کہ معاویہ کے ساتھ جنگ کی کیا اہمیت ہے اور اسے کیوں مقدم سمجھنا چاہیے، نیز انھیں سمجھایا کہ فی الحال خوارج کے مسئلے کی طرف سے خاموشی اختیار کی جائے اور سر دست ان کا نام تک نہ لیا جائے۔

سپاہ نے جب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے یہ اقوال سنے تو کہا کہ فیصلہ کن اقدام کے لیے ہماری جانب سے آپؑ کو کُل اختیار ہے اور کہا کہ ہم ایک متحد جماعت اور آپؑ کے خیر خواہ ہیں، جس گروہ کی جانب لے جانے میں آپ خیر و صلاح سمجھیں اُدھر ہی ہمیں لے چلیں۔ (کامل: ج ۳، ص ۳۴۰)

خوارج کے ساتھ جنگ کی ضرورت

خوارج کی سرگرمیوں کے بارے میں انتہائی اختصار کے ساتھ اُوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کو جب ان کے مجرمانہ افعال کی خبریں ملیں تو اس کے بعد آپ نے ان کی طرف سے چشم پوشی کرنا اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا مناسب نہ سمجھا کیوں کہ یہاں مسئلہ اظہارِ خیال و رائے کا نہ تھا بلکہ معاشرے کے امن میں خلل اندازی اور شرعی حکومت کے خلاف مسلح گروہ کی بغاوت تھی۔ چنانچہ اس بنا پر آپؑ نے معاویہ سے جنگ کیے جانے کے فیصلہ کو بدل دیا۔

عبداللہؓ بن خباب کا قتل امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے لیے اس قدر گراں بار تھا کہ آپؑ نے ان خوارج کے سامنے جنھوں نے یہ اعتراف کیا کہ ہم ان کے قاتل ہیں فرمایا:

واللہ لو اقر اہل الدنیا کلھم بقتلہ بکذا وانا اقدر علی قتلھم بہ لقتلھم

"اگر خطۂ ارض کے تمام لوگ یہ کہیں کہ ہم ان کے قتل میں شریک ہیں اور میں ان کے خون کا بدلہ لے سکوں تو سب کو قتل کر ڈالوں گا"۔ (شرح نہج البلاغہ: علامہ خوئی، ج ۴، ص ۱۲۸، ابن ابی الحدید، ج ۲، ص ۲۸۲)

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے مزید اطلاعات حاصل کرنے کے لیے حارث بن مرہ کو خوارج کے پاس روانہ کیا۔ خوارج نے انھیں قتل کر دیا۔ ان کے اس اقدام نے سپاہ کو پہلے سے کہیں زیادہ متاثر اور غضب ناک کر دیا۔ چنانچہ سپاہ نے بلند آواز سے کہا:

تدع ھولاء القوم وارثنا یخلفوننا فی عیالنا واموالنا سر بنا الیھم فاذا فرغنا نھضنا الی (الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۲۷)

"اے امیرالمومنینؑ! کیا آپؑ انھیں اسی لیے بے مہار چھوڑے دے رہے ہیں کہ وہ ہمارے پیچھے ہماری عزت و ناموس اور مال و دولت کے ساتھ جو چاہیں کریں؟ پہلے آپؑ ہمیں ان کی طرف لے چلیے، ان سے نمٹنے کے بعد ہم شامی دشمن کی جانب روانہ ہوں گے"۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے بھی ان کی بات مان لی چنانچہ! آپؑ نے سپاہ کو ان کا

تعاقب کرنے کے لیے پل ① کے اس پار جانے کا حکم دیا۔ یہاں سے یہ لشکر دیر ابوموسیٰ کی جانب روانہ ہوا اور دریائے فرات کے کنارے نہروان ② نامی جگہ پر پڑاؤ ڈالا۔ راہ میں حضرت علی علیہ السلام کو یہ اطلاع دی گئی کہ خوارج پل پار کر کے آگے آچکے ہیں۔ اس موقع پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کے عقیدہ کو مستحکم کرنے، نیز اپنی معنوی عظمت کے بارے میں بتانے کی خاطر فرمایا:

> "ان کی قتل گاہ نہر کے اس طرف ہی ہے۔ خدا کی قسم اس جنگ و پیکار میں اگر ان کے دس آدمیوں نے نجات حاصل نہ کی تو تم میں سے بھی دس افراد قتل نہیں ہوں گے"۔ ③

جس وقت سپاہ دریائے فرات کے کنارے پہنچی تو معلوم ہوا کہ خوارج نے دریا پار نہیں کیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے نعرہ بلند کیا اور فرمایا: اللہ اکبر، صدق رسول اللہ۔

جنگ سے باز رہنے کے لیے کوشش

دونوں لشکر دریائے نہروان کے کنارے ایک دوسرے کے مقابل آچکے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے نبرد آزمائی سے قبل ہر ممکن کوشش کی کہ جنگ نہ ہو۔ چنانچہ آپؑ نے مندرجہ ذیل شرائط رکھیں:

① خوارج سے کہا کہ وہ عبداللہؓ بن خباب کے قاتلوں نیز شہدا کو ہمارے حوالے کر دیں تا کہ ہم تم سے دست بردار ہو کر شام کی جانب روانہ ہو جائیں۔ انھوں نے جواب دیا:
انا كلنا قتلنا سم كلنا ستحل لاما نكم ودمائهم "ہم سب ہی قاتل ہیں اور مزید یہ کہ تمھارا اور ان کا خون بہانا ہمارے لیے جائز و مباح ہے"۔ (الامامہ والسیاسہ:

---

① یہ پل دریائے طبرستان پر حلوان اور بغداد کے درمیان واقع تھا اور شاہراہ خراسان اسی پل سے گزرتی تھی۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۴۰۵)

② اس نام کے تین گاؤں تھے جو طول میں ایک دوسرے کے بعد آباد تھے، ان کی شناخت نہروان اعلیٰ، نہروان اوسط اور نہروان اسفل سے کی جاتی تھی۔ یہ گاؤں واسط اور بغداد کے درمیان آباد تھے۔

③ مصارعهم دون النطفة واللہ لا یفلت منهم عشرة ولا یهلك منكم عشرة۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۵۹)

ج۱،ص ۱۲۷)

۲ آپ نے یہ تجویز پیش کی کہ تم میں سے کون شخص آمادہ ہے کہ وہ قرآن مجید اٹھائے اور اس جماعت کو کلام اللہ کی جانب آنے کی دعوت دے۔ طائفہ بنی عامرؑ کے ایک نوجوان نے اپنی آمادگی کا اعلان کیا۔ انھوں نے قرآن پاک اپنے ہاتھ میں لیا اور خوارج کو اس کی جانب آنے کی دعوت دی۔ خوارج نے ان پر بھی تیروں کی بارش کردی۔ اگرچہ ان کے چہرے پر سب سے زیادہ تیر لگے تھے مگر اس کے باوجود وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک آگئے اور چند لمحے بعد ہی شہید ہوگئے۔ (شرح نہج البلاغہ: خوئی، ج۴،ص ۱۲۹)

۳ قیس بن سعد اور "ابوایوب انصاری" جیسے اصحاب نے بھی اتمامِ حجت کے طور پر خوارج کے سامنے تقاریر کیں۔ ان حضرات کے علاوہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام بذاتِ خود تشریف لے گئے اور آخری مرتبہ انھیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

مَیں تمھیں کل کے لیے آگاہ کیے دیتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملتِ اسلامیہ تمھیں لعنت ملامت سے یاد کرے کیوں کہ تمھارے جسم تو اسی نہر کے کنارے زمین پر گریں گے اور تم کوئی محکم دلیل یا سنت بطور سند اپنے بارے میں چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔

اس کے بعد آپؑ نے حکمیت کے افسوس ناک واقع اور اس سلسلہ میں اپنے نیز خوارج کے کردار اور اپنے ہی قول سے ان کی رُوگردانی و خلاف ورزی کے بارے میں تقریر کی۔ اس ضمن میں آپؑ نے فرمایا:

"اگرچہ حکمین نے کلام اللہ اور سنتِ رسولؐ سے منحرف و رُوگردان ہوکر اپنے نفسانی میلان کی بنیاد پر حکم جاری کیا مگر ہم اب بھی اپنی اس سابقہ روش پر قائم ہیں۔ اس کے بعد تم کہو کہ کیا کہنا چاہتے ہو اور کہاں سے آئے ہو؟[1]

۴ تقریر ختم کرنے کے بعد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے پرچم امن ابوایوب انصاریؓ کے حوالے کیا اور انھیں حکم دیا کہ اعلان کریں کہ جو شخص بھی اس کے نیچے آئے گا وہ امن

---

[1] فنبئوکم ومن این اتیتم؟ الامامہ والسیاسہ: ج۱،ص ۱۲۷۔ تاریخ طبری: ج۵، ص ۸۴، کامل: ج۳،ص ۳۴۳

وامان میں رہے گا۔ اس کے علاوہ جو کوئی شہر میں داخل ہوگا یا عراق کی جانب واپس چلا جائے گا وہ بھی امان میں رہے گا۔ ہمیں تمھارا خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ (الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۲۸، کامل: ج ۳، ص ۳۴۵، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۸۵)

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے جیسے ہی پرچم امان لہرایا تو بہت سے لوگوں نے باآواز بلند کہنا شروع کیا: اَلتَّوبَہ، اَلتَّوبَہ یَا اَمِیرَ الْمُؤمِنِینَ۔ چنانچہ اس کے بعد تقریباً آٹھ ہزار افراد مخالفت سے دست بردار ہوکر پرچم امان کے نیچے جمع ہوگئے۔ (شرح نہج البلاغہ: علامہ خوئی، ج ۴، ص ۱۳۵)

دو سپاہ کے درمیان جنگ

حضرت علی علیہ السلام نے اگرچہ صلح کی ہر ممکن کوشش کی مگر اس کے باوجود ان میں سے چار ہزار سے زیادہ خوارج باقی رہ ہی گئے۔ وہ عبداللہ بن وہب کے زیر فرمان اب بھی اپنے عقیدے پر پوری طرح قائم تھے اور اَلرَّوَاحَ، اَلرَّوَاحَ اِلَی الْجَنَّۃِ (بڑھتے چلو جنّت کی طرف) کے نعرے لگاتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام کے لشکر پر حملہ آور ہوگئے۔ (الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۲۸، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۴۶، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۸۶)

حضرت علی علیہ السلام نے بھی اپنی سپاہ کی صفیں آراستہ کیں۔ چنانچہ میمنہ پر حجرؓ بن عدی اور میسرہ پر شیثؓ بن ربعی کو متعین کیا، سوار فوج کی فرمان داری ابوایوبؓ انصاری اور پیادہ لشکر کی ابوقتادہؓ کے سپرد کی۔ قیسؓ بن سعد کو مدینہ کے لوگوں کا سردار مقرر کیا۔ ان کی تعداد بھی تقریباً آٹھ سو افراد پر مشتمل تھی۔ قلب لشکر میں آپؑ بذاتِ خود موجود رہے۔ (الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۲۸)

تیر اندازی خوارج کی جانب سے شروع ہوئی۔ چنانچہ جب ایک شخص کو خون آلود حالت میں آپؑ کے سامنے لایا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ حملہ کرو کہ اب اس گروہ کا قتل کرنا ہمارے لیے جائز ہے۔ ①

دونوں لشکر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے۔ شروع میں اگرچہ لشکرِ اسلام کے سوار فوج دشمن کے سنگین حملے کے باعث اپنے مقام سے پیچھے ہٹ گئے اور پوری صفِ لشکر سے الگ

---

① الان حل قتالھم احملوا علی القوم (مروج الذہب: ج ۲، ص ۴۰۵)

ہو گئے۔ خوارج اس پر تیر کی تیزی سے حملہ آور ہوئے۔ وہ قلب لشکر پر حملہ کرنے کے ارادے آگے بڑھے ہی تھے کہ یکا یک جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ تیر اندازوں کے اس دستے کو جو پہلے سے ہی اس مقام کی پشت پر متعین تھا جہاں سوار فوج کی جگہ مقرر کی گئی تھی۔ انھیں اپنے تیروں کا نشانہ بنایا اور اپنی طرف سے غافل و بے خبر پا کر ان پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ ایسا اچانک اور سخت تھا کہ ان کے لیے آگے بڑھنا ممکن تھا اور نہ ہی پیچھے ہٹنے کے لیے کوئی چارہ تھا۔ خوارج کا خیال تھا کہ سواروں کے لشکر نے ان کی طرف سے پشت کر لی ہے لیکن اس نے دائیں اور بائیں بازو کے پرے ساتھ لے کر انھیں اپنے درمیان زنبور کی طرح نرغے میں لے لیا اور دمِ شمشیر و نیزے کی نوک سے ان کی خوب خاطر و تواضع کی۔ قلب لشکر اسلام کے درمیان محاذ پر متعین دستے کو چوں کہ ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا وہ بھی ان کی سرکوبی کرنے کی غرض سے حملہ آور ہوا۔ دشمن کی فوج کے فرمان دار عبداللہ بن وہب کے علاوہ ذوالثدیہ، اخنس طائی، مالک بن وضاح وغیرہ جیسے دیگر فرمان دار لشکر، حضرت کی شمشیر کے باعث ہلاک ہوئے۔ (شرح نہج البلاغہ: علامہ خوئی، ج ۴، ص ۱۳۶، منقول از کشف الغمہ)

خوارج چونکہ سخت نرغے میں آ گئے تھے اسی لیے وہ اس میں بری طرح پھنس گئے اور دو گھنٹے بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ وہ زمین پر اس طرح گرنے لگے جیسے خزاں کے دنوں میں درختوں سے پتے گرتے ہیں۔ گویا یہ بھی کوئی کُن فَیَکُون کی طرح تکوینی حکم تھا جس کے تحت ان سے کہا گیا کہ مر جاؤ اور وہ مر گئے۔ چار ہزار افراد میں سے صرف نو شخص یعنی شہدائے اسلام کی تعداد کے برابر اپنی جان بچا کر بھاگ گئے اور اس طرح امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

جنگ کے بعد

جنگ ختم ہو جانے کے بعد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے حکم دیا کہ ذوالثدیہ کی تلاش و جستجو کریں (رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ نہروان میں مقتولین کی جو خصوصیات بتائی تھیں وہ اس شخص میں موجود تھیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کی جستجو اس لیے کرائی تھی کہ حق کی روشن دلیل اور تائید حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام واضح ہو جائے)۔ سپاہی اس کی لاش تلاش کرنے کے لیے نکلے مگر

ناکام واپس آ گئے۔ اس کے بعد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام خود اس کی لاش نکالنے کے لیے تشریف لے گئے۔ کچھ دیر بعد اس کی لاش دیگر مقتولین کی لاشوں کے نیچے سے نکل آئی۔ اسے دیکھ کر آپؑ مسرور ہوئے اور فرمایا:

"اللہ اکبر! میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی بات کبھی غلط نہ پائی۔ رسولؐ خدا نے فرمایا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ چھوٹا ہوگا جس میں ہڈی نہ ہوگی۔ اس کے ایک طرف پستان جیسا گوشت کا گولہ ابھرا ہوگا، جس پر پانچ یا سات بال اُگے ہوئے ہوں گے"۔

جس وقت امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے یہ تمام خصوصیات دیکھیں تو آپؑ فوراً سجدے میں تشریف لے گئے اور خدا کا شکر بجالائے۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۴۰۶)

اس کے بعد آپؑ گھوڑے پر سوار ہوئے اور مقتولین کی لاشوں کے پاس سے گزرے اور فرمایا:

افسوس! تمھارے اور اس کے حال پر جس نے تمھیں مغرور کیا اور اس حال کو پہنچا دیا۔

دریافت کیا گیا کہ کس شخص نے اُنھیں مغرور کیا؟

آپؑ نے فرمایا: شیطان اور نفس امارہ انھیں غرور کی جانب لے گیا۔ آرزوؤں نے انھیں فریب دیے، نافرمانیاں انھیں حسین وجمیل نظر آئیں اور فتح ونصرت کے وعدے نے انھیں اپنا فریفتہ کر لیا۔ (نہج البلاغہ: کلمات قصار، ص ۳۲۳)

حضرت علی علیہ السلام نے وہ ہتھیار اور چوپائے جو میدانِ جنگ میں بطور مالِ غنیمت ہاتھ آئے تھے سپاہ کے درمیان تقسیم کر دیے۔ خوارج کا باقی سامان، ان کی کنیز وغلام وغیرہ کوفہ واپس آنے کے بعد ان کے وارثوں کے حوالے کر دیا۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۴۰۶)

اصل دشمن کی جانب توجہ

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے خوارج کی سرکوبی کے بعد جدوجہد کے اصل محاذ اور اسلام کے دفاع کی جانب رُخ کیا۔ اس جدوجہد کی خصوصیت واہمیت بتانے، معاویہ کے خلاف جہادِ مقدس کی لشکر اسلام کو ترغیب دلانے اور عوام کو معاویہ کی حکومت کے عواقب وانجام سے باخبر کرنے

کی غرض سے آپؑ نے تقریر کی اور فرمایا:

"اے لوگو! جب فتنہ وفساد کی لہریں ہر طرف پھیل چکی تھیں اور اس کا بحران اپنے انتہائی درجہ کو پہنچ چکا تھا اس وقت کسی میں اتنی جرأت و ہمت نہ تھی کہ میدانِ کارزار میں داخل ہوتا اس وقت میں ہی ایسا شخص تھا جس نے اس فتنے کو خاموش کر دیا۔ یاد رکھو فتنوں میں سب سے زیادہ بھیانک خطرہ بنی اُمیہ کے فتنے کا ہے۔ یہ فتنہ سیاہی اور اندھیرے کا فتنہ ہے اور جب اس کا سایہ پھیل جائے گا تو اس کی بلا خاص طور پر نیک لوگوں پر نازل ہوگی...... ان کے اذیت ناک مظالم تم پر سالہا سال تک جاری رہیں گے، ان پر تمھارا فاتح ہونا اتنا ہی اہم ہے جتنا غلاموں کا اپنے مالک پر غالب آنا یا پیروکاروں کا اپنے پیشوا پر غلبہ حاصل کر لینا...... اس وقت قریش یہ چاہیں گے ان کے پاس جو کچھ اس دنیا میں ہے اسے خرچ کر کے بس ایک بار اسے دیکھ لیں۔ اگرچہ وقت چند لمحات پر منحصر ہے بس اتنا ہے جتنا ایک اُونٹ کو نحر کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ آج وہ چیز جس کا صرف ایک حصّہ میں ان سے مانگ رہا ہوں اور وہ نہ دینے پر بضد ہیں۔ کل اسے دینے کے لیے اصرار کریں گے اور یہ چاہیں گے کہ میں اسے قبول کرلوں"۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۴۰۶)

غالیوں کا وجود (۱)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنی حقانیت ثابت کرنے، خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں بالخصوص خوارج کو جگانے اور چند دیگر مصلحتوں کی بنا پر بہت سے غیبی مسائل کی پیش گوئی کرنا شروع کر دی لیکن کچھ کم ظرف لوگوں نے آپؑ کے بارے میں مبالغے سے کام لیا۔ وہ خوارج

---

(۱) غلات اور غالیہ حضرت علی علیہ السلام کے عقیدت مندوں کا وہ گروہ تھا جس نے آپؑ کے بارے میں اس قدر مبالغے سے کام لیا کہ دائرۂ مخلوق سے نکال کر اُلوہیت کے سراپردے تک لے آیا۔ (ملل ونحل شہرستانی: ج ۱، ص ۲۳۷)

کے عین مقابل آگئے اور چوں کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی غیر معمولی عقل ونظر اور دانش و بینش سے وہ حیرت زدہ و مرعوب تھے اسی لیے وہ آپؑ کو حدِ انسانیت اور مخلوقیت سے بالاتر سمجھنے لگے اور آپؑ کی اُلوہیت کے قائل ہو گئے۔

حضرت علی علیہ السلام کے نظریے کے مطابق دونوں ہی گروہ ہلاکت و بدبختی سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ خود فرماتے ہیں: "میرے معاملے میں دو شخص ہلاک ہوئے۔ ایک وہ جس نے مبالغہ کیا اور دوسرا میرا بدخواہ دشمن"۔ ①

ایک روز امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام تقریر فرما رہے تھے، سامعین میں سے ایک شخص جو آپؑ کا والہ و شیدائی تھا اپنی جگہ سے اُٹھا اور کہنے لگا: اَنْتَ اَنْتَ۔

آپؑ نے فرمایا: افسوس! تیرے حال پر میں کیا کہوں۔

اس نے کہا: اَنْتَ اللہ۔

یہ سن کر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے حکم دیا کہ اسے اور اس کے ہم عقیدہ ساتھیوں کو گرفتار کرلیا جائے۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۵)

غلات جو غیب کی باتیں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے سنتے تھے انھی میں مشہور کر دیتے اور کہتے کہ ایسے کاموں کا کرنا خدا کے علاوہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ اسی بنا پر حضرت علی علیہ السلام خدا ہیں یا کوئی ایسی شخصیت ہیں جس کے وجود میں ذاتِ خداوندی حلول کر گئی ہے۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید: ج ۵، ص ۷)

جنگ نہروان کا نتیجہ

جنگ نہروان کا خاتمہ اگرچہ خوارج کی سرکوبی پر ہوا لیکن اس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ نہایت مضر اور اندوہناک ثابت ہوئے جن میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

① اس جنگ میں مقتول کی تعداد چونکہ بہت زیادہ تھی اس لیے سپاہِ عراق کے دلوں پر بہت زیادہ خوف و ہراس غالب آگیا اور باہمی اختلافات کی بنا پر وہ دو گروہ میں تقسیم ہو گئے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جن کے عزیز و اقربا اس جنگ میں مارے گئے تھے وہ

---

① ھَلَکَ فِیَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ غَالٍ وَمُبْغِضٌ قَالٍ (نہج البلاغہ، کلمات قصار: ص ۱۱۷)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے سخت بدگمان ہو گئے۔

④ لشکرِ اسلام میں سرکشی اور نافرمانی کا جذبہ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سپاہ یہ بہانہ بنا کر جنگ کی کوفت دُور کر رہے ہیں حضرت علی علیہ السلام کے فرمان بجالانے میں سُستی اور کاہلی سے کام لینے لگی۔ بالخصوص اس وقت جب کہ وہ جنگ سے واپس آ کر اپنے خاندان کی گرم آغوش میں پہنچے اور اہلِ خاندان کے چہروں پر غم واندوہ کے آثار دیکھے۔ یہ عامل نیز اس کے ساتھ ہی دیگر عوامل اس امر کا باعث ہوئے کہ انھوں نے ہمیشہ کے لیے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا اور معاویہ کے ساتھ آشتی کرنے کو اس کے ساتھ جنگ کرنے پر ترجیح دینے لگے۔

مورخین نے لکھا ہے کہ جب جنگِ نہروان ختم ہو گئی تو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنی سپاہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

"خداوند تعالیٰ نے تمھیں آزمایا اور تم اس کے امتحان میں پورے اُترے اسی لیے اس نے تمھاری مدد کی اب تم جلدی سے معاویہ اور اس کے ظالم وستم گر ساتھیوں سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ انھوں نے کلام اللہ کو پسِ پشت ڈال دیا ہے اور نہایت معمولی قیمت پر دشمن سے سازباز کر لی ہے"۔

یہ سن کر ساتھیوں نے کہا: امیر المومنینؑ! ہماری طاقت اب جواب دے چکی ہے۔ ہمارے زرہ بکتر پارہ پارہ ہو چکے ہیں، تلواریں ٹوٹ چکی ہیں اور نیزوں کی نوکوں میں خم آ گئے ہیں۔ ہمیں وطن جانے کی اجازت دیجیے تاکہ وہاں ہم اپنا اسلحہ تیار کر سکیں۔ وہاں رہ کر کچھ وقت خوشی وخرمی میں بسر کریں اور اپنے ساتھیوں کی تعداد میں اضافہ کریں۔ ایسی صورت میں ہم دشمن کا بہتر طور پر مقابلہ کر سکیں گے۔ (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید: ج۵، ص۷)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام جانتے تھے کہ واپس جانے کا کیا انجام ہوگا، لیکن جب آپ نے اکثریت کو اس نفاق انگیز نظریے کی جانب مائل دیکھا تو مجبوراً ان کے ساتھ اتفاق کیا اور نخیلہ کی جانب واپس آ گئے یہاں آپؑ نے سپاہ کو تاکید کر دی کہ وہ اپنی لشکرگاہ کو (چھاؤنی) کو چھوڑ کر نہ جائیں۔ اہل وعیال کی جانب کم توجہ دیں، اللہ کے جہاد کے لیے تیاری کرتے رہیں۔

سپاہ میں سے چند لوگ ہی ایسے تھے جنھوں نے حضرت علی علیہ السلام کی ہدایات پر عمل کیا۔ چنانچہ! چند روز تک یہاں قیام کرنے کے بعد آہستہ آہستہ اپنے اپنے گھروں کی جانب واپس جانے لگے جہاں انھوں نے آرام کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ ①

جہاد کی دعوت

جب حضرت علی علیہ السلام کوفہ واپس تشریف لے آئے تو آپؑ نے ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو معاویہ سے جہاد کرنے کی ترغیب دلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ! ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے آپؑ نے فرمایا:

> ”اے لوگو! اس دشمن کی جانب روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ، جس کے ساتھ جنگ کرنا خداوند تعالیٰ کی قربت کا سبب ہے۔ وہ لوگ جو امرِ حق سے رُوگرداں ہو چکے ہیں، کلام اللہ سے دُور ہیں اور دین کے کاموں میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ درحقیقت اندھیرے اور گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے خلاف تم جتنے سپاہی اور گھوڑے فراہم کر سکتے ہو مہیا کر لو اور خداوند تعالیٰ پر بھروسہ کرو“۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی تقریر کا لوگوں پر ذرا بھی اثر نہ ہوا اور جنگ پر جانے کے لیے انھوں نے کوئی آمادگی ظاہر نہیں کی۔ حضرت علی علیہ السلام نے انھیں چند دنوں کے لیے ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس عرصے میں آپؑ نے قوموں کے سرداروں کو دعوت دی اور ان کا نظریہ جاننا چاہا۔ بعض نے عذر و بہانہ بنایا۔ کچھ نے رضایت کا اظہار کیا مگر چند لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اس دعوت کو قبول کیا۔ (الامامہ والسیاسہ: ج۱، ص۱۲۹)

> امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دوبارہ عوام کے اجتماع میں کھڑے ہوئے اور فرمایا:
> ”اے اللہ کے بندو! میں جب بھی حکم دیتا ہوں آخر تم کیوں زمین سے چپک کر بیٹھ جاتے ہو؟ کیا آخرت کی زندگی کے مقابلے میں اس چند روزہ دنیا کی

---

① الامامہ والسیاسہ: ج۱، ص۱۲۸، تاریخ طبری: ج۵، ص۸۹، کامل ابن اثیر: ج۳، ص۳۴۹۔ طبری لکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سے یہ گفتگو اشعث نے کی تھی۔

خوشیوں پر فریفتہ ہو گئے ہو؟ عزت کے بجائے تم نے ذلت و خواری کو اختیار کرلیا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ میں تمھیں جب بھی جہاد کی دعوت دیتا ہوں تم آنکھیں پھیرنے لگتے ہو؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم موت کے کنارے آپہنچے ہو یا تمھارے دل سراسیمہ و پریشان ہیں جو کچھ نہیں سکتے۔ آنکھیں بند ہیں جو دیکھ نہیں سکتیں، شاباش! تم اور تمھاری دلیری پر، فرصت کے لحات میں تم گویا جنگل کے شیر ہو اور جب تمھیں جنگ کے لیے دعوت دی جائے تو لومڑیوں کی طرح فرار کرنے لگتے ہو۔ اب مجھے تم پر اعتماد نہیں رہا"۔ ①

حضرت مالک کا صوبہ دارِ مصر کی حیثیت سے تقرر

مالک اشترؓ بااثر و رسوخ سردار اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے محکم و طاقت ور سپہ سالار نیز آپؑ کے سچے حامی و طرف دار تھے۔ حضرت عثمان کے قتل کے بعد وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور بیعت کرتے وقت بہت ہی پریشانی کے عالم میں کہا تھا کہ کیا ان تین افراد کے بعد بھی آپؑ زمامِ حکومت سنبھالنے کے لیے تیار نہیں"۔ (کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۲۹، تاریخ طبری: ج ۵، ص ۹۰، الامامہ والسیاسہ: ج ۱، ص ۱۲۹، غارات: ج ۱، ص ۳۵)

اس کے اگلے دن مسجد میں لوگوں کے درمیان جو حضرت علی علیہ السلام کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے آئے تھے، انھوں نے کہا تھا:

"یہ پیغمبروںؑ کے وصی اور علمِ انبیاءؑ کے وارث اور وہ بزرگ ہستی ہیں جو سخت آزمائشوں سے گزرے ہیں۔ کلام اللہ اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپؑ کے رضوانِ بہشت ہونے کی شہادت دی ہے۔ آپؑ وہ ہیں جو فضائل کے اعتبار سے کمال کی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ آپؑ کی نیک طینتی اور دانش مندی کے بارے میں ان لوگوں کو بھی شک نہ تھا جو اس دنیا سے گزر چکے ہیں اور جو

① ان میں سے کچھ نے بیماری کا بہانہ بنایا اور خود کو بیمار ظاہر کیا، حالانکہ وہ بیمار نہ تھے بلکہ وہ جنگ سے فرار چاہتے تھے۔

آیندہ آئیں گے وہ بھی اس پر یقین کریں گے، آپ لوگ اُٹھیے اور آپؑ کے دستِ مبارک پر بیعت کیجیے"۔ (الامامہ والسیاسہ: ج۱،ص ۴۷)

اس کے بعد وہ ہر جگہ اور ہر مرحلے پر اپنی لاثانی اور بے نظیر بہادری کے باعث ہمیشہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دوش بدوش رہے۔ ان کے اثر و رسوخ اور سیاسی تدبر کا اندازہ اس فرمان سے لگایا جاسکتا ہے جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ان کے نام حکومتِ مصر تفویض کرتے ہوئے جاری کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خطوط جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے ان کے نام تحریر فرمائے تھے، نیز وہ مراکز جن کی فرماں روائی انھوں نے قبول کی تھی ان کے حسنِ تدبر و معاملہ فہمی کے آئینہ دار ہیں۔ (تاریخ یعقوبی: ج ۲،ص ۱۷۹)

جنگ صفین اور واقعۂ حکمیت کے بعد سپاہِ عراق میں بتدریج کمزوری اور پراگندگی کے باعث لوگوں کے درمیان بالخصوص دار الخلافت سے دُور دراز کے علاقوں میں استقامت و پائیداری کا وہ جذبہ جس سے خوشی و نشاط حاصل ہوتی ہے نیز معاویہ سے جنگ کرنے کا جوش و خروش آہستہ آہستہ سرد ہونے لگا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو اطلاع ملی کہ معاویہ کا حامی و طرف دار معاویہ بن خدیج نامی ایک شخص مصر میں حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اس نے وہاں کے امن و امان کو درہم برہم کر دیا ہے۔ صوبہ دار محمدؓ بن ابی بکر کی حیثیت و منزلت کو متزلزل اور وہاں کے لوگوں کا زندہ رہنا سخت دشوار کر رکھا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فیصلہ کیا کہ صوبہ دار کا تبادلہ کر لیا جائے۔ مالک اشترؓ چونکہ نصیبین میں مامور تھے اور جنگ صفین کے بعد وہ واپس وہاں چلے گئے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے انھیں بلایا اور مصر سے متعلق مسائل کے بارے میں انھیں سمجھا کر محمدؓ بن ابی بکر کی جگہ مقرر کر دیا اور اس ضمن میں فرمایا: "تمھارے علاوہ اس جگہ کے لیے کوئی اور اہل و شائستہ نہیں اس لیے اس طرف روانہ ہو جاؤ"۔ [1]

---

[1] مصر کی فرمان داری پر مامور ہونے سے قبل حضرت مالک اشتر موصل، نصیبین، دارانجار، آید، ہیت اور عانات کے والی رہ چکے تھے۔ (شرح نہج البلاغہ: ناصر مکارم، ج ۳،ص ۳۵۵)

اس کے ساتھ ہی آپؑ نے وہاں کے لوگوں کے لیے مراسلہ روانہ کیا جس میں مرقوم فرمایا:

"بندۂ خدا علیؑ امیر المومنین کی جانب سے، مسلمانانِ مصر کو معلوم ہو کہ جب لوگوں نے خطۂ ارض پر حکمِ خدا سے رُوگردانی کی تو انھوں نے اس کے غضب کو دعوت دی...... میں ایک ایسے بندۂ خدا کو تمھاری طرف روانہ کر رہا ہوں جو خوف و ہراس کے دنوں میں چین کی نیند نہیں سوتا، سخت و بحرانی وقت میں وہ دشمن سے خوف زدہ نہیں ہوتا اور وہ بدکار لوگوں کے لیے آگ سے زیادہ سوزناک ہے۔ اس کا نام مالکؓ بن حارث ہے"۔ ①

مالک اشترؓ کی شہادت

مالک مصر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ کوفہ میں مقیم معاویہ کے جاسوسوں نے اس واقعے کی اطلاع اسے دے دی۔ معاویہ جانتا تھا کہ اگر مالک مصر پہنچ گئے تو وہ اس پر قبضہ کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ! اس نے خفیہ طور پر علاقۂ قلزم ② کے تحصیل دار کے نام فرمان جاری کیا:

"جس طرح بھی ممکن ہو سکے مالک کو مصر پہنچنے سے قبل ہی قتل کر دے اور اس سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو تادمِ حیات اس علاقے کا لگان معاف کر دیا جائے گا"۔

اس پُرفریب فرمان کو جاری کرنے کے بعد اس نے دعاگوئی کے لیے ایک جلسہ طلب کیا تا کہ حاضرین جلسہ مالک کی تباہی کے لیے دُعا کریں کہ اگر کہیں اس کا یہ حربہ کامیاب ہو گیا تو وہ

---

① اس بارے میں اختلاف ہے کہ حضرت مالک اشترؓ کو محمدؓ ابن ابی بکر کی شہادت سے قبل صوبہ دار مقرر کیا گیا یا اس واقعے کے بعد مورخین کے نزدیک یہی قول مشہور و معتبر ہے۔ اس کے علاوہ نہج البلاغہ کا مکتوب ۳۴ جو محمدؓ بن ابی بکر کو لکھا گیا تھا اور اس میں انھیں بتایا تھا کہ ان کا تبادلہ کس وجہ سے عمل میں آیا ہے اور اس امر کی تائید کرتا ہے، لیکن علامہ مفید مرحوم نے اپنی کتاب امالی میں دوسرے قول کو قابلِ قبول قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: الغارات: ج ۱، ص ۲۵۴، حاشیہ)

② الغارات: ج ۱، ص ۲۵۸، شرح نہج البلاغہ: ابن ابی الحدید، ج ۶، ص ۷۶۔

لوگوں کو یہ کہہ کر خوش فہمی میں مبتلا کرسکے کہ ان کی موت تمھاری دعاؤں کے اثر سے واقع ہوئی ہے۔

حضرت مالک جب قلزم پہنچے تو وہ ایک شخص (۱) جو ان کی ہلاکت کے لیے مامور کیا گیا تھا، ان کے پاس آیا اور انھیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ حضرت مالکؓ نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ میزبان نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام اور آپؑ کی حکومت کی تعریف کے ایسے پل باندھے کہ مالکؓ کو اس پر اعتماد ہوگیا۔ اس نے دسترخوان بچھایا اور شہد کا شربت جس میں مہلک زہر ملا ہوا تھا، سامنے لاکر رکھ دیا۔ مالکؓ نے اسے پیا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہیں شہید ہوگئے۔ (الغارات: ج ۱، ص ۲۵۹، ۲۶۴)

اس شہادت کے باعث امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کو بہت قلق ہوا مگر معاویہ کو بڑی مسرت ہوئی۔ مالکؓ کی شہادت کے بعد دونوں نے جو باتیں ان کے بارے میں کہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک عظیم سانحہ تھا۔

قبیلۂ نخع کے چند سردار پرسہ دینے کے لیے حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے آپؑ کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: آپؑ مالکؓ کی شہادت سے سخت مضطرب خاطر تھے۔

اس موقع پر آپؑ نے فرمایا: اس شہادت کا اجر خدا ہی دے گا۔ مالکؓ کی کیا تعریف کروں، خدا کی قسم! اگر اسے پتھر سے بھی تراشا گیا ہوتا تو وہ یکتا و ممتاز زمانہ ہوتا۔ اگر وہ پتھر کا بھی انسان ہوتا تو ایسا ہی محکم اور ارادے کا مضبوط ہوتا کہ کوئی سواری اس کے کہسار وجود سے بالاتر نہ ہوسکتی۔ کوئی پرندہ اس کی عظمت کے اوج بلندی سے نہیں گزرسکتا۔ (۲)

معاویہ حضرت مالکؓ کا جانی دشمن تھا، جب اس نے یہ خبر سنی کہ وہ شہید ہوگئے ہیں تو اس نے کہا کہ علیؑ کے دو ہاتھ تھے ان میں سے ایک تو جنگ صفین میں قطع ہوگیا وہ تھا عمارؓ اور دوسرے

---

(۱) یہ مصر کے راستے میں ایک بستی تھی یہاں سے مصر کا فاصلہ تین دن کا تھا۔ (معجم البلدان: ج ۴، ص ۳۸۸)

(۲) مالك وما مالك! والله لو كان جبلا لو كان فندا ولو كان حجراً لكان صلدا لا يرتقية الحافی ویرق۔ (نہج البلاغہ: کلمات قصار، ۴۴۳، الغارات: ج ۱، ص ۲۹۵۔ الغارات کے مصنف نے یہ واقعہ قدرے مختلف طور پر بیان کیا

ہاتھ مالکؓ اشتر تھا جو آج شہید ہو گیا۔ (1)

مصر پر لشکر کشی

معاویہ کو جب معلوم ہوا کہ عراق کی سپاہ نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے حکم سے رُوگردانی کی ہے اور آرام طلبی وتن پروری کو اس نے اپنا شعار بنا لیا ہے تو اس نے عمرو بن عاص، ضحاک بن قیس، بُسر بن ارطاۃ اور ابوالاعور سلمی جیسے مشاورین کو اپنے پاس بلایا اور ان کے ساتھ مشورہ کیا۔ اتفاق رائے اس بات پر ہوا کہ وہ علاقے جو حضرت علی علیہ السلام کی قلمرو حکومت میں شامل ہیں حملہ کر کے ان پر قبضہ کر لیا جائے۔

اس وقت مصر چونکہ خاص اہمیت کا حامل تھا (جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ منطقہ عراق کے مقابلے میں شام سے نزدیک تر ہے اور وہاں کے اکثر و بیشتر لوگ حضرت عثمان کے مخالف تھے اس لیے بھی معاویہ کو اس منطقہ کی طرف سے تشویش لاحق رہتی تھی۔ اس کے علاوہ مصر پر قبضہ ہو جانے کے بعد محصول کی آمدنی میں اضافہ ہو سکتا تھا اور وہاں کی انسانی طاقت کو حضرت علی علیہ السلام کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا)۔ اسی لیے اس نے یہ خاکہ تیار کیا کہ حضرت عثمان کے طرف دار ان عناصر کو جو مصر میں ہیں بروئے کار لائیں اور لشکر کشی کا آغاز وہاں سے کیا جائے۔ اس سے قبل کہ وہ اس طرف اپنی فوجی طاقت روانہ کریں۔ انھوں نے معاویہ بن خدیج اور مسلمہ بن مخلد جیسے اپنے ہوا خواہوں کو خط لکھا اور اس میں اس بات کا تذکرہ کیا کہ کثیر تعداد میں میری سپاہ جلد ہی تمھاری مدد کے لیے پہنچ جائے گی۔ (شرح نہج البلاغہ: ابن ابی الحدید، ج ۶، ص ۸۱)

اس کے بعد اس نے تقریباً چھے ہزار سپاہی عمرو بن عاص کی سرکردگی میں روانہ کیے۔ اس کی چونکہ دیرینہ آرزو تھی کہ اس منطقہ پر حکمرانی کرے اسی لیے اس طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت عثمان کے طرف دار بھی بصرہ سے چل کر اس کے ہمراہ ہو گئے۔ اس سے قبل کہ وہ شہر میں داخل ہوں، عمرو بن عاص نے محمدؓ بن ابی بکر کو خط لکھا جس میں انھیں یہ تنبیہ کی کہ اس سے پہلے کہ شام کی سپاہ تمھارا سر تن سے جدا کر دے تم خود ہی اپنے عہدے سے برطرف ہو جاؤ اور بصرہ سے نکل کر

---

(1) کانت لعلی بن ابی طالبْ یدان یمینان فقطعت احداھما یوم صفّین یعنی عمار وقطعت الاخری الیوم وھو مالک اشتر (الغارات: ج ۱، ص ۲۶۴، کامل ابن اثیر: ج ۳)

کسی بھی طرف چلے جاؤ۔

محمدؓ بن ابی بکر نے اپنے خط کے ساتھ عمرو بن عاص کا مراسلہ اور معاویہ کا عریضہ حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں روانہ کر دیا اور آپؑ سے مدد کے طالب و خواستگار ہوئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے محمدؓ بن ابی بکر کو جو خط لکھا اس میں آپؑ نے انھیں ہدایت کی تھی کہ استقامت اور پائیداری سے کام لیں اور شہر کی حفاظت کے پورے انتظامات کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے حکم دیا کہ کنانہ بن بشر کو، چونکہ آزمودہ، باتجربہ اور جنگجو سردارِ سپاہ ہیں۔ حملہ آوروں کی جانب روانہ کیا جائے اور مصر میں بھی اپنے لوگوں کو جو بھی سواری میسر آسکے اس کے ہمراہ تمھاری طرف روانہ کروں۔ (الغارات: ج ۱، ص ۲۷۶، ۲۸۰، شرح نہج البلاغہ: ابن ابی الحدید، ج ۵، ص ۸۲، ۸۵، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۵۶)

اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

''نابغہ زادہ ① کثیر سپاہ لے کر مصر پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوا ہے۔ محمدؓ بن ابی بکر اور دیگر مصری بھائیوں کو تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس کی داد و فریاد کو پہنچو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مصر تمھارے ہاتھ سے نکل جائے۔ اگر یہ ملک تمھارے ہاتھ میں رہے تو باعثِ عز و شرف ہے اور تمھارے دشمنوں کی کمزوری اور ناتوانی کا سبب، کل ہماری وعدہ گاہ ہے جرعہ کی فوجی چھاؤنی''۔ ②

حضرت علی علیہ السلام دوسروں سے پہلے ہی سپاہ کی لشکرگاہ (چھاؤنی) میں تشریف لے گئے۔ وہاں آپؑ نے ظہر کے وقت تک انتظار کیا جو لوگ وہاں پہنچے ان کی تعداد سو سے بھی کم تھی۔ مجبوراً کوفہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ جب رات ہوئی تو آپؑ نے قبائل کے سرداروں کو بلایا اور فرمایا:

''خدا کی حمد و تعریف کے بعد! قضا و قدر نے میرے باعث تمھیں آزمائش میں مبتلا کیا۔ لوگو! میں نے جب بھی تمھیں حکم دیا تم نے اس کی اطاعت نہیں کی اور جب بھی میں نے تمھیں اپنی طرف آنے کی دعوت دی تم نے اسے

---

① عمرو بن عاص کی ماں کا نام تھا۔

② یہ جگہ کوفہ کے باہر حیرہ و کوفہ کے درمیان واقع ہے۔

قبول نہ کیا...... اپنی مدد اور راہِ حق میں جہاد کرنے کے لیے تم کس چیز کے منتظر ہو؟ موت چاہتے ہو یا ذلت خواری...... کیا تمھارے پاس وہ دین و ایمان نہ رہا جو تمھیں متحد کر سکے۔ کیا اب تم میں وہ غیرت وحمیت باقی نہ رہی جو تمھیں جہاد کی جانب جانے کے لیے ترغیب دلا سکے...... کیا یہ بات باعثِ حیرت نہیں کہ معاویہ پست فطرت، ظالم و جفا کار لوگوں کو جمع کرنے کے لیے کہے اور وہ اس کے گرد جمع ہو جائیں اور صلہ و انعام کی تمنا کیے بغیر اس کی اطاعت و پیروی کریں لیکن اس کے برعکس جب میں تم کو جو اسلام اور ہمت و مردانگی کی یادگار رہ گئے ہو، اپنی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں تو میری مخالفت کرتے ہو۔ تم مجھے اکیلا نہ چھوڑو اور انتشار و پراگندگی سے گریز کرو"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۱۸۰، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید: ج۶، ص۹۰، الغارات: ج۱، ص ۲۹۰)

حضرت علی علیہ السلام کی تقریر نے مالکؓ بن کعب کی غیرت کو للکارا۔ وہ جمع کے درمیان سے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ جہاد پر جانے کے لیے تیار ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خدمت گزار سعد سے کہا کہ لوگوں میں جا کر منادی کریں اور مالکؓ کے ہمراہ مصر کی جانب روانہ ہوں۔

چنانچہ! ایک ماہ گزر جانے کے بعد مالکؓ کے گرد دو ہزار افراد جمع ہو گئے تو مصر کی جانب انھوں نے کوچ کیا۔ پانچ روز تک سفر کرنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے نمایندے نے یہ اطلاع پہنچائی کہ محمدؓ بن ابی بکر شہید ہو گئے۔ یہ خبر سن کر مالکؓ، حضرت علی علیہ السلام کے حکم کے بموجب واپس کوفہ آ گئے۔ (الغارات: ج۱، ص ۲۹۲-۲۹۳، شرح نہج البلاغہ: ابن ابی الحدید: ج۶، ص۹۱)

محمدؓ بن ابی بکر کی شہادت

محمد بن ابی بکر کو جب حضرت علی علیہ السلام کا خط ملا تو انھوں نے معاویہ اور عمرو بن عاص کو تند لہجے میں قطعی جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی سپاہ کو دعوت دی کہ حملہ آوروں سے جنگ و پیکار کریں۔ جن لشکروں نے نبرد آزمائی کا اعلان کیا ان کی تعداد تقریباً دو ہزار افراد ہو گئی۔ چنانچہ! انھیں کنانہ بن بشر کی زیر قیادت و فرمان داری دشمن کی جانب روانہ کیا اور خود بھی دو ہزار

افراد کو ساتھ لے کر ان کے پیچھے کوچ کیا۔ پہلے ہی قصبے میں شام کی پیش گام سپاہ نے پے در پے حملوں کے باعث مصر کی مختصر دفاعی قوت کا قلع قمع کر دیا۔ عمرو بن عاص نے معاویہ بن خدیج کو پیغام بھیجا اور اس سے مدد طلب کی۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ معاویہ بن خدیج نے میدانِ کارزار کو لشکریوں سے بھر دیا۔

مصریوں کے مخالف اپنی پوری طاقت کے ساتھ کنانہ کے مقابل جمع ہو گئے۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ دشمن کے ہر طرف سے سخت دباؤ کے باعث وہ اپنے گھوڑے کو حرکت نہیں دے سکتے تو وہ چھلانگ لگا کر زمین پر گر گئے۔ ان کے ساتھی بھی انھیں دیکھ کر گھوڑوں سے اُتر گئے۔ کنانہ جس وقت دشمن کے سپاہیوں کو بری طرح کچل رہے تھے، یہ آیت ان کی زبان پر تھی:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا

"کوئی ذی روح، اللہ کے اذن کے بغیر مر نہیں سکتا، موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے"۔ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۴۵)

کنانہؓ بن بشر کی شہادت کے بعد محمدؓ بن ابی بکر کے اطراف سے فرمان داری کا سلسلہ چونکہ ٹوٹ چکا تھا اس لیے جو سپاہ باقی رہ گئی تھی وہ منتشر و پراگندہ ہو گئی۔ ناچار انھوں نے بھی ایک ویرانے میں پناہ لی۔ مصر کے شورش پسندوں کے رہبر ابن خدیج نے ان کی تلاش شروع کی اور انھیں اس ویرانے میں چھپا ہوا پایا اور گرفتار کیا۔ پہلے شمشیر سے سر کو تن سے جدا کیا۔ اس کے بعد جسم کو مرے ہوئے گدھے کی کھال میں بھر کر آگ لگا دی۔ (الغارات: ج ۱، ص ۲۸۲، شرح نہج البلاغہ: ابن ابی الحدید: ج ۶، ص ۸۶، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۵۷)

جب محمدؓ بن ابی بکر کے قتل کی خبر معاویہ اور عمرو بن عاص کے پاس ملکِ شام پہنچی تو انھوں نے انتہائی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا۔ عبداللہ ابن مسیب کا کہنا ہے کہ جس قدر خوشی اور مسرت کا اظہار کیا گیا ایسی خوشی و مسرت و شادمانی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ (الغارات: ج ۱، ص ۲۸۲، شرح نہج البلاغہ: ابن ابی الحدید، ج ۶، ص ۸۶، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۵۷)

لیکن ان کی شہادت کی خبر جب امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو ملی تو آپؑ نے فرمایا:

"ان کے قتل کیے جانے کا غم واندوہ اتنا ہی ہے جتنا معاویہ کو اس کا سرور۔ جب سے میں نے میدانِ کارزار میں قدم رکھا مجھے کسی کے قتل کیے جانے کا

اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ میرے اپنے گھر میں پل کر جوان ہوا اور میں نے اسے اپنی اولاد کی طرح سمجھا، وہ میرا حقیقی خیر خواہ تھا۔ ایسے شخص کی وفات پر جس قدر رنج و غم منایا جائے بجا ہے۔ خدا سے دُعا ہے کہ وہی اس کی جزا عطا کرے"۔ (مروج الذہب)

لوگوں کی سرزنش

محمدؓ بن ابی بکر کی رقت انگیز شہادت اور لوگوں کی پے درپے تباہ کاریوں کے باعث امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام بہت زیادہ آزردہ خاطر ہوئے۔ چنانچہ! جب یہ اطلاع ملی کہ عمرو بن عاص نے مصر پر قبضہ کرلیا تو آپؑ نے واضح طور پر لوگوں کو سخت وسست کہنا شروع کر دیا اور فرمایا:

"تم وہ لوگ ہو جو کسی کے خون کا بدلہ لینے میں میری مدد نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی گتھی اُلجھ جائے تو تم اسے سلجھا نہیں سکتے۔ پچاس دن سے زیادہ میں تمھارے سامنے داد و فریاد کرتا رہا کہ بھائیو! آؤ اور میری مدد کرو مگر تم اس اُونٹ کی طرح بلبلاتے رہے جو دردِ شکم کے مارے تڑپ رہا ہو۔ تمھاری حالت اس شخص کی سی ہے جو راہِ جہاد میں تو نکلے مگر یہ سوچ کر کہ اس کام سے مجھے حاصل کیا ہوگا۔ زمین پکڑے بیٹھے رہے یہاں تک کہ تم ہی میں سے ایک مختصر سپاہ کی جماعت تھی جنھیں دیکھ کر لگتا تھا کہ خود کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں، افسوس تمھاری حالتِ زار پر"۔ (الغارات: ج ۱، ص ۲۹۷)

حضرت علی علیہ السلام کے رنج و اندوہ کا یہ عالم تھا کہ زندگی سے بیزاری اور یہ آرزو کرنے لگے کہ جس قدر جلد ہو سکے موت آجائے تاکہ ان لوگوں کی ہم نشینی کے سخت و سنگین بار سے نجات ملے۔

حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عباسؓ کو جو خط مرقوم فرمایا تھا اس میں آپؑ نے اس احساسِ کرب کا اظہار اس طرح کیا تھا:

"مصر کو دشمن نے فتح کرلیا، محمدؓ بن ابی بکر شہادت سے ہمکنار ہوئے...... میں

نے لوگوں کو بار بار ان سے ہم دوش ہونے اور ان کی مدد کرنے کی ترغیب دلائی اور کہا: اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے، تم ان کی دادو فریاد کو پہنچو، چند لوگ تیار بھی ہوئے مگر بددلی کے ساتھ کچھ عذر و بہانہ کر کے علیحدہ ہو گئے اور بعض نے تو ان کی مدد کرنے سے قطعی ہاتھ اٹھا لیا اور گھروں میں گھس گئے۔ میں تو خدا سے یہی دعا کر رہا ہوں کہ مجھے ان لوگوں کے چنگل سے نجات دلائے اور ان سے رہائی کی کوئی سبیل نکل آئے۔

خدا کی قسم! دشمن کے ساتھ جنگ و پیکار کرتے وقت شہادت کی آرزو نہ ہوتی اور میں نے راہِ خدا میں خود کو مرنے کے لیے آمادہ نہ کر لیا ہوتا تو میں اس بات کو ترجیح دیتا کہ ایسے لوگوں کا ایک دن بھی منہ نہ دیکھوں اور ان کے پاس سے بھی نہ گزروں"۔ (نہج البلاغہ: مکتوب ۳۵، الغارات: ج۱، ص ۲۹۸)

نہروان کے بعد

وحشت پسند اور غارت گر گروہ

معاویہ کو اس اقتدار کے باوجود جو اس نے حاصل کیا تھا اور اس اثر و رسوخ کے بعد بھی جو اس کا شام کے لوگوں پر ہو گیا تھا نیز سپاہ عراق میں ہر طرح سے انتشار و پراگندگی پیدا کر کے بھی یہ اطمینان نہ تھا کہ اگر وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے مرکز حکومت پر حملہ کرے گا تو وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے جنگ صفین کے دوران جو ہولناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور حضرت علی علیہ السلام کی تلوار کے جن حملوں کو اس نے برداشت کیا تھا وہ اس امر کے متقاضی نہ تھے کہ ایسا کوئی اقدام کرے، اسے اب تک جو کامیابی نصیب ہوئی تھی وہ سب حیلہ و نیرنگ کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ اس کے ساتھیوں نے جب یہ تجویز پیش کی کہ کوفہ پر حملہ کیا جائے تو اس نے اس کا جواب نفی ہی میں دیا۔ اس ضمن میں اس نے کہا:

> "عراق کے لوگوں کو شکست دینے کے لیے پراگندہ فوجی دستے عراق کے مختلف علاقوں میں سرکشی و غارت گری کرتے رہیں کیوں کہ یہی ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے ہمارے حامی و طرفدار بتدریج طاقت ور ہوتے چلے جائیں گے اور عراق کا محاذ شکست و ریخت اور خوف و خطر میں مبتلا رہے گا۔ جب عراق کے اشراف و سربرآوردہ لوگ یہ کیفیت دیکھیں گے تو وہ خود ہی حضرت علی کا ساتھ چھوڑ کر ہماری طرف آنے لگیں گے"۔

اس فیصلے کے بعد اس نے نعمان بن بشیر، سفیان بن عوف، عبداللہ بن سعدہ اور ضحاک بن قیس جیسے فرمان داروں کی زیر قیادت سپاہ کے دستے منظم کیے اور انھیں عراق کے مختلف علاقوں میں روانہ کیا تاکہ اس فرمان کو جس میں مسلمانوں کے لیے تباہی و بربادی اور خوف و وحشت کے عناصر شامل تھے، جاری و ساری کر سکے۔

ہم یہاں ان ہلاکت بار تجاوزات کی درد انگیز داستان بیان کرنے کے ساتھ ہی ان افراد کا مختصر تعارف کرائیں گے جو ان دستوں کے سرغنہ و سردار تھے۔

① نعمان بن بشیر

یہ انصار اور طائفۂ خزرج میں سے تھا۔ عثمان کے زمانے میں جو شورشیں ہوئیں ان میں اس نے خلیفۂ وقت کا ساتھ دیا۔ حضرت عثمان کے قتل کے بعد ان کا خون آلود کرتہ وہ ملک شام میں لے کر گیا اور معاویہ کو پیش کیا اور یہیں سے وہ معاویہ کا حامی وطرفدار ہوا۔ معاویہ کی طرف سے کچھ عرصہ حاکمِ کوفہ بھی رہا اور اس کے بعد اسے حمص کا حاکم مقرر کیا گیا۔

معاویہ نے اسے ۳۹ ہجری میں دو ہزار افراد کے ساتھ "عین التمر"① کی جانب روانہ کیا۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے فوجی محافظ دستے پر جو تقریباً سو افراد پر مشتمل تھا، اس نے حملہ کیا۔ دلاور مدافعین نے اپنی تلواروں کی نیامیں توڑ کر پوری پامردی و جانبازی سے دفاعی مقابلہ کیا۔ اس عرصے میں تقریباً پچاس افراد ان کی مدد کے لیے وہاں آن پہنچے۔ نعمان کے سپاہیوں کو یہ گمان گزرا کہ مدافعین کے پاس مدد کے لیے جو لشکر پہنچا ہے اس کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ! راتوں رات وہ اس جگہ سے بھاگ نکلے اور شام کی جانب رُخ کیا۔

② سفیان بن عوف

اسے معاویہ کی طرف سے اس مقصد کے تحت مقرر کیا گیا تھا کہ عراق کے بعض مقامات پر حملہ کرے۔ معاویہ نے رخصت کرتے وقت اسے یہ تاکید کی تھی:

> "تمھارے سامنے کوئی بھی ایسا شخص آئے جو تم سے متفق و ہم خیال نہ ہو، اسے بے دریغ قتل کر دینا، تمھارے سامنے جو بھی بستیاں آئیں انھیں ویران کرتے چلے جانا، لوگوں کے مال و متاع کو لوٹ لینا کیونکہ لوٹ مار بھی قتل کرنے کے برابر ہی ہے بلکہ بعض اوقات غارت گری قتل سے زیادہ

① یہ کوفہ کے مغرب میں شہر انبار کے نزدیک بستی تھی۔ (معجم البلدان: ج ۴، ص ۱۷۶، الغارات: ج ۲، ص ۴۳۵، طبری: ج ۲، ص ۱۳۳، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۷۵، شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۳۰۱، ۳۰۵)

جاں گداز و مہلک ثابت ہوتی ہے"۔

چلتے وقت اسے یہ ہدایت بھی کی کہ پہلے شہر "ہیت"① پر حملہ کرنا، اس کے بعد انبار اور مدائن کے شہروں پر قبضہ کرنا۔

سفیان بن عوف چھے ہزار سپاہیوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوا۔ جب شہر ہیت میں اسے کوئی نظر نہ آیا تو اس نے شہر انبار پر یورش کی۔ محافظین شہر کو کثیر تعداد میں قتل کرنے کے بعد اس نے شہر میں کشت و کشتار اور غارت گری کا بازار گرم کیا اور بہت سا مال جمع کر کے وہ شام کی طرف واپس آ گیا۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۸۵، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۷۶، الغارات: ج ۲، ص ۴۷۴)

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو جب اس واقعے کی اطلاع ملی تو آپؑ نے جہاد کی فضیلت کے بارے میں مفصل تقریر کی اور بتایا کہ جو لوگ اس اسلامی فرض سے رُوگردانی کرتے ہیں وہ کیسے ناگوار نتائج سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں آپؑ نے فرمایا:

"میں شب و روز، پنہاں و آشکارا تمھیں اس گروہ سے برسرِ پیکار ہونے کی دعوت دیتا رہا۔ میں نے تمھیں یہ ہدایت کی کہ اس سے پہلے وہ تمھارے ساتھ نبرد آزما ہوں تم انھی پر وار کر دو...... لیکن تم نے سُستی سے کام لیا اور فرضِ جہاد کو ایک دوسرے پر ٹالتے رہے۔ چنانچہ! نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ تم پر ہر طرف سے پے در پے حملے کیے جانے لگے۔ تمھیں غارت گری کا نشانہ بنایا جانے لگا اور اب تمھاری زمین و جائداد کے مالک دوسرے لوگ ہو گئے ہیں۔ یہ شخص جس نے اپنی سپاہ کو ساتھ لے کر شہر انبار پر حملہ کیا۔ "غامد" قبیلے کا ہے اس نے فرمان دار شہر، حسان بن حسان بکری کو قتل کیا اور تمھاری سپاہ کو اس نے ان کی عسکر گاہوں سے باہر نکال دیا ہے۔

مجھے یہ اطلاع ملی کہ ان میں سے ایک شخص ایک مسلم خاتون اور اس اہلِ کتاب عورت کے گھر میں، جو مسلمانوں کی زیرِ حمایت زندگی بسر کرتی تھی، داخل ہوا

① یہ شہر دریائے فرات کے کنارے بغداد اور انبار کے درمیان واقع تھا۔ (معجم البلدان: ج ۵، ص ۴۲۰)

اور ان کے زیورات ان کے جسموں پر سے اُتار لیے۔ اس کے بعد بہت سا مال جمع کر کے وہ اور اس کے ساتھی واپس چلے گئے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان غارت گروں میں سے نہ تو کوئی زخمی ہوا اور نہ ہی کسی کے خون کا قطرہ زمین پر گرا۔ اس واقعے کے بعد اگر ایک سچا مسلمان غم و افسوس کے باعث مر جائے یا ڈوب مرے تو بجا ہے اور وہ قابلِ سرزنش بھی قرار نہ دیا جائے گا"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۲۷)

۳ عبداللہ بن سعد

ابتداء میں وہ حضرت علی علیہ السلام کے حامی و طرف داروں میں سے تھا لیکن دنیا پرستی کے باعث کچھ عرصہ بعد معاویہ سے جاملا اور اس کا شمار حضرت علی علیہ السلام کے سخت ترین دشمنوں میں کیا جانے لگا۔ معاویہ نے اسے سترہ سو افراد کے ساتھ "تیما"[1] کی جانب روانہ کیا اور یہ حکم دیا کہ جس بستی سے بھی گزرنا اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرنا اور جو شخص ادا کرنے سے منع کرے اسے قتل کر ڈالنا۔

عبداللہ مکہ اور مدینہ کے شہروں سے گزرا، جب حضرت علی علیہ السلام کو اس کی روانگی کی اطلاع ملی تو آپؑ نے مسیب بن نجبہ فزاری کو دو ہزار افراد کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ تیما میں دونوں حریف لشکر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ دونوں کے درمیان سخت معرکہ ہوا جس کے باعث شامی لشکر کا فرمان دار زخمی ہوا اور سدہ راتوں رات شام کی جانب بھاگ گیا۔[2]

۴ ضحاک بن قیس

وہ معاویہ کی فوج کا فرمان دار تھا۔ وہ کچھ عرصہ تک محافظین شہر دمشق کا صدر امین رہا اور بعد میں کوفہ کی حکومت بھی اسے تفویض کی گئی۔ اس نے معاویہ کے حکم پر تین ہزار سپاہیوں کو ساتھ لے کر سرزمین ثعلبیہ کی جانب رُخ کیا۔ اس کے گرد و نواح کے ان تمام قبائل کو اس نے اپنی غارت

---

[1] یہ بستی شام کے اطراف میں شام اور وادی القریٰ کے درمیان اس راستہ پر واقع ہے جہاں سے شام و دمشق کے حجاج گزر کر مکہ پہنچتے تھے۔ (معجم البلدان: ج ۲، ص ۶۷)

[2] تاریخ طبری: ج ۵، ص ۱۳۴، کامل ابن اثیر: ج ۳، ص ۳۷۶، تاریخ یعقوبی: ج ۲، ص ۱۹۶۔

گری کا نشانہ بنایا جو حضرت علی علیہ السلام کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ اس کے بعد وہ کوفہ کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں اسے قطقطانہ ① نامی علاقے میں عمرو بن عمیس سے سامنا ہوا۔ وہ زیارت حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے جارہے تھے۔ ضحاک بن قیس نے انھیں اور ان کے قافلے کو لوٹ لیا اور انھیں اپنے مقصد کی طرف جانے سے روکا۔ ②

حضرت علی علیہ السلام نے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے حجرؓ بن عدی کو چار ہزار سپاہیوں کے ہمراہ روانہ کیا۔ حجر کا ضحاک سے تدمر ③ نامی مقام پر مقابلہ ہوا جس میں سپاہ شام کے انیس سپاہی مارے گئے۔ اس کے بعد ان کی سپاہ فرار کر کے شام کی جانب چلی گئی۔ (تاریخ طبری: ج ۵، ص ۱۳۵، الغارات: ج ۲، ص ۴۲۵)

⑤ بُسر بن ارطاۃ

قبیلۂ قریش میں سے تھا۔ عراق و حجاز کی جانب معاویہ نے جو فرمان دار روانہ کیے تھے ان میں اس کا شمار خونخوار ترین فرمان دار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ رخصت کرتے وقت معاویہ نے اس سے کہا تھا:

> "مدینہ پہنچنے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ راستے میں لوگوں کو منتشر و پراگندہ کرتے رہنا۔ جو بھی سامنے آئے اسے خوف زدہ ضرور کرنا۔ جو لوگ تمھاری اطاعت سے انکار کریں ان کے مال و متاع کو تباہ و غارت کر دینا"۔

بُسر بن ارطاۃ تین ہزار افراد کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ جس بستی سے بھی گزر جاتا وہاں کے مویشیوں پر قبضہ کر لیتا اور انھیں اپنے لشکریوں کے حوالے کر دیتا۔ مدینہ پہنچ کر اس نے تقریر کی جس میں دل کھول کر مسلمانوں پر سخت نکتہ چینی کی اور جو نہ کہنا تھا وہ کہا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں مجبور کیا کہ اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ بہت سے گھروں کو نذرِ آتش کرنے کے

---

① یہ کوفہ کے راستے میں ایک بستی تھی جہاں حجاج قیام کرتے تھے۔ یہ خزیمہ سے پہلے اور شقوق کے بعد حجاج کی منزل گاہوں پر واقع تھی۔

② تاریخ طبری: ج ۵، ص ۱۳۵۔ لیکن ثقفی نے الغارات کتاب میں لکھا ہے کہ ضحاک بن قیس نے عمرو بن عمیس نیز اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔

③ تدمر سرزمین شام کا قدیم شہر تھا۔ یہ جگہ شہر حلب سے پانچ دن کے سفر پر واقع تھی۔ (معجم البلدان)

بعد ابو ہریرہ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خود مکہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں قبیلۂ خزاعہ کے بہت سے لوگوں کو تہہِ تیغ کر ڈالا اور یہاں سے وہ "سراح" کی جانب روانہ ہوا جہاں اس نے حضرت علی علیہ السلام کے حامی و طرف داروں کو قتل کر ڈالا۔ نجران اور یمن میں اس نے کشت و کشتار کا خوب بازار گرم کیا۔ یہی نہیں بلکہ فرمان دارِ یمن عبید اللہؓ بن عباس کے دو کم سن بچوں کے سر تک اس نے اپنے ہاتھ سے قلم کیے۔ قتل و غارت گری اور کشت و کشتار کا بازار گرم کرنے اور تقریباً تیس ہزار کو تہہِ تیغ کرنے کے بعد وہ واپس ملکِ شام پہنچ گیا۔ ①

حضرت علی علیہ السلام کا ردعمل

حضرت علی علیہ السلام کو جب بُسر بن ارطاۃ کے بزدلانہ حملوں کا علم ہوا تو آپؑ نے لوگوں کو اس کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور فرمایا:

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ بُسر نے یمن پر قبضہ کر لیا ہے، خدا شاہد ہے کہ مجھے اس بات کا علم تھا کہ یہ لوگ جلد ہی تم پر غالب آ جائیں گے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ باطل پر تو ہیں مگر یکجا ہیں، اس کے برعکس تم حق پر ہو مگر منتشر و پراگندہ تمہارے راہبر و پیشوا نے تمہیں راہِ حق پر چلنے کے لیے کہا مگر تم نے نافرمانی کی۔ وہ آج باطل پر ہیں مگر اپنے سردار کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔

وہ اپنے راہبر کے ساتھ امانت داری سے کام لیتے ہیں اور تم خیانت کرتے ہو، وہ اپنے شہروں میں اصلاح کے کام کر رہے ہیں اور تم فساد بپا کیے ہوئے ہو۔ میں تمہارے پاس اگر قدح (پیالہ) بھی بطورِ امانت رکھوں تو اس بات کا احتمال ہے کہ اس کے گرد کوئی ڈوری بندھی ہوئی ہو تو وہ بھی چرا لی جائے گی"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۲۵)

اہلِ کوفہ نے پہلے کی طرح اب بھی حضرت علی علیہ السلام کے فرمان پر اپنی سرد مہری دکھائی۔ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد آپؑ نے ایک ہزار افراد پر مشتمل لشکر جاریہ بن قدامہ کی سرکردگی میں ترتیب دیا جسے ساتھ لے کر جاریہ بصرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حجاز کے راستے سے وہ یمن پہنچے۔

---

① الغارات: ج ۲، ص ۰ و دیگر بعد کے صفحات، نیز شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۱۷، الغانی: ج ۱۶، ص ۲۶۶

بُسر کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ جاریہ کا لشکر حرکت میں ہے۔ چنانچہ! اس نے یمامہ کی سمت کو ترک کر کے اپنا رُخ دوسری طرف موڑ لیا۔ جاریہ منزل گاہ پر اُترے بغیر تیزی کے ساتھ ان کا تعاقب کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ بُسر ان کے خوف سے کبھی ایک طرف فرار کر جاتا اور کبھی دوسری جانب یہاں تک کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی قلمرو حکومت سے باہر چلا گیا۔ لوگوں نے جب اس طرح فرار ہوتے ہوئے اسے دیکھا تو اچانک اس پر حملہ کر دیا۔ جاریہ کے خوف نے اس کو ایسا سراسیمہ و وحشت زدہ کیا کہ اس کو نہ تو تحفظ و دفاع کا ہوش رہا اور نہ ہی اس مال کو وہ اپنے ساتھ لے جا سکا جسے اس نے قتل و غارت گری سے جمع کیا تھا۔ بُسر کا مقابلہ کیے بغیر جاریہ واپس کوفہ تشریف لے آئے۔ (شرح ابن ابی الحدید: ج ۲، ص ۱۶)

معاویہ کے حملوں کا نتیجہ

شام کے جن شرپسندوں نے فتنہ و فساد کے بیج بوئے تھے ان کے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کی سرحدوں پر پے در پے حملے، سخت نقصان دہ نتائج کا باعث ہوئے۔ ان میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

① وہ اسلامی معاشرہ جس میں اب امن و سکون بحال ہونے لگا تھا دوبارہ بدامنی اور بحرانی کیفیات کا شکار ہونے لگا۔ خوارج کا فتنہ ابھی دبا ہی تھا، بصرہ و کوفہ میں بھی معاویہ کی تحریک پر شرپسند حملہ آوروں نے مدینہ، مکہ، یمن اور دیگر شہروں میں فتنہ و فساد بپا کرنا شروع کر دیا۔

② وہ بزدل اور سُست عقیدہ لوگ اس خوف و خطر کے باعث جو اس وقت ماحول پر مسلط تھا یہ سوچنے لگے کہ حکومت اس قابل نہیں کہ امن بحال کر سکے اور معاویہ کے حملہ آور ہر جگہ اپنا قبضہ کر لیں گے اسی لیے وہ معاویہ کی جانب چلے گئے۔

③ دیگر عوامل کے ساتھ غارت گردستوں کے حملے اس امر کا باعث ہوئے کہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام جنگِ نہروان کے بعد اپنی منتشر و متفرق فوجی طاقت کو تیزی کے ساتھ یکجا نہ کر سکے۔ نیز ایسے محکم و مضبوط فوجی، سیاسی اور اقتصادی تشکیلات بھی وجود میں نہ آسکیں جن کے باعث معاویہ کا مقابلہ کیا جا سکتا۔

۴ وہ لوگ جو حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے حامی اور طرف دار تھے، کثیر تعداد میں بزدلانہ حملوں میں قتل ہوئے۔ قبیلۂ ہمدان کے سب ہی افراد حضرت علی علیہ السلام کے پیرو و معتقد تھے۔ وہ بُسر کے حملوں کا شکار ہوئے جس میں سارے مردوں کو قتل کر دیا گیا اور عورتوں کو بُسر کی قید میں ڈال دیا گیا اور یہ اوّلین مسلم خواتین تھیں جنھیں بُردہ فروشوں کے بازار میں لایا گیا۔

دو متضاد سیاسی روشیں

اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ چند نمونے اس سیاسی روش و حکمت عملی کے ہیں جو معاویہ نے مطلق اقتدار حاصل کرنے اور حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کو تباہ و برباد کرنے کے لیے اختیار کی تھی۔ ہم اس کے مقابل امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی انصاف پسندانہ و عدل گسترانہ سیاسی راہ و روش دیکھتے ہیں۔ چنانچہ! جس وقت جاریہ بن قدامہ کو حضرت علی علیہ السلام رخصت کرنے لگے تو آپؑ نے یہ نصیحت کی:

> ''صرف جنگجو لوگوں سے ہی جنگ کرنا، تمھیں چاہیے مجبوراً پیدل سفر طے کرنا پڑے مگر عوام کے چوپایوں پر ہرگز نظر مت رکھنا، جب تک کنوؤں اور چشموں کے مالک اجازت نہ دے دیں، تم راستے میں کسی کنویں اور چشمے کا پانی استعمال نہ کرنا، کسی مسلمان کو فحش بات نہ کہنا، جس سے تمھارا عہد و پیمان ہو جائے اس کے ساتھ عہد شکنی کر کے ظلم نہ کرنا اور ذرّہ برابر خون ناحق نہ بہانا''۔ (تاریخ یعقوبی: ج۲، ص۲۰۰)

جب ہم ان دو متضاد روشوں کا باہمی موازنہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان میں سے پہلی قتل و غارت گری پر مبنی ہے اگرچہ یہ حکمت عملی بظاہر لوگوں کے مال و حقوق کا احترام کرتی ہے مگر چونکہ پہلا طریقہ جس راہ سے گزر کر منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے وہ اُصول و ضوابط کے کسی دائرے میں نہیں آتا۔ اس کے برعکس قانونی حدود اور انسانی قدریں دوسرے گروہ کی راہ میں چونکہ مانع و حائل ہوتی ہیں اسی لیے وہ اسے ہر ناجائز و ناروا کام کو انجام دینے سے روکتی ہیں۔

حق گوئی اور عدل پسندی جیسی خصوصیات کی پابندیوں کے باعث حضرت علی علیہ السلام کی سپاہ

کے دنیا پرست افراد نے جہاد جیسے مقدس فرض کو انجام دینے میں سُستی و سہل انگاری سے کام لیا کیونکہ وہ اپنے سامنے ایسی جنگ دیکھتے تھے جس کا اجر اس دنیا میں ان کے لیے موت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر وہ جنگ میں کامیاب ہوتے تو دشمن کے مال پر قبضہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کسی دشمن کو نہ تو اپنی مرضی سے قتل کر سکتے تھے اور نہ ہی اس کے بیوی بچوں کو اپنی قید میں رکھ سکتے تھے۔ جب یہ شرائط و پابندیاں عائد ہوں تو جنگ کس لیے کریں؟ جنگ کے محرکات میں احکامِ خداوندی کی پابندی اور انسانی فضائل پیشِ نظر رکھے جاتے تو ان کے لیے جنگ کرنا اُمرلا حاصل تھا۔ اس کے برعکس اہلِ شام معاویہ کی ایک آواز پر فوراً لبیک کہتے، کیوں کہ جنگ سے ان کی تمام حیوانی جبلتوں کو آسودگی ملتی جسے بھی وہ چاہتے قتل کر دیتے، کنیز و غلام بنا لیتے، قتل و غارت گری ہی ان کی آمدنی کا ذریعہ و وسیلہ تھا۔ بالخصوص اہلِ شام میں ان لوگوں کے جن کی تربیت اسلامی اُصول کے مطابق نہیں ہوئی تھی۔

حضرت علی علیہ السلام نے کوفہ کے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے اس کی جانب اشارہ کیا اور فرمایا تھا:

> انی لعالم بما یصلحکم ویقم اودکم ولکنی لا اری اصلاحکم بافساد نفسی (نہج البلاغہ: خطبہ ۶۹)
>
> ''جس چیز سے تمھاری اصلاح ہوتی ہے اور جو چیز تمھاری کجی کو درست کرتی ہے میں اس سے واقف ہوں لیکن تمھاری اس اصلاح کو اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف اور ناجائز سمجھتا ہوں''۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ریاکار سیاست مندوں کی راہ و روش اختیار کرنے کے بجائے ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ عراق کے عوام کی اصلاح کے ذریعے عام لوگوں کے ضمیر میں اس جذبے کو بیدار کرتے رہیں۔ نیز اسلامی معاشرے کی کمزوری اور دشمن کی طاقت کے عوامل کی جانب توجہ دلا کر انھیں اصلاحِ نفس و تہذیب اَخلاق کی تعلیم دیں تا کہ ان کی کمزوریوں کو دُور کر کے انھیں دعوتِ حق قبول کرنے کی صلاح دی جا سکے۔

حضرت علی علیہ السلام کے خطبات و ہمدردانہ نصائح میں وہ تمام انسانی محرکات اور مادی و معنوی پہلو موجود ہیں جن میں عراق کے عوام کی فلاح و بہبود مضمر تھی۔ چنانچہ! ہر درد و غم اور ہر کمزوری و

ناتوانی کا علاج ان پر کار بند رہ کر ہی کیا جا سکتا تھا اور اسی میں ان کی فلاح و بہبود پنہاں تھی۔

کوئی بھی بشر، وہ علم و اقتدار کے اعتبار سے کسی بھی مقام و منزلت پر ہو، حضرت علی علیہ السلام جیسی بصیرتِ نظر کے ساتھ اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا تھا جو اس وقت عراق و شام پر مسلط و حکم فرما تھی۔ اپنے رہبر کے حکم سے رُوگرداں ہو کر اور جہاد جیسے مقدس فرض سے کنارہ کشی کر کے عراق کے لوگوں کی کیا سرنوشت ہو سکتی تھی اسے حضرت علی علیہ السلام سے بہتر کوئی دوسرا شخص بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آپؑ نے بہترین دستورِ عمل پر کار بند رہنے کی ہدایت فرمائی تھی جس سے ان کی حالت فلاح و بہبود پا سکتی تھی۔

آپؑ کی نظر میں عراق کے عوام ان سے کہیں بدتر تھے جنھیں معاویہ جنگ و پیکار کے لیے بھیجا کرتا تھا کیوں کہ وہ دوستی کا لبادہ پہن کر آپؑ کے پرچم کے نیچے جمع ہوتے اور ہواخواہی و طرف داری کا دم بھرتے لیکن اس کے ساتھ اس جنگ میں جو اہلِ شام کی طرف سے شروع کی جاتی وہ دفاعی اِقدام نہ کرتے۔ وہ ہر لحہ و ہر لحظہ کوئی نہ کوئی بہانہ تراشتے رہتے۔ کبھی کہتے کہ موسم بہت گرم ہے، اتنی تو مہلت دیجیے کہ دن کی تمازت ذرا کم ہو جائے اور کبھی یہ کہنے لگتے کہ موسم بہت سرد ہے اس وقت تک کے لیے صبر کیجیے کہ موسم معتدل ہو جائے۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۲۷)

جب حضرت علی علیہ السلام انھیں یہ کہہ کر لاجواب کر دیتے کہ سردی و گرمی تو تمھارے لیے ایک بہانہ ہے۔ خدا کی قسم! تم اس قدر کاہل و بزدل ہو چکے ہو کہ اگر تلوار تمھارے رُوبرو آجائے تو اسے دیکھ کر فرار کر جاؤ گے۔

اس پر وہ کہتے کہ ہم اس صورت میں ہی میدانِ کارزار کی طرف جا سکتے ہیں کہ جنگ میں آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں۔

ان کی یہ شرائط اس حالت میں تھی جب کہ مرکزی حکومت کو حضرت علی علیہ السلام کی سخت ضرورت تھی۔ اس پر حضرت علی علیہ السلام فرماتے:

> ”کیا ان حالات کے تحت میرے لیے میدانِ جنگ کی جانب روانہ ہونا مناسب ہے؟ تمھاری یہی شرط کافی ہے کہ میں اپنے ایک دلاور اور قابلِ اعتماد فرمان دار کا انتخاب کروں اور اس کے ہمراہ تمھیں جنگ پر روانہ

کروں"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۱۱۹)

حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں جب تک عنانِ حکومت رہی آپ کا کوئی بھی وقت ایسا نہ گزرا جس میں آپؑ نے عوام کی راہنمائی نہ فرمائی ہو۔ وہ اپنے تجربات اور باطنی علوم کے ذریعے ان پر وہ چیزیں کشف وعیاں کرتے جن میں ان کی فلاح و بہبود مضمر تھی اور انھی سے ان کی حالت بہتر ہو سکتی تھی۔ چنانچہ! ایک مرتبہ آپؑ نے فرمایا تھا:

"میں نے تمھارے ساتھ رہ کر تمھاری ہم نشینی و ہم دمی کو زیبائی اور خوبصورتی بخشی اور میری ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ جس قدر ممکن ہو سکے تمھیں ذلت و خواری کے حلقے اور جور وستم کی بندشوں سے آزاد کرا دوں"۔ (نہج البلاغہ: خطبہ ۱۵۹)

لیکن افسوس کہ حضرت علی علیہ السلام نے اصلاح کی جو بھی ہمدردانہ سعی وکوشش کی اس کا اثر ان کے تھکے ہوئے جسموں اور خستہ وکوفتہ دل و دماغ پر اس حد تک نہ ہو سکا جس قدر آپؑ چاہتے تھے۔ چنانچہ! یہی وجہ تھی کہ انھوں نے خود کو غارت گر شامیوں کے حوالے کر دیا تاکہ جب بھی چاہیں اور جس طرح بھی چاہیں ان کے جان و مال کو نذرِ آتش کر دیں۔

فتنۂ خریت

خوارج کے تباہ کن وخطرناک عقائد ان لوگوں کے دلوں میں جو ذہنی طور پر فرسودہ و ناکارہ ہو چکے تھے اور اس کج رفتاری کے لیے آمادہ تھے بتدریج قوت پانے لگے اور ان کی وجہ سے اسلامی معاشرے کے لیے وہ نئی مشکل پیدا ہو گئی جس کا ذکر ذیل میں آئے گا۔

خریت بن راشد بہت سخت خوارج میں سے تھا۔ جب حکمیت کے نتیجے کا اعلان کیا گیا تو وہ اپنے تیس حواریوں کو ساتھ لے کر حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: اس کے بعد مجھ سے آپؑ کی اطاعت وفرمانبرداری نہ ہو سکے گی میں آپؑ کے پیچھے نماز بھی ادا نہ کروں گا اور کل میں آپ سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔

اپنے اس فیصلے کا محرک وہ مسئلہ حکمیت کو سمجھتا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کو جواب دینے

میں نرم رویہ اختیار کیا اور اسے پند و نصیحت کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ حکمیت کے بارے میں چاہیں تو بحث و گفتگو کر سکتے ہیں۔

اس وقت تو اس نے گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا البتہ اگلے دن کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ مگر رات کے وقت وہ اپنے حواریوں کو ساتھ لے کر فرار کر گیا، اور دیگر خوارج کی طرح دہشت پسندی اور غارت گری شروع کر دی۔ چنانچہ راہ میں اسے جتنے بھی کینہ پرور لوگ ملے وہ اس کے ہمراہ ہو گئے۔ وہ مدائن پہنچ گیا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے زیاد بن خصفہ الکبری کو ان کا تعاقب کرنے کے لیے روانہ کیا اور مختلف شہروں میں اپنے کار پردازوں کو بھی لکھا تا کہ وہ ان علاقوں میں جو ان کے زیر فرمان ہیں، ان کی تلاش و جستجو کے لیے اپنے کارندے مقرر کریں اور اس کے نتائج سے آپ کو مطلع و باخبر کرتے رہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے قرظہ بن کعب نامی کار پرداز نے اسے اپنی حراست میں لے لیا اور اس واقعے کی حضرت علی علیہ السلام کو اطلاع دی۔ حضرت علیؑ نے زیاد کو اس بارے میں مطلع کیا اور حکم دیا کہ اسے میرے پاس روانہ کر دو۔ اگر وہ آنے سے انکار کرے تو ان کے ساتھ جنگ کرو کیونکہ اس نے نیز اس کے حواریوں نے حق کو پس پشت ڈال کر لوگوں کا ناحق خون بہایا ہے اور راستوں میں بدامنی پھیلا رکھی ہے۔

زیاد اور خریت ایک دوسرے کے مقابل آئے۔ دونوں کے درمیان گفتگو اور سوال و جواب ہوئے۔ خریت اپنے عقیدے پر ثابت تھا۔ دونوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی اور ان کے بیشتر افراد کاری زخموں کے باعث مجروح ہوئے۔ جب رات ہو گئی تو خریت فرار کر کے اہواز کی سمت چلا گیا اور زیاد واپس بصرہ تشریف لے آئے۔

اہواز میں بہت سے راہزن، اس کے ہم عقیدہ عرب اور سطحی مسلمان جو اس کی تحریک کو دین پر ضرب لگانے، خراج ادا نہ کرنے اور قانون کی ہر قید و بند سے خارج ہونے کا ذریعہ و وسیلہ سمجھتے تھے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

حضرت علی علیہ السلام کو جب ان واقعات کی اطلاع ملی تو آپ نے معقلؓ بن قیس کو ایک ہزار افراد کے ہمراہ جنگ کرنے کے لیے بھیجا۔ آپؑ نے صوبہ دار بصرہ حضرت عبداللہؓ بن عباس کو بھی خط

لکھا کہ وہ دو ہزار افراد کے ساتھ کسی دلیر و بہادر نیز راست باز شخص کو روانہ کریں تا کہ وہ حضرت معقلؓ کے ساتھ مل کر جنگ کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی آپؑ نے زیاد اور اُن کے ہم قبیلہ لوگوں کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے انھیں واپس آنے کے لیے حکم صادر کیا۔

حضرت عباسؓ نے حضرت خالدؓ بن معدان طائی کو دو ہزار افراد کے ہمراہ روانہ کیا، خریت کا تعاقب کرنے کے بعد حضرت معقل اُہواز پہنچ کر اُترے۔ اس وقت خوارج وسیع دشت سے گزر کر کوہِ رامہرمز کی بلندیوں کی جانب جانے کی کوشش وفکر میں تھے تا کہ تعاقب کرنے والی جماعت کی نسبت وہ بہتر اور مستحکم جگہ پر قیام کر سکیں، لیکن معقل نے انھیں اچانک نرغے میں لے لیا اور وہ ابھی پہاڑ کے دامن سے اُوپر نہیں گئے تھے کہ ان پر حملہ کر دیا۔ خون ریز جنگ ہوئی۔ قبیلۂ بنی ناجیہ کے تین سو ستر افراد کے قتل اور ان کے بے دین ساتھی کی کشت و کشتار (جن میں کچھ عرب، بے دین اور بعض گرد شامل تھے) کے بعد خریت کے لیے فرار کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ یہاں سے فرار کرنے کے بعد خریت بحرین میں دُور ترین ممکن مقام پر پناہ گزین ہوا۔ یہاں بھی اس نے اپنے اغراض و مقاصد کا پرچار شروع کر دیا اور دوبارہ لوگوں کو اپنے گرد آنے کی دعوت دینے لگا۔ معقل نے حضرت علی علیہ السلام کے حکم کے مطابق اس کا تعاقب کیا۔ بحرین پہنچنے کے بعد اس نے سب سے پہلے حضرت علی علیہ السلام کا وہ خط پڑھ کر سنایا جس میں آپؑ نے مسلمانوں، عیسائیوں، مرتدین اور بے دین لوگوں سے خطاب کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے پرچم دین لہرایا اور کہا:

> ''خریت اور اس کے ان حواریوں کے علاوہ جو کینہ وعداوت کے باعث مسلمانوں سے علیحدہ ہو گئے ہیں، جو شخص بھی اس پرچم کے زیر سایہ آجائے گا وہ امن وامان میں رہے گا''۔

ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ خریت کے اَطراف میں اس کے اہل قبیلہ کے علاوہ کوئی شخص نہ رہا۔ اس کے اور معقلؓ کے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ ستم گروں کی استقامت و پائیداری ایک گھنٹہ سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ ان کا رہبر اپنے ایک سو ستر سے زیادہ افراد کے ساتھ قتل ہوا۔ باقی ساتھی ایسے فرار کر گئے جیسے بھیڑوں کے درمیان کوئی بھیڑیا آیا ہو، لیکن وہ بھی گرفتار و قید ہوا۔ ان میں سے جو لوگ تائب ہو گئے، معقل نے انھیں آزاد کر دیا اور باقی افراد کو جو تعداد میں پانچ سو

سے زیادہ تھے، کوفہ کی جانب روانہ کر دیا"۔ ①

آخری کوشش

۳۹ ہجری کے دوران معاویہ کی یورش میں چونکہ بہت اضافہ ہو گیا تھا، اس لیے حضرت علی علیہ السلام نے اس کے حملوں کو روکنے کے لیے ان فوجی دستوں کو بھیجنے کے علاوہ جن کی حیثیت محافظ لشکر کی تھی، یہ فیصلہ کیا کہ اپنی تمام کوشش شام کی جانب لازم و ضروری فوجی طاقت روانہ کرنے کے لیے صرف کر دیں تا کہ معاویہ کی سرکشی و ستم گری کا ہمیشہ کے لیے سدباب ہو سکے۔ کیونکہ آپؑ کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہ گیا تھا کہ مکمل جنگی سطح پر اس کا مقابلہ کیا جائے تا کہ اس کے شر سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل ہو اور وہ بھی اپنی جگہ خاموش ہو کر بیٹھے رہے۔

اس فیصلے کے بعد آپؑ نے حضرت معقلؓ بن قیس کو سواد ② کوفہ کی جانب روانہ کیا تا کہ لوگوں کو جنگ میں شریک ہونے کی دعوت دے سکیں۔

آپؑ نے والیٔ آذربائیجان قیسؓ بن سعد کو خط لکھا جس میں مرقوم فرمایا کہ وہ لوگوں کو شام کی جانب روانہ ہونے کے لیے آمادہ اور نظریاتی اعتبار سے ان میں وحدت و یکجہتی پیدا کرے۔ (الغارات: ج ۲، ص ۷۸۳، تنقیح المقال: ج ۲، ص ۲۹۷)

اس کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام نے خود بھی کوفہ کے لوگوں کو آمادہ کرنے کے لیے مفصل تقریر کی جس میں آپؑ نے فرمایا:

> "اے اللہ کے بندو! گذشتہ اقوام کی تاریخ پر غور و فکر کرنا تمھارے لیے بیش قیمت درسِ عبرت ہے۔ کہاں ہیں وہ بادشاہوں کے دیو اور ان کے وارثین سلطنت؟ کیا ہوئے فراعنہ اور ان کے جانشین؟ کدھر گئے وہ خاندان رس

---

① یہ حضرت جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ جنگ جمل میں تو انھوں نے قبیلۂ نصر کی فرمان داری کے فرائض بھی انجام دیے لیکن مسئلۂ حکمیت کے بعد حضرت علی علیہ السلام سے برگشتہ ہو گئے اور آپؑ کی مخالفت پر اتر آئے۔

② "سوادِ کوفہ" اطرافِ کوفہ میں وہ جگہ تھی جہاں کھجور کے درخت اس کثرت سے تھے کہ دور سے وہ جگہ سیاہ نظر آتی تھی۔ اسی وجہ سے اسے سواد کہا جاتا تھا۔ یہ جگہ طول میں موصل سے آبادان تک اور عرض میں غریب۔ پھیلا ہوا تھا مجمع البحرین

کے مدنی فرمانروا جنھوں نے پیغمبروںؑ کو جہیہ تیغ، سنت کے روشن چراغوں کو خاموش اور ستم گروں کی راہ و روش کو زندہ کیا تھا؟ کہاں گئے وہ فرمانروا جو عظیم لشکر لے کر روانہ ہوئے اور جنھوں نے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی سپاہ کو شکست دی؟ کدھر جا چھپی فاتح لوگوں کی وہ کثیر فوج جو یکجا جمع ہوئی اور جس نے نئے نئے شہروں کی بنیاد رکھی؟

......خدا کے برگزیدہ و نیک بندے سفر پر جانے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ انھوں نے دنیا کی فانی و بے ثبات چند روزہ چیزوں کا سودا آخرت کی جاودانی زندگی سے نہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے وہ بھائی جنھوں نے جنگ صفین میں اپنا خون بہایا تھا اگر آج اس دنیا میں نہیں ہیں تو انھوں نے کون سا خسارہ برداشت کیا؟

کہاں ہیں وہ میرے بھائی جنھوں نے جہاد کی راہ اختیار کی اور جادۂ حق طے کیا؟ کہاں ہیں عمارؓ؟ کہاں گئے ابن تیہان، کیا ہوئے ذوالشہادتینؓ اور کدھر گئے ان جیسے دوسرے لوگ جنھوں نے موت سے عہد و پیمان کیا اور شرپسندوں کے ہاتھوں اپنے سر قلم کرائے''۔

اس کے بعد آپؓ نے ریش مبارک پر اپنے ہاتھ رکھے اور کافی دیر تک گریہ وزاری کرتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا:

''افسوس افسوس کہاں گئے وہ میرے بھائی جنھوں نے قرآن پاک کی تلاوت کی اور زندگی میں اسے اپنا حاکم بنایا، اپنے فرائض کے پابند رہے اور ہمیشہ انھیں پورا کیا؟ انھوں نے سنتِ نبویؐ کو زندہ اور بدعتوں کا قلع قمع کیا۔ انھوں نے جہاد کی حکومت کو قبول کیا اور اپنے ہادی و رہبر پر پورا اعتماد کرتے ہوئے اس کی پیروی کی؟''

اس کے بعد آپؓ نے باآواز بلند فرمایا:

''جہاد جہاد، اے خدا کے بندو! میں تمھیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج میں بھی تمھارے ساتھ عسکرگاہ کی جانب چلوں گا۔ جو شخص بھی خدا کی جانب

جلد از جلد آنا چاہتا ہے وہ نکل کر ہمارے ساتھ آئے"۔ (الغارات: ج ۱، ص ۵۹ ۳، کامل: ج ۳، ص ۳۶۹)

آپؑ کی اس کوشش کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ تقریباً چالیس ہزار افراد عسکرگاہ میں جمع ہو گئے۔ بقول نوف بکالی: آپؑ نے دس ہزار سپاہ کا پرچم حضرت امام حسین علیہ السلام کو دیا۔ دس ہزار سپاہی حضرت قیسؓ کی سرکردگی میں دیئے۔ دس ہزار سپاہ حضرت ابوایوبؓ انصاری کی زیر فرمان داری مقرر کیے اور دس ہزار سپاہی ان دیگر فرمان داروں کے حوالے کیے جنھوں نے اس تعداد میں مزید اضافہ کیا تھا اور حکم دیا کہ پوری فوج صفین کی جانب روانہ ہو لیکن ابھی جمعہ بھی نہ گزرا تھا کہ آپؑ کے سرِ مبارک پر ابنِ ملجم لعین نے کاری ضرب لگائی جس کے باعث لشکر بحالت مجبوری واپس کوفہ آ گیا۔ (بحارالانوار: ج ۴۲، ص ۲۶۸)

حضرت علی علیہ السلام کے خلاف سازش

تمام مشکلات اور سختیوں کے باوجود حضرت علی علیہ السلام جس زمانے میں شام کی جانب روانہ ہوئے اور معاویہ سے جنگ کا تدارک کر رہے تھے اسی عرصہ میں چند خوارج بظاہر مراسمِ حج بیت اللہ ادا کرنے کی نیت سے مکہ میں جمع ہوئے۔ یہاں انھوں نے چند جلسات کی تشکیل کی جس میں ان مقتولین کو یاد کیا جو جنگِ نہروان میں کام آ گئے تھے۔ ان کے خیال میں وہ لوگ بے قصور مارے گئے تھے اور ان کے قتل کے اصل ذمہ دار حضرت علی علیہ السلام، معاویہ اور عمرو بن عاص تھے۔

ان کے خیال میں یہ تینوں ہی ائمہ ضلال (گمراہوں کے امام) تھے۔ چنانچہ! انھوں نے فیصلہ کیا کہ تینوں کا فیصلہ کر دیا جائے تا کہ اس طرح باہمی اختلاف، کشمکش اور ناانصافی کی بیخ کنی کر دیں۔

ان میں سے تین افراد نے اس مقصد کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی، تا کہ تینوں مذکورہ حضرات کی زندگی کو ختم کر دیں۔ حضرت علی علیہ السلام کو قتل کرنے کا ذمہ عبدالرحمٰن ابنِ ملجم نامی نے لیا۔ انھوں نے اس سازش کی تکمیل کے لیے باہمی عہد و پیمان کیے اور یہ فیصلہ کیا کہ ۱۹ ماہِ رمضان ۴۰ ہجری صبح کے وقت وہ اپنی دہشت پسندانہ کارروائی پر عمل کریں گے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

ابنِ ملجم کوفہ میں داخل ہوا اور اپنی چچازاد بہن قطامہ کے گھر پہنچا۔ وہ اس کے ساتھ پہلے بھی چونکہ معاشقہ کر چکا تھا اسی لیے اب اسے اپنی شادی کا پیغام دیا۔ قطامہ خود خوارج میں سے تھی۔ اس کے بھائی اور باپ کا قتل جنگِ نہروان میں ہو چکا تھا۔ اسی لیے اس کے دل میں حضرت علی علیہ السلام کے خلاف سخت عداوت و دشمنی تھی۔ اس نے کہا:

> "میں اس شرط پر شادی قبول کر سکتی ہوں کہ ایک کنیز و غلام اور تین ہزار درہم نقد دینے کے علاوہ تو حضرت علی علیہ السلام کو قتل کر دے۔ اگر تُو اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو میرے کلیجہ کو ٹھنڈا کرے گا اور مجھ سے داد پائے گا اور اگر تو خود مارا گیا تو تجھے دنیوی نعمتوں سے کہیں زیادہ عظیم اس کا اجر و ثواب ملے گا"۔

ابنِ ملجم نے جب دیکھا کہ یہ عورت اس کام کے لیے بہت زیادہ اصرار کر رہی ہے تو اس نے بتایا کہ میں بھی ناپاک ارادہ لے کر کوفہ سے آیا ہوں۔ (بحار الانوار: ج ۴۲، ص ۲۲۴، ارشاد مفید: ص ۱۴)

ابنِ ملجم نے شبیب بن بجرہ نامی دوسرے شخص سے جو خود بھی خوارج میں سے تھا اس کام میں مدد لی۔ قطامہ نے وردان بن مجالد کو بھی اس کے ساتھ کر دیا تاکہ وہ بھی اس کام میں اس کا مددگار ہو سکے۔ اس نے اشعث بن قیس کو بھی اپنا رازدار بنا لیا۔ اس شخص نے بھی حوصلہ افزائی کی۔[1]

شہادت کا انتظار

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے احادیثِ نبویؐ اور علمِ لدنی کی بنیاد پر یہ پیشین گوئی کر دی تھی: "آپؑ کی شہادت ماہِ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں واقع ہوگی"۔

جب ماہِ رمضان آ گیا تو افطار کے بعد آپؑ کبھی امام حسن علیہ السلام اور کبھی امام حسین علیہ السلام اور بعض راتوں میں عبداللہ بن عباسؓ کے گھر قیام فرماتے لیکن افطار کے وقت تین لقموں سے زیادہ

---

① حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے قتل میں اشعث بن قیس شریک تھا، اس کی بیٹی نے حضرت امام حسن علیہ السلام کو زہر دیا، اس کا بیٹا محمد بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کے قتل میں شریک تھا۔ (بحار الانوار: ج ۴۲، ص ۲۲۸)

تناول نہ فرماتے، جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو آپؑ نے فرمایا: ''میری یہ آرزو ہے کہ میں خداوند تعالیٰ کا دیدار شکم سیر ہوئے بغیر کروں''۔ (مروج الذہب: ج ۲، ص ۴۱۱، بحار: ج ۴۲، ص ۲۲۸، مقاتل الطالبین: ص ۱۱۸)

ماہِ مبارک کی انیسویں شب میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام پر سخت ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ آپؑ اچانک گھر کے اندر سے نکل کر صحن میں تشریف لے آتے اور ٹہلنے لگتے اور آسمان کی طرف دیکھتے۔ آپؑ نے سب حاضرین کو بتادیا تھا کہ آج کون سا عظیم حادثہ رُونما ہونے والا ہے۔ آپؑ یہ فرما چکے تھے: ''خدا کی قسم میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں اور مجھے غلط خبر نہیں دی گئی ہے کہ آج کی رات وہی رات ہے جس کا مجھ سے وعدہ کیا جاچکا ہے''۔ ①

اس رات حضرت علی علیہ السلام تمام وقت بیدار رہے۔ پوری رات تلاوتِ قرآنِ مجید اور عبادت میں گزاری۔ طلوعِ فجر سے قبل جب آپ گھر سے مسجد تشریف لے جانے لگے تو راستے میں مرغابیاں آگئیں جنھیں راستے سے دُور کردیا گیا۔ اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: انھیں کچھ مت کہو یہ نوحہ وگریہ کررہی ہیں۔ (ذروھن فانھن نوائح، بحار: ج ۴۲، ص ۲۲۶)

شہادت

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام مسجد میں تشریف لائے جو لوگ محوِ خواب تھے انھیں بیدار کیا کہ خداوند تعالیٰ کی عبادت ومناجات میں مشغول ہوں۔ آپؑ نے ابنِ ملجم کو بھی بیدار کیا۔ وہ اوّل شب ہی سے آپؑ کی آمد کا منتظر تھا اور اس وقت ایسے بن کر لیٹ گیا تھا جیسے سو رہا ہے، اس کے بعد آپ نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور قلب وزبان کے ساتھ ذکرِ خدا میں مشغول ہوگئے۔ (بحارالانوار: ج ۴۲، ص ۲۲۶، ارشادِ مفید: ص ۱۲)

اس وقت شبیب نے آپؑ پر تلوار سے وار کیا مگر اس کی تلوار محرابِ مسجد سے ٹکرا کر رہ گئی، تباہ کار ابنِ ملجم جلدی سے آگے آیا۔ اس نے اپنی تلوار اُوپر اُٹھائی اور بآوازِ بلند کہا:

الحکم للہ لا لک یا علی ولا لاصحابک

یہ کہہ کر اس نے حضرت علی علیہ السلام کے سرِ مبارک پر اپنی تلوار اُٹھائی جو ٹھیک اسی جگہ لگی جہاں

---

① واللہ ما کذبت ولا کذبت انھا معی لیلۃ التی وعدت فیھا (بحار: ج ۴۲، ص ۲۲۶، ارشاد: ص ۱۵)

جنگِ خندق میں عمرو بن عبدود کی تلوار لگ چکی تھی۔ حق و عدل کا وہ پیکر جو صریح و واضح کفر و الحاد کے ضربات سے زمین پر نہیں گر سکا تھا آج نفاق و جہل و تعصب آمیز ظاہری تقدس کے ایک ہی وار سے خاک و خون میں لوٹنے لگا۔ حضرت علی علیہ السلام نے جیسے ہی ضربِ شمشیر کو محسوس کیا تو فرمایا:

فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ (مناقب: ج ۳، ص ۳۱۲، بحار: ج ۴۲، ص ۲۳۹)

"قسم کعبہ کے خدا کی کہ آج میں نے کامیابی حاصل کی"۔

آپؑ کے فرزندوں اور اصحاب پر تو گویا غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہر طرف سے گریہ و نالہ اور آہ و بکا کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ لوگ سراسیمگی کی حالت میں مسجد کی جانب دوڑے۔

حضرت علی علیہ السلام کا سرِ مبارک حضرت امام حسن علیہ السلام کی آغوش میں تھا جس سے مسلسل خون جاری تھا۔ زخم کی شدت اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے آپؑ ابھی تک بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ ابنِ ملجم بھی پکڑا گیا اور اسے حضرت امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے اس سے فرمایا:

"اے ملعون! تُو نے پیشوائے مسلمین حضرت علی علیہ السلام کو قتل کر دیا، کیا نیکی اور خیر خواہی کا بدلہ یہی ہے۔ تُو وہی شخص ہے جسے خلیفۂ وقت نے پناہ دی اور اپنا مقرب بنایا"۔

اس کے بعد آپؑ نے والد محترم کی خدمت میں عرض کیا:

"بابا جان! یہ آپؑ کا اور خدا کا دشمن بحمد اللہ گرفتار کر لیا گیا ہے وہ اس وقت آپؑ کے رُوبرو حاضر ہے"۔

حضرت علی علیہ السلام نے چشمِ مبارک کو کھولا اور فرمایا:

"تُو بہت عظیم سانحہ کا مرتکب ہوا ہے اور تُو نے نہایت ہی خطرناک کام کیا ہے، کیا میں تیرے لیے بُرا امام ثابت ہوا؟ ایسی کون سی مہربانی و بخشش تھی جو میں نے تیرے حق میں روا نہ رکھی؟ کیا لطف و مہربانی کا یہی بدلہ و صلہ ہے؟"

اس کے بعد آپؑ نے حضرت امام حسن علیہ السلام سے فرمایا:

"اے فرزندِ عزیز! اپنے اس قیدی کے ساتھ خاطر و مدارات کا سلوک کرنا اور

اس کے ساتھ مہربانی و نوازش سے پیش آنا۔ جو کچھ تم کھاؤ اور پیو وہی تم اسے کھلانا اور پلانا۔ اگر میں مر جاؤں تو میرے خون کے قصاص میں اسے قتل کر دینا، مگر اس کے ناک، کان نہ کاٹنا، کیوں کہ میں نے پیغمبر اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنا ہے کہ اس کتے کے بھی ناک کان نہ کاٹو جس نے تمھیں کاٹا ہے۔ اور اگر میں بچ گیا تو میں ہی جانتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ اسے معاف کر دینے میں مجھے سب پر فضیلت حاصل ہے کیوں کہ ہمارا خاندان وہ خاندان ہے جس نے بڑے بڑے گناہ گاروں کو معاف کیا اور ان کے ساتھ ہم بزرگواری سے پیش آتے ہیں"۔ (بحارالانوار: ج ۴۲، ص ۲۸۷-۲۸۸)

حضرت امام حسن علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کو گھر لے آئے۔ لوگ گریہ و نالہ کرتے اور آپؑ سے رخصت ہوتے۔ عجب کہرام کا عالم تھا، لگتا تھا کہ غم گساروں کی جان کھینچ کر لبوں پر آ گئی ہے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے بعض اطباء کو جن میں اثیر بن عمرو سکونی سب سے زیادہ ماہر و حاذق طبیب تھے، کو علاج کے لیے بلایا۔ انھوں نے کہا کہ بھیڑ کا تازہ جگر لاؤ۔ اس کی ایک رگ انھوں نے حضرت علیہ السلام کے زخم کے اندر رکھی اور اسے باہر نکال لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مغز کی سفیدی اس رگ پر گئی ہے اور دم شمشیر کی ضرب نے دماغ تک اثر کیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس طبیب نے کہا: اے امیر المومنینؑ! اگر کوئی وصیت کرنا چاہیں تو کر دیجیے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اپنے فرزندوں کو اَخلاقِ حسنہ کی وصیت فرمائی۔ اپنی زندگی کے قابلِ قدر و قیمت درس انھیں اور تمام مسلمین کو دیے۔ اُمورِ خلافت اپنے فرزند محترم امام حسن علیہ السلام کو تفویض کیے اور اس کا گواہ اپنے فرزندوں، خاندان کے بزرگوں کو بنایا۔ کلامِ مجید اور اپنا اسلحہ آپؑ کی تحویل میں دیا۔

جب حضرت علی علیہ السلام اپنے فرزندوں کو پند و نصائح کر چکے تو آپؑ نے موت کی علامات محسوس کیں۔ اس کے بعد آپ قرآنِ پاک کی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ آخری آیت جو آپؑ کی زبانِ مبارک پر آئی وہ یہ تھی:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (سورۂ زلزال: آیت ۷-۸)

"پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا"۔

۲۱ رمضان ۴۰ ہجری اس وقت جب کہ آپؑ کا سن شریف تریسٹھ سال کا تھا آپؑ کی روحِ مقدس ومطہر اس جہانِ فانی سے پرواز کر کے عالمِ جاودانی کی طرف عروج کر گئی۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے اپنے دیگر بھائیوں اور حضرت علی علیہ السلام کے اصحاب کی مدد سے اپنے شہید والد محترم کی تجہیز کا انتظام کیا۔ غسل وکفن کے بعد جب کچھ رات گزر گئی تو اس پیکرِ مقدس کو کوفہ سے باہر لے آئے۔ تمام راستہ جنازے کے پیچھے رہ کر طے کیا اور جنازہ اس جگہ لایا گیا جو آج نجفِ اشرف کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد انتہائی خاموشی کے ساتھ اس پیکرِ تقدس کو سپردِ خاک کر دیا۔ (بحار الانوار: ج ۴۲، ص ۲۹۴)

سَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ اسْتُشْهِدَ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا

"سلام ہو اس پر جس دن اس کی ولادت ہوئی اور جس دن شہید کیا گیا، اور جس دن زندہ اٹھایا جائے گا"۔

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

فرشتہ نما انسان

انسانی صورت میں وہ ایک فرشتہ تھیں۔ وہ فرشتہ جس نے بارگاہِ اُلوہیت سے انسانوں کی سرزمین میں قدم رکھا تاکہ آسمانی طہارت و صفا کو عملی طور پر پیش کریں۔ اپنے وجود سے خدا کی بہشت کی جانب ایک خوش منظر دریچہ کھولیں اور بہشت کی تمام زیبائیوں کو ایک جگہ اپنے صفحۂ زندگی پر نمایاں کریں تاکہ انسانوں کے سامنے فضیلت وطہارت کا مرقع پیش کریں۔ وہ ایک کامل انسان کا نمونہ تھیں۔ فضیلت کے تمام جلوے آپؑ میں نمایاں تھے اور آپؑ ایک خاتون تھیں۔

وہ ایسا زمانہ تھا جب صنفِ نسواں کا کوئی مقام نہ تھا، یہاں تک کہ اس کی انسانی شخصیت بھی نہ تھی۔ ایک ایسی طاقت کی ضرورت تھی جو صنفِ نسواں کے راستہ کو بدل دے اور اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات کو بھی بدل دے اور عورت اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرلے اور اپنے انسانی حقوق سے بہرہ مند ہوسکے۔ ان سب کے باوجود تقویٰ، پاک دامنی اور عفت کے دائرہ سے بھی باہر نکلے اور اپنے مخصوص فرائض کو بھی فراموش نہ کرے۔

وہ دن تاریخ صنفِ نسواں کے لیے ایک نیا دن تھا جس نے ماضی کے سیاہ و تاریک دور کو درخشاں و نُورانی مستقبل سے علیحدہ کردیا۔ اس روشن و درخشاں مستقبل میں عورت کو بھی ماضی کی تاریکیوں اور اپنے اُوپر ہونے والی زیادتیوں سے اپنے آپ کو دُور کرنا اور اپنی فطری تخلیق کے مطابق اپنے مسلّم حقوق سے بہرہ مند ہونا اور قدرت نے اس کے اندر جو فطری صلاحیت دی ہے اس کے مطابق فعال زندگی بسر کرنا چاہیے جس سے نئی اور افتخار آمیز زندگی کا آغاز ہوسکے۔

ہر جہت سے انقلاب رُونما ہوچکا تھا۔ ایسا انقلاب جو رفتہ رفتہ اور بڑے ہی آرام سے انسانی زندگی کے ہر پہلو پر اثرانداز ہورہا تھا۔ اس نے ذہنوں سے کام شروع کیا۔ ذہنی انحراف، ذہنی بت پرستی، ذہنی خیانتوں اور آخرکار تمام برائیوں کو دُور کردیا۔ ایک نئی زندگی میں داخل ہوا۔ وہ روابط جو ظلم پر برقرار تھے انھیں دگرگوں کرکے رکھ دیا۔ اسلام اور پیغمبرؐ کے انقلابی ہاتھوں یہ تمام مراحل کامیابی کے ساتھ طے پائے۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ عورت کے بارے میں اسلام کے

انقلابی افکار ایک عملی نمونہ بن کر آئے اور خواتین کے معاشرہ میں ایک نمایاں منظر جلوہ گر ہو۔ ایسا منظر جو عورت کو شخصیت عطا کرے، عفت و تقویٰ کا درس دے، اسے بغیر آلودہ کیے ہوئے بال و پر عطا کرے اور یہ عظیم اور تاریخی فریضہ انھی کے سپرد کیا گیا یعنی فاطمہ زہراؑ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔

ولادتِ باسعادت

مشہور روایات کے مطابق بعثت کے پانچویں سال ۲۰ جمادی الثانی بروز جمعہ حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی ولادت ہوئی۔ آپؑ کی ولادت عام ولادت جیسی نہ تھی۔

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی ولادت کے مقدمات استثنائی حوادث کے زمرے میں آتے ہیں اور ان مقدمات نے ایک خاص دور کا آغاز کیا۔ اس دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے درمیان بیٹھے گفتگو فرما رہے تھے اور لوگ بھی بڑے ہی اشتیاق سے باتیں سن رہے تھے اس لیے کہ آپؐ کی باتیں بالکل نئی تھیں۔ آپؐ فرما رہے تھے: بتوں کی پرستش نہ کرو اور ان بے جان مجسموں کی پوجا نہ کرو، اپنی معصوم لڑکیوں کو زندہ درگور نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، خیانت نہ کرو۔

آپؐ کا معمول تھا کہ ہر وقت اور ہر جگہ بالخصوص جہاں بھی زیادہ مجمع دیکھتے وہاں تشریف لے جاتے اور آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتے۔ ایک روز حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرزمینِ بطح میں بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد جمع تھی۔ لوگ آپؐ کے بیانات سے بہرہ مند ہو رہے تھے۔ کبھی ملکوتِ اعلیٰ اور کبھی خدا کی جنّت اور کبھی جہنّم کے دردناک عذاب اور اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے بارے میں آپ فرما رہے تھے اور لوگ سن رہے تھے۔ کچھ لوگ جذب ہوکر آسمانی منطق، جو بے جان جسم میں حیات بخش روح عطا کرنے والی ہے، کے سامنے سرتسلیم کر رہے تھے اور کچھ لوگ تمسخر کرتے ہوئے آپؐ سے دُور ہو رہے تھے۔ ان لوگوں کے قلوب سیاہ اور دل مکہ کے پہاڑوں کی طرح سخت تھے۔

آپؐ لوگوں کے درمیان تھے۔ کبھی آپؐ پر ایسی کیفیت طاری ہوجاتی تھی کہ آپؐ اپنی گفتگو منقطع کر دیتے تھے اور جیسے ہی ایک آسمانی نامرئی موجود آپؐ کی جانب آتی، آپؐ آسمانی سفر کا آغاز کر دیتے تھے۔ آپؐ کے اندر خفیف سی حرکت ہوتی تھی اور جس طرح مروارید کے سینہ میں دانہ چمکتا ہے اسی طرح آپؐ کی پیشانیٔ اقدس سے پسینہ کے موٹے موٹے قطرے ٹپکتے تھے۔

بدن مبارک میں گرانی محسوس ہوتی۔ آپؐ کے جو بھی چیز قریب ہوتی اس پر ٹیک لگا لیتے۔ دھیرے دھیرے بے خود ہو کر دوسری دنیا میں پہنچ جاتے۔ ایسی دنیا جہاں ہر نا معلوم شے جلی حروف میں نمایاں ہے اور صرف پیغمبر اکرمؐ اس حالت میں اسے پڑھ سکتے تھے۔ اس صورت میں آنحضرت ﷺ اسرارِ عالم سے آشنا ہو جاتے تھے۔ ہر چیز کے بارے میں آپؐ کو علم دے دیا جاتا تھا۔ قرآن کریم، جس نے لوگوں کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا ہے وہ آنحضرتؐ کے ایسے ہی مخصوص حالات کا نتیجہ ہے۔ ایسی حالت کو آپ "حالتِ وحی" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

اس دن آپؐ پر پھر وہی حالت طاری ہوئی۔ خدا کے مخصوص فرستادہ حضرت جبرائیل ملکوتِ اعلیٰ سے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: "اے محمدؐ! آپؐ کے پروردگار کا حکم ہے کہ چالیس روز تک خدیجہؓ سے کنارہ کشی اختیار کیجیے"۔

جبرئیلؑ نے خدا کے پیام کو سنا دیا اور آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔ رسول اللہ اپنی معمولی اور ہمیشہ رہنے والی حالت پر پلٹ آئے۔ سب لوگ منتظر تھے کہ آپ وحی الٰہی کی تلاوت فرمائیں گے۔ اس لیے کہ آپؐ کی عادت تھی کہ جیسے ہی جبرئیل امینؑ آیاتِ الٰہی لے کر آتے تھے آپ لوگوں کے سامنے پڑھ کر سناتے تھے۔ اصحاب بھی ان آیات کو سننے کے لیے بے تاب تھے۔

اصحاب آپؐ کی باتوں کو باعثِ سعادت و روح کی غذا جانتے تھے۔ بہت سے ایسے افراد بھی تھے جو چند الٰہی آیات سن کر ہی عصبیت سے بالکل دور ہو جاتے تھے اور آپؐ کے سامنے تسلیم ہو جاتے تھے۔ ابتدائی دنوں میں اور بعد میں بھی یہی آیات رسول اللہؐ کا اسلحہ تھیں۔

لیکن اس دن حالتِ وحی کے بعد آپؐ پر صرف خاموشی طاری تھی۔ ایسی خاموشی جس سے غم و اندوہ عیاں تھا۔

مؤرخین لکھتے ہیں: یہ حکم حضرت محمد ﷺ کے لیے بہت ہی سخت تھا۔ دوری اور جدائی وہ بھی خدیجہؓ سے۔ وہ خدیجہؓ جو حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں ستارۂ صبح کی مانند درخشاں تھیں۔ وہ خدیجہؓ جنھوں نے بعثت کے ابتدائی دنوں میں ہی حضرت محمد ﷺ کے چہرۂ مبارک میں نبوت کے ملکوتی انوار کا مشاہدہ کیا اور ایمان و عقیدہ کے ساتھ آپ کو اس منصب کی مبارک باد دی۔

وہ خدیجہؓ جنھوں نے ایک سے ایک خوبصورت، بڑے سے بڑے ثروت مند اور مشہور

لوگوں کے پیغاموں کو ٹھکرا دیا۔ اس ثروت اور غرور کو چھوڑ کر خدیجہؓ نے یتیم کا انتخاب کیا۔ لیکن تعمیل حکم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں اور حضرت محمدؐ نے حضرت خدیجہؓ سے وقتی جدائی کے آسمانی حکم کی تعمیل کا فیصلہ کر لیا۔

ہجر و جدائی کے سخت ایام یکے بعد دیگرے گزرنے لگے۔ حضرت خدیجہؓ کے گھر میں وہ ہمیشہ والی خوشی و شادابی نہ تھی۔ اب خدیجہؓ کے لبوں پر کلیوں کی طرح مسکراہٹ نہ تھی۔ تاریکیٔ شب دنیا کو جب اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی اس وقت خدیجہ بھی اپنے نیم تاریک کمرہ میں بارگاہِ احدیت میں مناجات کیا کرتی تھیں۔ آپؓ کے نرم و نازک رخسار پر شبنم کے قطروں کے مانند آنسو جاری ہوتے جس سے آپؓ کا دامن تر ہو جاتا تھا۔

حضرت محمد ﷺ کوئی ایسے شخص نہ تھے کہ آسانی سے انھیں بھلایا جا سکتا اور نہ ہی حضرت خدیجہؓ ایسی تھیں کہ اتنی جلدی دل ہٹا کر صدق و صفا کے آشیانہ کو بھلا دیتیں۔ ضرور کوئی راز ہے۔ یہ ان رازوں میں سے ہے جو ان کے اور خدا کے درمیان ہمیشہ رہا ہے، کسی کو بھی اس کی خبر نہیں ہے۔ انھی دنوں رسول اللہ ﷺ کے سچے ساتھی حضرت عمار یاسرؓ ایک روز رسولؐ خدا کا پیغام لے کر حضرت خدیجہؓ کے پاس گئے۔ پیغام کا مضمون یہ تھا:

> ”خدیجہؓ! تم سے جدائی کا سبب کینہ یا تنفر نہیں ہے بلکہ حکمِ خدا کی بنا پر مَیں نے تم سے جدائی اختیار کی ہے۔ تم اپنے بارے میں صرف اچھے خیالات رکھنا۔ تمھارے سلسلہ میں تو خداوند عالم فخر و مباہات کرتا ہے۔ رات کو گھر کا دروازہ بند کر لیا کرو۔ اپنے کمرے میں بستر پر سویا کرو۔ میں بھی اس وقت فاطمہؓ بنت اسد کے گھر میں ہوں“۔

حضرت خدیجہؓ کے مایوس دل کو اس پیغام سے نئی مسرت حاصل ہوئی اور انھوں نے اپنے گمان کو صحیح پایا۔

ہاں، محمدؐ کوئی ایسے شخص نہیں ہیں جو مہر و وفا کے اُصول سے چشم پوشی کر لیں اور محبت سے سرشار دل سے میری محبت نکال دیں لیکن اس حکم کا راز کیا ہے؟ محمدؐ کا خدا جانتا ہے اور بس......

دن تیزی سے گزر رہے تھے لیکن حضرت خدیجہؓ کی تنہائی کی تاریک راتیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ صرف اسی اُمید میں زندہ تھیں کہ شوہر کو جو حکم ملا ہے وہ ختم ہو۔

یہاں تک کہ چالیس روز گزر گئے۔

چالیس روز تھوڑے اور قابلِ برداشت ہیں لیکن ہر شخص کے لیے نہیں جو شخص انتظار کی آگ میں جلتا ہے اس کے لیے ایک منٹ ایک سال کے اور ہر سیکنڈ طولانی مدت کے برابر ہے۔

حضرت محمدؐ اور حضرت خدیجہؓ دونوں ہی انتظار کے کربناک حالات سے دوچار تھے۔

چالیسویں دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزہ سے تھے۔ سورج دھیرے دھیرے مغرب کی جانب بڑھ کر وقتِ افطار کا اعلان کر رہا تھا۔ پھر آسمان کا حاکم شب میں آرام کرنے کے لیے دامن اُفق میں چلا گیا اور مکہ کے بلند و سیاہ پہاڑوں میں چھپ گیا۔ ستاروں نے اپنے اندر جرأت پیدا کی اور آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے آسمان پر نمودار ہوئے۔

مشرق کی طرف سے سرخی نمودار ہوئی اور وسط آسمان کی طرف پہنچی۔ یہ سرخ رنگ کی پٹی جیسے ہی آسمان کے وسط اور دیکھنے والے کے سر پر پہنچے ویسے ہی اوّل مغرب اور افطار کا وقت سمجھا جاتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی افطار کے لیے تیار ہوئے۔ اسی درمیان ایک جانی پہچانی آواز آپؐ کے کانوں میں پہنچی۔ وہ آواز جو ہمیشہ آسمان کی خبریں سناتی تھی۔ ہاں جبرئیلؑ نازل ہوئے، آپؐ سے کہا: ''اے محمدؐ! اب اپنے پروردگار کے ہدیہ کو لینے کے لیے تیار ہو جائیے''۔

شاید رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُمید تھی کہ حسب سابق جبرئیلؑ اپنی زبان سے کوئی نئی بات کہیں گے، ایسی بات جس سے مکہ اور پورا عرب بلکہ تمام بشریت کو اپنی طرف کھینچ سکیں اور لوگوں کو سعادت و افتخار کی راہ بتا سکیں لیکن اُمید کے برخلاف سابقہ زبان سے ہٹ کر ایک نیا کلمہ سنا ''ہدیہ''۔

یہ ہدیہ کیا ہے؟ جتنا بھی غور و فکر کیا، یہ مشکل حل نہ ہوئی۔ سوال کرنے کے علاوہ کوئی راہ نہ دیکھی، فرمایا: اے جبرئیلؑ! میرے پروردگار کا ہدیہ کیا ہے؟

جبرئیل بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح بے خبر تھے۔ بہرحال ہدیہ جو بھی ہو، ہدیہ کو عالی اور مقدس ہونا چاہیے، اس لیے کہ خدا نے اپنے رسولؐ کے لیے منتخب کیا ہے۔ لیکن یہ ہدیہ صرف حضرت محمدؐ کے لیے نہ تھا بلکہ ایک ایسی چیز ہے جو خدائے دوجہاں اپنی زمین پر رہنے والے بندوں کے لیے بھیج رہا ہے۔ یہ ہدیہ ایک ایسی بیٹی کے وجود کی ابتداء ہے جو نہ صرف پیغمبرؐ خدا کے لیے غیر معمولی و بلند ہے بلکہ دنیائے بشریت کے لیے نمونۂ عمل و معلم ہے۔ دنیا، تقویٰ، پاک

دامنی، عفت، شہادت اور فضیلت کا نمونہ آپؐ کی مختصر سی زندگی میں دیکھے اور اس نمونہ کو دیکھ کر اپنی زندگی کو اُستوار کرے۔

آخرکار خدا نے اس راز سے پردہ ہٹا لیا اور یہ پیام بھیجا: ''اے محمدؐ! خدا کا ارادہ ہے کہ آج کی شب آپؐ کے صلب سے ذُریتِ طیبہ کی خلقت کرے۔ ایسی ذُریت، جو انسانیت کے لیے بہترین نمونہ ہو......''۔

پہلے حضرت فاطمہ علیہا السلام ہیں، پھر آپؐ کے بطنِ مبارک سے ایسے فرزند ہوں گے جو ستارۂ درخشاں کے مانند نُور افشانی کریں گے اور اپنے نُور کے پرتو سے قافلۂ انسانیت کی تاریکی کو منور کریں گے....

خدا کا ارادہ تھا کہ اس شب پیغمبرؐ خدا کا افطار طیب و طاہر جنّتی غذا ہو اور صرف ایسی ہی غذا حضرت زہرا علیہا السلام جیسی شخصیت کے وجود کا سرچشمہ بن سکتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ملا کہ جلد سے جلد حضرت خدیجہؓ کے گھر جائیں۔ آپؐ نے بھی اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق چالیس روز کی دُوری کے بعد حضرت خدیجہؓ کے گھر کی طرف قدم بڑھائے۔ مکہ کی پُرپیچ وخم گلی کوچوں سے اندھیری رات میں گزرتے وقت آپؐ کے دل میں دو طرح کے تصورات تھے: ایک ماضی اور ایک مستقبل، ایک محدود و مختصر دوسرا طولانی و دائمی۔ ایک غم انگیز دوسرا نشاط آور۔ ایک حضرت خدیجہؓ سے چالیس روز تک دُوری سے متعلق، دوسرا آیندہ نسل سے متعلق جو حضرت خدیجہؓ کے بطن سے وجود میں آنے والی ہے اور دنیا کی رہبری کرنے والی ہے۔

تاریک شب میں آپؐ کے دل میں یہی دو قسم کے تصورات تھے۔ آپؐ بڑے بڑے قدم اُٹھا رہے تھے تاکہ سخت و پریشانی کرنے والی دُوری کو ختم کر کے جلد سے جلد حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ جائیں اور آیندہ کے تصورات بھی آپؐ کو تیزی سے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ آپؐ صبح کی سہانی ہوا، بے رنگ سیاہ، مادہ سے خالی روح کی طرح مکہ کی تنگ گلیوں سے گزر رہے تھے۔ آپؐ آگے بڑھ رہے تھے تاکہ دنیائے بشریت کے لیے آیندہ کے رہبر، بھٹکی ہوئی بشریت کے لیے قافلۂ سالار و بلند و اعلیٰ رہبر مہیا کر سکیں۔

آپؐ نے اپنی آسمانی آیات کے ذریعے بشر کو عالی و معیاری تعلیم دی تھی۔ یہی درس کا اثر

تھا جس نے انسانوں کی زندگی کو بدل دیا تھا اور معاشرہ میں عظیم وعمیق انقلاب رُونما ہوا تھا۔ آپؐ نے اسی عظیم انقلاب کے سایہ میں برائیوں کو محو کر دیا تھا اور موہوم وعبث چیزوں سے نجات عطا کی تھی۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم کا خاتمہ کیا۔ بدبخت و بے چارے لوگوں کو بے ہودہ لوگوں کی پرستش و عبودیت سے نجات دی۔ اب جو انقلاب سامنے آیا اسے محافظین کی ضرورت تھی جو آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی راہ کو باقی رکھیں اور آپؐ کے انقلاب کو مزید پھیلائیں۔ انھیں محافظوں میں اسلام کی عظیم خاتون اور رسول اللہ ﷺ کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا تھیں۔

آپؓ کے دامن میں حسنؓ و حسینؓ کی تربیت ہوئی ہے۔ آپؓ ہی کا وہ طیب وطاہر دامن ہے جس میں حسینؓ جیسی شخصیت کی تربیت ہو سکتی ہے۔ وہ حسینؓ، جنھیں بشریت کو فداکاری، جانبازی اور ظالموں سے مقابلہ کرنے کا درس دیتا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے انسانی معاشرہ کی تربیت کے لیے دو راستوں کو چُنا ہے:

① لوگوں کے کانوں کے ذریعے تربیت کرنی ہے۔ (وعظ ونصیحت)

② یہ راستہ پہلے راستے سے زیادہ اہم اور زیادہ مؤثر ہے اور یہ لوگوں کی آنکھوں سے استفادہ کرنا ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے لوگوں کے کانوں کے ذریعے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔ مسلسل تبلیغات و وعظ کے ذریعے لوگوں کے درمیان اچھائیاں پھیلائیں اور ان کی تربیت کی، یہ تربیت کرنا جو رسولؐ اللہ کے لیے آسمانی فریضہ ہے لہٰذا ان کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ایسے بافضیلت و اعلیٰ نمونے پیش کریں، جنھیں دیکھ کر لوگ اپنی روحانی زندگی سنوار سکیں۔

اسلام نے ایک مسلمان عورت کے لیے فردی اور اجتماعی زندگی کے فرائض کو مکمل طور پر بیان کیا تھا۔ اب حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو صنفِ نسواں میں ایک اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کیا کہ اب مسلم خواتین اس طیب وطاہر، عفت وفضیلت کے مرقع کو دیکھ کر اپنی زندگی سنواریں اور اپنی اسلامی زندگی اور راہ و رسم کو آپؓ کے نقشِ قدم کے مطابق اُستوار کریں۔

آخرکار اس رات کے بعد نو ماہ گزر گئے۔ حضرت خدیجہؓ کے لیے ایک خاص مرحلہ تھا۔ ہم آپ کو یہ بھی یاد دلا دیں کہ شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ بہت بڑی ثروت کی مالکہ تھیں اور آپؓ

نے اپنی تمام ثروت رسولؐ اللہ کے حوالے کر دی تا کہ اسلام کے پھیلانے میں اسے خرچ کریں اور حضرت محمدؐ نے بھی بغیر دریغ کے اس ثروت سے استفادہ کرتے ہوئے مکہ کے ضرورت مند و محتاج مسلمانوں کی مدد کی۔ حضرت خدیجہؓ کی دولت غریب مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ تھی۔ غریب و نادار مسلمان حضرت خدیجہؓ کی دولت میں اپنے کو شریک سمجھتے تھے، جب کہ پیغمبرؐ خدا نے بغیر کسی حساب و کتاب کے پیمبرانہ اَخلاقِ حسنہ کی بنا پر سب کو شریک رکھا تھا۔

رفتہ رفتہ یہ عظیم سرمایہ ختم ہوتا رہا۔ حضرت خدیجہؓ کا ہاتھ مالِ دنیا سے خالی ہو گیا۔ وہ لوگ جو درہم و دینار کے عاشق تھے، دھیرے دھیرے حضرت خدیجہؓ سے دُور ہوتے گئے، انھیں تنہا چھوڑ دیا۔ حضرت خدیجہ حضرت محمدؐ پر ایمان لائی تھیں۔ ہر محاذ پر صمیم قلب کے ساتھ رسولؐ اللہ کی مدد کی تھی۔ یہ بات کافی تھی کہ لوگ حضرت خدیجہؓ کے خلاف نہ ہوتے، ان سے تعلقات منقطع نہ کرتے۔

مکہ کی عورتوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب حضرت خدیجہؓ کے گھر رفت و آمد نہیں کریں گی اور آپ کے شوہر — جنھوں نے لوگوں کے بتوں، لوگوں کے اجتماعی نظام، بلکہ تمام غلط آداب و رسوم کے خلاف سخت جنگ کا آغاز کیا تھا، کو یکہ و تنہا چھوڑ دیا جائے گا۔ حضرت خدیجہؓ اب بالکل تنہا ہو کر رہ گئی تھیں۔

تنہائی

بعثت کو پانچ سال ہو چکے تھے اور حضرت خدیجہ علیہا السلام تنہائی کے ساتھ پُرسکون زندگی گزار رہی تھیں۔ انھی حالات میں انھیں درد کا احساس ہوا۔ یہ درد وضع حمل کا مقدمہ تھا۔ حضرت خدیجہؓ کو اُمید تھی کہ معمول کے مطابق شہر کی عورتیں سرہانے آئیں گی اور ان کی مدد کریں گی۔ لیکن وہ ''دارالندوہ'' جو مکہ کے لیے مرکز شورائے عالی کی حیثیت رکھتا تھا، وہاں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ تمام لوگ یہاں تک کہ عورتیں بھی پیغمبرؐ خدا کے گھر رفت و آمد نہیں رکھیں گی۔

حضرت خدیجہؓ تنہا درد میں گرفتار تھیں۔ ایک عظیم غم و اندوہ کا احساس کر رہی تھیں۔ اپنے خدا سے راز و نیاز کر رہی تھیں۔ درد کی شدت بڑھتی گئی یہاں تک کہ آرام حاصل ہوا، ولادت ہو گئی۔ لڑکی کی ولادت ہوئی۔ اس لڑکی کا نام فاطمہ رکھا گیا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمہؑ سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے۔ ایک باپ اپنی بیٹی کو جتنا چاہتا ہے رسول اللہؐ اس سے زیادہ حضرت فاطمہؑ کو عزیز رکھتے تھے، جب کہ اس زمانہ میں لڑکی ننگ وعار و بدنامی کا باعث تھی۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ○ (سورۂ نحل: آیت ۵۸)

"اور جب وہ بیٹی کی ولادت کی خبر سنتے تھے تو ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا اور وہ غضب ناک ہو جاتے تھے"۔

آخرکار اس لڑکی کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ایسے ماحول میں حضرت فاطمہ علیہا السلام کی ولادت ہوئی۔ بہت عزیز ومحترم قرار دی گئیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی آپؑ کو بہت زیادہ عظمت عطا کی۔ آپؑ کو اپنا جز قرار دیا، آپؐ نے فرمایا:

فاطمة بضعة منّي (بحار الانوار: ج ۲، ص ۳۷۹)

"فاطمہؑ میرے جگر کا ٹکڑا ہیں"۔

خداوندعالم نے آپؑ کو کوثر قرار دیا:

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ○ (سورۂ کوثر: آیت ۱)

"اے رسولؐ! ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا"۔

یعنی ہم نے آپؐ کو فاطمہؑ عطا کی، وہ فاطمہؑ جو آپؐ کی اولاد سے دنیا کو پر کر دیں گی۔ خدا نے چاہا کہ فاطمہؑ کے ذریعے عورت کو عظمت و وقار عطا کرے۔ عورت کے کھوئے ہوئے انسانی حقوق دوبارہ عطا کرے۔ خدا نے چاہا کہ فاطمہؑ کے وجود سے عورت کے بارے میں اسلامی مکتب فکر بیان کرے۔ آج سے پہلے عورت کو جینے کا حق نہ تھا، ملکیت حاصل کرنے کا حق نہ تھا، میراث لینے کا حق نہ تھا، شوہر کے انتخاب کا بھی حق نہ تھا۔ مختصر یہ کہ عورت کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ دیگر اشیاء کی طرح اس کی خرید وفروخت ہوتی تھی۔ حیوانوں کی طرح اس کا تبادلہ ہوتا تھا۔

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی ولادت ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سینے پر جگہ دی، احترام کیا۔ حضرت فاطمہؑ جب بھی باپ کی ملاقات کو جاتیں، رسولِ اکرم مرحبا کہتے اور محدث قمی کی روایت کے مطابق حضرت فاطمہؑ کے طیب وطاہر ہاتھوں کا بوسہ لیتے۔ رسولؐ اکرم چاہتے تھے

کہ اس طرح حضرت فاطمہؑ کی شخصیت و عظمت کو نمایاں کریں اور عورت کے بارے میں جاہل و نادان افراد کی فکروں کو بدل دیں۔

حضرت فاطمہؑ رفتہ رفتہ بڑی ہونے لگیں۔ آپؑ کا تقویٰ، عفت اور پاک دامنی مشہور ہوگئی۔ ہر جگہ فاطمہؑ کے روحی و معنوی کمالات کا چرچا تھا۔ مکہ، مدینہ اور پھر عرب کے تمام گھرانوں میں اسلام کی ملکہ کے فضائل کا تذکرہ تھا۔ رفتہ رفتہ حضرت فاطمہؑ اس عمر کو پہنچیں جب لڑکیوں کی شادی ہوا کرتی ہے۔

عرب کے روساء اور حجاز کے نمایاں افراد آرزومند تھے کہ یہ عظیم افتخار انھیں حاصل ہوا اور یہ بلبل سعادت ان پر سایہ فگن ہو۔ چنانچہ حضرت فاطمہؑ کی خواستگاری کے لیے گھرانوں میں عجیب عجیب کوششیں شروع ہوگئیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو بھی مثبت جواب نہ دیا۔ پیغمبرؐ خدا چاہتے تھے کہ معاشرے میں جتنی بھی غلط رسومات ہیں اس میں شادی کے ذریعے ان کا خاتمہ کردیں اور معاشرے میں اہم تبدیلی لائیں۔

اس دن تک شادی کا معیار اور امتیاز واہیات چیزیں تھیں۔ رسول اللہؐ کی نظر میں ان معیار کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ آپؐ چاہتے تھے کہ عملی طور پر رائج معیار کو ملتِ اسلامیہ کے سامنے بے اہمیت بنا کر پیش کریں۔

حضرت علی علیہ السلام بھی دل میں جنابِ فاطمہؑ کی خواستگاری کی آرزو رکھتے تھے لیکن تنگدستی مانع تھی کہ اپنی خواہش کو رسول اللہؐ کے حضور میں پیش کریں۔ آخرکار ایک روز آپؑ نے اپنا آخری فیصلہ کرلیا اور رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن مدعا بیان کرنے میں حیا مانع ہوئی۔ پیغمبرؐ خدا نے محسوس کرلیا اور فرمایا: اے ابوطالبؑ کے بیٹے! کیا چاہتے ہو؟ کیا حاجت ہے؟ تمھارے دل میں جو بھی ہے اسے بیان کرو۔

آخرکار حضرت علی علیہ السلام نے عرض کیا: حضرت فاطمہؑ کی خواستگاری کے لیے آیا ہوں۔

پیغمبر اکرمؐ وہاں سے اُٹھے، جنابِ فاطمہؑ کے یہاں تشریف لے گئے تاکہ اس بارے میں ان کے نظریہ کو جان سکیں۔

کیا اسلام کی نظر میں شوہر کے انتخاب کا حق عورت کے مسلّم حقوق میں سے نہیں ہے؟ اسی

بنا پر باوجود اس کے کہ رسولِ اکرمؐ علیؑ و فاطمہؑ کی شادی پر تہہ دل سے راضی تھے، بغیر جناب فاطمہؑ کی مرضی معلوم کیے ہوئے ہاں یا ناں میں کوئی جواب نہ دیا بلکہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کے پاس گئے، واقعہ بیان فرمایا۔ حضرت فاطمہ علیہا السلام نے خاموشی اختیار کی۔ گویا شادی کے بارے میں خاموشی کو رضا سمجھا جاتا تھا۔ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے شادی کے بارے میں حضرت فاطمہ علیہا السلام کے مثبت جواب کو دریافت کرلیا تب علی علیہ السلام کے پاس آئے۔ صاف طور پر علی علیہ السلام کی فرمائش کو قبول کرلیا اور فرمایا: اس شادی کے لیے تم نے کتنے مہر کا انتظام کیا ہے؟

حضرت علی علیہ السلام نے عرض کیا: میرے پاس ایک تلوار، ایک زرہ اور ایک اُونٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تلوار کی تمھیں ضرورت ہے، اسے فروخت نہ کرو۔ پانی بھرنے کے لیے اُونٹ کی بھی ضرورت ہے۔ تم ایک شجاع انسان ہو، لہٰذا تمھیں زرہ کی ضرورت نہیں ہے، اسے فروخت کردو۔

زرہ کو فروخت کر کے شادی کے اخراجات کے لیے پیسہ فراہم کیا گیا۔ تمام رسوم بڑی سادگی سے فضیلت و تقویٰ کے ساتھ انجام پائیں۔ حضرت فاطمہ علیہا السلام شوہر کے گھر گئیں اور اُمورِ خانہ داری و شوہر کے آداب و رسوم کے لیے مسلمان عورتوں کے لیے بہترین نمونہ قرار پائیں۔

جس رات جنابِ فاطمہ علیہا السلام شوہر کے گھر رخصت ہو کر گئیں، عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایسا واقعہ جو حضرت فاطمہ علیہا السلام کی عظمت و بزرگی روح کو پورے طور پر نمایاں کر گیا۔

اس رات دلہن کے گھر میں شادی کی رسوم جب انجام پا چکیں تو اب رخصتی کا وقت آیا۔ شہر کی محترم و معزز خواتین نے حضرت فاطمہ علیہا السلام کی سواری کو حلقہ میں لیا اور حضرت علی علیہ السلام کے گھر کی جانب بڑھ گئیں۔ اس رات شادی کی مناسبت سے جنابِ فاطمہ علیہا السلام نے نیا لباس زیب تن کیا تھا۔ آپؑ کے امکان میں تمام زر و زیور تھا مگر آپ نے اسی ایک لباس پر اکتفا کیا۔ شہر کی خواتین میں رسولؐ کی بیٹی کی سادگی کا چرچا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایک جوان لڑکی اور وہ بھی شادی کی رات اتنی سادگی اور ہر قسم کی آرائش سے دُور شوہر کے گھر جائے۔

شادی کی بھیڑ بھاڑ اور شور و غل کے درمیان اچانک حضرت فاطمہؑ نے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ ایک معمولی سا گریہ تھا۔ نالہ بلند کرنے والے نے کہا: اے فاطمہؑ! اے دخترِ رسولؐ! اب

تم شوہر کے گھر جارہی ہو، تمھارے اردگرد لوگ خوشیوں میں مشغول ہیں لیکن تمھیں ذرا بھی خبر ہے کہ اس وقت ایک فقیر و نادار عورت کو لباس کی ضرورت ہے۔ اے دخترِ رسولؐ! کیا تم نہیں چاہتی کہ خدا کے لیے آج کی شب ایک برہنہ کو لباس عطا کرو۔

آواز ختم ہوگئی۔ شادی کے شور وغل اور بھیڑ میں آواز گم ہو کر رہ گئی لیکن حضرت فاطمہؑ کی روح میں اثر کرنے کے لیے اتنی ہی آواز کافی تھی کہ آپؑ اپنے اہم فریضہ کی طرف متوجہ ہوجائیں۔

حضرت فاطمہ علیہا السلام کھڑی ہوگئیں۔ حضرت فاطمہؑ کے اچانک اور بے موقعہ کھڑے ہوتے سے شہر کی عورتیں متعجب تھیں۔ عورتوں نے حضرت فاطمہؑ کا جو حلقہ کر رکھا تھا اس سے حضرت فاطمہؑ نے اپنے کو علیحدہ کیا، اپنا نیا لباس اُتار کر محتاج کے حوالے کیا۔ اپنا پرانا لباس زیب تن کیا اور اسی پرانے لباس میں شوہر کے گھر گئیں۔

یہ ایک درس ہے جو دُخترِ رسولؐ، صنفِ نسواں کو دے رہی ہیں۔ آپؑ کہنا چاہتی ہیں۔ عورت کا کمال، عورت کی فضیلت، عورت کی عزت و آبرو، اس میں نہیں ہے کہ وہ اپنے کو زینت و تجمل میں غرق کرلے اور زندگی کا محور و رسم قرار دے بلکہ عورت کا کمال تقویٰ میں ہے، عفت پاک دامنی میں ہے، فضیلت میں ہے، وہ مظلوم کی فریاد سنے، فقیر و محتاج کے دل پر مرہم رکھے۔

ہاں حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام، عزت و عظمت کے باوجود ہر قسم کے تجمل سے دُور تھیں۔ ایک روز رسولِ اکرمؐ حضرت فاطمہ علیہا السلام کے گھر تشریف لائے۔ پہلی مرتبہ فاطمہؑ کے بدن پر زیور کا مشاہدہ کیا۔ اظہارِ ناراضگی کیا اور گھر سے مسجد کی طرف چلے گئے۔ حضرت فاطمہ علیہا السلام جنھیں صنفِ نسواں کو سادگی کا درس دینا تھا، نے فوراً زیور اُتارا اور پدرِ بزرگوار کی خدمت میں بھیج دیا، پیغام بھی دیا کہ بابا جانؐ! اسے خدا کی راہ میں دے دیجیے۔

آپؑ ایک فعال اور زحمت کش خاتون تھیں، یہاں تک کہ گھر کے لیے آٹا بھی گھر میں پیستی تھیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ آپؑ نے اتنی چکی چلائی کہ ہاتھوں میں زخم ہوگئے تھے۔ وہ ایسا زمانہ تھا جب عورت کو صرف مرد کی تسکین کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں عورت کا مقام صرف یہ تھا کہ وہ مرد کی آتشِ ہوس کو خاموش کرے اور اس کی شہوت کو سکون عطا کرے۔

حضرت فاطمہ زہراؑ کو یہ راستہ تبدیل کرنا تھا۔ صنفِ نسواں کو یہ تعلیم دینی تھی کہ کسی طرح

شہوت پرست مردوں سے اپنی حفاظت کر سکیں۔ عورت کی منزلت اور اس کا مقام ان چیزوں سے بالا ہے۔ اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ عورت کا انسانی مقام اور اس کی بلند شخصیت شہوت اور ہوس کی حد تک گر جائے۔ اسلام نے کوشش کی ہے کہ عورت کو ہوس و شہوت کا شکار نہ ہونے دے اور اس راستہ میں اتنا اصرار ہے کہ قانون کے خلاف مردوں کی شہوت بھری نظر بھی نہ پڑنے پائے۔

اب یہ درس زہرائے مرضیہ عملی طور پر صنفِ نسواں کو دے رہی ہیں:

ایک دن ایک نابینا شخص خانہ رسولؐ اللہ میں حاضر ہوا۔ حضرت زہراؑ وہاں تشریف فرما تھیں۔ جیسے ہی وہ نابینا داخل ہوا۔ حضرت زہراؑ نے اپنے کو چادر میں چھپایا اور کنارے چلی گئیں۔

پیغمبرؐ خدا نے فرمایا: یہ شخص نابینا ہے۔

حضرت فاطمہ زہراؑ نے عرض کیا: ٹھیک ہے، وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا، مگر میں تو اسے دیکھ سکتی ہوں۔

یہ ہے حضرت زہراؑ کا مقامِ عفت، یہ درس ہے جو آپؑ نے عورتوں کے معاشرہ کو دیا ہے۔ آپؑ معتقد تھیں کہ عورت کا کمال یہ ہے کہ وہ بافضیلت اولاد کی تربیت کرنے میں کامیاب ہو۔ یہ درس بھی دخترِ رسولؐ نے عملی طور پر خواتین کو دیا ہے۔ آپؑ نے خود زینب کبریٰؑ و حسنینؑ جیسے بچوں کی تربیت کی۔ ان میں سے ہر ایک نے انسانیت کی سعادت کی رہبری کرنے میں اہم اور مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ ایسے بچے جنھوں نے انسان کو بدبختی سے نجات دلانے کے لیے خود کو آتش و خون کے حوالے کر دیا اور پوری توانائی کے ساتھ اُمواج و حوادث کے سپرد کر دیا، حق و عدالت کے لیے اپنی جان نثار کر دی۔

حضرت فاطمہؑ ایک عظیم مربی کا کردار ادا کرتی رہیں یہاں تک کہ مصیبت عظمیٰ آپڑی۔ باپ کی موت جیسی مصیبت، ایسا باپ جو مہر و محبت کا مرقع اور خدا کا رسولؐ تھا۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ آپؑ پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ گویا یہ مصیبت حضرت فاطمہؑ کے لیے تمام حوادث کا پیش خیمہ تھی۔ باپ کی موت کے بعد آپؑ پر بہت مصیبتیں پڑیں، انھیں حوادث کی بنا پر حضرت علی علیہ السلام خانہ نشین ہو گئے اور فدک جیسی جائیداد حضرت فاطمہ زہراؑ کے ہاتھوں سے نکل گئی۔

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام نے ان حوادث سے مقابلہ کرنے کا آغاز کیا اور اپنے مسلّمہ حقوق کو

ثابت کرنے کے لیے مسجد تک جانا گوارا کیا۔ مسلمانوں کے مجمع میں پس پردہ دلوں کو دہلا دینے والی جوشیلی تقریر کی۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ پر جو مختلف حوادث پڑے تھے آپ بہت زیادہ پریشان تھیں جن کی بنا پر آپ زیادہ اس دنیا میں نہ رہ سکیں۔ وفاتِ رسولؐ کے ۷۵ روز یا ۹۵ روز بعد اس دنیا سے رحلت کر گئیں۔ اسلامی معاشرہ کو اور فطرت کو غم و اندوہ میں چھوڑ گئیں۔

ساری کائنات میں کہرام تھا۔ تاریکیٔ شب میں غم کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ آسمان سے ستارے بھی غم کے آنسو بہا رہے تھے۔ شاخۂ آسمان پر چاند کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ آسمان و زمین کو وہ وحشت شہر و بیابان سب پر ایک تاثر ہوا تھا۔ ہواؤں میں اضطراب تھا۔ تمام موجودات میں وہ نالۂ پُرسوز سنا رہی تھی۔ اس شب دنیا کو گویا اندوہ کے ڈھانچے میں کر دیا گیا ہے جسے دیکھ کر اہل بہشت و اہل آسمان اشک افشانی کر رہے تھے، اشک بہا رہے تھے تاکہ آسمان کے راستہ کی آبیاری کریں جس سے آپ کی روح بہشت میں اپنے مقام تک جا سکے۔

وہ ایسا لمحہ تھا جب پھول پژمردہ ہو رہا تھا۔ وہ پھول جو ایک روز باغِ بہشت سے ملائکہ کے نُورانی ہاتھوں سے ہوتا ہوا ایک بہترین پھول کی صورت میں زمین پر آیا تھا۔ ہاں وہ بہشت سے آئی تھیں۔

آپ کا نُور، آپ کی چمک، آپ کی پاکیزگی، آپ کا تقویٰ سب کچھ بہشتی تھا۔ عرشِ خدا و ملکوتِ اعلیٰ سے یہ طلائی پرندے فضائل کے حامل زمین پر اس لیے آئے تھے کہ زمین پر بہشتِ خدا کی جلوہ نمائی کریں اور لوگوں کی آنکھوں کے سامنے دل پذیر اور خوش منظر بن کر رہیں۔

حضرت فاطمہؑ نے اپنے فرائض انجام دیے تھے اور اب رخصت ہوگئی تھیں تاکہ اپنے سرچشمہ کی طرف دوبارہ پلٹ آئیں۔ بہت سی روایات کے مطابق رحلت کی شب، ۱۳ جمادی الاول ۱۱ ہجری تھی۔ اسی شب میں حضرت فاطمہ زہراؑ نے دارِ دنیا کو وداع کیا اور جنتِ رضوان کی طرف پرواز کر گئیں۔

سلام اللہ علیھا و علی ابیھا و بعلھا و بنیھا

"سلام ہو آپ پر، آپ کے والد بزرگوار، شوہرِ نامدار اور باوقار بیٹوں پر"۔

حضرت امام حسن علیہ السلام
کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

ہمارے دوسرے امام حضرت حسن بن علی علیہ السلام نے ۱۵ رمضان المبارک ۲ ہجری کو مدینہ منورہ میں ولادت پائی۔ آپؑ کے والد ماجد حضرت علی علیہ السلام اور مادرِ گرامی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہیں۔

عہدِ طفلی اپنے نانا پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے والدین، علی مرتضیٰؑ و فاطمہ زہراؑ کے پاک و پاکیزہ سایۂ عاطفت میں گزارا۔ آپؑ علم و زُہد اور تقویٰ کے لحاظ سے اپنے عہد کے تمام لوگوں سے بلند تھے۔ آپؑ نے ان ہی اعلیٰ اَقدار کی بنا پر بعد میں والد سے امامت کی میراث پائی۔

۲۱ رمضان المبارک ۴۰ ہجری کو حضرت علی علیہ السلام درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو قطعی شک نہیں تھا کہ پورے اسلامی معاشرہ میں حضرت امام حسن علیہ السلام کے سوا کسی میں امامت کے درجہ پر فائز ہونے کی صلاحیت و شائستگی نہیں ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اہلِ کوفہ نے (کہ اس زمانہ میں کوفہ اسلامی حکومت کا مرکز تھا) حضرت امام حسن علیہ السلام کے ہاتھوں پر بیعت کی اور اُمت کے مسائل آپؑ کو تفویض کیے لیکن......

امامت کے سلسلہ میں حضرت امام حسن علیہ السلام کے سامنے ایک بہت بڑی مشکل تھی۔ مدینہ، مکہ، بصرہ اور اسلامی طاقت کے مرکز کوفہ آپؑ کے علم و عدل کے سامنے جھک گئے اور آپؑ کی بیعت کرلی۔ لیکن شام معاویہ کے زیرِ اثر و تسلط تھا۔ معاویہ خاندانِ نبوت کے دیرینہ دشمن ابوسفیان کا بیٹا تھا۔ خلفائے ثلاثہ کے دورِ اقتدار میں، ابوسفیان کی چالاکی سے معاویہ کا بھائی یزید بن ابی سفیان شام کا گورنر مقرر ہوا اور اس نے ابتدا ہی سے الٹی تبلیغات سے لوگوں کے ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اس منصوبہ کا مقصد شامی فوج کی مدد سے تختِ خلافت پر قبضہ کرنا اور پھر پورے اسلامی معاشرہ پر حکومت کرنا تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسلامی معاشرہ کہ جس کی تربیت اصیل اسلامی کی بنیاد پر عدل خواہی و عدالت جوئی کے مطابق ہوئی ہے۔ وہ آسانی سے اس کی طرف رُخ نہ کرے گا۔ اس نے پیشین گوئی کی تھی اس مقصد تک رسائی میں سب سے بڑا خطرہ خاندانِ علیؑ بن ابی طالبؑ ہے، کہ جس کا ہر فرد اپنی جگہ اسلامی عدالت کا مکمل نمونہ و پیکر ہے۔

واضح ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت امام حسن علیہ السلام کے ہوتے ہوئے وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے اس نے شام میں، جو کہ اسلامی معاشرہ کا معتد بہ حصہ نیز ثروت مند علاقہ تھا۔ دونوں طریقوں سے اپنی فعالیت کا آغاز کیا۔

چونکہ شام مدینہ، مکہ اور کوفہ سے بہت دُور تھا اور وہاں کے لوگوں کو خاندانِ علی کے دیدار کی بہت ہی کم توفیق ہوتی تھی لہٰذا اس نے جھوٹے پروپیگنڈے اور فریب کارانہ طریقہ سے اہلِ شام کو علیؑ و خاندانِ علیؑ سے بدظن کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ معاویہ نے اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور خاندانِ علیؑ کے خلاف تبلیغات میں کسی بھی حربہ کے استعمال میں دریغ نہیں کیا۔ چنانچہ حادثۂ قتلِ عثمان سے اس نے خوب فائدہ اُٹھایا اور یہ پروپیگنڈا کیا کہ قتلِ عثمان میں حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ ہے۔ اس سے اہلِ شام، جو کہ سیاست سے بے خبر اور شہر مدینہ سے دُور تھے، علیؑ کے مخالف ہو گئے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ شام ایک ثروت مند و متمول علاقہ تھا، لہٰذا معاویہ کے قبضہ میں کافی مال تھا۔ وہ بیت المال میں خیانت کر کے مملکت کے عام مال کو اپنے ذاتی و نجی اُمور پر صرف کرتا تھا۔ دولت کی فراوانی تھی۔ چنانچہ اس نے ایسی بہت سی اسلامی شخصیتوں کا دین و ایمان خرید لیا جن کا اسلامی معاشرہ میں اثر و نفوذ تھا اور انھیں اپنی طرف مائل کر لیا۔

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام کا ایسی ہی مکارانہ سیاست سے مقابلہ تھا۔ حضرت امام حسنؑ معاویہ سے غافل نہیں تھے، جانتے تھے کہ ایک روز اس سے جنگ ہو گی لیکن جنگِ صفین جو کہ حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کے ٹکراؤ کا ایک نمونہ تھا ۔۔۔ کے حالات آپؑ کی نظروں میں گھومتے رہتے تھے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام یاد کرتے تھے کہ اس جنگ میں والد کی فوج کے سربرآوردہ افراد نے معاویہ کے درہم و دینار کے عوض اپنا دین بیچ دیا تھا، یہاں تک کہ خود حضرت علی علیہ السلام پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ گویا گذشتہ حوادث و حالات کے پیشِ نظر حضرت امام حسن علیہ السلام معاویہ سے اُلجھنے کے سلسلے میں متردد تھے۔ آپؑ یہ چاہتے تھے کہ اس مشکل سے اسلامی معاشرہ کو دوسرے ذریعہ سے نجات دلائیں۔

حضرت امام حسن علیہ السلام منصبِ امامت پر فائز تھے، یعنی ایک ملت کی مادی و معنوی قیادت

صرف اس شخص کے سپرد کی جاسکتی ہے جو کہ ملت کے لیے قربان ہونے کا حوصلہ وقدرت رکھتا ہو، یہ اسلامی طرزِ فکر ہے جو کہ ٹھیک دنیائے مادہ کے عملی نظام کے محور کے خلاف ہے۔

منصب امامت جتنا اہم وعظیم ہے اتنا ہی ذمہ دار وخطیر ہے۔ اس منصب کا اوّلین راز ان لوگوں کے لیے قربانی کے لیے تیار رہنا ہے جو کہ امامت وحکومت کے سایہ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس فصل میں ایسے بہت سے مسائل پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے حضرت امام حسن علیہ السلام دوچار تھے اور مختلف زاویوں سے حضرت امام حسن علیہ السلام کی شخصیت کو موضوعِ بحث قرار دیا جاسکتا ہے۔ آپؑ کا علم، اخلاق، لطف ومحبت، صبر وبردباری اور آپؑ کے انسانی ملکات میں سے ہر ایک مستقل عنوان ہے کہ جس پر ایک بڑی کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ لیکن ہم اختصار کے پیش نظر اس سے چشم پوشی کرتے ہیں اور صرف آپؑ کی حیات کے درخشاں ترین خطوط کو قلم بند کرتے ہیں۔ لوگوں کے لیے قربانی دینا تو آپؑ کی امامت وقیادت کا رمز ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام بھی اسی راہ میں قربان ہوئے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں تو شاید آپ کو تعجب ہوگا کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی قربانی زیادہ جاں گداز اور حوصلہ شکن ہے!

فرائض کے لحاظ سے دونوں فریضہ کی انجام دہی کے لیے اُٹھے لیکن یہ اجتماعی حالات تھے کہ دونوں کی قربانی اور فریضہ کی انجام دہی دو مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئی۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کا طریقہ قربانی بہت زیادہ دردناک ہے۔

آپؑ روزِ جنگ اپنی شیر دلی کی آن بان سے چشم پوشی کرکے چند گھنٹوں میں تمام مصیبت و بلا کے بعد آسودہ ہوسکتے تھے اور اس جہان کی آسائش سے مالا مال ہوسکتے تھے۔ لیکن نہیں، یہ آپؑ کا فریضہ نہیں تھا۔

اس سے بڑی مکاری اور بڑے دھوکے کا مقابلہ کرنا تھا۔ معاویہ کی دلی تمنا یہ تھی کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کو قتل کردیا جائے تاکہ اس کی راہ سے مانع ہٹ جائے اسی لیے وہ امام حسن علیہ السلام کے حکمِ جنگ صادر کرنے سے پہلے شام سے چلا، وہ اس لیے تیزی سے آیا تاکہ اپنی ان خواہشوں کی راہ سے، جو کہ انسانیت کی ضد ہیں، ایک عظیم پہاڑ کو ہٹا سکے اور پھر اطمینان کے ساتھ اسلام کا خاتمہ کرسکے۔

وجودِ امام حسنؑ ایک عظیم مانع

انسان فطری طور پر نیکی وفضیلت کی طرف راغب ہوتا ہے اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نہایت ہی بُردبار اور حلیم ومتواضع تھے۔ ایک روز چلے جارہے تھے، دیکھا کہ ایک چادر پر چند فقیر بیٹھے کھانا کھارہے ہیں۔ حضرت امام حسنؑ ان کے قریب گئے۔ انھوں نے کہا: بسم اللہ۔ امام علیہ السلام سواری سے اُتر کر ان کے فقیرانہ دسترخوان پر بیٹھ گئے اور فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُتَكَبِّرِيْنَ ''بے شک خدا تکبر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ہے''۔

عبادت میں کوئی آپؑ کے مثل نہیں تھا۔ جب نماز کے لیے خدا کے حضور جاتے تو بدن میں لرزا پیدا ہوجاتا تھا۔ ۲۵ حج پاپیادہ کیے، بارہا راہِ خدا میں اپنا مال تقسیم کیا، جودوسخا میں سب سے آگے تھے۔

آیت اللہ العظمیٰ سیّد علی خامنہ ای، رہبر انقلاب اسلامی ایران کے ترجمہ ''صلح امام حسنؑ'' میں مرقوم ہے کہ ایک ہاشمی اور ایک اُموی کے درمیان بحث ہورہی تھی۔ یہ اپنے خاندان کو بڑا کہہ رہے تھے، وہ اپنے خاندان کو...... آخرکار طے یہ ہوا کہ ہر ایک اپنے اپنے خاندان کے دس اشخاص کے پاس جائیں اور ان سے کچھ طلب کریں۔ اُموی، بنی اُمیہ کے دس افراد کے پاس گیا، ان میں سے ہر ایک نے دس دس ہزار دینار دیے۔ ہاشمی پہلے حضرت امام حسن علیہ السلام کے پاس آیا تو امام علیہ السلام نے ڈیڑھ لاکھ درہم دینے کا حکم دیا۔ پھر وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا۔ آپؑ نے معلوم کیا کہ مجھ سے پہلے بھی کسی کے پاس گئے تھے؟ اس نے کہا: جی ہاں آپؑ کے بھائی حسنؑ کے پاس گیا تھا۔ فرمایا: میں اپنے سرور کے عطیہ سے زیادہ نہیں دے سکتا، لہٰذا آپؑ نے بھی ڈیڑھ لاکھ درہم دیے۔

اُموی کو دس آدمیوں سے ایک لاکھ درہم ملے تھے اور ہاشمی کو دو سے تین لاکھ ملے تھے۔ اُموی اس تفاوت سے بہت غضب ناک ہوا اور دینے والوں میں سے ہر ایک کے درہم لوٹا دیے اور انھوں نے بھی واپس لے لیے۔ ہاشمی نے بھی ایسا ہی کیا لیکن حسنینؑ نے واپس نہیں لیے اور دونوں نے فرمایا: اگر چاہو اُٹھالے جاؤ، چاہو زمین پر پھینک دو، ہم عطیہ واپس نہیں لیتے ہیں۔

حضرت امام حسن علیہ السلام اپنے وقت کے اعلم تھے۔ سخن وری میں کوئی آپؑ کا ثانی نہیں

تھا۔ متقی و پرہیزگار تھے۔ مختصر یہ کہ جو صفات ایک انسان کامل میں ہونی چاہییں وہ سب آپؑ میں تھیں۔

لوگ حضرت امام حسن علیہ السلام کے اندر تمام فضائل و کمالات کو احسن انداز میں جلوہ گر دیکھتے تھے۔ انسان فطری طور پر نیکی و فضیلت کی طرف مائل ہے۔ عدل و فضیلت کے پیکروں سے عشق کرتا ہے۔ حضرت امام حسن علیہ السلام ایسے پیکروں میں آشکار اور نمایاں فرد تھے۔ ان فضائل کی وجہ سے لوگوں کا آپؑ کی طرف متوجہ ہونا فطری تھا نہ کہ معاویہ کی طرف جس کا وجود ظلم و ستم سے خمیر تھا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام اس مسئلے کو اچھی طرح محسوس کرتے اور جانتے تھے کہ لوگوں کے درمیان آپؑ کی محبوبیت بھی معاویہ کی من مانیوں کے لیے ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ معاویہ بھی اس سے بے خبر نہیں تھا اور اس کی پوری کوشش اس بات پر صرف ہو رہی تھی کہ جیسے بھی ہو، جنگ یا صلح کے ذریعے اس رکاوٹ کو راستہ سے ہٹا دے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام بھی حالات کے تجزیہ سے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ جنگ میں مسلمان قتل ہوں گے اور اسلام نابود ہو جائے گا لیکن معاویہ کے پاس اس مانع کو ہٹانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے دو ہی راستے تھے: جنگ کے ذریعے آپؑ کو خاموش کرے یا صلح کے وسیلہ سے۔ وہ احتیاط کے ساتھ شام سے عظیم لشکر کے ہمراہ کوفہ کی طرف چلا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور انھیں معاویہ سے جنگ و جہاد کی دعوت دی۔ آخر کار ایک لشکر جمع ہو گیا۔ اس لشکر میں تقریباً چالیس ہزار سپاہی شامل تھے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے پہلے کوفہ کے شرفا میں سے "حکم کندی" کو کوفہ کے سپاہیوں کی ایک جماعت کا سپہ سالار مقرر کیا اور معاویہ کی طرف روانہ کیا۔ یہاں سے حضرت امام حسن علیہ السلام کی زندگی میں دردناک حوادث کا سلسلہ شروع ہوا۔

معاویہ کو کوفہ کے حالات معلوم ہو چکے تھے۔ اس نے "حکم" کے نام ایک خط لکھا اور اس سے یہ وعدہ کیا کہ "اگر تم میرے پاس آؤ گے تو میں تمھیں شام یا جزیرہ نما عرب کے کسی شہر کا گورنر بنا دوں گا۔ "حکم" نے خط پڑھا اور نصف شب میں اپنی فوج کو چھوڑ کر معاویہ کے پاس چلا گیا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے بنی مراد کے ایک شخص کو "حکم" کی جگہ پر معین کیا اور اسے معاویہ کی طرف

بڑھنے کا حکم دیا۔ معاویہ نے اس کے لیے پانچ لاکھ درہم بھیج دیے۔ چنانچہ جب اس نے اتنی بڑی رقم اپنے سامنے دیکھی تو وہ بھی نصف شب میں معاویہ کے پاس چلا گیا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے تیسرا شخص "عبید اللہ بن عباس" کو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا مگر افسوس کہ معاویہ نے عبید اللہ بن عباس کو بھی فریب دے دیا اور یہ وعدہ کیا کہ اگر تم بھی میرے پاس آجاؤ گے تو تمھیں دس لاکھ درہم دوں گا۔ پانچ لاکھ اسی وقت دے دیے اور پانچ معاویہ کے پاس پہنچنے پر دینے کا وعدہ کیا۔ لہٰذا ابن عباس بھی معاویہ کے پاس پہنچ گیا۔

مختصر یہ کہ معاویہ نے درہم و دینار کے ذریعے امام حسن علیہ السلام کی فوج کے سربر آوردہ افراد کو آپؑ سے جدا کر دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے کہ آپؑ کی فوج کے بعض سپاہیوں نے آپؑ پر تلواریں کھینچ لیں اور آپؑ کو زخمی کر دیا۔

یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر حضرت امام حسن علیہ السلام کو آپؑ کے بھائی حضرت امام حسین علیہ السلام کے برابر بہتر اشخاص ہی باوفا مل گئے ہوتے تو آپؑ ہرگز صلح نہ کرتے اور معاویہ کی ظالم حکومت کو نابود کرنے کی کوشش کرتے لیکن نامساعد حالات کے تحت آپؑ نے مجبوراً صلح نامہ پر دستخط کیے اور یہ طے کیا کہ اس راستہ سے نہیں مگر دوسرے راستہ سے معاویہ اور ظالم بنی اُمیہ سے مبارزہ کریں گے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام جانتے تھے کہ ابھی اس خاندان (اُمویہ) سے جنگ کرنے کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں، مگر اس خاندان کے خلاف، جو کہ ناموسِ اسلام اور اسلام کی عدالتِ اجتماعی سے جنگ کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے، انقلاب بپا کرنا ہے۔ لیکن امام علیہ السلام اس بات کو بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اجتماعی نقطۂ نظر سے انقلاب کے لیے بھی خاص حالات درکار ہیں کہ ان کے فراہم ہوئے بغیر انقلاب کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لیے آپؑ نے یہ طے کیا کہ خلافت سے دست بردار ہوکر انقلاب کے لیے زمین ہموار کریں اور زمین ہموار کر کے اپنے بھائی حضرت امام حسین علیہ السلام کے سپرد کر دیں تاکہ وہ کربلا کا عظیم انقلاب بپا کریں۔

اس طریقے سے حضرت امام حسن علیہ السلام نے اولاً خود کو بچا لیا اور اپنی باعظمت شخصیت کی حفاظت کر کے پہاڑ کے مانند معاویہ کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

دوسرے امام حسن علیہ السلام نے اپنی روشن فکری سے لوگوں کی عقل کو روشن کر دیا اور لوگوں کے

ذہنوں کو انقلاب کے لیے تیار کرلیا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اٹھیں اور سانحۂ عاشورہ کو وجود میں لائیں۔ اس سلسلہ میں حضرت امام حسن علیہ السلام نے معاشرہ اور لوگوں کو ترجیح دی۔ آپؑ کو لوگوں کے لیے قربان ہونا تھا، خواہ شہادت کے ذریعے کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے شہادت میں مصلحت نہ تھی، یا دوسرے طریقہ سے، کہ آپؑ زندہ رہیں، مصائب و آلام برداشت کریں اور ایک عظیم پہاڑ کے مانند معاویہ کی ستم گرانہ خواہشوں کے مقابلے میں ڈٹے رہیں۔ اُس وقت کے خاص حالات کی بنا پر آپؑ نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ راستہ پہلے راستے سے کہیں زیادہ سخت اور صبر آزما تھا۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے شیر دلی کی آن بان کا ثبوت دیا اور معاشرے کی مصلحت و بھلائی کی خاطر صلح قبول کرلی۔ مدینہ واپس تشریف لے گئے۔ اب امام علیہ السلام کی زندگی کی دوسری فصل کا آغاز ہوتا ہے۔

اس فصل میں آہستہ آہستہ امام علیہ السلام قربان ہوجاتے ہیں، لیکن ایسے نہیں کہ جس طرح ایک سپاہی میدانِ جنگ میں حملہ کرتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں جان دے دیتا ہے، بلکہ آپؑ اس قیدی کے مانند جو کہ طویل شکنجوں اور مشقتوں کے بعد موت کو گلے لگاتا ہے۔ دس سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام، معاویہ سے صلح کے بعد مدینہ آگئے اور دس سال تک لوگوں کے امامؑ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے اس دس سال کے طویل عرصہ میں رفتہ رفتہ شہادت پائی ہے اور اس جانبازی سے آپؑ نے مکتب اور آئیڈیالوجی کو بچالیا کیونکہ معاویہ سب کچھ اسلام کے نام پر کرنا چاہتا تھا۔

اس زمانہ میں حضرت امام حسن علیہ السلام کی ذمہ داری یہ تھی کہ جہاں بھی معاویہ اسلام کے نام پر کوئی غلط کام انجام دے وہیں آپؑ مصائب و مشقت برداشت کر کے اس سے لوگوں کو آگاہ کریں تاکہ دیگر افراد کے افکار میں کجی پیدا نہ ہو اور انقلاب کی زمین ہموار ہونے تک رسولؐ کا لایا ہوا اسلام ان کے ذہن میں محفوظ رہے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام چاہتے تھے کہ معاویہ کی کمزوریوں کو اور اسلام کے خلاف اس کے کرتوتوں کو معاشرہ کے سامنے پیش کردیں۔ پھر معاشرہ سے اس کی مذمت کرائیں اور اس بات کو واضح کرنا چاہتے تھے کہ یہ رسولؐ کا اسلام نہیں ہے اور نہ ہی یہ اسلامی حکومت ہے کہ جس کو رسولؐ

آسمان سے زمین پر لائے تھے۔ان تمام باتوں کی وضاحت انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔

انقلاب کیا ہے؟ــــ ظلم اور بے عدالتی کے خلاف افکار کی سرکشی۔حاکم وجبار کے مقابلے میں پسے انسانوں کا بھڑک اٹھنا۔

جو قوم ظلم و بے عدالتی سے تنگ آچکی ہو، اس کا ناگہاں جوش وخروش میں آجانا اور اپنے خون کی گرمی سے ظالم وجابر کی حکومت اور اس کے تمام اثاثہ کو جلا کر راکھ کر دینا، کیا معاشرہ آسانی سے جوش میں آجاتا ہے؟ اس کے لیے غیر معمولی حالات درکار ہوتے ہیں۔تب کہیں ایسا مقدس جوش پیدا ہوتا ہے جو ظالم معاشرہ کے دَرودیوار کو ہلا دیتا ہے۔

اس کی اوّلین شرط یہ ہے کہ لوگ آگاہ، ذمہ دار، دل سوز اور جانباز ہوں تاکہ وہ اپنے علم و آگاہی کو خاص طریقے سے پھیلائیں تاکہ وہ معاشرہ کو بھی آگاہ کرسکیں کہ معاشرہ ریا وفریب کے ہزاروں پردوں کے پیچھے، معاویہ کی نماز جمعہ و جماعت اس کے ظاہری عدل کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کو سمجھ سکیں اور معاویہ کی ستم گری کو دیکھ سکیں۔یہ ہے امام حسنؑ کی ذمہ داری کہ آگاہی بخشیں اور طوفانِ انقلاب کے لیے زمین ہموار کریں۔

جنگ یا صلح

یہاں ہم ایک اور چیز کا تجزیہ کرتے ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت امام حسن علیہ السلام اور معاویہ کے سامنے دو راستے ہیں: جنگ یا صلح، امام علیہ السلام اور معاویہ جداگانہ طور پر اپنے اپنے خاص فکری معیار کے تحت ان دونوں راستوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔

معاویہ......

اگر وہ جنگ کو اختیار کرتا ہے اور آخرکار اپنے مکروفریب اور جنگی وسیاسی حکمت عملی سے حضرت امام حسن علیہ السلام کو شہید کر دیتا ہے تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔جس معاشرہ پر معاویہ حکومت کرنا چاہتا ہے، نواسۂ رسولؐ کی شہادت پر اس کا کیا ردِعمل ہوسکتا ہے؟

یہ صحیح ہے کہ قوم کے سربرآوردہ افراد کے منہ کو حکومت اور درہم و دینار دینے کے وعدے

سے بند کیا جاسکتا ہے لیکن کیا ان عام لوگوں کے منہ کو بھی منصب و مال کے لالچ سے بند کیا جاسکتا ہے کہ ہمیشہ جن کی قوت سے انقلاب آتا ہے؟ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ عام افراد کی فکر کو خریدا جاسکتا ہے اور نہ انھیں فریب دیا جاسکتا ہے۔

یہ چیز ہم عہدِ حاضر کی انقلابی لہر میں، ہر جگہ، ویت نام میں، اریٹرہ میں، نکاراگوا میں، ایران میں مختصر یہ کہ تیسری دنیا میں ہر اس جگہ دیکھ سکتے ہیں جہاں کے لوگ انقلاب لاتے ہیں باوجودیکہ انقلاب سے قبل اور اس کے دوران پروپیگنڈہ کی مضبوط مشنری تاریخ کے معاویہ صفت لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہے لیکن وہ عام لوگوں کو فریب دینے سے عاجز ہیں۔ عام لوگ، پبلک ہمیشہ معاویہ جیسے افراد کے ذرائع ابلاغ کے پس پردہ حقیقت کو دیکھتے ہیں اور اس کا ادراک کرتے ہیں اور ہرگز فریب نہیں کھاتے ہیں۔ اگرچہ بیسویں صدی کے معاویہ صفت لوگ اس حقیقت کے درک کرنے سے عاجز ہیں لیکن معاویہ بن ابی سفیان اتنا چالاک تھا کہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

وہ اس حقیقت کو بھی درک کر چکا تھا کہ عدل و فضیلت کے حامی کے قتل پر معاشرہ اور عام لوگ ہرگز خاموش نہیں رہیں گے۔ اگرچہ میدانِ جنگ میں امام حسن علیہ السلام کو قتل کرنا آسان کام ہے لیکن عام افکار کے لحاظ سے بہت دشوار ہے۔

اس قتل و شہادت سے معاشرہ کو دھچکا لگتا ہے، انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ اگرچہ انقلاب ہمیشہ چھوٹی سی چیز سے شروع ہوتا ہے اور ابتداء میں اس کے محرک ایک یا چند افراد ہوتے ہیں، لیکن اس میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ شروع ہوتے ہی سُرعت پکڑ لیتا ہے۔ چنانچہ اریٹرہ کا انقلاب تین افراد سے شروع ہوکر لاکھوں تک پہنچ جاتا ہے اور آخرکار کامیاب ہوجاتا ہے۔

معاویہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کا قتل ایک عظیم و ہمہ گیر انقلاب کے برابر ہے۔ اس فارمولے کو اس نے ایک ناقابلِ انکار حقیقت کی صورت میں درک کیا تھا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا معاملہ قتلِ امام حسن علیہ السلام کے بغیر حل ہوجائے اور امام حسن علیہ السلام راستے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ لیکن وہ اس نکتہ سے غافل تھا کہ جس کو صرف امام حسن علیہ السلام نے درک کیا تھا وہ کیا تھا؟ امام حسن علیہ السلام کے وجود کا عام لوگوں پر اثر۔

بعض شخصیتیں اس منزل پر پہنچ جاتی ہیں کہ جن کی حیات و موت دونوں ہی ظالموں اور ستم

گروں کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔ ان کے قتل سے انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ ان کی حیات سے خلجان و انقلاب۔

حضرت امام حسن علیہ السلام معنوی شخصیت کے لحاظ سے اسی جگہ پر پہنچ جاتے تھے۔ آپؑ کی شہادت عام لوگوں کے دلوں کو لرزا دینے والی تھی اور ان کے قلب کے لرز جانے سے معاشرہ میں اضطراب و بحران پیدا ہوتا ہے کہ جس سے انقلاب آتا ہے۔

اسے تو معاویہ جانتا تھا لیکن حضرت امام حسن علیہ السلام کی حیات، کہ جس سے ابتداء میں معاویہ غافل تھا، مگر امام حسن علیہ السلام اسے خوب سمجھتے تھے، وہی اثر تھا لیکن دوسرے طریقہ سے، افکار کو روشن کرنے کے طریقہ سے۔

جن بڑی شخصیتوں کا دل مظلوموں اور محروموں کے لیے تڑپتا ہے ان کا پروگرام یہ ہے کہ وہ لوگوں کی آنکھوں اور ان کے کانوں کے ذریعے ان کی عقل تک پہنچ جاتے ہیں اور ستم دیدہ طبقہ کی عقل و فکر سے تاریکی کو دُور کرتے ہیں۔ ان کے فکری معیار میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں اور اس طرح انقلاب کے لیے زمین ہموار کرتے ہیں۔

حضرت امام حسن علیہ السلام اپنے وجود کی حفاظت کر کے اسی راستے کو طے کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے آپؑ نے جنگ کے بجائے صلح کا انتخاب کیا۔ کیونکہ یہاں بھی ایک نہایت ہی لطیف نکتہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسرے انقلاب میں پہلے انقلاب سے زیادہ علم و آگہی ہے کیونکہ یہ اس روشن فکری سے آیا ہے جو پہلے ہی وجود میں آچکی ہے اس لیے حضرت امام حسن علیہ السلام لوگوں کی عقل و فکر میں نفوذ کرنے اور انھیں روشن کرنے والا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

عہد نامہ

حضرت امام حسن علیہ السلام لوگوں کی فکر کو روشن کرنے والے اقدام کو عہد نامہ کی پہلی شق قرار دیتے ہیں: چار لفظوں میں پورے عہد نامہ کا خلاصہ ہوتا ہے:

① قانون ② توارث کے ذریعے سے زمام داری ③ آزادی ④ حق طلب لوگوں کا تحفظ۔

پہلی شق میں امام علیہ السلام قانون کی قدر و قیمت پر زور دیتے ہیں کہ زمام دار کے لیے ضروری

ہے کہ قانون کو نافذ کرے، درحقیقت امام علیہ السلام پہلی شق میں زمام دار کے فریضہ کو بیان کرتے ہیں۔

اس شق میں آیا ہے: ''معاویہ عہد کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان کتابِ خدا، سنتِ رسولؐ اور پسندیدہ خلفاء کی سنت پر عمل کرے گا''۔

سبھی جانتے ہیں کہ کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ قانون ہیں اور روشِ خلفاء شاید کنایۃً روشِ علیؑ مراد ہے۔ وہ اجراء قانون کا نمونہ ہے۔

صلح نامہ کی دوسری شق میں زمام داری کے بنیادی مسائل میں سے ایک کی تصریح کی گئی ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے، زمام دار کے انتخاب کا کیا معیار ہے؟ اسی کتاب میں دوسری جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے زمام دار کا معیار اور شرائط دونوں چیزوں میں خلاصہ ہو سکتی ہیں: علم و تقویٰ۔

زمام دار و حاکم کو چاہیے کہ وہ اپنے علم کے ذریعے ملت و اُمت کے مفادات کی تشخیص کرے اور اپنے تقویٰ کے ساتھ اس معین کردہ راہ پر گامزن ہو، یعنی اُمت کے مصالح کی راہ کو اختیار کرے۔

کیا توارث زمام داری کا معیار ہو سکتا ہے؟ اسلام نے کُلی طور پر اس کی نفی کی ہے کیونکہ علم و تقویٰ زمام دار کے بیٹے تک میراث کے ذریعے نہیں پہنچتا ہے۔ اس لیے زمام داری بھی بیٹے کو میراث میں نہیں مل سکتی ہے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام صلح نامہ کی دوسری شق میں معاویہ سے عہد لیتے ہیں کہ وہ اپنے بعد کسی کو زمام دار معین نہیں کرے گا۔ واضح رہے کہ کسی سے مراد یزید ہے۔ حضرت امام حسن علیہ السلام عقل کی منطق کی بنیاد پر معاویہ کے تمام راستے بند کرنا چاہتے ہیں کہ کل وہ اپنے بیٹے یزید کو مسندِ خلافت پر نہ بٹھائے اور اپنے بعد حکومت کی زمام اس کے اختیار میں نہ دے۔

آزادی کے بارے میں حضرت امام حسن علیہ السلام صلح نامہ میں تصریح کرتے ہیں کہ معاویہ کی حکومت میں بھی اپنے اُمور میں اس کے شر سے محفوظ رہیں گے اور سب کا تحفظ کیا جائے گا۔

دوسری شق میں خاص طور سے مردانِ حق طلب و حریت پسند لوگوں کی جان و عزت سے بحث ہے۔ یہ لوگ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا اتباع کرنے والے تھے۔ آپؑ کے مکتب سے انھوں نے آزادی اور آزادی مانگنے کا درس لیا تھا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام معاویہ سے عہد لیتا

چاہتے ہیں کہ پیروانِ علیؑ، جہاں بھی ہیں ان کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھا جائے گا۔

یہ تھا صلح نامہ کا لب لباب، اگرچہ معاویہ نے ان میں سے کسی پر عمل نہیں کیا لیکن حضرت امام حسن علیہ السلام نے یہ عہد نامہ لکھ کر روحِ اسلام کی نقشہ کشی کر دی اور دس سال کی مدت میں جہاں بھی صلح نامہ کی کسی شق سے انحراف نظر آتا، اسی طرح لوگوں کی توجہ مبذول کراتے تھے۔ خصوصاً جب معاویہ نے توارث کی اساس پر یزید کو ولی عہد بنایا تو امام حسن علیہ السلام کی تقریر سے اسلامی معاشرہ میں ایک فکری انقلاب آگیا تو معاویہ اس بات کی طرف متوجہ ہوا کہ صرف حضرت امام حسن علیہ السلام کی شہادت ہی اس کے خلاف معاشرہ میں انقلاب برپا نہیں کرتی ہے بلکہ آپؑ کی حیات بھی اس کی حکومت کے لیے بہت زیادہ خطرناک ہے۔ لہٰذا اس نے آپؑ کے قتل کا منصوبہ بنایا اور اس سلسلہ میں معاشرہ کے ہونے والے ردعمل کو روکنے کے لیے اس نے اپنی حکومت کی جاسوس، آپؑ کی زوجہ "جعدہ" کے ہاتھ آپؑ کے قتل کا منصوبہ بنایا، تاکہ براہِ راست اس پر الزام نہ آئے۔ چنانچہ "جعدہ" کے پاس پیغام بھیجا اور زہر دینے کے سلسلے میں اسے سبز باغ دکھائے۔ "جعدہ" بھی اس کام کے لیے تیار ہوگئی۔ مشہور ہے کہ ۵۰ ہجری میں ۴۷ سال کی عمر میں اس نے آپؑ کو زہر دے دیا اور انسانیت کو عدل و انصاف پر قربان ہونے والی عظیم شخصیت کے سوگ میں بٹھا دیا۔

سلام ہو ان پر، اور زندہ رہے ہمیشہ ان کی رسم و راہ یہ سلسلہ جاری ہے اور یہی راہ ہر روز و ہر لحظہ عدل پر قربان ہونے والوں میں تاریخی و ابدی حماسوں کی روح پھونکتی ہے تاکہ ایک روز ظلم کی بساط اُلٹ جائے اور "قربانیٔ عدالت" نام کا فاجعہ و حادثہ تاریخ میں ثبت ہو جائے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام
کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

تین شعبان تین ہجری کو خاندانِ نبوت میں ایک بچے نے ولادت پائی، جس کا نام حسینؑ رکھا گیا۔ بے شمار انسانوں نے عرصۂ ہستی میں قدم رکھا۔ دنوں، مہینوں اور برسوں کو بخوبی دیکھا اور آخرکار موت کا ذائقہ چکھ کر نابود ہو گئے۔ یہ لوگ جلد ناپید ہو جانے والے حباب کے مانند ہیں جو کہ بحرِ زمانہ کی سطح پر اُبھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے نابود ہو گئے۔

تمام انسانوں کے مانند حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی سطحِ حیات پر قدم رکھا اور انھی کی طرح دنوں، مہینوں اور برسوں کا بخوبی مطالعہ کیا اور آخرکار آپؑ بھی موت کی منزل سے گزر کر ہدایت میں مقیم ہو گئے، نابود ہوئے اور نہ فراموش۔

آپؑ اٹھاون سال کے تھے مگر مانند حباب نہیں تھے بلکہ اس موج کی طرح تھے جو وسط سمندر سے اُٹھتی ہے۔ جیسے جیسے اس کی زندگی بڑھتی جاتی ہے اسی تناسب سے پھیلتی جاتی ہے۔ موج ایک نقطہ سے اُٹھتی ہے لیکن وہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ سمندر کی نرم و پھسلا دینے والی سطح پر پھیلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے اور ساحل تک اپنا دائرہ وسیع کر دیتی ہے اور پورے سمندر پر چھا جاتی ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام ایک موج کے مانند بحرِ زمانہ کی سطح پر اُبھرے۔ آپؑ کا نقطۂ آغاز زندگی کے سال تھے۔ بعبارتِ دیگر یہ کہا جائے کہ امام علیہ السلام نے اپنے ظلم شکن انقلاب کہ جس نے عاشورۂ جاوید کا نام پایا—— سطحِ زمانہ اور اذہان و افکار سے آغاز کیا۔

یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ اپنے نقطۂ آغاز سے تحریک جتنی زیادہ دُور ہوتی جائے گی اتنی ہی اس کی موج کی وسعت بڑھتی چلی جائے گی اور لحظہ بہ لحظہ نئی سرحدوں پر پہنچتی رہے گی اور فتح کرتی چلی جائے گی۔ چنانچہ صدیوں کے بعد آج بھی ہم حضرت امام حسین علیہ السلام کی بیکراں عظمت و شکوہ کو مشاہدہ کر رہے ہیں، کیوں؟

واضح رہے کہ عاشورہ کی موج اور لہر کی قلمرو کو قومی اور زمانی حدوں میں منحصر و محدود نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام صرف فرزند اسلام ہی نہیں اور اسلام کی سرحدوں ہی میں محدود نہیں ہیں کیونکہ: حضرت امام حسین علیہ السلام نے خود کو سانحۂ عاشورہ کے قالب میں جگہ دی ہے اور یہ

قالب حدوں میں محدود نہیں ہے۔

جس دن سے انسان نے اس کرۂ خاکی پر قدم رکھا ہے اسی دن سے ظلم وستم اور بے انصافی کو اپنے سامنے پایا تو بشریت ظلم کے اندھیروں اور ستم کی تاریکیوں کو سامنے پا کر مختلف حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک گروہ خود ان ظلم وستم کا عامل تھا کہ جن سے بدترین طبقاتِ انسانی کی تشکیل ہوئی۔

یا نہیں ـــــ یہ انسان بھی نہیں تھے۔ مرحبۂ انسانیت سے گر چکے تھے اور ایسے درندے تھے جنھوں نے انسانی نقاب میں اپنا کریہہ المنظر چہرہ چھپا رکھا تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ظلم ستیزی کے بجائے خاموشی اختیار کی اور اپنے سکوت سے ظالموں کے لیے پنپنے کے مواقع فراہم کر دیے۔

طبقۂ اوّل کی طرح ان لوگوں نے بھی بدنامی ہی کمائی اور بس۔

تیسرے طبقہ نے ظلم و بے انصافی کے مقابلے میں استقامت کی ہے اور جتنی روحی، فروی امکانات اور اجتماعی حالات نے اجازت دی، کم وبیش اسی تناسب سے وہ ظلم وستم کی سرکوبی اور جڑ کاٹنے کے لیے کھڑے ہوئے۔

بشریت اسی طبقے کے لوگوں کا احترام کرتی ہے اور ان کا نام اپنی تاریخ میں سرفہرست رکھتی ہے۔ کبھی ایسے افراد بھی پیدا ہوجاتے ہیں کہ جو ظلم کی مذمت اور اس کے سدباب کی خاطر عدالت، فریضہ کی ادائیگی اور خدا کے علاوہ کسی منطق کو نہیں پہنچاتے ہیں۔ روحی حالات، فروی امکانات اور اجتماعی حالات ان کے عزم میں تزلزل نہیں پیدا کر سکتے۔

ان کی منطق کے لحاظ سے بے انصافی ہر ماحول، ہر معاشرہ اور ہر جگہ مذموم ہے، جسے ختم ہونا چاہیے۔ جو شخصیتیں اس فکر کی اساس پر جاں بکف ظلم وستم سے جنگ کے لیے گئی ہیں، ان میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا اسمِ گرامی سرفہرست نظر آتا ہے۔

وہ بے اعتقادی کے زمانے میں ظلم اور ظالم کی جڑ کاٹنے میں اپنے والد علی ابن ابی طالبؑ کے مانند تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں آپؑ سے کہا گیا: معاویہ کو معزول نہ کیجیے۔ موجودہ حالات اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں جب حکومت کے پایے محکم ہوجائیں گے اور ہر طرح سے حالات اُستوار ہوجائیں گے تو معاویہ کو معزول کر دیجیے گا۔

حضر علی علیہ السلام عدل قائم کرنے اور ستم گر کو علیحدہ کرنے کے سلسلہ میں حالات کے اُستوار

ہونے کا انتظار نہیں کرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں معاویہ کی معزولی کا حکم نامہ لکھ کر شام روانہ کرتے ہیں۔ حسینؑ اسی باپ کے بیٹے اور اس مکتب کے شاگرد تھے۔ آپؑ نے حضرت علی علیہ السلام جیسے باپ اور حضرت فاطمہؑ بنت رسولؐ جیسی ماں کی آغوش میں تربیت پائی تھی۔

آپؑ کے پیش نظر ایسا حیرت انگیز اور غیر معمولی پیغام تھا اور ایسی سرنوشت کہ جس کا تعلق تاریخ جہان اور حیاتِ اسلام سے ہے اور یہ سرنوشت خدا کے قلمِ قضا سے آپؑ کی حیات کی پیشانی پر لکھی گئی تھی۔

تاریخ ہمیشہ شخصیتوں کو ان کی فکری و روحی تجلیات کے جھروکوں سے پہچانتی ہے اور یہی دریچہ تاریخ کو ان شیر دل لوگوں کی روح تک پہنچاتا ہے اور ان کی روحی عظمت و شکوہ کو آشکار کرتا ہے۔

ہم حسین بن علی ابن ابی طالب علیہما السلام کو آپ کی روحی و فکری تجلیات کے دریچہ یعنی حادثۂ عاشورہ سے پہچانتے ہیں۔ مکتبِ عاشورہ اس عظیم فکر کی وضاحت کرتا ہے کہ جس نے تین شعبان کو خاندانِ نبوت کے ایک بچے کے ساتھ ولادت پائی۔ اس فکر کی ایک خاص الف ب تھی، نتیجہ میں اس کی تجلیات نے خاص رنگ اختیار کیا، ایسا رنگ کہ جس کا سرچشمہ خون و انقلاب ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام خاص زمانہ میں واقع ہوئے تھے۔ جس زمانہ میں اُموی، فرزندانِ اسلام اور عدل سے برسرِ پیکار تھے اور ظلم وستم کے آخری نقطہ پر پہنچ چکے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے اور دوسرے امام، حضرت امام حسن علیہ السلام کو معاویہ کے حکم سے زہر دے دیا گیا۔ نتیجے میں انھوں نے دنیا سے رحلت فرمائی۔

امامت نے امام حسین بن علی علیہما السلام پر خاص فرائض عائد کیے تھے۔ امامت کے سایہ میں آپؑ نے اُمت کی نگہبانی اپنے ذمہ لی تھی۔ اب اُمت پر پھاڑ کھانے والے درندوں کے حملے آپؑ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اپنی امامت کے ابتدائی زمانہ ہی سے آپؑ نے اپنے بھائی حضرت امام حسن علیہ السلام کے مانند معاویہ پر سخت تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور اس کی ظالم حکومت کے لیے تبلیغات کا آغاز کیا۔ اس طرح آپؑ نے اپنی امامت کے ابتدائی زمانہ ہی سے اُموی ظالم حکومت سے سرد جنگ شروع کر دی۔ یا یہ کہا جائے کہ اس سرد جنگ کا سلسلہ جاری رکھا ہو جو کہ آپؑ کے بھائی حضرت امام حسن علیہ السلام نے مخصوص حالات کے تحت شروع کی تھی۔ کیونکہ امام حسنؑ کی

رحلت سے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی لہٰذا امام حسین کو انھی حالات کی اساس پر سرد جنگ جاری رکھنا ہے اور یہ سرد جنگ، تبلیغاتی حملہ، حادثہ عاشورہ کو، جو کہ خاندانِ علیؑ کے خاندانِ اُموی سے مبارزہ کا نقطۂ آخر ہے، وجود میں لانے کے لیے ضروری تھا۔

اس مبارزہ کا نقطۂ عروج اور آخری چوٹی حادثۂ عاشور ہے۔ اس اوج تک پہنچنے کے لیے منزل بہ منزل آگے بڑھنا چاہیے۔ عدل وظلم کی جنگ ناگزیر ہے، اس کا آغاز ہوجانا چاہیے اور حضرت امام حسن علیہ السلام اس کا آغاز کرتے۔ چنانچہ جتنی حالات نے اجازت دی اسی تناسب سے امام حسنؑ نے سرد جنگ اور تبلیغاتی حملہ کا آغاز کیا اور امام حسین علیہ السلام نے اسی راہ کو جاری کیا۔

حکومتِ معاویہ، یزید کی حکومت سے اچھی نہیں تھی، بلکہ معاویہ ہی کی خائن حکومت نے یزید کی فاسد حکومت کے لیے زمین ہموار کی تھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے معاویہ ہی کے زمانہ میں میدانِ کربلا میں کیوں قدم نہیں رکھا تھا اور سانحۂ عاشورہ کو کیوں وجود نہیں بخشا تھا؟

جواب یہ ہے کہ جس دلیل کی بنا پر حضرت امام حسن علیہ السلام نے ایسا اقدام کرنے سے پرہیز کیا تھا اس دلیل کی بنا پر حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی معاویہ کے زمانہ میں حادثۂ کربلا کو وجود بخشنے سے احتراز کیا تھا۔

ایسے دھماکے اور سانحے کے لیے مساعد حالات اور مخصوص چیزوں کی ضرورت تھی، اور اسباب ومقدمات امام حسن علیہ السلام کے زمانے اور امام حسین علیہ السلام کی امامت کے اوائل میں فراہم نہیں ہوئے تھے۔ پہلے یہ اسباب ومقدمات فراہم ہوجانے اور اس دھماکے کے لیے زمین ہموار ہوجانی چاہیے تھی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام ۶۱ ہجری کے ماہِ محرم کی دسویں کی صبح تک ان ضروری چیزوں کو فراہم کرنے اور واقعۂ کربلا کے لیے زمین ہموار کرنے میں مشغول تھے۔ اسی صبح سے آپؑ کے عظیم پیغام اور بنیادی کردار کا آغاز ہوا۔ یہ وہی پیغام تھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کی خبر آپؑ کی ولادت کے بعد دی تھی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے ابھی ولادت پائی ہے، اس نوزاد کو رسولؐ نے اپنی آغوش میں لیا۔ بچہ کے دائیں کان میں اذان، بائیں کان میں اقامت کہی اور نونہال کو سینہ سے لگا کر بہت دیر

تک گہری فکر میں ڈوبے رہے۔ حاضرین نے دیکھا کہ آپ کی چشم مبارک میں آنسو بھر آئے ہیں اور اب وہ آنسو آہستہ آہستہ آنکھوں سے رسولؐ کی نورانی و نرم داڑھی کی طرف رواں ہو گئے ہیں۔ آنسو ٹپکنے لگے۔ رسولِ خدا نے آنکھیں کھولیں اور غمگین لہجہ میں ایک خونی حادثہ کی خبر دی۔ چنانچہ اسی وقت سے خاندانِ رسالت امام حسین علیہ السلام کے انقلاب آفریں مکتب اور آپؑ کے مخصوص پیغام سے آشنا ہوئے۔ آخر کار دس محرم ۶۱ ہجری کو یہ پیشین گوئی عاشورہ کی صورت میں پوری ہوئی اور آزاد منش و آزادی چاہنے والے انسانوں کی تاریخ زندگی میں ایک عظیم نقطۂ اتصال کو وجود بخشا۔

پیغامِ عاشورہ خاص طرزِ فکر کا نمائندہ تھا۔ اس طرزِ فکر کا جو فداکاری و جانبازی سے سرشار ہے۔ اس طرزِ فکر کو ایک مسیحی صاحبِ قلم اس طرح لکھتا ہے:

"یزیدی گماشتے: ہمیں کتنے مال سے نوازا جائے گا؟
اصحابِ حسینؑ: آپؑ اور آپؑ کے مشن پر جان قربان کر دیں گے۔
دو مخالف محور، متضاد طرزِ فکر، دو الگ الگ راہیں، ایک روشن، دوسری تاریک، ایک پست، دوسری عظیم دونوں مخصوص لوگوں کی نمائندگی کرتی ہیں......
ایک یزید ابن معاویہ کے پیروکاروں کی ہے، دوسری سید الشہداء حسین بن علیؑ کے اصحاب کی ہے"۔

مذکورہ بالا عبارت، جارج جرداق، مشہور مسیحی صاحبِ قلم کی ہے۔ اس نے مسیحی ہوتے ہوئے مکتبِ حسینؑ کی ماہیت کو پہچنوانے اور مکتبِ معاویہ و یزید کی شناخت کرانے کے لیے اپنی مشہور کتاب صَوتُ العَدَالَةُ الإنسَانِيَّة میں ایک فصل قائم کی ہے۔

ایک جملے میں وہ امام حسین علیہ السلام کو مخاطب قرار دیتا ہے اور دوسرے میں معاویہ و یزید کو مخاطب قرار دیتا ہے۔ معاویہ یزید ایک مکتب کے نمائندے ہیں اور حسینؑ بن علیؑ دوسرے مکتب کے امام و پیشوا ہیں۔

مکتبِ اوّل کے ماننے والے خود خواہی، منفعت طلبی اور مادیت میں غرق ہیں۔ ان کی منطق یہ ہے: "ہمیں کتنا دو گے؟"۔

دوسرے مکتب کے ماننے والے فداکاری، جانبازی اور ایثار سے سرشار ہیں۔ اپنے امامؑ کے سامنے ان کی منطق یہ ہے: "ہم آپؑ کے ساتھ مریں گے"۔

یہ جملہ اصحاب حسینؑ کی فداکاری اور ان کے بلند ایمان کا غماز ہے۔ یہ سبق انھوں نے اپنے مکتب کے پیشوا حسینؑ سے سیکھا تھا۔ یہ اہم بات نہیں ہے کہ انسان ایک عقیدہ و مقصد مقرر کر کے اسے بشریت کی راہ میں قرار دے بلکہ اہم چیز یہ ہے کہ اس عقیدہ و مقصد کو پیش کرنے والا اپنے مقصد کے حصول اور اس عقیدہ کی وسعت میں جانبازی اور فداکاری سے گریز نہ کرے۔

یہی وہ نازک مسئلہ ہے جو انبیاء اور مذہبی رہبروں کی صف کو تمام لوگوں کی صف سے جدا کرتا ہے۔ دینی پیشواؤں نے ہرگز ایک اَخلاقی عزلت گزیں مصلح کی صورت میں خود کو نہیں پہچنوایا ہے۔

ایک معلّم اَخلاق نصیحت کرتا ہے، خیر وشر کے راستوں کو بیان کرتا ہے۔ چنانچہ انسان کی سعادت و کامیابی کی راہ میں اس کی کوشش اتنی ہی ہے لیکن انبیاء و ائمہ اس خصوصیت کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ وہ نصیحت و وعظ کے ساتھ ساتھ مقصد بھی پیش کرتے ہیں اور منصوبہ بندی کے بعد، اسے نافذ کرتے ہیں اور اس مقصد میں کامیابی کے لیے میدانِ عمل میں اُترتے ہیں۔

امام حسین بن علی علیہما السلام نبوت کا لب لباب اور عالمِ اسلام کے تیسرے امام ہیں۔ منفعت طلب شکم پرور مکتب کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہاں آپ کے سامنے دو راستے تھے، خاموشی کہ جس کے نتیجے میں عیش وآرام یا حزبِ مخالف کے خلاف انقلاب برپا کریں اور نتیجے میں خون وخاک کی آغوش میں سوجائیں۔

آپؑ اپنی اصلی و آخری راہ کو اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اپنے آسمانی پیغام رسانی کے سلسلہ میں عزمِ محکم کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترتے ہیں۔ آپ کو عملی طور پر دنیائے انسانیت کے سامنے ایک مکتب کھولنا چاہیے۔ آپؑ کو اپنے قول وکلام کو عملی جامہ پہنانا چاہیے۔ ہم سب جانتے ہیں امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے اصحاب نے اس پیغام کو کس طرح پہنچایا ہے اور اس سے ہم سب آگاہ ہیں کہ انھوں نے فریضہ کی انجام دہی اور یزید لعین کے ظلم وستم کی بساط کو اُلٹنے کے لیے بے مثال اور باشکوہ جانبازی کے ذریعے ایک انقلاب برپا کیا، جس انقلاب نے عاشور کا نام پایا اور اپنی روح و جان، عدل کے ہمراہ اَبد کی سرحد میں داخل ہوگیا۔

عدل اور عاشورہ

اس فصل کو دو لفظوں، عدل و عاشورہ کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔ قوموں کی تاریخوں میں

ہمیں ایسے دن اور ماہ بھی ملتے ہیں جو اَبدی و جاودانی ہو گئے ہیں۔ دن، زمانہ کا ایک ٹکڑا ہے اور ایسی زنجیر کی کڑی ہے کہ جس کی ابتدا و انتہا کی خبر نہیں ہے۔

تعجب خیز بات یہ بھی ہے کہ ان کڑیوں میں سے ایک زمانے کے اٹوٹ بندشوں سے خود کو رہا کر لیتا ہے، اوج پر پہنچ جاتا ہے اور پھر گزر جانے والی خاصیت کو محو کر دیتا ہے، اور خاص عوامل کے سایہ میں اتنی وسعت پیدا کر لیتا ہے کہ آہستہ آہستہ زمانے کی فضا و ماحول کی سرحدوں سے آگے نکل جاتا ہے اور پھر اس کے سامنے ماضی و مستقبل کا کوئی مفہوم نہیں رہتا ہے۔

واضح ہے کہ یہ چیز خاص عوامل کے سایہ میں انجام پاتی ہے۔ چنانچہ جو بھی اَسرار و رُموز ہیں وہ اسی خاص عامل میں موجود ہے۔ وہ عامل و سبب جو کہ زمانہ کے اس ٹکڑے سے جڑا ہوا ہے اور اسی میں حل ہو گیا ہے۔ اس طرح زمانے کے اس ٹکڑے کو اس عامل و سبب سے جدا کوئی عنصر تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی موقعہ ہے جہاں اس سبب و عامل کی خاصیت زمانے کے اس حصّے میں نفوذ کر جاتی ہے اور اسے اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ محرم ایسی ہی خاصیت کا حامل ہے، محرم وہ مہینہ ہے جو اَبدی و جاوداں ہو گیا ہے جو تاریخ بشریت کی فضا پر چھا گیا ہے۔ یہاں قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ماہِ محرم کو دوسرے مہینوں کی سلکِ محکم سے کس چیز نے جدا کیا ہے اور کس نے اسے عظمت و اَبدیت کے اوج پر پہنچایا ہے؟

وہ کون سا عظیم و رفیع عامل ہے جو عاشورہ سے متصل ہوا اور اسے بھی اپنی خاصیت عطا کر دی ہے؟ یہ عظمت و جلالت اسی عامل کا ہے اور عاشورہ و محرم کی اَبدیت کے راز کو بھی اسی عامل میں تلاش کیا جائے۔ یہیں سے بحث دوسرا رنگ و رُخ اختیار کرتی ہے اور بعض اُمور کے مطلق و نسبی ہونے کی بحث سامنے آتی ہے۔

کیا حق و عدل نسبی ہیں یا مطلق؟

اگر حق و عدل کو نسبی فرض کریں تو پھر یہ ایک وقت اور ایک معاشرہ میں عظمت و اہمیت کے حامل ہوں گے۔ اگر ان دونوں کا نسبی ہونا مسلّم ہے تو پھر حق و عدل نے خود کو زمان و مکان کی قید سے کیوں آزاد کیا اور ہمیشہ تاریخ بشریت میں کیوں درخشاں نظر آتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم بعض کو اُمورِ نسبی فرض بھی کر لیں تو بھی ہمیں اس بات کا عقیدہ رکھنا

چاہیے کہ چند اُصول خاصہ اطلاق کے حامل ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں کا ان اُصولوں سے پیوند ہے وہی اَبدی و جاودانی ہیں۔

سقراط اور شوکران دو لفظ ہیں: دونوں کی ایک ہی حکایت ہے: راہِ حق و عدل میں فداکاری۔ یہ ایسی اصل ہے جو ہمیشہ اور ہر جگہ محترم و مقدس ہے۔

چھوڑیے اس بحث کو ہم اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ انبیاءؑ کو دیکھتے ہیں کہ جن کی معنوی شخصیت نابغہ حضرات سے کہیں بلند ہے۔ حضرات ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہیں۔

کبھی نمرود و فرعون اور ابوسفیان کے مقابلہ میں آئے۔ خدا کے انبیاءؑ نے آلودہ معاشروں میں پرچم عدل بلند کیا اور اس کی مقدس روشنی کو بشریت کے تاریک معاشروں میں پھیلایا ہے اور ظلم کی آواز کو نمرود و فرعون اور ابوسفیان کے شیطانی حلق ہی میں دبا دیا ہے اور یہ بشریت کا اعلیٰ تصور ہے، مقدس تصور جب کہ مطلق ہے اور یہی پیغمبروںؑ کی اَبدیت کا راز ہے۔ ان کا مقام ہمیشہ انسانیت کی جبین پر رہتا ہے اور رہتی دنیا تک وہ عدل پسندوں کے قلوب کو منور کرتے رہیں گے۔

عدل کوئی علاقائی مفہوم نہیں ہے، بلکہ زمان و مکان سے بلند مفہوم ہے۔ ہاں چونکہ دنوں اور مہینوں نے عدل کو اپنی آغوش میں جگہ دی ہے اس لیے وہ بھی عدل کے مانند ابدی ہو جائیں گے۔

عدلِ اسلامی

عاشورۂ حسینی نے خاص مہینہ محرم ۶۱ ہجری میں وجود پایا ہے۔ اس مہینہ نے چونکہ عدل کے رستاخیز حادثہ کو اپنی آغوش میں جگہ دی تھی اور نتیجہ میں اس کا بھی عدل کے عظمت و شکوہ سے ملحق ہو کر ابدی و جاوداں ہو گیا ہے۔

ماہِ محرم میں عدل اسلامی مجسم ہوا ہے، محرم کا عاشورہ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اسلام کسی بھی حالت میں ظلم کے پنپنے کے لیے میدان خالی نہیں چھوڑتا۔

عاشورہ کا مقصد، عدل

اس عاشورا کے پرچم دار و شبر امام حسین علیہ السلام ہیں اس لیے امام حسین علیہ السلام کے ابدی ہونے

کے راز کو بھی آپؑ کے مقصد کی ابدیت میں تلاش کرنا چاہیے۔

مقصد

ہر شخص کی قدر و قیمت کا تعلق براہِ راست اس کے مقصد سے ہے۔ مقصد جتنا بلند ہوگا اس میں اتنی ہی انسانیت ہوگی اور اسی تناسب سے انسان کی قدر و قیمت زیادہ ہوگی۔

بعض لوگ اپنے اندر دنیا کا خلاصہ کرتے ہیں، جوش میں آتے ہیں، کوشش کرتے ہیں، مبارزہ کے لیے اُٹھتے ہیں لیکن ایسے اقدامات وہ صرف اپنے ہی لیے کرتے ہیں۔ ان کی حیات ایک دائرہ بناتی ہے۔ انھی سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور انھی پر وہ ختم ہوجاتا ہے۔ ان لوگوں کی مثال کرمِ ابریشم کی سی ہے۔ ان کے مقصد کا انھی کے ڈھانچہ میں خلاصہ ہوتا ہے۔ دنیا کی نظروں میں ایسے لوگوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ نیز تاریخ بھی ان کے اسماء کو اپنے سینہ میں جگہ نہیں دیتی ہے۔ ایسے کروڑوں انسانوں نے عرصہ عدم سے اُٹھ کر صحنِ حیات وہستی میں قدم رکھا اور حباب کے مانند بحرِ زمانہ کی سطح پر آئے اور فوراً ہی نیستی و فراموشی کی قبر میں دفن ہوگئے۔

لیکن کبھی ایسے انسانوں کا ظہور ہوتا ہے کہ جن کے تصور و عقیدہ کا محور انسانیت ہوتی ہے۔ وہ خود کو بھول جاتے ہیں، دوسروں کو یاد رکھتے ہیں، وہ ایک عظیم معاشرہ اور بشریت سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ جہاں بھی کسی انسان، کسی معاشرہ اور کسی قوم کو رنج و مصیبت میں مبتلا دیکھتے ہیں، ظلم و ستم کے چنگل میں اسیر پاتے ہیں، بے قابو ہوجاتے ہیں۔ ان کی رہائی کے لیے تگ و دو میں لگ جاتے ہیں اور ان کو ظلم و ستم کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے پوری طاقت صرف کرتے ہیں اور جب تک ظلم کی چیرہ دستیوں سے انھیں چھڑا نہیں لیتے آرام نہیں پاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حیات خود ان سے شروع ہوتی ہے لیکن انسانیت پر ختم ہوتی ہے۔ آغاز تو ان کا ایک لحظہ سے ہوتا ہے لیکن ان کے انجام کا سلسلہ ابدیت سے ملتا ہے۔ ان کی عظمت و جلالت کو زمانوں کے پردے نہیں چھپا سکتے ہیں اور تاریخ انسانیت بھی انھیں ہرگز فراموش نہیں کرتی ہے۔

سنہ تین ہجری کی تین شعبان کو آج صدیاں گزر چکی ہیں مگر یہ عظیم دن اپنی پوری تابانی کے ساتھ تاریخ بشریت کی جبین پر چمک رہا ہے اور روز بروز اس کی عظمت و جلالت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اس روز خاندانِ رسالت مآبؐ میں ایک بچہ نے دنیا میں آنکھیں کھولیں جس نے حسینؑ نام

پایا۔ تونہال نے اپنی زندگی کے آٹھ سال رسولؐ کے سایۂ عاطفت میں گزارے۔ آنحضرتؐ کے بعد علیؑ و فاطمہؑ جیسے والدین کے زیر سایہ تربیت پائی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے لیے جو چیزیں ضروری تھیں وہ ان کے گھرانے میں موجود تھیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی حیات کے ابتدائی آٹھ برسوں میں یگانۂ دہر تین عظیم شخصیتوں کی تربیت سے مالا مال تھے۔ وہ تین شخصیتیں محمدؐ، علیؑ اور فاطمہ زہراؑ تھیں۔ امام حسین علیہ السلام کے روحی مزاج میں ان تینوں کی تربیت شامل تھی چنانچہ امام حسینؑ کو ایسا انسان بنایا کہ جو تاریخ اور دنیا کے لیے ایک استثنائی اور ناقابلِ فراموش انسان ہے۔

ان برسوں میں حضرت امام حسین علیہ السلام، رسولِ خدا کے وجود مبارک سے بہرہ ور تھے۔ آپ "سینۂ رسولؐ پر پروان چڑھے اور آنحضرتؐ کی پوری محبت سے سرشار رہے۔ رسولِ خدا کو امام حسین علیہ السلام سے اس قدر محبت تھی کہ رسولؐ، حسینؑ کو اپنا جز سمجھتے تھے اور فرماتے تھے:

حُسَینٌ مِنِّی وَاَنَا مِن حُسَین

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ (کنز العمال: ج ۲۲۲، بحارالانوار: ج ۴۳، ص ۲۶۱)

رسولِ خدا، امام حسینؑ کے عظیم و تاریخی پیغام سے بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ ایک روز یہی بچہ پُرشکوہ اور تاریخ میں نہ بھلائی جانے والی فداکاری و ایثار کو وجود بخشے گا۔

یہی بچہ ہے جو کہ آپؐ نے آسمانی کتب کی اُمیدوں اور آرزوؤں پر اپنی جان نثار کرے گا اور اسلام کو برباد ہونے سے بچائے گا۔ رسولؐ کی نگاہیں مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ میدانِ کربلا میں اسی بچہ کا شیرانہ کردار دیکھ رہی تھیں۔ ملاحظہ فرمارہے تھے کہ حسینؑ اپنے سرخ خون سے کس طرح اسلام کی حریت کی کتاب لکھ رہا ہے اور اپنے عزیزوں کی مقدس و مطہر لاشوں پر کس طرح اسلامی شرف و عظمت کے محل کی بنیاد رکھ رہا ہے۔

رسولؐ کی دُوربین نگاہوں نے زمانوں کے تہ در تہ پردوں کو چیر دیا تھا اور ان کے پیچھے آج کے بچے کو دیکھ رہے تھے جو کہ فولادی مرد کی طرح میدانِ جنگ میں قدم رکھتا ہے اور خونی جنگ کا آغاز کرتا ہے۔ ستم گروں اور جابروں سے جنگ کرتا ہے۔

ان کے مقابلے میں جو مسند رسولؐ پر بیٹھ کر اسلام کے نام پر لوگوں پر حکومت کررہے تھے

لیکن اسلام و رسولؐ کے مقصد کی بو بھی ان کے مشام میں نہیں پہنچی ہے۔ رسولؐ دیکھ رہے تھے کہ حسینؑ مختصر سی جماعت کے ساتھ محاذِ ظلم پر حملہ آور ہیں اور اسلامی معاشرہ کی جڑ، عدل پر اپنا خون بہا رہے ہیں۔

رسولؐ ان تمام چیزوں کو دیکھ رہے تھے اور آپؐ کا قلب دو متضاد کیفیتوں سے لبریز تھا۔ غم آمیختہ شوق اور خوشی کے آنسوؤں سے، چہرہ خوشی سے شاد لیکن آنکھیں اشکبار تھیں۔

رسولؐ کی نظریں امام حسین علیہ السلام کے چہرۂ طفلی میں ان کی غم انگیز سرنوشت ملاحظہ کر رہی تھیں۔ آنحضرتؐ کی نگاہیں حسینؑ کی پُر نشیب و فراز سرنوشت سے آگے بڑھتی جا رہی تھیں، خون دیکھ رہی تھیں، آگ دیکھ رہی تھیں۔ مصیبتوں اور بلاؤں کو ملاحظہ فرما رہی تھیں۔ اپنے حسینؑ کی طرف منہ پھیلائے ہوئے درندوں کو بڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھیں جو ان پر حملہ کر کے لہولہان کر رہے ہیں۔ آنحضرتؐ کی نگاہیں لہر کی مانند اس وجودِ مبارک کی طرف لوٹ آتی ہیں۔ بدن میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ قلب و روح کو متاثر کرتی ہیں۔ رسولؐ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں، لبوں پر بھی مہرِ سکوت لگانا چاہتے ہیں تاکہ اس عظیم راز سے کوئی واقف نہ ہو سکے لیکن یہ راز چھپانے کے قابل نہیں تھا، کبھی نہ کبھی زبان پر اس کا ذکر آ ہی جاتا تھا۔ حسینؑ کی مصیبت کو یاد کرتے اور ستم گروں کے مقابلے میں آپؑ کی فداکاری و جانبازی کی خبر دیتے تھے۔

یہ وہی ستم گر تھے جو اپنی شیطانی روح کے ساتھ اسلام کے لباس میں چھپ گئے تھے اور تمام چیزوں کو اپنی ہوس رانی کے بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ تاریخ میں یزید لعین کے زمانے سے زیادہ تاریک اور گھٹا ٹوپ زمانہ نہیں ہے۔ اسی زمانے میں لوگوں پر خدا کی حکومت، شخصی و فردی حکومت میں تبدیل ہو گئی تھی اور یزید جیسے بدکار انسان کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ اس عہد میں جن عام اموال کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ ہونا چاہیے تھا وہ چند لوگوں کی ہوس پرستی پر خرچ ہو رہے تھے۔ شجرِ اسلام اس حکومت کی مسموم و تند ہواؤں سے زرد پڑ گیا تھا اور یکے بعد دیگرے اس کے پتے و شاخ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھی۔

اسلام کی اصلی جڑ عدالت اجتماعی تھی۔ اس میں ضعف اور اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ اس درخت کی جڑ خشک ہونا ہی چاہتی تھی اور ایک بار پھر جاہلیت کا بول بالا ہونے والا تھا اور معاشرہ کے ٹوٹے ہوئے بت دوبارہ زندہ ہونے والے تھے۔

اس خطرناک و نازک حالت کو امام حسین علیہ السلام نے محسوس کر لیا اور بس یہی وہ خصوصیت ہے جو ہمیشہ عظیم لوگوں کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے اور سب سے بلند جگہ پر پہنچاتی ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کا صرف یہی امتیاز نہیں تھا کہ آپؑ نے اس کو صحیح درک کیا تھا بلکہ آپؑ کا سب سے بڑا امتیاز کہ جس نے اُصولی طور پر آپؑ کو صفِ بشریت سے ممتاز کیا اور گوہر کی طرح چمکایا ہے وہ آپؑ کی بے نظیر فداکاری اور خود گزشتگی تھی۔

ایک طرف حضرت امام حسین علیہ السلام اس آئین کو ابدی و جاودانی بنانا چاہتے تھے جسے آپ کے جد پیغمبرؐ خدا نے پیش کیا تھا اور دوسری طرف اپنی شہادت اور اہلِ بیتؑ کی اسیری کی بنیاد پر لوگوں کو یزید کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کا منصوبہ بنایا۔

انسان فطری طور پر اپنی ذات و حیات کو دوست رکھتا ہے اور اپنے انہدام کی خاطر قطعاً نقشہ نہیں بناتا ہے لیکن امام حسین علیہ السلام بشریت کی اس سرحد سے آگے بڑھ چکے تھے اور خدا کے فرشتوں کی صف میں جگہ پا چکے تھے۔ فرماتے تھے:

لَا اَرٰی الْمَوْتَ اِلَّا سَعَادَةً وَّالْحَیَاةَ مَعَ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا بَرَمًا

"ظالموں کے ساتھ زندہ رہنے کو دل خراش اور موت کو سعادت سمجھتے تھے"۔ (بحار الانوار: ج ۴۴، ص ۱۹۲)

حضرت امام حسین علیہ السلام کی اٹھاون سال کی تمام اجتماعی و سیاسی فعالیت اس بلند و اعلیٰ منطق کے پایوں پر اُستوار تھی، لہٰذا ظلم اور ظالم کو نابود کرنے کے لیے آپؑ نے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی اور موت کو گلے سے لگا لیا لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آپؑ نے اس راہ کے ذریعے کہ جس میں بھی کام آگئے اور بظاہر فنا ہو گئے۔ حیاتِ جاوداں پائی اور آزاد لوگوں کے قلوب آپؑ کی طرف جھک گئے اور بشریت کے درد کو اپنی سمت کھینچ لیا۔

رسولؐ خدا، امام حسین علیہ السلام کی ولادت کے وقت ہی سے ان پر آنسو بہاتے تھے اور مستقبل میں آپؑ کی خون آلود سرنوشت کو بیان کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ امام حسین زمانۂ رسولؐ سے گزر چکے ہیں۔ آٹھ سال کی عمر میں رسولؐ کی وفات نے آپؑ کے قلب پر گہرا اثر کیا۔ اس کے بعد زمانے کے اچھے بُرے حوادث سے دوچار ہوئے، یہاں تک کہ خود آپؑ کی نوبت آئی۔

۶۰ ہجری تھا کہ امام حسین علیہ السلام نے اپنے عظیم پیغام کا آغاز کیا اور مظہر ظلم و ستم خاندانِ اُمیہ سے جنگ کرنے کے لیے میدان میں اُترے۔

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عاشورہ کے جاوداں مکتب کے بانی امام حسین علیہ السلام ہیں۔ ہم آپ کو ایسا پرچم دار پاتے ہیں کہ جو کارزارِ حیات میں جوش و خروش کا ثبوت دیتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپؑ انسانیت کو بنی اُمیہ کے تسلط سے نجات دلانے کے لیے خطرناک میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ اپنی جان پر نیزہ و شمشیر کے حملے برداشت کرتے ہیں۔ صرف اس لیے تاکہ بدبختیوں سے انسانیت کو نجات دلائیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام ایسے تھے کہ جن کے مقصد کا خلاصہ، ستم کے چنگل سے انسانیت کی نجات میں کیا جاسکتا ہے۔ ہم آپؑ کے مقصد نیز اس راہ کو، جو کہ آپؑ سے اپنے مقصد تک رسائی کے لیے منتخب کی تھی، آپؑ کے ان کلمات سے سمجھ سکتے ہیں جو آپؑ مختلف شخصیتوں سے فرماتے تھے۔ ان میں سے ایک محمد بن حنفیہ سے گفتگو بھی ہے۔

جس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام مدینہ سے نکل کر مکہ کی طرف روانہ ہونا چاہتے تھے اس وقت آپؑ نے اپنے بھائی محمد حنفیہ سے کچھ گفتگو کی تھی۔ اس گفتگو کے ذریعے ہم آپؑ کے مقصد کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کے علاوہ ہم اس گفتگو کی روشنی میں اس راہ کو بھی معین کر سکتے ہیں جس کو امام حسین علیہ السلام نے اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے منتخب کیا تھا۔

امام حسین علیہ السلام اپنی گفتگو کے ضمن میں محمد حنفیہ سے فرماتے ہیں:

وَاِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِی اُمَّةِ جَدِّی اُرِیْدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهٰی عَنِ الْمُنْکَرِ (بحار الانوار: ج ۴۴، ص ۳۲۹)

"میں اپنے نانا کی اُمت کی اصلاح و فلاح کے لیے جارہا ہوں اور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پیغام پہنچاؤں گا"۔

پہلے جملے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقصد اُمت کی اصلاح اور اسے آلودگیوں سے نجات دلانا تھا۔ اس زمانے میں اسلامی معاشرہ منحرف ہو چکا تھا اور اس کے انحراف سے ملتِ اسلامیہ کی بنیاد کھوکھلی ہوتی جارہی تھی۔

کُلی طور پر اجتماعی مفاسد اور انحراف کی دو قسمیں ہیں:

① وہ انحراف کہ جس کا اثر محدود ہوتا ہے اور اس کی بدبختی کی لپیٹ زیادہ بلند نہیں ہوتی ہے۔ ایسا انحراف معاشرہ کو برائی میں ملوث تو کرتا ہے لیکن اس سے ملت اسلامیہ کی جڑ نہیں کاٹ سکتا ہے۔ اپنی طاقت کے مطابق بدبختی و ناکامی کا باعث ہوتا ہے لیکن ایک ملت وقوم کے وجود کے لیے خطرہ نہیں بنتا ہے۔

② دوسرا انحراف وہ ہے کہ جس کا اثر براہ راست ایک معاشرے کے وجود اور اس تشخص پر ہوتا ہے۔ ایسے انحرافات اپنی طاقت سے دیکھتے ہی دیکھتے معاشرہ کو نگل لیتے ہیں اور اس کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ ایسے انحرافات میں گناہ اور ظلم سرفہرست ہوتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلْمُلْکُ یَبْقٰی مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ

”کفر کے ارتکاب سے حکومت برقرار رہ سکتی ہے لیکن ظلم وستم کے ارتکاب سے حکومت کا استحکام ختم ہو جاتا ہے“۔ (بحارالانوار: ج ۷۵، ص ۳۳۱، منہج الصادقین: ج ۴، ص ۴۶۳، تفسیر صافی: ج ۳، ص ۷۷۴)

ظلم وستم ایسے خطرناک جراثیم ہیں کہ جو تھوڑی سی مدت میں حکومتوں اور قوموں کو متزلزل کر دیتے ہیں اور نابود کر دیتے ہیں۔

۶۰ ہجری میں اسلام کا مقابلہ ایسے ہی خطرناک اور نابود کرنے والے جراثیم سے تھا، جس حکومت کا رأس و رئیس یزید لعین تھا وہ راہِ عدل سے کوسوں دُور تھی۔ ظلم ہی اس کا قانون تھا۔ ظلم کے اندھیروں سے معاشرہ کے در و دیوار سیاہ ہو چکے تھے۔ اسلامی معاشرہ میں فساد ہی فساد تھا۔ ایسے حالات میں ضروری تھا کہ ایک طاقتور اصلاح کرنے والا اُٹھے اور خطرناک جراثیم کو موت کے گھاٹ اُتارے اور ملت اسلامیہ کو یقینی تباہی سے نجات دلائے اور یہ اصلاح کرنے والے حسینؑ بن علیؑ تھے۔

امام حسین علیہ السلام اس سنگین جرم اور گناہِ کبیرہ کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ پھر یہ معاشرے کا معنوی مرض تھا۔ مادی ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ ایک مرتب منصوبہ کے تحت اس کا علاج کیا جا سکتا تھا۔ لیکن معاشرے کے معنوی مرض و گناہ کا علاج آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل اور عظیم انسان درکار ہے۔ وہی معاشرے کے معنوی امراض کی تشخیص کر کے

منصوبے کے تحت اس کا علاج کر سکتا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام جو کہ امامت و ولایت کی نظر سے معاشرے کو دیکھ رہے تھے وہ معاشرے کے مرض کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ملاحظہ فرمارہے تھے کہ ظلم و گناہ کا سرطان ملتِ اسلامیہ کی اجتماعی حیات کو تہس نہس کر رہا ہے۔ امام حسین علیہ السلام دین کے پاسدار اور منصب امامت کے عہدہ دار ہیں۔ جلد از جلد اقدام کرنا چاہیے اور سرطان و کینسر کے جراثیم بنی اُمیہ خصوصاً یزید لعین کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کے لیے قدم اُٹھائیں۔

اس زمانے میں بنی اُمیہ نے اپنے زہریلے پروپیگنڈوں، دھوکہ دہی اور نیرنگیوں سے معاشرے کو ایسا مدہوش وشت کر دیا تھا کہ جس کو آسانی سے بیدار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسلامی معاشرے کو معمولی طریقے سے ہوش میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔

امام حسین بن علی علیہما السلام ایک ایسی منصوبہ بندی کی فکر میں تھے کہ جس سے بم کے مانند دھماکہ ہوا اور خواب میں ڈوبا ہوا معاشرہ جاگ اُٹھے۔ امام حسین علیہ السلام نے یہ منصوبہ اپنی شہادت اور اہلِ بیتؑ کی اسیری کی بنیاد پر بنایا تھا۔ معاشرے میں امام حسین علیہ السلام ممتاز شخصیت کے مالک تھے، رسولؐ کے بیٹے تھے۔ آپؑ سے پاک دل لوگ اور مسلمان بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ آپؑ کو رسولؐ کی یادگار اور خاندانِ نبوت کی نشانی سمجھتے تھے اور امام حسین علیہ السلام لوگوں کے دل میں اپنی اس منزلت و احترام سے بخوبی واقف تھے۔ آپؑ چاہتے تھے کہ اس سے فائدہ اُٹھائیں اور خود کو ملتِ اسلامیہ پر قربان کر دیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور اہلِ بیتِ رسولؐ کی اسیری اتنا آسان مسئلہ نہیں ہے کہ جس کو اسلامی معاشرہ آسانی سے برداشت کر لے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُموی ظالموں نے اپنی طاقت و تسلط کو ہر جگہ پھیلا دیا تھا اور معاشرے کے سربرآوردہ افراد کے عقائد و افکار کو خوف و ہراس اور لالچ و طمع کے ذریعے اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا لیکن امام حسین علیہ السلام جیسی عظیم شخصیت کی شہادت میں اتنا اثر ہے کہ معاشرہ کے سمندر پر ایک تباہ کن موج پیدا کر سکتی ہے اور آتشِ انقلاب کو بھڑکا سکتی ہے۔

اس وقت معاشرہ کے بزرگ اشخاص انقلاب برپا کرنے کو ضروری سمجھیں گے اور اسی کو اپنے شعار بنائیں گے۔ ۶۰ ہجری کے اسلامی معاشرہ میں انقلاب کی لہر دوڑائی جانی چاہیے تھی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور اہلِ بیتؑ رسولؐ کی اسیری کے بغیر ایسا انقلاب نہیں آسکتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا مقصد یزید لعین جیسے ظالم کے تسلط سے انسانوں کو نجات دلانا ہے، خواہ اس سلسلہ میں سر قلم ہو جائے۔ مختصر یہ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقصد اپنی شہادت اور اپنے خاندان کی اسیری کے ذریعے انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقصد صرف حکومت حاصل کرنا نہیں تھا نہ ہی فوجی کامیابی آپ کا ہدف تھا۔ سانحۂ عاشورہ کو تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امام حسین علیہ السلام کس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آپؑ نے اس مقصد تک پہنچنے کے لیے کس راستے کو اختیار کیا تھا۔ چنانچہ آپؑ اپنے بھائی محمد حنفیہ سے فرماتے ہیں:

اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِي اُمَّةِ جَدِّي

"میں تو صرف اپنے جد رسولؐ کی اُمت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں"۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اسلامی معاشرہ کو فساد و تباہی سے نجات دلانے کے لیے جا رہے ہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ امام حسین علیہ السلام اس مقدس و عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے کیا طریقے اختیار کرتے ہیں؟

اُرِيدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوفِ وَاَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ

"میں نیکیوں کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے کے لیے نکل رہا ہوں"۔ (بحار الانوار: ج ۴۴، ص ۳۲۹)

امام حسین علیہ السلام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نکلتے ہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا ہے؟

یہ وہ طاقت ہے کہ جس پر اسلام نے اپنے قوانین و دستورات کے نافذ کرنے کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ قانون کتنا ہی اچھا اور صحیح کیوں نہ ہو، اگر اس کے نفاذ کی ضمانت نہ ہو، اسے نافذ نہ کیا جاسکتا ہو تو اس کا اثر بھی نہیں ہوسکتا اور معاشرے کا نظم و نسق قائم نہیں ہوسکتا ہے۔ اسلام نے قانون سازی کا اپنا فریضہ پورا کر دیا ہے اور فردی و اجتماعی قوانین بنا دیے ہیں، نیکی و بدی کی وضاحت کر دی ہے، لوگوں کو کامیابی اور ناکامی کے اسباب سے آگاہ کر دیا اور اب اسے اپنے

قانون کو نافذ کرنے والا ضامن معین کرتا ہے۔ قوانین نافذ و جاری کرنے والا ایسا ضامن جو گناہوں کے سیلاب کو روک سکے اور نیکیوں کو رواج دے سکے۔

اس مرحلے میں دنیا کے تمام مکاتب حقوقی (عدلیہ) کی طرح اسلام نے بھی سزا وغیرہ کا سہارا لیا ہے۔ "حدود ودیات" کے نام سے ایک فصل قائم کی ہے اور ہر جرم و گناہ کے مطابق سزا معین کی ہے۔ لیکن اسلام اسی پر اکتفا نہیں کرتا ہے بلکہ کوشش کرتا ہے کہ ایمان وعقیدہ کی اساس خود لوگوں کے درمیان قوانین کو جاری کرنے کا ایک ضامن فراہم کردے، ایمان لوگوں کو خلوت و جلوت میں گناہوں اور انحراف سے باز رکھتا ہے۔

مکتب اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے قوانین کا اجراء میں سو فی صد سزا کا سہارا نہیں لیا ہے بلکہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ لوگوں کو گناہوں سے ایسے طریقوں سے باز رکھا جائے اور اچھائی کے لیے ابھارا جائے کہ جو کبھی سزا اور دھمکی سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ ان ہی میں سے ایک طریقہ ایمان کی بنیاد پر تربیت کرتا ہے اور دوسرا طریقہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ چیز اسلام نے تمام لوگوں پر واجب کی ہے۔

آج کی دنیا نے لوگوں کو یہ حق دیا ہے کہ معاشرے کی روش و کردار پر اچھی طرح نگاہ رکھیں اور جہاں بھی قانون شکنی اور انحراف دیکھیں وہیں تنقید و اعتراض کریں اور مجرم و قانون شکن لوگوں کو سرزنش کریں۔

آج کی ڈیموکریسی نے قومی نگہبانی کو نجی حق کی صورت میں، جو کہ ڈیموکریسی کا لازمہ اور لوگوں کی لوگوں پر حکومت ہے۔ معاشرے کے افراد کو تفویض کر دیا ہے اور اسلام نے قومی نگہبانی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنوان سے تمام مسلمانوں پر واجب کیا ہے۔

مسلمان پر صرف سماجی و اجتماعی لحاظ سے نظارت کا حق نہیں ہے بلکہ اس پر واجب ہے کہ وہ اس قانونی اور فطری حق سے فائدہ حاصل کرے اور سنجیدگی و سختی کے ساتھ ظلم اور گناہوں کا مقابلہ کرے۔ اسلام نے سارے مسلمانوں کو مامور کیا ہے کہ اچھائیوں اور فضیلتوں کی نشرواشاعت میں ہر ایک اپنے لحاظ سے کوشش کرے، اس طرح اسلام نے خود عوام میں سے احکام ومقررات کے نافذ کرنے اور انھیں پھیلانے والے افراد فراہم کیے ہیں۔ اگر سماج میں ایسے افراد اپنی ذمہ داری پوری کریں اور اپنے کام میں منہمک رہیں اور سارے احکام و قوانین اور مقررات کی صحیح

طریقہ سے پابندی کی جائے اور اگر تمام لوگ اپنی آنکھیں بند کر لیں اور امر بالمعروف نہی عن المنکر سے دست کش ہو جائیں تو اس سے گناہوں کے پھیلانے کے لیے زمین ہموار ہو جائے گی اور دن بدن اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے گا۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ فَرِيْضَتَانِ تُقَامُ بِهِمَا الْفَرَائِضُ

"بے شک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دو فریضے ہیں کہ جن کے ذریعے احکام وقوانین پر عمل ہوتا ہے"۔ (وسائل الشیعہ: ج ۶، ص ۱۱۹)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مختلف مراحل ہیں۔ ان کے طریقے جداگانہ ہیں۔ اس عظیم فریضہ کی ادائیگی کبھی سماج کے خاص حالات کی بنا پر، منفی اور کبھی مثبت مبارزہ کی صورت میں ہونی چاہیے۔

امام حسین بن علی علیہ السلام وہ ہیں جن کو ظلم وستم کا قلع قمع کرنے کے لیے مثبت رویہ اختیار کرنا ہے۔ آپؑ کا فریضہ ہے کہ ظالموں کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور سختی کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ شروع کر دیں۔ آپؑ اپنے بھائی محمد حنفیہ سے فرماتے ہیں: "میں اچھی باتوں کا حکم دینے اور بُرائیوں سے روکنے کے لیے نکل رہا ہوں"۔

اس عظیم ومقدس فریضہ کی انجام دہی کے لیے حضرت امام حسین علیہ السلام مثبت مبارزہ والا طریقہ اختیار کرتے ہیں، مردانہ وار میدانِ جنگ میں اُترتے ہیں، فداکاری کرتے ہیں، قربان ہو جاتے ہیں اور اس طرح بشریت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ظلم وعصیان سے مقابلہ کرنے کا طریقہ سکھاتے ہیں اور اس عظیم ومقدس مقصد پر خود اور اپنے اہلِ بیتؑ کو فدا کر دیا اور اس طرح آپؑ خود اور آپؑ کے اہلِ بیتؑ حیاتِ ابدی سے ملحق ہو جاتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○ (سورۂ آل عمران: آیت ۱۶۹)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں اُن کو مُردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں سے روزی پاتے ہیں"۔

سانحۂ کربلا کے تاریخی ریشے

حوادث کو معاشرے جنم دیتے ہیں۔ سماج کے مخصوص حالات ہی سے حوادث وجود میں آتے ہیں اور تاریخ کے واقعات کا سرچشمہ بھی سماج ہی ہے۔ بعبارتِ دیگر، معاشرہ اپنے کچھ داخلی عوامل کی بنا پر ایسے مدوجزر کا حامل ہے کہ جن کے جوش سے سطحِ معاشرہ پر کچھ حباب پیدا ہوجاتے ہیں اور یہی حباب وہ حوادث ہیں جو کہ تاریخ و مورخ کی خوراک بنتے ہیں۔

ایک تاریخی حادثے کے اسباب و علل اور اس کے اجتماعی و سماجی ریشوں کی تحقیق، بہت دشوار کام ہے مگر یہ کہ کسی تاریخی حوادث کی ایک یا چند علتیں ہوں۔ لیکن زیادہ تر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک اجتماعی واقعہ بہت سی علتیں اور عوامل مل کر وجود دیتے ہیں۔ لہٰذا حوادث کو پہچاننے کے لیے ان علل واسباب کا تجزیہ و تحلیل بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان عوامل میں سے بعض کا تعلق معاشرے کے روحی میلان سے ہے۔ ایک معاشرہ کے لوگوں کے طرزِ فکر اور ان کے روحی نظام اس معاشرے کے تاریخی حوادث پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔

کسی تاریخی حادثے کے تجزیہ و تحلیل کے وقت اس سے پہلے رُونما ہونے والے حوادث کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیے، کیونکہ سماجی و اجتماعی حوادث کی مثال زنجیر کی کڑیوں کی سی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے سے پہلی کی پیداوار اور بعد والی کڑیوں کو وجود میں لانے کا سبب ہوتی ہیں۔

عاشورائے حسینیؑ بھی ایک عظیم تاریخی حادثہ ہے۔ اس کے تجزیے کے ساتھ ان اسباب و علل کا بھی تجزیہ کیا جانا چاہیے کہ یہ حادثہ کیوں وجود میں آیا؟

ایک طرف تو ہمیں تاریخ کی گہرائیوں میں اُترنا چاہیے اور ۶۱ ہجری سے قبل حوادث کو کماحقہ ملاحظہ کرنا چاہیے اور اس حادثہ کے وجود میں آنے کے سلسلہ میں ان کے اثر کی تحقیق کرنی چاہیے۔ یہاں ہمیں تاریخِ اسلام کے زرین ورق کو بھی پلٹنا چاہیے اور اس سے قبل کے تاریک زمانہ پر بھی نظر ڈالنا چاہیے۔ زمانۂ جاہلیت، قومی تعصبات اور بنی ہاشم و بنی اُمیہ کے اختلافات کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔

بنی ہاشم و بنی اُمیہ، قریش کے دو بڑے قبیلے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان جو اختلاف ہے اس کے کچھ تاریخی اسباب ہیں۔ رسولؐ اسلام بنی ہاشم کے چشم و چراغ ہیں۔ اسلام آنے سے قبل

حکومت و فرمانروائی بنی اُمیہ کے ہاتھ میں تھی اور جس زمانے میں رسولؐ اسلام مبعوث بہ رسالت ہوئے تھے اس وقت لوگوں کے افکار و عقائد کی بنیاد بت پرستی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے ان اجتماعی آداب و رسوم کی مذمت کی جو کہ ظلم و خرافات کی بنیاد پر اُستوار تھیں۔

اس زمانے میں معاشرے کا فرسودہ نظام سرکشوں کے منافع پر چل رہا تھا۔ ان سرکشوں میں ابوسفیان سرفہرست تھا۔ وہ بنی اُمیہ کا بزرگ اور رؤسائے قریش میں سے تھا۔ ثروت و منصب دونوں ہی یک جا تھے۔ یہ تاجر و استثمار گر انسان تھا اور تمام قبائل کے سرداروں کی یہی منفور روش تھی۔

رسولؐ خدا کا جدید آئین اس فرسودہ اور ظالم نظام کے لیے پیغامِ موت تھا۔ جس وقت محمدؐ کے پاک دہن سے عدالتِ اسلامی کی صدا معاشرے کے قلب میں گونجی تو ان سرکشوں کی سیادت کے پایوں میں زلزلہ آ گیا۔ اسلام ان کی راہ کے بالکل خلاف تھا اور اس بات کے لیے کوشاں تھا کہ ظالم بندشوں کو توڑ دیا جائے اور عوام کو قبائل کے سرداروں اور معاشرے کے جابروں کی قید سے رہائی دلائی جائے۔

واضح رہے کہ جو لوگ موجودہ نظام ہی میں اپنے منافع سمجھتے تھے وہ اس تحریکِ آزادی کی ضرور مخالفت کریں گے۔ چنانچہ جوش و خروش شروع ہو گیا اور ستم گروں کی اقلیت نے رسولؐ کے خلاف محاذ بنا لیا۔ ابوسفیان ان کا کمانڈر تھا۔

رسولؐ تیرہ سال تک مکہ میں رسالتِ حق کے فرائض انجام دیتے رہے اور اس زمانے میں بنی اُمیہ کا سردار ابوسفیان آپؐ کی مخالفت کرتا رہا۔ اور جب رسولؐ اور آپؐ کے اصحاب کو بہت زیادہ ستایا جانے لگا تو رسولؐ خدا ابوسفیان اور اس کے گماشتوں سے تنگ آ کر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ مدینہ والوں نے آنحضرتؐ کا استقبال کیا۔ اس کے باوجود ابوسفیان خاموش نہ بیٹھا۔ وہ روز بروز لوگوں کے ذہنوں میں بڑھتی ہوئی اسلام و رسولؐ کی محبت کو دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا اس نے عدالتِ اسلامی کی آواز کو خاموش کرنے اور رسولؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

ناچار رسولؐ سے جنگ کا ارادہ کیا، چنانچہ ہجرت کے بعد ہونے والی جنگِ بدر و اُحد و اَحزاب، رسولؐ سے ابوسفیان اور تمام مشرکینِ مکہ کی دشمنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان تمام جنگوں میں ابوسفیان نے رُسوا کن شکست کھائی اور پسپا ہوا۔

آخرکار انسانوں کو نجات دلانے کے سلسلے میں رسولؐ اسلام کو فتح عظیم حاصل ہوئی۔ اب آپؐ کے پاس اتنی طاقت فراہم ہوگئی ہے کہ مکہ لوٹ جائیں اور مرکز توحید، خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کریں اور جبر تاریخ کے لحاظ سے اب ابوسفیان صفت لوگوں اوران کے اجتماعی نظام کو فنا ہونا ہے۔ اسلامی افکار ہر روز ترقی کر رہے ہیں، لحظہ بہ لحظہ اسلام کا محاذ قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔

رسولؐ اسلام کو یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ اب محاذ ظلم وستم اور ابوسفیان کے گروہ میں اس عظیم طاقت سے ٹکر لینے کی ہمت نہیں ہے۔ لہٰذا آپؐ مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ خیال کیا جا رہا تھا کہ ابوسفیان بھی اعلان کرے گا کہ سب لوگ جمع ہوجائیں اور اپنے شہر اور ان اُصولوں سے دفاع کرنے کے لیے محاذ بنائے گا کہ جن پر اس کی ریاست کی بنیاد قائم تھی۔ لیکن جب اسے اسلام کی عظیم طاقت (فورس) کی خبر ملی اور اپنی آنکھوں سے اس نے رسولؐ کی عظمت وسطوت دیکھ لی تو اس نے یہی سمجھا کہ اب اپنا طریقہ بدل کر دوسرے طریقہ سے اسلام کے خلاف جنگ کی جائے۔

وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ براہ راست اسلام سے جنگ کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ ایک عظیم وجوش مارتا ہوا سیلاب ہے جو جاری ہو چکا ہے۔ اس نے شہر ودیار کی طرف راستے پیدا کر لیے ہیں جسے بھی اپنی راہ میں رکاوٹ سمجھے گا اسی کو بہالے جائے گا۔ اور بڑی سے بڑی طاقت کو پاش پاش کردے گا۔ پانی کی دھار کے خلاف پیرنا عقل ومنطق کے خلاف ہی نہیں بلکہ طاقت سے بھی باہر ہے۔ محمدؐ کے افکار کی تابناکی کو ابوسفیان بخوبی لوگوں کے قلوب میں محسوس کر رہا تھا، اور لوگوں کو آپؐ کے حکم ودستورات کے سامنے سراپا تسلیم دیکھ رہا تھا۔ اس تسلیم کا ایک واضح نمونہ اسی دن مکہ میں اسلامی سربازوں کا داخلہ تھا جسے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اس دن رسولؐ اسلام دس ہزار دلاور مسلمانوں کے ساتھ، کہ جس میں ہر ایک اپنی جگہ شیر افگن تھا، مکہ آئے تھے۔ اس دن تک ابوسفیان اور اہلِ مکہ نے بڑی فوج نہیں دیکھی تھی۔ فوج سے بیابان بھرا پڑا تھا اور سب سے زیادہ عجیب بات، اپنے فرمانروا رسولؐ کے سامنے سراپا تسلیم ہونا تھی۔ رسولؐ اسلام کے حکم سے کھڑے ہوتے اور آپؐ ہی کے حکم سے حرکت میں آتے تھے۔ رسولؐ خدا کچھ ارشاد فرماتے تو یہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے۔ سینے میں سانس روک لیتے تھے، ان کی اطاعت واضح نمود تھی۔

ابوسفیان کو اس بات کی کم وبیش اطلاع مل چکی تھی کہ لشکرِ اسلام شہر کے قریب پہنچ چکا ہے، لہٰذا وہ مکہ سے نکلا۔ سپاہِ اسلام ''مرالظہران'' میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ ابوسفیان نے کچھ فاصلہ طے کر کے رسولؐ خدا کی سپاہ کی عظمت وشکوہ کو دیکھا۔ اس نے ہرگز اتنا بڑا لشکر نہیں دیکھا تھا۔ اپنے دوست بدیل بن ورقا سے کہا: ''آہ! میں نے آج تک ایسی روشن آگ اور اتنا بڑا لشکر نہیں دیکھا ہے''۔

عباس ابن مطلبؓ پہلے ہی خدمتِ رسولؐ میں پہنچ چکے تھے اور اب رسولؐ خدا کے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر امان دینے کے لیے شہر مکہ کی طرف جا رہے ہیں۔ انھوں نے ابوسفیان کی یہ بات سنی تو ٹھہر گئے اور ابوسفیان کی دوسری کنیت ''ابوحنظلہ'' سے پکارا۔

لشکرِ رسولؐ دیکھ کر ابوسفیان حواس باختہ ہو گیا تھا، وہ اس آواز کو سن کر اس کی سمت چلا، عباس سے ملاقات ہوئی۔ عباس نے دیکھا کہ ابوسفیان کا چہرہ فق ہے۔ کہا: ابوسفیان! رسولِ خدا مکہ کی طرف آرہے ہیں۔ افسوس تمھارے حال پر کہ تم ایساراستہ اختیار کرو کہ یہ عظیم لشکر جنگ و خونریزی کے ساتھ شہر میں داخل ہو۔

مختصر یہ کہ ۱۰ ہجری میں رسولؐ خدا نے دنیا سے کوچ کیا، یہ وہ موقع ہے جس میں ابوسفیان کمین گاہ سے نکل کر فائدہ اُٹھا سکتا ہے اور بنی ہاشم کے ہاتھ سے قدرت وطاقت کو نکال کر بنی اُمیہ کے ہاتھوں میں دے سکتا ہے چنانچہ وہ اس کی کوشش شروع کرتا ہے۔

رسولؐ خدا نے خداوندعالم کے صریح حکم يَآيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (سورۂ مائدہ: آیت ۶۷) سے اپنی حیات ہی میں علی بن ابی طالب علیہ السلام کو اپنے جانشین کے عنوان سے متعارف کرا دیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام، بنی ہاشم کے منتخب و چیدہ افراد میں سے تھے۔ اُمویوں نے یہ طے کیا کہ جیسے بھی ممکن ہو اس منصب سے علیؑ کو محروم کر دیا جائے۔

یہ تھی رسولؐ کی وفات کے بعد بنی ہاشم کے مخالفوں کی فعالیت کی بنیاد۔ رسولؐ خدا کے مانند علیؑ بھی قرآن و اسلام پر ایمان رکھتے اور ایک مقصد پیشِ نظر تھا۔ پھر خاندانی مسائل سے بلند ہو کر آپؑ آئینِ اسلام کے مطابق عمل کرتے تھے۔ آپؑ بشریت وعدالت کو دیکھتے تھے۔ بنی ہاشم و بنی اُمیہ یہاں تک کہ عرب بھی ایک عالمی پیغام کی راہ میں قابلِ توجہ مسئلے کے عنوان سے نہیں آسکتے ہیں اور نہ اس پیغام کے حوادث کا محور بن سکتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ رسولؐ و علیؑ بھی بنی ہاشم میں سے ہیں لیکن تاریخ کی وہ عظیم شخصیتیں کہ جنھوں نے بشریت کے منافع اور ان کے مصالح کے لیے قیام کیا ہے وہ ہرگز ایک قوم، ایک قبیلہ بلکہ ایک ملت میں محدود نہیں ہوسکتی ہیں۔ ایسی شخصیتوں میں علیؑ سرفہرست ہیں۔ آپؑ بنی اُمیہ یا بنی ہاشم کے مفاد پر انسانوں کے مفاد کو قربان نہیں کرسکتے۔

حضرت علی علیہ السلام سازش کرنے والے اور جانب داری کرنے والے نہیں ہیں۔ ان سے ضرور حکومت چھین لینی چاہیے تاکہ اُمویوں کی ترقی کے راستے کھل جائیں۔

رسولؐ خدا دنیا سے اُٹھ گئے۔ حضرت علیؑ آپؐ کی تکفین و تدفین میں مشغول ہوگئے۔ رسولؐ خدا کے جسمِ اطہر کو ابھی دفن بھی نہیں کیا گیا تھا کہ موقع پرست لوگ حکومت ہاتھ میں لینے کے منصوبے بنانے میں مشغول ہوگئے۔ ایک کے بعد ایک منصوبہ، تیزی سے عملی جامہ میں سامنے آنے لگا۔ زمین ہموار ہوگئی۔ آخرکار ان چند لوگوں نے جو سقیفہ کی میٹنگ میں موجود تھے حضرت علی علیہ السلام کی عدم موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر، رسولؐ کے خلیفہ کے عنوان سے بیعت کرلی اور عام لوگوں کو بھی بیعت پر مجبور کیا۔ حضرت علی علیہ السلام ابھی قبر رسولؐ ہی کے پاس تھے، دفنِ رسولؐ سے فارغ ہی ہوئے تھے۔

مرحوم جواد فاضلؒ نے اس منظر کی اس طرح نقشہ کشی کی ہے:

"حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ میں بیلچہ تھا اور تن تنہا قبر رسولؐ کو درست کررہے تھے۔ جندبؓ بن زہیر آئے اور کہنے لگے: اے ابوالحسن! جانتے ہیں کیا ہوگیا؟

فرمایا: کیا کچھ ہوگیا ہے؟

عرض کیا: ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے جندبؓ کی طرف نگاہ کی اور فرمایا: اتنی آسانی سے؟

نہیں ابوالحسنؑ! انصار و مہاجرین کے درمیان بہت بحث ہوئی لیکن مہاجرین نے اس دلیل سے کہ وہ حسب و نسب میں رسولؐ سے قریب ہیں اور رسولؐ کی قوم میں شمار ہوتے ہیں، انصار کے قبیلوں کو خاموش کردیا اور ابوبکرؓ قریش اور رسولؐ کے خسر ہونے کے اعتبار سے تختِ خلافت پر پہنچ گئے ہیں۔

فرمایا: صرف اس بنا پر قریش انصار پر حکومت کرسکتے ہیں کہ رسولؐ ان کے

قبیلہ سے ہیں اور رشتہ داری ہے؟
عرض کیا: ہاں، اے ابوالحسنؑ!
تو ہم قریش کی بہ نسبت رسولؐ سے زیادہ قریب ہیں۔ ہم اور آپؑ کا ایک ہی خون وخو ہے، کیا ہم قریش سے زیادہ میراث کے مستحق نہیں ہیں؟"
حضرت علی علیہ السلام وہاں سے گھر لوٹ آئے اور شب میں حسب معمول اپنے اس وظیفہ نماز و نیاز میں مشغول ہو گئے جو طلوعِ آفتاب تک جاری رہتا تھا۔ ابھی آفتابِ حجاز نے شہر مدینہ کو اچھی طرح روشن نہیں کیا تھا کہ جنابِ فضہؓ نے آ کر کہا: مولاؑ! ابوسفیان بن حرب آپؑ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔
فرمایا: بلا لو۔ ابوسفیان آپے سے باہر غیظ و غضب میں بھرا ہوا آیا۔ امیر المومنین علی علیہ السلام نے اطمینان سے پوچھا: اے ابوحنظلہ! خیریت تو ہے، اس وقت کیسے زحمت فرمائی؟
ابوسفیان چلّایا؟ کیا ہوا؟ اور کیا کرنا چاہتے ہیں؟
حضرت علیؑ کے سامنے ابوسفیان نے نہایت ہی برہمی کے ساتھ کہا: ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے، یہ خاندانِ عبد مناف کے لیے ذلّت کا مقام ہے۔ حکومت کو سرنگوں کرنے کے لیے خون کے دریا بہہ جاتے ہیں۔ ہاتھ بڑھایئے! خلیفہ کے عنوان سے میں آپؑ کی بیعت کرتا ہوں۔ ضرورت ہوگی تو میں مدینہ کو مسلح فوجیوں سے بھر دوں گا۔
ابوسفیان کو نہ اسلام کی کوئی پروا تھی اور نہ حضرت علیؑ سے ہمدردی تھی۔ وہ تو موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا اور ایک اندرونی اختلاف پیدا کر کے اسلام کو مٹا کر دوبارہ جاہلیت کے گندے دور کی تجدید کرنا چاہتا تھا اور اس کی تجدید کے سایہ میں دوبارہ خود سردار بن کر اپنی فرعونیت کی بساط بچھانا چاہتا تھا۔ لیکن حضرت علیؑ کی فکر اس سے کہیں اُونچی تھی کہ وہ ایک جانے پہچانے انسان کے فریب میں آئیں۔ آپؑ کی نظروں میں سب سے اہم چیز اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت تھی خواہ کی حفاظت کے لیے آ ؑ کو خانہ نشینی اور

اپنے مسلم حق سے دست کشی پر مجبور ہونا پڑے۔

ابوسفیان کو یہ توقع تھی کہ حضرت علیؑ اس کی پیشکش کا استقبال کریں گے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک دوسرے کے تعاون سے نئی حکومت کی بنیاد کو متزلزل کریں گے اور اس کا تختہ پلٹ کر امر خلافت کو اپنے ہاتھوں میں لے کر لوگوں پر حکومت کریں گے۔

حضرت علی علیہ السلام ایسے انسان نہیں تھے جو منصب پر پہنچنے کے لیے فتنہ برپا کرتے اور لوگوں کے خون سے کھیلتے، کشتوں کے پشتے لگا کر حکومت تک پہنچنے کے لیے ان کا زینہ بناتے۔

اس نازک زمانہ میں حضرت علی علیہ السلام نے صریح طور پر ابوسفیان کی پیشکش کو رد کر دیا اور اسے یہ جواب دیا: ''تیرا دل اسلام دشمنی سے پُر ہے۔ اس سے تمھارا مقصد مال و مقام حاصل کرنا ہے۔ میں تمھاری پیشکش نہیں قبول کر سکتا''۔

اس داستان کے نتیجہ ہی سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں۔

ابوسفیان نہایت ہی غیظ و غضب کے عالم میں حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا تھا لیکن جب واپس لوٹا تو برف کے مانند سرد تھا۔ اپنے گھر واپس جا رہا تھا کہ ابوبکرؓ کا قاصد راہ میں ملا اور کہنے لگا: اے ابوحنظلہ! خلیفۂ رسولؐ نے آپ کو بلایا ہے۔

ابوسفیان نے کچھ بہانہ بھی کیا کہ چند ہی منٹ پہلے تو حضرت علیؑ کو خلیفۂ رسولؐ کے خلاف اُبھار رہا تھا اور ابوفصیل کے خلاف مدینہ کو سوار و پیادہ فوج سے بھرنے کا وعدہ کر رہا تھا، اب ابوفصیل سے کیا کہے گا؟

لیکن ابوسفیان ایک سیاستدار تھا، وہ اپنے اُوپر قابو پا کر خلیفۂ رسولؐ سے ملاقات کر سکتا تھا۔ ابوسفیان حضرت ابوبکرؓ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں پر ابوبکرؓ، ابوحفص، عمرؓ، ابوعبیدہ جراح اور خالد بن ولید حضرات کی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی۔ اس کو تو خدا ہی جانتا ہے کہ انھوں نے ابوسفیان سے کیا کہا اور ابوسفیان نے کیا سنا، لیکن یہ مسلم ہے کہ شام کی گورنری اس میٹنگ میں خاندان ابوسفیان کے لیے لکھ دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے یزید بن ابی سفیان (وبہ کا بھائی) کے حق میں شام کی

گورنری کا پروانہ لکھ دیا اور وہ عہد خلافت عمر میں بھی چھ سال تک گورنر رہا۔

اس طرح وفاتِ رسولؐ کے فوراً بعد ہی قتلِ حسینؑ کی زمین ہموار ہوگئی۔ خلیفہ دوم نے بھی یزید بن ابی سفیان کے نام شام کی گورنری کا پروانہ لکھا اور اس کے بعد اس کے بھائی معاویہ بن ابی سفیان کو شام کا حاکم مقرر کیا۔ حضرت عمر قتل ہوگئے تو حضرت عثمان خلیفہ بنے۔ انھوں نے بھی شام کی حکومت پر معاویہ کو باقی رکھا۔ معاویہ نے جو کہ نہایت ہی چالاک تھا ــــ شام میں آہستہ آہستہ اپنی خلافت کی زمین ہموار کرلی۔

حضرت عثمان بھی اس انقلاب میں قتل ہوگئے جو کہ ان کے خلاف لوگوں نے برپا کیا تھا۔ اس وقت مسلمان حضرت علی علیہ السلام کے در پر پہنچے اور آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت علی علیہ السلام خلافتِ ظاہری پر آئے۔ اب عدل و انصاف کی حکومت قائم ہونا چاہیے۔ ناپاک لوگوں کے ہاتھ سے لوگوں کا دامن چھڑایا جائے۔ حکومت کے افراد میں معتدبہ تبدیلی آنی چاہیے۔ معاویہ نہایت ہی ناہنجار آدمی تھا۔ وہ ابوسفیان کا جانشین اور بنی اُمیہ کا یادگار تھا۔ اس نے اپنی گورنری کے زمانے میں بیت المال کو، جو کہ عام مسلمانوں کا حق تھا، اپنی ہوس رانی پر خرچ کیا۔ لوگوں کے حقوق پامال کیے۔ اس کی حکومت سوفی صد ظالمانہ تھی۔ ایسا شخص، حضرت علی علیہ السلام ایسے انسان کی حکومت کا رکن نہیں رہ سکتا ہے۔ لہٰذا پہلی فرصت میں حضرت علی علیہ السلام نے اس کی معزولی کا پروانہ لکھ کر شام بھیج دیا لیکن معاویہ اتنی آسانی سے ہٹنے والا نہیں تھا۔

اس نے قتلِ عثمان کو بہانہ بنایا اور خونِ عثمان کے انتقام کی آواز بلند کی۔ اس سے بحران پیدا ہوگیا۔ اس نے حضرت عثمان کے خون آلود لباس کو نیزہ پر بلند کیا اور اہلِ شام کو قاتلانِ عثمان سے جنگ کرنے پر اُبھارا اور غلط پروپیگنڈے سے یہ باور کرایا کہ حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کو قتلِ عثمان پر اُبھارا تھا۔ حقیقت میں حضرت علی علیہ السلام ہی کو جنگ کے لیے اُٹھنا چاہیے تھا۔ شامی سادہ لوح تھے، پھر اولادِ ابوسفیان کی زہریلی تبلیغات سے متاثر ہوچکے تھے۔ یہ باتیں ان کی سمجھ میں آگئیں، جنگ کے لیے اپنی تیاری کا اعلان کردیا۔ دوسری طرف حضرت علی علیہ السلام معاویہ کو برطرف کرنے کے لیے مجبوراً اس سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ آخرکار سرزمینِ صفّین پر دونوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ مہینوں تک اس کا سلسلہ جاری رہا اور حکمیت قبول کرنے پر جنگ ختم ہوگئی۔

معاویہ نے درہم و دینار میں حضرت علی علیہ السلام کی فوج کے سپہ سالاروں کو خرید لیا۔ دوسری طرف عمرو عاص کی شیطانی سیاست نے، کہ جس میں شکست یقینی تھی، جنگ کا رُخ ہی بدل دیا۔

معاویہ حضرت علی علیہ السلام کی حین حیات میں بھی گستاخیاں کرتا رہا اور حکومتِ حق کے مقابلے میں کھڑا رہا اور شام میں اپنی ظالمانہ حکومت جاری رکھی۔ حضرت علی علیہ السلام نے شہادت پائی اور معاویہ کے سامنے سے حضرت علی علیہ السلام جیسی شخصیت اُٹھ گئی۔

امام حسن بن علی علیہما السلام خلیفہ مقرر ہوئے تو معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کی نئی حکومت کا بھی مقابلہ شروع کر دیا۔ پھر ایک بڑا لشکر لے کر کوفہ کی طرف چلا تا کہ امام حسن علیہ السلام کی حکومت کا تختہ پلٹ کر خود تختِ خلافت پر متمکن ہو سکے۔ امام حسن علیہ السلام سے جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ایک بار پھر امامؑ کے پیروکار معاویہ کے درہم و دینار کے لالچ میں آ گئے اور آپؑ کو چھوڑ کر فرار ہونے لگے، یہاں تک کہ آپؑ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ امام علیہ السلام نے مجبوراً معاویہ سے صلح کی اور کوفہ کو چھوڑ کر واپس اپنے جد رسولؐ خدا کے شہر مدینہ میں آ گئے۔

معاویہ کی دیرینہ تمنا پوری ہوگئی اور وہ خود خلیفہ مسلمین و جانشین رسولؐ کہلوانے لگا۔ مسلمانوں کے تمام علاقوں پر اس کی حکومت مسلّم ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے سوچا کہ خلافت کو موروثی بنا دے۔ چنانچہ حضرت امام حسن علیہ السلام سے ہونے والی صلح کی دستاویز اور عام مسلمانوں کی ناراضگی کے باوجود اس نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ معاویہ اپنے کیفر کردار کو پہنچا تو یزید لعین مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ اپنی بدکرداری کی وجہ سے وہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے منظوری نہ لے سکا۔

اس زمانے میں حضرت امام حسین علیہ السلام دُنیائے اسلام کے چشم و چراغ تھے۔ سب کی نظریں آپؑ پر لگی ہوئی تھیں، سبھی آپؑ کو دل و جان سے دوست رکھتے تھے۔ مسلمان یزید کی ننگ و عار والی حکومت کو قبول کرنے میں شرم محسوس کر رہے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ اس حکومت کے بارے میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا کیا ردِعمل ہے؟ اور اس سلسلہ میں آپؑ کا کیا کردار ہے؟

لوگ یزید، اس کے باپ معاویہ اور اس کے دادا ابوسفیان کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کے کردار و کرتوت سے بھی بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے امام حسینؑ ایسے نہیں ہیں جو یزید کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں گے۔ اس طرح مرگِ معاویہ کے بعد حضرت امام حسینؑ کی یزید سے جنگ یقینی ہوگئی۔ اپنے زمانے میں معاویہ نے امام حسینؑ سے کسی چیز میں زبردستی نہیں کی اور آپؑ کو

اپنے بیٹے یزید کی بیعت کے لیے مجبور نہیں کیا۔ جب معاویہ مدینہ آیا تھا تو اپنے بیٹے یزید کی جانشینی کے بارے میں امام حسینؑ سے گفتگو کی تھی لیکن جب اس مسئلے کے بارے میں امام حسینؑ کا محکم موقف دیکھا تو آپؑ سے کچھ نہ کہا اور آپؑ کے خلاف کوئی سخت رویہ اختیار نہ کیا یہاں تک کہ اپنے بیٹے یزید سے بھی وصیت کی تھی کہ حسینؑ بن علیؑ سے سختی سے پیش نہ آنا۔ نیز کہا تھا: اگر حسینؑ تمھارے خلاف کوئی اقدام کریں تو تم سخت ردعمل کا مظاہرہ نہ کرنا، لیکن معاویہ کے بعد یزید نے اپنے باپ کی وصیتوں کو فراموش کر دیا اور والیٔ مدینہ کو خط لکھا اور اسے حکم دیا کہ سختی کے ساتھ حسینؑ بن علیؑ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے بیعت لے لو، لکھا تھا: ''ان سے اس وقت تک سختی میں کمی نہ کرنا جب تک یہ میری حکومت کے سامنے جھک نہ جائیں''۔

جب یہ خط مدینہ پہنچا تو اس سے ولید بن عتبہ عجیب مخمصہ میں پڑ گیا۔ ولید بن عتبہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے اچھی طرح واقف تھا۔ جانتا تھا آپؑ یزید جیسے کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے اور بیعت نہیں کریں گے۔ لیکن مرکزی حکومت کے فرمان کے مطابق عمل کرنا۔ یا کم از کم یہ بات حضرت امام حسین علیہ السلام تک پہنچا دینا بھی ضروری ہے۔

اس لیے ولید نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو بلوایا اور آپؑ کو حالات سے خبردار کیا لیکن حسینؑ بن علیؑ نے بھی ولید کے خیال کے مطابق کمالِ صراحت کے ساتھ یزید کی بیعت کو ٹھکرا دیا اور اس کی حکومت قبول کرنے سے پہلو تہی کی۔

یہاں حضرت امام حسین علیہ السلام کے سامنے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کیا صرف بیعت نہ کرنے سے آپؑ کا فریضہ پورا ہو جائے گا اور یزید کی ظالم حکومت کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کا فریضہ نہیں ہے؟ یہ وہ موڑ ہے جہاں امام حسین علیہ السلام معمولی انسانوں کی حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور الٰہی و آسمانی لوگوں کی صفوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ آپ ہرگز کسی ستم گر کو یہ اجازت نہیں دیں گے جو کہ اسلامی خلافت اور جانشینیٔ رسولؐ کے نام سے لوگوں پر ظلم و تشدد کے ساتھ حکومت کرے۔ لہٰذا آپؑ نے ولید کے دربار سے نکلتے وقت یہ طے کیا کہ پورے اعتماد کے ساتھ میدانِ مبارزہ میں اترنا چاہیے اور بنی اُمیہ کی نسل کی حقیقت کو آشکار کر دینا چاہیے۔

آپؑ شعلہ انقلاب کو بھڑکانا چاہتے ہیں۔ ایسا شعلہ جو ستم و ستم گر کو جلا کر خاکستر کر دے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام ایسا انقلاب برپا کرنے کی غرض سے مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔

چند روز مکہ میں قیام پذیر رہے اور اپنی جوشیلی تقریروں سے اہلِ مکہ کو بیدار کیا اور پھر عراق کی سمت روانہ ہو گئے کیونکہ اہلِ کوفہ نے آپؑ کے پاس بے شمار خطوط روانہ کیے تھے اور درخواست کی تھی کہ کوفہ تشریف لائیے اور مسلمانوں کے اُمور کی زمام سنبھالیے۔

اگرچہ حضرت امام حسین علیہ السلام اہلِ کوفہ کو پہلے سے جانتے تھے اور ان کے اعتماد پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے اور نہ کوفہ کو اپنے لیے محکم مرکز قرار دے سکتے تھے لیکن چارۂ کار کیا تھا؟ ایک نقطہ سے مبارزہ کا آغاز ہونا چاہیے اور چونکہ اہلِ کوفہ نے اپنی تیاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس لیے کوفہ ہی کو اپنی تحریک کے آغاز کا مرکز قرار دینا مناسب سمجھا۔ مقصد یہ ہے کہ ظلم وستم کا عامل ذلیل و رُسوا ہو جائے اور اسلامی معاشرے اس بات کو جان لیں کہ ظالم وستم گر سے اسلام کس طرح نمٹتا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کوفہ کی سمت سے چلے، لیکن اب کوفہ کے وہ حالات نہیں ہیں جو پہلے تھے کیونکہ یزیدِ لعین کے حکم سے ابنِ زیاد کوفہ پہنچ چکا تھا اور وہاں کے حالات کو قابو میں لے چکا تھا۔ یہاں یہ واضح کر دوں کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں: سخت و مقاومت کرنے والے اور ملائم و نرم۔

اہلِ کوفہ دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے فکر و عقیدہ میں محکم و سخت نہیں ہیں، بہت جلد رنگ بدلتے ہیں اور فوراً راستہ بدلتے ہیں۔ شروع میں انھوں نے حسینؑ سے یہ درخواست کی تھی کہ بنی اُمیہ کے خلاف ہماری قیادت فرمائیے اور جب انھوں نے اپنے سامنے سفاک و خونریز ابنِ زیاد کو دیکھا تو ان کے سارے ولولے پانی ہو کر بہہ گئے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کو دشمن کے سامنے تن تنہا چھوڑ دیا۔ اس لیے ابنِ زیاد کوفہ میں جلد کامیاب ہو گیا۔ جب اس نے کوفہ پر قابو پالیا تو پھر تحریکِ حسینیؑ کو ناکام بنانے کے منصوبے بنائے۔ چنانچہ کوفہ اور اس کے مضافات سے اس نے اتنی فوج جمع کر لی کہ جو امام حسینؑ کو کوفہ آنے کے بجائے کربلا جانے پر مجبور کر دے۔

ابنِ زیاد نے اتنے اسباب و وسائل مہیا کر لیے تھے کہ جن سے وہ کربلا میں بظاہر حضرت امام حسین علیہ السلام کو شکست دے سکے اور امام علیہ السلام نے وہ عظیم توفیق پائی تھی کہ جس سے آپؑ اپنی شہادت کے ذریعے اسلامی ممالک میں عام انقلاب برپا کر دیا اور اُموی ظالموں کو آگ کے شعلوں میں جلا دیں اور وہ عظیم توفیق کہ جس کو حقیقت میں خدا کا خاص پیغام کہنا چاہیے، یہ ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے تاریخی انقلاب سے اسلامی معاشرے کو ظالم وستم گر سے ٹکرانے کا طریقہ بتا دیا اور ایسے مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی کہ جس سے بشریت کی اصلاح کرنے والے بہادر ہمیشہ

درس لیتے رہیں گے۔

عاشور کے بعد

ان کا پروگرام ختم ہوا اور ان کی بہادرانہ جنگ تمام ہوئی ___ اب ہمارے سامنے دو اور جری آتے ہیں۔ عاشور کے دن حوادث کا محور امام حسین علیہ السلام تھے۔ آپؑ ہی غور وفکر کرتے تھے اور اس کو عملی جامہ پہناتے تھے، جس کے نتیجے میں سانحۂ کربلا رُونما ہوا۔

آپؑ کا پروگرام آپؑ کی شہادت پر ختم ہو چکا، لیکن ایسا لگتا ہے کہ مقصد تک پہنچنے میں کافی فاصلہ ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اُموی ظالموں کی عام لوگ مذمت کریں اور یزید کا ظالمانہ نظام آئینِ اسلام سے جدا ہو جائے۔

انسان اس چیز کو سمجھ جائے کہ اسلام ظلم کا کیسے مقابلہ کرتا ہے۔ وہ آزادی کی راہ و رسم کو زندہ حوادث کے پیکر میں دیکھے۔ حسینؑ اس مقصد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس مقصد کی طرف بڑھنے کا اصلی رکن حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت و جانبازی ہے اور اس کا دوسرا رکن بھی ہے۔ یہیں سے ہمارے سامنے معرکہ میں دو اور جری نظر آتے ہیں: وہ ہیں امام زین العابدینؑ اور حضرت زینب سلام اللہ علیہا۔

یہ دونوں حوادثِ کربلا کے باقی ماندہ ہیں اور سانحۂ کربلا کے بعد یہ دونوں ایک عظیم پیغام پہنچانے والے ہیں۔ واقعۂ کربلا اور شہادتِ امام حسینؑ کے بعد اُمویوں نے آپؑ کے اہلِ بیتؑ کو کربلا سے اسیر کیا اور وہاں سے کوفہ پھر شام لے گئے۔

ان دونوں شیروں کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ حضرت زینبؑ اور امام زین العابدینؑ حادثۂ عاشورا کی بنیاد پر لوگوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑ سکتے ہیں اور اس کے ذریعے خرمن بنی اُمیہ کو آگ لگا سکتے ہیں اور ان کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

حضرت زینبؑ نے کوفہ سے اپنا پہلا قدم اُٹھایا اور اُمویوں کی حکومت پر کاری ضرب لگائی۔ مجمع کے سامنے آپؑ نے لب کشائی کی اور فرمایا: "حمد خدا سے مخصوص ہے، صلوات ہو میرے جد محمدؐ پر۔

لوگوں میں کہرام بپا ہو گیا۔ ہنسی خاموشی میں بدل گئی، چہرے فق ہو گئے، بدن لرزنے لگے، آنکھوں سے اشکِ سیل جاری ہو گیا۔ غفلت کے پردے پھٹ گئے۔ سبھی جانتے تھے کہ رسولؐ کی

نواسی اور علیؑ ابن ابی طالبؑ کی بیٹی ان سے ہمکلام ہے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ شہید کربلا حسینؑ بن علیؑ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

اس روز جنابِ زینبؑ نے مجمع کے سامنے طویل خطبہ دیا۔ لوگوں کے سامنے خود کو اور اپنے بھائی حسینؑ کو پہچنوایا اور مجمع کے سامنے اپنے خاندان کے کارنامے بیان کیے۔

صاحب نہج البلاغہ کی بیٹی نے اپنی ایک تقریر سے امویوں کے سارے پروپیگنڈے پر پانی پھیر دیا اور لوگوں کے اندازِ فکر کو بدل دیا۔ اپنی اس خطابت سے تختِ یزید کو متزلزل کر دیا۔ کوفہ پر سوگ کی فضا چھاگئی اور انقلاب کے جن شعلوں کو بنی اُمیہ نے اپنی بربریت سے دبا دیا تھا وہ آہستہ آہستہ بھڑکنے لگے۔ حضرت زینبؑ اپنی کامیابی سے قدم بہ قدم نزدیک ہورہی تھیں۔ حضرت زینبؑ کی تقریروں کے دوران آپ کا شاہکار یہ تھا کہ اُموی پروپیگنڈے کے برخلاف، حادثۂ عاشورہ کو غیر انسانی وغیر قانونی ثابت کیا اور نہایت اطمینان سے فرمایا:

يَا أَهلَ الكُوفَه! يَا أَهلَ الخَتلِ وَالمَكرِ (بحار الانوار: ج ۴۵، ص ۱۰۹)

حضرت زینبؑ نے یہ نہیں فرمایا: اے کوفہ والو! میرے بھائی کو کیوں شہید کیا ہے؟ ان کے اہلِ بیتؑ کو کیوں اسیر کیا ہے؟ بلکہ اپنی تقریر کا آغاز اس طرح کیا کہ اگر شیعہ ہوں گے تو ضرور قبول کریں گے، شریعت کو ماننے والے اس کے سامنے سرِتسلیم خم کریں گے، یہاں تک کہ یزید کے طرفدار بھی اسے مانیں گے۔

حضرت زینبؑ نے لوگوں کے مکر وحیلہ پر تنقید کی۔ آپؑ کی تقریر کا لب لباب یہ ہے:

اے دھوکہ بازو! اے فریب کارو! کیا اسلام میں فریب کاری، دھوکا بازی جائز ہے؟ تم نے اُٹھارہ ہزار خط لکھے اور میرے بھائی کو دعوت دے کر بلایا اور پھر ان سے جنگ کر کے شہید کر دیا۔ اے شریعت کے منکرو! اے قانون شکنی کرنے والو! دھوکے سے حسینؑ کو بلایا اور پھر انھیں شہید کرا دیا۔ ایسا کیوں کیا ہے؟ کیوں دھوکہ دیا ہے؟ اے لوگو! تم نے جھوٹ بولا، انھیں دعوت دی، لیکن دھوکہ دیا، تم نے غیر قانونی کام کیا۔

لیس منا من ماکر مسلما (بحار الانوار: ج ۷۵، ص ۲۹۲)

اپنے اس بیان سے حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے لوگوں کا راستہ بدل دیا اور اپنی تقریر سے

لوگوں کے دلوں میں انقلاب کا بیج بو دیا۔

ایک بار پھر ابنِ زیاد کے سامنے مرکز حکومت میں خطبہ دیا اور دوبارہ اپنے خطبہ کے ذریعے اُمویوں کے سیاہ کرتوت کو آشکار کر دیا۔ اور جب شام میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اپنا تعارف کرانا چاہتے تھے تو فرماتے تھے:

انا بن من قتل صبراً و کفٰی بذٰلک فخراً (بحارالانوار: ج ۴۵، ص ۱۱۳)

غیر قانونی قتل ہے، انسان کسی حیوان کو ذبح کر سکتا ہے اور اسے کھا سکتا ہے لیکن کسی جانور کو بھوکا پیاسا اور گھیر کر قتل کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ غیر قانونی کام ہے، یعنی بہت سے لوگ اسے چاروں طرف سے گھیر لیں اور تیز ہتھیاروں سے اس پر ٹوٹ پڑیں اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔۔۔ ایسا قتل، قتلِ صبر ہے اور یہ حرام ہے۔

اس انسان کو قتل کرنا چاہیے کہ شریعت نے جس کے قتل کی اجازت دی ہے لیکن قتلِ صبر کے ذریعے اس کی جان نہیں لینا چاہیے۔ اگر کوئی اس طریقہ سے قتل کرے گا تو یہ غیر قانونی ہے اور حرام ہے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے مجمع کے سامنے فرمایا:

انا بن من قتل صبراً و کفٰی بذٰلک فخراً

"میرے لیے اتنا ہی فخر کافی ہے کہ مَیں کہوں: ان دنیا والوں نے میرے بابا کو قتل کر دیا، قتلِ صبر کے طریقے سے اور ایسا قتل غیر قانونی و حرام ہے"۔

بالکل انھوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو قانون کے برخلاف شہید کیا ہے۔

جی ہاں، حضرت زینبؑ اور حضرت امام زین العابدینؑ نے ہر موقع سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں کو بیدار کیا اور معاشرے کی فکر میں مدوجزر پیدا کر کے سیاست کا پانسا ہی پلٹ دیا۔ اُفق پر تاریکی پھیلی، لب بہ سکوت مجمع میں ہیجان پیدا ہو گیا، پُرسکون معاشرے میں تلاطم برپا ہو گیا۔ حکومت ہشاش بشاش چہرہ، رنج و غم کی گرد سے اَٹ گیا۔ یہ سب کچھ حضرت زینبؑ اور حضرت امام زین العابدینؑ کی محنت کا ثمرہ تھا اور اسی محنت کے نتیجے میں بنی اُمیہ کے مخالفین نے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اس طاقت کو ختم کر دیا۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام
کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

انقلابِ عاشورہ اور معرکۂ کربلا کی یادگار چوتھے امام حضرت علی بن الحسین علیہ السلام ہیں۔ آپؑ کے زین العابدین، سیّد سجاد، زکی اور امین وغیرہ القاب ہیں۔ آپؑ کی عظیم ذمہ داری، انقلابِ عاشورہ کو کامیاب بناتا ہے۔ اس سے بحث نہیں ہے کہ آپؑ نے کس دن ولادت پائی ہے۔ عدل و انصاف پر قربان ہونے والے آدمیوں کی نقش آفرینی میں، دنوں، مہینوں اور سال کا کوئی کردار نہیں ہوتا ہے۔ ان عظیم لوگوں کی روحی کیفیت کی تحقیق ہونی چاہیے۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ ۳۳، ۳۶ یا ۳۸ ہجری جمادی الاولیٰ بروزِ جمعرات کو آپؑ دنیا میں آئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھی سالوں آپؑ نے ولادت پائی ہے، بلکہ اہم چیز امام علیہ السلام کی روحی کیفیت اور طریقۂ فکر اور آپؑ کے دماغ کے نظام کی تحقیق کو درک کریں تاکہ اس معرفت کی شیفتگی سے ہم بھی عدل وظلم، ظلمت ونُور اور اچھائی وبرائی کی اس جنگ میں ان کی صف میں کھڑے ہوسکیں کہ جس نے تاریخ بشریت کو پُر کردیا ہے۔ ہم آپؑ کے والدین سے آغاز کرتے ہیں:

والدِ ماجد

آپؑ کے والدِ بزرگوار نواسۂ رسولؐ حسینؑ بن علیؑ ہیں۔ عزت وشرف کے لیے اگرچہ یہی نسبت کافی ہے لیکن اسلام کے نقطۂ نظر سے، معیار نہیں ہے۔ معیار صرف وہ اجتماعی فعالیت ہے جو تقویٰ کے ساتھ انجام دی جاتی ہے۔ ہاں اس نسبت سے ہم ایک دوسرا مفہوم نکالیں گے۔ صرف ایسا نہیں ہے کہ آپؑ کے والد بزرگوار عظیم انقلاب کے قہرمان تھے، بلکہ آپؑ خود بھی عینی طور پر اس عظیم انقلاب میں موجود تھے۔ اس ترتیب سے اس انقلاب میں آپؑ کے کردار کی تحقیق کی جانی چاہیے۔

والدہ ماجدہ

ایران کے بادشاہ یزدجرد کی بیٹی شہربانو ہیں۔ اس ایران کے بادشاہ کی ساسانی شہنشاہیت

کے زیر تسلط تھا جس نظام میں عوام بری طرح پس رہی تھی۔ جس نظام کی بنیاد "طبقات" روح اور اس کے موجود ہونے پر اُستوار تھی، جن طبقات میں نفوذ نہیں کیا جا سکتا تھا، جن میں اختلاط آسان کام نہیں تھا۔ ایک دوسرے سے بالکل مختلف، خوش حالی و رفاہ صرف بڑے طبقہ کے لوگوں سے مخصوص تھی اور ان میں ساسانی بادشاہ سب سے بلند تھا اور سب اس کے غلام تھے۔

حقوق، باوجودیکہ ساسانیوں کے حقوقی نظام میں قانون کا سرچشمہ اور اس کی اساس، زرتشت مذہب تھا لیکن اس زمانے میں ایران میں حقوق کا تعلق مکمل طور پر ساسانی بادشاہوں کے اختیار سے تھا۔ واضح رہے کہ یہ قانون ہر جگہ اور ہر زمانے میں بڑے طبقے کے فائدے اور عوام کے نقصان کے لیے بنائے جاتے تھے۔

عہد ساسانی کی ظالم حکومت کی وجہ سے ایرانی معاشرہ کا شیرازہ بکھر گیا، اور جو پیوند معاشرہ ساز اور ملت ساز ہو سکتا تھا وہ ایرانی معاشرہ میں ناپید تھا۔ جس کے نتیجے میں معاشرہ، لوگ، عام پبلک، کاشتکار اور مزدوروں کا حکومت سے اعتماد اُٹھ چکا تھا۔

ایسے معاشرے میں ضرور انقلاب آتا ہے۔ چنانچہ ایرانی معاشرے سے ایسا انقلاب اُٹھا لیکن فوراً ہی شاہِ عدل، کہ جس کے عدل کی آواز نے تاریخ کو روشن کر دیا، کے ذریعے یہ انقلاب دب کر رہ گیا۔ انوشیروان، شہزادوں اور زمین داروں کے ہاتھوں سخت خونریزی ہوئی اور انقلاب کو ناکام بنا دیا گیا لیکن ایرانی معاشرہ لحظہ بہ لحظہ ظلم و ستم کے کنویں میں اُترتا چلا گیا۔ اس معاشرے کے لوگ موقع کے منتظر تھے کہ اس سے استبداد کے کنویں سے سر باہر نکالیں اور انقلاب برپا کر کے موجودہ نظام و حکومت کا تختہ پلٹ دیں۔

پہاڑوں کے درمیان سے گزر کر اسلام کی آواز ان دُور افتادہ اور غیر معروف زمین پر بسنے والوں کے درمیان گونجی۔ اسلام کی گونج موج کے مانند ہر لحظہ وسعت پذیر ہوتی جاتی تھی۔ کوہِ ابوقبیس سے گزر کر مدینہ، عراق اور پھر مومن سپاہیوں کے ذریعے ایران کی سرحد تک پہنچ گئی۔

عجیب بات ہے کہ ڈیموکریسی کے نظاموں میں، عام لوگوں کی رائے اور ووٹ سے حکومت حاصل کی جاتی ہے اور ان ہی کی رائے مخالف ہو جانے سے حکومت ہاتھ سے نکل جاتی ہے، بلکہ استبدادی نظام میں کہ جہاں عوام کی رائے کو کوئی حیثیت حاصل نہیں ہوتی ہے اور اپنی پشت پناہی کے لیے دوسری چیز کو قرار دیا جاتا ہے، وہاں بھی طاقتوں کے بروئے کار آنے اور ان کی زوال

پذیری میں عام لوگوں کی رائے دخیل رہی ہے اور ہے۔

ایران کی تاریخ میں ضحاک کی شیطانی طاقت کو آخرکار عوام کی رائے اور پبلک نے پاش پاش کر دیا۔ ہندوستان میں برطانیہ کی قوی شہنشاہیت ہندوستان کی عوام ہی کی طاقت سے تباہ ہوئی اور تاریخ ایران میں پھر قومی اور پبلک کی حمایت کے اُٹھ جانے سے ساسانی بادشاہی مسلمانوں کی طاقت عدل کے سامنے جھک گئی۔ معاشرے میں جان پڑ گئی تھی وہ حکومت و نظام سے رُوگرداں تھا۔ ایران کے کمزور لوگوں کے کانوں میں سرحد کے اُس پار سے عدل کی صدا آ رہی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے اسلام کی پیش روی کے لیے زمین ہموار کی۔ ایک کمزور آسیابان کے ہاتھوں ان کا بادشاہ قتل ہو گیا اور اس طرح ساسانیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

پہلی حکومت کے سلسلے کے جو لوگ باقی بچ گئے وہ حکومت چھن جانے کے سبب اسیری میں آگئے اور انھیں مدینہ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ یہ ۳۲ ہجری کا واقعہ ہے۔ فارس کے بادشاہوں کی باقی رہ جانے والی نسلوں نے چونکہ اس زمانے کے مخصوص معاشرے کے نظام میں پرورش پائی تھی اور ان کا ذہن خاص طبقاتی معیاروں سے لبریز تھا اور اسی فکر کے ساتھ وہ خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں پہنچے۔

ان ہی لوگوں میں ساسانی بادشاہ یزدجرد کی بیٹی شہربانو بھی تھیں۔ شاید انھوں نے اپنے دربار میں بہت سے اسیر، خصوصاً روم کے اسیر دیکھے تھے۔ اسیر یعنی محکوم، جن کو موت کے گھاٹ اُتارا جائے، جنھیں ذلیل و رُسوا کیا جائے۔ فاتح طاقت کے سامنے محکوم و اسیر، انسان محسوب نہیں ہوتے ہیں، چہ جائیکہ انسانی حقوق کے مالک ہوں!!

انھوں نے اپنے والد، ساسانی بادشاہوں اور طاقتوں سے وابستہ لوگون کو دیکھا تھا وہ انسانی حقوق کے باوجود، سب کے ساتھ، رعایا اور اسیروں پر کیسے ظلم و زیادتی کرتے تھے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ حق ہمیشہ بادشاہ کا ارادہ ہوتا ہے۔

اب وہ اس مجلس میں حاضر ہیں کہ جس میں اسلام کے اہلِ منصب و جاہ جمع ہیں، جنھوں نے ایران کی شہنشاہیت اور بڑی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا ہے۔ یزدجرد کی بیٹی اپنی عقل اور اپنے نظام کے تجربے سے ہر قسم کی ذلت و اہانت یہاں تک مرنے کے لیے تیار تھیں۔

اچانک حیرت تعجب ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور انھوں نے نیا نغمہ سنا، دل نشیں

آواز تھی، جسے ساسانی نظام نے کبھی نہیں سنا تھا گویا کہ انسانوں کے ظلم وستم بلند آسمان سے کوئی فرشتہ بول رہا ہے۔

نہیں، یہ انسان کی آواز نہیں ہے، حق واَخلاق اور فضیلت وانسانیت کی آواز ہے کہ جس کا انسانوں سے بہت فاصلہ ہے۔ یہ فرشتہ کی آواز ہے۔ خدا کا کلام ہے کیونکہ حق وانصاف کی بات خدا اور فرشتوں ہی سے سنی جاسکتی ہے۔

انھوں نے جستجو کی، ان کی نگاہ نے چھوٹے کبوتر کے مانند سارے مجمع کا گشت لگایا اور اچانک ایک جگہ ٹھہر گئی کہ جہاں چہرۂ علیؑ میں حق جلوہ گر تھا۔ انھوں نے ان کی آواز سنی:

أَكْرِمُوا كَرِيمَ كُلِّ قَوْمٍ

"ہر قوم کے نجیب اور بزرگوں کا احترام کرو"۔

یہ ابھی مسلمان ہوئے ہیں اور حق کے سامنے تسلیم ہو گئے ہیں، میں اور بنی ہاشم ان سے اپنا حق اُٹھاتے ہیں۔

سب نے حضرت علی علیہ السلام کی پیروی کی۔ حضرت علیؑ کی پیشانی میں منعکس ہونے والے اَخلاقِ اسلام کی تجلی نے فارس کے ملوک کے باقی رہ جانے والوں کی اسیری سے رہائی دلائی۔

اب انھیں یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی تقدیر کے بارے میں خود فیصلہ کریں۔ شریکِ حیات کے انتخاب کا مسئلہ اُٹھا۔ ایرانی عورتیں اسلام کی ایک جھلک دیکھ کر، پہلی باتوں کو بھول گئیں اور انصاف کی شیدا اور حق وعدل کا لحاظ کرنے والوں کی شیفتہ ہو گئی۔

ان کے دل حضرت علیؑ اور آپؑ کے خاندان کی طرف جھک گئے اور شریکِ حیات کے انتخاب کے سلسلے میں شہربانو کی نگاہ حسینؑ ابن علیؑ پر مرکوز ہو گئی۔ آہ!...... کیا میں خاندانِ رسالت کی بہو بن سکتی ہوں؟ یہ جوان حضرت علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ علیہا السلام کا پسر، نواسۂ رسولؐ، حسینؑ ہے۔

امام حسین علیہ السلام سے نگاہ نہیں ہٹ رہی تھی، نگاہوں کے راستے جان و دل بھی حسینؑ پر نثار ہو گئے۔ امام حسین علیہ السلام نے بھی انھیں قبول کر لیا۔ حضرت علی علیہ السلام کے سامنے رشتہ ہو گیا۔ اس شادی کا ثمرہ حضرت امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام تھے جو کہ ۳۸ ہجری کو شہر مدینہ میں پیدا ہوئے اور بعد میں کوفہ چلے گئے۔

آپؑ نے اپنی عمر کے تقریباً سات سال اپنے دادا حضرت علی علیہ السلام کے زیر سایہ گزارے۔

اس طرح آپؑ کی شخصیت حضرت علی علیہ السلام کے تقویٰ اور محبت کے سایہ میں بنی۔ اس کے بعد صلح نامہ لکھے جانے کے بعد اپنے چچا امام حسن علیہ السلام کے ساتھ کوفہ سے مدینہ آ گئے۔ یہاں تک کہ آپؑ کے پدر بزرگوار کی امامت کا زمانہ آ گیا۔ اپنے والد کے ساتھ خون و آتش کے سفر کے لیے تیار ہوئے۔ کربلا آ گئے۔ کربلا کے سانحہ کو قریب سے دیکھا۔ چونکہ مریض تھے، جنگ ساقط تھی۔ دوسری ذمہ داری آپؑ کے دوش پر تھی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس وقت عہدۂ امامت آپ کو ملا اس وقت اسلام تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا۔ بعبارتِ دیگر یہ کہا جائے کہ آپؑ کی امامت کا آغاز خون و آتش کے درمیان سے ہوا تھا۔

یہ میدانِ کربلا ہے۔ لوگ خود کو مسلمان اور دینِ اسلام کا پیرو سمجھتے ہیں اور امام مسلمین کے مقابلے میں صف باندھے کھڑے ہیں اور ان سے جنگ کر رہے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام یزیدی فوج سے ستم شکن جنگ کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ آپؑ کے اصحاب و انصار شہید ہو چکے ہیں۔ اب آپؑ کی نوبت ہے۔ دشمن کے سامنے جا کر پر شکوہ جانبازی کا آغاز کرتا ہے۔ آپؑ امام اور حجتِ خدا ہیں۔ اس مقدس و عظیم منصب کی وجہ سے آپؑ پر بڑی ذمہ داری تھی اور امامؑ کی سب سے اہم ذمہ داری آثارِ نبوت کی حفاظت اور مذہب کے بنیادی ارکان کا تحفظ ہے۔

نبیؐ مذہب کی بنیاد رکھتا ہے اور امامؑ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی عظیم ذمہ داری کی بنا پر آپؑ میدانِ کربلا میں آئے اور جنگ و پیکار کا آغاز کیا۔ امام حسین علیہ السلام سخت ترین حالات سے دوچار تھے۔ بنی اُمیہ ابتداء ہی سے مقابلہ میں تھے۔ جس دن رسولؐ نے اپنی نجات بخش تحریک کا آغاز کیا بنی اُمیہ اسی دن سے آپؐ سے برسرِ پیکار تھے اور لحظہ بہ لحظہ رسولؐ کی آسمانی رسالت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے رہتے تھے۔ اسلام سے بنی اُمیہ کے مبارزے دو مختلف اَدوار میں تقسیم ہوتے ہیں:

پہلا دور: وہ زمانہ ہے کہ جس میں وہ کھلم کھلا رسولؐ اور مسلمانوں سے جنگ کرتے اور اس بات کی کوشش کرتے کہ غیر انسانی طریقوں اور خونریزی سے مکتبِ اسلام کو کمزور کر دیں اور اس کی بڑھتی ہوئی ترقی کو روک دیں۔

یہ دور آغازِ بعثتِ رسولؐ سے شروع ہوتا ہے اور فتح مکہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں اسلام کے خلاف چلنے والی تحریکوں کی قیادت بنی اُمیہ ہی کرتے تھے اور اسلام کو نابود کرنے کی

پوری کوشش کرتے تھے۔ ایک زمانہ تھا اصحابِ رسولؐ کو مار ڈالنے والا شکنجہ دیتے اور جلتے ہوئے تازیانے لگاتے تاکہ وہ رسولؐ اسلام کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں۔ کبھی اپنی فوج تیار کرتے اور مسلمانوں سے، بدر و اُحد اور خندق نامی جنگ لڑتے تھے۔

ان کھلم کھلا جنگوں کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ۸ ہجری میں رسولؐ اسلام بڑے لشکر کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے اور اسے فتح کرلیا۔ یہاں سے اسلام کے خلاف اُمویوں کی دوسری جنگ کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جب انھوں نے رسولؐ کی دن بدن بڑھتی ہوئی طاقت اور معاشرہ میں ندائے عدالت اسلامی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت کو مشاہدہ کیا تو انھوں نے مجبوراً جنگ کا انداز بدل دیا اور بظاہر رسولؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا۔

اُس دن اسلام کے خلاف ہونے والی جنگوں کا سربراہ اور خاندانِ بنی اُمیہ کا بزرگ ابوسفیان رسولؐ کے ہاتھوں پر اسلام لے آیا۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھ چکا تھا کہ کھلم کھلا اسلام سے جنگ نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ اس میں اپنی اور اپنے خاندان کی تباہی و نابودی بھی ہے۔ لہٰذا جنگ کا طریقہ بدل دیا اور یہ طے کیا کہ اسلام کی نقاب ڈال کر اس مقدس آئین کے خلاف جنگ لڑے گا۔

آج کے بعد سے اسلام کے خلاف اُمویوں کی سرد اور غیر مستقیم جنگ کا آغاز ہوا۔ اس خبیث خاندان نے مبارزہ کے اس دوسرے دور میں ہر موقع سے فائدہ اُٹھایا اور برابر اسلام کی بنیاد کو کھوکھلا کرتا رہا۔

بنی اُمیہ اگرچہ بظاہر اسلام کے حلقہ بگوش ہوگیا لیکن وہ صرف اسلام پر عقیدہ و ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ اس کے سخت ترین دشمن تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے اسلامی معاشروں میں اپنی حیثیت بنالیں اور اس کے بعد اسلام کی طاقت کو پاش پاش کردیں۔

کہتے ہیں کہ ابوسفیان اپنی آخری عمر میں نابینا ہوگیا تھا۔ اسی زمانے میں ایک خفیہ میٹنگ تھی۔ ابوسفیان نے یہ خیال کرکے کہ یہاں اس کے خاندان والوں کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے، کہا:
"اے خاندانِ اُمیہ! تیزی سے طاقت اپنے ہاتھوں میں لے لو اور خلافت کی گیند کو اُچک لو۔ قسم اس کی کہ جس کی ابوسفیان قسم کھاتا ہے، جنت و جہنم کوئی چیز نہیں ہے"۔

ان باتوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ بنی اُمیہ زمانہ رسولؐ ہی میں خلافت و حکومت حاصل

کرنے کے چکر میں تھے۔ وہ کسی زمانے میں مومن و معتقد نہیں تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے اور ابوسفیان کے بعد معاویہ، جو کہ بنی اُمیہ کا سردار سمجھا جاتا تھا، مرکزی حکومت کی طرف سے شام کا گورنر مقرر ہوگیا۔ اس منصب سے اس نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ آخرکار اپنی شیطانی تدبیروں کے نتیجے میں تختِ خلافت اور اسلامی معاشروں پر حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

معاویہ کے خلیفہ بن جانے سے ارکانِ اسلام لرز کر رہ گئے۔ فضیلت و تقویٰ کا محور نابود ہوگیا۔ مکتب اسلام کی بنیاد، عدالت و آزادی، ہوا و ہوس کا کھلونا بن گئی۔ اس چیز نے آہستہ آہستہ لوگوں کے مزاج پر اثر کیا اور انھیں دین و مذہب کے مرکز سے دُور ہٹا دیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے (یزید) نے تو حد ہی کردی اور اسلام سے جنگ اور مذہبی مقدسات کو نقصان پہنچانے میں وہ بے باک ہوگیا کہ اُس نے کھلم کھلا لوگوں کے سامنے کہا:

لَعِبَتْ هَاشِمُ بِالْمُلْكِ فَلَا ‌ ‌ ‌ خَبَرٌ جَاءَ وَلَا وَحْيٌ نَزَلَ

"بنی ہاشم نے حکومت سے کھیل کھلا ہے ورنہ خدا کی طرف سے کوئی خبر آئی ہے اور نہ وحی نازل ہوئی ہے"۔

اس طرح یزید مذہبی مقدسات اور خاندانِ نبوت سے سرکاری طور پر جنگ شروع کرتا ہے۔ ان کی زہریلی تبلیغات کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں میں ایمان و مذہب کا جذبہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سانحۂ کربلا اور اس کا متاثر کرنے والا منظر بجائے خود ایک دریچہ ہے کہ جس سے ہم اس زمانے کے اسلامی معاشرہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

یہ لوگوں کی ایمان کی کمزوری ہی تھی کہ یزید، نواسۂ رسولؐ امام حسین علیہ السلام سے جنگ کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور اُس نے ان ہی لوگوں میں سے ایک بڑا لشکر بنا کر امام علیہ السلام سے جنگ کے لیے بھیجا۔ ایک طرف اسلام کے خلاف بنی اُمیہ کا پروپیگنڈہ اور دوسری طرف دہشت گردی وغیرہ نے لوگوں کے ایمان و مذہب کے جذبے کو کچل دیا تھا۔

جس روز حضرت امام حسین علیہ السلام شہید ہوئے تھے پورے اسلامی معاشرے میں دو تین آدمی ہی حقیقی معنوں میں مسلمان رہ گئے تھے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اِرتَدَّ النَّاسُ بَعدَ الحُسَینِ اِلَّا ثَلَاثَۃٌ

"قتلِ حسینؑ کے بعد سب لوگ کفر کی طرف پلٹ گئے تھے، صرف تین آدمی ہی اپنے عقیدہ پر قائم اور دینِ اسلام کے وفادار تھے"۔ (بحارالانوار: ج ۴۶، ص ۱۴۴، وج ۷۴، ص ۲۲۰)

روایت ہمارے سامنے اس زمانے کے اسلامی معاشرے کی صحیح صورت پیش کرتی ہے۔ ایسے تاریک دور میں ضروری تھا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام زمامِ اُمور اپنے ہاتھوں میں لیں اور امامت کے فرضِ منصبی کے تحت اسلام کو یقینی تباہی سے بچائیں۔

اسلام اور اس کی تباہی میں صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اسلامی معاشرہ گناہوں کی تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر جاہلیت کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا۔ وہ خدا کے بجائے بت کو پوجنا چاہتا اور مسجد کو بت کدہ بنانا چاہتا تھا۔ ظلم وتعدی، عدل وانصاف پر غالب آنا چاہتا تھا۔ ہر قسم کی طاقت، اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اس سے فائدہ اُٹھا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسے خطرناک و بدترین حالات میں اسلام کی مقتدر شخصیت علیؑ بن الحسینؑ درجۂ امامت پر فائز ہوئے۔ سانحۂ عاشورہ میں اہم بات یہ تھی کہ شہادتِ حسینؑ بن علیؑ پر بات ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ ابھی ایک ایسے مقتدر انسان کی ضرورت تھی جو کہ اسلامی معاشرے میں شہادتِ عظمیٰ کے حادثے کی نشرواشاعت کرے اور مُردہ انسانوں میں ازسرِنو روح پھونکے۔ اسلام کے مرجھائے ہوئے درخت کی آبیاری کرے۔ ایسے انسان کی ضرورت تھی جو کہ تن تنہا عدل دشمن عناصر کے مقابلے میں ڈٹ جائے اور لوگوں کی فکر و روح کی زمام کو ان کے ہاتھوں سے چھڑا لے۔ ایسا انسان جو کہ اُمویوں کی سالہا سال کی تبلیغات کو ناکام بنا کر لوگوں کو دوبارہ دین کی طرف پلٹا دے۔

خدا نے یہ اہم عظیم ذمہ داری عالمِ اسلام کے مقتدر انسان حضرت امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ السلام کے دوش پر رکھی تھی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اس بات پر مامور تھے کہ امامت کے اہم فریضہ کو ان سخت حالات میں، اپنے بیٹے علی بن الحسینؑ کے سپرد کریں۔ یہ علی بن الحسینؑ ہیں جنھیں امام حسین علیہ السلام کے بعد اس انقلابی پیغام کو انجام تک پہنچانا ہے اور مذہب و ایمان کی روح کو دوبارہ لوگوں کے مُردہ دلوں میں پھونکنا ہے۔

وہ عاشور کا روز تھا، آفتاب آسمان کے وسط میں پہنچنے ہی والا تھا، خاک و خون میں آغشتہ اصحابِ حسینؑ کے پاک و پاکیزہ ابدان پر سورج کی تیز دھوپ پڑ رہی تھی۔ اب امام حسین علیہ السلام کی نوبت ہے کہ میدانِ شہادت میں مردانہ طریقے سے اُتریں اور ظالم کی فوج سے جنگ کریں۔

آپؑ میدان کی سمت جانے سے قبل حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے خیمہ میں تشریف لے جاتے ہیں تاکہ منصب امامت ان کو تفویض کریں اور انھیں آیندہ کے منصوبے سے آگاہ کریں۔

خیمہ میں کیا گزری، کیا گفتگو ہوئی؟ ہم نہیں جانتے! دو مردانِ خدا ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ ایک شہادت کی دہلیز پر اور دوسرے حیاتِ نو کی چوکھٹ پر کھڑے تھے۔ ایک عدل انصاف پر جان قربان کرنے کے لیے جا رہے ہیں، دوسرے جذر و مد سے پُر زندگی کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ ایک کی طرف سے امامت دوسرے کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ میراثِ نبوت ایک سینہ سے دوسرے سینہ میں منتقل ہوتی ہے۔

امام حسین بن علی علیہما السلام نے ضروری چیزوں کی بیٹے کے سامنے وضاحت کی اور ان کی مستقبل کی زندگی کی نقشہ کشی کی۔

اس لحظہ کے بعد حضرت امام زین العابدین علیہ السلام ایک معمولی شخصیت نہیں رہیں گے۔ لوگوں کے امام و پیشوا ہو گئے ہیں۔ اب آپؑ پر خود اپنی ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ذمہ داری ہے۔ ان کی نجات کے لیے کھڑے ہونا ہے اور موجودہ حالات کو ملحوظ رکھ کر، مناسب طریقہ اختیار کرنا ہے۔ ایسا طریقہ جو کہ امام حسین علیہ السلام کے خونی انقلاب کو کامیاب بنا سکے اور اسلام و مسلمین کو یزید لعین جیسے ظالم سے محفوظ رکھیں۔ آپؑ کو عدل و انصاف کے دشمنوں کی سالہا سال کی محنتوں پر پانی پھیرنا ہے اور دوبارہ لوگوں کے افکار کا رُخ عدل و مذہب کی طرف موڑنا ہے۔

اس اہم و عظیم مقصد تک پہنچنے کے لیے امام زین العابدین علیہ السلام کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ ظاہری و مادی تمام طاقتیں، دشمن کے اختیار میں ہیں۔ آپ اس وقت ایک اسیر انسان کی طرح خونیں دشمن کے چنگل میں ہیں۔ تمام لوگوں کے دل اُمویوں کی نفرت سے پُر ہیں۔ وہ خاندانِ نبوت اور ان لوگوں کے طرفدار ہیں جن کے دل یادِ خدا میں دھڑکتے تھے وہ بھی خاک خون میں آغشتہ ہیں۔

تمام اسلامی ممالک میں امام علیہ السلام کے طرفداروں کی تعداد انگشت شمار ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ بڑے محدثین میں سے ایک بڑے محدث، فضل بن شاذان کہتے ہیں:

وَلَم یَکُ فِی زَمَنِ عَلِیِّ بنِ الحُسَینِ فِی اَوَّلِ اَمرِهٖ اِلَّا خَمسَةُ نَفَرٍ

"تمام اسلامی معاشروں میں صرف پانچ اشخاص تھے جو آپؑ سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتے تھے"۔

ایسے ناسازگار حالات میں امام زین العابدین علیہ السلام کو ایک تابناک و درخشاں مستقبل کی طرف اپنا راستہ بنانا ہے اور اُمویوں کے پیدا کردہ بھیانک طوقوں میں گھری ہوئی اسلام کی کشتی کو نجات دلانا ہے۔ آپؑ کربلا سے کوفہ جاتے ہیں، تاکہ اسیری و قیدی کے لباس میں حادثۂ عاشورہ کو وجود میں لانے والوں کے خلاف اپنی تبلیغات کا آغاز کریں۔

آپؑ کے ذمہ دو عظیم فریضے تھے:

① لوگوں کو اُمویوں کے تسلط سے نجات دلائیں، لوگوں کی فکر کو عدل کے دشمنوں کے قبضۂ قدرت سے چھڑائیں اور اُمویوں کی پروپیگنڈہ کی مشینری کو بیکار بنا دیں، جب لوگ فکری لحاظ سے آزاد ہو جائیں گے، اس وقت امامؑ مناسب ماحول میں فضائل و اقدار کی پرورش کر سکیں گے اور دوبارہ ایمان و مذہب کی روح اور خدا پر توجہ کو مسلمانوں میں زندہ کر سکیں گے۔

بنابرایں، امام علیہ السلام کی زندگی دو مختلف اَدوار میں تقسیم ہوتی ہے۔ پہلے دور میں امام علیہ السلام کی یہ کوشش تھی کہ جہاں تک ہو سکے اُمویوں کے پلید باطن کو لوگوں کے سامنے آشکار کریں اور ان کی توجہ کو اس ظالم خاندان سے منحرف کریں۔ اسلامی معاشرہ میں آزادئ فکر ہونی چاہیے۔ لوگوں کی روح یزید کی دہشت گرد و ظالم حکومت سے نجات پائے۔ اس مقصد میں کامیابی کے بعد امام علیہ السلام اپنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کر سکتے ہیں اور لوگوں کی روح میں خدا پر توجہ اور فضیلت کو زندہ کر سکتے ہیں۔ اسلامی معارف کو وسعت دے کر لوگوں کے دلوں کو دوبارہ دین و مذہب کی طرف پلٹا سکتے ہیں۔ صحیفۂ سجادیہ، جو کہ اسلامی علوم و معارف کا خزانہ ہے، امام علیہ السلام کی زندگی کے دوسرے دور کا ماحصل ہے۔

اُمویوں کے تسلط سے امام علیہ السلام لوگوں کی روح کو آزاد کرانے کے بعد ان کے افکار کی پرورش کی طرف متوجہ ہوئے اور دعاؤں کے پیرایوں میں بہترین طریقہ انھیں یادِ خدا اور

عبادت و بندگی کی طرف متوجہ کیا۔ صحیفۂ سجادیہ، جو کہ زبورِ آلِ محمدؐ کے نام سے مشہور ہے، قرآن اور نہج البلاغہ کے بعد اوّل درجہ کی کتاب ہے۔

بہرصورت حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے لوگوں کو بیدار کرنے اور اُمویوں کے طریقے کی مذمت کرنے والے کام آپؑ نے اپنی امامت کے ابتدائی زمانے ہی میں شروع کر دیا۔ بظاہر آپؑ خونی دشمن کے چنگل میں اسیر ہیں لیکن آپؑ ایسی طاقت کے مالک ہیں کہ اسی اسیری کی حالت میں، اُمویوں کے گڑھ میں ان کے خلاف اپنی موثر تبلیغات کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔

حادثۂ عاشورہ کو دو دن سے زیادہ نہیں گزرتے تھے کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے شہر کوفہ میں لوگوں کے سامنے اپنا انقلابی خطبہ دیا اور لوگوں کے سامنے یہ ثابت کیا کہ بنی اُمیہ کی روش غیر قانونی ہے۔ مذہب کے اُصول و قواعد کے سراسر خلاف ہے۔ لوگوں کو جاننا چاہیے کہ اُموی مذہب سے قطع نظر، غیر انسانی اعمال کے ارتکاب سے بھی پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ سانحہ کربلا ان کے غیر انسانی اعمال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سانحہ عاشورہ کو بنی اُمیہ اپنی بہت بڑی کامیابی خیال کرتے ہیں جس وقت اس منحوس دن کی شام ہوئی اور کربلا کے شیر حسینؑ بن علیؑ شہید ہو گئے، تو اس پر سب نے بنی اُمیہ کو مبارک باد دی۔ اُمویوں کا سیاستمدار، ابنِ زیاد اس کامیابی کے نشے میں چور اور مسرت و سُرور میں غرق تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میں نے اپنے مسلسل منصوبوں سے کس طرح اس مشکل کو حل کر دیا ہے اور حکومت یزید سے ٹکرانے والی اس طاقت کا قلع قمع کر دیا ہے کہ غیر قابلِ تزلزل صورت میں سامنے آسکتی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا اور اس کا امیر یزید، اس غیر متوقع کامیابی سے بھی سخت خطرناک رقیب کے راہ سے ہٹ جانے سے، حیرت و مسرت محسوس کر رہا تھا۔ مختصر یہ کہ بنی اُمیہ یہ سوچ رہے تھے کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے اور مسئلہ حسینؑ کو حل شدہ سمجھ رہے تھے۔ کیونکہ نواسۂ رسولؐ کو قتل کرنے کے سلسلے میں انھوں نے فوجی و سیاسی تمام پیش بندیاں کر لی تھیں اور کسی بھی پیش آنے والے خطرے کا پہلے ہی سدباب کر دیا تھا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ حسینؑ عراق کی سمت بڑھ رہے ہیں تو انھوں نے یہ سوچا کہ خاندانِ رسولؐ سے عقیدت و محبت رکھنے والے چپے چپے سے آکر امام حسین علیہ السلام سے ملحق ہوں گے جس سے ان کی ایک عظیم فوج بن جائے گی۔

ابنِ زیاد نے ایسے تمام راستوں پر سخت پہرے بٹھا دیے جن سے امام حسین علیہ السلام تک پہنچا جاسکتا تھا۔ ہر قسم کی آمد و رفت پر نظر رکھی گئی اور امام علیہ السلام تک پہنچنے والی ہر قسم کی مدد کے راستے بند کر دیے۔ اس قسم کی تمام پیش بندیوں سے ایک یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اس خبر کے عام ہونے کو روکا جائے کہ امام حسین علیہ السلام عراق کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے امام علیہ السلام سے عقیدت رکھنے والوں تک یہ ہیجان آور خبر نہیں پہنچنے دی۔

ابنِ زیاد نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ میدانِ جنگ کی طرف اتنی فوج بھیجی کہ اگر کوئی شخص محاصرے کو توڑ کر امام حسین علیہ السلام تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو بھی اس کی جنگی سپاہ اپنی کامیابی کو نہ گنوا سکے۔

جس اہم اور بڑے خطرے کی پیشین گوئی کی جاسکتی تھی وہ یہ تھا کہ امام حسین علیہ السلام کے شہید ہو جانے کے بعد اسلامی معاشروں میں جوش اُٹھے گا اور وہ فرزندِ رسولؐ کے خون کا انتقام لینے کے لیے شورش و انقلاب بپا کریں گے اور ایسے عام شورش کو آسانی سے نہیں کچلا جاسکتا ہے۔ اور یہ خطرہ ایسا ہی تھا کہ جس کے پیش آنے کے احتمالات بہت زیادہ تھے۔ اس کے سدباب کے لیے پیش بندیاں کرنا بہت ضروری تھا۔ بنی اُمیہ کے سیاستمدار ابنِ زیاد، جو ہر قسم کی فضیلت و شرف سے تہی دامن اور خبیث انسان تھا۔ اس نے اس خطرے سے نمٹنے کے لیے ایک عجیب منصوبہ بنایا تھا۔ ایسا منصوبہ کہ جس کو اس زمانے کا بدترین سیاسی منصوبہ کہا جاسکتا ہے۔

اس نے اس لیے کہ شہادتِ حسینؑ اور کربلا میں انجام پانے والی غیر انسانی حرکتوں سے لوگوں کا غم و غصہ نہ بھڑکے اور انقلاب و شورش کی آگ شعلہ ور نہ ہو، اور اپنے بُرے عمل کو قانونی رنگ دینے کے لیے یہ طے کیا کہ امام حسین علیہ السلام سے کی جانے والی جنگ کو شرعی اور قانونی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ اس طرح ریاکاری اور لوگوں کی نظروں میں جو قانون کا احترام ہے اس سے غلط فائدہ اُٹھا کر ان کے ہر قسم کے غم و غصہ کو بھڑکنے سے روکا جاسکتا ہے۔

اب ہم ابنِ زیاد کے بدترین منصوبے کی تحقیق و تجزیہ کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہم اس شق کی طرف اشارہ کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ جس کو اسلام کے مقننن نے پیش کیا ہے۔ اسلام میں قانون یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص امامِ وقت کے مقابلے میں آئے، انقلاب بپا کرے اور امام علیہ السلام پر خروج کرے تو حکومت کو حق ہے کہ وہ انقلاب کو کچل دے اور شورش کرنے والے کو کیفر کردار تک

پہنچائے۔ یزید کی تبلیغاتی مشینری حرکت میں آگئی۔ کوفہ، شام، بصرہ اور رفتہ رفتہ تمام اسلامی مراکز میں یہ بات شائع کر دی کہ ایک شخص نے حکومت کے خلاف خروج کیا ہے۔ مجبوراً حکومت قانون کی رُو سے اس سے نمٹنے کے لیے فوجیں جمع کر رہی ہے۔ تبلیغاتی مشینری ایک طرف یزید کو مفترض الطاعۃ امام اور دوسری طرف امام حسین علیہ السلام کو خروج کرنے والا ثابت کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ امام حسینؑ کا نام تک بھی لیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ پوری کوشش کرتے تھے کہ کہیں بھی حسینؑ کا نام زبان پر نہ آئے کیونکہ نامِ حسینؑ کے ذکر ہی سے ساری حقیقت روشن ہو جائے گی اور سارا مکر و فریب آشکار ہو جائے گا۔

اُمویوں کے ناپاک منہ سے صرف یہ بات سنی جاتی تھی کہ کربلا میں ایک شخص نے حکومتِ وقت کے خلاف شورش کی ہے۔ ناچار حکومت اس سے جنگ کرے گی۔ درہم و دینار کے غلام اُمویوں کے گماشتوں نے ان چند دنوں میں اچھے طریقے سے اپنا کردار ادا کیا اور اپنے زعم میں انھوں نے اس زہریلی تبلیغ کے ذریعے امام حسین علیہ السلام سے جنگ کے لیے زمین ہموار کر لی اور لوگوں کے ذہنوں کو کافی حد تک اس کے لیے تیار کر لیا۔ تبلیغات کے ذریعے ہمیشہ معاشروں کے افکار کے دھارے کو موڑا جاتا ہے۔ چنانچہ بنی اُمیہ بھی اس موثر و عظیم طاقت سے غافل نہیں تھے۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر وہ اپنی خیانت کاری پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ امام حسین علیہ السلام کو انھوں نے ایک خارجی کے نام سے مشہور کیا اور یوں باور کرایا کہ ایک خارجی اسلام کے لیے بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ حکومت فوجی طاقت کے ساتھ اس سے نمٹے گی۔ فریب کھانے والوں نے فریب کھایا اور ایک جماعت ان کی رُسوا کن تبلیغات کے دامِ فریب میں نہیں آسکی۔ وہ اندرونِ خانہ جو بات تھی اس سے واقف تھے لیکن انھیں سبز باغ دکھا کر خاموش کر دیا گیا۔

ابن سعد، جو ایک نمازی تھا اور لوگوں کے درمیان اس کی ایک حیثیت تھی وہ گورنری کے وعدے پر تسلیم ہو گیا اور کربلا کی جنگی سپاہ کا اس کو سپہ سالار بنا دیا گیا۔ کچھ لوگوں کو دہشت اور دھمکی سے خاموش کیا گیا۔ اس طرح تاریخ کی عظیم مصیبت کو میدانِ کربلا میں وجود میں لایا گیا اور روزِ عاشورہ آفتاب غروب ہونے سے قبل امام حسینؑ کو ان حالات میں شہید کر دیا گیا جنھیں ہم سب جانتے ہیں۔

انھوں نے ان تمام اُصول و قواعد کی رعایت کی تھی کہ جو امام حسین علیہ السلام جیسی شخصیت کے قتل کے لیے درکار تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح امام حسینؑ کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ لیکن کرتک

دار آواز گونجی، جس سے کوفہ کے در و دیوار لرز اُٹھے۔ یہ آواز خطرے کی گھنٹی تھی، جس سے بنی اُمیہ کی حکومت خوف و وحشت میں مبتلا ہو گئی۔ ابنِ زیاد کی یہ کوشش تھی کہ کربلا کے بعد کوئی بھی امام حسینؓ کا نام نہ لے سکے اور لوگوں کے کان اس نام سے آشنا نہ ہو سکیں۔ کوشش یہ تھی کہ شیرِ کربلا کی با افتخار شخصیت و حقیقت سے کوئی واقف نہ ہو سکے۔ حقیقت پردے ہی میں رہے۔ یہ تھا سانحۂ کربلا کے بعد اُموی حکومت کا پروگرام۔ لیکن علی بن الحسین امام زین العابدین علیہ السلام جیسے ہی ان کے اس منصوبے سے آگاہ ہوئے اور ان کی گمراہ کن تبلیغات کی خبر ملی تو آپؓ نے ایسا قدم اُٹھایا جو آپؓ کی شایانِ شان تھا۔ اس شیرِ اسلام نے اس جرأت کے ساتھ فعالیت کی کہ دشمن کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔

آپؓ کا فریضہ تھا کہ لوگوں کو بیدار کریں اور انھیں حیرت و سرگردانی سے نجات دلائیں۔ آپؓ کے لیے ضروری تھا کہ بنی اُمیہ کی زہریلی تبلیغات کو ناکام بنا کر لوگوں کو حقائق سے آگاہ کرتے۔ تبلیغات کی لہروں نے لوگوں کو بے حس بنا دیا تھا۔ حقیقت پر سیاہ پردہ پڑ گیا تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے اہلِ بیتؓ کا قافلہ قیدیوں کی صورت میں کوفہ میں داخل ہوا۔ لوگ جشن و مسرت میں غرق تھے۔ لوگ چونکہ ان قافلہ والوں کو ایک خارجی سے وابستہ سمجھتے تھے اس لیے تالیاں بجا کر ان کا استقبال کر رہے تھے۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے خود کو ایسی غفلت میں پڑی ہوئی قوم کے سامنے دیکھا۔ حکومتِ وقت کا خیال تھا کہ کربلا کے جاں گداز حادثہ نے علی بن الحسینؓ کو بہت زیادہ پژمردہ و غم زدہ کر دیا ہے۔ ماجرائے کربلا نے امام زین العابدین علیہ السلام کو کافی مضمحل و مرعوب کیا تھا۔ لیکن جب امام علیہ السلام نے غافل لوگوں کا جمِ غفیر اپنے سامنے دیکھا تو آپؓ کو اپنا اہم فریضہ اور اپنے والد امام حسین علیہ السلام کا انقلابی پیغام یاد آ گیا۔ ان چیزوں کے مقابلہ میں بنی اُمیہ کی حکومت آپؓ کی نظروں میں سبک و پوچ ثابت ہوئی۔ وہ امام حسینؓ کے فرزند ہیں۔ آپؓ کی ہمت و عزم کا سرچشمہ خاندانِ نبوت و امامت کی لازوال قدرت و طاقت ہے۔ فریضہ کی ادائیگی کا اتنا شدید احساس ہوا کہ جان کی بھی پروا نہ کی۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنے پہلے فریضہ کو ادا کرنے کے لیے لب کشائی کی اور سانحۂ کربلا کے بعد پہلی بار بنی اُمیہ کے فرسودہ اور ناتواں پیکر پر مہلک حملہ کیا۔ اُمویوں نے انھیں

خارجی مشہور کر رکھا تھا اور اپنے زعم میں انھوں نے اس حادثہ کو قانونی رنگ میں رنگ دیا تھا۔
امام زین العابدین علیہ السلام کے لیے ضروری تھا کہ ریاکاری کے اس پردہ کو چاک کریں اور اپنا اور اپنے خاندان کا لوگوں سے تعارف کرائیں۔

آپؑ نے پہلے خدا کی حمد وثنا کی، پھر محمدؐ وآلِ محمدؐ پر صلوات بھیجی۔ جو لوگ غرور میں مست تھے۔ بے خبر انسان، ان قافلہ والوں کو غیر مسلم خاندان سے وابستہ سمجھے ہوئے تھے۔ تعجب وحیرت سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انھوں نے دیکھا: اُونٹ پر سوار ایک جوان ہے جو حیرت انگیز جرأت کے ساتھ خدا اور رسولؐ کا نام لے رہا ہے، خدا کی حمد کر رہا ہے اور اس کے رسول، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیج رہا ہے۔

عجیب! اُونٹوں پر سوار یہ لوگ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو عظمت و بزرگی کے ساتھ خدا کو یاد کر رہے ہیں؟ یہ خدا اور اس کے رسولؐ سے کہاں سے آشنا ہوئے ہیں؟ مجمع حیرت کے ساتھ خاموشی میں ڈوب گیا۔ سب ہی چاہتے تھے کہ یہ شجاع جوان اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھے اور خود کو اور اپنے خاندان کو پہچنوائے۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے جب دیکھا کہ مجمع خاموش اور تقریر سننے کے لیے تیار ہے تو آپؑ نے دوبارہ تقریر کا سلسلہ شروع کیا اور فرمایا: جو مجھے نہیں جانتے ہیں وہ جان لیں کہ میں علی بن الحسینؑ ہوں! میں علیؑ کا پوتا ہوں!

انھی دو جملوں نے کافی حد تک مجمع کو منقلب کر دیا۔ لوگ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ اور آپؑ کے فرزند امام حسینؑ سے اچھی طرح واقف تھے۔ علیؑ کی عادلانہ حکومت کا پرتو کہ جس کا مرکز یہی کوفہ تھا، ان کے ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا۔ لوگ حضرت علی علیہ السلام اور ان کے خاندان کو تقویٰ و فضیلت کے ساتھ پہچانتے تھے، آپؑ کی امامت و پیشوائی کا عقیدہ رکھتے تھے۔

اُونٹ پر سوار جوان کیا کہتا ہے؟ وہ اپنا تعارف اس طرح کراتا ہے کہ میں حسینؑ کا بیٹا اور علیؑ کا پوتا ہوں۔ آہ! ہم کتنے بُرے لوگ ہیں! ہم کتنے عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ (مجمع سوچنے لگا)۔ کیا یہ قافلہ خاندانِ نبوت و امامت سے تعلق رکھتا ہے؟ کیا ہم نے اس بے حیائی سے ان کا استقبال کیا ہے؟ مجمع کا سکوت ٹوٹ گیا۔ نالہ اور شیون کی آواز بلند ہوگئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل جاری ہو گیا کیونکہ لوگوں کے جذبات بھڑک اُٹھے تھے۔

وہ سب یا ان میں سے زیادہ تر بنی اُمیہ کی گمراہ کن حبلیغات کے سبب یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ ایک خارجی کے قافلہ کے استقبال کے لیے جارہے ہیں۔ اس کاررواں کو دیکھنے جو خدا کی معرفت رکھتا ہے، نہ اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہے۔ اب تو خود کو ایک بڑی مشکل میں پھنسا ہوا پا رہے ہیں۔ گناہِ عظیم سے ان کا دامن داغدار ہو گیا ہے۔ بنی اُمیہ کے کارندوں کی ریا و فریب کا پردہ چاک ہو گیا ہے۔ لوگوں پر حقیقت عیاں ہو گئی ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ قافلہ حسینؓ بن علیؓ سے تعلق رکھتا ہے۔

لیکن امام زین العابدین علیہ السلام نے اسی پر اکتفا نہیں کی۔ اس موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا اور لوگوں کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ برانگیختہ کرنا چاہتے تھے۔ آپؒ نے اس طرح اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا:

> ”میں اس کا بیٹا ہوں جسے فرات کے کنارے ذبح کیا گیا، جس کی ہتک عزت کی گئی، جس کا مال لوٹا گیا، جس کے اہلِ بیتؑ کو اسیر کیا گیا“۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے دہن سے جو جملہ بھی نکلتا تھا وہ بارود کے ڈھیر میں آگ کی چنگاری کا کام کرتا تھا...... کوفہ لرز اُٹھا...... ہر طرف سے انقلاب کی آواز بلند ہونے لگی۔ بنی اُمیہ کی مضبوط حکومت تباہی و سرنگونی کے دہانے پر پہنچ گئی۔

لوگوں کو بیدار کرنے کے سلسلہ میں امام زین العابدین علیہ السلام ہر موقع سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور معاشرے کے فکری سمندر میں مدوجزر پیدا کر کے سیاست کا رُخ موڑ دیا۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی تبلیغ سے لوگوں کے فکر و خیال کو روشن کر دیا اور ان کی گردن سے یزید کی غلامی کا طوق نکال کر پھینک دیا اور ان کے لیے بہترین طریقہ سے فکری آزادی فراہم کر دی۔

اسی فکری آزادی کے نتیجے میں اچانک بنی اُمیہ کے خلاف، انقلاب کے شعلے بھڑک اُٹھے جس سے ان کی حکومت کے ارکان میں زلزلہ آ گیا اور انھیں فنا و بدنام کر دیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ امام فکری حریت و آزادی سے فائدہ اُٹھا کر اپنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کرنے میں کامیاب ہو گئے اور دوبارہ لوگوں کو اسلام کے احکام و دستور کی طرف پلٹا دیا اور ایک بار پھر اسلامی معاشروں میں فضیلت، شرف اور انسانیت کو زندہ کر دیا۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام
کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کی نقشہ کشی کرنا بہت دشوار کام ہے کیونکہ امامؑ بلندی کے اس نقطہ پر فائز ہوتا ہے کہ کما حقہ اسے دیکھا جاسکتا ہے اور نہ پہچنوایا جاسکتا ہے۔ مورخین نے صرف ان کے پرتو دیکھا ہے اور اسی کی نقشہ کشی کی ہے۔

لکھتے ہیں: امام علیہ السلام نے پہلی رجب بروز جمعہ ۵۷ ہجری کو شہر مدینہ میں ولادت پائی۔ آپؑ کی والدہ فاطمہؑ بنت حسنؑ ہیں۔ ولادت کے تھوڑی دیر بعد سنتِ اسلامی کے مطابق آپؑ کے والد امام زین العابدین علیہ السلام نے آپؑ کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اس طرح آپؑ کی پُرافتخار زندگی کا خدا کے نام سے آغاز ہوا۔ یہ وہی مقدس نام ہے جو امامؑ کی پوری زندگی کو اپنے زیر سایہ رکھتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ۶۱ ہجری میں رُونما ہونے والے حادثۂ عاشورہ میں چار سال کے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ۳۸ سال کی عمر میں مسندِ امامت پر متمکن ہوئے اور تعلیم میں مشغول ہوئے۔ اس تعلیم نے اتنی وسعت پائی کہ محمد بن مسلم کہتے ہیں: "میں نے تیس ہزار حدیثوں کے بارے میں آپؑ سے سوال کیا اور جواب پائے"۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام دیگر ائمہ کے مانند علم و تقویٰ کے کمال پر فائز تھے۔ علمی دنیا میں امام علیہ السلام اتنی شہرت پا چکے تھے کہ لوگوں نے آپؑ کو "باقر العلوم" کا لقب دیا تھا۔ جس کے معنی علم کی تہہ تک پہنچنے والے کے ہیں۔ امام علیہ السلام نے اسلامی علوم و معارف کی نشر و اشاعت میں خاص حالات سے فائدہ اُٹھایا۔ امام علیہ السلام کی آخری عمر میں دو طاقتیں، بنی اُمیہ و بنی عباسیہ، ایک دوسرے کی جان کی فکر میں تھے۔ ان دونوں طاقتوں کی سیاسی رسّہ کشی کی وجہ سے امامؑ محفوظ و آزاد رہے۔ امامؑ نے اس نسبی آزادی سے، جو کہ سیاسی طاقتوں کے تضاد سے حاصل ہوئی تھی، خوب فائدہ اُٹھایا اور علوم کی نشر و اشاعت کو وسعت دینے میں مشغول ہوئے۔

مورخین نے لکھا ہے کہ جن اصحاب نے آپؑ سے تعلیم حاصل کی ہے ان میں سے تقریباً پانچ سو علم کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوئے ہیں اور امامؑ کے ان ہی شاگردوں نے، فقہ و حدیث اور تفسیر میں کتابیں تصنیف و تالیف کر کے اسلام کے علمی کتب میں چار چاند لگائے ہیں۔

زرارہ، ابوبصیر اسدی، حمران بن اعین، محمد بن مسلم، محمد بن مروان، اسماعیل بن فضل ہاشمی وغیرہ ان نمایاں اشخاص میں سے ہیں جنھوں نے امام علیہ السلام سے تعلیم حاصل کی اور علمی دنیا میں عالمی شہرت پائی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام وہ دین ہے جس کا زندگی کے ساتھ امتزاج ہے۔ وہ اس سے جدا نہیں ہے، اسلام کا مقصد اُمت کی زندگی کو حقیقتوں کی بنیاد پر چلانا ہے، اور اُمت کو ایک حقوقی مکتب کے بغیر چلانا ممکن نہیں ہے۔ ایسے حقوق ہوں جو انسانوں کی زندگی کے تمام زاویوں پر مشتمل ہوں۔ اسی لیے اسلام نے عالمانہ حقیقت کے ساتھ حق کو اپنا مکمل محور قرار دیا ہے، لیکن اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے حق کا دامن بہت وسیع ہے۔ غیر مذہبی مکاتب میں حق محدود ہے اور وہ صرف انسان کی زندگی کے پہلو کو شامل ہے۔ ان حقوق میں روحِ انسان کے بہت سے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

مخلوق پر خدا کا حق اور نتیجہ میں خدا کے حضور مخلوق کا فریضہ اَخلاقی حقوق جو کہ بجائے خود ایک عظیم فصل ہے اور قانونی حقوق سے جدا ہے ــــ ایسے مسائل ہیں جن کو غیر مذہبی مکاتب بیان نہیں کرتے ہیں لیکن اسلام میں حق کے بہت وسیع مراد لیے گئے ہیں یہاں تک کہ وہ اعتقادی، عبادی اور اَخلاقی مسائل کو بھی شامل ہے۔ رسولؐ نے اس مکتب کی بنیاد رکھی ہے اور یہ ائمہ دین اور آپؐ کے جانشینوں کا فریضہ ہے کہ موجودہ زمانے کے امکانات کے تحت اس درخت کو بارآور بنائیں اور ان اُصولوں کی وضاحت کریں۔ اس کے لیے مخصوص حالات درکار تھے۔ ان میں اوّلین و بنیادی چیز آزادی تھی۔ عالمی فعالیت میں ائمہ دین کی آزادی، یہ آزادی کسی حد تک امام محمد باقر علیہ السلام کی آخری عمر میں حاصل ہو گئی تھی کیونکہ آپؐ کے زمانے میں بنی اُمیہ ہمیشہ دین کے سدِّ راہ رہے تھے اور جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا انھیں محدود رکھتے تھے لیکن اب ان کا مقابلہ عباسیوں سے تھا۔

چونکہ بنی عباس نئی تحریک کے علم بردار تھے، اس لیے ہر لحاظ سے بنی اُمیہ پر سختی کرتے تھے۔ نتیجہ میں بنی اُمیہ نے بھی خاندانِ علوی اور ائمہ دین سے چشم پوشی کر لی اور پوری توجہ بنی عباس پر مرکوز کر دی۔ اس طرح آزادی حاصل ہوئی اور امام محمد باقر علیہ السلام نے اس موقع سے استفادہ کیا۔ اسلامی معارف کی نشر اور شیعہ حقوقی مکتب کے اُصول کی توسیع میں مشغول ہوئے اور اپنے علم

وحکمت سے، کہ جس کا سلسلہ وحی سے تھا۔ لوگوں کے مُردہ دلوں کو زندہ کیا۔

آپؑ کا علمی مرتبہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ کہا گیا ہے: ہر عالم و دانشور خود کو آپؑ کے سامنے حقیر و کم تر سمجھتا تھا۔ تاریخ کہتی ہے: اس زمانے میں مستقل عصر کے وقت شہر مکہ میں، مسجد الحرام میں بہت زیادہ جوش و ہمہمہ دکھائی دیتا تھا۔

اس روز بھی لوگ حسب عادت دستہ دستہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے اور پھر خانۂ خدا کے طواف کے بعد، بہت سارے لوگ جم غفیر کی صورت میں کعبہ و حجر اسود کے درمیان جمع ہوئے۔ دیگر لوگ ان کے پاس آکر بیٹھنے لگے۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا تھا، جس سے بہت زیادہ علمی استفادہ کرتے تھے۔ لوگ ان کی عظمت و علمی وقار کی وجہ سے ان سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ حرمت و پاکیزگی ہالہ کی صورت میں آپؑ کا احاطہ کیے رہتی تھی، جس سے آپؑ ممتاز نظر آتے تھے۔ علم و دانش کے شیفتہ لوگوں میں سے ہر ایک سوال کرتا تھا اور ہر ایک کی دلی تمنا ہوتی کہ جتنی جلد ہو سکے آپؑ کی لامحدود علمی قدرت و استطاعت سے اپنی مشکل کو حل کرے۔ چوٹی کے دماغ مشغول تھے۔ ایک سے ایک مشکل سوال، پیچیدہ ترین مذہبی مسائل، علمی دقائق یکے بعد دیگرے آپؑ کے پیش ہونے لگے۔ آپؑ بھی ہر ایک کو اطمینان بخش جواب دیتے۔ جواب ہر ایک کو ایسے فرحت بخشا جیسے پیاسے کو پانی نشاط عطا کرتا ہے۔

حبابہ کہتے ہیں: اس دن میں نے دیکھا کہ آپؑ نے اسی مختصر وقت میں ہزار علمی و مذہبی سوالات کے جواب دیئے۔ اس کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھے تا کہ بیت الشرف تشریف لے جائیں۔ اسی اثناء میں اس مجمع میں سے، کہ جو اپنے غیر معمولی علمی نشاط کا احساس کر رہا تھا، ایک آدمی اُٹھا۔ بہ آواز بلند کہا: یہ ہے وہ درخشاں و روشن نُور کہ جس نے بشریت کے تاریک شبستان کو روشنی عطا کی ہے اور یہ ہے وہ عطر آگیں نسیم کہ جس نے انسانیت کے مشام کو معطر کر دیا ہے۔ یہ ہے وہ ناشناختہ حق کہ دنیا نے جس کی قدر نہیں کی۔

لوگوں نے پوچھا: وہ کون ہے؟

اس نے جواب دیا: وہ ہیں باقر العلوم محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام۔

جی ہاں! وہ تھے علم کی تہہ تک پہنچنے والے شیعوں کے پانچویں امام محمد باقر علیہ السلام، اور آپ کو باقر کا بافتخار لقب رسولؐ نے عطا کیا تھا۔ بہت پہلے رسولؐ نے آپؑ کے بارے میں فرمایا تھا:

یَبقَرُ العِلمَ بَقرًا (بحار الانوار: ج ۳۶، ص ۳۱۳ و ص ۳۸۶)

یہ تاجِ افتخار صرف امام محمد باقر علیہ السلام کو نصیب ہوا اگرچہ دیگر ائمہ تمام بلند فضائل، لامحدود علم، بے حد سخاوت، حیرت انگیز شجاعت اور خلق عظیم کے مالک تھے۔ مختصر طور پر یہ کہا جائے کہ انسانیت کے جتنے بھی بلند فضائل ہو سکتے تھے وہ سب ان میں جمع تھے لیکن ان کو ظاہر کرنے کے لیے تمام کے لیے ماحول و معاشرہ کے حالات یکساں نہیں تھے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مقصودہ زمانے کے حالات اور بنی اُمیہ و بنی عباس کے ٹکراؤ کی وجہ سے امام محمد باقر علیہ السلام سے پابندیاں اُٹھ گئی تھیں۔ چنانچہ ۱۹ سال اور چند ماہ کی مدت میں آپؑ اپنی امامت کے زمانے میں اسلامی حقوق و فقہ کو وسعت دینے اور شیعوں کی علمی کتب کو اپنے محکم و مستدل بیانات سے مالامال کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

امام محمد باقر علیہ السلام مذہبی مفاہیم سے لوگوں کے دماغ کو روشن کرنے کو بہت اہمیت دیتے تھے، یہاں تک کہ عملی طور پر بھی اسی چیز کو پیش کرتے تھے۔ آپؑ کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ گرمی کے زمانہ میں ایک روز آپؑ اپنے ملازمین کے ساتھ شہر سے نکل کر اپنے مزرعہ کی طرف جا رہے تھے۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ امامؑ پسینہ سے شرابور اور تھکے ماندے، راستہ طے کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک مسلمان نے آپؑ سے ملاقات کی۔ یہ حال دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا۔ اس نے سوچا کہ امامؑ اس شدید گرمی میں آج اپنے مزرعہ کے کام سے شہر سے کیوں باہر نکلے ہیں؟

اس نے چاہا کہ اس سلسلہ میں امام علیہ السلام سے استفسار کرے، آگے بڑھا، سلام کیا اور عرض کیا: آپؑ بزرگانِ قریش میں سے ہیں۔ دنیوی کاموں کے سلسلہ میں اس گرمی میں آپؑ کیوں گھر سے باہر تشریف لائے ہیں۔ اگر اس وقت آپؑ کو موت آجائے تو بتائیے آپؑ خدا کو کیا جواب دیں گے؟

یہ شخص کہتا ہے کہ جیسے ہی مَیں نے امام علیہ السلام سے یہ جملہ عرض کیا ویسے ہی آپؑ اپنے ملازمین سے الگ ہوئے اور میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اگر اس حال میں مجھے موت آئے تو مَیں بہترین وقت میں اس سے ملاقات کروں گا۔ خدا کی اطاعت و بندگی کی حالت میں، اس شدید گرمی میں، مَیں نے اپنے آرام کو چھوڑا اور کام کے لیے نکلا ہوں۔ میں اس لیے نکلا ہوں تاکہ پسینہ اور زحمت کے ساتھ اپنی مالی حیثیت صحیح کروں اور ایک انسان کے لیے یہ بہترین حالت ہے۔

خوف و ہراس کا مقام وہ ہے کہ جہاں انسان کے سامنے موت آئے اور وہ معصیت خدا کی حالت میں ہو اور کاہلی و سُستی کے ساتھ دوسروں کی محنت کا کھاتا ہو۔

یہ شخص یہ سمجھتا تھا کہ فضیلت و دین داری کے یہ معنی ہیں کہ اپنی کمائی اور پیداوار سے دست کش ہو جائے، کام کی پروا نہ کرے۔ چنانچہ جب امام علیہ السلام نے اس فکری انحراف کو اس کے اندر دیکھا تو اسے نصیحت کی اور اس سلسلہ میں اس کے سامنے اسلام کا نظریہ پیش کیا۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے، جیسا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کے بیان سے عیاں ہے، ایک فعال و متحرک مسلم معاشرہ اقتصادی زندگی کی راہ میں ترقی کرتا ہے اور ایسا معاشرہ ہے جو عبادت کی حالت میں ہے اور جو معاشرہ پیداوار و کمال سے دست کش ہو جاتا ہے اور دوسروں کی کوششوں اور محنتوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ایسا معاشرہ معصیت کار ہے اور خدا کی معصیت میں ہے۔

امام علیہ السلام کی علمی میراث میں بہت سی احادیث ہیں جن سے اسلامی کتب بھری پڑی ہیں۔ آپؑ کے چند نصیحت آمیز کلمات ملاحظہ فرمائیں:

1. دینی علوم کی تحقیق۔
2. حوادث و مصائب میں ثابت قدمی۔
3. زندگی کی معیشت کا نظم و نسق اور اقتصادی جہات کی تخمینہ گیری۔
4. جس عالم کے علم سے لوگ فائدہ حاصل کرتے ہیں وہ ستر ہزار متقی و عابدوں سے افضل ہے۔
5. افسردگی اور بے قراری سے بچو کیونکہ مایوس انسان حق نہیں ادا کرتا اور بے قرار انسان کا صابر پر کوئی حق نہیں ہے۔
6. مجلس میں اس جگہ بیٹھو جو تمھاری شان سے کم ہو۔
7. سب کو سلام کرو۔
8. کسی سے مجادلہ نہ کرو اگرچہ تم حق پر ہی کیوں نہ ہو۔

افسوس کہ امام علیہ السلام کے فیضانِ علم کا زمانہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا اور ھشام بن عبدالملک کے حکم سے ۵۷ سال کی عمر میں ۱۱۴ ہجری میں آپؑ کو زہر دیا گیا اور اس طرح دنیائے اسلام آپؑ کے وجودِ مقدس کی برکتوں سے محروم ہو گئی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

بڑا فخر و مباہات کا روز تھا، جو بشریت کی برکت و سعادت کا سرچشمہ بن گیا۔ دوشنبہ ۱۷ ربیع الاول کوئی معمولی دن نہیں ہے کہ جسے اسلامی معاشرہ فراموش کردے اور اس کی یاد منانے سے چشم پوشی کرے۔

اسی روز رسولِ اسلام ﷺ دنیا میں تشریف لائے، انھوں نے اسلام کی بنیاد رکھی، اسی روز چھٹے امام جعفر صادق علیہ السلام نے ۸۳ ہجری کو ولادت پائی۔ آپؑ نے اپنے وسیع و آسمانی علم کی روشنی میں مذہب کی بنیاد قائم کی۔

آپؑ کا نام جعفر اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ القاب: صابر، فاضل، طاہر اور مشہور ترین لقب صادق ہے۔ اپنی زندگی کے ۳۴ سال اپنے والد امام محمد باقر علیہ السلام کے سایۂ عاطفت میں گزارے اور اپنے والد کی وفات کے بعد ۱۱۷ ہجری میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔ اپنی امامت کے زمانے کے ۳۱ سال اسلامی معارف کی نشر و اشاعت اور مذہب حقہ شیعہ کی بنیاد اُستوار کرنے میں گزارے۔ آپؑ کے درس میں چار ہزار بڑے علماء و محدثین شرکت کرتے تھے۔ لوگوں نے جتنا آپؑ کے چشمۂ علم سے استفادہ کیا ہے اتنا کسی اور امامؑ کے علم سے نہیں کر سکے ہیں۔ آپؑ کے قیمتی بیانات سے علمی حدیث و فقہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

آپؑ کی علمی منزلت اور ممتاز شخصیت کی وضاحت سے قبل اس نکتہ کو بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عظیم شخصیتوں کے بارے میں مختلف زاویوں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کی زندگی تاریخی حوادث کی صورت میں بیان ہوتی ہے لیکن اگر ہم ان کی زندگی کے بلند پہلوؤں سے بحث کرنا چاہیں تو اس شخصیت کے تعمیری عوامل سے بحث کریں اور اس سے بھی اہم بات اس تاثیر و اثر کو بیان کرنا ہے جو کہ اپنے معاشرہ پر اس کی شخصیت کا ہو سکتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی بھی ایسی ہے۔ کبھی آپؑ کی حیات کو تاریخی بنیاد پر اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ آپؑ کی زندگی کے حوادث سے بخوبی مطلع ہو جائیں اور کبھی وسیع نظر سے کام لیتے ہیں اور آپؑ کی شخصیت کے خصوصیات و امتیازات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

آج چودہ سو سال بعد بھی آپؑ کا نامِ گرامی کیوں احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے؟ اور وہ کون

سی خصوصیت ہے کہ جس نے آپؑ کو دوسرے کروڑوں اور اربوں لوگوں کے درمیان ممتاز کر دیا ہے اور آپؑ کو ابدی وجاوداں بنا دیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے امام جعفر صادق علیہ السلام نے بروز دوشنبہ ۱۷ ربیع الاول ۸۳ ہجری کو اپنے دادا امام زین العابدین علیہ السلام کی حیات میں ولادت پائی۔ آپؑ کا قد میانہ، شاداب چہرہ اور رنگ مائل بہ سفیدی تھا۔ بال گھنگریالے، مونچھوں سے خاص جلال عیاں تھا۔

والدہ ماجدہ

اُم فروہؑ بنت قاسمؒ بن محمدؒ بن ابی بکر ہیں۔ اس ممتاز وشریف خاتون کے احترام کی وجہ سے کبھی لوگ امام جعفر صادق علیہ السلام کو ابن المکرمہ کہتے تھے۔ اس خاتون کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے تھے:

كَانَتْ أُمِّي مِمَّنْ آمَنَتْ وَاتَّقَتْ وَاحْسَنَتْ وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

"میری والدہ ان عورتوں میں سے ایک تھیں جو ایمان لائیں، تقویٰ اختیار کیا اور احسان کیا، خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ (بحار الانوار: ج ۴۷، ص ۷)

والد ماجد

آپؑ کے والد محترم شیعوں کے پانچویں امامؑ ہیں۔ جب امام محمد باقر علیہ السلام دنیا سے رحلت فرما گئے تو صادقِ آلِ محمدؑ نے مسلمانوں کی زمام اپنے دست اختیار میں لی کیونکہ آپؑ اپنے بھائیوں، عبداللہ اکبر، عبداللہ اصغر اور ابراہیم کے درمیان ممتاز ونمایاں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امام محمد باقر علیہ السلام کی رحلت کے بعد ان میں سے کسی نے بھی آپؑ کی امامت کے بارے میں شبہ نہیں کیا۔ امامؑ نے بھی اپنے ناقابلِ انکار فضائل اور اپنے غیر معمولی علم سے اس عظیم وآسمانی منصب کو ثابت کیا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام ۱۱۷ ہجری میں ۳۴ سال کی عمر میں منصب امامت پر فائز ہوئے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا زمانہ خاص زمانہ تھا۔ سیاست میں نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ بنی اُمیہ کی وہ حکومت جس کی بنیاد انھوں نے رسولؐ اسلام کے زمانے ہی سے مضبوط کی تھی اور اپنے

شیطانی فریب کے نتیجے میں ایک زمانہ تک اسلامی معاشرہ پر حکومت کی تھی، وہ آہستہ آہستہ تباہی کے دھانے پر پہنچ رہی تھی۔

بنی اُمیہ عہد رسولؐ سے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخرکار وہ اپنے شیطانی منصوبوں اور انسانی و اَخلاقی مسلّم اُصولوں کے برخلاف مکروفریب کے ذریعے اپنی دیرینہ آرزو تک پہنچ گئے اور اسلامی حکومت پر متمکن ہوئے اور معاویہ کو سرکاری طور پر حکومت مل گئی۔ یہ حکومت دیکھتے ہی دیکھتے وسعت پاگئی اور ترقی کے اَوج پر پہنچ گئی۔ معاویہ نے اپنی چالاکی، زیرکی اور معاشرہ شناسی سے اپنے بافضیلت و شائستہ حریف کو میدانِ مقابلہ سے ہٹا دیا اور پھر اسلامی معاشروں پر حاکم بن گیا۔

معاویہ نے شروع سے علوی خاندان کو کچلنے اور ان کی بیخ کنی کو اپنا نصب العین بنایا تھا۔ آلِ علیؑ کی مخالفت ان کی طاقت کو کچلنا اور ان کے اثر ونفوذ کو ختم کرنا، اُموی حکومت کے گھناؤنے کارنامے ہیں۔ بنی اُمیہ حکومت ہاتھ میں لینے کے لیے مجبور تھے کہ جیسے بھی ہوسکے اپنے شائستہ و لائق حریفوں کو راہ سے ہٹا دیں، لہٰذا انھوں نے اپنے کام کی ابتداء ہی حضرت علی علیہ السلام کے خاندان کے خلاف پروپیگنڈے سے کی اور دنیا کی ساری برائیاں، تہمتیں اور افتراء ان کی طرف منسوب کردیں اور اس سلسلہ میں اتنا زہر اُگلا کہ جب حضرت علی علیہ السلام نے شہادت پائی تو شام کے لوگوں نے معاویہ کی تبلیغ کی وجہ سے تعجب سے پوچھا: علیؑ نے محراب میں کیسے شہادت پائی ہے؟

وہ سوچتے تھے کیا علیؑ نماز بھی پڑھتے تھے کہ محراب میں حالتِ نماز میں قتل ہوئے ہیں؟...... بنی اُمیہ نے علویوں کے خلاف اتنا پروپیگنڈہ کیا کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے اور زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ حکومت انھی کے ہاتھ رہی یہاں تک کہ بنی عباس کی نوبت آئی اور اُمویوں کی طاقت رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی۔

مروان اُمویوں کا آخری خلیفہ ہے۔ تاریخ کہتی ہے: مروان کا زیرک، سیاستمدار اور اس کے ساتھ ساتھ سوچا سمجھا جنگ جو تھا۔ اُمویوں کی حکومت برقرار رکھنے کے لیے اس نے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کردی تھیں۔ لیکن ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں کیونکہ ان کی حکومت کا زمانہ ختم ہوچکا تھا۔

مروان اپنی پانچ سال اور دس روز کی نام نہاد خلافت میں مسلسل کشمکش اور مبارزوں میں

گرفتار رہا۔ وہ اپنی ساری صلاحیتیں سیاسی گتھیوں کو سلجھانے اور جنگی مسائل کو حل کرنے میں صرف کرتا رہا۔ وہ مستقل خوارج اور بنی عباس سے جنگ و جدال میں مشغول رہا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ میں اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھوں گا جب تک کامیابی حاصل نہیں کرلوں گا اور اُموی حکومت کو خطرے سے نہیں نکالوں گا۔ لہٰذا وہ اپنی حکومت کے زمانے میں مسلسل جنگ و مبارزہ میں مشغول رہا۔ کبھی وہ اپنے چچازاد بھائی ولید بن یزید سے، کبھی خوارج سے اور کبھی اپنے سخت و طاقتور دشمن بنی عباس سے دست و گریبان رہا۔

بنی عباس تر و تازہ تھے، وہ صرف جنگ جو، شجاع اور سوچ سمجھے ہی نہیں تھے بلکہ اُصولِ سیاست و تدبیر اور معاشرہ و مردم شناسی سے بھی واقف تھے۔ عام طور پر جنگ جو اور فوجی لوگ نفسیاتی باریکیوں اور معاشرے کے سیاسی اُصولوں سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک ڈپلومیٹ کو ہنرمند بھی کہا جائے لیکن بنی عباس کی حکومتوں کے بانیوں کا امتیاز تھا کہ وہ جنگ جو اور بے باک ہونے کے ساتھ ساتھ لائق و عقل مند سیاست مدار بھی تھے۔ وہ بنی اُمیہ کو شکست دینے اور انھیں میدانِ مقابلہ سے نکالنے کے لیے صرف جنگ و جدال پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ انھوں نے سیاسی نقطۂ نظر اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ٹھیک اُموی سیاست کے خلاف عمل کرتے تھے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ بنی اُمیہ کی حکومت کی بنیاد، خاندانِ علیؑ کی دشمنی پر اُستوار تھی۔ لیکن بنی عباس نے اپنی حکومت کا منبع، آلِ علیؑ کی طرف داری اور ان کی شخصیت و عظمت کے اعتراف کو قرار دیا اور اسی سیاسی نقطۂ نظر سے انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار طرفدار پیدا کرلیے۔

چونکہ لوگوں کا آلِ علیؑ اور بنی اُمیہ سے سابقہ تھا اس لیے یہ طریقہ بہترین و کامیاب ہوا اور اس نے لوگوں کے دلوں کو بنی عباس کے لیے نرم کردیا۔ لوگوں کو ابھی تک سانحہ کربلا یاد تھا۔ انھوں نے یزید کے ظلم و ستم کو فراموش نہیں کیا تھا۔ آلِ علیؑ کی فضیلت و عظمت اور بنی اُمیہ کی پستی و رذالت سب پر آشکار ہو چکی تھی۔ اُمویوں کی تاریک زندگی نے خاندانِ رسولؐ و علیؑ کی نورانیت کو مزید نمایاں کردیا۔

تاریخ اسلام میں یہ دو خاندان ایک دوسرے کے مقابل آئے اور ہر ایک نے مخصوص دستور کا اجراء کیا۔ ایک نے ننگ و بدنامی کا طریقہ دوسرے نے شرف و فضیلت کا راستہ اختیار کیا۔

ایک شیطان کا غلام اور ہوس کا بندہ اور دوسرا خدا کا بندہ اور اپنی ہوس پر مسلط ہے۔ ایک انسانوں کو قیدی بناتا ہے، دوسرا انھیں آزادی دلاتا ہے۔ رسولؐ و ابوسفیان، علیؓ و معاویہ اور حسینؓ و یزید دونوں خاندانوں کے واضح نمونے ہیں۔

تاریخ نے ان دونوں خاندانوں کے لیے اپنے دروازے کھولے۔ میدانِ تاریخ میں بنی ہاشم اور بنی اُمیہ دونوں ہی اُترے، دونوں انقلاب و حوادث کا سرچشمہ بن گئے۔ لوگوں کا کام یہ ہے کہ ان دونوں کے بارے میں تاریخ کے صفحات کا مطالعہ کر کے فیصلہ کریں۔ واضح ہے کہ یہ فیصلہ خاندانِ رسولؐ اور بنی ہاشم کے حق میں ہوگا۔

بنی اُمیہ کی بدنامی اور شکست کے برخلاف آلِ علیؓ روز بروز عظمت و محبوبیت حاصل کرتی رہی۔ اسلامی معاشروں خصوصاً ایران میں عام رجحان خاندانِ رسولؐ اور آلِ علیؓ کی طرف ہو گیا تھا اور اس موقع سے بنی عباس نے خوب فائدہ اُٹھایا اور اپنی حکومت کی بنیاد مضبوط کر لی۔

تمام اسلامی ممالک ان دو لہروں کی لپیٹ میں تھے۔ ایک لہر بنی اُمیہ کی دشمنی کی تھی دوسری خاندانِ علیؓ سے محبت کی تھی۔ یہ دونوں لہریں اتنی شدید تھیں کہ اپنے سامنے آنے والی ہر طاقت کو نابود کر دیتی تھیں۔ ان کے بہاؤ کے خلاف جو بھی طاقت ابھرتی اس کو فنا کر دیتی تھیں۔

بنی عباس نے نہایت ہی زیرکی و ہوشیاری سے خود کو ان لہروں کے رُخ پر چھوڑ دیا اور لوگوں کے ہم خیال و ہم نوا ہو گئے۔ خود کو بنی اُمیہ کے دشمن اور آلِ علیؓ کے دوست کے عنوان سے پیش کیا۔ چنانچہ جس دن بنی عباس نے علویوں کی طرف داری اور بنی اُمیہ کی مخالفت میں قدم علم کیا تھا اسی دن ان کے پرچم کے نیچے ان لوگوں کی اکثریت آ گئی تھی جو بنی اُمیہ کے ظلم و ستم سے عاجز آ چکے تھے۔ انھوں نے خلوص و صداقت سے اس پرچم کو بلند کرنے والوں کی مدد کا عزم کیا۔

آہستہ آہستہ بنی عباس کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ نتیجہ میں وہ سرکاری طور پر جنگ و جدال کرنے میں مشغول ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کی جان کی فکر میں پڑ گئے۔ بنی اُمیہ کے نئے اور خطرناک رقیب کے پیدا ہو جانے سے مشکل کھڑی ہو گئی تھی لہٰذا خاندانِ علیؓ سے ان کی توجہ ہٹ گئی اور بنی عباس سے نمٹنے اور ان کی تحریک و فعالیت کو نابود کرنے میں مشغول ہو گئے۔ دوسری طرف بنی عباس ـــــ جو کہ خود کو خاندانِ علیؓ کا طرف دار قرار دیتے تھے ـــــ بھی اولادِ علیؓ کے مزاحم ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور خاندانِ علیؓ کی نمایاں و ممتاز فرد

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایسے حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے سیاسی طاقتوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے اس نازک اور گزر جانے والے موقع سے اچھی طرح فائدہ اُٹھایا۔ ہم اس موقع سے فائدہ کے طریقے کو ـــ جو کہ حضرت امام صادق علیہ السلام کی زندگی کا حساس ترین نکتہ ہے ـــ بعد میں بیان کریں گے۔ فی الحال ایک تاریخی بحث پیش کرتے ہیں اور آپ کی شہادت کے سیاسی عوامل قلم بند کرتے ہیں۔

ان دونوں سیاسی طاقتوں کا مقابلہ اسی طرح جاری رہا یہاں تک کہ خاندانِ علیؑ کے دوستدار ایرانی عباسیوں کی مدد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس زمانے میں نصر بن سیاح خراسان میں بنی اُمیہ کی طرف سے حاکم تھا۔ ایران کے بڑے سردار، ابو مسلم نے بنی عباس کی طرف داری میں شورش برپا کر دی اور عباسیوں کی دعوت کو ایران میں عام کیا۔ چونکہ لوگ بنی اُمیہ سے خوش نہیں تھے اور ان کی ظالم و ستم کیش حکومت سے سخت متنفر تھے۔ اس لیے انھوں نے علویوں کی طرف داری کی بنا پر ابو مسلم کے ذریعے سے عباسیوں کی ہمنوائی شروع کر دی۔ نتیجے میں ابو مسلم کی طاقت بڑھی اور نصر بن سیاح کی طاقت گھٹتی چلی گئی۔ آخر کار دونوں میں جنگ ہوئی۔

دونوں میں سخت جنگ ہوتی ـــ دونوں ہی ایک دوسرے کی جان کے در پے تھے لیکن فتح ابو مسلم کی ہوتی تھی کہ وہ بے باک و دلیر سردار تھا۔ فنون حرب و ضرب اور فوجی تکنیک سے واقف تھا۔ ناچار، نصر بن سیاح نے مرکزی حکومت سے بھیک مانگی اور مروان سے مدد طلب کی لیکن وہ خود خوارج کے ساتھ جنگ میں اُلجھا ہوا تھا۔

مروان خوارج کے مسئلے کو قطعی طور پر حل کرنا چاہتا تھا۔ خوارج متعصب کٹ حجت تھے۔ کسی بھی موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مرکزی حکومت کے ناک میں دم کر رکھا تھا اس لیے مروان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ جو اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان سے نمٹے، ایسے حالات میں وہ ابن سیاح کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ مروان خوارج سے اور ابو مسلم نصر سے مبارزہ میں مشغول تھا۔

آخر کار مروان نے خوارج کا مسئلہ حل کر لیا اور انھیں نابود کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کامیابی کے ساتھ خراسان میں اس کی ایسی شکست فاش ہوئی کہ جو اس کی حکومت کے زوال کا مقدمہ تھی۔ کیونکہ نصر مرکزی حکومت کی مدد سے مایوس ہو کر خراسان سے فرار کر گیا تھا اور اس طرح

پورا خراسان بغیر کسی ٹکراؤ کے ابو مسلم کے قبضہ میں آ گیا لیکن اس نے اسی پر اکتفا نہ کی۔ وہ اپنی حکومت کو مزید وسعت دینا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اُصولی طور پر خلافت کو بنی اُمیہ سے بنی عباس کی طرف منتقل ہو جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں اس نے بہت زحمتیں اُٹھائیں، جنگیں لڑیں۔ اس دلیر و شجاع ایرانی سردار نے اتنی فعالیت کی کہ بنی عباس اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور تخت خلافت پر متمکن ہو گئے۔

جب مروان کو یہ خبر ملی کہ خراسان ہاتھ سے نکل گیا تو اس نے ابراہیم کو اسیر کرنے کا حکم صادر کیا کہ ابو مسلم اسی کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے۔ دو ماہ تک ابراہیم کو قید خانہ میں رکھا اور پھر بدترین طریقہ سے قتل کرا دیا۔

مروان سلسلۂ بنی اُمیہ کا آخری خلیفہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے ابراہیم کو قتل کر کے عباسیوں کی تحریک کا قلع قمع کر دیا ہے، لہٰذا خراسان پر دوبارہ قبضہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں صرف اسی کی غلطی ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ معاملہ ہی اُلٹ گیا، کیونکہ ابراہیم کے قتل سے اہلِ خراسان میں سخت غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی اور انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جتنی جلد ہو سکے گا مرکز خلافت سے نزدیک ہو کر حکومت کو متزلزل کر دیں گے، لہٰذا وہ خراسان سے رَے کی سمت اور وہاں سے اصفہان و نہاوند اور کرمانشاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ لوگ آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ مرکز خلافت عراق پہنچ گئے۔

ایرانیوں نے شدید حملہ کر کے عراق کے سیاسی مرکز کوفہ کو فتح کر لیا اور ابراہیم کے وصی عبداللہ بن سفاح کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ خراسان و عراق اس طرح بنی عباس کے قبضے میں آ گئے اور بنی عباس کے سب سے پہلے خلیفہ عبداللہ بن سفاح نے لوگوں سے بیعت لی لیکن شام و مصر اور جزیرہ ابھی تک اُمویوں کے قبضے میں تھا۔

عراق کی فوج نے سفاح کے چچا عبداللہ بن علی کی سپہ سالاری میں اُمویوں کے مرکز خلافت جزیرہ پر حملہ کر دیا اور مروان کو شکست ہوئی۔ مروان وہاں سے فرار کر کے مصر چلا گیا۔ آخرکار ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۲ ہجری میں مصر کے نزدیک ایک دیہات میں قتل کر دیا گیا۔ اس طرح بنی اُمیہ کی حکومت کا زوال اور بنی عباس سلطنت تک پہنچ گئے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بنی عباس نے اپنی   کی بنیاد بنی اُمیہ کے خلاف آلِ علیؑ

اور علویوں سے ہمدردی اور ان کی طرف داری پر رکھی۔ بنی عباس کے سب سے پہلے خلیفہ سفاح اپنی چار سال اور آٹھ ماہ کی حکومت کی پوری مدت میں اس سیاست پر کاربند رہا۔ حق تو یہ ہے کہ اسی سیاست کے طفیل میں انھوں نے اپنی حکومت کے پایوں کو محکم کیا۔

سفاح کے انتقال کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر عبیداللہ بن محمد معروف بہ منصور دوانقی خلیفہ ہوا۔ ابتداء میں تو اس نے بھی اسی سیاست کو اپنایا اور اپنی سیاسی فعالیت کے دو محور قرار دیے۔ ایک بنی اُمیہ کی مخالفت اور ان کی باقی ماندہ طاقت کو کچلنا، دوسرے خاندانِ علیؑ سے محبت اور ان کی طرف داری۔ اس کا یہی رویہ رہا یہاں تک کہ ہر جگہ اس کا تسلط ہوگیا۔ ایک طرف بنی عباس کا تسلط اور دوسری طرف دو انقلابی حوادث اس بات کا باعث ہوئے کہ آہستہ آہستہ منصور کی بلکہ بنی عباس کی سیاست بدل گئی اور انھوں نے اپنی سیاست کے اُصولِ اولیہ میں تجدیدِ نظر کی۔

علویوں کی طرف داری کے نعرہ سے وہ طاقت حاصل کرتے تھے۔ علویوں کی طرف داری لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا بہانہ تھا ورنہ منصور اور بنی عباس میں سے کوئی بھی حضرت علی علیہ السلام اور آپؑ کی آل کی فضیلت کا شیفتہ و شیدا نہیں تھا۔ چنانچہ منصور نے ایک روز ایک دعوت کے موقع پر اپنے دل کی بات کا اظہار کیا۔ اس روز ایک ناکام انقلاب کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ حاضرینِ مجلس اس تحریک کا تجزیہ و تحلیل کر رہے تھے۔ ہوتے ہوتے دین و مسائل دینی کے بارے میں بحث ہونے لگی۔ انھوں نے اظہارِ خیال کیا: یہ تحریک مذہبی عنصر پر مشتمل تھی لیکن اس کو چلانے والوں سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔ وہ یہ سوچتے تھے کہ دینِ مصطفیٰ صرف خلیفۂ مسلمین منصور سے قائم ہوگا۔ اسی اثناء میں دسترخوان بچھا دیا گیا۔ بھنا ہوا مرغ اور لذیذ کھانے دسترخوان پر منصور کے سامنے رکھے گئے۔ منصور نے گردن اُٹھائی اور کہا: دوستو! حقیقت یہ ہے کہ دین و ایمان سے قطعاً کوئی سروکار نہیں ہے۔ جنگ و جدال ان کھانوں پر ہے۔ انقلابی چاہتے تھے کہ اس دسترخوان پر بیٹھ کر لذیذ کھانے کھائیں اور میں بھی یہی چاہتا تھا لہٰذا ہم نے مارا، قتل کیا، اسیر کیا تاکہ اپنے حریف کو ناتواں بنا دیں۔ چنانچہ آج اس لذیذ غذا سے مستفید ہو رہے ہیں۔

اس لیے دین و ایمان کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علویوں کی طرف داری ایک بہانہ تھا۔ بنی عباس چاہتے تھے کہ اس شریف خاندان سے لوگوں کو جو محبت و عقیدت ہے اس سے فائدہ اُٹھائیں اور عیش و نوش سے سرشار زندگی بسر کریں۔ چنانچہ جب ان کی حکومت

ہوگئی تو پھر اس سیاست کو جاری رکھنے کو لازم نہیں سمجھا، لہٰذا انھوں نے اپنا رویہ بدل دیا۔ اب خاندانِ علیؑ کا پہلے جیسا احترام نہیں کرتے تھے۔

اسی زمانے میں دو ایک علویوں، عبداللہؓ بن محض کے دو بیٹوں محمدؒ و ابراہیمؒ نے قیام بھی کیا تھا لیکن بنی عباس کی حکومت محکم ہوچکی تھی۔ وہ سیاست کو سمجھے اور موجودہ حالات کو درک کیے بغیر مدینہ سے نکل گئے اور انقلاب برپا کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ یہ دونوں بھائی ایک زمانے تک روپوش رہے۔ ایک ان میں سے مدینہ لوٹ آیا۔ دوسرا بصرہ چلا گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان دو اسلامی شہروں سے اپنی تحریک چلائیں اور پھر وہاں سے مرکز خلافت کی طرف بڑھیں۔ منصور نے ان دونوں کو شکست دی اور ان کے انقلاب کو ناکام بنادیا لیکن اس نے سوچا کہ اس کے بعد علویوں کے بارے میں سخت و ٹھوس طریقہ اختیار کیا جائے۔

دوسری چیز جو منصور کو کھٹکتی تھی اور اس کے حسد و غیظ و غضب کی آگ کو بھڑکاتی تھی۔ وہ علویوں کے سردار امام جعفر صادق علیہ السلام کی لوگوں میں مقبولیت و تعظیم تھی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فترت و فرصت کے زمانے کو مذہب کی ترویج کرنے میں صرف کیا تھا جس کے نتیجے میں ہر ایک دوست و دشمن پر آپؑ کا علمی پایہ آشکار ہوگیا تھا۔ یہ عظمت اور بڑاپن اور لوگوں کی نگاہوں میں احترام منصور کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ یہی چیزیں اس بات کا سبب بنیں کہ منصور آلِ علیؑ کے بارے میں اپنی سیاست میں تجدید نظر کرے۔ اب دوبارہ اُمویوں کے منصوبے پر بنی عباس کے ذریعے عمل ہوتا ہے اور خاندانِ علیؑ پر ایک بار پھر ظلم و ستم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

منصور نے حکم صادر کیا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو مدینہ سے عراق لایا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ یہاں آپؑ پر نظر رکھے اور اس طرح آپؑ کے قتل کے اسباب فراہم کرے۔

مؤرخین لکھتے ہیں: جس زمانے میں امام جعفر صادق علیہ السلام بغداد میں تھے اس زمانے میں منصور نے بارہا آپؑ کے قتل کا ارادہ کیا لیکن کامیاب نہ ہوسکا یا کچھ وجوہ کی بنا پر قتل سے باز رہا۔ شاید وہ علویوں کی شورش و انقلاب سے ڈرتا تھا یا دوسری وجوہ کی بنا پر وہ ایسا نہیں کرسکا۔ آخرکار اس نے اس طرح آپؑ کے قتل کا منصوبہ بنایا کہ جس سے کوئی یہ گمان نہ کرسکے کہ اس نے امام علیہ السلام کو شہید کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوگیا اور صادق آلِ محمدؐ کو زہر آلود انگور کھلا کر

۲۵ شوال ۱۴۸ ہجری کو شہید کر دیا ــــ یہ تھی ہماری تاریخی بحث۔

امام علیہ السلام کی شخصیت

گذشتہ فصل میں بحث کی اساس تاریخی حوادث اور امام علیہ السلام کے زمانہ کے اجتماعی و سیاسی حالات کا جائزہ تھا۔ جس زمانے میں امام جعفر صادق علیہ السلام زندگی گزار رہے تھے وہ بنی اُمیہ و بنی عباس کے ٹکراؤ کا زمانہ تھا جس کے سبب سیاسی حالات بدل گئے تھے۔

بنی عباس نے اُمویوں کو کچلنے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کی غرض سے علویوں کی طرفداری کے نام سے قیام کیا۔ چنانچہ اسی عاقلانہ و مدبرانہ سیاست کی بنا پر انھوں نے لوگوں میں بڑی مقبولیت پائی اور نتیجے میں حکومت حاصل کر لی اور تھوڑی ہی مدت کے بعد ان کی سیاست میں بھی تبدیلی آگئی۔

ایک طرف مقصد میں کامیابی اور دوسری طرف دو علویوں کی وجہ سے ایک انقلاب کی لہر کا پیدا ہونا اور علویوں کے رأس و رئیس امام جعفر صادق علیہ السلام نے لوگوں میں بے پناہ عظمت و احترام پیدا کر لیا تھا۔ انھی باتوں کی بنا پر بنی عباس کے دوسرے خلیفہ نے اپنی سیاست بدل دی اور علویوں کو قید و بند میں ڈالنے اور انھیں محدود کرنے کا عزم کر لیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی ساری توجہ علویوں کے رئیس امام صادق علیہ السلام پر مرکوز تھی۔

ان اسباب کی بنا پر منصور نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو زہر دے دیا اور آپؑ نے جامِ شہادت نوش کیا لیکن امام علیہ السلام کی عقل و درایت اتنی قوی تھی کہ آپؑ نے اسی مختصر زمانے میں اسلامی ثقافت کی بنیاد قائم کر دی تھی اور مذہب کی ترویج کی تھی کہ جس میں دو طاقتیں ٹکرا رہی تھیں۔

بنی اُمیہ کا زمانہ ایسا ظلم و بربریت کا دور تھا کہ جس میں مذہبی پیشواؤں کے لیے علمی و دینی فعالیت کا امکان بہت کم تھا، کیونکہ بنی اُمیہ کی سیاست ہی علویوں کو محدود رکھنا تھا اور ائمۂ اسلام جو کہ خاندانِ علیؑ میں سب سے زیادہ بافضیلت و شریف تھے بنی اُمیہ کے زمانے میں ان پر بہت سختی کی جاتی تھی اور ان کی شدید طریقے سے نگرانی کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے ایسے تاریک دور میں اسلامی معارف کی نشر و اشاعت نہیں کر سکتے تھے اور نہ اس مذہب کی ثقافت کو فروغ دے سکتے تھے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ بنی عباس نے اپنی سیاست کی بنیاد آلِ علیؑ کی طرفداری قائم کی تھی۔ نتیجہ

میں ائمہ دین کو کچھ فرصت مل گئی تھی مگر افسوس جیسے ہی بنی عباس کی حکومت مستحکم ہوئی، انھوں نے بھی بنی اُمیہ جیسا سلوک روا رکھنا شروع کر دیا اور علویوں پر دوبارہ ظلم وستم کے باب کھل گیا۔ ائمہ کو صرف اس زمانے میں کچھ آزادی ملی تھی جب یہ دونوں طاقتیں ایک دوسرے کی جان کی فکر میں تھیں۔

بنی اُمیہ، بنی عباس ایسے خطرناک رقیب و دشمن سے اُلجھے ہوئے تھے۔ اب ان میں خاندانِ علیؑ سے مبارزہ کی مجال نہیں تھی۔ بنی عباس ابھی حکومت پر نہیں پہنچے تھے، لہٰذا انھوں نے لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کرنے کے لیے خاندانِ علیؑ کی طرف داری کو اپنا نعرہ قرار دیا جس کے نتیجے میں علویوں کو بہت ہی مختصر زمانے کے لیے امام صادق علیہ السلام کے دور میں آزادی ملی تھی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام امامت کے معنوی منصب پر فائز ہونے کے علاوہ بڑے عاقل و زیرک تھے۔ انھوں نے اس ہاتھ آنے والے موقعہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا اور جہاں تک ہوسکا اسلامی معارف کی اشاعت کی۔

یہاں اس نکتہ پر توجہ کرنا چاہیے کہ جس اسلامی انقلاب کی بنیاد رسولؐ اسلام نے رکھی تھی اور جس کو بعد میں ائمہ دین اور آپ کے جانشینوں خصوصاً امام جعفر صادق علیہ السلام نے آگے بڑھایا اس انقلاب کی بنیاد علم وثقافت پر اُستوار ہے اور اس کے فکری ریشے اُستوار ہیں اور یہی چیز رسولؐ کی کامیابی اور ثبات ودوام اسلام کا راز ہے۔

دنیائے بشریت پوری تاریخ میں عظیم انقلابات اور خونی معرکوں کی گواہ رہی ہے۔ یہ انقلابات ثبات ودوام کے لحاظ سے اور لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہونے کے اعتبار سے یکساں نہیں تھے۔ ان انقلابات میں سے بعض بہار کے طوفانوں کے مانند تیزی سے گزر جانے والے تھے جن سے خونی معرکے وجود میں آئے اور چند دنوں کے بعد لوگوں کی زندگی پر کوئی گہرا اثر چھوڑے بغیر ختم ہوگئے اور فراموشی کے مقبرہ میں دفن ہوگئے۔

ان انقلابات کا اتنا اثر ہوا کہ تاریخ حوادثِ بشریت میں چند صفحات کا اضافہ ہوگیا اور تاریخ کے محتویٰ میں کچھ خونیں داستان رقم ہوگئیں۔ انسانی معاشروں میں ایسے انقلابات کے نتیجے میں قتل وخونریزی اور تباہی تو ہوئی ہے لیکن کسی تمدن کی بنیاد نہ رکھی ہے اور نہ ایک نئے معاشرہ کی تعمیر کی راہ میں کوئی قدم اُٹھایا ہے۔ اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران میں جہاں تک ممکن تھا

مغلوں نے وحشت ناک انقلاب برپا کیے۔ مغلوں نے اس سرزمین پر خون کی ندیاں بہائیں اور پورے ملک پر مسلط ہو گئے۔ انھوں نے تباہی پھیلانے والے انقلاب کے مانند سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیے جس کا لازمی نتیجہ قتل و غارت گری اور وحشت تھی۔

مغلوں نے بہت بڑا انقلاب بپا کیا حالانکہ کسی نئے معاشرے کی تعمیر و ترقی اور خوش حال زندگی کے سلسلہ میں چھوٹا سا قدم بھی نہیں اُٹھایا۔ اس کا راز یہ ہے کہ مغلوں کے انقلاب کی بنیاد خون و شمشیر پر قائم تھی، علم و تمدن پر نہیں۔ واضح رہے کہ ایسا انقلاب ایک قوم کے حالات بدل سکتا ہے نہ کسی دیرپا تمدن کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔

یہ بھی انقلاب کی ایک قسم ہے لیکن دوسری قسم وہ انقلاب ہے جو کسی فکر و بنیاد پر اُستوار ہوتا ہے۔ ایسے انقلابات کی فعالیت کا محور لوگوں کی روح و قلب ہوتے ہیں۔ ان کے جسم و بدن نہیں۔ ایسے انقلاب لانے والوں کو لوگوں کے افکار و دماغ سے سروکار ہوتا ہے، ان کے ظاہری حالات سے نہیں۔ ایسے انقلابات سے ماحول میں خونریزی کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں قتل و اسیری اور آتش زنی کا کہیں نشان نہیں ملتا ہے۔ ایسے انقلابات کی قیادت کرنے والے اشخاص جانتے ہیں کہ جب تک لوگوں کے دل و دماغ میں انقلاب نہیں آئے گا اس وقت تک قوم کی زندگی اور اس کا رہن سہن نہیں بدل سکتا۔ لہٰذا وہ اپنی ساری صلاحیتیں لوگوں کی صحیح فکری قیادت میں صرف کرتے ہیں۔ ایسے انقلابات دنیا میں عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ اعلیٰ تمدن ان ہی انقلابات کی دین ہیں۔ یہی تمدن بشریت کے معنوی و مادی تکامل کا سبب بنتے ہیں۔ ان انقلابات کو ممتاز کرنے والی چیز یہ ہے کہ یہ فکری ریشہ اور بنیاد کے حامل ہوتے ہیں اور خدا نے اس عظیم فلسفی و سماجی نکتہ کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا ہے، ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (سورۂ رعد: آیت ۱۱)

"خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنی حالت نہیں بدلتی ہے"۔

یہ سنتِ الٰہی ہے کہ سماجی انقلابات فکری، روحی اور ثقافتی انقلابات ہی کی بنیاد پر آتے ہیں۔ تاریخ میں کم و بیش ایسے انقلابات کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں فرانس میں ایسا عظیم انقلاب آیا کہ اس نے صرف اہلِ فرانس کی تقدیر ہی کو نہیں بدلا بلکہ پوری دنیا کی سیاست ہی کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ اس عظیم انقلاب کی لہریں فرانس کی سرحدوں بلکہ یورپ گزر کر

ساری دنیا میں بسنے والوں تک پہنچ گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کے دل اس انقلاب کے لیے نرم تھے اور انقلاب کے قائدین نے بھی اپنی صحیح و مؤثر فعالیت کا محور لوگوں کی فکر وروح کو قرار دیا۔ پہلے فکری رجحان کو ـــــ جو کہ غلامی و اسیری کا عادی بن چکا تھا، بالکل ہی بدل دیا اور ذہنوں کو آزادی و حریت کی طرف موڑ دیا اور لوگوں کے دماغوں کو اس سعادت بخش تار و پود میں جکڑ دیا۔

اگر انسانی معاشروں میں آسمانی ادیان عظیم کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ اگر خدا کے رسل اور ائمہ معصومینؑ نے قوموں کے سماجی نظاموں میں ہمیشہ کے لیے ناقابلِ فراموش چیز کا اضافہ کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی فعالیت کا محور لوگوں کی روح وفکر تھی۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ معاشروں کے سوچنے کے نہج کو بدل دیں اور غلط اُصولوں کو جڑ سے اُکھاڑ پھینک دیں، ان کی سعی یہ تھی کہ لوگوں کی فکر ان شائستہ اُصولوں کے تحت حرکت میں آئے جو خوش بختی کا سبب ہوں۔

اگر رسولِ اکرم ﷺ ایک ترقی پذیر وجدید سماجی نظام ایجاد کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اس جدید و آسمانی نظام کو ہمیشہ کے لیے اُستوار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی فعالیت کے اوّلین اقدام ہی سے لوگوں کے ذہنوں کو جھنکا دیا تھا۔

رسولؐ کے مبارزہ کے دو محاذ تھے اور اس مبارزہ کا میدان بھی لوگوں کے دماغ و افکار تھے۔ ایک محاذ پر غلط فکری اُصول کو تہس نہس کیا اور فرمایا: ”لا الٰہ“ ہر قسم کے غیر حقیقی خدا کی نفی کر کے بتوں کو توڑ دیا اور معاشرے کے لغو و فرسودہ نظام کو غلط قرار دیا۔ ظلم وستم کو بُرا بتایا اور ریاکاری، سودخوری و مے نوشی کو منسوخ کیا۔ مختصر یہ کہ عام افکار میں ہر قسم کے غلط عمل کی مذمت کی اور دوسرے محاذ پر تعمیر وقیادت میں مشغول ہوئے اور فرمایا: ” الا اللّٰہ“ پہلے ویرانہ پر دین کی بہترین باعظمت عمارت کھڑی کی۔ جھوٹے خداؤں کی جگہ خالق و حقیقی خدا کو ثابت کرتے ہیں۔ مساوات و برابری پر اُستوار عادلانہ اقتصادی نظام پیش کیا۔

رسولؐ فرسودہ نظام کو ختم کرنے والے اور جدید دنیا تعمیر کرنے والے ہیں اور یہ اتنی بڑی کامیابی آپ کو فکری و عملی اور ثقافتی انقلاب بپا کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کے بعد یہ مشن آپؐ نے اپنے جانشینوں کے سپرد کیا تاکہ وہ مناسب اوقات میں استفادہ کرتے ہوئے اسے پھیلائیں۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی ایک خاص سیاسی موقع سے استفادہ کیا اور اس عظیم و مقدس فریضہ کی انجام دہی میں مشغول ہوئے۔ اس سلسلہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کو عظیم کامیابی

ملی کہ آج ہمارا حقوقی وفقہی مسلک آپؑ ہی کے مقدس نام کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اسے فقہ جعفری کہا جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ثقافت و معارف اسلامی کو عظمت کے اوج پر پہنچایا اور اس زمانے تک جو اسلامی علوم اور قرآن کے علمی رُموز، سیاسی حالات کے دباؤ کی وجہ سے ائمہ دین کے سینوں میں محفوظ تھے وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوئے۔

صادق آلِ محمد علیہم السلام کی اکتیس سالہ امامت کا دور معارفِ اسلام کی نشر اور مذہب حقہ تشیع کی بنیاد قائم کرنے میں گزرا۔ ہماری مذہبی کتابیں ایسے مطالب سے پُر ہیں جو کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے دہن مبارک سے صادر ہوئے ہیں۔ اسلام کے حقوقی کتب کی بنیاد رسولؐ نے رکھی تھی اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

امام علیہ السلام کی علمی روش

امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ نمایاں امتیاز تھا کہ آپؑ نے قرآنِ مجید سے استفادہ کرتے ہوئے صحیح علمی روش کا سراغ لگایا۔ یاد رہے کہ انسان کی علمی ترقی کا اس وقت آغاز ہوا کہ جب علماء نے اپنی علمی تحقیق میں طبیعت کے مشاہدہ، تجربہ اور اس کے دقیق مطالعہ کا آغاز کیا۔

ادھر تین سو سالہ صحیح علمی روش سے بشر کو یہ عظیم توفیق نصیب ہوئی ہے کہ وہ دانش بشری کتاب کے محتویات کو آج کے معیار تک پہنچائے اور یہ وہی روش ہے کہ جس کو قرآنِ مجید نے پہلی بار پیش کیا اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسے اپنے علمی مباحثوں میں استعمال کیا ہے، حتیٰ کہ جہاں امام صادق علیہ السلام خدا اور توحید کے بارے میں بحث کرتے ہیں وہاں بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امام علیہ السلام کی فکر کا محور، طبیعت اور اس کے وقوعوں کا مطالعہ ہے، وہ بھی عینی وحسی مطالعہ۔

بنی عباس کے خلفاء خصوصاً مامون نے جو اسلامی معاشرہ، علم اور اسلامی ثقافت سے جو خیانت کی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے خاندانِ نبوت کی علمی عظمت کو گھٹانے اور مذہبی مشینری کے مقابلے میں دوسری مشینری ایجاد کرنے کے لیے اسلامی معاشروں کو قدیم یونان کی فرسودہ اور پرانی علمی روش کی طرف موڑ دیا۔ اس روش کی طرف جو ٹھیک عینی مشاہدے کی روش کی ضد تھی۔

مسلمان چاہتے تھے کہ قرآن اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی تحقیقاتی روش سے فائدہ اُٹھا کر طبیعت کی صحیح شناخت کی راہ پر گامزن ہوں۔ اسلام میں اس مکتب کا اوّلین ثمرہ امام علیہ السلام کا شاگرد "جابر بن حیان" ہے کہ جسے موجد کیمیا کے لقب سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اچانک اس نئی تحریک وروش کے مقابلے میں فلسفۂ یونان اور اس کی غیر حسی تحریک وروش آگئی کہ جس کی حمایت و پشت پناہی حکومت کر رہی تھی۔ یہ روش وتحریک اتنی طاقتور تھی کہ علماء ودانشور بھی اپنے طبیعی مطالعات میں اس کی پیروی کرنا چاہتے تھے اور روش کی تشخیص میں اسی غلطی کی وجہ سے قرون وسطیٰ میں اسلام سے بے رُخی اور یورپ والوں کی عزت بڑھی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے صحیح علمی روش سے استفادہ کرتے ہوئے عظیم شاگردوں کی تربیت کی اور ملت اسلامیہ پر اپنے علم کے باب کھول دیے۔ اس زمانے میں ہزاروں لوگ آپؑ سے علمی استفادہ کرتے تھے۔ جمیل دراج، عبداللہ بن مکان، ابان بن تغلب، ابوحمزہ ثمالی اور بڑے فقہا و بلند پایہ محدثین آپؑ کے شاگرد تھے۔

مورخین لکھتے ہیں: جس وقت آپؑ مسند درس پر تشریف فرما ہوتے تھے تو سیکڑوں عالم، فقیہ اور متکلم زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے۔ آپؑ کے شاگردوں کی تعداد چار ہزار قلم بند کی ہے۔

حسن بن زیاد کہتے ہیں: ابوحنیفہ سے پوچھا گیا: سب سے بڑا عالم وفقیہ کون ہے؟

کہا: جعفرؑ بن محمدؑ۔ نیز فرمایا: جعفرؑ بن محمدؑ کی طرف لوگوں کے بڑھتے ہوئے رجحان سے منصور کو سخت تشویش لاحق تھی۔ اس کی ساری کوشش اس بات پر صرف ہو رہی تھی کہ لوگوں کی نظر میں آپؑ کی عزت گرادے۔ وہ علمی مرتبہ اور آپؑ کے درس کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے تحت اس نے امام علیہ السلام کو مدینہ سے بلایا اور مجھے بہت دشوار اور سخت سوالات تیار کرنے پر مامور کیا تاکہ ملاقات کے وقت آپؑ سے معلوم کروں۔

ایک روز منصور نے ایک آدمی میرے پاس بھیجا۔ وہ حیرہ میں تھا جب میں مجلس میں پہنچا تو میری نظر امام جعفر صادق علیہ السلام پر پڑی جو کہ رُعب وجلال کے ساتھ منصور کی دائیں جانب تشریف فرما ہیں۔ اس سے مجھے سخت دھچکا لگا۔ دل دھڑکنے لگا اور آپؑ کے سامنے ششدر رہ گیا۔ منصور نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے میرا تعارف کرایا اور کہا: یہ ابوحنیفہ ہیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: جی ہاں! انھیں پہچانتا ہوں۔

میں نے منصور کے حکم سے سوالات کا سلسلہ شروع کیا اور امام صادق علیہ السلام نے بلا تامل سب کا جواب دیا یہاں تک کہ ہر مسئلے کے بارے میں اختلاف رائے کو بھی بیان فرمایا۔ اس طرح میرے چالیس سوالات کے جوابات دیے۔

قارئین جانتے ہیں کہ ابوحنیفہ اہل سنت والجماعت کے فقہائے اربعہ میں سے ایک ہیں۔ آپؑ کی یہی بڑھتی ہوئی علمی روشنی اور اس کے نتیجے میں لوگوں میں محبوبیت اس بات کا سبب بنیں۔ آہستہ آہستہ آپؑ سے دشمنیاں بڑھیں اور آپؑ کو شہید کر دیا گیا۔

عباسی خلیفہ منصور اس بڑھتے ہوئے احترام سے بہت خوف زدہ ہوا۔ لہٰذا اس نے یہ ارادہ کیا کہ خاندانِ علیؑ کے بارے میں اپنی سیاست کے بارے میں تجدید نظر کرے۔ اسی ارادے نے آخرکار امام جعفر صادق علیہ السلام کے لیے شہادت کے اسباب فراہم کر دیے۔ چنانچہ اس نے ۲۵ شوال ۱۴۸ ہجری کو صادق آلِ محمد علیہ السلام کو زہر آلود انگور کھلا دیے جس سے آپؑ کی شہادت واقع ہوئی۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام
کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

شیعوں کے ساتویں امام حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے بروز یکشنبہ سات صفر ۱۲۸ھ کو مکہ و مدینہ کے درمیان واقع ابواء نامی جگہ پر ولادت پائی۔ آپؑ کا اسم مبارک موسیٰ، مشہور کنیت ابوالحسن اور ابوابراہیم ہے۔ آپؑ کے والد ہمارے چھٹے امام جعفر صادق علیہ السلام ہیں۔ آپؑ کی والدہ ماجدہ حضرت حمیدہؒ ہیں۔ یہ خاتون ایسی عالمہ تھیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مسلمان عورتوں کی مذہبی تعلیم و تربیت آپؒ کے ذمہ رکھی تھی۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے تقریباً ۵۵ سال کی عمر پائی اور ۲۵ رجب ۱۸۳ ہجری کو بغداد میں شہادت پائی۔ امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کے عہد کے سماجی حالات بہت سخت تھے یہاں تک کہ امام علیہ السلام کو مذہبی معارف اور دینی احکام بیان کرنے کی بھی آزادی میسر نہیں تھی۔ آپؑ کے زمانے میں سیاسی و سماجی حالات میں واضح تبدیلی آگئی تھی۔ بنی عباس مکمل طور پر حالات پر قابو پاچکے تھے جب کہ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے کے سماجی حالات ایسے نہیں تھے۔ اس وقت آزادی میسر تھی۔

جب امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد موسیٰ بن جعفرؑ منصب امامت پر فائز ہوئے تو اس وقت آپؑ کی عمر شریف بیس سال تھی۔ منصور، امام جعفر صادق علیہ السلام کو زہر دے چکا تھا لہٰذا اس نے امام موسیٰؑ سے تعرض نہ کیا۔ منصور کے بعد مہدی عباسی اور اس کے بعد ہادی تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ یہ دونوں کم و بیش امام موسیٰ بن جعفرؑ پر نظر رکھتے تھے۔ مرقوم ہے کہ مہدی عباسی نے چند روز آپؑ کو محبوس بھی کیا تھا۔

ہادی کے بعد ہارون رشید کی نوبت آئی۔ اس نے زیادہ قدرت و طاقت حاصل کی اور جب اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کر چکا تو پھر ان لوگوں کو یکے بعد دیگرے راستہ سے ہٹایا کہ جن سے اسے خطرہ تھا۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا لوگوں کے دل میں جو احترام تھا اس سے ہارون اچھی طرح واقف تھا۔ ایک طرف لوگوں میں امام علیہ السلام کے احترام اور دوسری طرف آپؑ کے خاندان کے نمایاں کارناموں کے سبب ہارون رشید کو فطری طور پر خوف لاحق ہونا ہی چاہیے تھا۔ آخر کار اس خوف نے اپنا کام کیا اور ہارون رشید نے ایک مدت کے لیے امامؑ کو قید کر دیا، کیوں؟

ہمارے ساتویں امام علیہ السلام نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ کیوں قید خانہ میں گزارا؟ اس سوال کا جواب آپؑ کی عظیم شخصیت کو پہچاننے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ اس سوال کا جواب ہارون رشید کی زبانی سنیے:

ہارون رشید بنی عباس کا پانچواں خلیفہ تھا جو آٹھ کروڑ کی آبادی پر حکومت چلا رہا تھا۔ چالیس ملک اس کی فرماں روائی میں تھے، حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانے میں جہاں تک انسان بستے تھے وہاں تک اس کی حکومت تھی۔ ہارون رشید اپنی ترقی کی آخری منزل تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایسے زمانے میں ساتویں امامؑ کو قید کیا تھا۔

ایک روز امام علیہ السلام اس کی مجلس میں تشریف لے گئے۔ ہارون بڑی انکساری سے پیش آیا اور مسند پر اپنے برابر میں بٹھایا اور جب تک امامؑ وہاں رہے اس نے کسی دوسرے سے گفتگو نہ کی۔ یہ چیز مامون جیسے زیرک انسان کے لیے بہت ہی حیرت انگیز تھی۔

مامون شب میں اپنے باپ کے پاس گیا اور پوچھا: بابا! یہ کون تھا جس کے ساتھ آپ ادب و احترام سے پیش آئے اور انھیں اپنے مسند پر اپنے سے اُوپر بٹھایا؟ ہارون بیٹے کا سوال سن کر گہری فکر میں ڈوب گیا۔ کافی دیر کے بعد سر اُٹھا کر کہا: بیٹے! یہ لوگوں کے امام ہیں، خلقِ خدا پر اس کی حجت ہیں۔ مامون —— جو کہ اپنے باپ کے علاوہ کسی کو پیشوا نہیں سمجھتا تھا نے اور زیادہ تعجب سے پوچھا: بابا! کیا آپ کے علاوہ بھی کوئی امام و خلیفہ ہے؟

ہارون نے کہا: یہ شخص جسے تم نے آج دیکھا ہے سب سے زیادہ یہی خلافت کے لائق ہے لیکن کیا کیا جائے اَلْمُلْکُ عَقِیْمٌ، ان تمام فضائل اور ان کے بارے میں اپنے اس عقیدہ کے باوجود اگر وہ کبھی میرے خلاف اُٹھیں گے تو میں ان کا سر قلم کردوں گا۔

یہ تھا امام علیہ السلام کے بارے میں ہارون رشید کا فیصلہ۔ ایک اور داستان —— ممکن ہے اسی داستان کی دوسری صورت ہو۔ مامون کہتا ہے کہ اس سال میرے والد ہارون رشید نے مکہ جا کر فرائضِ حج انجام دینے کا قصد کیا۔ اس سفر میں میرے علاوہ میرے اور دو بھائی امین و معتصم بھی ان کے ساتھ تھے۔ مدینہ ہمارے راستے میں پڑتا تھا۔ میرے والد کی سواری استقبال کرنے والے جمِ غفیر کے حلقہ میں شہر مدینہ میں داخل ہوئی۔ والد نے گورنر ہاؤس میں اُترنے اور شہر کے بڑے لوگوں کی میزبانی کے لیے تیار ہونے کے بعد اپنے دربان کو حکم دیا کہ جب تک تمھیں

ملاقات کرنے والوں کے حسب ونسب کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہو جائیں اس وقت تک داخل ہونے کی اجازت نہ دینا۔ چنانچہ ملاقات کی اجازت دینے سے پہلے دربان ملاقات کرنے والوں میں سے ہر ایک سے اس کا حسب ونسب معلوم کرتا تھا۔ آنے والا بھی اپنا سلسلہ کسی مہاجر یا انصار یا قریش تک پہنچاتا تھا۔ پھر دربان اسے شرف یابی کی اجازت دیتا تھا۔ حسب ونسب سے واقفیت کا فلسفہ یہ تھا کہ ہارون رشید خاندان کی عزت وعظمت کے مطابق عطایا وبخشش دے سکے۔

مامون کہتا ہے: انھی ایام میں ایک روز میں اپنے والد کے پاس بیٹھا تھا کہ فضل بن ربیع آیا اور والد سے کہنے لگا: اے امیر المومنین! ایک شخص آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں موسیٰؒ بن جعفرؒ بن محمدؒ بن علیؒ بن حسینؒ بن علیؒ بن ابی طالبؓ ہوں۔

میرے والد یہ نام سنتے ہی صحیح ہو کر بیٹھے۔ صورت سے عیاں تھا کہ اس نام نے ان پر بہت زیادہ اثر کیا ہے۔ اس وقت ہم سے مخاطب ہو کر کہا: دیکھو! ہوشیار، سب اپنی اپنی جگہ ادب سے بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد موسیٰؒ بن جعفرؒ کو بلانے کی اجازت دی اور حکم دیا کہ "میری مخصوص مسند پر بٹھایا جائے"۔

اس کے بعد پردہ ہٹا اور اس کے پیچھے سے اس بزرگ کا چہرہ نمایاں ہوا کہ شب بیداری اور عبادت کی وجہ سے جس کا چہرہ چاند کے مانند چمک رہا تھا، سراپا متانت ووقار تھا اور پیشانی پر سجدے کا نشان لعل کی طرح درخشاں تھا۔ بے پناہ عظمت وشوکت کے حامل، ان تمام باتوں کے باوجود انکساری کی دولت سے مالا مال۔ یہی وجہ تھی کہ معمولی جگہ بیٹھ جانا چاہتے تھے لیکن میرے والد نے کہا: نہیں! آپؒ میری مسند پر میرے پاس تشریف رکھیں۔ اس مجلس میں ملک بھر کے سربراہ اور فوج کے سپہ سالار موجود تھے۔ انھوں نے امامؒ کو اس جگہ سواری سے نہ اُترنے دیا جہاں آپ اُتر کر بیٹھنا چاہتے تھے۔ میرے والد نے آپؒ کا استقبال کیا، ادب واحترام کے ساتھ آگے بڑھ کر آپؒ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔ جب تک وہ مجلس میں رہے اس وقت تک والد نے کسی دوسرے سے کوئی گفتگو نہ کی۔

مامون کہتا ہے: اس سے قبل میں نے موسیٰؒ بن جعفرؒ کو دیکھا تھا اور نہ انھیں پہچانتا تھا بلکہ آپؒ کے نام سے بھی واقف نہ تھا اسی لیے اس سلوک سے مجھے سخت حیرت تھی اور لحظہ بہ لحظہ یہ خیال پیدا ہوتا کہ یہ کون ہیں جن کا میرے والد نے اس قدر احترام کیا ہے؟ موسیٰؒ بن جعفرؒ واپسی کے

قصد سے مجلس سے اُٹھے تو میرے والد نے دوبارہ آپؑ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ہم تینوں بھائیوں کو مخاطب کر کے کہا: اپنے چچا کی رکاب کو تھام لو تا کہ سوار ہو جائیں اور ان کی منزل تک رخصت کرنے کے لیے جاؤ۔

ناچار ہم بھی موسیٰ بن جعفرؑ کے ہمراہ چل دیے۔ درمیان راہ لوگوں کی نگاہوں سے دُور لحظہ بھر کے لیے مَیں نے موسیٰ بن جعفرؑ کو اپنی طرف متوجہ پایا۔ وہ مجھ سے رازدارانہ بات کہنا چاہتے تھے۔ میں آگے بڑھا، آپؑ نے نہایت ہی اطمینان و آہستگی سے فرمایا: اس کے بعد تمھاری نوبت ہے، جب تم اس منصب پر پہنچنا تو میرے بیٹے کے ساتھ نیکی کرنا۔

مَیں نے تعجب کے ساتھ آپؑ کی بات سنی، انھوں نے مستقبل میں میری بادشاہی کی خبر دی تھی۔ اس پیشین گوئی سے مَیں مزید حیرت میں پڑ گیا اور انھیں پہچاننے کا اور زیادہ اشتیاق بڑھ گیا۔ رات ہوگئی۔ میں والد کے پاس گیا، ان کا کمرہ خالی تھا، مَیں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا: اے امیر المومنین! یہ کون شخص تھا جس کا آپ نے اتنا زیادہ احترام کیا کہ خود پر اسے مقدم کیا اور مجلس میں اس سے نیچے بیٹھے، ہمیں رکاب تھامنے اور مشایعت و بدرقہ کا حکم دیا؟

ہارون تھوڑی دیر کے لیے فکر میں ڈوب گیا پھر سر اُٹھا کر کہنے لگا: وہ لوگوں کے امامؑ اور ان پر خدا کی حجت ہیں۔ وہ لوگوں کے درمیان رسولؐ خدا کے جانشین ہیں۔

میں نے کہا: اے امیر المومنین! یہ سب صفات تو آپ کی ہیں کہ جن کی آپ ان کی طرف نسبت دے رہے ہیں۔

ہارون نے کہا: نہیں بیٹے! میں نے یہ منصب زبردستی، طاقت کے بل پر حاصل کیا ہے لیکن لوگوں کے حقیقی امام اور ولی موسیٰ بن جعفرؑ ہیں۔ بیٹے! خدا کی قسم! ان کو رسولؐ کی جانشینی اور لوگوں پر حکومت کرنے کا سب سے زیادہ استحقاق ہے۔ لیکن کیا کروں الملک عقیم، حکومت ان چیزوں کو نہیں پہچانتی ہے۔ یہاں تک کہ تم بیٹے، کہ میرے بیٹے ہو۔ اگر تم میری مخالفت کرو گے تو مَیں تمھارا بھی سر قلم کر کے قصہ ختم کر دوں گا۔

یہ صلاحیت و شائستگی کہ جس نے ہارون رشید کو امام علیہ السلام کے ساتھ خاکساری و انکساری کے ساتھ پیش آنے پر مجبور کیا یہ کہاں سے آئی ہے؟ اس عظمت کو کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے؟ طریقے اور راستے بہت زیادہ ہیں۔ ہم یہاں القاب کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ اس زمانے میں دنیائے

اسلام نے جو القاب ساتویں امامؑ کو دیے تھے وہ بہت زیادہ ہیں لیکن ان میں سے دو عالم و صالح بہت اہم ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ ہارون کا زمانہ ثقافت و تمدن کا زمانہ تھا۔ مکہ، مدینہ، بغداد، غرناطہ، قاہرہ، طرابلس والجزائر اور اسلامی ممالک کی دیگر یونیورسٹیوں کی کارکردگی اس علمی ترقی کا واضح ثبوت ہے۔

اس علمی ماحول میں دانشوروں، علماء اور ادیبوں نے امام کو "عالم" کا لقب دیا ہے اور اس زمانے کے بڑے عالم ابوحنیفہ کہتے ہیں: میں نے موسیٰ بن جعفرؑ کو ان کے عہدِ طفلی میں دیکھا۔ ان سے کچھ علمی سوالات کیے۔ انھوں نے ان سب کے واضح جواب دیے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے سرچشمۂ ولایت سے علم حاصل کیا ہے۔ میں نے انھیں بڑے فقیہ اور عظیم متکلم پایا۔ دیگر لوگوں نے بھی انھیں لقب "صالح" دیا تھا۔

وہ شائستہ، بافضیلت اور پرہیزگار آدمی تھے۔ یہ علم و فضیلت اور عظمت و حرمت امامؑ کو عطا ہوئی تھی۔ اسی نے ہارون سے سکون و اطمینان چھین لیا تھا۔ شرپسند اس سلسلہ میں اسے اور زیادہ پریشان کرتے تھے، کہتے تھے ہارون! کیا ایک ملک میں دو خلیفہ حکومت کر سکتے ہیں؟ کیا لوگ دونوں کو لگان اور ٹیکس دے سکتے ہیں؟ انھیں پکڑ کر قید کر دیجیے، قصہ ختم کیجیے۔ ان شرپسندوں کی مراد امام موسیٰ بن جعفرؑ تھے۔ مختصر یہ کہ علم و فضیلت کی دو خصوصیتوں نے امام علیہ السلام کی طرف دو راہ کھول دیں۔ آپؑ نے ان دو خصوصیتوں نیز اپنے اعلیٰ روحی صفات کے سبب لوگوں کے دلوں اور ان کی روح کی گہرائیوں میں محبوبیت پائی۔ بافضیلت دلوں کا قبلہ قرار پائے اور اسی سے آپؑ کی طرف دوسری راہ کھلی اور ہارون رشید ایسے خلفاء آپؑ کی طرف متوجہ ہوں۔

ساتویں امام موسیٰ بن جعفرؑ کی عظیم شخصیت ہارون کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بظاہر لوگ اس کی حکومت کی عظمت و سطوت کے سامنے سر جھکاتے ہیں لیکن یہ تملق و چاپلوسی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ ان کے دل دوسری طرف جھکے ہوئے ہیں۔ اس گھر کی طرف جو ہر قسم کے زرق و برق سے دُور ہے۔ اس گھر کی طرف جس میں اولادِ رسولؐ سے ایک عمر رسیدہ روحانی موسیٰ بن جعفر زندگی بسر کرتے ہیں۔

طاقت اس کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ دیکھتا تھا کہ لوگوں کے دل امام علیہ السلام کی معنوی طاقت کے قبضہ میں ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے اور اس کے اسلاف نے اس مسئلے پر اپنی پوری طاقت

صرف کی ہے اور علماء نوازی و علم کی ترویج کے ذریعے خاندانِ علیؑ و موسیٰؑ بن جعفرؑ کی علمی سطوت کو کم کرنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اس کے برخلاف اسلامی معاشروں نے موسیٰؑ بن جعفرؑ کو عالم واعلَم کا لقب دیا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ لوگ کاظم، عبد صالح، عالم اور زین المجتہدین کے ایسے القاب کے پیرایہ میں اپنا خلوص امامؑ پر نثار کرتے ہیں۔ کیا لوگوں کے ان احساسات سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے؟ کیا یہ عظمت وقدرت ایک روز اس کے لیے مشکل نہیں کھڑے کرے گی؟

ایک مرتبہ خود امامؑ سے اپنی ذہنی تشویش کا اظہار کیا اور کہا: اے موسیٰؑ بن جعفرؑ! کیا یہ صحیح ہے کہ اسلامی معاشرہ پر دو خلیفہ حکومت کریں اور لوگ دونوں کو لگان اور ٹیکس ادا کریں؟ دو خلیفہ سے ہارون کی مراد ایک وہ خود اور دوسرے امام موسیٰؑ بن جعفرؑ تھے۔ جس روز ہارون نے امام موسیٰؑ بن جعفرؑ سے یہ بات کہی تھی اس دن خلافت کے موضوع پر طویل گفتگو ہوئی تھی اور امام علیہ السلام نے ہر موقعہ پر منطقی دلیل سے حقائق کو آشکار کیا۔ یہی منطقی استدلال ہارون کی وحشت میں اضافہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس چیز نے ہارون کو آخری فیصلہ کرنے پر اُکسایا۔

امام موسیٰؑ بن جعفرؑ میں حقائق کو صراحت کے ساتھ بیان کرنے کی بے نظیر شجاعت تھی۔ آپ بھی دیگر ائمہ دین کے مانند مقتضائے وقت کے مطابق حقیقت کو بیان کرتے تھے۔ چنانچہ اسی راہ میں آپؑ نے جان قربان کر دی ہے۔ جس شجاعت وصراحت کا واضح نمونہ ہارون کی مجلس میں ظاہر ہوا تھا اس نے آپؑ کی جان کو خطرے میں ڈال دیا۔ اس روز کی ملاقات بہ حُسن وخوبی ختم ہوگئی، لیکن ہارون کا دل خون ہوگیا اور کینہ وغصہ سے مضمحل ہوگیا۔

اس نے اپنی جیل کے بے رحم وسفاک داروغہ سندی بن شاہک کو ذکر کیا اور پھر امام علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد حکم دیا کہ سپاہی امام کو سندی بن شاہک کی تحویل میں دے دیں۔ پہلے بھی ہارون نے بعض لوگوں سے امام علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے کہا تھا، لیکن انھوں نے یہ ظلم نہیں کیا تھا۔ صرف سندی بن شاہک نے اپنی ذاتی پستی کی بنا پر اس افسوس ناک ذمہ داری کو قبول کرلیا اور زہر آلود خرما (رطب) کے ذریعے امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کو زہر دے دیا جس سے آپؑ نے ۲۵ رجب ۱۸۲ھ کو دنیا سے رحلت فرمائی۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام
کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

ہمارے آٹھویں امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام نے بروز جمعرات ۱۱ ذی قعدہ ۱۴۸ ہجری کو مدینہ میں ولادت پائی۔ آپؑ کا نام علیؑ، کنیت ابوالحسن اور مشہور لقب "رضا" ہے۔ ہمارے ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام آپؑ کے والد اور حضرت تکتم الملقب بہ نجمہ والدہ ہیں۔ پدر بزرگوار نے آپؑ کو عالمِ آلِ محمدؐ کا نام دیا ہے۔

شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ نے ابراہیم بن عباس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے کسی کو زبان سے تکلیف پہنچائی ہو یا کسی کا کلام قطع کیا ہو، اور خود بیچ میں بول دیے ہوں۔ جو آپؑ سے ہم کلام ہوتا تھا اس کے سامنے ٹیک لگا کر نہیں بیٹھتے تھے اور پاس بیٹھنے والے کے سامنے پیر نہیں پھیلاتے تھے۔ اپنے غلاموں کو برا بھلا نہیں کہتے تھے، کبھی قہقہہ نہیں لگاتے تھے بلکہ مسکراتے تھے۔

کتاب "زندگانی حضرت علی بن موسیٰ رضا" میں ابن شہر آشوب سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؑ نے خراسان میں عرفہ کے روز اپنا سارا مال راہِ خدا میں بخش دیا تھا۔ اسی کتاب میں مرقوم ہے کہ کلینیؒ نے کافی میں اور ابن شہر آشوب نے "الیسع بن حمزہ قمی" سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا، کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے جو حلال و حرام کے مسائل دریافت کر رہے تھے۔ اچانک ایک آدمی داخل ہوا، سلام کیا اور کہنے لگا: میں آپؑ کا، آپؑ کے آباء و اجداد کا محب ہوں۔ میں حج سے لوٹ رہا ہوں۔ میرا زادِ راہ کم پڑ گیا ہے۔ اب گھر تک پہنچنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ گزارش ہے کہ میرا خرچ فراہم فرمائیں اور مجھے میرے وطن پہنچا دیں۔ وہاں میرا سرمایہ ہے جو آپؑ مجھے عطا کریں گے، اسے میں وطن پہنچتے ہی آپؑ کی طرف سے صدقہ دے دوں گا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: خدا تم پر رحم کرے، بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک اس سے گفتگو کی اور پھر اُٹھ کر گھر میں گئے، کچھ دیر کے بعد دروازہ بند کیا اور دروازے کے اُوپر سے ہاتھ بڑھا کر آواز دی: خراسانی کہاں ہے؟ خراسانی نے عرض کیا: حاضر ہوں۔ فرمایا: یہ لو دو سو دینار اور انھیں اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔ انھیں بابرکت سمجھو اور چلے جاؤ تاکہ میں تمھیں نہ دیکھوں

اور تم مجھے نہ دیکھو۔

سلیمان کہتے ہیں: وہ شخص چلا گیا تو میں نے امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: قربان جاؤں آپؑ نے بہت زیادہ عطا کیا ہے تو پھر اس کے سامنے کیوں تشریف نہیں لائے؟ آپؑ نے فرمایا: تاکہ میں سوال کرنے کی خفت و ذلت کو حاجت روائی کرتے ہوئے نہ دیکھوں۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے تقوے اور عبادت کی یہ کیفیت تھی کہ اپنا تمام وقت عبادت و ذکر خدا میں گزارتے تھے۔ علم کی حد یہ تھی کہ آپؑ کو عالمِ آلِ محمدؐ کا لقب دیا گیا تھا۔ امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: میں نے اپنے والد جعفر بن محمدؐ سے سنا ہے کہ عالمِ آلِ محمدؐ تمھارے صلب میں ہے۔ اے کاش! میں انھیں دیکھتا، وہ امیر المومنین علیؑ کے ہم نام ہیں۔

امام رضا علیہ السلام کی علمی تجلیات و فروغ کی یہ حالت تھی کہ آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں اور دل آپؑ کی طرف جھک جاتے تھے۔ اس علمی فروغ کا خاص انداز تھا۔ آٹھویں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام عباسی خلیفہ مامون کے ہم عصر تھے۔ مامون بہت ہی ذہین وزیرک تھا۔ اس کا ایک مقصد خاندانِ علیؑ کو تباہ کرنا تھا اور علویوں کے درمیان آٹھویں امامؑ ہی کی نمایاں شخصیت تھی۔

علویوں کو اُمویوں کے زمانے میں بھی اذیت دی گئی اور عباسیوں کے دور میں بھی ستایا گیا۔ اُمویوں کے پاس عقل و درایت کی کمی تھی اس لیے دوسرے اُموی خلیفہ یزید بن معاویہ نے حسینؑ بن علیؑ کو دبانے کی خاطر حادثۂ کربلا کو وجود دیا۔ اس غم انگیز حادثہ کا سماجی ردعمل نفرت اَلم کے علاوہ اور کچھ نہ ہوا اور اُمویوں کی ہزاروں ماہ کی حکومت عوام کی نفرت کا مقابلہ نہ کرسکی۔ نتیجہ میں عباسیوں کے ہاتھوں اس کا تختہ اُلٹ گیا اور تاریخ کے مقبرہ میں دفن ہوگئی۔ بنی عباس تخت و حکومت پر آئے۔ انھوں نے علویوں کے خلاف بنی اُمیہ کی سیاست سے عبرت حاصل کی تھی۔ لیکن مقصد دونوں کا ایک تھا۔

عباسیوں کا مقصد بھی محدود رکھنا تھا۔ ائمہ دین کی زندگی چاہے جتنی تنگی کے ساتھ گزرے، اذیت و شکنجوں میں بسر ہوتا کہ وہ انقلاب و شورش برپا نہ کرسکیں۔ ائمہ دین اپنے علم و تقویٰ کی بنا پر لوگوں کے درمیان معزز و محترم تھے۔ یہ چیز ان کی حکومت کے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے جہاں تک ہوسکے ان کے روحانی و معنوی اثر و نفوذ کو کم کیا جائے اور علویوں کے خلاف اس طرح کام کیا جائے کہ جس سے عوام میں غم و غصہ کی لہر نہ دوڑ سکے۔ اس سے بہتر کیا چیز ہوسکتی ہے

کہ ائمہ کی محبوبیت کے عوامل ہی کو ختم کر دیا جائے اور سب سے اہم یہ کہ ان کی علمی ہیئت و سطوت کو ختم کر دیا جائے۔

اس فکر کی بنیاد پر مامون چارہ سازی میں مشغول ہوا۔ وہ اپنے زعم میں امام علیہ السلام کی علمی عظمت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے علم و دانش کو ترقی و رونق دی۔ علما اور دانشوروں کو عزت احترام کے ساتھ جمع کیا اور انھیں یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور علمی مذہبی مکاتب کے برابر میں نئے مکاتب کھول دیے، خصوصاً ان علوم کے ماہروں کو بہت اہمیت و سہولتیں دیتا تھا، خصوصاً مجمع عام میں ان کا احترام کرتا تھا۔ وہ امام رضا علیہ السلام کے مقابلے میں ایسے علماء کو جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچ سکتے تھے۔

امام رضا علیہ السلام کو نہایت قوی اور ٹھوس محاذ کے مقابلے میں جانا ہے۔ مناظرے اور مباحثہ کی مجالس منعقد ہونی چاہیں تا کہ علمی طاقتوں کے سامنے امام علیہ السلام لاجواب و عاجز ہو جائیں اور نتیجے میں آپؑ کی علمی عظمت و سطوت گھٹ جائے۔ اس غلط فکر کی بنیاد پر ماہِ شوال ۲۰۰ھ میں امام علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان بلایا گیا۔

مامون نے لوگوں کے خیالات کو حقیقت منحرف کرنے اور اپنے منصوبوں کو خفیہ طریقے سے انجام دینے کے لیے، امامؑ سے خراسان تشریف لانے، بلکہ خلافت قبول کرنے کی درخواست کی۔

تاریخ نے اس چیز کو اس طرح لکھا ہے:

مامون: اے فرزندِ رسولؐ! منصبِ خلافت کے لیے میں اپنے سے زیادہ شائستہ آپ کو سمجھتا ہوں، لہٰذا میں اسے آپ کے سپرد کر کے اس سے علیحدہ ہونا چاہتا ہوں۔

امام علی بن موسیٰ رضاؑ: اگر یہ منصب خدا نے تمھیں دیا ہے اور تمھارا حق ہے تو اس سے دست بردار ہونا اور اسے دوسرے کے سپرد کرنا صحیح نہیں ہے اور اگر یہ تمھارا حق نہیں ہے تو غیر کی چیز کو تم کسی دوسرے کو کیسے دے سکتے ہو؟

مامون: ہر صورت میں آپؑ کو یہ منصب قبول کرنا ہے۔

امام علیہ السلام: میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا اور بہ رضا و رغبت تمھاری بات کو قبول نہیں کروں گا۔

مامون: واقعاً آپؑ مائل نہیں ہیں؟

امام علیہ السلام: قطعاً مائل نہیں ہوں؟

مامون: میری ولی عہدی قبول کر لیجیے۔

امام علیہ السلام: میں اسے قبول کرنے سے بھی معذور ہوں۔

مامون: خواہ نہ خواہ یہ قبول کرنا ہی پڑے گا! اسے قبول کرنے کے لیے میں آپ کو مجبور کروں گا۔

امام علیہ السلام: تم مجھے ڈراتے ہو؟

مامون: ہاں! یہ میری دھمکی ہے! ولی عہدی قبول کر کے آپؑ زندہ رہ سکتے ہیں۔

امام علیہ السلام نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد محسوس کیا کہ اب چارۂ کار نہیں ہے۔ مامون چھوڑ نہیں رہا ہے۔ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول اور اپنے منصب و مقام کو محفوظ رکھنے کے لیے میرے وجود سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ یہ شخص وہی ہے جس نے خلافت حاصل کرنے کے چکر میں اپنے بھائی امین کو بھی قتل کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کوئی بھی کام کر سکتا ہے، خواہ میرا قتل ہی ہو۔ اب حالات نازک اور خطرناک ہیں۔ مجبوراً قبول کرتا ہوں۔

امام علیہ السلام نے سر بلند کیا اور فرمایا: جب بات جبر اور تہدید تک پہنچ گئی ہے تو میں بھی مجبوراً قبول کرتا ہوں لیکن تمھیں بھی میری کچھ شرطیں قبول کرنا پڑیں گی۔

مامون نے اپنا منصوبہ کامیاب ہوتے دیکھا تو مسکرایا، اس کا بگڑا ہوا چہرہ کھل گیا اور کہنے لگا: اپنی شرائط بیان کیجیے بسر و چشم قبول کروں گا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: میں ان شرائط کے ساتھ قبول کرتا ہوں کہ میں سیاسی اور حکومتی اُمور میں دخل نہیں دوں گا۔ سیاسی اُمور کے علاوہ میں تمھاری ولی عہدی قبول کر سکتا ہوں، میں کسی حاکم کو معزول کروں گا اور نہ کسی کو حاکم مقرر کروں گا، کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گا۔

مامون نے ان شرائط کو قبول کر لیا۔ اس طرح امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے بادلِ نخواستہ طوعاً و کرہاً ولی عہدی قبول کی لیکن اس کے قبول کرنے میں آپؑ نے اسلامی معاشرہ کا کوئی فائدہ نہ دیکھا اور یہ بہتر نہ سمجھا کہ حکومت کے اُمور میں وارد ہو کر ان کے برے اعمال پر پردہ پوشی کا ذریعہ بنیں۔

آپؑ امام تھے۔ آپؑ کی معنویت و شخصیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ ظالموں اور بیدادگروں کے ساتھ تعاون کریں۔ علی بن موسیٰ رضا مذہبی نقطۂ نظر سے اپنے دادا حضرت علی

بن ابی طالب علیہ السلام جیسی حکومت کے طرفدار ہیں۔ ایسی حکومت کے طرفدار جو کہ صرف عدل کو دیکھتی ہے فقط مظلوموں اور ستم دیدہ لوگوں کے احقاق کے لیے قدم اُٹھاتی ہے۔ ایسی حکومت کی رکنیت کیونکر قبول کر سکتے ہیں کہ جس کی بنیاد عدل پر اُستوار نہ ہو؟

اگر آپ اس منصب کو قبول کر لیتے ہیں اور اس کے سیاسی اُمور کی انجام دہی کی ذمہ داری بھی قبول کر لیتے ہیں اور سرکاری طور پر کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ ایسی حکومت کے کارناموں سے امام خوش ہیں اور امام حکومت کے ہاتھ میں ایسا ہتھکنڈہ نہیں دینا چاہتے ہیں اس بنا پر مصلحت اس منصب کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔

لیکن یہاں ایک نکتہ ہے جو امام علیہ السلام کی باریک بین نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر امام علیہ السلام سختی سے انکار کرتے رہتے اور مامون کی پیشکش کو قبول نہ کرتے تو پھر ان فرائض کو انجام نہیں دے سکتا تھے جو امامت کے عنوان سے خدا نے آپؑ کے سپرد کیے تھے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اگر مامون کی پیشکش کو رد کر دیا جائے تو اس کا ردعمل کم از کم یہ ہوگا کہ امام علیہ السلام پر سخت طریقے سے نظر رکھی جائے گی اور اس راہ میں آپؑ جان سے ہاتھ دھوئیں گے اور اس طرح امامت کے ان فرائض کو پورا نہیں کر سکیں گے جو بطورِ خاص آپؑ کے ذمہ ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ مامون کے عہد میں علم و دانش کو کافی فروغ ملا تھا اور مامون خاندانِ علیؑ کی علمی عظمت و حرمت گھٹانے کے لیے علما اور دانشوروں کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ ان کی علمی صلاحیتوں کے نکھار کے لیے اسباب فراہم کرتا تھا تاکہ اس طرح علی بن موسیٰ رضا کی علمی عظمت کو گھٹا سکے۔ درحقیقت دین کی جگہ علم کو رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ خاندانِ رسولؐ کے مذہبی شکوہ وجلال کو علم کو فروغ دے کر ختم کر دے۔ اس خاص موقع پر امام علیہ السلام کا فریضہ یہ تھا کہ اپنی مسلسل فعالیت سے دین کی علمی ترقی کو تمام علمی مکاتب پر آشکار کریں اور معاشرے کے گوش گزار کر دیں کہ انسان کی علمی صلاحیت خواہ کتنی ہی آگے بڑھ جائے پھر بھی وہ مذہب کے پایہ تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔ آپ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلام کے علمی معارف ـــــ کہ جن کا منبع وحی ہے ـــــ ہمیشہ تمام علمی مکاتب پر حاکم رہیں گے۔ بہت بڑی ذمہ داری تھی جو اس زمانے کے سماج کے مخصوص حالات کی وجہ سے امامؑ کے دوش پر آ گئی تھی۔

آپؑ سوچتے تھے کہ میں ولی عہدی کو قبول تو کر رہا ہوں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں

ہر قسم کے سیاسی اور حکومتی اُمور میں قطعی دخل نہیں دوں گا۔ اس طرح نہ ان کے اعمال سے میرا راضی ہونا ثابت ہوگا اور ولی عہدی سے استفادہ کرتے ہوئے آزادی کے ساتھ اپنے خاص فریضہ ـــــ جو کہ اسلام کے علمی مکتب کا تعارف ہے ـــــ کو بھی اچھی طرح انجام دیا جا سکے گا۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے ولی عہدی کے منصب کو اس کے سیاسی فرائض کے بغیر قبول کرلیا اور ضرورت و مصلحت دونوں کو بہترین طریقہ سے جمع کیا اور پھر اپنی حیثیت و منصب سے استفادہ کرتے ہوئے اسلام کے علمی مکتب کو پہچنوانے میں مشغول ہوئے اور ان بحرانی و نازک حالات میں آپؑ نے اس عہد کے بڑے علماء کی منعقد کردہ علمی اور مناظرہ کی مجالس میں شرکت کر کے اسلام کی علمی منطق اور اس کے شکوہ وجلال کو نمایاں کرتے تھے۔

مامون کا مقصد یہ تھا کہ امامؑ خراسان جائیں اور وہاں علماء اور دانشوروں کا مقابلہ کریں تاکہ امامؑ کا علمی بھرم ٹوٹ جائے۔

امام علیہ السلام کا بھی فریضہ تھا کہ آپؑ بحث و مناظرہ کی مجالس میں شرکت کر کے مذہب کے مکتب کی بالادستی کو واضح کریں۔ اس فکر کی بنیاد پر امام علیہ السلام خراسان تشریف لے گئے یہاں تک ولی عہدی کو بھی قبول کرلیا اور مامون نے پہلے سے تیار کردہ اپنے منصوبے کے تحت بڑی مجالس کا انعقاد کیا اور امام علیہ السلام کو اپنے وقت کے بڑے علما اور دانشوروں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ان مجالس کا حال تاریخ کی زبانی سنیے۔

کمالِ صراحت کے ساتھ تاریخ بیان کرتی ہے:

بحث و مناظرہ کی تمام مجالس میں امام علیہ السلام منطق و استدلال کی صلاحیت کے ذریعے سب پر کامیاب ہوجاتے تھے اور کبھی امام علیہ السلام کسی مسئلے میں لاجواب نہیں ہوتے۔

ابوصلت ہروی کہتے ہیں: میں نے امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے بڑا عالم نہیں دیکھا اور آپؑ کے بارے میں تمام دانشوروں کا یہی نظریہ ہے۔ مزید کہتے ہیں: مامون مختلف ادیان کے علماء، فقہا اور متکلمین کو جمع کرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ آپؑ سے علمی و مذہبی، مختلف مسائل پر بحث کریں۔ ایسا ہی ہوتا اور امامؑ ان سب پر غالب آجاتے تھے اور تمام دانشور آپؑ کی فضیلت و برتری اور اپنی عاجزی کا اعتراف کرتے تھے۔

مامون اس طرح تو کامیاب نہ ہوسکا۔ وہ امام علیہ السلام کی علمی عظمت نہ گھٹا سکا بلکہ ان مجالس

میں تمام دانشوروں پر امام علیہ السلام کی کامیابی کے موضوع پر عام محفل میں بھی تبادلہ خیال ہونے لگا اور امام علیہ السلام کی ستائش ہونے لگی۔ نتیجے میں روز بروز آپؑ کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔

کیا کیا جائے؟ ___ اس طاقت کو کیسے فنا کیا جائے؟

وہ امام علیہ السلام کی شخصیت کو نہ گرا سکا۔ اس نے خود امام علیہ السلام کو راستہ سے ہٹانے کا ارادہ کیا۔ یہاں اس کی کھوپڑی میں امام علیہ السلام کے قتل کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ آخر کار اس نے اپنے ارادے کو پورا کیا اور امام علیہ السلام کو زہر دے دیا اور مشہور قول کے مطابق امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام نے ۵۵ سال کی عمر میں ماہِ صفر ۲۰۳ھ میں شہادت پائی اور عدالت و انصاف پر قربان ہونے والوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

۲

ہمارے بارہ ائمہ میں سے جواد الائمہ حضرت امام محمد تقی علیہ السلام ہمارے نویں امامؑ ہیں۔ آپؑ کے والد امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام ہیں۔ والدہ سبیکہؓ ہیں جن کا تعلق رسولؐ کی کنیز ماریہ قبطیہ کے خاندان سے ہے۔

مشہور کے مطابق ابنِ جوزی نے آپؑ کا سنہ ولادت ۱۹۵ھ اور سنہ وفات حسرت آیات ۲۲۰ھ میں لکھا ہے۔ واضح ہے کہ وفات کے وقت آپؑ کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ابھی آٹھ سال کے نہیں ہوئے تھے کہ والد، حضرت علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اسی سال آپؑ منصب امامت پر فائز ہوئے۔ یہ بہت ہی حیرت انگیز بات تھی۔ شیعہ عجب کشمکش میں تھے۔ وہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ علیؑ بن موسیٰ رضاؑ کے بعد ان کا معنوی رہبر اور امام کون ہے؟ کوفہ بھی اس حیرت و سراسیمگی میں مبتلا تھا۔

کوفہ شیعوں کا مرکز تھا۔ خاندانِ علیؑ کے چاہنے والے زیادہ تر کوفہ میں زندگی گزارتے تھے۔ کوفہ کے شیعوں نے آٹھویں امامؑ کی وفات پر عبدالرحمٰن بن حجاج کے گھر مجلس عزا برپا کی۔ اس مجلس میں، یونس بن عبدالرحمٰن نے کہا: اب جب کہ ہمارا رہبر اور امام دنیا سے اُٹھ گیا ہے تو آپؑ کے فرزند کے بالغ ہونے تک ہمارا امام و پیشوا کون ہے؟ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ منصب الٰہی، امامت میں سن و سال کا دخل ہے جبکہ حقیقت اس کے ماسوا ہے۔ امامت کا معیار صرف لیاقت و صلاحیت ہے۔ شیعوں کے نقطۂ نظر سے امامت کے اصلی عنصر علم و تقویٰ ہے۔ سن و سال معیار نہیں ہے۔ خدا اس شخص کو امام بناتا ہے جو سب سے بڑا عالم و متقی ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ بچہ ہی ہو۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے متعلق ایک تاریخی داستان نقل کی جائے۔

عباسی خلیفہ خود کو علویوں کا محب وطرفدار بتاتا تھا۔ ایک روز اس کی مجلس میں حضرت علی علیہ السلام کی امامت اور آپؑ کے فضائل و مکارم کے بارے میں بحث چھڑ گئی۔ بعض کہہ رہے تھے کہ شیعہ آپؑ کی ایمان کی طرف سبقت کو آپؑ کے فضائل میں شمار کرتے ہیں۔ جبکہ حضرت علی علیہ السلام اس وقت بچہ تھے جبکہ ایمان لائے تھے۔ واضح رہے کہ دس سالہ بچے کے ایمان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی ہے اور اس عمر کے ایمان کو فضیلت و برتری کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس پوچ و ہلکی و پھلکی منطق

اور بے بنیاد بات سے مامون کو سخت تعجب ہوا اور کہنے لگا: میں تم سے ایک سوال پوچھتا ہوں اور وہ یہ کہ امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ رسولؐ خدا کی پیشکش سے پہلے خود ہی ایمان لے آئے تھے یا رسولؐ کی پیشکش کے بعد لائے تھے؟

سب نے یک زبان ہو کر کہا: رسولؐ خدا کی پیشکش کے بعد ایمان لائے تھے۔ رسولؐ نے آپؑ کے سامنے ایمان و اسلام پیش کیا۔ حضرت علی علیہ السلام نے غور وفکر کے بعد اسلام قبول کر لیا اور آپؐ پر ایمان لے آئے۔

مامون نے کہا: اگر دس سالہ بچے کے ایمان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ رسولؐ خدا نے اس بچپنے کے زمانے میں حضرت علی علیہ السلام سے ایمان لانے کے لیے کیوں فرمایا۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ سن و سال معیار نہیں ہے بلکہ سن و سال کو چھوڑ کر فضیلت و برتری کو معیار سمجھنا چاہیے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کا ایمان بھی ایک فضیلت و برتری ہے۔

یونس بن عبدالرحمٰن جو کہ اس منطق سے بے خبر تھے اور مذہب کی حقیقت کو صحیح طریقے سے سمجھ سکے تھے۔ کہا: امام محمد تقی علیہ السلام کے بالغ ہونے تک ہمارا امامؑ کون ہے؟

منصب امامت کی پوری معرفت رکھنے والے ایک پکے شیعہ نے یونس بن عبدالرحمٰن کی یہ بات سنتے ہی غضب ناک ہو کر کہا: اگر خدا نے ہمارے امامؑ کے بیٹے، حضرت جواد الائمہ کو منصب امامت پر فائز کیا ہے تو پھر سن و سال کی بحث فضول ہے اور اگر ان کی امامت پر تائید و رضائے خدا نہیں ہے تو بھی ہمارے مسلک کو بچپنا و ضعیفی متاثر نہیں کر سکتی لیکن جس کے بارے میں ہم یہ جانتے ہیں کہ خدا نے انھیں امامت کے منصب پر فائز کیا ہے اس کے سن و سال سے بحث فضول ہے۔

امام علیہ السلام کے اندر قیادت و رہبری کی لیاقت و شائستگی ہونا چاہیے، عالم و متقی ہونا چاہیے تاکہ علم کی روشنی میں اُمت مفاد و مصالح کو معین کر سکے اور تقویٰ کی روشنی میں ان کو عملی جامہ پہنا سکے۔

اُمت کی قیادت و زمام داری اتنا عظیم اور ذمہ دارانہ منصب ہے کہ ہر شخص میں اس کی اہلیت نہیں ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے اُمت کے امام اور لوگوں کے پیشوا میں دو اصلی شرطیں ہونی چاہییں: ① ایک علم ② دوسری تقویٰ۔

اُمت کے امام کو اس علم کا پیکر ہونا چاہیے جو ہر لغزش و خطا سے محفوظ ہو، کہ کبھی رہبری کی لغزش عوام کو نقصان پہنچا دیتی ہے۔ رہبر کو ایسے علم و نظر کا مالک ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعے وہ

معاشرہ کے تمام مصالح سمجھ سکے اور زمام دار کے لیے صرف معاشرہ کی تمام بھلائیوں کو سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ علم کے علاوہ اس تقویٰ کی بھی ضرورت ہے جو اسے خواہشات اور ہوس سے محفوظ رکھ سکے اور عمل میں لغزشوں سے بچائے۔ جب معاشرہ کے مفادات کو تشخیص دے چکے تو پھر ان مفادات کے حصول میں ان تھک کوشش کرے، خواہ یہ کوشش اس کے مزاج اور ہوس کے خلاف ہی ہو۔ امام کو خواہشِ نفس پر حاکم ہونا چاہیے اس کا تابع نہیں۔

یہیں سے عصمت کی بحث شروع ہوتی ہے۔ اسلام کہتا ہے: امام کو معصوم ہونا چاہیے، خطا سے معصوم، لغزش سے معصوم اور ہوس رانی سے معصوم ہو۔ امام و زمام دار اسی عصمت کی روشنی میں خود کو معاشرے پر قربان کرسکتا ہے اور اس کے مفاد پر اپنی خواہشوں سے چشم پوشی کرسکتا ہے۔

چونکہ علم تقویٰ اسلامی زمام داری کے دو بنیادی اور اصلی عنصر ہیں اس لیے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام علیہ السلام کے علم و دانش کا منبع وحی ہے۔ اس کو علمِ لدنی ہوتا ہے کہ یہی علم اسے ہر خطا و لغزش سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگرچہ اس وقت امام محمد تقی علیہ السلام کی عمر صرف آٹھ سال تھی لیکن امامت کی تمام شرائط آپؑ میں جمع تھیں اور علم و تقویٰ کے دونوں عنصر کے حامل تھے۔ آٹھ سال کے تھے لیکن عجوبہ سمجھے جاتے تھے۔ اس بات کو مامون نے کہا ہے اور مامون کے قول کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔

مامون سیاسی مصلحت کی بنا پر یا حقیقت میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے قتل پر پشیمان ہوگیا تھا۔ وہ اپنے اس غیر انسانی عمل کے تدارک میں امام محمد تقی علیہ السلام سے اپنی بیٹی اُم الفضل کا نکاح کرنا چاہتا تھا، لیکن دربارِ خلافت سے منسلک افراد اور بنی عباس کے سربرآوردہ لوگوں کو جب یہ خبر ملی تو وہ بہت پریشان ہوئے کہ وہ بنی عباس کی خلافت کے طفیل میں اس مقام تک پہنچے تھے، انھیں یہ خوف لاحق ہوا کہ اس رشتہ داری سے خلافت بنی عباس کے ہاتھوں سے نکل کر علویوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔ نتیجہ میں تسلط رہے گا اور نہ دولت ہاتھ آئے گی۔ سخت مرحلہ تھا، حسد کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور غیبت و نمامی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ یکے بعد دیگرے مامون کے پاس پہنچتے اور اسے اس کام کے عواقب سے ڈراتے تھے۔ گویا ایک بڑی مجلس میں سب نے ایک ساتھ بُرائی شروع کی اور مامون کی نظروں میں امام محمد تقی علیہ السلام کی عظمت کو گھٹانے کی پوری کوشش کی اور اس بات کی امامؑ کو، فاقدِ صلاحیت بچہ ثابت کرنے کی سعی کی۔

بڑا جوش وخروش بپا کیا لیکن جب ان کے شدید جوش وخروش کی لہر مدہم پڑ گئی تو مامون نے ان کے جواب میں ایک بات کہی: ان کا امتحان لینا آسان کام ہے۔ امتحان لے لیا جائے۔ ان کے متعلق جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے یا تم جاننا نہیں چاہتے۔ یہ علوی جوان تم سب سے بلند و برتر ہے۔ ان کا حسب ونسب بالترتیب تم سب کے حسب ونسب سے بلند ہے اور کیا تمھاری نظر میں ان سے بڑا کوئی عالم ہے؟

آپؑ اس کم سنی میں علمی میدان میں اس زمانے کے بڑے بڑے علما پر سبقت لے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگوں کے امامؑ ہوں گے، کیونکہ آپؑ منبع علم سے سیراب ہوئے ہیں اور خاندانِ وحی والہام میں پرورش پائی ہے۔

آخر کار نوبت امتحان کی پہنچی۔ واضح رہے مامون کا زمانہ علم و دانش کے ارتقا کا عہد تھا۔ اسلامی علوم کے علاوہ مامون نے یہ حکم دیا تھا کہ یونان کی علمی وفلسفی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا جائے، اس لیے عہد مامون میں علم و دانش اور فلسفہ کا بڑا چرچا تھا۔ مامون اپنے ذاتی ذوق، اس خاص سیاست کی وجہ سے علما کی بہت عزت کرتا تھا جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ وہ علم پرور اور اسے وسعت دینے والا آدمی تھا اس لیے اس کا دربارِ خلافت بڑے بڑے علما سے پُر تھا۔ ان دانشوروں میں یحییٰ بن اکثم سب سے بڑا عالم تھا۔

یحییٰ، قاضی القضاۃ تھا اور اس نے اسلامی معاشرے کے اس عظیم منصب کو اپنے بے پناہ علم کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ وہ علم خصوصاً حقوق اور اسلامی فقہ کے میدان کا بڑا کھلاڑی تھا۔ اگرچہ فقہ میں وہ مہارت رکھتا تھا لیکن دوسرے علوم میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ چنانچہ فقہ وقانون میں مہارت ہی کی بنا پر وہ قاضی القضاۃ کے منصب پر پہنچا تھا۔ لوگوں نے طے کیا کہ امامؑ کا مقابلہ اسی سے کرایا جائے اور موضوعِ بحث بھی کوئی فقہی مسئلہ ہونا چاہیے۔

امتحان کا دن اور تاریخ معین کر دی گئی۔ اس جلسہ میں تمام بڑے بڑے علما ملک کے سر برآوردہ افراد اور بنی عباس کے لوگوں کو بلایا گیا۔ جلسہ منعقد ہوا۔ اپنے زمانے کا بڑا عالم، قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم سن رسیدہ کی صورت میں بڑے ہی رُعب وداب کے ساتھ جلسہ میں پہنچا۔ اسی وقت امام محمد تقی علیہ السلام، جو کہ اُس وقت نوجوان و کمسن تھے، جلسہ میں پہنچے۔ مامون نے آپؑ کا بہت احترام کیا۔ آپؑ کو صدر مجلس میں یحییٰ بن اکثم سے اُوپر اپنے پاس بٹھایا۔

کچھ تکلفات کے بعد یحییٰ بن اکثم نے سوال کرنے کی اجازت چاہی، مامون نے اسے اجازت دی۔ یحییٰ بن اکثم نے امام محمد تقی علیہ السلام کی طرف رُخ کر کے کہا:

جس شخص نے حالتِ احرام میں شکار کیا ہے، اس کا کیا فریضہ ہے؟

قارئین محترم سے اپنی بات قریب کرنے کے لیے ہم اس سوال کی وضاحت کرتے ہیں۔ "احرام" حج کی اصطلاحوں میں سے ایک ہے۔ حج کرنے والے کو چاہیے کہ وہ مکہ میں داخل ہونے سے قبل میقات سے احرام باندھے۔ احرام باندھنے والے کو محرم کہتے ہیں۔ احرام باندھنے کے لیے تین چیزیں واجب ہیں اور محرم کے لیے ۲۴ چیزیں حرام ہیں۔ جیسا کہ تمام اسلامی عبادتوں میں نیت واجب ہے اسی طرح احرام میں بھی واجب ہے۔

۲ احرام کا لباس پہننا، یہ دو کپڑے ہوتے ہیں، ایک کو کاندھوں پر ڈال دیتے ہیں اور دوسرے کو لنگی کی طرح باندھ لیتے ہیں۔ ۳ لبیک کہنا ہے حالتِ احرام میں محرم پر چوبیس چیزیں حرام ہوجاتی ہیں۔ انھی میں سے ایک حرمِ خدا میں شکار کرنا بھی ہے۔ یہاں تک حیوانات کو بھی نہیں مار سکتے۔ حیرت ہے کہ گھاس بھی نہیں اُکھاڑ سکتے۔ درختوں کا اُکھاڑنا بھی حرام ہے۔ حج کرنے والے کو چاہیے کہ وہ حیوانات کو صدمہ نہ پہنچائے اور ان کا شکار نہ کرے۔

یحییٰ بن اکثم نے سوال کیا: اگر کوئی شخص حالتِ احرام میں شکار کرلے تو اس کا فرض کیا ہے؟ سوال کر کے خاموش ہوگیا اور امامؑ کے جواب کا منتظر رہا۔ جلسہ پر ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سبھی اس مناظرہ کا نتیجہ برآمد ہونے کے منتظر تھے۔ اس مناظرہ کے نتیجے میں ایک طرف یحییٰ ابن اکثم جیسا ضعیف العمر و تجربہ کار تھا اور دوسری طرف کمسن نوجوان جلوہ افروز تھا۔ بڑا ہی دلچسپ و حیرت انگیز منظر تھا۔

آخرکار امام علیہ السلام نے لب کشائی کی اور جواب دینے سے قبل سوال کو واضح کرنے کے لیے فرمایا: اس سوال سے آپؑ کی مراد کیا ہے؟ کیا شکار کرنے والا مُحل تھا یا مُحرم؟ عالم تھا یا جاہل؟ جان بوجھ کر اس نے شکار کیا تھا یا غلطی سے ہوگیا تھا؟ مُحرم آزاد تھا یا غلام؟ کم سن تھا یا سن رسیدہ؟ اس نے پہلی بار شکار کیا تھا یا شکار کھیلنا اس کا شغل تھا؟ جس حیوان کو مارا ہے وہ بچہ ہے یا بڑا؟ مُحرم اس فعل پر پشیمان تھا یا نہیں؟ دن میں شکار کیا تھا یا رات میں؟ حج کا احرام تھا یا عمرہ کا؟

ایک سوال سے اتنے استنباط شدہ سوالا سن کر یحییٰ بن اکثم مبہوت گیا، جھکا لیا،

چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امامؑ کو کیا جواب دے؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا ایک چھوٹا سا سوال امامؑ کی دُوربین نظروں سے ایک ضخیم کتاب بن جائے گا۔ ایسی کتاب جس کے مطالعہ سے بھی وہ قاصر ہے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شکار کے ایک معمولی سے سوال کی اتنی شاخیں نکل آئیں گی۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ پیشانی سے شرمندگی کا پسینہ بہنے لگا۔ حیرت وحشت کے عالم میں زمین سے نظر نہیں اُٹھا سکتا تھا!!

بہت حساس و نازک موقع تھا۔ جلسہ حیرت میں ڈوب گیا، سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے: یہ بڑے میاں، کہ جنھیں ہم قاضی القضاۃ کہتے ہیں، کیوں خاموش ہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟

آخرکار مامون نے جلسہ کی اس خطرناک کیفیت کو بدلنے کے لیے اپنے چچازاد بھائیوں کی طرف رُخ کر کے کہا: تم نے اسے دیکھ لیا اور پہچان لیا؟ بالکل! یہ فرزند رضاؑ ہیں۔ یہ جواد الائمہ ہیں، میں نے انھیں اپنی دامادی کے لیے چُن لیا ہے۔

اس جلسہ میں خطبۂ نکاح پڑھا گیا اور اُم فضل آپؑ کے حبالۂ نکاح میں آ گئی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد مامون نے امام علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپؑ ان فروعات کے جواب بتا دیجیے۔

امام علیہ السلام نے سب کے جواب بیان فرمائے۔ دن گزرتے گئے۔ مامون کا زمانہ ختم ہو گیا اور معتصم خلیفہ بن گیا۔ مامون کے زمانے میں معتصم امامؑ سے اُم فضل کے نکاح کا مخالف تھا اور جن لوگوں نے مامون کو اس کام سے منع کیا تھا، ان میں ایک معتصم بھی تھا۔ مامون اپنے کیفر کردار کو پہنچا اور معتصم خلیفہ بن بیٹھا۔ اس کے گذشتہ افکار دوبارہ زندہ ہو گئے۔ نتیجے میں اس نے امام علیہ السلام کو زہر دینے کا ارادہ کیا تاکہ بزعمِ خود ایک خطرہ کا سدباب کر سکے۔ مختصر یہ کہ اس نے اپنے غیر انسانی ارادے کو عملی جامہ پہنایا اور امام علیہ السلام کو زہر دے دیا۔

حضرت امام علی نقی علیہ السلام
کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

آپ کا نام علیؑ، کنیت ابوالحسن اور القاب نجیب، مرتضیٰ، عالم، فقیہ، ناصح، امین، مؤتمن، طیب، ابن الرضا، متوکل اور مشہور ترین لقب نقی و ہادی ہیں۔

ہمارے بارہ ائمہ میں سے نویں امام محمد تقی علیہ السلام آپؑ کے والد اور والدہ "سمانہ" ہیں جو کہ بڑی عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ چنانچہ خود امام علیہ السلام نے اپنی والدہ کے بارے میں فرمایا ہے:

"وہ میرے حق سے واقف ہیں، جنتی عورت ہیں، شیطان ان سے دُور ہے، خدا ان کا حافظ و نگہبان ہے"۔

مؤرخین نے امام علیہ السلام کا حلیہ اس طرح لکھا ہے: چہرہ دل کشا و کشادہ، رخسار اُبھرے ہوئے، رنگ سفید مائل بہ سرخی، اَبرو کشادہ، آنکھیں بڑی بڑی، قد میانہ، نہ بڑا نہ چھوٹا، مختصر یہ کہ حسین تھے۔

کافی، اعلام الوریٰ، مناقب، ارشاد مفید اور دیگر معتبر کتابوں کی روایت کے مطابق آپؑ نے بروز منگل ۱۵ ذی الحجہ ۲۱۲ ہجری کو ولادت پائی۔ آٹھ سال کے نہیں ہوئے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ سات سال گیارہ ماہ اور پندرہ روز کے تھے کہ منصب امامت پر فائز ہوئے اور اُمت کے اُمور کی زمام ہاتھ میں لی۔

یہاں بھی ہم صلاحیت و شائستگی کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور علم و تقویٰ کا موضوع چھیڑتے ہیں۔ علم و تقویٰ امامت کے دو بنیادی عنصر ہیں کہ اس میں سن و سال کا دخل نہیں ہے۔

امام علی نقی علیہ السلام کے اندر یہ دونوں عنصر بدرجہ اتم موجود تھے اور علم و تقویٰ ہی سے آپؑ نے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور ان میں بڑی محبوبیت پیدا کی تھی۔ اس عظمت کو دشمن کی زبان سے سنیے: "امام جماعت حرمین، بریحہ نے متوکل کو ایک خط لکھا اور اس میں یہ تحریر کیا "اگر مکہ و مدینہ پر اپنی حکومت برقرار رہنا چاہتے ہو تو اس سرزمین سے علیؑ بن محمدؑ کو ہٹا دو کیونکہ اہلِ مکہ و مدینہ ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں"۔

متوکل اگرچہ طاقت کی بنا پر معاشرہ پر حکومت کرتا تھا لیکن جہاں طاقت کام نہیں کرتی وہاں

حکومت بھی نہیں ہوتی۔ اور لوگوں کے قلوب کو طاقت کے ذریعے اسیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ صرف فضیلت و شائستگی سے دلوں پر حکومت کی جاسکتی ہے۔ اسی عظمت و محبوبیت نے امامؑ کے لیے خطرہ پیدا کر دیا اور متوکل چارہ سازی کے لیے مجبور ہوا۔

جعفر متوکل عباسی، بنی عباس کے بدترین و رذیل ترین خلفاء میں سے ایک تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی غیبی خبروں میں اسے بنی عباس کا کٹر کافر قرار دیا ہے۔ خاندانِ علیؑ سے اسے سخت دشمنی تھی، یہاں تک کہ وہ اہلِ بیتؑ کے طاہر و مطہر مزاروں پر بھی رحم نہیں کرتا تھا۔ اسی نے شہداء کربلا کے مزاروں اور قبرِ حسینؑ پر ہل چلانے اور وہاں کھیتی کرنے کا حکم دیا تھا کہ وہاں کوئی اثر باقی نہ رہے۔

ایک طرف تو اس کا ذہن اور خیالات ایسے تھے دوسری طرف مکہ، مدینہ سے اس کے کارندے اسے خط لکھتے تھے جو کہ بڑے خطرے کی حکایت کرتے تھے، ایسے خطرے کی، امام علی نقی علیہ السلام کی محبوب و مطاع شخصیت کی طرف سے خطرے کو بیان کرتے تھے۔

متوکل نے آپؑ کی نگرانی کا منصوبہ بنایا اور اسے ریا کے پردے میں پوشیدہ رکھا۔ امام علی نقی علیہ السلام کو نہایت ہی محبت آمیز خط لکھا اور آپؑ کو مرکزِ حکومت سامرہ آنے اور وہیں قیام پذیر ہونے کی دعوت دی باوجودیکہ یہ خط چاپلوسی، محبت اور نرمی سے پُر تھا لیکن امام علیہ السلام اس سے کہیں زیادہ دُوراندیش تھے۔ آپؑ نے الفاظ کے اندر پنہاں زبردستی کو سمجھ لیا۔

مجبوراً امام علیہ السلام متوکل کے گماشتہ یحییٰ بن ہرثمہ کے ساتھ سامرہ کی سمت روانہ ہوئے۔ متوکل نے یحییٰ بن ہرثمہ کو مدینہ بھیجا تھا کہ جیسے بھی ہو سکے امامؑ کو سفر کے لیے تیار کرے اور ہر جگہ آپؑ پر نظر رکھے لیکن لوگوں کے ردعمل کو مدنظر رکھتے ہوئے ادب و احترام کے ساتھ رکھے۔ متوکل عام ردعمل کے خوف سے آپؑ کو اس سفر پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اس لیے اس نے ریا و مکر کے پردے میں چھپ کر امام علیہ السلام کو جلاوطن کیا۔ یہی تدبیر ضروری بھی تھی کیونکہ اگر مدینہ والوں کو امامؑ کی شان میں چھوٹی سی بے حرمتی کا بھی احساس ہو جاتا تو اس کا شدید ردعمل ہوتا۔

ہم جانتے ہیں کہ یحییٰ بن ہرثمہ کے مدینہ پہنچتے ہی شہر منقلب ہو گیا تھا۔ جیسے ہی لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ متوکل نے امام علیہ السلام کو لے جانے کے لیے یحییٰ کو بھیجا ہے تو ان میں ہیجان پیدا ہو گیا۔

بڑے مظاہرے کیے یہاں تک کہ یحییٰ نے لوگوں کے سامنے یہ قسم کھائی کہ مجھے امامؑ کو اذیت و آزار کے لیے نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ اس بات پر مامور کیا گیا ہے کہ جب آپؑ سامرا کے سفر کے لیے روانہ ہوں تو میں آپؑ کی خدمت میں حاضر رہوں۔

امام علیہ السلام سامرا پہنچے تو وہاں آپؑ پر کڑی نظر رکھی گئی۔ ائمہ دین ہر زمانے میں حکومت کے مقابلے میں رہے ہیں۔ ہر خلیفہ خود کو رسولؐ کا جانشین سمجھتا تھا اور دین و اسلام کے نام پر لوگوں پر حکومت کرتا تھا۔ لیکن یہ صرف ریاکاری تھی۔ اُموی اور عباسی خلفاء ایسے ظالم تھے کہ جو فریضۂ الٰہی سمجھ کر حکومت کرتے تھے اور نہ پسماندہ طبقے کی حمایت کے لیے بلکہ وہ اپنی ہوس رانی اور خواہشِ نفس کو پورا کرنے کے لیے حکومت کرتے تھے اور اپنی اس حکومت کو بچانے کے لیے، جو کہ ان کی غیر انسانی خواہشوں کو پورا کرنے کا ذریعہ تھی، کسی بھی قسم کے ظلم وستم کو روا رکھنے میں خوف محسوس نہیں کرتے تھے۔ معمولی سے اندیشہ پر مارتے اور قتل کر دیتے تھے، جس سے ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرتے، اس کو فنا کر دیتے تھے۔ اُموی اور عباسی خلفاء کی یہی روش تھی اور یہ تھا اسلامی معاشرہ میں ایک قطب۔

دوسرا قطب بھی تھا۔ ائمۂ دین نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے ان کی طمع پسندی کے سامنے عظیم رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ شہید ہوتے، قید میں جاتے، ہتھکڑی اور بیڑی کا بار اُٹھاتے تھے، لیکن اس عظیم فریضہ کی انجام دہی سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے سارے ائمہ یا کھلم کھلا یا زہر کے ذریعے خفیہ طور پر شہید کیے گئے ہیں اور اپنی زیادہ تر عمر عباسی ظالموں کے قید خانوں اور ان ستم گروں کی زنجیروں کے بارے میں بسر کی ہے۔ یہ تھی خلفاء کی روش اور یہ تھی ان کے مقابل میں ائمہؑ کی روش۔

یہ دونوں روشیں ایک دوسرے کے بالمقابل چلتی رہی یہاں تک کہ امام علی نقی علیہ السلام اور متوکل کی نوبت آتی ہے اور متوکل، امام علیہ السلام کو مدینہ سے سامرا لے جاتا ہے تاکہ نزدیک سے آپؑ پر نظر رکھ سکے۔ چنانچہ کبھی کبھی متوکل کے ملازم آپؑ کے گھر میں داخل ہوتے، تلاشی لیتے، تاکہ متوکل کے خلاف کی جانے والی فعالیت کا کوئی ثبوت فراہم کرسکیں۔

مسعودی لکھتے ہیں: امام علیہ السلام کے خلاف متوکل کو ایک رپورٹ ملی۔ اس رپورٹ میں لکھا تھا: امام اپنے گھر میں اسلحہ جمع کر رہے ہیں۔ آپؑ کے چاہنے والوں خصوصاً قم کے شیعوں کے بہت

سے خطوط ہیں، وہ تمھارے خلاف جنگ کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔

متوکل نے ترکوں کے ایک گروہ کو ـــــ کہ اس زمانے میں ان کا دربارِ خلافت میں اثر و نفوذ تھا۔ یہ ذمہ داری سونپی کہ رات میں آپؑ کے گھر پر حملہ کریں۔ انھوں نے حکم کے مطابق شب میں امامؑ کے گھر پر حملہ کر دیا لیکن کافی تلاش و جستجو کے باوجود انھیں کسی قسم کا اسلحہ اور کوئی خط نہ مل سکا بلکہ دیکھا کہ امامؑ ایک کمرے کا دروازہ بند کیے، موٹا لباس پہنے ریت اور سنگریزوں پر عبادتِ خدا میں مشغول ہیں۔ آیات کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ ترکوں کا گروہ اسی حالت میں امامؑ کو متوکل کے پاس لے گیا، متوکل بزم مے خواری میں تھا۔

یہاں بھی دونوں قطبوں کا تضاد نظر آتا ہے۔ ایسی دو طاقتوں کا جو کہ، دنیا کے مشرق و مغرب میں ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابل رہی ہیں اور ظلم کے خلاف عدل کی جنگ کو وجود میں لاتی رہی ہیں۔

عدل کے طرف دار اور معاشرے کے پسماندہ لوگ آدھی رات کو خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوتے اور اللہ کی ان آیات کی تلاوت کرتے ہیں جو کہ انھیں محاذِ ظلم سے ٹکرانے اور اس کے مقابلے میں ڈٹے رہنے کی طاقت عطا کرتی ہیں۔

ظلم کے حامی آدھی رات کو اس بزم میں جاتے ہیں کہ جہاں بے خبری و مستی کی حالت میں یا بعبارت دیگر خدا سے بے خبر ہو جاتے ہیں تاکہ اس خون کو شراب کی صورت میں اپنے حلق سے نیچے اُتار سکیں جو کہ دن میں معاشرے کے بدن سے نچوڑتے ہیں اور شہوت انگیز عورتوں کی آغوش میں ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ انھیں اس کی پروا نہیں ہے کہ ان کی حکومت میں بھوکی و برہنہ عورتیں اپنے بچوں کی دل گداز گریہ و زاری سے تڑپتی ہیں۔ وہ شراب و شہوت کی مستی سے ساری چیزوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔

اگر یہ مستی و بے خبری نہ ہوتی تو اپنے ضمیر کی ملامت گر آواز اور وہ آواز جو ان کے دل کی گہرائی سے اٹھتی ہے اور انھیں سرزنش کرتی ہے وہ ان کی زندگی کو اجیرن بنا دیتی......

امام علیہ السلام کو متوکل کی بزم میں لے گئے۔ وہ اپنے بزمِ شبانہ میں تھا، ہاتھ میں شراب کا جام تھا۔ اُس نے امام علیہ السلام کی تعظیم کی، شراب کا جام امام علیہ السلام کی طرف بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: خدا کی قسم (یہ) مشروب ہرگز میرے خون و گوشت میں داخل نہیں ہوا ہے۔

اس نے کہا: کوئی شعر سنایئے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: مجھے زیادہ اشعار یاد نہیں ہیں۔

متوکل: لیکن سنائے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اس وقت امام علیہ السلام نے جو اشعار پڑھے تھے ان کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے:

"وہ بلندی کی انتہا پر پہنچ گئے ہیں،

اور دلاور لوگوں کو اپنی حفاظت کے لیے مقرر کر لیا ہے لیکن اس کا کیا فائدہ؟

کہ ان دلاوروں سے انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گا،

اور ایک روز عزت و عظمت کی چوٹی سے نیچے کھینچ لے جائیں گے اور قبر کے گڑھے میں دفن کر دیے جائیں گے۔

اور کتنا برا ٹھکانہ ہے!

اور جب قبر میں پہنچ جائیں گے تو ایک آواز بلند ہوگی۔

وہ تخت و تاج اور زیور و اسباب آرائش کہاں ہیں؟

وہ آواز اسی طرح ان کی قبر میں گونجتی رہے گی......

نعمتوں میں غرق صورتیں کیا ہوئیں؟

وہ صورتیں جو پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں!

قبر فصیح زبان میں جواب دے گی اور کہے گی: صورتوں کو پوچھتے ہو؟

آہ! اب ان پر کیڑے رینگ رہے ہیں

ایک زمانے تک وہ دنیا سے فائدہ اُٹھاتے رہے، کھاتے رہے، پیتے رہے اور اب وہ زمانہ ہے وہ خود کیڑوں کی غذا بن گئے ہیں"۔

ان اشعار سے بزم کا نقشہ ہی بدل گیا۔ بزم نشینوں کے دل ہل گئے اور ان کا نشہ و مستی کافور ہوگئی۔ سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے یہاں تک کہ متوکل نے بھی معذرت چاہی اور امام علیہ السلام کو واپس آپؑ کے گھر بھیج دیا۔

امام علیہ السلام ہر موقع سے استفادہ کرتا ہے اور پیغام پہنچاتا ہے لیکن...... اگرچہ گمراہ اور متوکل لحظہ بھر کے لیے حسرت کے آنسو بہاتے ہیں لیکن پھر اپنی پہلی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔

اس پیغام کی تبلیغ ان کا تختہ اُلٹنے والی ہے، لہٰذا وہ اس کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ چنانچہ متوکل نے بارہا امام علیہ السلام کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ یہاں تک ۲۴۷ ہجری میں ۱۵ سال حکومت کر کے چالیس سال کی عمر میں ترکی افسر کے ہاتھ مارا گیا۔

دربارِ خلافت میں ترکوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ وہ ایک خلیفہ کو قتل کرتے اور دوسرے خلیفہ کو مسند پر بٹھاتے تھے۔ متوکل کے بعد محمد و منتصر تختِ خلافت پر بیٹھے اور پھر مستعین اور اس کے بعد معتز خلیفہ ہوا۔

مرحوم محدث قمی کی تحریر کے مطابق امام علی نقی علیہ السلام نے معتز کے زمانے میں ۲۵۴ ہجری میں زہر خورانی کے سبب شہادت پائی۔ وفات کے وقت آپؑ کی عمر ۴۲ سال تھی۔ ۳۳ سال اُمت کی امامت کے منصب پر فائز رہے۔ ۱۳ سال مدینہ میں اور بیس سال سامرا میں گزارے۔

والسلام علیه وعلی آبائه واولاده الطاهرين

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے مختصر احوالِ زندگی

maablib.org

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے ۲۳۲ ہجری میں شہر مدینہ میں ولادت پائی۔ نام حسنؑ، کنیت ابومحمد اور مشہور ترین القاب عسکری اور ابن الرضا ہیں۔ والدہ کا نام ''سلیلؑ'' ہے جن کو بہت سے مورخین نے ایرانی جانا ہے۔

آپؑ کے والد امام علی نقی علیہ السلام ہیں جو ۲۵۴ ہجری میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور اُمت کی امامت کی ذمہ داری آپؑ کے دوش پر آ گئی تھی۔ اس وقت آپؑ کی عمر ۲۲ سال تھی۔ آپؑ کا رنگ گندمی، بڑی بڑی آنکھیں اور نہایت حسین جوان تھے۔

خلفاء بنی عباس کی طرف سے قم میں اوقاف و صدقات کے ذمہ دار احمد بن عبیداللہ ——— مرحوم محدث قمی کی تحریر کے مطابق امام حسن عسکری علیہ السلام کے بارے میں کہتے ہیں:

''میں نے سامرا میں، علم و زہد، وقار، ورع، عفت و حیا اور قدر و منزلت میں امام حسن عسکری علیہ السلام جیسا علوی سادات میں نے کسی کو نہیں پایا۔ انھی صفات کی وجہ سے آپؑ امامت کے سزاوار تھے اور اس خدائی منصب پر فائز ہوئے''۔

چنانچہ جب امام علی نقی علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی امامت کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا چاہا تو امامت کے معیاروں کو بیان کرتے ہیں۔ اس چیز کو مرحوم جواد فاضل نے کتاب ''چہاردہ معصوم'' میں امام حسن عسکری علیہ السلام کے حالات میں رقم کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

''ابوبکر فدکی کہتے ہیں: امام ابوالحسن سوم نے مجھے لکھا: میرا بیٹا ابومحمد تمام آلِ محمدؐ سے زیادہ گرامی، شریف اور منصبِ امامت کے لیے سب سے زیادہ شائستہ ہے۔ وہ میرا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ وہ میرا جانشین ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم دینی مسائل میں اس کی طرف رجوع کرو۔ اس خط میں امامؑ نے اپنے بیٹے کے علم و فضل اور ان کی شرافت و عظمت کو بیان کیا ہے''۔

صحیح ہے کہ آپؑ امامؑ کے فرزند ہیں لیکن جیسا کہ ہم گذشتہ فصل میں بیان کر چکے ہیں کہ معیارِ امامت، بلکہ اسلامی ماحول میں زمام داری کی اساس، لیاقت و صلاحیت ہے یا بعبارت دیگر

ملت اسلامیہ کی زمام داری توارث کی بنیاد پر نہیں ملتی ہے۔ چنانچہ یہی معنوی خصوصیات تھے جن کی وجہ سے دوست و دشمن آپؑ کے سامنے خاکسار ہو جاتے۔ یہی چیز انھیں آپؑ کی پیروی کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

درج ذیل حکایت سے ہم آپ کے معنوی اثر کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس حکایت کو مرحوم محدث قمی نے شیخ مفید وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ بنی عباس میں سے، کچھ لوگ صالح بن وصیف کے پاس گئے۔ اس زمانے میں امام حسن عسکری علیہ السلام اس کی قید میں تھے۔ بنی عباس کے اس گروہ نے صالح سے کہا: ان پر زیادہ سے زیادہ سختی کرو۔

صالح نے کہا: میں اس سے زیادہ سختی نہیں کرسکتا۔ میں نے انھیں اپنی معلومات کے مطابق شقی ترین افراد کی تحویل میں دے دیا تھا۔ وہ دو افراد علی بن بارمش اور دوسرا اقامش ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس زمانے سے امام علیہ السلام کو ان کی قید میں رکھا ہے اسی وقت سے یہ بھی نیک و صالح بن گئے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں اور بڑے عبادت گزار بن گئے ہیں۔

اس کے بعد صالح نے کسی کو بھیج کر ان دونوں کو بلایا۔ صالح نے سخت لہجے میں گفتگو کی اور انھیں سرزنش کرتے ہوئے کہا: وائے ہو تم پر! اس شخص کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

انھوں نے کہا: اس شخص کے بارے میں ہم کیا کہیں جو دنوں کو روزہ رکھتا اور راتوں کو عبادت میں گزرتا ہے۔ خدا کے علاوہ کسی سے لو نہیں لگاتا ہے۔ جب ہماری طرف دیکھتا ہے تو ہمارے بدن کانپ اٹھتے ہیں؟ یہ ہے لوگوں پر امامؑ کی معنوی خصوصیت کا اثر انھیں خصوصیات نے آپؑ کو امامت کے لائق بنایا ہے۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام اپنے آباؤ اجداد کے مانند ظالم خلفا اور ستم گروں کے مدمقابل تھے۔ آپؑ شیعوں کے رہبر اور بنی عباس کے خلاف لڑنے والوں کے رہبر تھے۔ آپؑ کے زمانہ میں معتمد عباسی خلیفہ تھا۔ وہ نہایت سفاک و خونخوار تھا۔

مخالف جماعتوں کو اس نے سنگدلی کے ساتھ کچل دیا تھا۔ "منتخب التواریخ" کے مؤلف نے سیوطی کی تاریخ الخلفاء سے نقل کیا ہے کہ "معتمد نے بصرہ میں ایک دن کے اندر تین لاکھ لوگوں کو تہہ تیغ کیا۔ بظاہر یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے لیکن جو کچھ بھی ہو، اس سے کم از کم اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ معتمد اپنے مخالفوں سے کس طرح نمٹتا تھا۔

اس خصلت کا انسان، شیعوں کے قائد و پیشوا حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے ہرگز چشم پوشی نہیں کرسکتا تھا۔ شیعہ شروع ہی سے ائمہ دین کی قیادت میں ظالم بادشاہوں اور خلفاء کے خلاف تحریک چلاتے تھے۔ لفظ "شیعہ" کے ساتھ مبارزہ اس طرح متصل ہوگیا ہے کہ تاریخ شیعہ کو جس کا آغاز رسولؐ خدا کے زمانے سے ہوتا ہے۔۔۔ ظلم کے خلاف عدل کی جنگ سمجھا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ معتمد باللہ، بنی عباس کا سفاک خلیفہ، امام علیہ السلام کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام علیہ السلام نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ قیدخانے میں گزارا۔ کبھی صالح بن وصیف کے ہاتھوں اسیر ہوئے۔ ایک زمانے تک علی بن حزین کی جیل میں رہے اور ایک عرصہ تک رذیل و پاجی "نحریر" کے زندان میں رہے۔ جب معتمد کی نظروں میں آپؑ کا وجود کھٹکنے لگا اور وہ آپؑ کو اپنی حکومت کے لیے خطرہ سمجھنے لگا تو اس نے آپؑ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

محدث قمی لکھتے ہیں: ابن بابویہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ معتمد نے آپؑ کو زہر دے کر شہید کیا ہے۔ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے ۲۶۰ھ کو دنیا سے کوچ کیا۔ آپؑ کی امامت کا زمانہ تقریباً چھے سال ہے۔ سارے شہر میں آپؑ کی رحلت کی خبر پھیل گئی۔ سامرا اس زمانے میں دارالسلطنت اور مرکز خلافت تھا۔ اس میں نالہ و شیون کی آواز گونجنے لگی۔ لوگوں نے دکانیں بند کردیں۔ بنی ہاشم، حکومت کے کارندوں، سپہ سالاروں، ججوں اور معاشرے کے دیگر لوگوں نے آپؑ کی تشییع جنازہ میں شرکت کی۔ مراسم ختم ہوجانے کے بعد خلیفہ کے حکم سے اس کے بھائی ابوعیسیٰ نے امام علیہ السلام کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ① پھر خلیفہ کے حکم سے کچھ سربرآوردہ لوگوں کو بلایا گیا تاکہ وہ قریب سے امام علیہ السلام کے جنازے کو دیکھ لیں اور اس بات کے گواہ رہیں کہ امام علیہ السلام نے طبیعی موت کی وجہ سے دنیا سے رحلت کی ہے۔ اس سے وہ اپنے مظالم کی پردہ پوشی کرنا چاہتے تھے۔

چونکہ لوگ ائمہ دین سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور ان کی عظمت و احترام کے قائل تھے

① مذکورہ تحریر تقیہ اختیار کرتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ حقیقت میں امام زمانہؑ نے باعجاز امامت تشریف لاکر ابوعیسیٰ یا جو بھی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھا تو اس کے آگے بڑھ کر خود نماز جنازہ پڑھائی کیونکہ معصومؑ کا جنازہ معصومؑ ہی پڑھا سکتا ہے۔ کیونکہ غیر معصوم، معصومؑ کی حقیقی شان کے مطابق کلمات ادا نہیں کرسکتا۔ امام حسین علیہ السلام کا جنازہ امام علی بن الحسین علیہ السلام نے باعجاز امامت قیدخانہ سے بمقام کربلا تشریف لاکر اور امام علی رضا علیہ السلام نے مدینہ سے بغداد تشریف لاکر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا جنازہ پڑھایا۔

اور بنی عباس ان کے ردعمل سے ڈرتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے ائمہ دین کو خفیہ طریقے سے زہر دے کر شہید کیا اور اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ مملکت کے سربرآوردہ افراد امامؑ کے جنازہ کو نزدیک سے دیکھیں اور گواہی دیں کہ امامؑ نے طبیعی موت کی وجہ سے رحلت کی ہے۔

گیارہویں امامؑ کے انتقال کے بعد شیعوں نے ان ہی دو عناصر، علم و تقویٰ کے موجب آپؑ کے فرزند ارجمند، حضرت حجۃ ابن الحسن کا دامن تھام لیا۔

بارہویں امامؑ رسولؐ خدا کے صریح بیان کے مطابق اپنے والد کی رحلت کے بعد ہمارے بارہویں امامؑ ہیں۔ آج دنیا کو انھی کا انتظار ہے۔ ظہور کے بعد آپؑ پوری دنیا میں عدل قائم کریں گے اور بشریت کو گناہوں اور ظلم کی تاریکیوں سے نجات دلائیں گے۔

والسلام علیہ وعلی آبائہ الطیبین الطاہرین ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

maablib.org

حضرت امام مہدی علیہ السلام

maablib.org

سحر طلوع ہونے والی تھی، اُفق کے کناروں کو نُور کی سفیدی نے روشن کر دیا تھا، جس سے سورج کے طلوع ہونے کی نوید و خوش خبری ملتی تھی۔ ستارے خوف سے لرزتے ہوئے ایک ایک کر کے آسمان سے غائب ہو رہے تھے۔

شعبان کی پندرہویں شب تھی۔ آسمان کا جامِ مسرت جام شب بھر جلوہ گری میں مصروف رہا اور زمین پر نُور کی بارش کرتا رہا۔ شہر سامرا چاند کی دھیمی روشنی کی حریری چادر میں منہ لپیٹ کر سو رہا تھا۔ شہر کے تنے اور خوبصورت گھروں پر سحر کے بے رنگ سناٹے کی حکومت تھی۔ نسیم سحری کے دل نشیں نغموں کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بادِ نسیم سبک بالی کے ساتھ شہر کے پیچ وخم سے گزرتی اور اور اس کے در و دیوار پر اس عطر کی بارش کرتی چلی جاتی جو بہشت کے پھول سے عاریت لائی تھی۔

پورا شہر محوِ خواب اور فطرت بیدار تھی۔ چاند ضوفشانی اور نسیم عطر پاشی کر رہی تھی۔ طلوعِ فجر نے آسمان پر حریر جیسا نرم نرم پردہ کھینچ دیا اور آسمان کے کارندوں نے سپہر کو اس میں چھپا دیا۔ کائنات پر عجب عظمت وشکوہ کی حکمرانی تھی۔ اس لطف وزیبائی اور شان وعظمت کے ماحول میں ایک بچے کی ولادت ہونے والی تھی۔ اس بچے کی جس کے ماں باپ دونوں ہی باعظمت اور عظیم ماں باپ کی اولاد ہیں اس کے والد رسولؐ کے گیارہویں جانشین امام حسن عسکری علیہ السلام اور والدہ قیصر روم کی بیٹی "ملیکہ" تھیں، جنھیں مذہبی روایات میں "نرجس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نرجسؑ شبانہ راز و نیاز سے ابھی فارغ ہوئی تھیں، نماز تہجد ابھی ختم کی تھی کہ اپنے اندر ایسا درد محسوس کیا جو ابھی تک محسوس نہیں کیا تھا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ وضع حمل کے آثار نمایاں ہو گئے۔

نُور کے مرغولوں سے کمرہ پُر ہو گیا، جس کے پرتو سے زمین و آسمان روشن ہو گئے۔ آسمان کے دروازے کھل گئے۔ فرشتے سفید پرندوں کی صورت میں زمین کی طرف روانہ ہوئے۔ اپنے نرم و بہشتی پروں سے اس شب کے بچے کو پیار کرنے لگے۔

بچہ پیدا ہو چکا تھا، نام رکھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ رسولؐ مدتوں پہلے فرما چکے تھے: "اس

کا نام و کنیت وہی ہے جو میرا نام و کنیت ہے"۔ (منتخب الاثر: ص ۱۸۲)

دیگر اسماء بھی ہیں کہ جن میں مشہور ترین نام "مہدی" ہے۔ رسولؐ اور ان کے جانشین سیکڑوں حدیثوں میں مدتوں پہلے امام حسن عسکری علیہ السلام کے بیٹے "مہدی" کو بارہویں امامؑ کے عنوان سے پہچنوا چکے تھے بلکہ ان کے عالمی پیغام اور خاص فریضے کی بھی وضاحت کر چکے تھے۔

رسولؐ اسلام نے فرمایا تھا: لمبی ناک اور چوڑی پیشانی والے مہدیؑ مجھ سے ہیں، وہ دنیا کو ایسے ہی عدل و انصاف سے پُر کریں گے جیسا کہ وہ ظلم و ستم سے بھر چکی ہوگی۔ (حوالۂ سابق)

اس شب میں ولادت پانے والا بچہ بہت سے رُموز و اَسرار کا حامل ہے، اس کی ولادت، غیبت، مقصد و منصوبہ مختصر یہ کہ عالمی حکومت اور اُمید بخش عدالت سب کے سب ایسے راز ہیں کہ جن سے مرورِ زمانہ کے ساتھ پردہ اُٹھے گا۔

آپؑ اپنی ولادت کے ساتھ دنیا میں عالمی حکومت کا نظریہ لائے۔ اس زمانے میں بشریت اس نظریے کو آسانی سے ہضم نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا اسے ایک نظریے کی صورت میں بھی قبول نہیں کر سکتی تھی۔ کیا دنیا میں عدل و انصاف کی بنیاد پر کوئی حکومت قائم ہو سکتی ہے؟

اس زمانے کے حالات و کوائف کچھ ایسے تھے کہ بشریت امام زمانہ علیہ السلام کی عالمی حکومت کی خبر سن کر انگشت بدندان رہ گئی تھی۔ مومنوں نے اسے خدائی راز سمجھ کر تسلیم کر لیا تھا لیکن جو مومن نہیں تھے وہ ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کا مذاق اُڑا کر رد کر دیتے تھے۔ وہ صدیوں پر محیط مستقبل کے پردے میں آج کی تکامل یافتہ دنیا کا مشاہدہ نہیں کر سکتے تھے۔

جس زمانے میں اسلام نے ایک عالمی حکومت کے مسئلے کو وہ بھی حقیقی عدل کی بنیاد پر قائم، وجودِ امام مہدیؑ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس وقت بشریت کے اذہان نے ایک ناقابلِ حل عظیم راز سمجھا تھا لیکن مرورِ زمانہ نے اس راز سے پردہ ہٹا دیا۔ چنانچہ یہ آج کی دنیا ہے کہ بلند آواز سے، عالمی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے بین الاقوامی تنظیم سے بشریت کو ایک عالمی حکومت کی دعوت دے رہی ہے اور یہ عقلِ بشری کے تکامل کی نمود ہے۔

یہاں ہم تاریخ بشر کے تین اَدوار کی بنیاد پر اس مسئلے سے بحث کرتے ہیں: یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آج کی دنیا نے ایک عالمی صلح و صفائی کی زمین ہموار کرنے کے سلسلے میں نہایت ہی مقدس قدم اُٹھایا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے دونوں بلاک بلکہ بشریت اس

وحشت و اضطراب سے تنگ آچکی ہے۔ اب وہ چاہتی ہے کہ ایک عالمی امن و عدالت کا فارمولا بنائے اور ایسا ماحول پیدا کرے کہ جس میں انسانیت اپنے صحیح اور حقیقی راستے پر گامزن ہو سکے۔

انسانیت خواہ نخواہ، مجبوراً، ایسے مقصد اور انہی مقدس فکر کی طرف بڑھ رہی ہے کیونکہ دنیا کا نظام کچھ ایسا ہے کہ ہر موجود اپنے شایانِ شان کمال تک پہنچنا چاہتا ہے۔ جس وقت پھول کا نرم بیج زمین کے اندر سر چھپاتا ہے اور زمین کی سختی سے آشنا ہوتا ہے تو اس وقت وہ چاہتا ہے کہ زمین کے پردے کو چیر کر سر باہر نکالے اور اپنا تشخص پیدا کرے اور ایک بہترین شاخِ گل کی صورت میں اپنے ماحول کو معطر کرے۔ پھول کے بیج کو ناچار ان منزلوں سے گزرنا ہے کیونکہ اس کا حقیقی کمال پھول بننا اور خوشبو پھیلانا ہے۔

ہر موجود کے لیے خدا نے ایک کمال مقرر کیا ہے اور وہ موجود بھی اس کمال تک پہنچانے کے لیے سخت کوشش کرتا ہے۔ کیا آج تک کبھی آپ نے یہ سوچا ہے کہ انسانیت کا کمال کس چیز میں ہے؟

اس تقسیم میں نوعِ انسان بالکل ایک فرد کے مانند ہے۔ فرد، وہ غریزہ سے اپنی زندگی شروع کرتا ہے۔ اس مرحلے میں وہ صرف غرائز کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ زندگی کے دوسرے مرحلے یعنی احساسات کی حاکمیت میں داخل ہوتا ہے۔ غیظ و غضب، ہیجان و تیزی، سب ہی اس مرحلے سے مربوط ہیں۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد عقلانی زندگی کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے۔ یہ عقل کی حاکیت کا زمانہ ہے۔ اب بچپنے کی شکم پرستی کی خبر نہیں ہے اور نہ جوانی کے زمانے کے ہیجان و ولولوں کا کہیں پتہ ہے۔

نوعِ انسان کو بھی لامحالہ یہ تین مرحلے طے کرنے ہیں۔ انسان ایک دن بچہ تھا۔ ایک روز اس کی زندگی غریزہ کے حکم کے تحت چلتی تھی۔ پھر وہ بتدریج احساس کے مرحلے میں داخل ہوا۔ شرارتیں، آدم کشی، مار پیٹ، اس مرحلے کا نتیجہ ہے۔ اب انسان رفتہ رفتہ مرحلۂ عقل "عقلانی زندگی" میں داخل ہوتا ہے۔ یہی عقلانی زندگی انسانیت کا مرحلۂ کمال اور مثالی بشریت کا دن ہے۔ اگرچہ ابھی تک انسان عقل کے مرحلۂ کمال اور عقلانی زندگی کے اوج تک نہیں پہنچا ہے۔ لیکن دنیا کے گوشہ و کنار میں جو قیمتی شعلے چمکتے ہیں ان سے یہ خوشخبری ملتی ہے کہ بشر اس مرحلے سے زیادہ

نہیں

احساس کی حاکمیت کے زمانے میں، جس زمانے میں بشر اپنے اندر طاقت محسوس کرتا تھا بے محابا حملہ کر دیتا تھا اور اپنے احساسات کے شعلوں سے قوموں کو نابود کر دیتا تھا۔ چنگیز خان کے زمانے میں مغل باہم مسالمت آمیز زندگی گزارنے اور بشر کی سیاسی لغت سے بالکل بے خبر تھا۔ بین الاقوامی تعاون کا اس کے نزدیک کوئی مفہوم ہی نہیں تھا۔ اس زمانے میں جو کچھ تھا وہ شدت پسندی اور ہیجان تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ انسان تکامل عقل کے مرحلے تک پہنچا۔ اب عقل کے ذریعے تند و تیز احساسات کو قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ شدید بحرانوں نے دنیا کو جنگ کے دھانے پر لے جا کر کھڑا کر دیا ہے۔ لیکن وہ اس میں کود نہیں رہے ہیں بلکہ روز بروز عام خلع سلاح، بین الاقوامی تعاون، ایسے اُمید بخش و نئے نغمے سنے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں بشریت کے عقلی روابط کی خوشخبری دیتی ہیں۔ اگرچہ بشریت ابھی تک عقلی بلوغ کی منزل تک نہیں پہنچی ہے لیکن عالمی سیاست کے صفحہ پر ابھرنے والے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روز بشریت اس منزل پر قدم رکھے گی۔ مذہب اس دن کو مہدی موعود کے ظہور کا دن قرار دیتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: امامِ زمانہؑ اس وقت تک ظہور نہیں کریں گے جب تک خدا اپنے بندوں کے سر پر اپنی رحمت کا سایہ نہیں کرے گا۔ اس رحمت کے سایہ سے ان کی عقل ٹھکانے لگے گی اور دماغ روشن و بیدار ہو جائیں گے۔ اور اس عقلی تکامل کی وجہ سے انسان حق و عدالت کی حکومت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا اور پھر بشر کے اُوپر ایک قانون اور اس تنظیم کی حکومت ہوگی جو حق و عدالت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ اس بات کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے:

دنیائے بشریت آج صنعت و تمدن کی روشنی میں مستقل طور پر دو خطوط پر آگے بڑھ رہی ہے۔ صنعت و تمدن کے پرتو میں انسان آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک معاشرے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ صنعت و تمدن سے پہلے وہ طوائف الملوکی کی صورت میں زندگی گزارتا تھا۔ کسی قوم و ملت پر کوئی اُفتاد پڑتی تو اس کی صحت پر اس کا قطعی اثر نہیں ہوتا تھا۔ معاشرے ایک دوسرے سے الگ تھلگ، بے خبر مخصوص طریقے سے زندگی بسر کرتے تھے۔ صنعت کا سلسلہ چل نکلا۔ ارتباط کے وسائل محکم سے محکم تر ہوتے چلے گئے۔ نئے نئے وسائل انسان کے دست اختیار میں آگئے۔ ان وسائل نے قوموں کو ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا۔ درمیان فاصلوں کو ختم

کیا اور ایک دوسرے کے حوادث سے متاثر ہونے لگے۔

تمدن و صنعت نے وحدت قائم کرنے کے لیے پراگندہ اور بے شمار ادارے قائم کیے، جیسا کہ ہم آج مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دنیا میں دو تین ہی ادارے ہیں لیکن انھی کی وجہ سے لوگوں کی زندگی ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوگئی ہے کہ اگر افریقہ کے علاقے میں کوئی حادثہ رونما ہوتا ہے تو ساری دنیا میں اس کا ردعمل ہوتا ہے۔

بشر کا یہ سفر ابھی تمام نہیں ہوا ہے۔ جس چیز سے کل کے بہت سے ادارے صنعت کی وجہ سے دو تین اداروں میں سمٹ آئے ہیں، ایک روز ایسا آئے گا کہ یہ دو تین ادارے بھی ختم ہو جائیں گے اور انسان ایک ''واحد'' کی صورت میں ابھرے گا۔

انسان کا دوسرا سفر

سترہویں صدی اور اس کے بعد سے انسان نے صنعتی زندگی میں قدم رکھا اور علمی دنیا میں عظیم انقلابات بپا کیے اور مشاہدہ و تجربہ کے طریقے سے بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ بعض دانشوروں نے نہ کہ سب نے ـــ کہ جنھوں نے تجربی روش کو بڑی علمی کامیابی سمجھا تھا، ہر قسم کے دوسرے اسلوب سے اعتماد اُٹھا لیا اور اپنے تمام مطالعات اور اُمورِ مشاہدہ اور تجربے کی بنیاد پر رکھنا شروع کیا۔

اسلوبِ تجربہ کے نفوذ کی وجہ سے ناقابلِ تجربہ مسائل علماء کی بحث سے خارج ہوگئے۔ یہیں اس گروہ کے دماغ میں خدا سے اعتقاد اُٹھنے کی فکر ابھری جو کہ دوسروں سے کم غور و فکر کرتے تھے۔ کیونکہ تجربہ کے سسٹم سے نہ خدا کا لیبارٹری میں، نہ مائیکروسکوپ اور نہ عظیم ٹیلی سکوپ سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کا عقیدہ بھی نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ اس بات سے غافل رہے کہ خدا شناسی کی راہ میں تجربہ و مشاہدہ سے ہٹ کر دوسرا راستہ بھی ہے۔ بہر صورت خدا پر ایمان رکھنا، جو کہ روح مذہب ہے، ایک گروہ کے دل میں متزلزل ہوگیا۔ اس تزلزل سے معاشرہ انسانی پر گناہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بشر علمی لحاظ سے تو بہت آگے بڑھ گیا ہے لیکن بدبختی و فساد معاشرہ کے در و دیوار سے عیاں ہیں اور دن بدن اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

آج انسان خود کو اور اپنی خواہشوں کو دیکھتا ہے۔ چونکہ خدا اور مذہب کے سلسلہ میں اس کا ایمان کمزور ہو گیا اور وہ اپنی خواہش پوری کرنے کے سلسلہ میں کسی بھی ظلم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے اور یہ چیزیں معاشرہ کے مزاج کے خلاف ہیں۔ نتیجہ میں سختی سے کام لیتا ہے اور جب شدت و سختی انتہا کو پہنچتی ہے تو انقلاب آجاتا ہے۔ طبیعت کا قانون ہے کہ ہر دباؤ اور فشار کے بعد دھماکہ ہوتا ہے اور یہ طبیعی قانون سو فی صد معاشرہ پر بھی صادق آتا ہے۔

معاشرہ کے مزاج سے کچھ اُمور سازگار و موافق ہیں۔ عدل، درستی، امانت داری، قانون کا احترام، بلکہ تمام فضائل معاشرہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں اور اسے تقویت بخشتے ہیں۔ کچھ اُمور قطعاً معاشرہ سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اگر انھیں معاشرہ میں داخل کیا جائے گا تو دباؤ بڑھے گا اور جب دباؤ اپنی انتہا کو پہنچے گا تو انقلاب آجائے گا۔ جس معاشرے میں ظلم و گناہ بڑھ جائیں گے تو کچھ مدت کے بعد ردعمل کے طور پر انقلاب آجائے گا۔ امریکا اور فرانس کے انقلاب انھیں اجتماعی دھماکوں کا نتیجہ تھے۔ پہلا براہ راست استعمارگروں کے ظلم کے نتیجے میں اور دوسرا دونوں معاشروں میں حکام کے ظلم سے وجود میں آیا ہے۔ انقلاب کے بعد یہ دیکھتا ہے کہ ظلم و ستم کے بارے میں حق وانصاف سے کام لیا جاتا ہے۔ ظلم عالمی ہے تو انقلاب بھی عالمی ہوگا۔

اس عالمی انقلاب کے بعد عدل و انصاف بھی پوری دنیا پر سایہ فگن ہوگا۔ ان کے سامنے ایسا دن آنے والا ہے کیونکہ یہ اس کے سیر تکامل کا لازمہ ہے اور بشریت لاشعوری طور پر کائنات کے عظیم کارواں کے ساتھ کمال کی طرف بڑھ رہی ہے اور انسانیت اس دن اپنے کمال پر پہنچے گی جس روز اس کی حیات کی لغت سے ہر قسم کی بدی و شرارت محو ہو جائے گی اور وہ سراپا عدل و انصاف ہو جائے گی۔

جبر تاریخ، دنیائے مادہ کی گردش اور عقل بشر کے تدریجی تکامل کے نتیجے میں ایسا دن آئے گا۔ یہ گردش اور یہ تکامل قطعی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انسان کی زندگی کا صرف ایک دن باقی رہ جائے گا تو بھی وہ دن آئے گا کیونکہ نوع کا حقیقی کمال تک پہنچنا آفرینش کا مقصد ہے۔ اسی لیے رسولؐ اسلام نے فرمایا ہے:

"اگر دنیا کی عمر کا ایک ہی دن باقی رہ جائے گا تو خدا اس دن کو اتنا طول دے گا کہ میرے خاندان میں سے ایک شخص اُٹھے گا تاکہ وہ دنیا کو اسی طرح

عدل و انصاف سے پُر کرے جیسا کہ وہ ظلم و ستم سے لبریز ہو گی"۔ (ملاحظہ فرمائیں: منتخب الاثر، مؤلف آیت اللہ صافی گلپائیگانی)

یہ شخص، شیعہ و سُنّی طریق سے پہنچنے والی روایات کے بموجب فرزند حسن عسکریؑ امام مہدیؑ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ رسولؐ اور ائمہ معصومینؑ کی ۸۷۵ سے زائد احادیث کی رُو سے اس عالمی انقلاب کے قائد بھی رسولؐ خدا کے بارھویں جانشین حضرت ولی عصرؑ ہی ہوں گے۔ انسانیت کے اس فرزند ارجمند کو دنیا میں آنے سے پہلے، اسلام اور مسلمان پہچانتے تھے۔ رسولؐ خدا اور ائمہؑ کی زبان سے بارہا سنا تھا کہ ولایت کے پاک و پاکیزہ درخت نے بشریت کے لیے گراں قدر میوہ فراہم کیا ہے، جس سے بشریت کا ظلم و ستم سے تلخ ہو جانے والا حلق شیریں ہو جائے گا۔ سب کو اسی کا انتظار ہے۔ مومنین کو اس لیے تاکہ آپؑ کی نصرت کریں اور بدکردار ظالموں کو اس لیے کہ انھیں نیست و نابود کریں۔ لیکن خدا ان کی حفاظت کرتا ہے اور لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔ غیبت کی یہ مدت کب ختم ہو گی، اسے خدا ہی جانتا ہے۔

روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب دنیا میں ہر طرف رنج و مصیبت ہی نظر آئے گی، جب ظلم و ستم سے انسان کی زندگی سیاہ رات سے بھی زیادہ تاریک ہو جائے گی۔ جب دنیا کے اُمور کی انجام دہی سے مادی طاقتیں عاجز ہو جائیں گی۔ جس وقت انسانیت، ظلم و گناہوں کی کثرت کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گی۔ اس وقت مسلمانوں کے بارھویں امامؑ، اپنی طویل غیبت کے بعد ظہور فرمائیں گے اور بشریت کے بھٹکے ہوئے کارواں کی قیادت سنبھالیں گے۔ اپنے ظہور سے ایک انقلاب لائیں گے اور اس انقلاب کے شعلوں سے ظلم و ستم اور گناہ و بدبختی کو خاکستر کریں گے۔

اس وقت تمام مذاہب متحد ہو جائیں گے۔ کیا ہر مذہب ایک عالمی مصلح کے انتظار میں لحہ شماری نہیں کر رہا ہے۔ ظلم و ستم اتنا زیادہ بڑھ جائے گا کہ انسان پس کے رہ جائے گا۔ یہاں تک بے دین بھی اس دباؤ اور سختی سے عاجز آجائیں گے اور جب ہر طرف سے مایوس ہو جائیں گے تو ایک مصلح پر نظر جمائیں گے جو انھیں تمام مصائب و آلام سے نجات دلائے۔

انسان خواہ نہ خواہ ایک اصلاح کرنے والے کے ظہور اور ہر لحہ کے اس انقلاب کا انتظار کرتا ہے۔ یہ انقلاب دنیا میں آکر رہے گا۔ جبر تاریخ انسانیت کو ایسے انقلاب کی طرف لے جا رہا

ہے جو کہ عدل کی میراث چھوڑتا ہے۔ اس عدل کی جو کہ اسلام کا آخری مقصد ہے۔

یہ وہی مقدس نمونہ ہے کہ جس کو بشریت اپنے تمام وسائل کے ساتھ ڈھونڈ رہی ہے۔ فی الحال اس کے پاس اس کی تصویر ہے۔ اس تصویر میں مستقبل کے آفاق موجود ہیں، جو غیر معمولی اور دل پذیر ہے: عدل کی تصویر۔

اس تصویر کو کھینچنے والا، انسان کا انسانی پہلو ہے یا انسان کا آسمانی پہلو ہے، اور یہ انسان متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس حیرت انگیز و سربستہ راز موجود میں رحمٰن و شیطان دونوں کا اثر ہے۔ انسان کا وجود ان دونوں کی جنگ کا میدان ہے اور تاریخ بشر اس جنگ کا البم ہے۔ جب شیطان غالب آجاتا ہے تو جنگ شروع ہو جاتی ہے اور ہر طرف ظلم و ستم کا بازار گرم نظر آتا ہے اور شبستانِ انسانیت پر بدبختی کی کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔

اور جب انسان کا آسمانی پہلو بھاری پڑتا ہے تو ساری دنیا میں صدق و صفا اور نورِ عدل سے بشریت کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ یہ دو طاقتیں ایسے ہی لڑتی رہیں گی، کامیابی رحمٰن کو حاصل ہوگی۔ اس وقت دنیا پر عدل و رحمت اور صلح و صفائی کی حکومت ہوگی۔ اس کیفیت کو قرآنِ مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ○ (سورۂ انبیاء: آیت ۱۰۵)

"آخر کار خدا کے صالح و شائستہ بندے ہی زمین کے وارث ہوں گے"۔

اس وقت کرۂ زمین پر صلاحیت و شائستگی اور عدل کا بول بالا ہوگا۔ یہ وہی طبیعت کا تکامل و ارتقا ہے جس پر اسلام گامزن ہے اور آگے بڑھ رہا ہے اور آخر کار ایک دن اس تک پہنچ جائے گا۔ ویسے تو ہر مکتب کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے کہ وہ جس کی طرف بڑھتا ہے۔ انبیاءؑ کا روحانی مقصد بھی اسی قاعدۂ کلی سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

انبیاءؑ کا روحانی مکتب، کہ جس کو دین و مذہب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پہلے پیغمبرؐ سے شروع ہوا اور کاروانِ زمانہ کے ساتھ ساتھ صدیوں کو طے کرتا ہوا آگے بڑھا ہے۔

اس مکتب کا مقصد کیا ہے؟ قرآنِ مجید نے اس مقصد کی اس طرح توصیف کی ہے۔ سورۂ حدید کی آیت ۲۵ میں ارشاد فرماتا ہے:

"ہم نے انبیاءؑ کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان پر کتاب اور میزانِ حق

نازل کی ہے تاکہ لوگ عدل کی طرف بڑھیں"۔

عدالت اس مکتب کا آخری مقصد ہے۔ روحانی اور آسمانی لوگوں کی جماعت اس مقصد کی طرف بڑھتی ہے اور ان کی پوری تگ و دو یہ ہوتی ہے کہ عدل زیادہ سے زیادہ فروغ پائے اور انسان کی زندگی کے تمام زاویوں پر سعادت مندی کا سایہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں اولین قدم، خدا کے اوّلین پیغمبرؑ نے اُٹھایا اور ان کے بعد حضرت نوحؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ سبھی اس مقصد کی طرف بڑھے ہیں۔ لیکن ایک روز اس سلسلہ کو ختم ہونا ہے اور نتیجے میں ایک دن یہ تمام کوششیں اور جانفشانیاں بارآور ہوں گی اور ہر جگہ عدل کا بول بالا ہوگا اور مکتبِ حق و عدالت انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر سایہ فگن ہوگی۔ عام خلقت کا تکامل یہ خوش خبری دیتا ہے کہ انسان ایک دن اس مقدس مقصد تک پہنچ جائے گا۔

اور وہ دن...... امامِ زمانہ علیہ السلام کے ظہور کا دن قوموں کے اتحاد کا دن ہے۔ عالمی عدل کا دن ہے۔ رسولِ خدا نے اس دن کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ ان میں سے ایک وہ روایت ہے کہ جو "فرائد" میں سعید بن جبیر ابن عباس سے نقل ہوئی ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا:

"میرے بعد میرے جانشین و اوصیاء اور لوگوں پر خدا کی حجت بارہ اشخاص ہوں گے۔ ان میں پہلے علیؑ اور آخری میرے بیٹے مہدیؑ ہیں۔ وہ نورِ خدا سے زمین کو روشن کریں گے اور مشرق و مغرب تک ان کی حکومت ہوگی"۔

نیز شیخ الاسلام نے "فرائد السمطین" اور شیخ سلمان بلخی حنفی نے ینابیع المودۃ کے باب ۷۷ میں عبایہ بن ربعی، جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت کی ہے کہ رسولِ خدا نے فرمایا:

"میں انبیاءؑ کا سردار ہوں اور علیؑ اوصیاء کے سردار ہیں اور میرے بعد بارہ اوصیاء ہوں گے اوّل علیؑ اور آخری مہدیؑ ہوں گے"۔

بارہویں امام حضرت حجۃ بن الحسنؑ کے وجود سے دنیا میں عدل کا بول بالا ہوگا۔ ہمارے بارہویں امام ــــ جیسا کہ شیخ مفیدؒ نے ارشاد میں سید بن طاؤسؒ نے اقبال میں اور شبلنجی نے "نورالابصار" میں نقل کیا ہے ــــ ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ میں پیدا ہو چکے ہیں۔

آپؑ چار سال پانچ ماہ اور سات روز کے ہوئے تھے کہ آپؑ کے والد، امام حسن عسکریؑ نے رحلت فرمائی۔ امام حسن عسکری علیہ السلام کے بعد حکومتِ وقت نے آپؑ کے بازماندگان کی جستجو کا

کام شروع کیا تا کہ انھیں ختم کر دیں اور دنیا سے نبوت و ولایت کی نشانیاں مٹا دیں لیکن خدا ثمرۂ نبوت اور آخری ذخیرۂ معنویت کو ستم گروں کی دست برد سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

یہاں غیبت کا مسئلہ سامنے آیا۔ غیبت کی دو قسمیں ہیں: غیبت صغریٰ ۷۴ سال تک اور غیبت کبریٰ ـــــ کہ جس کے انتہا کو خدا ہی جانتا ہے ـــــ کے اختتام کا دن عالمی عدل اور انسانی تکامل کا دن ہے، شیعہ ایسے ہی دن کے انتظار میں لحہ شماری کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں:

عَجِّلْ فَرَجَهٗ وَسَهِّلْ مَخْرَجَهٗ وَانْصُرْنَا بِهٖ نَصْرًا عَزِيْزًا

ان کی غیبت کب ختم ہوگی اسے خدا ہی جانتا ہے۔ امام حسن عسکری علیہ السلام نے احمد بن اسحاق سے فرمایا: اے احمد! یہ ایک راز ہے، پنہاں رکھے جانے والے رازوں میں سے ایک غیب ہے، خدائی غیوب میں سے۔ احمد نے اسلام کے گیارھویں پیشوا امام حسن عسکری علیہ السلام سے آپؑ کے جانشین کا پتا لگا لیا تھا۔ آپؑ کے بعد ہونے والے امامؑ کو پہچاننا چاہتے اور ان کے نام وغیرہ سے واقف ہونا چاہتے تھے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام نے ان کی رہنمائی فرمائی اور ان کے سامنے ایک عظیم راز سے پردہ اٹھایا اور یہ راز آپؑ کے بیٹے "مہدیؑ" ہیں۔

فرمایا: احمد! یہ فرزند میرے بعد امامؑ ہے۔ دنیا کو یہ ایسے ہی عدل سے پُر کرے گا جیسا کہ وہ ظلم و ستم سے بھر چکی ہوگی۔ اے احمد! یہ آنکھوں سے پنہاں ہو جائیں گے اور یہ غیبت اتنی طولانی ہوگی کہ ان کے معتقدین میں سے بھی اکثر ان کے وجود کے بارے میں شک کرنے لگیں گے اور نتیجہ میں گمراہ ہو جائیں گے۔

یہ بھی خدائی رُموز میں سے ایک راز ہے، عظیم اور اُمید بخش راز ہے۔ ابتداء بحث میں ہم کہہ چکے ہیں کہ ان کا وجود ہی راز ہے۔ آپؑ کی ولادت، غیبت، مقصد و منصوبہ، عالمی حکومت، اُمید بخش عدالت...... سبھی تو راز ہیں کہ جن سے مرورِ زمان کے ساتھ ساتھ پردہ اُٹھے گا۔ ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ آپؑ کی ولادت کے ساتھ ایک عالمی حکومت کا نظریہ بھی دنیا میں لے کر آئے ہیں۔

ایک عالمی حکومت (وہ بھی عدالت کی بنیاد پر) کا نظریہ دنیا کی تاریخ میں اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ کتاب زمانہ کے آپ ۱۴۰۰ اُوراق پلٹیں گے تو ایسی دنیا میں پہنچیں گے کہ جہاں معاشرہ کے نمایاں لوگوں کی نظر بھی قبیلہ اور کبھی شہر سے آگے کا نہیں دیکھتی تھی۔

اگر کوئی معاشرہ تمدن کی منزل طے کرلیتا اور دوسروں سے زیادہ ترقی کرلیتا تھا تو دوسرے شہروں کو بھی اپنی مملکت میں داخل کرلیتا تھا۔ یہ تھا اس زمانے میں معاشرے کے نمایاں لوگوں کا نظریہ کہ ناگہاں حیاتِ بشری کی تاریخ کے صفحہ پر اسلام کا نقش ابھرا۔

واضح ہے کہ اس زمانے میں ایک ایسی عالمی حکومت کی تشکیل ناممکن تھی کہ جس کی سرحد مشرق سے مغرب تک ہے۔ لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ اسلام قبیلوں، مکہ، مدینہ اور حجاز و جزیرہ نما عرب کی سرحدوں سے نکل کر ساری دنیا کے انسانوں تک پہنچ گیا۔

اگرچہ اس زمانے میں ایسی حکومت کا وجود میں آنا آسان نہیں تھا لیکن اسلام، جو کہ خود کو زمانے کی حدوں میں محدود اور زمان و مکان میں منحصر نہیں سمجھتا ہے، جو ہر زمانے کے لیے عالمی آئین ہے۔ اس نے پہلی بار ایک عظیم روحانی رہبر حضرت مہدیؑ، حجۃ بن الحسن کے تعارف کے ساتھ ایک عالمی حکومت کا نظریہ پیش کیا۔ حکومت کے سلسلہ میں اسلام کی آئیڈیالوجی کا محور یہ ہے کہ ایک روز پوری دنیا ایک پرچم کے نیچے آجائے گی۔ اسے ایک حکومت اور ایک انجمن چلائے گی۔ ایسی حکومت و انجمن کہ عدالت جس کی روح ہوگی۔ اسلام نے دنیا کو یہ اُمید بخش نوید دی ہے کہ کائنات کی طبیعی اور تکاملی سیر و سیاحت کے نتیجے میں ایسا نمونہ دن آئے گا...... کب، کس وقت؟ ہم نہیں جانتے۔

جس دن حالات فراہم ہوجائیں گے، جس دن انسان فکری اور عقلی لحاظ سے حق و عدالت قبول کرنے کے لیے تیار ہوجائے گا۔ جب مادی طاقتیں انسانوں کے اُمور کی تنظیم سے مایوس ہوکر اپنے عجز کا اقرار کرلیں گی۔ انسان عقل کی اس منزل پر پہنچ جائے گا کہ سنجیدگی کے ساتھ عدالت کو تلاش کرے گا اور دوسری طرف اپنے مادی سسٹم کے بارے میں یہ سوچے گا کہ اس کے مقصد تک رسائی میں رکاوٹ ہے۔ اس وقت وہ ان افکار کے روشن کرنے کے لیے تیار ہوجائے گا جو کہ دنیا اور اس کے معاشروں کے بارے میں صرف مادی زاویوں ہی کے لحاظ سے نہیں دیکھتے ہیں۔

اس دن اسلامی عدالت کے پرچم دار حضرت حجۃ ابن الحسنؑ، پردۂ غیبت سے باہر آئیں گے اور حیاتِ بشری کے میدان میں قدم رکھیں گے اور اس میں محبت کا پودا لگائیں گے، دنیا کو ظلم سے نجات دلا کر عدل کے سایہ میں لائیں گے۔

وَبِهٖ يَمْلَأُ اللّٰهُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا بَعْدَ مَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجُوْرًا

"ان کے ذریعے خدا زمین کو ایسے ہی عدل و انصاف سے پُر کرے گا
جیسا کہ وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہوگی"۔

اس دن انسان طبیعی طور پر اس نغمہ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنے گا، اس کی پیروی کرے گا کہ یہ نغمہ ان کی طبیعی خواہش ہے اور ان کی درونی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ انسان کی فطری و طبیعی ضرورتوں میں سے ایک ہدایت و رہنمائی ہے۔ انسان کو حیوان سے جدا کرنے والی چیزوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ حیوانات اپنے غریزی کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ چونکہ غریزہ اس کے مزاج میں بہت زیادہ ہے لہٰذا اسے ہدایت و رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ شہد کی مکھی اپنا مسدس چھتہ بنانے میں کسی انجینئر کی رہنمائی کی محتاج نہیں ہے۔ ایسے ہی چیونٹی بھی ایک اجتماعی نظام کی پیروی کرنے میں کسی راہنما و تربیت کرنے والے کی نیازمند نہیں ہے۔ چھتہ بنانے میں شہد کی مکھی اور اجتماعی نظام کی پیروی میں چیونٹی کا راہنما ان کا غریزہ ہی ہے جس کو مخلوق کے خالق نے ان کے مزاج میں ودیعت کیا ہے لیکن انسان......

چونکہ انسان کے طبیعی مزاج میں غریزہ زیادہ مقدار میں موجود نہیں ہے، لہٰذا وہ اپنی زندگی کے زیادہ تر اُمور میں ہدایت و رہنمائی کا محتاج ہے۔ حیوانی معاشرہ میں طبابت کی رہنمائی کا مسئلہ ہی نہیں ہے کیونکہ حیوانات اپنے غریزہ کی رہنمائی سے اپنے مرض کی تشخیص کرتے اور پھر اس کا علاج کرتے ہیں۔ مرض کی تشخیص میں صرف انسان پڑھے لکھے طبیب و ڈاکٹر کا محتاج ہے۔

انسانی معاشرے میں رہنمائی اور ہدایت کا مسئلہ وہ ہے کہ جس کا تعلق طبیعی و حقیقی ضرورت سے ہے۔ انسان اپنی روح و جسم کے تکامل، فردی و اجتماعی زندگی، بلکہ زندگی کے تمام اُمور میں خود کو ہدایت و رہنمائی کا محتاج سمجھتا ہے۔ یہیں سے ہمارے سامنے مکاتب کی پیدائش کا فلسفہ اور قیادت کے مختلف سسٹم آتے ہیں اور ہم ان کی موت و نابودی کے عمل سے واقف ہوتے ہیں۔

دنیا کا ہر مکتب انسان کی اسی طبیعی ضرورت کی اساس پر وجود میں آیا ہے کہ جس کو ہدایت و رہبری کہتے ہیں۔ انسان خود کو ہدایت و رہنمائی کا محتاج سمجھتا ہے۔ چنانچہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے، ان مفکرین کے ذہن کی اُپج سے بہت سے مکاتب وجود میں آئے جو کہ بزعم خود انسانی معاشروں کی قیادت سنبھالے ہوئے تھے۔

لیکن! چونکہ ان مکاتب میں سے زیادہ تر حق و عدالت کی اساس پر وجود میں نہیں آئے

تھے اور ہر لحاظ سے انسان کی فردی و اجتماعی زندگی کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے تھے لہٰذا اپنے سے بلند مکتب سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے۔ یہ تھا انسانی معاشروں میں مکاتب کی پیدائش اور ان کی نابودی کا فلسفہ۔

واضح رہے کہ دنیا میں وہی مکتب ابدی ہو سکتا ہے اور ہمیشہ بھٹکے ہوئے انسانی قافلوں کی رہبری کر سکتا ہے کہ جس نے بلند و صحیح طریقۂ کار کے ساتھ حق و عدالت کی بنیاد پر انسانوں کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھالی ہو اور تمام طبیعی و واقعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہو۔ ایسا مکتب خواہ نہ خواہ جبرِ تاریخ کے قطعی حکم کے تحت تمام مکاتب پر کامیاب ہوتا ہے اور ساری دنیا کے انسانوں کے اُمور کی زمام اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے اور جبرِ تاریخ کے اسی حکم کو مدنظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی مکتب میں صحیح رہنمائی کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور وہ بھی حق و عدالت کی اساس پر تو تنازع بقا کے میدان میں وہ دیگر مکاتب پر کامیاب ہو جائے گا اور آخر کار وہ عالمی مکتب بن جائے گا اور انسانوں کی ابدی قیادت کو اپنے لیے دست اختیار میں لے لے گا۔

قرآن کہتا ہے:

هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (سورۂ توبہ: آیت ۳۳)

"وہی تو وہ (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول (محمدؐ) کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ (مبعوث کر کے) بھیجا تاکہ اُس کو تمام دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرکین برا مانا کریں"۔

اس آیت میں اسلام کی کامیابی بیان ہوئی ہے ___ دنیا چاہے یا نہ چاہے، رسولؐ کا آئین تمام مکاتب پر غالب آئے گا اور جبرِ تاریخ کے حکم سے عالمی آئین بن جائے گا......

کیوں ___؟ اس لیے کہ رسولؐ دو طاقتوں کے حامل ہیں: ایک ہدایت دوسرے عدالت۔ جو شخص ان دو طاقتوں سے لیس ہوتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کا مکتب عالمی و اَبدی بن جاتا ہے۔ اس کا عالمی جلوہ امامِ زمانہؑ کے ذریعے ہوگا۔ کیونکہ آپؑ بھی دو طاقتوں کے حامل ہیں، ہادی بھی ہیں اور آپؑ کی دعوت کی بنیاد بھی عدالت پر اُستوار ہے اور یہ دونوں ایسے مسئلے ہیں کہ انسان پوری طاقت کے ساتھ ان کے پیچھے دوڑتا

اس میں نہ جنگ کی ضرورت ہے نہ جدال کی احتیاج۔ امامِ زمانہ علیہ السلام اس مرکز پر ہیں کہ جس کی طرف لوگوں کی طبیعی توجہ کی سوئی حرکت کرتی ہے۔ اس لیے امامِ زمانہ علیہ السلام کی کامیابی یقینی وحتمی ہے۔ آخرکار ایک توحید پرست معاشرہ عدل کی بنیاد پر امامِ زمانہ علیہ السلام کے ذریعے اپنے آخری مقصد تک پہنچ جائے گا، ان شاء اللہ!

امیر المومنین علی علیہ السلام کا مذہب اہل بیتؑ کی طرف دعوت دینا

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''تم کہاں جا رہے ہو؟ کدھر بھٹک رہے ہو؟ حالانکہ علمِ ہدایت نصب ہیں، نشانیاں واضح ہیں، منارے کھڑے ہیں۔ تمھاری یہ سرگردانی کہاں پہنچائے گی تمھیں؟ بلکہ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم بھٹک کیسے رہے ہو حالانکہ تمھارے درمیان اہل بیتِ پیغمبرؐ موجود ہیں جو حق کی زمام ہیں، دین کے جھنڈے ہیں، سچائی کی زبان ہیں، لہٰذا انھیں بھی قرآن کی طرح اچھی منزل پر رکھو اور تحصیلِ علم کے لیے ان کی خدمت میں پہنچو، جس طرح پیاسے اور تھکے ہارے چوپائے نہر کے کنارے پہنچتے ہیں۔

اے لوگو! یاد رکھو یہ ارشادِ پیغمبرؐ ہے کہ ہم میں سے کسی شخص کو اگر موت آ جائے تو ظاہری حیثیت سے وہ مر جائے گا لیکن درحقیقت زندہ ہوگا اور یوں اس کا جسم خاک میں مل جائے گا لیکن واقعاً خاک میں نہ ملے گا، لہٰذا تم جو باتیں جانتے نہیں ہو اس کے متعلق لب کشائی نہ کرو کیونکہ زیادہ تر وہی باتیں حق ہیں جن کا تم انکار کرتے ہو۔ معافی مانگو اس سے جس پر تم غلبہ نہیں پا سکتے اور وہ میں ہوں۔ کیا میں نے تمھارے درمیان ثقلِ اکبر (یعنی قرآن) پر عمل نہیں کیا؟ اور تم میں ثقلِ اصغر (یعنی اپنے دونوں جگر گوشے حسنؑ و حسینؑ) چھوڑنے والا نہیں ہوں؟ کیا میں نے تمھارے درمیان ایمان کا جھنڈا نہیں گاڑا؟

نیز حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اپنے نبیؐ کے اہل بیتؑ پر نظر رکھو، ان کی پہچان کا پورا دھیان رہے، ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہو، یہ تمھیں راہِ راست سے الگ نہ کریں گے اور نہ ہلاکت میں ڈالیں گے۔ اگر وہ ٹھہریں تو تم بھی ٹھہر جاؤ اور اگر چل کھڑے ہوں تو تم بھی چل پڑو۔ ان سے آگے نہ بڑھ جانا کہ گمراہ ہو جاؤ اور نہ پیچھے رہ جانا کہ ہلاکت میں پڑ جاؤ۔

ایک مرتبہ آپؑ نے اہل بیتؑ کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا:

وہ علم کی زندگی ہیں۔ (ان کے دم سے علم زندہ ہے) جہالت کے لیے (پیام) موت ہیں۔ ان کے عمل کو دیکھ کر تم ان کے علم کا اندازہ کر سکو گے، ان کے ظاہر کو دیکھ کر ان کے باطن کا اندازہ تمھاری سمجھ میں آجائے گا۔ ان کے سکوت سے تم سمجھو گے کہ ان کا کلام کس قدر جچا تلا ہوگا۔ نہ تو وہ حق کی مخالفت کرتے ہیں اور نہ ان کے مابین حق میں اختلاف ہوتا ہے۔ وہ اسلام کے ستون ہیں، مضبوط سہارا ہیں۔ ان ہی کے ذریعے حق اپنی منزل پر پہنچا۔ باطل کو زوال ہوا اور باطل کی زبان جڑ سے کٹ گئی۔ انھوں نے دین کو حاصل کیا۔ اس پر عمل کرنے اور ذہن نشین کرنے کے لیے صرف سننے سنانے کے لیے نہیں کیونکہ علم کے راوی تو بہت ہیں لیکن علم پر عمل کرنے والے، علم کا حق ادا کرنے والے بہت کم ہیں۔

☆☆☆

يَاعَلِي أَنتَ سَيِّدٌ فِي الدُّنيَا ، وَسَيِّدٌ فِي الآخِرَةِ ، حَبِيبُكَ حَبِيبِي ، وَحَبِيبِي حَبِيبُ اللهِ ، وَعَدُوُّكَ عَدُوِّي ،وَعَدُوِّي عَدُوّ اللهِ، وَالوَيلُ لِمَن أبغَضَكَ مِن بَعدِي

"اے علیؑ! تم دنیا میں سید و سردار ہو اور آخرت میں بھی، تمھیں دوست رکھنے والا مجھے دوست رکھنے والا ہے اور مجھے دوست رکھنے والا خدا کو دوست رکھنے والا ہے، اور تمھارا دشمن میرا دشمن ہے اور میرا دشمن خدا کا دشمن ہے۔ ہلاکت و تباہی نصیب ہو اسے جو میرے بعد تم سے بغض رکھے"۔

اس حدیث کو امام مالک نے مستدرک (ج ۳،ص ۱۲۸) میں درج کیا ہے اور بشرائط شیخین صحیح قرار دیا ہے۔

ادارہ منہاج الصالحین لاہور